نگار

بہ یادگار حکیم مومن خاں مومن

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ کو شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول ششر

فہرست مضامین سنہ ۱۹۲۸ء

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۱ | جنوری سنہ ۱۹۲۸ء | جلد ۱۳

کلام مومن پر ایک طایرانہ نگاہ

اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعراء متقدمین ومتاخرین کا کلام رکھ کر (باستثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی دیجائے، تو میں بلا تامل کہدونگا کہ "مجھے کلیات مومن دیدو اور باقی سب اُٹھالیجاؤ" ایک سننے والے کے دل میں قدرتاً اس کے بعد یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں ایسا کیوں کہوں گا اور اس ترجیح کا سبب کیا ہوسکتا ہے؟ اس مقالہ میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جس سے زیادہ تر مقصود مومن کی شاعرانہ قیمت کا اندازہ کرنا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ دنیا میں حقیقتیں نہیں بدلسکتیں، تو پھر ذوقِ انسانی کے اختلافات سوائے تعبیرات کے کسی اور چیز سے متعلق ہو ہی نہ شاعری حقیقت نہیں ہے، بلکہ حقیقتوں کا اظہار ہے، صداقت نہیں ہے بلکہ صداقتوں کی تعبیر ہے، خود کوئی کیفیت نہیں ہے بلکہ کیفیت بیان ہے، اور تعبیر وبیان کا اختلاف فطرت انسانی ہے۔

انسان کی قوتِ شعور بہ حیثیت ایک فطری قوت ہونے کے تمام افراد میں مشترک ہے لیکن بہ لحاظ کیفیات احساس ونقوش تاثر وہ دوسرے سے مختلف ہوسکتی ہے۔ انسان کا دماغ اپنی ساخت کے لحاظ سے مختلف ... اور اختصار ... [illegible]

نظر میں انحراف پیدا ہوتا ہے اور یہی وہ نظام فطرت ہے جس نے امیال وعواطف، کیفیات وجذبات، خواہشات و داعیات میں تمایز پیدا کرکے ایک ہی جنس کے مختلف افراد میں خطوط تفریق و امتیاز کھینچ دیئے اور کسی کو مومن بنادیا، کسی کو غالب، کسی کو میر کردیا اور کسی کو سودا

سورج وہی ایک چیز ہے اور اس کا طلوع وغروب وہی ایک منظر، لیکن ایک دل میں وہ مسرت ونشاط ہے اور دوسرے دل میں ہیبت و جبروت، وہ اُس کو دیکھ کر گنگنانے لگتا ہے اور یہ معبود سمجھکر سجدے میں گر پڑتا ہے، پھر نہ ہر شاعر گبر ہے اور نہ ہر گبر شاعر، حالانکہ اس کی شاعری اور اُس کی پرستش دونوں کا سرچشمہ وہی ایک آفتاب ہے۔ موسم برشکال کا وہی ایک پپیہا ہے جو کسی دلِ شادکام کے لئے شیریں پیام سرخوشی ہے اور کسی جسگ طعن جدائی پر کوئی برہن یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ "ڈارونگی بلکہ سر دوڑ" اسی خیال کو اور زیادہ وسیع کیجئے اور داد دیجئے اس کی جس نے اس تمام طوفان کو سمیٹ کر صرف اس ایک فقرہ میں بھر دیا کہ

"وحسنک واحد وعباراتنا شتّیٰ"

پھر جن اصول کے ماتحت جذبات وکیفیات میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، انھیں اصول کے زیر اثر ان کے سمجھنے میں بھی اختلاف ہونا ضروری ہے اور اسی بنا پر نہ میں اپنی پسندیدگی پر آپ کو مجبور کرسکتا ہوں اور نہ آپ مجھ سے اپنی عدم پسندیدگی کو بجبر تسلیم کرا سکتے ہیں اور سب سے پہلے یہی دشواری ایک نقاد کے سامنے آتی ہے جو بسا اوقات اسے صید ہے راستہ سے ہٹا دیتی ہے لیکن جن لوگوں نے ان دشواریوں کو محسوس کرکے اصول تنقید منضبط کئے ہیں وہ بہت محفوظ ہیں اگر ان پر عمل کیا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ ان پر عمل کئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ کسی خیال پر تنقید کرنے کے لئے سب سے پہلے اصول فطرت پر نظر ڈالنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ خیال کس حد تک درمیانی منازل طے کرتا ہوا فطرت کے ساتھ ساتھ چلا ہے اور اگر کوئی شخص اس طرح فیصلہ کرنے پر قادر ہو تو پھر دوسرا اصول یہ ہے کہ اس کو صرف اپنی ہی رائے پر اعتماد کرنا چاہئے اور سمجھ لینا چاہئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ہیچ ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق میں مومن کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالونگا (سرسری اس لئے کہ غایر تنقید کا ایک بسیط مضمون آپ کو اسی اشاعت میں کسی اور جگہ نظر آئے گا)

تمہید میں اس قدر عرض کرنا ضروری اسی لئے خیال کیا کہ بعد کو یہ سوال نہ پیدا ہو کہ مومن کے متعلق اظہار خیال کن اصول پر کیا گیا ہے ہر چند یہ بالکل صحیح ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے اور یہ بھی غلط نہیں کہ اس کی طبعی قوت کا نشو ونما ماحول سے بھی بڑی حد تک متاثر ہوتا ہے، اگر ابن المعتز شاہی خاندان سے نہ ہوتا تو بقول ابن رومی یہ شعر بھی نہ کہہ سکتا۔

فانظر الیہ کزورق من فضۃ 　　 قد اثقلتہ حمولۃ من عنبر

ہلال کو دیکھ کر عنبر کے بارسے دبی ہوئی چاندی کی کشتی" کی طرف خیال منتقل ہونا اسی وقت ممکن ہے جب کسی نے ان چیزوں کو دیکھا ہو جاہلیت عرب کے شعراء کا فطرت پرست ہونا اسی بنا پر تھا کہ سوائے مناظر قدرت کے کوئی اور چیز اُن کے سامنے نہ تھی۔ لیکن کبھی کبھی

یہ بھی ہوتا ہو کہ ایک شاعر اپنے ذوق فطری کے خلاف کسی ماحول میں پہونچ جاتا ہے' اور ایسی صورت میں اس پر گرد و پیش کی چیزوں کا بہت کم یا بالکل کوئی اثر نہیں ہوتا۔

مومن کا ماحول بھی وہی تھا جو غالب و ذوق کا تھا سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ، ستارۂ سحری کی طرح جھلملا رہا تھا اور شعرائے عصر اُسی کو غنیمت جانکر حریصانہ انداز کے ساتھ اس سے مستفید ہونے کے لئے ہات پاؤں مار رہے تھے اس میں شک نہیں کہ انحطاط و زوال کے عام سوگوارانہ مناظر کا اقتضا یہی تھا کہ اس وقت کی شاعری بالکل متشائمُ (Pessimistic) ہوتی لیکن ہمیں اس تلخ حقیقت کا اظہار کرنا پڑیگا کہ سوائے بہادر شاہ ظفر کے جو براہ راست انقلاب کا شکار تھا اور جو پوری طرح زوال حکومت کا درد اپنے دل میں لئے ہوے تھا، کوئی ایک شاعر بھی اس وقت ایسا نہ تھا جو تاریخ اسلام ہند کے اس حد درجہ دردناک منظر سے متاثر ہوا ہو۔ ذوق کو ظفر کے استاد ہونے کا فخر حاصل تھا، اور وہ بالکل خلاف ضمیر ظفر کو "شہنشاہ عالم و عالمیاں" کہہ کہکر اس مفلس و تہیدست و بیا بادشاہ کو لوٹنا چاہتا تھا، غالب یہی حسرت اپنے ساتھ لیگئے کہ وہ کیوں نہ ذوق کی جگہ ہوے اور ہرچند انھوں نے اپنی خلش کو چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے۔ غالب کا یہ کہنا کہ :-

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال　　یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

ایک ایسی تعریض اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے کہ اس سے زیادہ اظہار رشک کی شدید مثال مشکل سے کوئی اور ملسکتی ہے۔ میرے ایک فاضل دوست کا خیال تھا کہ غالب کی یہ غزل جس کا ایک بہت مشہور شعر یہ ہے :-

وہ بادۂ شبینہ کی سرمستیاں کہاں　　اُٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

زوال سلطنت مغلیہ کا مرثیہ ہے، لیکن یہ تاویل بالکل ایسی ہی ہے جیسے حافظ کی شراب کو آب کوثر قرار دینا۔ الغرض اس وقت کے شعراء سب کے سب اس احساس سے بالکل بیگانہ تھے، ورنہ "حماسیات" کا ایسا بے نظیر دفتر مرتب ہوجاتا کہ یا تو آج اقبال کے پیدا ہونے کی ضرورت نہ ہوتی یا ہوتی تو موجودہ سطح سے بہت زیادہ بلند و ارفع۔ مومن بھی اس بیحسی سے بالکل مستثنیٰ نہیں سمجھے جاسکتے، لیکن اسی کے ساتھ ان پر اس قدر بیغیرتی کا بھی الزام عائد نہیں ہوسکتا، کیونکہ انھوں نے نہ کبھی بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ لکھا اور نہ کسی امیر کو سراہا جس کی ایک وجہ تو اُن کی غیور و خود دار فطرت تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ سمجھتے تھے ایسے وقت میں بادشاہ کی تعریف کرنا حقیقتاً زخم پر نمک چھڑکنا ہے، بلکہ زیادہ گہری نظر سے ان کے کلام کو دیکھا جائیگا تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس وقت کی سیاسیات سے نابلد نہ تھے اور قومی خودداری کا جذبہ اُن میں اس قدر موجود تھا کہ جہاد پر انھوں نے ایک مثنوی ہی سپرد قلم کردی اور دیوان میں بھی بعض اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن کا روئے سخن فرنگیوں کی طرف ہے بہرحال پہلی چیز جو مومن کو اپنے عہد کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ ان کے کلام میں کسی جگہ خوئے گدایانہ کا اظہار نہیں ہوتا۔

غالب کا رشک کہئے یا خودداری اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ وہ "اپنے کافر کو خدا کو بھی نہ سونپ سکے" لیکن صاحب کے کف دست پر چکنی ڈلی دیکھکر خوشامد و تملق پر مجبور ہو ہی گئے اور اسی کے ساتھ جب تنخواہ ملنے میں دیر ہوئی تو اپنے فاقوں تک کا بھی ذکر کرنے سے احتراز نہ کیا، ذوق کا تو خیر ذکر ہی کیا کہ وہ اس باب میں غالب سے بھی فرد تر تھے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ خلاف فطرت ماحول کا اثر بہت کم یا بالکل نہیں ہوتا، وہ مومن پر منطبق ہوتا ہے جسکا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے شاہانہ دربار تک رسائی اور بیجا مدح سرائی کو اچھا نہیں سمجھا، لیکن ماحول کا جس قدر حصہ اُن کے احساس صحیح کو متاثر کر سکتا ہے اس سے متاثر ہوئے اور ان کا اظہار بھی انھوں نے کیا، لیکن اُسی کے ساتھ یہ امر ضرور تعجب انگیز ہے کہ ایک شخص مثنوی جہاد تو لکھ سکتا ہو لیکن کوئی شہر آشوب نہ لکھے، حالانکہ معاملات حسن و عشق میں وہ بڑے بڑے ماتم خیز اشعار لکھنے کا اہل ہو۔

دوسری خصوصیت جو مومن کو اپنے دیگر ہمعصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ رنگ تغزل میں انکا کلام اس غیر تغزلانہ چیز سے بالکل پاک ہے جس کو تصوف یا عشق حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہے، وہ خود بھی کہتے ہیں کہ:۔

مومن بہشت و عشق حقیقی تمھیں نصیب		ہم کو تو رنج ہو جو غم جاوداں نہ ہو

بظاہر یہ امر کچھ ہلکا کر دینے والا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کا کلام تصوف کی چاشنی سے خالی نظر آئے، لیکن اگر ایک نقاد غزل کو غزل ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھے گا تو وہ یوں بھی تصوف کے کلام کو خارج کر دیگا، کیونکہ غزل کے اندر ایسی باتوں کا اظہار جو تغزل سے علٰحدہ ہوں میرے نزدیک کوئی محمود بات نہیں ہے۔

تصوف کے حدود وہاں سے شروع ہوتے ہیں جہاں عقل کی پرواز ختم ہوتی ہے اور وہ فضا جو ماورا سرحد عقل و شعور ہے اس کے وسعت کی کوئی انتہا نہیں یہاں تک کہ مجانین و مجاذیب کی بے معنی باتیں بھی وہاں کوئی نہ کوئی مفہوم اختیار کر لیتی ہیں، اس لئے میرے نزدیک تغزل میں تصوف کو شامل کر لینا، ایک غزل گو شاعر کا کمال نہیں بلکہ اس کا عجز ہے۔ مومن نے اسی دنیا کا عشق کیا، اور اس میں جتنے تجربات تلخ و شیریں ہو سکتے ہیں وہ سب انھوں نے حاصل کئے، وہی ہجر و وصال کی مادی کیفیات، وہی شکوہ و شکایات وہی رقیب کا کھٹکا، وہی التجائیں، وہی تدبیریں، الغرض تمام وہ جذبات جو عناصر محبت سے تعلق رکھتے ہیں سب مومن کے ہاں پائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اگر ہم مومن کے معشوق کا کیرکٹر اُن کے کلام سے متعین کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ بازاری جنس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، لیکن باینہمہ مومن کا کمال شاعری دیکھئے کہ اگر ایک طرف وہ پستی سے اس قدر قریب ہے کہ ادنٰی سی لغزش بھی اسے گرا کر جرأت و انشا کی صف میں ملا سکتی ہے، تو دوسری طرف بلندی کا یہ عالم ہے کہ غالب کی انتہائی پرواز بھی اس کی فضا تک نہیں پہونچتی (لیکن یہ سب انھیں حدود کے اندر جن کو حدود تغزل کہا جاتا ہے)

دنیا میں کسی کتاب کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ وہ اخلاق پر اچھا اثر ڈالتی ہے یا بُرا، لایعنی سی بات ہے۔ اگر کوئی تنقید ہو سکتی ہے تو

صرف یہ کہ وہ اچھی لکھی گئی ہے یا بری۔ اس لئے جرات و انشا کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ اُن کی شاعری اخلاق کو خراب کرنے والی ہے، میرے نزدیک درست نہیں، لیکن حقیقتاً فن کے لحاظ سے بھی انکا کلام محل نظر ہے اور سخافت سے بھی احتراز نہیں کیا گیا، برخلاف مومن کے کہ انھوں نے نہایت عریاں طور پر معاملات حسن و عشق کا اظہار کیا، لیکن اسی کے ساتھ نہ کسی جگہ فن مجروح ہوا اور نہ رنگینی پیدا ہوئی آن کے ہاں ذلیل سے ذلیل جذبہ بھی نہایت بلند طریق پر ظاہر کیا گیا ہے۔ مومن کا محبوب بھی جرات و انشا کی طرح بازاری ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جرات و انشا کا عشق بھی بازاری ہے، اور مومن بہت بلندی سے دیکھتے ہیں اور اسی بلند فضا تک محبوب کو بھی لیجانا چاہتے ہیں۔ جرات و انشا اگر اپنی تمنا میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ ترک محبت کے لئے بھی آمادہ ہوجاتے ہیں، لیکن مومن کی پاکیزگی ذوق کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی اُمید کو بھی اس عالم آب و گل سے جدا قرار دیکر ایک غیر فانی چیز بنا دیتا ہے یہاں تک کہ اس کی محبت کی فضا محبوب و جلوۂ محبوب سے بھی بے نیاز ہوجاتی ہے، چنانچہ کہتا ہے :-

قطع امید سے سر کاٹنے کو کیا نسبت

مجھ میں وہ دم ہے ابھی جو ترے خنجر میں نہیں

میں نہیں سمجھتا کہ تمنا کو اس سے زیادہ رفیع و جلیل بنایا جا سکتا ہے۔

مومن کا عشق باوجود مادی ہونے کے اس درجہ بلند فضا دگی رکھتا ہے کہ وہ اپنی ہر ناکامی کا شکار خود ہی بننا پسند کرتے ہیں اور محبوب سے کوئی مطالبہ ایسا نہیں کرتے جو شان عاشقی و محبوبی کے خلاف ہو۔ زمانِ ہجراں میں عاشقوں یا شاعروں کا واویلا خاص چیز ہے، لیکن مومن کا ذوق اس باب میں یہ ہے :-

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

پھر وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات وہ اس سے بھی زیادہ قیامت ہوجاتے ہیں اور اپنی تمام تکالیف کو اس قدر صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا بیان بھی تیر و پیکاں سے کم نہیں ہوتا۔ ملاحظہ ہو یہ شعر :-

جانے دے چارہ گر شب ہجراں میں مت بلا وہ کیوں شریک ہو مرے حال تباہ میں

میرے خیال میں مومن ہی ایک ایسا شاعر ہے جو نفسیاتی رموز کو سمجھکر شاعری کرتا ہے اور ایسی معنوی نزاکتیں پیدا کرتا ہے کہ غور سے تجربہ کرنے کے بعد ان کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً اس کا ایک شعر ہے :-

دن رات فکر جور میں یوں رنج اٹھانا کبتلک میں بھی نہ دآرام لوں تم بھی نہ دآرام لو

بظاہر کس قدر سادہ شعر ہے" محبوب سے کہہ رہا ہے کہ مجھکو ستانے کی فکر میں رات دن الجھے رہنا بیکار پریشان ہونا ہے، کچھ دیر کے لئے اس خیال کو ترک کرکے سکون حاصل کرو" اس حد تک تو ہر شاعر کہہ سکتا تھا، لیکن یہ ٹکڑا کہ "میں بھی نہ دآرام لوں" صرف

مومن ہی کے دماغ میں آ سکتا تھا۔ اس فقرہ سے مومن نے اپنی نفسیات دانی کو بدرجۂ کمال ظاہر کیا ہے قابل غور امر ہے کہ مومن نے یہ کیوں کہا "میں بھی ذرا آرام لوں" ایک کھلی ہوئی وجہ تو یہ ہے کہ اس طرح وہ محبوب پر ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ "اب بھی مجھے کافی ایذا پہونچ چکی ہے اور اس لئے مزید فکر جور بیکار ہے" لیکن اس سے زیادہ گہری بات ایک اور ہے۔ فطرت انسانی ہے کہ جب کسی کے فائدہ کی بات بتائی جاتی ہے تو وہ غور کرتا ہے کہ کیوں ایسا مشورہ دیا گیا اور اس کو کیا غرض تھی کہ وہ میرے فائدہ کی بات بتاتا۔ اس لئے گمان بد کی بنا پر بعض مرتبہ وہ مشورہ قبول نہیں کیا جاتا، لیکن اگر ساتھ ہی ساتھ مشورہ دینے والا یہ بھی لکھدے کہ اس میں تھوڑا سا فائدہ میرا بھی ہے تو پھر غور و تامل کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اس کو بالکل موافق فطرت سمجھکر مان لیا جاتا ہے۔ مومن کا یہ کہنا کہ "میں بھی ذرا آرام لوں" بالکل اسی قبیل سے ہے۔

مومن نے رقیب کا ذکر کثرت سے کیا ہے اور موجودہ زمانہ میں اس کو معیوب سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس سے محبوب کی سیرت پر اچھی روشنی نہیں پڑتی، لیکن اول تو مومن کے عہد میں اس قسم کے مضامین معیوب نہیں سمجھے جاتے تھے اور اگر ہوتے بھی تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر اس قسم کے مضامین کوئی شخص مومن کی طرح لکھ سکے تو کیونکر ان سے قطع نظر ہو سکتی ہے۔ جرارت و انشا کے ہاں رقیب و دشمن کے متعلق جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ یقیناً دائرہ تہذیب سے خارج ہے، لیکن مومن تو ان کا بھی ذکر صرف اپنا ہی دل خون کرنے کی حد تک کرتا ہے اور کسی جگہ حدود عاشقی سے متجاوز نہیں ہوتا۔ مثلاً

ذکر اشک غیر میں رنگینیاں		بوئے خوں آئی تری گفتار سے

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جائیے		یہ ستم اے بیمروت کس سے دیکھا جائیے

عرفی کا نہایت معرکۃ الارا شعر ہے:۔

ہمرہ غیری ومی گوئی بیا عرفی تو ہم		لطف فرمودی برو کایں پای رفتار نیست

اس میں شک نہیں کہ اسلوب بیان اور ندرت ادا کے لحاظ سے نہایت عجیب و غریب شعر ہے اور مشکل سے اس مضمون میں کسی ترقی کی گنجائش نکل سکتی ہے، خاصکر یہ ٹکڑا، "کایں پای رفتار نیست" عجیب لطف دے رہا ہے، لیکن جب مومن اسی مضمون کو پیش کرتے ہیں تو عرفی کے شعر کا یہی ٹکڑا بالکل بےمعنے نظر آنے لگتا ہے۔ مومن کا ارتقا ملاحظہ ہو۔

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے، میں حیران ہوں		کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائیے

وہاں محبوب کو غیر کے ہمراہ دیکھ عرفی کے قدم نہیں اٹھتے اور جھنجلا کر کہدیتا ہے کہ تشریف لیجائیے میں ساتھ نہیں دے سکتا، یہاں مومن کی جان ہی اس منظر کو دیکھ کر نکلی جا رہی ہے جس کو وہ استقبال سے تعبیر کرتا ہے، لیکن استقبال کس کا؟ یہ خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا، مومن، عدو کی کامیابی سے آگاہ ہو چکے ہیں، لیکن باوجود اس کے احترام محبت ملاحظہ کیجئے،

جاں نہ کھاؤ وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں　　جب گلہ کرتا ہوں ہم دم قسم کھا جائے ہے

ان کے دیوان میں کثرت سے ایسے شعر ملیں گے جن میں عدو کی کامیابی اور اپنی حرماں نصیبی کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ہر جگہ ایک نئی کیفیت کے ساتھ اور عشق کی پوری نیاز آگینیوں کو لئے ہوئے یہاں تک کہ ایک جگہ وہ یہ بھی کہہ گزرتا ہے۔

ہے شب وصل غیر بھی کاٹی　　تو مجھے آزمائے گا کب تک

میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے زیادہ پُر درد طریقہ فراوانی جذبات کے اظہار کا اور کیا ہو سکتا ہے۔ محبوب کی ستم رانیوں سے بیزار ہو کر ترک الفت کا خیال کبھی ان کے دل میں آتا ہی نہیں اور اگر آتا بھی ہے تو اس طرح کہ اظہار میں صد ہزار توثیق الفت پنہاں رہتی ہیں:-

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

دنیائے شاعری مشکل سے ایسے ایجاز سدید، بیان جزیل اور عبارت انیق کی مثال پیش کر سکتی ہے۔

مومن اسلوب ادا اور قدرت بیان کا بادشاہ ہے وہ معمولی سی معمولی بات کا اظہار کرتا ہے تو بھی اس لطف کے ساتھ کہ اس میں جدت پیدا ہو جاتی ہے اور ذہن سامع بے اختیارانہ طور پر اس سے لطف اٹھاتا ہے، پھر وہ اسی سلسلہ میں جب اَن ہونی کو ہونی اور ہونی کو انہونی ثابت کر جاتا ہے تو عجیب سماں پیدا ہو جاتا ہے۔

شب فراق کی انتہائی تکلیف سے مر جانا یا مرنے کی آرزو کرنا بالکل قدرتی خواہش ہے اور اگر کوئی شاعر اس کے خلاف جائیگا تو یقیناً فطری ادعا کے خلاف کریگا، لیکن ملاحظہ ہو مومن کس حسن کے ساتھ اس کی توجیہ کرتا ہے۔

شب فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں　　کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

مومن کی ایک اور خصوصیت جو بہت کم کسی اور کے ہاں پائی جاتی ہے، یہ ہے کہ کہیں کہیں وہ ایسے مخفی لیکن نہایت پُر کیف مفہوم کے نشانات چھوڑ جاتا ہے کہ ہر شخص کی نگاہ وہاں تک نہیں پہونچ سکتی پھر کہیں یہ خصوصیت وہ ترکیب الفاظ سے پیدا کرتا ہے۔ مثلاً

کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم　　کہیں پامال سر نہ ہو جائے

دعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لئے　　سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لئے

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے　　اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

تھا محو رخ یار میں کیا آئینہ دیکھوں　　معلوم ہے یار دمجھے جو رنگ مرا ہے

ملاحظہ ہو باقی مضمون کیلئے اس رسالہ کا صفحہ ۱۴۸

حکیم مومن خاں اور اُن کی شاعری[۱]

کافر باشم اگر بمرگ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ماتم　(غالب)

سوانح حیات

ابھی ہندوستان کی نگاہوں نے ۱۸۵۷ء کا محشر زا ہنگامہ نہیں دیکھا تھا۔ مرحوم ظفر بھارت ورش کا شہنشاہ اور اقلیم سخن کا تاجدار جلوہ آرائے سریر سلطنت تھا۔ مومن۔ ذوق۔ غالب۔ ممنون۔ آزردہ۔ درخشاں۔ شیفتہ۔ صہبائی۔ علوی کی آتش بیانیاں گرمی محفل کا باعث تھیں اور یہی وہ لوگ تھے جن کی ذات "باد در محفل شاں مشک فشاں از دم شاں" سے عبارت تھی شمع بجھنے سے پہلے بھڑکتی ہے، دلی کی یہ بہار بھی شمع سحر کا آخری شعلہ تھا۔ اس بزم سخن میں مومن کی شمع حیات سب سے پہلے گل ہوئی جس کا ماتم ایک سوگوار نے مندرجہ عنوان شعر میں کیا ہے۔

حکیم مومن خاں مومن ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں دہلی کے محلہ کوچہ چیلان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خاں اور دادا کا حکیم نامدار خاں تھا۔ حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دو بھائی شاہ عالم کے عہد حکومت میں کشمیر سے آکر دلی میں سکونت پذیر ہوئے اور شاہی طبیبوں میں داخل ہوئے۔ شاہی خدمات کے صلہ میں موضع بلابہ وغیرہ پرگنہ نارنول میں بصورت جاگیر عطا ہوئے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا کی تو پرگنہ نارنول اس میں شامل تھا۔ نواب نے اس جاگیر کے عوض میں حکیم نامدار خاں کے ورثا کو ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر دی جس میں حکیم مومن خاں بھی شامل تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے بھی مومن کے خاندان کے چالیسوں کو سو روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی جس میں سے ایک چوتھائی ان کے والد کو ملتا تھا اور اُن کے بعد مومن خاں کو کچھ ملتا رہا۔

مومن خاں کے والد حکیم غلام نبی خاں کو حضرت شاہ عبد العزیز قدس سرہٗ العزیز سے بہت ارادت تھی۔ مومن خاں جب پیدا ہوئے تو حکیم غلام نبی خاں نے شاہ صاحب کو تکلیف دی اور اسی قدسی صفت نے نومولود کے کانوں میں اذان دی شاہ صاحب ہی نے اس مولود مسعود کا نام مومن خاں تجویز فرمایا۔ "گھر والوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور حبیب اللہ نام رکھنا چاہا لیکن شاہ صاحب ہی کے نام سے مشہور ہوئے بعض تذکرہ نویسوں

---

[۱] اس مضمون کی تیاری میں۔ آبحیات از محمد حسین آزاد۔ گل رعنا از سید عبد الحی۔ شعر الہند ہر دو جلد عبد السلام ندوی۔ بہارستان سخن سید امداد امام اثر۔ سخن شعرا از عبد الغفور نساخ۔ بزم سخن علی خاں۔ طرز عشق و طور کلیم نور الحسن۔ قصائد مومن مرتبہ ضیا احمد ایم۔اے۔ گلشن بیخار شیفتہ، History of U.L. by R. B. Saxena، العلم۔ زمانہ اور نگار کی پرانی جلدوں سے امداد لی گئی ہے۔ [۲] مہینے اور تاریخ کا پتہ نہ چل سکا۔

تجاہل کے باوجود اس نام سے اُن کی شہرت دنیائے اُردو میں قائم ہوئی۔

مومن کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو شفیق باپ نے شاہ عبدالقادر کی خدمت میں پہونچا یا۔ حافظہ اس بلا کا پایا تھا کہ شاہ صاحب کی زبان مبارک سے نکلا ہوا کوئی لفظ بمشکل بھولتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ اس ذہین لڑکے نے حضرت شاہ عبدالعزیز کا وعظ ایکبار سنکر لفظ بلفظ دہرادیا۔ غرض مومن نے درسیات کی تکمیل ایسے گھرانے میں کی جو ایک مدت تک دلی میں اپنے علم و فضل کی بناپر مشہور رہا۔ مومن نے اس گھرانے کے احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ العزیز کے وصال پر وہ بے بدل تاریخ لکھی ہے کہ حق تو یہ ہے کہ حق شاگردی ادا کردیا۔ شعر یہ ہے۔

دست بیداد اجل سے بے سرو پا ہوگئے
فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

درسیات کو ختم کرنے کے بعد اپنے والد حکیم غلام نبی خاں اور اپنے دونوں چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور اپنے آبائی مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ "ہر کہ درکانِ نمک رفت نمک شد" حکیم مومن خاں کی شخصیت بھی مومن شاعر کی شخصیت میں جذب ہوکر رہ گئی۔ مومن نے طب پڑھی طبابت کی مگر وہیں تک جہاں تک اُن کے عاشقانہ انداز طبیعت کا تقاضا تھا۔ مومن کے یہاں طب نے دراصل شاعری کا جامہ پہن لیا ہے مثنوی قول غمیں میں حکیم مومن شاعر کے لباس میں یوں جلوہ گر ہوتے ہیں

میں نے اس نبض پر جو ہاتھ دھرا
ہاتھ سے میرے مرا دل ہی چلا

اس کو جوں ہاتھ لگایا میں نے
دل سے بس ہاتھ اُٹھایا میں نے

آفتِ تازہ جو جان پر آئی
یہ غزل اپنی زبان پر آئی

غزل

کیا لگا دستِ دل آرام سے ہاتھ
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

کسکے ہاتھوں سے لگا تھا کہ جدا
نہیں ہوتا دلِ ناکام سے ہاتھ

ہاتھ دیتے تو ہو اب ہاتھوں پر
کان پر رکھئے گا پھر نام سے ہاتھ

کیا کہوں آہ بقولِ مومن
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

ادب اُردو اس غزل کیلئے مومن کی طبابت کی زیر بار احسان ہے۔ اس غزل کی سرگزشت شیفتہ کی زبان سے سنئے۔ گلشن بیخار میں صاحب معروف صاحب جی کے تذکرے میں فرماتے ہیں کہ "نام امۃ الفاطمہ بیگم معروف بصاحب جی بتقریب مداوا با مومن خاں کارش افتادہ ماہے چند کارہا

درد و دوا بود مثنوی قول غمیں، تام کہ از خان معزے الیہ است شرح نسخۂ حسن و جمال ہماں موزوں قد است "

مومن کی بچپن طبیعت کب تک طب کی گرویدہ رہتی وہ نجوم کی طرف مائل ہوئی اسے بھی ماہرین فن سے حاصل کیا رل میں بھی دستگاہ بہم پہنچائی

آبحیات میں بعض واقعات بھی درج کئے گئے ہیں جن سے مومن کے احکام نجوم کی صحت پر روشنی پڑتی ہے ۔

مومن کی اختر شناسی بھی اِن کی عاشقانہ طبیعت کیلئے ایک تازیانہ ثابت ہوئی ۔ دنیا میں کم لوگ ہونگے جو آئندہ کی باتیں جاننے کے خواہاں نہوں خصوصاً صنف لطیف ۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مومن خاں ابتداے شباب میں زندہ دل یار باش آزاد مشرب رنگیں طبع وارفتہ مزاج آدمی تھے ۔ طبابت اور اختر شناسی نے اِن کے لئے اور بھی سہولتیں پیدا کردی تھیں ۔ چنانچہ نجوم سے مومن وہی کام لیتے ہیں جو ایک عاشق کو لینا چاہیے ۔ ایکبار یہ اختر شناس آتش فراق سے جل رہا تھا ۔ کچھ دل میں آیا زائچہ اُٹھایا دیکھا تو ستارے مہربان تھے امید وصل سے دل کو تسکین دی اور جوش میں اپنے مطلوب کو جاکر یوں مطلع کیا ۔

کہاں ہے بدر سیما وہ ترحم　　کہ ہوں میں رازدانِ سیر انجم
نہیں کیا تم نے احکام آزمائے　　انھیں باتوں نے تو یہ دن دکھائے

یہ سب کچھ سچ پر اتنا بھی کہینگے　　کہ جیتے ہیں تو اکدن مل رہینگے
سلیماں ہمدم بلقیس ہوگا　　قرانِ زہرہ و برجیس ہوگا

ابھی سے گر جفا کم ہو تو اچھا　　زیادہ ربط باہم ہو تو اچھا
نہیں تو ہوگی اسکی شرمساری　　کسے منظور ہے خجلت تمھاری

لیکن یہ آسمان ہمیشہ مہربان نہیں رہتا، چنانچہ مومن بھی رازدانِ انجم ہونے کی حیثیت سے خود اپنی روشنی طبع کا رونا روتا ہے وہی اختر شناسی جو فراق میں وصل یار کا مژدہ سنا سکتی ہے کبھی بدنصیب منجم عاشق کو اسکی سوختہ اختری کی تلخ حقیقت سے مطلع کرکے ہمیشہ کے لئے قبل از وقت برباد کرسکتی ہے اور ایسی صورت میں یہی آرزو کیجاتی ہے کہ اگر ازل سے سوختہ اختری ہی ہماری قسمت میں تھی تو کاش ہمیں اختر شناس نہ بنایا ہوتا ۔

مومن اپنی اس تیرہ اختری کو ظاہر کرنے کیلئے کتنا لطیف اور پاکیزہ اسلوب بیان اختیار کرتا ہے

اِن نصیبوں پر کیا اختر شناس　　آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

اختر شناس عالم کے تغیرات کو ستاروں سے منسوب کرتا ہے مگر ایک شاعر جو منجم بھی ہو ان تاروں کے دام میں عرصے تک گرفتار نہیں رہ سکتا ۔ مومن پر ایک دور وہ بھی گزرا جب نجوم غالب تھا جب وہ حوادث عالم کو سیر انجم کا نتیجہ سمجھتے تھے مگر چونکہ فطرت کی طرف سے ایک شاعرانہ

دل و دماغ لیکر آئے تھے اس لئے بہت جلد ان پر منکشف ہو گیا کہ پس پردہ کوئی اور قوت ہے جو ستاروں پر حکمرانی کرتی ہے - کوئی پردہ نشین اور ہے جو کواکب کے اثرات کو بدل سکتا ہے -

مومن خاں جب تک نجوم کے زیر اثر رہے تو اپنی طبیعت کے زور سے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکے کہ

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

شعر میں علو تخیل اور تاثیر کی کمی نہیں لیکن اس دور کا شعر بھی دیکھئے جب منجم شاعر کی شاعرانہ قوتیں نجومی طاقتوں پر غالب آجاتی ہیں اسوقت یہی شاعر آسماں کی طرف نظر اٹھاتا ہے اور حیران ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ

دن بھی درازرات بھی کیوں ہے فراق یار میں — کاہے سے فرق آگیا گردش روزگار میں

اب دونوں شعروں کا خود موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ ایک بلند خیال ناظم منجم اور ایک شاعر منجم کا زاویۂ نگاہ کہاں جاکر بدلتا ہے - نجوم اور رمل حکیم مومن کی بیقرار طبیعت کو زیادہ دنوں تک سکون نہ دیسکے - مومن نے شطرنج سے دل بہلانا چاہا اور اس میں بھی وہ کمال پیدا کیا کہ دلی ایسے شہر میں اُن کا شمار مشہور شاطروں میں ہونے لگا - کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ تھی جو وہاں کے مشہور ترین شاطر تھے - لیکن مومن کی چنچل طبیعت شطرنج، نجوم، رمل طبابت سے بہل نہیں سکتی تھی صرف ایک شاعری تھی جو البتہ اسے سکون دیسکتی اور اس منزل پر پہونچ کر ان کی بیقرار طبیعت کو قرار آتا تھا شاعری سے خاں موصوف کو طبعی مناسبت تھی - ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھایا - مگر چند روز کے بعد ان سے اصلاح لینا چھوڑ دی اور پھر کسی کو اُستاد نہیں بنایا، لیکن پھر بھی مومن کا کلام شاہ نصیر کے رنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا - لکھنؤ اور دہلی کے کسی دو شاعر کا رنگ اگر کچھ مل سکتا ہے تو وہ شیخ ناسخ اور شاہ نصیر ہیں - مومن - ذوق - غالب تینوں نے ملکر ناسخ کا تتبع کرنا چاہا اور آخر میں ہر ایک نے اپنی شاعری کا رنگ بدل کر اعتراف عجز کیا - ناسخ کا تتبع اور شاہ نصیر کی چند روزہ شاگردی بیکار نہیں گئی اور بعض غزلوں کو بے تاثیر اور بے مزہ کرکے رہی - سچ تو یہ ہے کہ غالب اور مومن کی بعض غزلوں کی بے تاثیری اور پھیکا پن اسی تتبع ناسخ کا نتیجہ ہے - تنقید کلام مومن کے ضمن میں ناسخ اور نصیر کے کلام نے مومن پر جو اثر کیا ہے اسپر مفصل بحث انشاءاللہ کیجائیگی -

مومن کے مشہور تلامذہ میں شیفتہ - تسکین - نسیم - قلق - برق اور وحشت ہیں ہر ایک کا نمونہ کلام تلامذہ مومن کے زیر عنوان نظر آئیگا

وضع ولباس

ان کی وضع و صورت کا نقشہ تذکرہ نویسوں نے یوں لکھا ہے " رنگیں طبع سنگین مزاج - خوش وضع - خوش لباس کشیدہ قامت - سبزہ رنگ - سر پر لمبے لمبے گھونگر والے بال جن میں ہر وقت انگلیوں سے کنگھی کیا کرتے تھے - ململ کا انگرکھا ڈھیلے ڈھیلے پائنچے اس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا "

"صاحب آبحیات کا بیان ہے کہ میں نے انھیں نواب علی خاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سنا تھا - ایسی درد ناک آواز سے دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا - اللہ اللہ ابتک وہ عالم آنکھوں کے سامنے ہے - باتیں کہانیاں ہوگئیں "

مومن رنگیں طبع رنگیں مزاج تھے اور ضرور رہتے ابتدا میں اُن کی عاشقانہ طبیعت نے اُن کی شاعری کو چمکایا بھی گر شاعری نظر بہت جلد اس زندگی کے اسرار تک پہونچ جاتی ہے مومن کی شاعرانہ افتادِ طبیعت پر یہ طرزِ زندگی بھی بار گزرا اور انھوں نے شاہ سید احمدؒ سے جوانی ہی میں بیعت کرلی اور آخر وقت تک اپنے عہد کو نبھایا۔ مومن کی شاعری پر شاہ سید احمدؒ کی تعلیمات کا اثر بھی نمایاں ہے ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں۔

شوق بزم احمدو ذوق شہادت ہے مجھے
جلد مومن لے پہونچ اس مہدی دوراں تلک

طبیعت خوددار اور غیور واقع ہوئی تھی کسی دوست کا ادنیٰ احسان بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ دلی انھیں عزیز تھی۔اور وہیں قانع زندگی بسر کرتے رہے۔ "راجہ کپور تھلہ نے انھیں ساڑھے تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کرکے بلایا اور ہزار روپیہ خرچ سفر بھیجا۔ یہ آمادہ بھی ہوئے مگر جب معلوم ہوا کہ وہاں ایک گوَیئے کی بھی یہی تنخواہ ہے تو کہا کہ جہاں میری اور ایک گوئے کی تنخواہ ایک ہو میں وہاں نہیں جاتا۔ اسی طرح ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج کی پروفیسری کے لیے بلائے گئے لیکن وہ بھی منظور نہ کی۔

نواب وزیرالدولہ بہادر فرمانروائے ٹونک نے جو مومن کے پیر بھائی بھی تھے انھیں بلانا چاہا لیکن مومن نے نہ آنے کی معذرت میں ایک قصیدہ لکھکر بھیجدیا جس کا مطلع ہے:-

یاد ایام عشرت فانی
نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

اعتذار- پر کروں کیا کہ بن نہیں آتی
ورنہ میں اور تیری مہمانی

----------------------------- -----------------------------

ہے ابھی آرزوئے وصل صنم
ہے ابھی حسرت ہوس رانی

چار پانچ بار دلی چھوڑ کر سہارنپور۔ بدایوں۔ رامپور۔ سہسوان۔ جہانگیر آباد گئے لیکن دلی کی کشش ہمیشہ وہیں کھینچ لائی۔ رامپور میں رہتے تھے مگر دلی کی یاد دل سے جاتی نہ تھی۔

دلی سے رامپور میں لایا جنونِ عشق
ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

دوسری بار سہسوان گئے وہاں فرماتے ہیں۔

چھوڑ دلی کو سہسواں آیا
ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

بدایوں میں بھی دلی کا خیال نہیں جاتا۔

بدایوں میں مجھے جوشِ جنوں لایا ہے دلی سے
یہ کیونکر چارۂ بند خردمنداں ہوش آیا

خودداری اور غیرت کا یہ عالم تھا کہ طب رمل نجوم اور شاعری کو کبھی معاش کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ کبھی صلے کی امید میں کسی رئیس کی شان میں قصیدہ لکھا۔ نو قصیدوں میں دو مدحیہ قصیدے ہیں ایک تو اعتذار میں لکھا گیا۔ دوسرے کی شانِ نزول یہ ہے کہ "(ایک دن)

راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ جو دہلی میں رہتے تھے اور ان کی سخاوتیں شہر میں مشہور تھیں۔ وہ ایک دن مصاحبوں کے ساتھ سر راہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ خاں صاحب کا اُدھر سے گزر ہوا۔ لوگوں نے کہا مومن خاں شاعر یہی ہیں۔ راجہ صاحب نے آدمی بھیجکر بلوایا۔ عزت و تعظیم سے بٹھایا کچھ نجوم کچھ شعر و سخن کی باتیں کیں۔ اور حکم دیا کہ ہتھنی کس کر لاؤ ہتھنی حاضر ہوئی وہ خاں صاحب کو عنایت کی" شکریہ میں وہ مشہور قصیدہ مومن نے لکھا جس کا مطلع ہے

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری ۔۔۔ کثرت دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

آبحیات کی عبارت ہے کہ "سوا اس قصیدہ کے اور کوئی مدح کسی دنیا دار کے صلہ وانعام کی توقع پر نہیں لکھی، ابتک معلوم ہوسکا کہ اس قصیدہ کے پیش کرنے سے مومن کی کیا توقعات وابستہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قصیدہ اعتراف احسان اور شکریہ میں لکھا گیا نہ کہ کسی انعام اور صلے کی توقع پر۔ مسٹر رام بابو سکسینہ کا صحیح خیال ہے کہ راجہ کا ہاتھی پیش کرنا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کہ راجہ صاحب مومن کی خدمت میں ہاتھی پیش کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتے تھے

ان کی تیزی ذہن اور ذکاوت طبع کی تعریف نہیں ہوسکتی وہ خود بھی ذہانت میں دو شخصوں کے سوا کسی ہمعصر کو تسلیم نہ کرتے تھے ایک مولوی اسمٰعیل صاحب اور دوسرے خواجہ محمد نصیر صاحب کہ ان کے پیرادر خواجہ میر درد کے نواسے تھے"

مولوی اسمٰعیل شہید، مومن خاں کے پیر بھائی تھے خواجہ محمد نصیر ان کے خسر تھے اور رنج تخلص فرماتے تھے۔ صاحب آبحیات کو معلوم تھا کہ مومن شاہ سید احمد بریلوی کے مرید تھے معلوم نہیں کیا سمجھ کر خواجہ محمد نصیر کا مرید لکھدیا۔ رنج کے تذکرے میں صاحب طور کلیم نے لکھا ہے "میر محمد نصیر محمدی خلف میر کلو نبیرہ و سجادہ نشین میر درد علیہ الرحمۃ۔ مومن خاں با وے نسبت خویشی و دامادی داشت"۔

رنج کا ایک شعر ہے:-

دل یہ جسکے لئے پہلو میں تپاں رہتا ہے ۔۔۔ یوں سنا ہے کہ اسے بھی خفقاں رہتا ہے ۔۔۔ رنج

مومن خاں نے نہ تمام عمر کسی دنیا دار کی مدح کی نہ کسی کی ہجو میں اپنی زبان آلودہ کی خود فرماتے ہیں۔

ہجو گوئی نہیں ہمارا کام ۔۔۔ ایسی باتوں سے خامشی بہتر

آزاد نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ مومن اپنے معاصرین میں کسی کو کم خیال میں لاتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ مومن کی خودستائی کی بھی عادت نہیں تھی جو عموماً شعراء کا شعار ہے ملاحظہ ہو مومن کو اپنی تعریف کرتے ہوئے روحی تکلیف ہوتی ہے

لاف زنی پس مدیح زمانہ کیا کروں ۔۔۔ اس غم تازہ سے نہیں مجھکو امید جاں بری

حکیم مومن خاں کی شادی جیسا آگے بیان ہوچکا ہے خواجہ محمد نصیر صاحب رنج کی صاحبزادی سے ہوئی تھی ایک لڑکی ۱۲۵۹ھ میں پیدا ہوئی جسکی تاریخ ولادت ہے۔

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے کہی تاریخ دخترِ مومن

لیکن صرف چار برس کی عمر پائی۔ تاریخ وفات ملاحظہ ہو۔

خاک برفرق دولتِ دنیا من فشاندم خزانہ برسرِ خاک

آبحیات میں آزاد نے مومن خاں کے ایک صاحبزادے کا ذکر کیا ہے۔ جنکا نام احمد نصیر خاں ہے

ہندوستان کے شعراء اس بارے میں بہت خوش قسمت تھے کہ ان میں سے اکثر دراز عمر ہوئے کیٹس اور طرفہ کی طرح کوئی مشہور شاعر توجوان نہیں مرا یا مارا گیا مومن نے صرف ۵۱ برس کی زندگی پائی کوٹھے سے گرنا موت کا باعث ہوا جسکی تاریخ شاعر نے خود کہی دست و بازو بشکست اور حکم لگایا کہ پانچ دن یا پانچ مہینے یا پانچ برس میں مرجاؤں گا' وہی ہوا کہ پانچ مہینے کے بعد ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں اس دنیا کو خیرباد کہا اور جنت کو آباد کیا۔[۵۱] ایک شاگرد نے تاریخ وفات ماتم مومن جہاں سے نکالی۔ (۱۲۶۸ھ) دلی دروازے کے باہر میدھیوں کے جانب غرب حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ کے مقبرے کے پاس سپرد خاک کئے گئے۔

مومن خاں کی تصنیفات میں اردو کلیات کے علاوہ ایک انشاے فارسی اور دیوان فارسی ہے جنھیں حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے مرتب کیا یہ کتابیں ۱۸۵۷ء سے قبل مطبع سلطانی میں چھاپی گئی تھیں۔ مومن کے فارسی کلام کے متعلق سید عبدالحی مولف تذکرہ گل رعنا کی راے ہے کہ " کلام فارسی بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے اور جو دلفریبیاں مومن خاں کے اردو کلام کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اس میں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں" اردو کلیات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے جمع کیا تھا پھر میر عبدالرحمٰن آہی خلف میر حسین تسکین (خاں صاحب کے فرزند نسبتی) نے از سرِ نو مرتب کیا جو کئی بار چھپ چکا ہے۔

تمہید تنقید

یونان کے فیلسوف زینو نے دو معمے عالموں کے لئے پیش کئے تھے۔ فرض کرو کہ ایک کچھوا ایک خرگوش سے کچھ پہلے چل چکا ہے پھر بعد کو خرگوش چلتا ہے جب تک خرگوش اس جگہ پہونچے گا جہاں اسکے چلتے وقت کچھوا پہونچ چکا تھا کچھوا کچھ آگے بڑھ چلیگا اسی طرح جب خرگوش دوسری منزل طے کرے گا کچھوا کچھ آگے بڑھ جائیگا۔ اسی طرح ایک لا انتہاہی سلسلہ قائم ہو جائیگا۔ پھر خرگوش کچھوے کو پیچھے کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

دوسرا معمہ یہ تھا کہ ہر اک متحرک چیز جس لکیر پہ چلیگی وہ ہر وقت اس لکیر کے کسی نقطے پر موجود ہوگی پھر وہ چلتی کب ہے۔ ہر مسئلہ کے غور کرنے میں یہ دقت درپیش ہوتی ہے۔ اگر وقت کبھی ٹھہرتا نہیں تو (مثلاً) بارہ کب بجتے ہیں۔ اگر کوئی تعمیر سو برس میں رفتہ رفتہ گرجاتی ہے تو وہ ہر لحظہ میں کچھ نہ کچھ مسمار ہوتی رہتی ہے پھر وہ کھڑی اور قائم کب رہتی ہے۔[۵۲]

---

[۵۱] صاحب آبحیات نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ایک سچے خواب کا تذکرہ کیا ہے جس میں مومن خاں مغفور کی طرف سے ایک تحریر کا ذکر ہے جس میں مومن جنتی لکھا ہوا تھا ۱۲

[۵۲] اس عبارت کیلئے میں اپنے دوست پروفیسر رگھوپت سہاے کے مضمون نقد حقیقت کا رہین منت ہوں جو رسالہ سہیل علیگڈھ میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں ہوم و فنے کے ایک مسودے سے بھی امداد لی گئی ہے۱۲

لیکن اِن معقول اور صحیح منطقی اعتراضات کے باوجود خرگوش اس مسابقت میں کچھوے سے آگے نکل جاتا ہے ۔ متحرک چیز ایک لکیر کے کسی نقطے پر موجود ہوتے ہوئے بھی چلتی رہتی ہے ۔ بارہ بجتے ہیں اور ضرور بجتے ہیں ۔ گرنیوالی عمارت قائم بھی رہتی ہے ۔

پھر بھی ان معموں نے اس حقیقت کو مبرہن کر دیا کہ اعداد و واقعات کو صحیح طور سے بیان کرنے میں قاصر ہیں ۔ (حالانکہ فی زمانا جس مسئلے کو واقعات اور اعداد کی امداد سے ثابت کر دیا جاے اسکی صداقت سے انکار کرنا علمی کفر سے کم نہ ہوگا) اور معقولات کی تشریح حقائق نقص سے خالی نہیں ۔ زینو نے یہ معمے پیش کر کے ثابت کر دیا کہ معقولات اور حقائق میں ضد ہے اور دونوں ایک دوسرے سے منطبق نہیں ہو سکتے کیونکہ عقل جب حرکت کو سمجھنے کی کوشش کریگی تو اسے ساکن کر کے پس جب وہ حرکت پر کوئی حکم لگاے گی تو وہ حکم دراصل حرکت سے متعلق نہ ہوگا بلکہ سکون پر نتیجہ یہ ہوا کہ ریاضی نے معمۂ عالم کو حل کر کے محل اضداد بنا دیا ہے ۔ عقل سے معرفت اشیا ناممکن ہے ۔ حقائق اشیا عقل و منطق کی پرواز سے ماورا ہیں ۔

یہ تمہید صرف اس غرض سے اٹھائی گئی تھی کہ پرستاران خرد' جو مشرقی شاعری کو اکثر غیر فطری اور مبالغہ آمیز کہکر عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں انھیں معلوم ہو جاے کہ بیانِ اشیا کبھی فطری ہو ہی نہیں سکتا کسی پیش نظر شئے کا جو خاکہ ہم پیش کرتے ہیں وہ حقیقت سے شاید اتنا ہی بعید ہوتا ہے جتنا مشرقین ہیں کیونکہ کسی شے کا بیان ہم ہمیشہ اپنے نقطۂ نظر سے کرینگے جس کا کسی دوسرے شخص سے متحد ہونا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے جس پتّی کو ہم سبز کہتے ہیں دوسرا بھی اسے سبز ہی کہتا ہے لیکن صرف اسوجہ سے کہ دنیا کی زبانیں ناقص ہیں اور اس منظر کے اظہار کے لئے کوئی دوسرا لفظ اس کے پاس نہیں ہے ورنہ ظاہر ہے کہ شخص غیر کا زاویہ نگاہ اور ہمارا زاویہ نگاہ اسوقت تک ایک نہیں ہو سکتا جب تک وہ ہمارے ہی جسم میں حلول نکر جاے ۔ یہ محقق ہے کہ رنگ اپنے وجود کے لئے انعکاس نور کا محتاج ہے ۔ جس کے ہر مختلف زاویہ پر رنگ بدلتا جائیگا ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صدق' دروغ' غلو' مبالغہ کیا چیز ہے ۔ حالت تو یہ ہے کہ ہم دسترخوان پر بیٹھے ہوے ہیں ایک صاحب نے شکایت کی کہ گوشت میں نمک تیز ہے دوسرے نے کہدیا مجھے کم معلوم ہوتا ہے ۔ تیسرا کہتا ہے نہیں ٹھیک تو ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر ایک شخص دوسرے کی تکذیب نہیں کرتا حالانکہ ایک کا بیان دوسرے کی ضد ہے ۔ ہر شخص اپنی جگہ پر سچ کہتا ہے اس مثال سے یہ معلوم ہوا کہ صحت بیانی اس وقت ہوگی جب ایک شخص محسوس کرے کہ اسکا کوئی دوسرا معیار مقرر نہیں ہو سکتا ۔ اسی سلسلے میں اس حقیقت پر بھی نظر رکھنا چاہئے ۔ کہ صحت بیانی اور صدق بیانی میں فرق ہے ۔ مثال بالا میں ہر شخص نے جو محسوس کیا اگر اسے صحیح لفظوں میں بیان کیا ہے تو وہ بیان صحیح ہے اور ہر شخص کا بیان اپنی جگہ پر صحیح ہے مگر سب کا بیان بیک وقت سچ نہیں ہو سکتا ۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اردو شاعری کو مبالغہ آمیز کہکر جو ٹال دیا جاتا ہے وہ حقیقت کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ اگر ایک شاعر کی حس بڑھی ہوئی ہے اور اُسکا بیان ہمارے محسوسات کی رو سے مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ مبالغہ آمیز ہی ہو مثلاً مومن کہتا ہے ۔ تیرے دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے ۔ گل نہ ہوں گے شرر آتشِ سوزاں ہوں گے ۔

پہلی نظر میں یہ شعر صاف مبالغہ معلوم ہوتا ہے اور ہے مگر اسکا کیا علاج کہ مومن کسی طور پر یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا کہ تیرے دل تفتہ کی تربت پر گل ہونگے اگر ہوں گے تو شرر آتشِ سوزاں ہی ہوں گے ۔ اس بڑھی ہوئی حس کے سامنے مبالغہ آمیز کہنے والوں اور عدو کے بیان کی کیا وقعت باقی رہسکتی ہے

نداز بیان ہے اس غیر فطری بیان میں بھی تاثیر پیدا کردی ہے۔ اور اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو شاعر کا مقصود حاصل ۔ پھر بیان کا فطری یا غیر فطری ہونا دونوں برابر

حقائق اشیار کی معرفت میں معقولات کی بے بسی آپ دیکھ چکے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس میدان میں شاعری کہاں تک کامیاب ہوتی ہے سطور ذیل میں یہی بحث ہوگی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کیجائیگی کہ مومن بحیثیت شاعر دنیائے شاعری میں کہاں تک کامیاب یا ناکامیاب رہے۔

ہندوؤں نے تو شاعر کا مرتبہ فلسفی سے اونچا مانا ہے یعنی انھوں نے محسوسات کو معقولات پر ترجیح دی ہے۔ شاعری لے ہنٹ (Leigh Hunt) کی تعریف کے بموجب، صداقت، حسن و قوت کے جذبہ کا اظہار ہے جسے شاعر اپنی تخیل کی امداد سے دائرہ حس میں لے آتا ہے۔ اور کثرت فی الوحدت کے اصول سے زبان کو اپنا ہم آہنگ کرتا ہے۔

شاعری صرف ایک جذبہ ہے کیونکہ عمیق ترین تاثرات کی جستجو کرتی ہے اور یہی جذبہ کا کام ہے تاثرات کا غلام ہونا دراصل جذبہ ہے۔

شاعری جذبۂ صداقت ہے کیونکہ صداقت کے بغیر تاثرات یا تو پرفریب ہیں یا ناقص

شاعری جذبۂ حسن ہے کیونکہ اس کا فعل یہ ہے کہ مسرت میں چار چاند لگائے اور حسن ہی مسرت کا بہترین مظہر ہے۔

شاعری جذبۂ قوت ہے کیونکہ قوت دراصل تاثرات کی کامیابی کا نام ہے خواہ وہ خود شاعر پر اس کے حسب خواہش طاری ہو یا شعر سننے اور پڑھنے والوں پر۔

شاعر کی دنیا وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں اہل فن اور اہل علم کی پرواز اپنی سرعت رفتار کے کرشمے دکھا کر رک جاتی ہے۔ گلشن میں ایک پھول کا نام باغبان گلاب رکھ لیتا ہے ماہر نباتیات اسے نباتات کے کسی خاندان کی شاخ بتائیگا لیکن جب کسی پھول کو ایک شاعر دیکھتا ہے تو بے اختیار ہو کر کہہ اٹھتا ہے۔

اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری

وہ ہمیں یکایک ایک دوسرے عالم میں پہونچا دیتا ہے۔ ماہر نباتات کا نظریہ ممکن ہے آئندہ چلکر غلط ثابت ہو جائے اور گلاب کا پھول نباتات کے کسی دوسرے خاندان کی شاخ ہے اس پر اجماع ہو جائے۔ گلاب کے بجائے روز یا ورد کہنا شروع کر دیا جائے۔ لیکن اس میں کوئی تغیر نہ پیدا ہوگا۔ پھول کا نام بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن شاعر کا قول ہمیشہ اپنی جگہ پر قائم رہیگا وہ صدق و دروغ کی رسائی سے پرے ہے۔ گلاب کا پھول نباتات کی کسی شاخ سے ہو۔ شاعر کا قول ہمیشہ اوس پر صادق آئیگا۔

شاعری ایک تخیلی جذبہ ہے۔ محسوسات کی دنیا شاعر کی جولانگاہ ہے شعر شعور کا تابع ہے دراصل حسیات اور شعور ہی پر شعر کی عمارت قائم ہے یہ وہ عالم ہے جہاں معقولات کے پر جلتے ہیں اور صدق و دروغ کی تفریق جہاں بیکار ہو جاتی ہے یہاں دیکھنا ہے کہ مومن

حسیات وشعور سے اپنے اشعار میں کیا کام لیا ہے۔

ایسی لذت خلش دل میں کہاں ہوتی ہے — رہگیا سینے میں اُسکا کوئی پیکاں ہوگا

شاعر دل میں قیامت کی خلش محسوس کرتا ہے شعور کہتا ہے کہ تیر یار کے سوا کسی اور کا یہ کام نہیں - ڈرتا ہوں کہیں یہ اعتراض نہ کر دیا جائے کہ دل پر تیر تو مارا نہیں جاتا دل میں پیکان کیونکر رہجائیگا لہذا بیان غیر فطری ہے مگر اب شاید اُردو شاعری کے ایسے معترضین رہ نہیں گئے ہیں جو اُردو شاعری کے رمزی (Symbolistic) اور کنائی (Allegorical) پہلو کو نظرانداز کر دیتے ہیں -

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

قفس میں دل کا بہل جانا آشیاں کے برباد ہونے کی علامت ہے ممکن ہے نفسیاتی حقیقت بھی ہو' جسکے معلوم ہونے کا واحد ذریعہ گزشتہ تجربات ہوتے ہیں -لیکن نفسیاتی حقیقت کی اصلیت اتنی ہے کہ اسکی صحت کا سارا دار ومدار تجربات کی صحت پر مبنی ہے اگر تجربہ غلط ہے اور اُسکی غلطی معلوم نہ ہوئی تو جو نتیجہ اس سے نکالا جائے گا وہ غلط ہوگا - دنیا اسی مشکل میں آجکل گرفتار ہے روزانہ نفسیات کے نظریے بدلتے رہتے ہیں -اس دنیا میں شعور اور صرف شعور ایک ایسی چیز ہے جسپر اعتبار کیا جا سکتا ہے

ہو نہ بیتاب ادا تمھاری آج — کچھ تو کہتی ہے بیقراری آج

کائنات میں ایک حقیر سے حقیر شے کی جنبش سے ہلچل پڑ جاتی ہے -آپ نہیں خیال کر سکتے کہ ہماری ایک سانس سے فضائے عالم میں کتنا تموج پیدا ہو جاتا ہے -ہم کائنات کے ہر ذرے سے متاثر ہوتے ہیں اور ہر لحظہ انھیں متاثر کرتے رہتے ہیں - یہ فعل وانفعال کسر وانکسار اثر وتاثر ہر شے پر ہر لحظہ اپنا کام کیا کرتے ہیں -شعر کی توجیہ فلسفیانہ کیجئے عالمانہ کیجئے شاعر کو اس سے غرض نہیں اس کے شعور نے جو اسے بتایا وہ کہہ گیا -توجیہ گو فلسفی ہو مگر غلط ہو سکتی ہے -شعر اگر تابع شعور ہے تو اس میں یہ احتمال پیدا نہیں ہو سکتا - یہاں صرف میری بیقراری اسکی ضامن ہے کہ تمھاری ادا بیتاب ہے یہ بیان حق تو یہ ہے کہ نظریۂ فعل وانفعال' اثر وتاثر کی حد سے باہر ہے -بیقرار دل محسوس کر رہا ہے کہ تمھاری ادا بیتاب ہے کوئی لاکھ کہے کہ فلاں نظریہ علمی اس کے خلاف ہے -حسیات اور نظریہ علمی کی تائید وتردید سے بے نیاز ہے -

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

اس شعر میں شاعر کا یہ کلیہ کہ میرا ہمیشہ ایک نہ ایک بلا میں گرفتار رہنا ضروری ہے اور جس کا ذکر وہ نہایت حسن کے ساتھ چھوڑ گیا ہے - گزشتہ تجربات پر مبنی نہیں ہے شاعر کا نظریہ منطق استقرائی کا گراں بار احسان نہیں - تجربات کی بنا پر منطق استقرائی سے کام لیکر جو نتیجہ نکالا جائیگا اس میں ہمیشہ احتمال کا پہلو باقی رہیگا یہ صرف شعور INSTINCT. ہے جو شک کے حدود سے باہر ہے جو تائید وتردید سے مستغنی ہے -

داغ دل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ — یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہوں گے

بڑھی ہوئی حس کا لازمی نتیجہ ہے کہ بیاں (Prophetic Vein) ملہمانہ انداز اختیار کرلے - لے ہینٹ نے شاعری کی جو تعریف کی ہے (کہ شاعری صداقت و حسن و قوت کے جذبہ کا اظہار ہے جو تخیل اور تصور کی امداد سے اپنے معتقدات شعری کو محسوس کر دکھاتی ہے) اسکی رو سے مومن اُردو زبان میں غالباً سب سے زیادہ کامیاب شاعر ہیں - اسی کے ساتھ ملٹن کی رائے بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ "شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو" بہتر ہوتا اگر جوش سے بھرا ہونے کے بجائے پُر تاثیر کہدیا جاتا - پُر تاثیر زیادہ جامع لفظ ہے - صاحب مراۃ الشعر کا خیال ہے کہ اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ "اچھا شعر حسن خیال ۔ حسن الفاظ ۔ حسن ادا کا مجموعہ ہے" مومن کے یہاں ہزاروں جواہر پارے ایسے پائے جاتے ہیں جن میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں - چند مثالیں ملاحظہ ہوں.

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

اس شعر کو لے ہینٹ کے معیار سے دیکھئے کہ صداقت حسن و قوت کے جذبے کا اظہار کس حسن کے ساتھ کیا گیا ہے - عمیق ترین تاثرات قوت کا دوسرا نام ہے - صداقت تاثرات اور احساس کی قوت کا نتیجہ ہے - اور خود صداقت حسن کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں' یہ تینوں جذبے جو بظاہر مختلف مگر حقیقتاً ایک ہیں' اس شعر میں بھی اسی طرح بیک وقت متحد اور مختلف پائے جاتے ہیں - یہ صرف شعر کی دنیا ہے جہاں اجتماع بلکہ اتصال ضدین ممکن ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں مومن شعرائے عالم کی صف میں ممتاز نظر آتا ہے - یہ بحث آپ کو انشاء اللہ آئندہ صفحات میں ملیگی فی الحال مومن کے کلام سے لطف اندوز ہوجئے یہاں نظریہ اثر و تاثر دیکھئے - تجلی یار نے دیدۂ مشتاق کو کثرت انوار سے دیدۂ حیراں بنا یا اور دوست کو دیدۂ حیراں کے انداز حیرانی نے محو حیرت کیا یہی وہ جگہ ہے جہاں حبیب و محبوب طالب و مطلوب میں امتیاز باقی نہیں رہتا ہمیں وحدت فی الکثرت کے جلوے نظر آتے ہیں - اس شعر میں اگر ایک طرف صداقت و حسن و قوت کا جذبہ موجود ہے تو دوسری طرف حسن ادا اور اسلوب بیان کی بھی بہترین مثال ہو سکتا ہے -

آپ کی کون سی بڑھی عزت میں اگر بزم میں ذلیل ہوا

میرا ذلیل ہونا آپ کی عزت کو بڑھا نہیں سکا یہ عالمگیر صداقت ہے جس کے تسلیم کرنے میں کم لوگوں کو تامل ہوگا کہ کسے نہیں معلوم کہ میری ذات کا اثر اس ذات پر بھی پڑیگا جس سے مجھے دور کا بھی تعلق ہے - ذرہ کو اگر آفتاب سے نسبت ہے تو ذرہ کا ہر حسن و قبح بجائے اسکے کہ وہ ذرے کی ذات کیلئے باعث فخر و ذلت ہو آفتاب سے بھی متعلق ہوگا - اس عالمگیر صداقت کو ایک فلسفی بھی خشک طریقے سے بیان کر دیگا - ایک ادیب ممکن ہے اپنے زور بیان سے اسمیں دلچسپی پیدا کر سکے مگر یہ صرف شاعر کا قلم ہے جو صرف ایک عالمگیر صداقت بیان کرتا ہے مگر اسی کے ساتھ اپنا دل بھی نکال کر رکھدیتا ہے - کولرج کا قول ہے کہ جو بات نہایت صفائی سے ادا ہو جائے سمجھو کہ وہ سطحی نہیں ہے مومن کا یہ سادہ مگر عمیق شعر ایک معنوی مجسمہ ہے جو حسن ادا حسن خیال حسن الفاظ سے یکسر تیار کیا گیا ہے -

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ڈبلو - بی - ایٹس (W. B. Yeats) شاعری کی تعریف کرتا ہے کہ "وہ مجاز و حقیقت کی ترویج ہے" اس شعر کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ کونین کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے ایک طرف اگر عارف سمجھتا ہے کہ ترک ماسوا کے بعد جلوۂ حسن ازل نصیب ہوتا ہے تو دوسری طرف میں دیکھتا ہوں کہ مومن بھی منصور کے ساتھ انا الحق کہنے میں ہم آواز ہے - جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا اسوقت تم گویا میرے پاس ہوتے ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ جب دوسرا نہ ہوگا تو سوائے 'میں' کے کوئی دوسری ذات میرے پاس موجود نہ ہوگی - کوئی دوسری ذات دوسری نہ ہوتے ہوے اسی وقت میرے پاس ہو سکتی ہے جب وہ بھی 'میں' ہو جائے - یہاں لفظ گویا نے 'تم' کو 'میں' میں جذب کر رکھا ہے - اور یہ ظاہر ہے کہ مجاز میں تمھارے خیال کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے - بہر حال یہ شعر شاعری کے ہر معیار پر پورا اترتا ہے اور دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر کے لئے مایۂ ناز ہو سکتا ہے۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

سادگی کی تصریح کرتے ہوے مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے کہ "سادگی سے صرف لفظوں ہی کی سادگی مراد نہیں ہے - بلکہ خیالات بھی ایسے نازک اور دقیق نہ ہونے چاہئیں جنکے سمجھنے کی عام ذہنوں میں گنجائش نہ ہو - محسوسات کے شارع عام پر چلنا - بے تکلفی کے سیدھے رستے سے ادھر اُدھر نہ ہونا اور فکر کو جولانیوں سے باز رکھنا اسی کا نام سادگی ہے" لیکن یہ واضح رہے کہ سادگی ایک اچھے شعر کے لئے زیادہ سے زیادہ زیور کا کام دے سکتی ہے - وہ شعر کا حسن بڑھا سکتی ہے - مگر اپنی جگہ پر چنداں قابل اعتنا نہیں معنی سے بے نیاز شعر کے لئے سادگی کوئی معنی نہیں رکھتی - محض سادگی اردو کے دوسرے تیسرے شعراء میں بافراط نظر آتی ہے لیکن جو سادگی حسن ہے وہ یہاں صرف درد میر - مومن اور کبھی کبھی غالب کے یہاں نظر آتی ہے - مومن اپنے علوِ تخیل اور نزاکت تخیل کے سبب سے طبقۂ عوام میں مقبول نہیں جس کا اصل سبب بقول صاحب تذکرۂ گل رعنا یہ ہے کہ "مومن کو حالی جیسا نقاد نہیں ملا" - اسی شعر کو لیجئے شاعری کی وہ کون سی خوبی ہے جو اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ اس میں جلوہ گر نہیں - انھیں چند سادہ الفاظ میں معانی کا ایک دریا ہے کہ موجیں لے رہا ہے۔

ہوگئے دوروز کی الفت میں کیا حالت ابھی مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

اچھے شعر کی تو یہاں اچھے اشعار کو دیکھکر متعین کی گئی ہیں - ظاہر ہے کہ شاعری منطق نہیں جس میں استقرار سے کام لیا جائے - صرف ذوق سلیم شعر کا لطف لے سکتا ہے - اسی شعر کو لیجئے نہ تخیل کی نزاکت ہے نہ خیال کی ندرت ہے نہ اسلوب بیان میں کوئی جدت ہے مگر انھیں الفاظ میں ایسی تاثیر ہے جو ارباب ذوق کو تڑپا سکتی ہے

جراح کیا سوچا بتا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا؟ کیوں کھول لی پٹی مرے زخم جگر سے باندھکر

زخم جگر کے ناقابل شفا ہونے کی موثر حالت کھینچنے کیلئے اس سے بہتر شاید ہی کوئی اسلوب بیان ہاتھ آسکے شاعر نے آپ کے سامنے سارے واقعات ایک ایک کرکے پیش کردیے ہیں - کسی نتیجہ پر پہونچنا آپ کا کام ہے ایک صاحب فن کا جو فرض تھا اس نے اس کو انجام تک

پہونچا دیا' اب ذرا ماہر فن کا کمال دیکھیے۔ جراح نے زخم پر پٹی باندھی اور باندھکر کھول لی ۔ صرف اتنا مواد موجود ہے شاعر کو اتنے سے مواد میں ثابت یہ کرنا ہے کہ جراح خاموش ہے - مجروح بیقرار ہے اور جراحت ناقابل شفا ہے تینوں حالتوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے ۔لیکن الفاظ خود یہ معنی پیدا کرتے ہیں - جراح نے پٹی زخم جگر سے باندھی اور کھول لی ظاہر ہے کہ پٹی باندھکر کھولنا کسی سبب پر مبنی ہوگا - مجروح جراح کے اس فعل کو دیکھکر سوال کر اُٹھتا ہے " جراح کیا سوچا بتا " مگر کوئی جواب نہیں ملتا - دوسرے سوال کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے "کیا رنگ دیکھا" مگر جراح کی طرف سے خاموشی کے سوا دوسرا جواب نہیں زخمی پھر پوچھتا ہے "کیا ہوا" یہاں آکر مصرع ختم ہوتا ہے ۔

اب جراح کا طرز دیکھیے - مجروح کا پے در پے سوال کرنا (جو بیقراری کی علامت ہے) اور اسپر جراح کی خاموشی یہ مومن ہی اتنے بڑے شاعر کا کام تھا جو اتنی کامیابی کے ساتھ اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوا ہے ۔

آتی ہے بوے داغ شب تار ہجر میں   سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

دردکا خیال ہے کہ لطیف تاثرات کا لطیف انداز میں بیان کرنا حقیقی شاعری ہے یہاں انداز بیان کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ میر و درد کے سوا اُردو زبان میں کسی کو نصیب نہ ہوا ہوگا - یہ صحیح ہے کہ خیال مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے مگر تاثیر ہے کہ شعر سے ٹپکی پڑتی ہے اور مومن کا کمال یہی ہے کہ اسے مبالغہ کی حدود سے نکالدیا سینے کے چاک ہونے کا اپنی زبان سے صرف احتمال ظاہر کرتا ہے - لیکن سامع یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہے کہ سینہ بھی قبا کے ساتھ ضرور بالضرور چاک ہوگیا - میر کا بھی ایک ایسا ہی شعر ہے ۔

میرے مرنے کی حقیقت جسمیں تھی   ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

اس شعر میں بھی مبالغے کے ساتھ تاثیر موجود ہے اور یہی مقصود بالذات ہے -بحیثیت ناقد دونوں شاعروں کے کمال فن کو دیکھیے - مومن نے سینے کے چاک ہونے کا صرف احتمال ظاہر کیا ہے - میر نے کاغذ کے نم رہنے کا حکم لگا دیا' لیکن اُستاد تھے اور انداز بیان کی اس کمزوری کو محسوس کرتے تھے لہذا ' ایک مدت تک' کا ٹکڑا جوڑ کر بات بنالی اور تاثیر کو ہاتھ سے جانے نہ دیا - اس ٹکڑے نے کاغذ کے نم کو محدود کر دیا - اہل نظر ان دونوں شعروں میں دونوں اُستادانِ فن کے کمال فن کا موازنہ کریں تو وہ اس نتیجے پر پہونچنے کو مجبور ہیں کہ اس مقام پر مومن زیادہ کامیاب رہے ہیں -مومن کے انداز بیان کی لطافت بڑھی ہوئی ہے ۔

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو   کہ شب غم کوئی کس طور سحر کرتا ہے

ایک طرف مومن نے اگر فارسی ترکیبوں سے اپنے کلام کی بندش کو چست سے چست ترکیا تو دوسری جانب اپنے کلام کی تاثیر کو بڑھا دیا ہے غالب نے جب سادگی اختیار کی تو بقول خود میر کا طرز آگیا - اُردو زبان میں سادگی کی آمیزش تاثیر کے ساتھ کر دیجیے' پھر میر کے تتبع کے سوا چارۂ کار نہیں اس مقام پر پہونچکر غالب نے بھی اپنی انفرادیت کھودی جس کا انھوں نے خود اقرار کیا ہے - اب مومن کا کمال دیکھیے - اور مثال میں یہی شعر لیجیے - کمال سادگی کے ساتھ انتہائی تاثیر موجود ہے -لیکن میر کا رنگ نہیں' مومن کی انفرادیت صاف نمایاں ہے

اُردو شعراء میں مومن نے یہ ایسی کامیابی حاصل کی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی

بخت بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

اگر شاعر کا قلم اتنی بھی تاثیر نہیں پیدا کرسکتا تو اسکا ٹوٹ ہی جانا بہتر ہے - مومن کی حالت یہ ہے کہ وہ مردہ پر ایک زخمہ لگا کر اپنے نغموں کو ختم کر دیتا ہے، اسکی آواز فضا میں پھیلتی ہے اور محرم کے کان بقدر استعداد اس سے آشنا ہو سکتے ہیں شاعر نے بخت بد کی ایذا رسانیوں کے لئے صرف "یہ ڈرایا ہے" سے ایک لطیف اشارہ کر دیا ہے - اس 'یہ' سے بقدر ظرف مستفید ہو جیے اور شاعر کے کمال فن کی داد دیجیے -

اب یہ حالت ہے کہ اے پردہ نشیں تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

جس بلندی پر من و تو کا امتیاز اٹھ جاتا ہے مومن نے اپنے شاعرانہ کمال سے اسکی ایک جھلک اپنے اس شعر میں دکھا دی ہے تاثیر واصلیت کے جستجو کرنے والے اس شعر میں اس تجلی کا نظارہ کر سکتے ہیں جس کے لئے صرف حقیقی شاعر کی آنکھیں بنی ہیں - مومن کا کمال دیکھیے کہ پردہ نشین کی صفت جو محبوب کیلئے مختص تھی اب اپنے لئے ضروری قرار دیدی - ابتک وہ خود مریض سے پردہ کرتے تھے لیکن اب مریض ان سے پردہ کر رہا ہے کیا اس سے زیادہ عجیب و غریب انداز بیان اپنی حزین حالت کے اظہار کے لئے اور اس سے بہتر عشق چکاں اسلوب ادا دنیائے شاعری میں پیش کیا جاسکتا ہے ؟

ایک ناقد کا خیال ہے کہ "معشوق و محبوب کے بجائے مومن نے پردہ نشین کا لفظ پسند فرمایا ہے - اور تمام دیوان میں تقریباً بیس پچیس دفعہ استعمال کیا ہے - اول تو یہ لفظ ماہ پارہ، غیرت ناہید - رشک آفتاب - آفتاب حسن وغیرہ الفاظ کے مقابلے میں جو معشوق کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں - چست اور فصیح نہیں لیکن پھر بھی اگر اس لفظ کو باندھ کر مومن کوئی خاص مضمون ادا فرماتے - جب بھی کوئی بات تھی مگر نہ معلوم انھوں نے کیوں ایک غیر فصیح لفظ کو ایک فصیح لفظ پر ترجیح دیکر اس کی گردان کی" اسمیں شک نہیں کہ تنقید نگار نے اپنی رائے نہایت ایمانداراںہ طریقہ سے سپرد قلم کی ہے اور میں اُن کی رائے کا احترام کرتے ہوے اختلاف پر مجبور ہوں میرا خیال ہے کہ جناب ناقد نے لفظ "پردہ نشین" کو غیر فصیح کہنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا - ماہ پارہ کو فصیح سمجھنا اور پردہ نشین کو غیر فصیح کہنا کچھ زیادہ درست نہیں معلوم ہوتا - نہ تو پردہ نشین کسی اصول فصاحت سے غیر فصیح ہے اور نہ ماہ پارہ کسی ایسے اصول سے فصیح ہے جس سے پردہ نشین فصیح نہ ثابت ہو - اگر ذوق کو معیار فصاحت تسلیم کیجیے تو اختلاف بہیں نمایاں ہے جس لفظ کو جناب ناقد غیر فصیح کہتے ہیں میں غیر فصیح ماننے کو تیار نہیں بہت ممکن ہے کہ مومن اس لفظ کو بہت سے الفاظ سے فصیح تر سمجھتے ہوں - اب اس لفظ کی معنویت پر جائیے - تو میرا خیال ہے کہ یہ لفظ - ماہ پارہ - غیرت ناہید - رشک آفتاب - آفتاب حسن سے زیادہ معنویت رکھتا ہے "پردہ نشین" اور غیرت ناہید - رشک آفتاب - آفتاب حسن و ماہ پارہ میں وہی فرق ہے - جو حسن پس پردہ اور حسن بے پردہ میں ہے - بہت ممکن ہے اس دور میں حسن پس پردہ پر حسن بے پردہ کو ترجیح دی جائے لیکن مومن کے عہد میں حسن پس پردہ ہی کو ترجیح حاصل تھی - پردہ نشین کا اور شعر سنیے -

جلوہ دکھلائے تا وہ پردہ نشیں — میں نے دعویٰ کیا تحمل کا
ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں — زندگی پردہ در نہو جائے

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے — تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

حیوانوں میں انسان کی امتیازی خصوصیت نطق ہے۔ یوں تو اظہار مدعا کے لئے گائے بیل سے بھی ایسے حرکات ظاہر ہوتے ہیں جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسوقت وہ بھوکے ہیں اسوقت وہ پیاسے ہیں اسوقت وہ کسی خطرے سے دوچار ہیں اگر انسان نے بھی اپنی زبان سے اتنا ہی کام لیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے غیر ناطق حیوانوں کی صف میں جگہ نہ دیجائے۔ میرا خیال ہے کہ نطق عقل و بیان کے مجموعے کا نام ہے۔ کسی شے کے بیان کرنے میں حدود سے متجاوز نہ ہونا چاہئے منطقی اصطلاح میں اسی کو جامع و مانع بیان کہیں گے شعرا منطق کی بندشوں سے یقیناً آزاد ہیں لیکن وہ شاعری کی بندشوں سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ اگر شعر میں (Accuracy of Statement) نہیں ہے تو میرے خیال میں وہ انسان کا شعر نہیں اُسکے ہونے سے اُسکا نہ ہونا بہتر ہے۔ صحت مقال کی یہ خصوصیت ہے کہ کوئی ایسا پہلو نکل ہی نہ سکے جو اُسے غلط ثابت کرسکے یہ وہ جگہ ہے جہاں مومن دنیائے شاعری میں یکتائی کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ پہلے میرے خیال کو دوسروں کے اشعار کی روشنی میں سمجھ لیجئے اُس کے بعد میں مومن کی اس امتیازی خصوصیت پر بحث کروں گا۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں (میرؔ)

مفتی صدر الدین آزردہ نے اس شعر کو قل ہو اللہ کی صورت سے تشبیہہ دی تھی یعنی اس کا جواب محال ہے۔ اگر آپ غور کیجئے تو یہ صرف صحت مقالی نتیجہ ہے "شاید" اور "اسپر کچھ" کے الفاظ نے مضمون کو مطلق العنان ہونے نہیں دیا۔ شعر کی تاثیر بڑھ گئی شاعر کے قول پر کسی پہلو سے کوئی اعتراض وارد ہو نہیں سکتا بیان نہ پرواز تخئیل ہے نہ اسلوب بیان میں کوئی ندرت ہے نہ جدت ادا ہے مگر شعر ہے کہ ایک مفتی مجبور ہو کر اسے قل ہو اللہ سے مثال دیدیتا ہے اسی سلسلہ میں دردؔ کا بھی ایک شعر سن لیجئے۔

میرے تغیر حال پر مت جا — یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے (دردؔ)

اس شعر کے معنی بیان کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ شعر کا سارا لطف غارت نہ ہو جائے غور کیجئے وہ کون سی چیز ہے جو شعر کو نشتر بنائے ہوئے ہے وہی صحت مقالی ہے جسکو شاعر نے دبی زبان سے "یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے" کہا ہے۔ دنیا میں کس کی جرأت ہے جو شاعر کے اس قول کی تکذیب کرسکتا ہے۔ ظلم ہوگا اگر صحت مقالی کی مثالیں پیش کرتے ہوئے "شیفتہ" شاگرد مومن کا نہایت مشہور شعر مثالاً نہ پیش کروں۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ — اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اگر صحت مقالی کا خیال نہ رکھئے تو نہایت آسانی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سینے کے اندر جو آگ لگی ہوئی ہے اسی کا نام محبت ہے۔ لیکن کیا مضمون

کوئی لطف باقی رہگیا۔ یہ صحت مقالی کا کوچہ ایسا ہے جہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ 'شاید' 'اک' 'سی' یہ وہ الفاظ ہیں جو سینے کے اندر لگی ہوئی آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔ شاید یہ بات اب واضح ہوگئی ہوگی کہ اردو زبان کے تین موثر ترین شعر کی امتیازی خصوصیت صحت مقالی ہے بہت ممکن ہے کہ صحت مقالی کا جو مفہوم میرے ذہن میں موجود ہے وہ کسی حد تک ان مثالوں سے واضح ہوگیا ہو۔ اب ایکبار مومن کا شعر پھر سُن لیجئے

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

یہ شعر بھی انھیں شعروں میں ہے جن کی نزاکت جنبش قلم کو برداشت نہیں کرسکتی۔ حق تو یہ ہے کہ یہ شعر کسی تنقید و تبصرہ کا متحمل بھی نہیں ہوسکتا مومن نے جن جچے تلے الفاظ میں اپنے خیال کو ظاہر کیا ہے جتنی احتیاط برتی ہے اسکا اندازہ ہونا مشکل ہے۔ ایسے اشعار جن میں صحت مقالی کا خیال رکھا جاتاہے اونیں جتنے لفظی قیود زیادہ ہوتے ہیں معانی میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہاں اک ذرا اس حقیقت کا تصور کیجیے کہ جو شخص مطلوب کے نباہ ذکرنے پر شکایت کے بجائے شکر ادا کرے اسکی یاس کی دنیا کتنی وسیع ہوگی۔ 'تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی' یہ الفاظ جس دل سے نکل سکتے ہیں اور جس قلم سے صفحۂ قرطاس پر آسکتے ہیں وہ کس دنیا میں ہوگا۔ شاعر جس خیال کو موزوں کرنا چاہتا تھا آپ خود دیکھئے کہ اسنے کتنی کامیابی حاصل کی ہے۔ جس مایوس کیلئے برائی بھلائی ہوسکتی ہے جسکے لئے بیوفائی وفا سے کم نہیں ثابت ہوتی اس کی حالت بعینہ اس شخص کی سی ہے جو انتہاے یاس میں رو نہیں سکتا اور ہنسنے پر مجبور ہے۔ اس کے بعد شاعر دنیا اور اہل دنیا سے قریب تر ہو رہا ہے اور خدا جانے کیا سمجھ کر کہہ اٹھتا ہے۔

'میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے'

کردیا خواہش بیداد نے احوال تباہ تو تو ظالم نہیں زنہار یہ میں ہوں مظلوم

میں نہیں خیال کرسکتا کہ ایک شاعر اس سے زیادہ متعین (Definite) ہوسکتا ہے۔ یہ حسن بیان کا معجزہ ہو کہ کسی کو کچھ کہنے کا مجھ سے حق ہی نہیں میں اگر کچھ کہہ سکتا ہوں تو صرف اپنی ہی بابت۔ کیونکر کہوں کہ تو ظالم ہے خدا جانے تو ظالم ہے یا رحمدل بہرحال میں تو مظلوم ہوں۔ یہ حقیقت ہے اور ناقابل انکار حقیقت۔ ہاں ہاں سچ ہے میں ہی اپنی بربادی کا باعث ہوا ہوں۔ بیشک تو ظالم نہیں۔ تجھپر الزام نہیں۔ مگر اسکا کیا علاج کہ مجھپر ظلم ہوا ہے۔ شاعر کا یہ بیان جس سے انتہائی احتیاط برس رہی ہے اتنے ہی زور کے ساتھ کسی کے ظالم ہونے کی حقیقت کو سامع کے دل پر نقش کرا دیتا ہے جسقدر وہ اپنی مظلومی پر زور دیتا ہے اور کسی کا ظلم بغیر کہے بلکہ انکار کے باوجود بھی آشکارا ہو جاتا ہے۔

اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

'سا' کا لفظ 'کوچے کی ہوا' اور 'میری آہ' کو پنکھا نہ بناتے ہوے پنکھا بنا رہا ہے

سب تابہ حشر چونک پڑے تیرے عہد میں اک میرا بخت تھا کہ وہ بیدار کم ہوا

'کم ہوا' کہکر شاعر نے یہ محسوس کرا دیا کہ میرا بخت کبھی بیدار نہ ہوا۔

کچھ قیس اور میں ہی نہیں سب کے سب مجھے | اچھا تو درد عشق کا بیمار کم ہوا

دیکھئے شاعر اس کم سے کیا کیا کام لے رہا ہے جتنے نرم لہجہ میں کہہ رہا ہے اتنا ہی زبردست اثر پیدا کر رہا ہے (ART) اس کا نام ہے ۔

نہ جاؤنگا کبھی جنت میں میں نہ جاؤنگا | اگر نہ ہوئیگا نقشہ تمھارے گھر کا سا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ انداز بیان کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے ۔

یہاں تک تو میں نے اپنے اُن تاثرات کی بنا پر جو کلام مومن کے مطالعہ کے بعد مجھپر طاری ہوے عمومی طور پر صرف ان کیفیات کا اظہار کیا ہے جو ذوق سلیم میں ایک ہنگامہ کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں اور جسیں ایک شخص اصول تنقید وغیرہ سے بھی گزر جانا چاہتا ہے لیکن چونکہ مقصود اپنے محض جذبات کا اظہار نہیں ہے بلکہ مومن کی شاعری کی صحیح قیمت متعین کرنا ہے اس لئے میں اب اصل موضوع پر توجہ کرتے ہوے سب سے پہلے یہ بتاؤنگا کہ ان خصوصیات شاعری کے لحاظ سے جن میں اور شعرا بھی مشترک ہوسکتے ہیں مومن کا کیا مرتبہ تھا اور پھر یہ ظاہر کروں گا کہ اس کی انفرادیت کن خصوصیات سے متعلق تھی اور یہ کہ وہ اپنی مخصوص شاعرانہ حیثیت اور اپنے ممتاز تقدم شعری کے لحاظ سے کیا مرتبہ رکھتا تھا ۔

موضوع تذکرۃ الصدر پر تفصیلی نظر ڈالنے سے پہلے حکیم مومن خاں کی بابت آزاد کی راے سن لیجئے شاید یہ معلوم ہی ہوگا کہ جناب شمس العلماء نے خود مومن پر لکھنے کی کوئی زحمت گوارا نہیں فرمائی صرف کلام پر راے ظاہر کی ہے جو خود انھیں کے قلم سے نکلی ہوئی ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

"غزلوں میں اُن کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں اور استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہونچایا ہے ان میں معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کئے ہیں اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے اور اس پر وہ خود بھی نازاں تھے اشعار (مذکورہ) میں فارسی کی عمدہ ترکیبیں دلکش تراشیں ہیں کہ اُردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں اِن کی زبان میں چند وصف خاص ہیں جنکا جتلانا لطف سے خالی نہیں وہ اکثر اشعار میں "ایک شئے کو کسی خاص صفت کے لحاظ سے ذات شئے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجب لطیف لطیف بلکہ معانی پنہاں پیدا کرتے ہیں" یعنی آزاد بھی مومن کی نزاکت تخیل، علوے مضامین، زور تشبیہ و استعارہ کے مداح ہیں ۔ وہ گو مومن کی فارسی ترکیبوں کو عمدہ اور تراشوں کو دلکش کہتے ہیں مگر دبی زبان سے یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ یہ باتیں اُردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں ۔ آزاد کی زیر خط عبارت میں کچھ سمجھ نہ سکا غالباً اس سے استعارہ بالکنایہ مراد ہے ۔ یہ یاد رہے کہ کنایہ اور استعارہ بالکنایہ میں فرق ہے اگر لفظ یا جملہ غیر حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے مگر اسطرح کہ حقیقی معنی بھی مراد لئے جاسکتے ہیں تو یہ کنایہ کہلائیگا اور اگر حقیقی معنی مراد نہیں لئے جاسکتے تو وہ استعارہ بالکنایہ ہوتا ہے جو ایک فرع تشبیہ کی ہے ۔ بعض نقادوں نے خصوصیات مومن کے ضمن میں ندرت اسلوب بیان اور شوخی ادا پر بھی زور دیا ہے ۔

ذیل میں کچھ مثالیں درج ہیں جن میں نزاکت نمایاں ہے -

نزاکت تخیل

مومن قدرت کی طرف سے ایک نہایت زبردست بلند پرواز تخیل لائے ہیں وہ اپنی خصوصی فضا میں اڑتے ہیں اور نہایت بلند اڑتے ہیں اور یہ اُن کا نہایت ہی اعلیٰ کمال ہے" اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری مومن کی نزاکت تخیل کی مثال نہیں پیش کر سکی - اب شاعری میں تخیل کا کیا درجہ ہے پہلے اسے متعین کر لیجئے پھر مومن کے کلام پر نظر ڈالئے - علامہ شبلی کی رائے ہے کہ "اگرچہ محاکات اور تخئیل شعر کے عنصر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل تخئیل کا نام ہے" اب مومن کے کلام میں تخئیل کی گلکاریاں دیکھئے -

گر وہاں بھی یہ خموشی اثر افغاں ہوگا　　　حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

اگر میرے نالوں کا یہی خاموش کن اثر رہا جس کے دور ہونے کی کوئی توقع نہیں تو حشر میں بھی کوئی میرا پرسان حال نہ نکلیگا - جس شخص کی ساری عمر نالہ و فریاد میں کٹی ہو جسکا دنیا میں کوئی پھر بھی پرسان حال نہ ہوا ہو وہ اگر یہ نہ سوچے کہ کل بھی حشر میں یہی ہونا ہے تو کیا کرے - ذرا اس خموشی اثر افغاں کی وسیع المعنی ترکیب پر غور کیجیے' ظاہری معنے کے سوا اس ٹکڑے سے یہ معنی بھی پیدا ہوتے ہیں کہ شور فغاں نے سب آوازوں کو دبا دیا ہے - قاعدہ ہے کہ بلند آواز کے مقابل میں نیچی آواز خاموشی ہی کا حکم رکھتی ہے اور اگر یہ معنی نہ لئے جائیں تو سکوت و خاموشی کے الفاظ مہمل ہو جائیں گے - مثلاً سکوت شب کو لے لیجئے دن کے شور و شغب کے مقابل میں رات ساکت ہی معلوم ہوتی ہے - میں بھی ان لوگوں میں ہوں جو شور و سکوت میں صرف کمیت کا فرق سمجھتے ہیں میں دونوں کی کیفیت میں فرق سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوں - اب مومن کی تخئیل کے کارنامے دیکھئے کہ اس نے شور فغاں سے شور محشر کو دبا دیا ہے اور حشر کو دنیا کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کیا ہے

ہنسے وہ غیر مجھے بزم سے اٹھانے پر　　　سبک ہے وہ جو تری طبع پر گراں نہ ہوا

مومن نے اسمیں تضاد سے بہت فائدہ اٹھایا ہے جسکی مفصل بحث انشاء اللہ آئندہ صفحات میں آئیگی - شاعر کی خیال آرائی دیکھئے کہ اس نے اپنی رسوائی میں بھی منطق سے کام لیکر غیر کی سبکی کا پہلو نکال ہی لیا - مومن محفل سے نکالے گئے اس سے بڑی سبکی اور کیا ہو سکتی ہے غیر نے بھی یہی خیال کیا اور مومن کے رسوا کئے جانے پر خندہ زن ہوا لیکن زخم رسوائی پر اغیار کی نمک پاشی دیکھی نہ گئی اور بول اٹھے کہ میرے نکالے جانے پر غیر خندہ زن کیوں ہے - میں تو اسوجہ سے اٹھایا گیا کہ تیری طبع نازک پر بار ہوا وہ سبک ہونگے جبھی تو تیری طبیعت پر بار نہیں گزرے یہاں لفظ سبک سے فائدہ اُٹھایا گیا جسکے ایک معنی تو ذلیل ہونے کے ہیں اور دوسرے گراں کی ضد - یہ مومن کا خاص انداز ہے کہ وہ کسی حالت میں اپنا فائدہ نہیں چھوڑتے - یہ تخئیل کے کارنامے ہیں جو عزت کو ذلت اور ذلت کو عزت کر دکھاتے ہیں - اسی رنگ کا مومن کا دوسرا شعر ہے -

یاد سہواً اسے اے غیر ہے نسیاں عمداً　　　یاد رکھ بھول گیا جسکو وہی یاد رہا

دیت میں روز جزا لے رہیں گے قاتل کو　　　ہمارا جان کے جانے میں بھی زیاں نہ ہوا

سارا دیوان مومن کا نزاکت و رفعت تخئیل سے بھرا ہوا ہے' چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں :-

یہ عذر امتحاں جذب دل کیسا نکل آیا — میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

عاشق فرط شوق سے مجبور ہو کر محبوب کی محفل میں جا پہونچا ہے اور محبت کے ثبوت میں یہ پیش کرتا ہے کہ اسکی الفت اسے وہاں کشاں کشاں لائی اگر محبوب کے دلیں بھی عاشق کی الفت ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اسکے ہاں نہ جاتا اس سے عیاں ہے کہ انھیں اس سے کوئی تعلق نہیں یہ سنکر محبوب فوراً کہہ اٹھتا ہے کہ تمھاری دلیل بجاے اس کے کہ تمھارے لئے مفید ہو میری موید مقصد ہے تمھارا میرے ہاں یوں تنہا ہو کر آنا میرے جذبۂ دل کی قوت کا نتیجہ ہے اگر تم میں بھی یہ جذب کار فرما ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میں تمھارے ہاں کھنچا کھنچا نہ چلا آتا اور کوئی وجہ بھی کہ اگر تمھارا جذبۂ دل قوی تر نہ ہوتا تو مجھے اپنی طرف کھینچ نہ لیتا گویا تمھارے جذبۂ دل کی کمیت کا یہ امتحان تھا جسمیں تم ناکامیاب رہے اتنے بسوط مضمون کو مومن نے ایک شعر میں ادا کر کے کس خوبی سے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے" یہ جناب غلام ربانی صاحب عزیز کا خیال ہے جن کا مضمون "کلام مومن پر اک نظر" کے عنوان سے سال گزشتہ نگار میں شایع ہو چکا ہے۔ شعر کا مطلب مختصراً یہ ہے کہ عاشق محبوب سے اسکی بے نیازی کا شکوہ سنج ہوا۔ ادھر سے جواب ملا کہ میں ابتک تمھارے جذب دل کا امتحاں کرتا تھا کہ اگر تمھارا جذبۂ دل صادق ہے تو مجھے خود کھینچ بلا ئیگا۔

واعظ بتوں کو خلد میں لیجا ئینگے کہیں — ہے وعدہ کافروں سے عذاب الیم کا

بت پرست کافروں کے لئے سخت سے سخت عذاب یہ ہے کہ بت ان سے جدا کر دیے جائیں۔ مومن کی شوخی اور ساتھ ہی ساتھ تخئیل کی بلندی دیکھیئے کہہ رہا ہے کہ اے واعظ شاید بتوں کو جنت ملے گی کیونکہ کافروں سے عذاب الیم کا وعدہ ہے ایک کافر کے لئے ہجر بت کے سوا اور کوئی مصیبت نہیں۔ اگر کافر اور بت دونوں دوزخ ہی میں ڈالے گئے تو یہ عذاب الیم نہ ہوا اس سے زیادہ کافر اور کس چیز کا خواہاں ہو سکتا ہے۔ کافروں کو عذاب دینے کی ایک اور صرف ایک صورت ہے اور وہ یہی کہ انھیں کافروں سے علحدہ کر کے جنت میں جگہ دیجاے۔

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے — کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

عموماً شعرا نے جب بلند پروازی کی تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکے کہ گھر کو صحرا بنا دیا۔ لیکن مومن نے اس پامال روش کو چھوڑ کر اپنے لئے دوسری راہ نکالی وہ صحرا کو گھر بنا رہے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ صحرا پر میں نے قناعت تو کر لی ہے مگر اس کا خوف ہر وقت باقی ہے کہ کہیں صحرا بھی میری جنوں جولانیوں کے لئے تنگ نہ ثابت ہو۔

رشک پیغام ہے عناں کش دل — نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے

اس رشک کا کیا ٹھکانا جسنے نامہ بر کو راہ بر بنا دیا ہے۔ نامہ بر یار کو خط دیگا زبانی پیغام کہے گا مومن سے تو یہ دیکھا نہیں جاتا اور وہ بھی نامہ بر کے پیچھے پیچھے جانے کے لئے آمادہ ہے۔

دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ عش تمہیں دیکھکر نہ ہوجاے

اس شعر میں بھی رشک کا پہلو ملاحظہ ہو کہ آئینہ اس آئینہ رو کو دیکھ رہا ہے، مومن یہ نہیں دیکھ سکتا - لہذا وہ کہتا ہے للہ آئینہ مت دیکھو ڈرتا ہوں کہ کہیں تم خود آئینے کو دیکھ کر غش نہ ہوجاؤ اس شعر کے متعدد پہلوؤں پر نظر رکھیے - جمال یار کی تعریف کے لئے کتنا لطیف انداز بیان اختیار کیا ہے کہ آئینہ مت دیکھو کہیں تم اپنا جمال آئینہ میں دیکھ کر خود غش نہ ہو جاؤ - رشک کی وجہ سے عاشق یہ نہیں چاہتا کہ مطلوب آئینہ دیکھے لیکن صاف صاف کیونکر کہے لہذا ایسا انداز اختیار کرتا ہے جسمیں بظاہر مطلوب کا فائدہ ہو اور درپردہ اپنا۔

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ تجھکو اپنی نظر نہ ہوجاے

عاشق لاکھ اپنی مصیبتوں میں گرفتار ہو لیکن اس کے دل سے کبھی محبوب کا خیال جا نہیں سکتا - وہ اپنی مصیبتوں کو بھول جائے گا مگر مطلوب کو پریشان حال نہیں دیکھ سکتا - اس شعر میں مومن نے وہی اپنا مخصوص انداز بیان قائم رکھا ہے - جہانتک تخئیل کی نزاکت کا تعلق ہے مومن کا شعر یقیناً میر کے اس شعر سے بڑھا ہوا ہے -

میرے تغیر حال پر مت جا اتفاقات ہیں زمانے کے

لیکن شعر میں ایک چیز تخئیل و محاکات سے بھی بڑی ہوتی ہے جسکو میں نے ایک جگہ صحت تغزل سے تعبیر کیا ہے اس نے میر کے شعر کو مومن کے شعر سے کہیں بلند کر دیا ہے لیکن درد نے میر سے بھی اپنے شعر کو بلند تر کر دیا ہے

میرے تغیر حال پر مت جا یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے

مرزا غالب کا شعر بھی سن لیجئے

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

میرے خیال میں مومن کی نازک خیالی کہیں بڑھی ہوئی ہے - شبلی نے لکھا ہے کہ غالب نے خسرو کے اس شعر پر ترقی ہے -

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

ہے ایک خلق کا خوں سر پہ اشک خوں کے مرے سکھائی طرز اُسے دامن اٹھاکے آنے کی

نازک خیال مومن اپنے انداز بیان کو کبھی ترک نہیں کرتا - حسن کو وہ ہمیشہ عشق کا رہین منت ثابت کرتا ہے - یہاں بھی دیکھئے - اشک خونیں کے ڈر سے وہ آتے بھی ہیں تو دامن اُٹھائے ہوے - نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عالم اُن کی اس ادا کا شہید ہوگیا اور غریبوں کا خون میرے اشک خونیں یعنی میرے سر رہا -

داغ خوں سے میرے وہ حیران ہوا دامن الجھا ہے گل - بے خار سے

شبلی نے شاعری کو محاکات اور تخئیل کا مجموعہ کہا ہے - اس شعر میں تخئیل لطف تشبیہ کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے وہ اپنے دامن پر خون کے دھبے دیکھکر حیران رہگیا - ظاہر ہے کہ شعر کا مطلب صرف اتنا ہے مگر تشبیہ نے اسے کہاں سے کہاں پہونچا دیا - اب دامنِ یار کی نزاکت دیکھئے کہ وہ گلِ بے خار سے بھی الجھتا ہے -

اب تو مرجانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو　　ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جاے ہے

اس شعر میں مومن نے ضعف کی حد کردی ہے - یہاں تک کہ شعر بے تاثیر ہو کر رہگیا - لیکن اب بھی ایک طبقہ اس شعر پر سر دھننے کے لئے تیار ہے -

خاک میں ملجاے یارب بیکسی کی آبرو　　غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جاے ہے

یہ مثالیں نازکخیالی کو تو ضرور ظاہر کرتی ہیں - مگر تصنع نے شعر کو شعر نہ رکھا - آئندہ صفحات میں میں اِن اثرات سے بحث کروں گا جنھوں نے مومن سے یہ شعر کہلواے -

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا　　وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لئے

کیا حسن تعلیل ہے -

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے　　فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہونگے

اس مطلع میں مبالغہ حد درجہ کیا گیا ہے - یعنی جب ہم سوختہ ساماں خاک میں دفن ہوں گے تو فلس ماہی ہمارے لئے گل شمع شبستاں ہوجائینگے جنی ہماری سوختہ بختی کے اثر سے وہ مچھلی جو قدیم خیال کے موافق طبق زمین کے نیچے بالاے آب ہے اور حامل زمین ہے اس طور پر کہ گاے کو لئے ہوئے ہے' اور گاے کے سینگ پر طبق زمین ہے جلجاے گی - اور اس کے فلس گل شمع شبستاں کا کام دیں گے اور مچھلی کی چربی کی شمع بھی بنتی ہو

مومن کے اکثر اشعار میں بناوٹ ہے مگر بناوٹ بھی لازمۂ شاعری ہے - کیونکہ اس کا دوسرا نام معنی آفرینی ہے - جب شاعری کو محض سادگی اور بول چال سے بڑھایا جائے گا تو ضرور ہی بلند پروازی کیجاے گی اور بلند پروازی کا مقتضا وقت پسندی ہے" یہ ایک لکھنوی کی راے ہے جن کا مضمون زمانہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا ہے - دیکھئے ایسے اشعار کی بھی داد دینے والے لوگ موجود ہیں - زمانے کے اثر کو دیکھئے غالب کو بھی بعض مرتبہ ایسے ہی شعر کہنے پڑے -

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں　　کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

مومن کیوں پیچھے رہتے انھوں نے مذکورۂ بالا مطلع لکھ مبالغے کی حد کردی - رفعت تخئیل اور نزاکت خیال کے تحت میں سچ پوچھیے تو علوے مضامین - جدت ادا - اسلوب بیان وغیرہ سب کچھ آجاتا ہے - کیونکہ جبتک شاعر کی تخئیل بڑھی ہوئی نہ ہوگی وہ اداے بیان میں کیا خاک جدت دکھاسکے گا - نزاکت تخئیل کا عنوان اتنا جامع ہے کہ مومن کے اکثر اشعار اسکے تحت میں آسکتے ہیں - یہاں اب میں مثالاً وہ اشعار درج کروں گا جن میں مومن کی تخئیل نے علوے مضامین - جدت ادا یا ندرت اسلوب بیان سے کام لیا ہے - لیکن اشعار میں اگر آپ علوے بیان

جدت ادا یا ندرت اسلوب بیان کے متجسس ہیں تو ضرورت اس امر کی ہے کہ چند عنوان مقرر کر لیجئے اور دیکھئے کہ مومن نے ایک ایک مضمون کو کس طرح سے باندھا ہے۔ وصل۔ فراق۔ غم۔ ملال۔ رنج۔ ضد۔ عداوت۔ حسد۔ رشک۔ اضطراب۔ بیتابی۔ بیخوابی کے مضامین۔ بقول شمس العلماء نواب امداد امام اثر مومن خاں خوب باندھتے ہیں" حقیقت یہ ہے کہ مومن خاں نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ اُن کی ذہانت اور جولانی طبیعت کی تماشا گاہ ہے"

وصل و فراق

یہ جوش و یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کی وقت
دعاے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بیرحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

جمع متضاد میں مومن کو ید طولیٰ حاصل ہے یہ بھی اُن کی خصوصیات شاعری میں ہے۔ کہتے ہیں' یہ سب صحیح کہ ہجر میں زندگی مصیبت ہو جائے گی۔ لیکن بہر حال مرنے سے تو جینا آسان ہی ہے۔ لفظ ' مرنے ' سے کیا فائدہ اٹھایا ہے

آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا
مرگ کی آس پہ جینا شب ہجراں ہوگا

اس انداز بیان کی کیا تعریف ہو سکتی ہے ——— موت کے خیال سے دل کو سمجھا کر شب ہجر کاٹنا ہی کیا کم تھا ——— کہ اُس کے لئے بھی ' امید' کا شرمندۂ احسان ہونا پڑتا ہے ——— مومن نے اپنی انفرادیت اس نادر اسلوب بیان کرنے کے باوجود بھی باقی رکھی ہے۔ مومن کے اکثر شعروں میں آپ یہی جمع اضداد کی بات پائیں گے۔

زندگی ہجر بھی اک موت تھی
مرگ نے کیا کار مسیحا کیا

زندگی ہجر کا نقشہ اس سے زیادہ موثر طور پر اور کیا کھینچا جا سکتا ہے۔ زندگی ہجر کو مرگ مسلسل کہئے جس کی دوا صرف موت ہے۔

جب ہو چکا یقین کہ نہیں طاقت وصال
دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آگیا

دیکھئے ستم ایجاد نے کیا ستم ایجاد کیا ہے۔ خدا جانے اس ستم کے ایجاد کرنے کا سہرا مومن کے سر ہے یا ستم ایجاد کے سر

سادعدۂ وصلت سے دل ہو شاد کیا
تمسے دشمن کی مبارکباد کیا

تمسے دشمن کے وعدۂ وصل کی حقیقت کوئی میرے دل سے پوچھے۔ میں ہی جانتا ہوں کہ وہ کہاں تک باعث مسرت ہو سکتا ہے

بیخود تھے غش تھے محو تھے دنیا کا غم نہ تھا
جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

وصال و ہجر میں مومن ایسا شاعر کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتا' ژرف بیں نگاہیں جانتی ہیں کہ کیفیت میں دونوں ایک ہیں۔ یہی اس شعر میں ثابت کیا ہے۔

ہجر بتاں میں تجھکو ہے مومن تلاش زہر
غم پر حرام خوار توکل نہ ہو سکا

ہجر اور وصل کے مضمون کے لئے مومن نے جو جو اسلوب بیان اختیار کئے ہیں کم شعرا کے ہاں اتنی مثالیں مل سکتی ہیں۔ انداز بیان

اتنا توسع مومن کے نازک خیال دماغ کا سچ پوچھیے تو معجزہ ہے۔

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا — مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا

مومن کے طرزِ ادا میں ایک بات اور بھی ہے جس کو مولانا شبلی نے شعر العجم میں خصوصیات غالب میں بیان کیا ہے یہ صحیح ہے کہ مرزا غالب بھی اُن کے ساتھ شریک ہیں۔ مگر مومن کے یہاں یہ بات بہت نمایاں ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ہیں، جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والے کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، اس شعر میں مومن نے اپنی اسی ادا سے کام لیا ہے اور نہایت حسن کے ساتھ ثابت کر دکھایا ہے کہ وصل ہو یا ہجر نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ ملاحظہ ہو ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا۔ یعنی وعدہ وفا نہیں ہوا اور شب وعدہ شب وصل ہونے کے بجائے شب ہجر ہو گئی۔ لیکن بفرض محال اگر وعدہ وفا بھی ہوتا تو ہم اسپر جان فدا کرتے۔ دوسرا مصرع ملاحظہ ہو "مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا" مرنا بہرحال قسمت میں لکھا تھا وہ آتے تو ہم اُن پر اپنی جان قربان کرتے وہ نہیں آئے تو ہم غم سے مر گئے۔ مرنا ہر دو حال میں تھا۔ پھر نتیجہ کے لحاظ سے اُن کا آنا اور نہ آنا دونوں برابر ہے۔

واں طعنۂ تیر بار یہاں شکوہ زخم ریز — باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب

شب وصل کا نقشہ کتنا کامیاب کھینچا ہے۔ فارسی ترکیبوں نے شعر کو کتنا چست کر دیا ہے ان فارسی ترکیبوں کی استعمال کی وجہ بھی سن لیجیے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کہیں دیکھا تھا کہ مومن اور غالب کا یہ خیال تھا اور صحیح خیال کہ غزل میں دو ایک شعر کے سوا زیادہ اچھے شعر نکلنا مشکل ہے ایسی حالت میں بہترین صورت ہے کہ فارسی کی عمدہ ترکیبوں کو استعمال کر کے بقیہ اشعار کی بندش چست کر دی جائے۔

کس واسطے اے شمع زباں کاٹتے ہیں لوگ — کیا تو نے بھی کی تھی شبِ ہجراں کی شکایت

'بھی' کا لفظ رکھ کر کس انداز سے اپنی مصیبت کا ذکر کیا ہے۔

امید وعدہ بھی تو نہیں روز ہجر میں — ہم سے وفائے زندگیِ بے وفا عبث

روز ہجر میں زندگی کا بلائے جان ہونا کس انداز سے ادا کیا ہے۔

اے روز حشر کچھ شب ہجراں بھی کم نہیں — بدنام ہو جان میں تیری بلا عبث

مضمون کی بلندی دیکھیے اور اسپر انداز بیان۔ شب ہجراں کو روز حشر سے صرف کم نہیں کہا ہے لیکن اثر یہ پیدا کیا ہے کہ شب ہجر کا نمبر تجھ سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔

ہم تو بچتے نہیں تا شام وہ آئے تو کیا — اے دعائے سحری منتِ تاثیر نہ کھینچ

روز غم کون بھلا اُن کے ہوتا ہے شریک — انتظارِ اثر نالۂ شبگیر نہ کھینچ

مرچک کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے کہتے تو ہیں بھلے کی ولیکن بری طرح

کتنا کامیاب اندازِ بیان ہے

نے تابِ ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں کمبخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

شوقِ وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر سوجھا نہ کچھ مجھے شبِ مہتاب دیکھکر

تلاشِ مضموں دیکھئے۔ شبِ مہتاب تھی میں سمجھ گیا کہ وہ عدو کے گھر گئے ہونگے۔ برا ہو شوقِ وصال کا مجھے کہاں لے گیا۔

محوِ حیرت کو وصال و ہجر دونوں ایک ہیں بلبلِ تصویر کو کب یاد آتی ہے بہار

عاشقِ حیراں وصال و ہجر سے بلند ہے۔ وہ اپنے خیال ہی میں محو ہے۔ دیکھئے عشق کا کتنا بلند نظریہ پیش کیا ہے

جوں نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑگیا کچھ نہ سوجھا عالم اُس پردہ نشیں کا دیکھکر

منشی امیر احمد مینائی کا بھی ایک شعر سن لیجئے

ترے مشتاق کو حسرت رہی دیدار کی تیرے نقاب اٹھی تو پردہ پڑگیا آنکھوں پہ حیرت کا

شاید یہ شعر مومن ہی کے شعر سے ماخوذ ہو۔ مومن نے پردہ نشین کے لفظ کو یہاں بھی نہ چھوڑا۔ لیکن اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس لفظ نے شعر کی معنویت کو ترقی دیدی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا معشوق اپنے دور کے مذاق کے خلاف صنفِ لطیف ہی کا ایک فرد ہوتا تھا۔ اسی ضرورت کو مدنظر رکھکر مومن نے بار بار پردہ نشیں کے لفظ پر اتنا زور دیا ہے۔ رشکِ آفتاب۔ آفتابِ حسن کے الفاظ ایسے ہیں جو ہر دو صنف کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں۔ لیکن پردہ نشیں کے لفظ نے مومن کے محبوب کو مختص کر دیا ہے۔ اردو شاعری پر جو یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس کا محبوب جنس قوی سے بھی ہوتا ہے وہ مومن پر وارد نہیں ہوسکتا غالب کی طرح مومن کا دیوان ایسے اشعار سے پاک ہے

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا (غالب)

وصل میں احتمالِ شادیٔ مرگ چارہ گر درد لا دواے عشق

اس شعر میں مومن ایک پورا جز چھوڑ گئے ہیں۔ صرف ایک مقدمہ جس میں احتمال کا اختلاف ہوسکتا ہے اُسے بیان کر دیا ہے اور دوسرے مقدمہ کی پروا کئے بغیر نتیجہ نکال دیا کہ چارہ گر درد لا دواے عشق' یہ مسلم ہے کہ ہجر میں عاشق کی جانبری ناممکن ہے۔ وصل کی بابت شاعر شادیٔ مرگ کے قوی احتمال کو ظاہر کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عشق کی زندگی دو حال سے خالی نہ ہوگی یا وصل ہوگا یا ہجر۔ ہجر میں مرنا مسلم۔

وصل میں جان کا جانا اغلب - پھر اگر دردِ عشق لا دوا نہیں ہے تو کیا ہے - یہ مومن کا مخصوص اندازِ بیان ہے -

کس توقع پر امید وصل اب　　　طاقتِ صبر و شکیبائی نہیں

وہی وصل و ہجر کا مضمون ہے لیکن مومن نے ہر جگہ ایک نئے انداز سے باندھا ہے اور کس خوبصورتی کے ساتھ -

کیا رحم کھا کے غیر نے دی تھی دعائے وصل　　　ظالم کہاں وگرنہ اثر میری آہ میں

اسلوب بیان اور جدت ادا کی اس سے بہتر مثال ملنا مشکل ہے ملاحظہ ہو کس انداز سے مومن محبوب سے اپنے ایام فراق کی مصیبتوں کو بیان کر گیا - وہ مصیبتیں کتنی سخت ہونگی جن کو دیکھکر غیر کو بھی رحم آگیا ہو -

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں　　　میں نہیں چاہتا کمی اپنی شب دراز میں

کم عاشق دنیا میں پیدا ہوے ہوں گے جو اپنی شب ہجر کی درازی کے خواہاں ہوں - دیکھئے مومن نے درازی شب ہجر سے کیا بات پیدا کی ہے -

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں　　　اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

جس مہجور کے لئے ہجر عادت ثانیہ بن گئی ہو جس مہجور کیلئے وصل ستم ہو جائے خیال کیجئے اسکی ہجر کی مصیبتیں کیسی ہونگی - اس شعر کو غالب کے اس مشہور شعر سے موازنہ کیجئے -

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہی رنج　　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھپر کہ آساں ہوگئیں

دونوں اشعار میں جو یقیناً ہم معنی ہیں دیکھئے رنگ تغزل کہاں ہے - اور کس مقام پر شاعری خشک فلسفے سے علحدہ ہوتی ہے -

دن بھی دراز رات بھی کیوں ہے فراق یار میں　　　کا ہے سے فرق آگیا گردشِ روزگار میں

یہ شعر شرح و تفسیر کی حدود سے بہت بلند ہے -

اے اجل کاش الٹ جائیں شب ہجراں میں　　　وہ دعائیں کہ تری جان کو ہم کرتے ہیں

خیال کی جدت قابل داد ہے -

ربط اُس سے ہے مثل شعلہ و شمع　　　مرجاؤں گر ایک دم جدا ہوں

چھوٹی بحروں میں دراصل مومن کا کمال نمایاں ہوتا ہے - حالت جدائی میں جس میں مرنا یقینی ہے اسوقت نظر انداز کر دیجئے صرف حالت وصل کو لیجئے - تشبیہ نے اس میں بھی عاشق کی بیقراری اور تپش کا نقشہ کھینچ دیا ہے -

آتی ہے بوے داغ شب تار ہجر میں　　　سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

اس شعر پر " زمانہ " میں ا-م-لکھنوی نے لکھا تھا کہ اگر حزیں بھی زندہ ہوتے تو رشک کرتے -

تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

ایک ناقد کا خیال ہے کہ مومن کی زبان نہایت پاکیزہ و شستہ ہے گو بعض نقادانِ فن کے یہاں ذوق کی زبان اپنے تمام معاصرین سے سلیس اور لطیف سمجھی جاتی ہے - مگر میرے نزدیک مومن کی زبان اپنے معاصر سے کہیں زیادہ صاف ہے .... محاورہ کی آمیزش بھی کچھ کم پر لطف نہیں ہے" یہ مومن کی مشہور عام غزل کے مقطع کو چھوڑ کر سب سے زیادہ مشہور شعر ہے - ایک لطیف خیال جس لطیف انداز سے ظاہر کیا گیا ہے صرف ذوق اُس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے - مومن اپنے کو خاتم العشاق سمجھتا ہے - لہذا ساری بلائیں ساری مصیبتیں اسپر ختم تھیں مصیبت تو سب کا ساتھ دیتی ہے لیکن مصیبت کا ساتھ دینے والا عاشق کے سوا کوئی نہیں ملتا - اس انداز بیان کو دیکھیے کہ مومن کو اب اپنی فکر کے بجاے شب ہجراں کی فکر لگی ہوئی ہے - غالب نے بھی اسی مضمون کو صرف موزوں کیا ہے - ملاحظہ ہو -

آے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

غالب وہ سلاست نہ پیدا کر سکے جو مومن کے اس شعر میں پائی جاتی ہے - علاوہ بریں انداز بیان کے فرق نے شعر میں زمین و آسمان کا فرق پیدا کر دیا -

لذتِ مرگ سے ہجراں میں دعا ہے کہ خدا یہ مزا ہو نہ نصیبوں میں کسی ہجس کے

ہجس لذت مرگ سے کیا خاک لطف اندوز ہو سکتا ہے اسے مومن ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے - نیش کو نوش بنانا شاعر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے - مومن کی تخئیل کو دیکھیئے کہتا ہے - ظاہر ہے کہ عدو کو نہ کبھی ہجر کی مصیبت اٹھانا پڑے گی نہ اس کے صدموں سے کبھی مرنا ہوگا - یہ شرف تو صرف عاشق صادق کی قسمت میں لکھا ہے جب یہی ہونا ہے تو کیوں نہ مرگ کو شربت بنا کر اسطرح پیو کہ ایکبار تو رقیب کو بھی رشک ہو جاے یہ مومن کی وہ پرواز تخئیل ہے جسکے متعلق غلام ربانی صاحب عزیز کا خیال ہے کہ ان بلندیوں پر غالب ایسے سدرہ نشین کے پر جلنے لگتے ہیں -

پیہم سجود پاے صنم پر دم وداع مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

فارسی بندشوں سے شعر کو چیت کرنا مومن غالب اور اُن کے متبعین کا طرۂ امتیاز ہے - مومن کی خصوصیات میں عام طور پر سب سے مشہور خصوصیت تخلص کا نباہ ہے - اسمیں شک نہیں کہ مومن کا تخلص جو اُن کا نام بھی ہے اُن کے لئے بہت کچھ مفید ثابت ہوا - لیکن لفظ مومن کی معنوی خصوصیت کو نظر انداز کر دیجیۓ یا مومن کی جگہ کوئی دوسرا ہموزن تخلص رکھہ دیجیۓ اور پھر بھی اس مقطع کو دیکھیئے تو اس کی لطافت میں کوئی کمی نہ واقع ہوگی -

مومن کے اکثر مقطع آپ ایسے ہی پائیں گے - اگر لفظ مومن ہٹا بھی دیا جاے تو کوئی معنوی نقصان نہیں پیدا ہو سکتا - یہ خیال میرے نزدیک صحیح نہیں کہ مومن کا اپنے مقطعوں میں کامیاب ہونا صرف اس کے تخلص کی وجہ سے ہے - یہ درست ہے کہ لفظ مومن اختراع مضامین کے لئے ایک بہانہ ضرور ہو جاتا ہے لیکن جو معانی مومن پیدا کرتے ہیں وہ اُن کے تخلص کے لفظی رعایت سے بہت ارفع و اعلیٰ ہوتے ہیں -

یاں وصل ہے تلافیِ ہجراں میں الفلک　　　کیا سوجھتا ہے تازہ ستم انتقام کو

آسمان وصل کا بدلہ لینے کی فکر میں ہے - مومن کہتے ہیں بدلہ کس چیز کا لیگا یہ وصل سے ہجر کا تو خود بدلہ تھا -

یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی　　　نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

وصال یار میں یار کی جانگداز اداؤں نے ہجر اور وصل میں کم از کم مومن کے لئے کوئی فرق باقی نہ رکھا - مومن اپنے لئے وصل و ہجر کو بلحاظ نتیجہ یکساں سمجھتے ہیں - اُن کا بھی یہی فلسفہ ہے -

نہ کٹی ہم سے شب جدائی کی　　　کتنی ہی طاقت آزمائی کی

کہنا یہ تھا کہ شب ہجر میں ہم بچ نہ سکے لیکن انداز بیان نے اس پامال اور فرسودہ مضمون میں جان ڈالدی

امید مرگ یہ ہر فتنہ راحتِ جاں ہے　　　شب فراق میں کیا بیم روزگار مجھے

خوف مرگ کے بجاے امید مرگ پر زندگی بسر کرنیوالوں کے لئے اگر ہر فتنہ راحتِ جاں نہ ہوگا تو کیا ہوگا - غالب کا ایک مشہور شعر ہے -

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید　　　ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

غالب نے اس شعر میں جتنے معنی پیدا کئے ہیں مومن نے اس سے زیادہ ہی صرف "امید مرگ" کے ٹکڑے سے پیدا کر دئے ہیں - غالب کے ہاں دوسرا مصرع بالکل زائد ہے - چونکہ خیال میں وہ کوئی وسعت نہ پیدا کر سکے لہذا دوسرے مصرع میں پہلے مصرع سے جو خیال پیدا ہوتا ہے صرف اس کی تفسیر کرنے پر اکتفا کی پہلا مصرع دیکھئے - منحصر مرنے پہ ہو جسکی امید' جسکی امیدوں کا انحصار مرنے پر ہو ظاہر ہے کہ اسکی ناامیدی کیا ہوگی - لیکن دوسرا مصرع جو بدیہی ہے محض بیکار رہا اور وہ پہلے مصرع کو مطلق ترقی نہ دیسکا نہ اس کے معنی پر کوئی اضافہ کر سکا - اب مومن کے "امید مرگ" کے ٹکڑے کو لیجئے' دنیا اور اہل دنیا کے لئے بیم مرگ ہے مگر عاشق کے لئے' امید مرگ' مومن جسوقت شاہراہ عام سے علیحدہ ہوا ہے یعنی جسوقت بیم مرگ کے بجاے اس نے امید مرگ لکھا ہے وہیں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس شخص کی کیا حالت ہوگی جسکے لئے مرگ بیم کے بجائے امید ہو جاے - غالب نے دوسری ٹھوکر یہ کھائی ہے کہ اُن کی نظر متشائم PESSIMISTIC ہوکر رہگئی اور مومن نے وہی بات کہی ہے مگر انداز بیان متفاول OPTIMISTIC ہے غالب انتہاے ناامیدی کا نقشہ کھینچتے ہیں اور مومن کمال امیدواری کا منظر دکھاتے ہیں - تنقید کے اس جزو کو میں مومن کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں جس میں مومن کا پورا رنگ موجود ہے -

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کیلئے　　　سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لئے

زبان

مومن کے علوے تخئیل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اشعار میں تعقید پیدا ہوگئی - لیکن پھر بھی ایسے اشعار کی اُن کے کلیات میں کمی نہیں ہے جن کی زبان سے آج بھی ہم پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں - شاید مومن کے ایسے ہی اشعار کو دیکھ کر ایک ناقد نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اُن کی زبان ذوق سے بہتر ہے - بعض اشعار میں فارسی ترکیبوں نے بندش کو اسقدر چست کر دیا ہے کہ شعر کڑی کمان کا تیر معلوم ہوتا ہے - یہاں پر مومن کے

کچھ ایسے اشعار میں نقل کروں گا جنکی فصاحت اور سلاست مسلم ہے۔ بعض پوری پوری غزلیں زبان کی خوبیوں سے آراستہ ہیں۔

اُس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

سجدے کے تسلسل کے اظہار کے لئے 'سر کے بل' چلنے سے بہتر انداز بیان اختیار نہیں کیا جا سکتا۔

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری — چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

درد کو جان ثابت کر دیا، لیکن شعر میں سلاست زبان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جب درد ہی جان ہے تو ظاہر درماں جان ہی لیکر جائے گا۔

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے — آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

محاورہ ضرور باندھا ہے مگر استاذ ذوقؔ کی طرح شعر کو محض محاورے کی وجہ سے موزوں نہیں کیا ہے اس میں ایک معنویت ہے جو شعر سے جدا نہیں ہوتی جس کو جناب غلام زبانی صاحب عزیزؔ نے یوں ظاہر کیا ہے۔

آنکھ نہ لگنا شب بیداری کے معنوں میں آتا ہے اور آنکھ کا لگ جانا محبت کرنے کے معنی دیتا ہے دونوں محاوروں کے بیساختہ استعمال نے کتنا پرکیف مضمون پیدا کر دیا ہے۔

وقتِ وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوے — یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا

دم لینے کی طاقت ہے بیمار محبت میں — اتنا بھی غنیمت ہے مومن کا سنبھل جانا

سلاست زبان کے ساتھ تاثیر شعر سے دست وگریبان ہے۔

سینے پہ ہاتھ دھرتے ہی کچھ دم پہ بن گئی — لو جان کا عذاب ہوا دل کا تھامنا

اللہ رے ناتوانی جب شدتِ قلق میں — بالیں سے سر اُٹھایا دیوار تک نہ پہونچا

ہجر بتاں میں تجھکو ہے مومن تلاش زہر — غم پر حرام خوار توکل نہ ہو سکا

آپ کی کونسی بڑی عزت — میں اگر بزم میں ذلیل ہوا

رات دن بادۂ و صنم مومن — کچھ تو پرہیزگار ہونا تھا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ایک ایک ادا سو سو دیتی ہے جواب اُسکے — کیونکر لب قاصد سے پیغام ادا ہوتا

ہے یہ بندہ ہی بیوفا صاحب — غیر اور تم بھلے بھلا صاحب

کیوں اُلجھتے ہو جنبش لب سے — خیر ہے میں نے کیا کہا صاحب

مطلع کا طنزیہ انداز ملاحظہ ہو۔ دوسرے شعر میں زبان کو لئے ہوے کتنا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ اگر آپ نے کسی کو جنبش لب سے الجھتے دیکھا ہوگا تو یقیناً اس شعر سے محظوظ ہوں گے۔ میرے خیال میں اس حالت کے ظاہر کرنے کے لئے جنبش لب سے الجھنا بالکل نئی تعبیر ہے

کیوں لگے دینے خط آزادی　　　کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب
ستم آزار ظلم جور وجفا　　　جو کیا سو بھلا کیا صاحب
کس پہ بگڑے تھے کس پہ غصہ تھا　　　رات تم کس پہ تھے خفا صاحب
کس کو دیتے تھے گالیاں لاکھوں　　　کس کا شب ذکر خیر تھا صاحب
نام عشق بتاں نہ لو مومن　　　کیجئے بس خدا خدا صاحب

دیکھئے غزل کی غزل لطف زبان میں ڈوبی ہوئی ہے اور ایک طرح کا طنز ہے جو ساری غزل میں ساری ہے لیکن مومن نے محض لطف زبان کے لئے معنویت کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

اے روز حشر کچھ شب ہجراں بھی کم نہیں　　　بدنام ہو جہان میں تیری بلا عبث

اس شعر میں مومن نے شاعرانہ کمال کی انتہا کر دی ہے۔ مصرعۂ اولی پھر ملاحظہ ہو۔ اے روز حشر کچھ شب ہجراں بھی کم نہیں، شاعر نے یہ تو ضرور کہدیا شب ہجراں روز حشر سے کم نہیں لیکن یہ نہ بتایا کہ کس چیز میں۔ مصرع میں اسکا کہیں ذکر نہیں اور یہی شاعر کا کمال ہے کہ اس نے مقابلہ کسی ایک پہلو کو مخصوص کر کے محدود نہیں کر دیا ہے۔ بلکہ تعمیم سے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ بغیر اظہار مصرع سے یہ بات ثابت ہے کہ اے روز حشر شب ہجراں تجھ سے کم نہیں۔ لہذا بدنام ہو جہان میں تیری بلا عبث،

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں　　　کمبخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح
کیا دکھ دیکھے عشق میں کیا کیا نہ پائے داغ　　　زخموں پہ زخم جھیلے ہیں داغوں پہ کھائے داغ
جانے دے چارہ گر شب ہجراں میں مت بلا　　　وہ کیوں شریک ہوں مرے حال تباہ میں
بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا　　　مجھکو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

محبوب عاشق سے اپنی وفا جتانے کو کہتا ہے کہ میں نے تمہارے عدو کو بے جرم پائمال کیا مجھے تمہاری خاطر اتنا مدنظر تھی۔ اب عاشق کا جواب سنئے۔ بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا ۔ مجھکو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں ۔ تم نے عدو کو بے جرم پائمال کیا، کیا ہوگا ضرور کیا ہوگا۔ لیکن تمہارے سر کی قسم مجھے اسکا مطلق خیال نہیں۔ اللہ اکبر اب کہ عاشق کی بن آئی ہے عدو کو وہ اتنا حقیر سمجھ رہا ہے کہ اسکی پائمالی کو وہ کوئی اہمیت نہیں دے رہا؟ یہ صرف انداز بیان ہے جس نے اتنے بڑے مضمون کو دو مصرعوں میں نہایت صفائی کے ساتھ ادا کر دیا ہے

کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا　　　تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

عاشق اپنے محبوب سے جو ایک عرصے کے بعد اُس کے پاس آیا ہے شکوہ کرتا ہے کہ اب تم نے میرے یہاں آنا ہی بند کر دیا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کیا کروں مجبور ہوں اقربا طعنے دیتے ہیں تمھارے رقیب آوازے کستے ہیں آؤں تو کیونکر آؤں۔ عاشق یہ سنکر جواب دیتا ہے

کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا ۔۔۔ تیرا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

محتسب وہم ہے تو پہلے بھلا دیکھ مجھے ۔۔۔ نہ لنڈھا پی لے مے ناب زہر آب نہیں

مصرع آخری چار جملوں سے مرکب ہے میرا خیال ہے کہ اس بحر میں ایک مصرع میں چار سے زیادہ مربوط جملوں کا استعمال کرنا آسان کام نہیں۔ مومن کو زبان پر جو قدرت حاصل ہے اسکا یہ ایک اچھا نمونہ ہے۔

ہر ذرہ میری خاک کا برباد ہو چکا ۔۔۔ بس اے خرام ناز کہ تاب و تواں نہیں

مومن تم اور عشق بتاں اے بندہ پرور خیر ہے ۔۔۔ یہ ذکر اور منھ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن ۔۔۔ آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے ۔۔۔ وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے

تسلی دم واپسیں ہو چکی ۔۔۔ ہمیں ہو چکے جب تہی ہو چکی

مومن کی دلکش فارسی تراشوں اور نادر ترکیبوں کی تعریف آزاد کو بھی کرنا پڑی۔ مومن نے فارسی ترکیبوں سے کام لیکر کہیں شعر کی بندش کو چست کیا ہے کہیں ایک وسیع خیال فارسی کی نئی ترکیب سے ادا کیا ہے۔ چند مثالیں غالباً میرے اس خیال کو صحیح ثابت کرنے کیلئے کافی ہوں۔

گر وہاں بھی یہ خموشی اثر افغاں ہوگا ۔۔۔ حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

خموشی اثر افغاں۔ یعنی وہ فغاں جس کا اثر خموشی ہو۔

شبنم خراب جھروکتاں سینہ چاک ماہ ۔۔۔ لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں

دیکھئے فارسی ترکیبوں نے شعر کی بندش کو کتنا چست کر دیا ہے

چرخ و زمیں میں تو یہ کالمتاعیں سراغ ۔۔۔ ہنگامۂ بہار و ہجوم سحاب میں

اہل بازار محبت کا بھی کیا سودا ہے ۔۔۔ عشرت عمر ابد قیمت غم دیتے ہیں

سجدہ نہ کعبیں کرتا مومن قدم بت پر ۔۔۔ کعبے ہی میں ہوتی ہے بیہودہ سری اتنی

بیہودہ سری کی کیسی پیاری ترکیب مومن نے اختراع کی ہے۔

بیمار اجل چارہ کو گر حضرت عیسیٰ ۔۔۔ اچھا بھی کرینگے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

بیمار اجل چارہ کی ترکیب جسقدر وسیع مفہوم کو ظاہر کرتی ہے وہ ارباب ذوق سے پوشیدہ نہیں - مثنوی - قصائد - اور غزل میں مومن نے بہت سی نئی ترکیبیں ایجاد کی ہیں - مثلاً - خموشی اثر - اجل چارہ - آشوب گاہ حشر غم - جراحت زار - آمین سرا - زبان اجابت - بیہودہ سعی دم خونابہ ریز - حادثہ ریز - زخم ریز - تیر بار - رند خمکدہ کش - گرم پائی برق تپاں' زبان بیہودہ سائل - گلریز تکلم - بے پروا خرامی - حسرت فرماں روا - بخت بخواب آسودہ - عقوبت ربا - قدم فرسا - خواب تمنا یاب - عشق جبلت - زبوں اضطراب مصیبت بہرہ - قبول شوق دشواری پسند' - رقیب آفرینیاں - میکدہ آشام - آہوے نیم خواب - جان نغمہ راز - نالہ رخنہ سازنہ - اثر اہتمام چشم ستارہ باز شوق ہرزہ کار وغیرہ - مثالیں طوالت کے اندیشہ سے نظرانداز کی جاتی ہیں -

تشبیہات واستعارات | یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر کے زور طبیعت کا پتہ چلتا ہے -

کیا کیا شکن دیے ہیں دل زار کو مگر   اس کے خیال میں ورق انتخاب تھا

بالکل اچھوتی تشبیہ ہے - لفظ شکن سے کیا کیا فائدے اوٹھائے - اور دل زار کو شکن دینے کی کیا پیاری توجیہ کی ہے - ورق انتخاب کو عموماً موڑ دیا جاتا ہے - مومن کا دل اس بنا پر دکھایا جاتا ہے کہ وہ محبوب کی نظروں میں چڑھا ہوا ہے -

کس کی زلفوں کا دھیان تھا کہ میں شب   محو دود چراغ خانہ رہا

زلف کو دود چراغ کہنا کئی حیثیتوں سے پرلطف ہے - مشبہ بہ اور مشبہ میں ایک وجہ شبہ حرکت ہے - دوسری سیاہی - اور تیسری پریشانی پھر لطف یہ ہے دود چراغ کی ترکیب فوراً خیال کو چراغ کی لو کی طرف لیجاتی جس کے مقابل یہاں محبوب کا چہرہ ہے

آتش آہ بے اثر سے میرے   آسماں گلشن خلیل ہوا

تشبیہ کی جدت قابل داد ہے - آسمان کو کس خوبصورتی کے ساتھ گلشن خلیل ثابت کیا ہے

مو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن   نیند آتی ہے بآرام دگر آخر شب

واں تو ہے زرد پوش یہاں میں ہوں زرد رنگ   واں تیرے گھر بسنت ہے یاں میرے گھر بسنت

لیکن تیری بسنت مستعار ہے اور میری بسنت اصلی ہے -

داغ جدائی در دنداں وروے وزلف   ہے اشک شمع شعلۂ شمع دخان شمع

کتنی مسلسل تشبیہ ہے -

ربط اُس سے ہے مثل شعلہ و شمع   مر جاوں گر ایک دم جدا ہوں

اس تمثیل سے کس نئے انداز سے یہ خیال ادا کیا ہے - کہ وصل میں جلنا قسمت میں لکھا ہے - اور ہجر میں مرنا -

واعظ کے ذکر مہر قیامت کو کیا کہوں   عالم شب وصال کی آنکھوں میں چھا گئے

محبوب کے روے انور کی تابش کو کس لطف سے بیان کیا ہے

محاکات | کسی چیز یا حالت کی تعریف اس طرح بیان کرنا کہ اس شے کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاے - محاکات کہلاتی ہے - مثال رقیب کی رقابت - غم عشق وعدۂ وصال - امید و فا وغیرہ سیکڑوں قسم کے واقعات ہیں - جو عاشق کو عشق میں پیش آتی ہیں - ان واردات کو شعر میں بیان کرنا کہ سننے والے کے دل میں وہی جذبات موجزن ہونے لگیں - شاعری کا بہت بڑا کارنامہ ہے' ورنہ رقابت' شب ہجراں کی مصیبت' عشق کی جانکاہی وعدۂ وصل میں انتظار وغیرہ فی نفسہ کوئی ایسے واقعات نہیں جو کسی کو پیش نہ آتے ہوں - اس لئے ایک ہی چیز کا وقوع اتنا عام ہو' اسمیں کوئی جاذبیت نہیں پیدا ہوسکتی - مگر شاعر اپنے جوش بیان اور طرز ادا سے اسے اسقدر لطیف اور پرکیف بنا دیتا ہے کہ اس کا لطف کئی گنا زیادہ ہوجاتا ہے سننے والے سنتے اور سر دھنتے ہیں جسقدر شاعری کی تخئیل زبردست ہوگی - اسی قدر اس کی شاعری کیف بار اور نشہ آور ہوگی" محاکات کی مثالیں مومن کے کلام سے پیش کرنے سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ اگر محاکات اور تخئیل میں کوئی فرق ہے تو اسے واضح کردیا جاے - صاحب مراۃ الشعر کی راے ہے کہ شعر کی ایسی تقسیم نہیں کیجا سکتی کہ وہ حکائی ہو اور تخئیلی نہ ہو یا تخئیلی ہو حکائی نہ ہو - غرض یہ ہے کہ محاکات کو ہم تخئیل سے الگ نہیں کرسکتے شعر بہرحال تصویر معنوی ہے - میری راے میں محاکات کی دو قسمیں کرنی چاہئیں ایک محاکات تصویری اور دوسرے محاکات تخئیلی ہے - ظاہر ہے کہ محاکات تصویری میں صوری پہلو غالب ہوگا اور محاکات تخئیلی میں خیالی پہلو - اب مثالیں ملاحظہ ہوں -

لگ ہچکی ہے سر زانوے غم پر ہے کہ یاد آیا — کسی کا ہاتھ ہردم مارنا زانو پہ قہ قہ کر

کسی کو زانو پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوے کس نے نہ دیکھا ہوگا - یہاں بھی تشبیہ کا تسلسل دیکھئے ادھر وہ زانو پر ہاتھ مارتے ہیں یہاں زانوے غم پہ سر ہے وہاں قہ قہ ہے یہاں ہچکی بند ہی ہوئی ہے

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم — منھ دیکھ دیکھ کے روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

مومن نے بیکسی کی کتنی مکمل تصویر کھینچی ہے -

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم — تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم
اگر نہ ہاتھ میں اس دلربا کے دل دیتے — تو دل پہ ہاتھ سدا دھر لیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دام میں زلفِ سیہ کے آجاتے — تو یوں خراب و پریشاں رہا نہ کرتے ہم
اگر نہ لگتی چپ اس بدگماں کی شوخی سے — تو بات بات میں مضطر رہا نہ کرتے ہم
نہ جاتے اس بتِ ہرجائی کی گلی میں اگر — تو دوڑ دوڑ کے قلق سے پھرا کئے تے ہم
ہں آفت دل و جاں یا اگر نہ مرجاتے — تو اپنے مرنے کی ہردم دعا نہ کرتے ہم

نہ بھرتے دم جو کسی شعلہ رو کی خواہش کا — تو ٹھنڈی سانس ہمیشہ بھرا کرتے ہم
اگر نہ آنکھ تغافل شعار سے لگتی — تو بیٹھے بیٹھے یونہی چونک اٹھا کرتے ہم
نہ ہوش کھوتے اگر اس پری کی باتوں پر — تو آپ ہی آپ یہ باتیں کیا کرتے ہم
اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھا جاتا — تو بات بات میں یوں رو دیا کرتے ہم
اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ — تو ایک ایک کی صورت تکا کرتے ہم
جو غم بتوں کا نہ ہوتا تری طرح مومن — تو دیکھ چرخ کو ہے ہے خدا کرتے ہم

غزل کے دوسرے مصرعوں میں جو نقشہ کھینچا گیا وہ کس دلدادۂ آشفتہ حال پر صادق نہ آئے گا راہ عشق میں جن جن منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے انکا کماحقہ بیان اور کیا ہو سکتا ہے۔

کس کی خبر اب آنے کی کس لئے ہے یہ بیتابی — کس لئے ہیں ہم ہر دم بھرتے آتے ہیں اور جاتے ہیں

شب وعدہ اپنی بیقراری کا کتنا موثر اور صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ کسی کے انتظار میں بیتابی کا اس طرح مظاہرہ بالکل فطری ہے۔

دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں — کیا کہیں عاشق ہوئے یا ہو گیا سودا ہمیں

عاشق کی کتنی حسرت بھری تصویر کھینچی گئی ہے۔ "دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں"

اپنی آواز قدم سے بھی وہ ڈر کر رات کو — مڑ کے پیچھے دیکھ لے تھا ہر قدم پر آپ کو

شاعری بہر حال معنوی مصوری ہے، رات ہے۔ بہت ممکن ہے اندھیری ہو۔ وہ کہیں جانے کے لئے چھپ کر گھر سے نکلے ہیں قدم قدم پر خوف دامن گیر ہے کہ کہیں کوئی دیکھتا نہ ہو، تنہائی ہے۔ اپنی آواز قدم سے بھی دوسروں کے پیروں کی آواز سنائی دیتی ہے اس تمام منظر کا ہو بہو نقشہ مومن نے اس شعر میں کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دمبدم — گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اس ایک شعر میں پوری حدیث شوق موجود ہے۔ آغاز محبت سے لیکر انجام محبت تک کی ساری سرگذشت اس ایک شعر میں رکھدی گئی ہے۔ آغاز عشق کی سرگذشت سنئے۔ راز عشق افشا ہو چکا ہے۔ وہ چھپنے لگے ہیں بلکہ چھپائے جانے لگے ہیں اگر کبھی حسن اتفاق سے ملاقات ہو گئی تو پیشتر اسکے کہ عاشق اس کی شکایت کرے کہ اب تو آپ نے اپنی صورت دکھانا بھی چھوڑ دیا ہے وہ ملتے ہی بول اٹھتے ہیں ہم مجبور تھے تم سے نہ مل سکے کیا کریں اور ملامت کرتے ہیں۔ گھر گھر ہماری محبت کا چرچا رہتا ہے مطلب اس کہنے سے یہ ہوتا ہے کہ ہماری وفا اور محبت میں فرق نہیں آیا ہے عزیزوں کی ملامت سے جان مصیبت میں ہے ہمیں خود تم سے جلد جلد نہ ملنے کا افسوس ہے۔ اب انجام محبت کا بھی حال سن لیجئے۔ یا ایک وہ زمانہ تھا کہ اتفاقیہ ملاقات میں محض اظہار وفا کے لئے تم ملامت اقربا کا ہم سے گلا کرتے تھے یا اب وہ دن آگیا ہے کہ اب مجھے اس میں بھی شک ہے کہ

آیا تمھیں یہ باتیں یاد بھی ہیں یا نہیں ساری غزل کی غزل حالیہ ہے سادگی اصلیت تاثیر اور تسلسل بیان ایکبار عہد الفت کے بھولے ہوئے افسانے کی یاد کم از کم ضرور تازہ کر سکتا ہے۔ اسی غزل کے چند شعر اور ملاحظہ ہوں۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے اب گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ ہے سرگذشت بلاکشان محبت۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مصور کا قلم رک جاتا ہے اور شاعر کی دنیا شروع ہوتی ہے۔

گلہ ہرزہ گردی کا بیجا نہ تھا کچھ
وہ کیوں مسکرائے بجا کہنے کہتے

میں نے ہرزہ گردی کا جب شکوہ کیا تو انھوں نے مسکرا کر فرمایا جی ہاں بجا ہے۔ یہ بجا کا طنزیہ استعمال ہے اور اسپر تبسم اور بھی قیامت ہوگیا یہاں مومن کی قوت مشاہدہ اور قوت بیانیہ کو دیکھئے۔ آپ نے بھی دیکھا کہ آپ نے جائز شکایت کی اور وہ بجا ہے کہ کر ٹال دی گئی۔ بجا ہے کے متعدد پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تو اس طرز اقرار میں اقرار کی ندامت نہیں باقی رہتی دوسرے انکار کا بھی پہلو نکلتا ہے تیسرا قوی پہلو طنز یہ ہے مومن نے قیامت یہ کی ہے کہ اسپر مسکراہٹ بھی زیادہ کردی یہاں سے اس دنیا کی سرحد شروع ہوتی ہے جہاں سے مومن نے دنیا سے الگ ہو کر اپنی دنیا بسائی ہے اور اسی بساط پر مومن کوس لمن الملکی بجاتے ہیں۔

خصوصیات مومن

مومن کے کلام میں ایک مخصوص وصف ہے جسمیں کوئی استاد ان سے بہتر تو درکنار ان کے برابر بھی نہ ہو سکا وہ یہ کہ مومن اپنے مطلب کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ مخاطب اس میں اپنا فائدہ تصور کرتا ہے مثلاً یہ کہنا ہے کہ دشمن کی طرف نہ دیکھو تو اس کےلئے یہ انداز اختیار کرتے ہیں :-

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

اب بخیال دوستی دشمن محبوب مجبور ہے کہ وہ غیر کی طرف نہ دیکھے۔ محبوب پر ثابت کیا ہے کہ تمھارے نہ دیکھنے سے دشمن کا فایدہ ہے اور فایدہ اپنا متصور ہے :-

سرگیں آنکھوں سے تم نا نہ لگانے کیوں ہو
خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

محبوب کو اور کس طرح رقیب کے خط کی تکریم کرنے سے روکا جاسکتا ہے۔

منظور ہو تو وصل سے بڑھکر ستم نہیں
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجران کا غم نہیں

یوں کہنے سے کون سنتا ہے کہ آئے مجھ سے مل جائے۔ لہذا یہ کہا کہ ہجر کے صدمے اٹھاتے اٹھاتے عادت سی پڑگئی ہے۔ تم ستمگر ہو میں تمھیں صلاح نیک دیتا ہوں اب تو تم مجھ پر صرف یوں ہی ستم کر سکتے ہو کہ کبھی آن کر مل جاؤ لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ شعر محض شوخی ادا کا

کارنامہ نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مومن نے ہجر میں اتنے دن کاٹے ہیں کہ وہ عادت ثانیہ بن گئی ہے اور ہجر کے نشتر میں وہ خلش نہیں رہ گئی اگر تم ستم ہی کے خوگر ہو تو ایسی حالت میں وصل سے بڑھکر اور کیا ستم ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی تمھاری پسند پر موقوف ہے۔ منظور ہو تو وصل سے بڑھکر ستم نہیں، ورنہ میں تو وصل ہجر کے جھگڑے دل سے دور نکل گیا ہوں

خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ　　دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

گویا مومن خاں محبوب کو جور و جفا سے باز آنے کی صلاح دیکر خود اسی پر احسان کر رہے ہیں۔ دیکھئے محبوب سے کہنے اور استدعا کرنے کا کتنا لطیف انداز بیان اختیار کیا ہے۔ دبی زبان سے شکوہ جور بھی کرتے جاتے ہیں کہیں کہیں اس داستان کے پردے میں عرض وفا کے بھی افسانے سنائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ تقاضاے کرم بھی کرتے جاتے ہیں۔ سب کچھ کہتے جاتے ہیں مگر فایدہ اسی دشمن جاں کا مد نظر ہے شعر ایکبار پھر پڑھ لیجئے:-

خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ　　دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

بہت ستا چکے خدارا اتنا نہ ستاؤ کہ میرے دل میں مرنے کی آرزو پیدا ہو جائے۔ جفا سے باز آؤ ورنہ نتیجہ یہ ہونا ہے کہ جس دل میں اب تک تمھاری آرزو بسی ہوئی ہے اسی دل میں موت کی آرزو بھی ہوگی جسے میں نہیں دیکھ سکتا شعر کا بلند پہلو یہ ہے کہ جور و ستم کی عاشق شکایت ضرور کرتا ہے لیکن نہ اس لئے کہ اُسے تکلیف ہوتی ہے بلکہ صرف اس خوف سے کہ کہیں دل میں دوسری آرزو (موت) کی نہ پیدا ہو جائے۔ یعنی شعر کا ایک سطحی پہلو تو یہی ہے کہ مومن اپنا فایدہ چاہتا ہے لیکن اس کے حصول کی صرف یہی صورت ہے کہ جس سے وہ اپنا فائدہ چاہتا ہے اُس کو کوئی ایسا پہلو دکھائی دے جس میں اُسکا فایدہ نکلتا ہو۔ لیکن یہ خود غرضی ہے اور دنیائے عاشقی میں جائز نہیں۔ بلند معیار عاشقی یہ ہے کہ اپنی جان جاتی ہے تو جائے لیکن دل میں غیر کا خیال نہ آنے پائے۔ مومن نے اس پہلو کو ترک نہیں کیا ہے۔
بہت تم نے ستایا، شوق سے ستاؤ، لیکن اتنا نہیں کہ موت کی تمنا بھی دل میں پیدا ہو جائے۔ شکوۂ جور، تقاضائے کرم، عرض وفا، ایک سانس میں مومن ساری داستان عشق ختم کر گئے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

بزم میں اگر آپ نے سب کی طرف دیکھا اور صرف مجھ سے تجاہل برتا تو لامحالہ اغیار یہی نتیجہ نکالیں گے کہ آپ کو مجھ سے کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہے، بہتر یہی ہے کہ میری طرف بھی اک نگاہ غلط انداز ڈال لیجئے:-

شعلۂ دل کو ناز تابش ہے　　اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

یہ بلند پروازی تنہا مومن کے حصے میں آئی تھی۔ بقول میرے ایک دوست کے جب میں اس شعر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو کثرت معنی سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے، اور گھبرا کر شعر بھول جانے کی ناکام کوشش کرتا ہوں۔ ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی

اور آتش ہجر نے دل و جگر کو پھونک رکھا ہے۔ عاشق محبوب کے مزاج سے واقف ہے اسے معلوم ہے کہ محبوب کو دعویٰ یکتائی ہے۔ دیکھئے ملاقات کی کیا پیاری صورت نکالی ہے کہتا ہے شعلۂ دل کو اپنی تابش پر ناز ہو چلا ہے خدارا آؤ اور اپنا جلوہ تو دکھا جاؤ یہ تو ہی مومن کا مخصوص انداز بیان ہے۔ اب ذرا شعر کی وسعت پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ کہتا ہے جو آگ تم نے لگائی تھی وہی آج بلند ہو ہو کر تمھاری تجلی پر چشمک زنی کر رہی ہے تمھارے ہجر میں بھی وہ اثر ہے کہ وہ شعلۂ دل میں اتنی تابش پیدا کر سکتا ہے

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

محبوب جب کبھی اغیار کو دزدیدہ نظر سے دیکھتا ہے تو عاشق کو تکلیف ہوتی ہے مگر یہ تکلیف دور کیونکر ہو عاشق کو یہ تدبیر سوجھی کہتا ہے آپ اگر راز عشق کو ظاہر ہی کرنے پر تلے ہیں تو محفل اغیار کو دزدیدہ نظر سے دیکھئے اور ضرور دیکھئے

شام سے تا صبح مضطر صبح سے تا شام ہم ایک عالم میں ہیں کیوں لاگردش ایام ہم

کیوں اسے گردش ایام کیا اسی کا نام گردش ہے کہ ہم ابتک اسی عالم اضطراب میں ہیں

لذت جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا طعنے کیا کیا دے ارباب ستم دیتے ہیں

یعنی اب مجھ پر ستم کرنے کی صرف یہی ایک صورت رہگئی ہے کہ وہ ترک ستم کرے۔

گر ذکر وفا سے یہی غصہ ہے تو اب سے گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کریں گے

تقاضا نہ کرنے کے لئے صرف وعدۂ قتل کو تجویز کیا ہے۔ اپنا مطلب ہر حال میں حاصل ہے۔

میرے سینے پر قدم زور سے مت رکھ اے ظالم ہاں نہ چبھ جائیں کف پا میں کہیں دل کے خار

اس شعر کی بندش بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں مومن کا کمال فن اپنے منتہائے کمال تک پہونچ گیا ہے پہلا مصرع ہے میرے سینے پہ قدم زور سے مت رکھ ظالم کیونکہ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اس شعر کی تحلیل نفسی کیجئے ممکن ہے اس کے بعد مومن کے کمال کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ موقعہ یہ ہے کہ عاشق محبوب کو جور و جفا سے باز رکھنا چاہتا ہے جس کی صرف ایک صورت اس کے ذہن میں آتی ہے یعنی یہ کہ کوئی ایسی تدبیر نکالے جس میں بظاہر یا حقیقتاً محبوب کا فائدہ بھی مد نظر رہے اب اس تعمیم کو تخصیص سے بدل دیجئے اور صورت حال یہ پیش نظر رکھئے کہ عاشق کے سینے پر محبوب کا قدم ہے اور اسے تکلیف ہو رہی ہے۔ لہذا یہ ضروری ہو گیا کہ کوئی تدبیر ایسی کیجائے جس سے یہ تکلیف رفع ہو سکے۔ عاشق نے سوچا کہ اگر یہ کہا جائے کہ میرے سینے پر قدم زور سے مت رکھو تو وہ کیوں ماننے لگا لہذا یہ کہا جائے کہ اگر تم نے میرے سینے پر زور سے قدم رکھا تو ڈر ہے کہ میرے دل کے خار تیرے پائے نازک میں چبھ نہ جائیں۔ چونکہ یہ موثر صورت تھی اس نے یہی آخری صورت اختیار کرنے کا ارادہ کیا موقعہ کی نزاکت کا یہ خیال ہے کہ سینہ پاؤں کے نیچے دبا ہوا ہے کہنا چاہتا ہے کہ میرے سینے پر زور سے قدم مت رکھ ورنہ خوف ہے کہ میرے دل کے خار تیرے کف پا میں چبھ جائیں۔ ظاہر ہے کہ دوسری صورت محض مقصد براری کے لئے نکالی گئی ہے گھبراہٹ میں عاشق

اپنی بجائے سوچی ہوئی تدبیر پر عمل کرنے کے بجائے صاف کہ جاتا ہے کہ میرے سینے پہ قدم زور سے مت رکھ ظالم لیکن فوراً اسے احساس ہوتا ہے کہ میں کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہ گیا فوراً دہیں سے بات بدلتا ہے" ہاں نہ چبھ جائیں کہیں پا میں کہیں دل کے خار؛ ہاں، کا لفظ اسبات کو ظاہر کرتا ہے کہ عاشق نے (دفعتہً اپنی بات بدلی ہے) انسان جھوٹ بولنا چاہتا ہے لیکن بعض اوقات گھبرا کر سچ بول دیتا ہے اور جب اسے احساس ہوتا ہے کہ میں کیا کہ گیا وہیں سے بات بدلنا چاہتا ہے۔ اور ایسی ہی صورتیں اختیار کرتا ہے یہ صرف مومن کا کمال ہے کہ اُس نے تمام واردات کو ایک شعر میں پوری طرح ظاہر کر دیا ہے۔

طنز ادبیات میں طنز نے ایک نمایاں حصہ لیا ہے۔ انگریزی ادبیات میں (Steele) اسٹیل اور (Swift) سوفٹ اپنی طنزیہ طرز تحریر کی بابتہ بہت مشہور ہیں طنزیہ پیرایہ میں بیان کے لئے ایک خاص طور کی ذہنیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ طنز ہجو سے مختلف اور بلند ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ ایک ہجوگو طنزیہ شاعری بھی کر سکے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ہاجی طنزگو ہو ہی نہیں سکتا۔ طنز نہایت بلند چیز ہے۔ ہاجی کی پرواز تخیل وہاں تک پہونچ نہیں سکتی نثر میں طنزیہ پیرایۂ بیاں اختیار کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا نظم میں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نثر کی تحریروں میں کبھی کبھی بعض مصنفین کے یہاں طنزیہ رنگ جھلک جاتا ہے لیکن نظم میں بہت کم شاعر اتنا لطیف مذاق فطرت کی طرف سے لیکر آئے ہیں جو طنزیہ شاعری کر سکیں۔ ہجوگو شاعر بہت گذرے ہر زبان میں گذرے لیکن کلام میں طنز نہ پیدا ہو سکا۔ جہاں تک تاثیر کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ طنز وہ نشتر ہے جو رگ جاں پر کارگر ہوتا ہے طنز میں نزاکت ہے اور ہجو میں سخافت۔ خصوصیات مومن میں طنزیہ شاعری بھی ہے یہ بات کسی شاعر کو کم نصیب ہوتی ہے۔ مومن کی لطافت مذاق کا یہ عالم ہے کہ وہ طنزگو ہیں لیکن ہجوگو نہیں۔ میرے ایک محترم دوست نے طنزیات میں پھبتی۔ چلی کٹی آوازے وغیرہ کو بھی شمار کیا ہے ممکن ہے یہ تقسیم غلط نہ ہو لیکن مجھے تو طنز کے مقابل میں ان سب چیزوں میں سخافت کی بو آتی ہے ان کا شمار طنزیات کے بجائے ہجویات میں زیادہ کامیابی کے ساتھ ہو سکتا ہے اور طنز کو میں ہجو سے بالکل علحدہ چیز سمجھتا ہوں بہرحال میرے دوست نے طنزیات میں طعن، آوازہ، تشنیع، استہزا، پھبتی، زجر و توبیخ، ملامت، ہجو، بولی ٹھولی، شکوہ شکایت، نوک جھونک، رمز و کنایہ، جلی کٹی، واسوخت سب کچھ داخل کیا ہے۔ اردو شاعری میں مومن سے پہلے طنز پایا نہیں جاتا۔ اکبر مرحوم کے کلام میں طنز کا کہیں کہیں ہلکا سا رنگ ضرور موجود ہے مگر چونکہ اکبر مرحوم کی شاعری یکسر سطحی شاعری ہے لہذا ان کے طنزیہ کلام میں وہ نشتریت نہ پیدا ہو سکی جو مومن کا طرۂ امتیاز ہے۔ میں ذیل میں مومن کی طنزیہ شاعری کو چند مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

کس دن تھی اُسکے دلمیں محبت جواب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

طنزیہ کلام کو سمجھنے میں عموماً پہلی غلطی یہ ہوتی ہے کہ متکلم کے بارے میں ہمارا پہلا خیال یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہ رہا ہے صحیح نہیں ہے یعنی الفاظ کا مفہوم کچھ اور ہے اور مدعا کچھ اور مثلاً شاعر کہتا ہے۔

سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا: ظاہر ہے کہ ان کہنے سے وہ یہ مفہوم لے رہا ہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ تو عدو سے بے سبب خفا ہوا، لیکن طنز کا سطحی پہلو ہے۔ اب ذرا غور کیجئے کہ اگر شاعر جو کہہ رہا ہے اُس کو محسوس بھی کر رہا ہے اور اس سے وہی مطلب لیتا ہو جو کہہ رہا ہے نہ کہ اس کا برعکس تو اس کے کلام کے طنز کا کیا ٹھکانا۔ میں دوسری مثال سے اپنے مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا (Swift) کے نام سے کم انگریزی داں حضرات ہوں گے جو ناواقف ہوں گے جس ماحول میں اس کی زندگی بسر ہوئی اس کا تقاضا تھا کہ وہ طنز مجسم ہو کر رہ جائے ملک میں قحط و افلاس کا دور دورہ ہے بڑھے بچے جوان فاقے کے ہاتھوں مر رہے ہیں سلطنت اس پریشانی کو دور کرنے کی ہر طرح ساعی ہے۔ لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی سونفٹ کی زندگی ان ایام میں بھی جب خوشحال تھا تنگدستی کے ساتھ بسر ہو رہی تھی اب کہ ملک میں قیامت برپا تھی اس کا کون پرسان حال تھا۔ سلطنت کی تدابیر جب اس صورت حال کو بدلنے میں ناکامیاب رہی تو سونفٹ نے بھی تنگ آکر ایک قیامت خیز تجویز پیش کی اور اس کا عنوان (a modest proposal) تجویز کیا تجویز میں کیا تھا۔ آپ سننے کی تاب نہ لاسکیں گے اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ غریب والدین کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو حلال کر دیا جائے اس کی رائے تھی کہ ان کی رانوں کا کباب نہایت عمدہ ہوگا۔ سینہ تورخے کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس تجویز کا فایدہ یہ دکھایا تھا کہ ان بچوں کو حلال کرنے سے ان کے والدین کو ایک بڑی مصیبت اور فکر سے نجات مل جائیگی یہ لڑکے جو غذا کھاتے وہ بچ جائیگی۔ اور خود ان لڑکوں کا گوشت امیروں کی دسترخوان کی رونق ہوگا۔ یعنی اس تجویز پر عمل کرنے سے ایک تو ملک کی کافی غذا بچ جائیگی اور دوسرے انکا گوشت خود غذا کا کام دے گا۔ اس تجویز کے طنزیہ پہلو کو نظر انداز کیجئے اور غور کیجئے کہ ایک شخص دنیا کا ستایا ہوا زندگی کی آسائشوں سے محروم جلے ہوئے مگر صدق دل سے یہ تجویز پیش کرتا ہے تو کیا آپ اُسے محض طنز کہکر نظر انداز کر دیں گے جن لوگوں نے سونفٹ کی زندگی پر بامعان نظر ڈالی ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ سونفٹ کی یہ تجویز مذاق نہ تھی بلکہ وہ دراصل اسے محسوس کرتا تھا کہ یہی ایک حل اس مشکل کا ممکن ہے اب اپنے شاعروں کو دیکھئے جو دن رات جو آسمان اور معشوق کا گلہ کرتے رہتے ہیں اگر وہ سچے دل سے گلہ کرتے ہیں تو وہ طنز نہیں بول سکتے جو صداقت سے خالی ہو۔ مومن نے دنیائے عشق و محبت میں جو مصیبتیں جھیلی ہیں جنکا نقشہ ہمیں انکی آپ بیتی مثنویوں میں نظر آتا ہے کم از کم مجھے تو ضرور مجبور کرتا ہے کہ میں اُن کے طنزیہ کلام کو محض طعن و تشنیع کہکر ٹال نہ دوں بلکہ اس تلخ حقیقت پر غور کروں جو ان طنزیہ اشعار کے لفظ لفظ میں ساری ہے۔ شعر کے دوسرے مصرعے میں مومن نے محبوب کے بیان کو بلا اضافۂ الفاظ دہرایا ہے۔ سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا یہ سچ اگر جھوٹ ہو جائے تو یقیناً اسمیں وہ طنز باقی نہ رہیگا جو سچ ہونے کی حالت میں موجود ہے۔

ہے یہ بندہ ہی بیوفا صاحب　　غیر اور تم بھلے بھلا صاحب

طعن، آوازہ، تشنیع، استہزا، پھبتی، زجر و توبیخ، ملامت، ہجو، بولی ٹھولی، شکوہ و شکایت، نوک جھونک، حرف و کنایہ، جلی کٹی، وغیرہ اور طنز میں یہی فرق ہے کہ ان سب اصناف سخن کے یہ دو پہلو نہیں نکلتے۔ اسی شعر کو لے لیجیے "ہے یہ بندہ ہی بیوفا صاحب" ایک تو اسکے

عام معنی ہوئے کہ بیوفا کہ کر اپنی وفاشعاری پر زور دیا جارہا ہے۔

لیکن اگر اسی کو سچ سمجھ لیجئے کہ "ہے یہ بندہ ہی بیوفا صاحب" اور اس مصرعے کی کوئی تاویل نہ کیجئے پھر اس کے بعد مومن کی ذہنیت کا تجزیہ کیجئے اس وقت آپ پر روشن ہوگا کہ اس شعر میں کتنے تیر و نشتر پوشیدہ ہیں جو شخص یہ کہ سکے کہ "ہے یہ بندہ ہی بیوفا صاحب۔ غیر اور تم بھلے بھلا صاحب" وہ کس دنیا کا رہنے والا ہوگا۔ طنزیہ شاعری میں قدم قدم پر مومن کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔

آپ مجھ سے نباہیں گے سچ ہے　　باوفا حسن و بیوفا ہے عشق

سچ ہے میں نباہ کر سکا عشق ہی بیوفا ہے۔ اس ناکامیابی کا احساس کس کامیابی سے کم ہے جو اس تاویل کی ضرورت محسوس ہو کہ شعر طنزیہ ہے اور سیدھے سادے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کیا نباہیں گے حسن کیا باوفا ہوگا۔ شعر طنزیہ ضرور ہے لیکن طنز سطحی چیز نہیں۔ اقرار ناکامیابی کافی ہے کہ بیوفا عشق کو باوفا حسن پر ترجیح دلادے

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی　　پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

سخت جانی کو طعنہ دیتا ہے کہ تیری بدولت روز مجھ پر خنجر ٹوٹتے ہیں لیکن کس انداز سے کہ اگر خنجر ٹوٹ گیا تو کوئی گلے لگانے کے قابل بھی تو نہ ملیگا۔ یہ ایک لطیف طنزیہ انداز ہے جو مومن پر ختم ہے

سیدھے ہیں ہم صیاد کے کہتا ہے کس کس لطف سے　　گر ہو سکے راہ چمن ای رستگان دام لو

جب صیاد کو معلوم ہو چکا کہ ہم گرفتار دام نہیں ہیں بلکہ گرفتار صیاد ہیں تو کتنا لطف لے لے کر کہتا ہے "اگر ہو سکے راہ چمن اے رستگان دام لو" صیاد نے کتنا طنزیہ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے لیکن گرفتار کو مجبوراً یہ زہر کا گھونٹ بھی پینا پڑتا ہے۔

کر علاج جوشش وحشت چارہ گر　　لادے اک جنگل مجھے بازار سے

اس شعر میں مومن نے طنز کا کمال دکھا دیا ہے۔ ہاں اے چارہ گر اگر تو جوش وحشت کا علاج کرتا ہے تو پہلے یہ بتا کہ تو بازار سے جنگل بھی لا سکتا ہے یا نہیں، مومن کا خیال ہے اور صحیح خیال ہے کہ جو لوگ جوش وحشت کا علاج کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا بازار سے جنگل خریدنا چاہتے ہیں، جوش وحشت کا علاج تو یونہی ممکن ہے کہ وحشیوں کے لئے جنگل مہیا کیا جائے۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ بازار سے جنگل لانا کیا معنی نست پوچھئے جوش وحشت کے علاج کے کیا معنی۔

میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو　　کہیں دامان تر نہ ہو جائے

یقیناً میرے آنسو پونچھنے سے ان کا دامن تر ہو جائیگا لیکن اس نشتر کو دیکھئے جو اس شعر کے لفظ لفظ میں پوشیدہ ہے میں رو رہا ہوں وہ دیکھ رہے ہیں اتنا نہیں ہوتا کہ اپنے دامن سے میرے آنسو پونچھکر مجھے تسلی دیں۔ وہ میرے آنسو پونچھنا گناہ سمجھتے ہیں شعر کا مختصر الفاظ میں مطلب یہ ہوا کہ دیکھئے دیکھئے میرے آنسو نہ پونچھئے گا کہیں آپ گنا ہگار نہ ہو جائیں۔ کہیں دامان تر نہ ہو جائے

ہنسو نہ تم تو میرے حال پر میں ہوں وہ ذلیل ۔۔۔ کہ میری ذلت و خواری سے تم کو شان لگی

دنیا مجھ پر ہنستی ہے ہنسے لیکن تمھیں میری ذلت پر ہنسنے کا کوئی حق نہیں میری ذلت و خواری نے تمھاری شان بڑھائی۔ اس شخص کی زندگی پر ذرا غور کیجئے جو یہ کہنے پر مجبور ہو جائے۔ ایسے ہی حالات انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ طنز مجسم ہو جائے۔

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے ۔۔۔ میں نے ہی تم سے بیوفائی کی

یہ محبوب کے الفاظ تھے مومن نے صرف انھیں دہرا دیا اور صرف ایک ٹکڑا 'سچ ہے' کا بڑھا دیا محبوب کی شکایت کو مومن نے پلٹ کر طنز بنا دیا 'سچ ہے' میں نے ہی تم سے بیوفائی کی۔ میں ہی خطا وار ہوں

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے ۔۔۔ تمنے اچھا کیا نباہ نہ کی

ابتک آپ نے طنزیہ انداز بیان میں مومن کا کمال دیکھا۔ اس شعر میں مومن کچھ اور بلند اڑ رہے ہیں، یہاں مومن نے طنز کو بلند کیا ہے جو حقیقت سے ہمدوش ہے۔ ہر حقیقت آگے چلکر تلخ حقیقت ثابت ہوتی ہے اور ہر تلخ حقیقت طنز کا دوسرا نام ہے۔ طنز کا دوسرا پہلو جو میں نے سوفٹ کی رسالہ (a modest proposal) میں واضح کیا ہے وہ یہاں اس سے بھی زیادہ عریانی اور تلخی کے ساتھ روشن ہے محبوب سے کوئی شکایت نہیں ہے بلکہ الٹے شکریہ ادا کیا جا رہا ہے لیکن یہ شکریہ شکایت سے تلخ تر ہے۔ طنز کی نشتریت اس کی واقعیت میں پوشیدہ ہے۔ میر کا ایک شعر ہے۔

اب حال دل ہے ان کے دلخواہ ۔۔۔ کیا پوچھتے ہو الحمد للہ

الحمد للہ میں جو طنز اور معنویت ہے زبان اس کے بیان سے قاصر ہے لیکن مومن کا شعر بھی پڑھیے

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے ۔۔۔ تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

ممکن ہے کہ آپ بھی میرے ہمخیال ہو جائیں کہ مومن نے اسی ایک تلخ حقیقت کا اظہار کچھ کم قاتل لہجہ میں نہیں کیا ہے۔

اجتماع ضدین

شعر کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ موسیقی جب الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہے تو شعر کہلاتی ہے موسیقی کا تخیل توازن اور تسلسل کے بغیر نہیں ہو سکتا یہ توازن کیا ہے' یہ تسلسل کیا ہے۔ سکون و حرکت کا دوسرا نام۔ بغیر سکون کے سمجھے ہوئے ہم حرکت کو سمجھ نہیں سکتے اسی طرح حرکت کو سمجھے بغیر ہم سکون کی بابتہ کوئی رائے نہیں قائم کر سکتے۔ اجتماع ضدین کے بغیر تخلیق کا تصور محال ہو جاتا ہے مثال میں موسیقی ہی کو لیجئے ترنم تال و سم کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ محض تال یا محض سم یعنی محض حرکت یا سکون سے ترنم نہیں پیدا ہو سکتا ضدین میں (compromise) مصالحت کے سوا کوئی دوسرا طریقہ ممکن نہیں۔ بجلی جو آپ کے گھروں کو روشن کرتی ہے مثبت اور منفی لہروں کے اتصال کا نتیجہ ہے تنہا مثبت یا تنہا منفی لہر بیکار ہے کائنات میں بھی یہی اصول کار فرما ہے خلقنا کل شئی زوجین۔ جنھوں نے مخلوقات کے اس پہلو پر غور کیا ہے کہ ان کی تخلیق اتصال اضداد کے سوا کسی اور طریقے سے ممکن نہیں کچھ وہی اسکو سمجھ سکتے ہیں کہ

دنیا میں جن مسائل سے ہمیں دوچار ہونا پڑتا ہے ان کا حل اضداد میں مصالحت پیدا کرنا ہے مذہب کا یہی کام ہے کہ وہ ایسا راستہ بتائے جو حیات قبل موت اور حیات بعد موت میں یکرنگی پیدا کر دے ——— بعض مذاہب نے اس دنیا کی زندگی پر انتہائی زور دیا ہے۔ بعض مذاہب نے عقبیٰ کے لئے اس دنیا کو ترک کر دینے کا مشورہ دیا ہے۔ اسلام کی کامیابی یہی ہو کہ اُس نے دونوں کا خیال رکھا۔ الغرض تمام عالم اجتماع ضدین کا مظہر ہے۔ ایک حقیقی شاعر خلقت کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا مومن کے شاعرانہ دل و دماغ نے اس حقیقت کو پالیا اور مختلف طریقوں سے مختلف صورتوں میں اپنے اشعار میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ چند مثالیں مومن کی اس خصوصیت کو بھی ظاہر کرونگی جہاں تک کم شاعروں کی نظریں پہونچی ہونگی

آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا ——— مرگ کی آس پہ جینا شب ہجراں ہوگا

حرماں یعنی ناامیدی کا علاج امید ہی سے ہوسکتا ہے بظاہر اس مرض کا اصول علاج علاج بالضد معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اس مرض کا اصول علاج۔ علاج بالمثل ہے۔ حرماں کیا ہے ناکامیاب امیدیں۔ اس کا علاج کیا ہے وہی امید' امید ہی مرض حرماں کا باعث ہوئی امید ہی سے اس کا علاج ہوسکتا ہے۔

موئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہوا ——— بلائے جان ہے وہ دل جو بلائے جان نہوا

مومن پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ بعض الفاظ ایسے بھی استعمال کر جاتے ہیں جو مذاق سلیم پر گراں گزرتے ہیں حالانکہ دوسرا بہتر لفظ موجود ہوتا ہے۔ مثلاً یہاں 'موئے' کہا ہے جس کا ترک اولیٰ تھا۔ ہم اس امر کو قطع نظر کر کے کہ 'موئے' مومن کے عہد میں متروک تھا یا نہیں؟ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ "موئے" آج بھی قابل ترک ہے یا نہیں۔ موئے کو ترک کر کے مرے استعمال کرنے کی صلاح دیجاتی ہے۔ مصرع اولیٰ میں موئے کے بجائے "مرے" رکھئے اور پھر غور کیجئے کہ مرنے کا لفظ موئے کی جگہ رکھنے سے مصرع میں کتنی معنوی کمزوری پیدا ہوجاتی ہے۔ مرے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہوا' یہاں 'نہ سکے' کی مزید ضرورت مصرع میں محسوس ہوتی ہے ——— لفظ موئے' نہ سکے کا محتاج نہیں۔ علاوہ بریں مرے اور موئے دونوں طرح سے مصرع کو پڑھئے۔ اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا۔ کہ 'مرے' سے مصرع میں ایک ثقل بھی پیدا ہوجاتا ہے جو موئے رکھنے کی صورت میں باقی نہیں رہتا کیونکہ 'ر' حرف صحیح ہے اور "و" حرف علت۔ حرف صحیح حرف علت سے زیادہ ثقیل ہوتا ہے' موئے' میں جو روانی لوچ اور نرمی ہے وہ مرے میں نہیں؛ بنابریں میں تو اسے قابل ترک نہیں سمجھتا شاید مومن بھی مرے کو موئے کے مقابلے میں ثقیل سمجھتے ہیں رہگیا یہ شعر وہ خود جس عالمگیر حقیقت کا مظہر ہے اس سے انکار نا ممکن ہے۔ عشق کے بغیر زندگی کا لطف نہیں اور عشق کے بعد زندگی ممکن نہیں۔ اس حقیقت کا اظہار اس سے بہتر لفظوں میں ممکن نہیں کہ بلائے جان ہے وہ دل جو بلائے جان نہوا' ایسے اشعار میں صنعت تجنیس یا صنعت تضاد تلاش کرنے کے بجائے معنی پر زیادہ زور دینا چاہئے۔

تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری

فطرت انسانی کا تقاضا ہے کہ وہ زیر نقاب ہستی کو برافگندہ نقاب دیکھنا چاہتی ہے نگاہ شوق کو نقاب حجاب ہونے کے بجائے تازیانہ ہوجاتی ہے - مومن اسی واسطے پردے کو پردہ در سمجھتا ہے -

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری

مومن خاں سے قبل شعرائے اردو زمین کی گردش سے واقف بھی نہ ہوں گے چہ جائیکہ انھیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ زمین کی گردش کا ایک سبب اس کی تپش بھی ہے - مومن نے زمین کی گردش سے فائدہ اوٹھایا اور کہدیا کہ کہنے کو تو میں زنداں میں ہوں لیکن درحقیقت آزاد ہوں - حیات انسانی انہیں اجتماع اضداد کا نام ہے انہیں قضیوں نے جبر و اختیار کے جھگڑے کھڑے کردئے ایک شخص جسکو اختیار کہتا ہے اوسی کو دوسرا شخص جبر کہتا ہے - ایک شخص جسکو اسیری کہتا ہے دوسرا اسی کو آزادی سمجھتا ہے -

کچھ نہ سوجھا عالم اوس پردہ نشیں کا دیکھکر جوں نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑگیا

نقاب مانع دید تھی - جب تک چہرے پر نقاب رہی دیدار نہ ہوسکا لیکن قیامت تو یہ ہے کہ نقاب اوٹھی بھی تو دیدار نہ ہوسکا - انوار جمال کی کثرت نے آنکھوں کو خیرہ کردیا - یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچکر جبر و اختیار کی حقیقت کھلتی ہے جہاں حسن زیر نقاب اور حسن برافگندہ نقاب نگاہ شوق کی دسترس سے دور ہیں - یہاں امتیاز ضدین محال ہوجاتا ہے -

آج اور زور کرتے ہیں بیطاقتی سے ہم اُس کو میں جا مریں گے مدد اے ہجوم شوق

زمانہ ثابت کررہا ہے کہ بیطاقتی ہی اصل طاقت ہے اور یہ وہ طاقت ہے جس کا توڑ نہیں -

ڈر ہے کہیں نزول بلا بیشتر نہ ہو اے آہ آسماں میں عبث رخنہ گر نہ ہو

وہی آہ جو کبھی آسمان سے اثر لاتی تھی اب بڑھتے بڑھتے آسماں میں رخنہ گر ہونے لگی جو علاج تھا وہی اب مرض ثابت ہورہا ہے -

اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے

معلوم نہیں نہ دیکھنے کا شکر ادا کیا جائے یا شکایت -

قصاید مومن کے قصاید[1] بہت بلند ہیں اور ان سے علمی لیاقت اور شاعرانہ تخئیل بخوبی ثابت ہے اور بیشک ان کے قصاید نہ صرف ان کے معاصرین مشہور کے ہمپایہ ہیں - بلکہ ان کا درجہ اساتذہ فارسی سے ملتا ہوا ہے اور اُن کے مطالعہ سے معمولی استعداد کا آدمی لطف نہیں اُٹھا سکتا - اردو میں مومن نے وہ قصاید لکھے جو سلمان ساوجی کے قصیدوں سے ملتے ہوئے ہیں -

اس شور نے کیا مزہ چکھایا الحمد لواہب المعطایا
جس نے ہمیں آدمی بنایا والشکر لصانع البرایا

---

[1] از لکھنوی - زمانہ فروری ۱۹۱۱ء

دوسرے شعر میں ترقی محال ہے کسی زبان میں اس سے بہتر حمد کا شعر ملنا دشوار ہے۔ اللہ تعالےٰ کا سب سے بڑا کرم ہم پر یہی ہے کہ اس نے ہمیں آدمی بنایا۔

اب بھی نظر اس مجاز میں ہے (ق) کیوں مہر نگاہ میں سمایا
نے عقل بسیط اس کا پر تو نے نور مجرد اس کا سایا
سبحانک یا الہ عالم عالم ترا عجز نے دکھایا
ہر جائے ہے تیرا جلوہ لیکن دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا
یاں عقل ہے گم کہ بس تجھی کو پایا ہر شے میں پر نہ پایا

مومن نے شریعت اور شاعری دونوں کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ مولوی ضیاء احمد صاحب ایم اے کی رائے ہے کہ مومن سے پہلے جسقدر شعرا گذرے ہیں قصیدہ میں باستثنائے سودا۔ مومن کا کوئی ہمسر نہیں اگرچہ پختگی اور روانی میں قصاید ذوق کا درجہ کہیں ارفع ہے۔ تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں ہوسکتا۔ ان کی تشبیب عموماً نادر اور انوکھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہر قصیدے میں تعلّی اور شکایت زمانہ کہ شعرا کی سنت ہے اس شکوہ اور زور کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ عرفی کا دہوکا ہوتا ہے تخلیص یا گریز البتہ نسبتاً کمزور ہوتی ہے۔ کلام میں عقیدت کی جھلک اکثر نظر آتی ہے اور اسی کے ساتھ کہیں کہیں مذہبی تعریض بھی کر جاتے ہیں قصاید میں علمی مضامین بکثرت لاتے ہیں اور چونکہ خود نجوم و رمل و طب میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اس لئے مخصوص مصطلحات سے کلام کا اغلاق بڑھا دیتے ہیں۔ کہیں کہیں تلمیحات اور آیات و احادیث کی طرف بھی اشارات کرتے ہیں اور عربی جملوں کو تو اس خوبی سے تضمین کر جاتے ہیں کہ انگوٹھی میں نگینے کا گمان ہوتا ہے۔

صاحب موصوف کا یہ جملہ کہ پختگی اور روانی میں قصاید ذوق کا درجہ کہیں ارفع ہے" میں کوشش کے باوجود بھی نہ سمجھ سکا۔ اگر پختگی کے معنی ہیں زیادہ قصاید کہنے کے تو اس میں شک نہیں کہ ذوق نے زیادہ قصیدے لکھے ہیں۔ ورنہ قصاید کے لئے اگر شوکت الفاظ۔ ندرت تشبیہ زور بیان۔ بلند پروازی۔ عالی خیالی۔ علاوہ مضامین کی ضرورت ہے تو وہ مومن کے یہاں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں آئندہ مثالیں اس امر کو واضح کریں گی۔ مومن کی قصیدہ گوئی پر کوئی مفصل بحث کرنے سے پہلے یہ طے کر لینا چاہئے کہ تقاضائے قصیدہ گوئی کیا ہے اور مومن کے قصاید اس معیار پر کہاں تک پورے اترتے ہیں۔ نواب امداد امام صاحب اثر فرماتے ہیں کہ بتانا چاہئے کہ قصیدہ کی اصل غرض یہ ہے کہ شاعری کے پیرایہ میں مسائل اخلاق و معاشرت و تمدن و معاش و معاد وغیرہ کی تعلیم دینی و دنیوی بنی آدم کو نصیب ہو۔ حمد خدا و نعت محمد مصطفےٰ و منقبت علی مرتضیٰ وایہ باصفا سے شاعر کو ثواب حاصل ہو اور سامعین کو ذکر خدا و رسول سے توفیق عبادت پیدا ہو" اگر تقاضائے قصیدہ گوئی یہی ہے تو مومن سے زیادہ اردو قصیدہ گو شعرا میں شاید ہی کوئی زیادہ کامیاب ہوا ہو۔ مومن نے

کل نو قصیدے کہے ہیں: ایک حمد میں ایک نعت میں چار چار یار کی منقبت میں ایک سیدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منقبت میں ایک معذرت میں ایک بسلسلۂ اعتراف احسان یعنی نو قصیدوں میں سات قصیدے مذہبی رنگ لئے ہوئے ہیں اور باقی دو کسی صلہ کی خواہش یا امید پر نہیں لکھے گئے۔ ان قصیدوں میں پختگی روانی۔ شکوہ۔ علوے مضامین بلند پروازی سب کچھ موجود ہے گرچہ یقیناً نسبتاً کمزور ہے۔ اگر یہی ثبوت قصیدوں کے پختہ نہ ہونے کا ہے تو بیشک مومن کے قصاید میں پختگی نہیں ملاحظہ ہو

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری　　کثرت دود سے سیہ شعلۂ شمع خاوری
سامعہ سوز و دلخراش گریہ فزا ندخم ریز　　نغمۂ لوک عندلیب قہقہۂ گل تری
مجھکو فغاں سے کام اور ذکر میں اہل خانقاہ　　دیر میں شور بید خواں میکدوں میں نواگری
صبح کی جب بہار ہو ساقی غنچہ لب ہو پاس　　مے سے عذار لالہ رنگ لب سے مذاق شکری
میرے یہ بخت ہائے بخت ایسی نصیب بانصیب　　چارۂ یاس امید حشر مرگ علاج مضطری
جان جہاں کو دل دیا دشمن جان ہوا جہان　　سر میں ہوا نظر میں یاس سینہ میں آہ زد بھری
یک دل و گونہ گونہ زخم یک تن و فوج فوج غم　　یک جگر و ہزار نیش یک سر و صد گراں سری

یہ قصیدہ راجہ اجیت سنگھ کی تعریف میں کہا گیا ہے۔ راجہ صاحب نے ایک روز مومن خاں کو بلوایا اور رخصت کے وقت ہتھنی کسوا کر اُن کو اسپر بٹھا کر رخصت کیا۔

راجہ اجیت سنگھ نام کامروا ے خاص و عام　　جو دے جسکے بانظام کار جہاں کی ابتری
نیل زنجین بنا دیا خاک نشین کو اُسنے اب　　خاک نہیں فلک کو زیب لاف گزاف برتری

اسی قصیدے میں راجہ اجیت سنگھ کے نیزہ کی تعریف میں کیا شعر کہا ہے۔

افعی رمح سینہ کو چیر کے دل نکال لے　　مار سیاہ زلف سے ہو نہ سکے یہ دلبری

تعریف تیغ و تیر:—

خندۂ برق تیغ میں گرمیٔ مہر ماہ تیر　　گریۂ زخم تیر میں جوشش سحاب آذری

تعلیاں ملاحظہ ہوں:—

شاعر بے نظیر ہوں سحر بیان بیر ہوں　　دم ہے مرا نمونۂ معجزۂ پیمبری
سحر حلال سے مرے جادوئی سامری خجل　　طور کلیم اوج فکر نور خدا فسوں گری

لاف زنی پس مدیح رسم قدیم کیا کروں ۔۔۔ اس غم تازہ سے نہیں مجھکو امید جانبری

کفر حکایت غرور اس کے بغیر یہ محال ۔۔۔ تا متنبّی و جریر عار ہے مجھکو ہمسری

میری زبان میں وہ بات جس سے ملک سخن ہے پست ۔۔۔ میرے بیان میں وہ سحر جس سے جنوں زدہ پری

مجھکو یہ گل زمین پسند آگئی اتفاق سے ۔۔۔ مزرع غیر میں کسے ورنہ سر کدیوری

نان گدا پہ رغبت شاہ جہاں غلط غلط ۔۔۔ با ہمہ برتری دروغ آرزوی فروتری

اب نہیں کی ہے اختیار نظم کو میں نے یہ زباں ۔۔۔ آب ہیں لب پہ بوسہ زن ہندی تازی و دری

باغ میں اپنے ہر شجر تا بہ چنار و سرو بید ۔۔۔ اول و آخر بہار یاد فروش نوبری

لذت مدح جانفزا تلخی ہجو تا بگاہ ۔۔۔ شہد ہے یاں تو شہد ناب صبر ہے تو سقوطری

میری طلاقت لساں میری فصاحت کلام ۔۔۔ چارۂ صدرہ آزما از پے گنگی و کری

میرے معاند حسود ہرزہ ستائے زنگیاں ۔۔۔ ہاجی خویش و بے خبر مست بلب کف آوری

ہیں یہ سگان جیفہ خوار شعر سخن سے بے نصیب ۔۔۔ کافر انتخواں پرست طرفہ سگی و کافری

ہیں وہ شہ سریر فضل جس کے خطیب کیلئے ۔۔۔ اوج حضیض آسماں پست و بلند منبری

اردو شاعری اس شکوہ و زور کا جواب کہاں سے لا سکتی ہے۔ سودا، انشا، ذوق، غالب تو کس شمار قطار میں ہیں فارسی زبان میں بھی چند ہی قصیدے اتنے زور دار نکل سکتے ہیں، چند مدحیہ اشعار ملاحظہ ہوں:—

اسکے ادیم حشمت و مایۂ جلال پر ۔۔۔ ختہ زیاب کی طنین طنطنۂ سکندری

جوش طراوت مشام وجہ عطاس عز وجاہ ۔۔۔ لطف نسیم مشک بیز خلق شمیم عنبری

بوسہ روا بہر طریق سجدۂ فرق ہر فریق ۔۔۔ سنگ در اسکا آں صنم رشک بتاں آذری

تروہ بہار باغ حسن جسپہ کرے نثار جاں ۔۔۔ لالہ رخی سہی قدی گلبدنی سمن بری

لب کو مثال کس سے دوں لعل و عقیق ہیں مگر ۔۔۔ گل میں کہاں یہ نازکی ان میں کہاں یہ احمری

چشم کا تیری امتیاز روح فزا نظر فزا ۔۔۔ گریۂ و مستیٔ نگاہ روح گلاب و عنبری

فصل بہار بعد یاس کس لئے غنچہ ہو بڑا ۔۔۔ بزم میں تیری گر نہ تھی گل کو امید سا غری

جمع ہیں تجھ میں عدل و حسن جس سے خرابیاں ہوا ۔۔۔ مست خراب لب خراب محو پری نئی پری

دعائیہ اشعار کا انداز دیکھئے:—

تار ہے الفت آزما ناز و غرور دلربا — تار ہے آرزو فزا طرز ادائے دلبری

اس حسن بیان کا جواب ہو سکتا ہے:۔

حور پہ تیرے جاں نثار نگار بتیاں دین مال — وصل سے تیرے کامیاب لب شکران عسکری
تاکہ ہو تو بہار میں قسمت رند مظہر بال — مستی و بے حجابی و نغمہ زنی و میخوری
بہر حسود جام زہر ساغر مے ترے لئے — تا نہ ہو ناگوار طبع تلخی بادہ شکری
رقص و سرود سے تری انجمن نشاط گرم — شعلۂ دور عارض روشن دود زلف عنبری
سوئے ہزار گوش جاں دی زمین زر فشاں — باغ میں جب تک اس طرح جلوہ کرے گل تری
تجھکو نصیب بزم میں داد وہی صلہ وہی — مجکو مبارک ایکسو مدح گری گداگری

مومن عمر بھر مدح گری کو گداگری سمجھتے رہے یہ صرف سر سے راجہ کا بار احسان اتارنا تھا جس کے لئے اتنا زور طبع دکھایا گیا۔

مومن کا زور بیان آپ دیکھ چکے اور بہت ممکن ہے کہ آپ بھی میرے ہمخیال ہو جائیں کہ اُن کے قصاید ادب اردو کے لئے سرمایۂ ناز ش ہیں

اب مومن خاں کے دریائے فکر کی روانی دیکھئے جس کی بابت ضیا احمد صاحب کی رائے ہے کہ ذوق کے یہاں بڑھی ہوئی ہے۔ حمدیہ قصیدہ آپکی نظر سے گذر چکا ہے ایک دوسرا قصیدہ ملاحظہ ہو جو ٹونک نہ پہونچ سکنے کی معذرت میں لکھا گیا ہے:۔

یاد ایام عشرت فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوے صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
خاک میں رشک آسماں ملی — ہائے کیسی بلند ایوانی
کر دیا گردش سپہر نے حیف — برج خاکی مسیر کیوانی

برج خاکی کی یہ تاثیر ہے کہ اگر سعد سیارہ ہو تو اس کی سعادت بڑھا دیگا اور اگر نحس سیارہ ہے تو اس کی نحوست میں اضافہ کر دے گا میری نحوست دیکھئے کہ کیوان گھوم پھر کے برج خاکی ہی میں رہتا ہے۔

ایسی وحشت سرا میں جائے کون — بے نوری کر رہی ہے دربانی
کیا ہوئی وہ بلندیٔ دیوار — کیسا ہو سلے وہ عماد طولانی
جائے گل ہیں چمن میں ریزۂ سنگ — کاہ کرتی ہے ناز ریحانی
اٹ گئے حوض و نہر غیر از چشم — ایک قطرہ کہیں نہیں پانی
نہ ملا کچھ نشان آب رواں — خاک سارے جہان میں چھانی

سقف رنگیں وزر نگار کہاں　　جز سپہر و نجوم نورانی

تخلیص عموماً مومن کی کمزور خیال کی جاتی ہے۔

اے فلک دل کو داغ کرتی ہے　　زر خورشید کی درخشانی
بے زری سے مری تجھے حاصل　　کچھ نہ ہوگا بجز پشیمانی
جان مومن پہ گونہ گونہ ستم　　کافرانتی بھی نامسلمانی
تاکجا اے یزید شمر خصال　　فتنہ ہائے فریب مردانی
اس سے کاوش نہ کر نہ ظالم　　آپ اپنا تو دشمن جانی
تجھے معلوم ہے کہ ہے وہ کون　　کھول دوں میں یہ راز پنہانی
مدح خوان شہ وزیر لقب　　ختم جس پر ہوئی سخندانی
پایہ سنج کمال اہل کمال　　فارق قلزمی و عمانی

گھوڑے کی تعریف اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے:-

شوخی یار کی سی چالاکی　　نگہ شوق کی سی جولانی

انداز دعا دیکھئے کتنا پاکیزہ ہے:-

جب تلک باعث نشاط و ملال　　ہے وصال و فراق جانانی
تیرے حساد و رنج گوناگون　　تیرے احباب اور تن آسانی
تیرا اقبال روز افزوں ہو　　جیسے مومن پہ لطف رحمانی

روانی کی مثال میں نہیں تسلیم کر سکتا کہ ذوق کی قصیدہ گوئی اس سے بہتر پیش کر سکتی ہے مومن کی قصیدہ گوئی کی وہ خصوصیت جس کے اردو اور فارسی شاعری میں وہ تنہا مالک ہیں اُن کی تشبیب ہے جو حقیقی معنوں میں تشبیب کہلانے کی مستحق ہے۔ تشبیب کے لغوی معنی پر اگر نظر رکھی جائے تو اس کا انداز تغزل سے جدا نہیں ہو سکتا۔ مذہبی قصاید سے میں چند ایسی مثالیں پیش کروں گا جو مومن کی اس خصوصیت کو روشن کرینگی:-

دل ایکی بار ہوا ایسی بے جگہ پامال　　کہ جان کو بھی ٹھکانے لگا رکھے گا دل

بے جگہ کا استعمال کتنا با محل ہے:-

وہ بد شعار ظرحدار دلربا جس سے　　امید وصل خطا ترک آرزو مشکل

تم اور حسرت ناز آہ کیا علاج کروں — میں نیم جاں نرہا امتحان کے قابل
چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا — غضب ہے شوق رسائی و دوری منزل
خدا سے ڈر بت بیدرد ہے یہ کیا انصاف — کہ تو جفا سے نہو اور وفا سے ہوں میں خجل

ہے یہی حسرت دیدار تو مرنا دشوار — دم شماری کی مری عمر ہوئی روز شمار
بدگمانی نے دعا سے بھی رکھا محروم آہ — راز دل غیر سے کس طرح میں کرتا اظہار
دہوم ہے تابش خورشید قیامت کی مگر — مجھ سے اللہ نہ پوچھے گا عذاب شب تار؟

غالب کے دو شعر سن لیجئے اس کے بعد مندرجہ بالا شعر کو دیکھئے

آتا ہے یاد حسرت دل کا شمار یاد — مجھ سے مری گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اگر کنایہ صراحت سے زیادہ لطیف ہے تو غالب کی کردہ گناہوں کی سزا اور مومن کی تابش خورشید قیامت کی دہوم اور غالب کے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد اور مومن کی پرسش عذاب شب تار سے کیا نسبت۔ غالب نے ایک ہی بات کو دو طریقوں سے ادا کیا لیکن بھونڈے طریقے سے مومن نے اسی خیال کے لئے کتنا لطیف پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے

نیک نامی نہ سہی مجھکو ہے تم سے سروکار — چھوڑ دوں آج وفا گر ہو وفا سے بیزار

دنیا کی شاعری اس سے بہتر تسلیم و رضا کا درس نہیں پیش کر سکتی تیاگ کا فلسفہ اس سے اونچی تعلیم پیش نہیں کر سکتا۔

نقد جاں اپنی تجلی کی نہ کہنا قیمت — صبح محشر کہیں بنجائے نہ روز بازار

میں قصاید کی بحث مومن کی دعا پر ختم کرتا ہوں بحث ضرور تشنہ ہے مگر اتنا مواد جمع کر دیا گیا ہے جسکو دیکھکر ارباب نظر مومن کی قصیدہ گوئی پر کسی نتیجے پر خود پہونچ سکیں۔

وہ عشق دے جس کا نام اسلام — وہ شیوہ نبی نے جو بتایا
وہ نعرۂ عشق صحابی — جس نے کہ اس آگ کو بجھایا
کچھ آب زنی کرے نہیں تو — سر نار جحیم نے اٹھایا
مجھکو بھی بچالے جیسے تو نے — یوسف کو گناہ سے بچایا
وہ رفعت حال دے کہ جس نے — منصور کو دار پر چڑھایا

مومن غیر مقلد تھے اور عقاید میں نہایت سخت۔ تصوف جو ان کے یہاں نہیں پایا جاتا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ وحدت وجود کو اسلام کے منافی سمجھتے تھے ان کا ایمان وحدت شہود پر تھا۔ وحدت وجود کے مسئلے کو ترک کر دیجئے پھر تصوف میں کیا خاک رہجاتا ہی لیکن اس کے باوجود اس حمدیہ قصیدے میں مومن یہ دعا کرہی گئے کہ:-

وہ رفعت حال دے کہ جس نے　　منصور کو دار پر چڑھایا

بہت ممکن ہے کہ یہ قصیدہ شاہ سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پہلے لکھا گیا ہو:-

اس کا مرے دل پہ ایک پرتو　　جس شعلہ نے طور کو جلایا

مومن کہے کس سے حال آخر　　ہے کون ترے سوا خدایا

مقطع کی کس زبان سے تعریف کیجائے۔

مثنویاں

مومن کی مثنویاں ان کی حیات معاشقہ کی منظوم تصویر ہے۔ اُن کی سیرت کا وہ پہلو جس نے ان کے کلام پر اثر کیا ان مثنویوں کے مطالعہ سے صاف واضح ہوجاتا ہے، سوال یہ اٹھ سکتا ہے کہ مثنویوں میں جو واقعات قلمبند ہوے ہیں ان کے امر واقعہ ہونے کا کیا ثبوت ہے۔ داخلی ثبوت تو یہ ہے کہ مثنویوں میں جو سوز و گداز ہے وہ اس بات ——————— کا شاہد ہے کہ وہ سب آپ بیتی ہیں فرضی قصوں میں یہ بات نہیں پیدا ہوتی دوسری بات جو ان مثنویوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مومن کی حیات معاشقہ میں صرف ایک حادثہ یہ پیش آیا ہے کہ محبوب کا انتقال ہوگیا۔ مثنوی ہی میں اس کا ماتم کیا گیا ہے لیکن طبیعت کو اس سے تسلی نہ ہوئی مومن نے دل کو تسکین دینے کے لئے ایک درد انگیز مرثیہ بھی لکھا جس کے ابتدا میں لکھا ہوا ہے۔ "ترکیب بند بہ مضمون مرثیۂ معشوقۂ حور ولک شیم حصلنی وصالہا فی جنت النعیم" آخر کا ٹکڑا "حصلنی وصالہا فی جنت النعیم" اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ کسی فرضی معشوقہ کا مرثیہ نہیں تیسری بات جو خلاف روش وقت مومن کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جنس لطیف ہی کا کوئی نہ کوئی فرد ان کا محبوب و مطلوب رہا ہے، مومن کے سارے کلیات میں ایک مصرع بھی ایسا نہیں نکل سکتا جس سے یہ وہم ہو سکے کہ مومن کا محبوب کبھی دوسری جنس کا کوئی فرد رہا ہے یہی وجہ ہے کہ مومن خاں اپنے کلام میں بار بار لفظ پردہ نشین پر زور دیتے ہیں۔ مثنویوں کی سادگی اور ان میں کسی (پلاٹ) کی عدم موجودگی بھی میرے اس خیال کو یقین کے درجے تک پہونچاتی ہیں کہ یہ سب مومن نے اپنی ہی سرگذشت لکھی ہے ورنہ حکیم مومن ایسا نازک خیال شاعر اور یہ سادگی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ خارجی ثبوت صرف ایک معتبر مل سکا ہے اور وہ گلشن بیخار ہے جس کے مولف نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ مومن کے ہمراز اور شاگرد ہیں شیفتہ صاحب کے تذکرے میں لکھتے ہیں "نام امۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی۔ بتقریب مداوا با مومن خاں کارش افتادہ چندگاہ در دوالود مثنوی قول غمیں نام کہ از مصنفات خان مغرے الیہ است شرح نسخہ احسن وجمال ہماں موزوں قد است" مثنوی قول غمین کی صاحب جی

(ہیمسرو ئن) میں قصہ مختصر طور پر یہ ہے

ایک چندے یہی اوقات رہی — روز ہیروں کی ملاقات رہی
واں ہر اک طرح بہلتا تھا دل — کہ ہوئی اسمیں بلا اک نازل
کہیں باہر سے کوئی واں آیا — میرے بیٹھے ہی وہ مہماں آیا
سنتے ہی اوسکے آنے کی خبر — پردے کے واسطے آیا باہر

....

اتنے میں دل جو مرا گھبرایا — جی میں کچھ سوچ کے میں گھر آیا
دوسرے دن جو ہوا گھر سے رواں — جانب کوچۂ رشک بستاں

....

الغرض جب میں وہاں جا پہونچا — تازہ پیغام اجل آ پہونچا
دم لیا بھی نہ کہ دم دینے لگے — تلخکامی کے مزے لینے لگے
دام الفت میں گرفتار ہوے — پاے بند ستم یار ہوے
یہ کچھ آشفتہ سری نے مارا — کہ مجھے چارہ گری نے مارا
کی یہ تشخیص نے میری تدبیر — کہ ہوا دمبدم احوال تغیر
ہو گیا نبض شناسی سے جنوں — سنو حال دل دیوانہ کہوں
صاحب خانہ نے بعد اکرام — بیقرارانہ کیا مجھ سے کلام
کہ یہاں عید و محرم ہے بہم — کل سے کیا کیا طرب و غم ہے بہم
یعنی وارد ہے وہ مہمان عزیز — جس کے قربان مری جان عزیز
لیک بیمار پریشاں احوال — نہ وہ جلوہ نہ وہ رونق نہ جمال

....

آپ کچھ چارہ گری کیجئے غرض — نبض دیکھو کہ ہو تشخیص مرض
میں نے اس نبض پہ جو ہاتھ دھرا — ہاتھ سے میرے مرا دل ہی چلا
آفت تازہ جو جاں پر آئی تو — یہ غزل اپنی زباں پر آئی

غزل

کیا لگا دست دلآرام سے ہاتھ　　دل گیا ہاتھ سے اور کام کے ہاتھ

....　　.........................

سارے دن تو رہے بصحبت یار　　جب ہوئی شام تو اٹھے ناچار
اسکے کوچے سے نہ اٹھتا تھا قدم　　بیٹھے جاتے تھے ہر اک گام پہ ہم
واں سے آنے کی کہاں طاقت تھی　　کیا کہوں آہ عجب حالت تھی
دل میں جب ہوک اٹھی بیٹھ گیا　　یاد اس کی جو اٹھا جی بیٹھ گیا
عجب احوال سے گھر تک پہونچا　　خون دل دیدۂ تک پہونچا
گھر میں آیا تو دسے ہوش کہاں　　دل وہاں جان وہاں دھیان وہاں
شوق فرمائے کہ ہاں پھر چلیئے　　جی میں یہ آئے کہ واں پھر چلیئے
دل بیتاب کو پھر تھام لیا　　بیقراری ہی میں آرام لیا

....　　.........................

بوئے گل لائی صبا بستاں سے　　یعنی اک نامہ بر آیا واں سے
واکیا جوں وہ طلسم افسوں　　ہاتھ آیا یہی گنج مضموں
کہ تمہارے بھی عجب ہیں حرکات　　ایسے ناداں کہ سمجھتے نہیں بات
کیا مناسب تھے یہ بیباک سخن　　نامناسب تھے، یہ بیباک سخن
حرکت اچھی نہیں بدنامی کی　　یہی باتیں تو ہیں ناکامی کی
پاس رسوائی کا گر اپنی نہ ہو　　دیکھو تم مجھکو تو رسوا نکرو
بسکہ ہوتا ہے محبت میں اثر　　مجکو سب درد کی تیرے ہی خبر
دل مشتاق تپاں ہے یاں بھی　　زینت لب یہ فغاں ہے یاں بھی

....　　.........................

اب گیا واں تو تکلم بر لب　　دشنہ در جان و تبسم بر لب
پھر ہی اگلی سی شیریں سخنی　　دل میں سو زخم وے خندہ زنی

اور دل سے حرف دلاویز انہ　　آشنائے سخن بیگانہ

....　　.......................

یونہی با عشرت و عیش و آرام　　جب کہ گزرے ہیں کچھ اور ایام
بعد چندے فلک ناہنجار　　بد چلن بد روش و کج رفتار
جمع احباب پریشاں گرداں　　گردش افزائے بیاباں گرداں
دیکھ واں روز کا جانا میرا　　بیٹھنا ہنسنا ہنسانا میرا
راہ بیداد کی لی ظالم نے　　چھوڑ دی راست روی ظالم نے
سر پر اک آفت تازہ لایا　　بد سلوکی سے مرے پیش آیا

....　　.......................

یعنی واں کوچ کی اُن کے ٹھہری　　ناگہاں کوچ کے اسکے ٹھہری
جس گھڑی ہم تلک آئی یہ خبر　　چھا گئی بیخبری سی دل پر
اک غلو ہوش پہ بیہوشی کا　　عالم اک اپنی فراموشی کا
خود فراموشی و غفلت کوشی　　بیخودی بیخبری بیہوشی
اسمیں پیغامبر آیا واں سے　　ترجماں لعل لب جاناں سے

....　　.......................

جی میں آجائے تو آجاؤ یہاں　　آنکر شکل دکھا جاؤ یہاں
اور اسوقت بھی گر آپ نہ آئے　　ہم کہاں اور کہاں تم پھر آئے
سن کے یہ بات میں با حال تباہ　　بیخودانہ ہوا اُسکے ہمراہ
پایۂ شوق کہاں تک پہونچا　　وہ مجھے جس جائے وہاں تک پہونچا
کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی　　کہ نہ کچھ بولی نہ کچھ بات ہوئی
ملکے حیرت زدگان بیکس　　دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس
خونفشاں لب پہ دو آہیں باہم　　حسرت آلودہ نگاہیں باہم
گرچہ ہرگز بھی نہ تھی تاب کلام　　پر یہ بولی کہ ذرا جی کو تھام

کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو　　مفت کسواسطے جی کھوتے ہو
اب تم اور دل سے لگالیجو جی　　نہ ہوسے ہم تو کوئی اور سہی
ہاں اگر فکر ہو تو ہمسکو ہو　　رنج واندوہ ہو جو ہمسکو ہو
کہ بری آہ ہماری خو ہے　　ہم میں اک مہر و وفا کی بو ہے
خیر رہنا ہوا اب تک اپنا　　اب وطن تمسکو مبارک اپنا
تم رہو خوش کسی جاناں کیساتھ　　ہم چلے حسرت و حرماں کیساتھ
کام دل رنج و بلا کو سونپا　　تم کو لو ہمنے خدا کو سونپا
کہہ کے یہ اٹھگئی جی کھوتی ہوئی　　ہچکیاں لیتی ہوئی روتی ہوئی
ہم بھی روتے ہوئے اپنے گھر آئے　　بادل مضطرب و مضطر آئے
کیا کہوں کیونکہ گذاری وہ رات　　گذری کس حال میں ساری وہ رات
کس سے یہ صدمہ سہا جاتا ہے　　کس سے وہ حال کہا جاتا ہے
جو ہو دلدادہ وہ سمجھے آپہی　　کار افتادہ سمجھے آپہی

صاحب آب حیات کی راے ہے کہ "مثنویاں نہایت درد انگیز ہیں کیونکہ درد خیز دل سے نکلی ہیں۔ زبان کے لحاظ سے جو غزل کا انداز ہے وہی ان کا ہے" مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ مومن خاں کی مثنویوں سے ملک نے کیوں اتنی بے اعتنائی برتی۔ اگر ان مثنویوں کو کوئی صاحب اخلاق سے گری ہوئی سمجھتے ہیں تو انھیں میر اثر دہلوی کی مثنوی خواب و خیال دیکھنا چاہئے جس کی عریانی کہیں بڑھی ہوئی ہے جس معیار اخلاق سے مومن کی مثنویاں پست سمجھی جاتی ہیں اُس کے لحاظ سے شاید غزل کا کوئی شعر بھی پڑھنے کے قابل نہ مل سکے نہ یہاں موقعہ ہے نہ مجھے فرصت کہ میں اس معیار اخلاق پر بحث کروں جس نے ہمیں تنگ نظر بنا رکھا ہے میں تو ایسے اخلاق کو جو اظہار حقائق سے چشم پوشی کرے تنگ اخلاق سمجھتا ہوں۔ مذکورۂ بالا مثنوی کے یہ چند اشعار اردو زبان کیلئے قابل فخر ہیں

کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی　　کہ نہ کچھ بولی نہ کچھ بات ہوئی

آخری ملاقات کا کیا صحیح مرقع کھینچا گیا ہے۔ اس منظر کی حسرتناکی اگر بیان ہوسکتی ہے تو اس کے لئے اس سے زیادہ بہتر الفاظ کہاں سے آئیں گے عاشق و معشوق گفتگو کرنے کے لئے بیتاب ہیں لیکن مہر بہ لب صرف زبانِ حال شرح آرزو کرسکتی ہے۔

مل کے حسرت زدگان بیکس　　دور بیٹھے ہوے روتے رہے بس

آخری ملاقات ہے۔ وقت گذر رہا ہے اور زبان نہیں کھلتی ایک دوسرے کو حسرت زدہ دیکھتے ہیں اور روتے ہیں۔ عورت

عورت ہے اس کے تاثرات مرد سے ہمیشہ زیادہ ہوتے ہیں - اس لئے مثنوی پڑھیے اور دیکھئے کہ یہ جدائی صاحب جی پر کیا اثر کر رہی ہے، اور مومن اس سے کہاں تک متاثر ہیں - عورت کے لفظ لفظ سے اس کی محبت اور مصیبت ٹپک رہی ہے -

.... پھر یہ بولی کہ زرا جی کو تھام
کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو مفت کس واسطے جی کھوتے ہو
اب تم اور واں سے لگا بیٹھو جی نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی

یہی صاحب جی نے کہا ہوگا اس کا خیال غلط نہ نکلا مومن نے دوسروں سے اس کے بعد طبیعت بہلائی - لیکن صاحب جی کا کیا حشر ہوگا اسے بھی سن لیجئے :-

ہاں اگر فکر ہو تو ہمکو ہو رنج واندوہ ہو جو ہمکو ہو
کہ بری آہ ہماری خو ہے ہم میں اک مہر و وفا کی بو ہے

کم از کم اسوقت عورت کے تاثرات اتنے عمیق ہیں کہ ہم مجبور ہیں کہ اس کی مہر وفا کی داد دیں :-

خیر رہنا ہوا اب تک اپنا اب وطن تمکو مبارک اپنا

یعنی اب تم ہو اور عیش و عشرت ہم ہیں اور رنج و مصیبت :-

کام دل رنج و بلا کو سونپا تمکو تو ہمنے خدا کو سونپا

عورت جانتی ہے کہ جہاں میں جدا ہوئی مرد مجھے بھول جائیگا لیکن محض یہ خیال اس کی محبت کو کم نہیں کر سکتا - ہم پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹیں - لیکن تم خوش رہو -

کہہ کے یہ اُٹھ گئی جی کھوتی ہوئی ہچکیاں لیتی ہوئی روتی ہوئی
ہم بھی روتے ہوئے اپنے گھر آئے بادل مضطرب و مضطر آئے

دونوں اُٹھکر چلے ہیں لیکن صاحب جی، ہچکیاں لیتی ہوئی روتی ہوئی اٹھی ہے اور مومن روتے ہوئے اپنے گھر آئے ۔" عورت بے اختیار ہوکر رو رہی ہے لیکن مومن صرف اس بنا پر روتے ہوئے اوٹھے ہیں کہ محبوب روتا ہوا اٹھا ہے - خود ان کے رنج و غم کا ہم پر وہ اثر نہیں پڑتا جو صاحب جی کی رنج و مصیبت کو دیکھ کر پڑتا ہے -

مومن کی مثنویوں میں خارجی مناظر کا بیان تلاش کرنا بے سود ہے - مومن نے مثنویاں نہیں لکھی ہیں بلکہ دل کے چند جلے پھپھولے ہیں جو توڑے گئے ہیں - مومن کی مثنویوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضرورت ہے کہ انھیں اسی روشنی میں پڑھا جائے جن کے ماتحت وہ لکھی گئی ہیں - مصنوعی معیار پر انھیں پرکھنے سے کچھ حاصل نہیں -

رباعیات

مومن کی ہمہ گیر طبیعت نے کس صنف سخن میں اپنی جولانی نہیں دکھائی۔ مومن کے اس زور طبیعت کو دیکھتے ہوئے اگر شیفتہ نے گلشن بیخار میں یہ لکھا تو کیا غلط ہے کہ "بزعم فقیر بقوت شاعری ایشاں کم کسے برخاستہ در ہر جنس آنچناں مکانتے وافی دارد کہ کسے در یک صنف ہم میسر نیامدہ اگر حظے از فہم خدا دادہ داری بیا و بدیوانش نظر کن و بتصدیق و تکذیب من زبان انصاف بکشا" جسطرح مثنویاں مومن کی عاشقانہ زندگی کی آئینہ دار ہیں اوسیطرح رباعیاں مومن کے عقاید پر روشنی ڈالتی ہیں:-

محروم حصول مدعا نے چاہا　　　حسرت زدہ بخت نارسا نے چاہا
مومن اس بت نے گر نچاہا نہ سہی　　　ہم خوش ہیں اسی میں جو خدا نے چاہا

بالکل پیچ ہے صبر و شکر اسی مجبوری کا نام ہے:-

ہے عہد شباب زندگانی کا مزا　　　پیری میں کہاں وہ نوجوانی کا مزا
اب یہ بھی کوئی دن میں فسانہ ہوگا　　　باتوں میں جو باقی ہے کہانی کا مزا

جوانمرگ مومن کا یہ صرف زور طبیعت تھا جس نے یہ رباعی کہلائی ورنہ پیری تو دیکھنا ہی نصیب نہوئی۔

لکھا نہ گیا اگرچہ دفتر لکھا　　　لکھا وہی بالکل کہ ہے دلبر لکھا
حیراں ہوں کہ جو حال پریشاں ہے مرا　　　یہ کاتب تقدیر نے کیونکر لکھا

حق تو یہ ہے کہ اردو زبان رباعیوں سے قریب قریب خالی ہی ہے۔ کوئی عمر خیام کوئی ابوسعید ابوالخیر کوئی سرمد اردو زبان میں پیدا نہوا۔ دو مومن انیس و دبیر کے یہاں کچھ رباعیاں ضرور ملتی ہیں لیکن انہیں فارسی زبان کی رباعیوں سے کیا نسبت۔

مومن ہو اگرچہ سب اسی کا یہ ظہور　　　توحید وجودی کا نکرنا مذکور
یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے　　　بندے کو خدا بنانے کس کا مقدور

توحید وجودی کو چھوڑکر تصوف کی شاعری ناممکن ہو جاتی ہے یہ صرف مومن خاں کا کمال تھا کہ انھوں نے توحید شہودی لیکر شاعری کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

مظہر سے بری ہے کبریائی اسکی　　　آئینہ گداز خود نمائی اُس کی

آئینہ گداز خود نمائی اسکی، توحید وجودی کے خلاف اس سے بہتر شاعرانہ حربہ نہیں مل سکتا:-

روتا ہوں حسین ابن علی کے غم میں　　　ہے عیش جناں کی آرزو ماتم میں
حیف آل نبی میں کوئی باقی نہ رہا　　　لازم ہے کہ باقی نہ رہے کچھ ہم میں

مومن نے جہاں دوسرے مذاہب پر شاعرانہ انداز سے مذہبی چوٹیں کی ہیں وہاں اس امر کو نظر انداز نکرنا چاہئے کہ حضرت امام حسینؑ کے ماتم میں بھی وہ سیاہ پوش نظر آتے ہیں اسی مضمون کی پانچ چھ رباعیاں ان کے دیوان میں موجود تھیں حالانکہ رباعیوں کی حیثیت سے اُن کا پایہ چنداں قابل ذکر نہیں :۔

مومن یہ اثر سیاہ مستی کا نہ ہو — اندیشہ بلند و پستی کا نہ ہو

توحید وجودی میں جو ہے کیفیت — ڈرتا ہوں یہ حیلہ خود پرستی کا نہ ہو

ایک نئے مضمون کو بالکل نئے انداز سے لکھا ہے :۔

بے شاہد و بے بادۂ نہ سبز توبہ توبہ — اس عمر میں دلیہ جبر توبہ توبہ

ایام شباب اور دکھو ساقی — فصل گل و جوشش ابر توبہ توبہ

کلیات میں سوا سو سے زیادہ رباعیاں موجود ہیں اور بقول اثر لکھنوی رباعیوں میں بھی طبیعت کا اصلی رنگ موجود ہے۔

مرثیہ مومن کی عاشقانہ زندگی کا دور نویں سال سے شروع ہوتا ہے

یعنی طفلی سے ہوں میں پیر مغاں — بلد راہ گرہان جہاں

تھے برس ہم شمارۂ افلاک — کہ ہوا پائمال صورت خاک

ابھی دو سال بھی آرام سے نہیں کٹے تھے کہ معشوقہ حور ملک شیم کا انتقال ہوگیا۔

آفت جان ودل فراق و وصال — الغرض کٹ گئے یونہی دو سال

بہر تسکین شدت خفقان — ٹھہری گلگشت روضۂ رضواں

گئی جنت میں بسکہ ایسی حور — ہوئی بیتاب کیسی کیسی حور

مومن کی ساری حیات معاشقہ میں صرف اسی ایک محبوبہ کا انتقال ہوا اور یہ مرثیہ اسی کا لکھا گیا ہے ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں مرثیہ بہت بعد کو لکھا گیا ہوگا۔ یہ مومن کا کمال ہے کہ بلا کسی فوری اثر سے متاثر ہوئے اتنا بھی اثر پیدا کر دیا ہے۔ میرانیس اور مرزا دبیر کے مراثی ہیں اگر وہ تاثیر پیدا کر سکتے ہیں تو اس کی وجہ اور بھی قوی ہے کہ وہ رونا رلانا باعث نجات سمجھتے ہیں۔ حالی نے غالب کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ غالب کے مرنے کے بعد لکھا ہے اور حالی خود مرگ غالب سے نہایت متاثر تھے۔ غالب نے عارف کا مرثیہ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے لیکن وہ بھی فوری تاثر کے ماتحت۔ مومن نے جو مرثیہ لکھا ہے وہ کسی فوری تاثر کے ماتحت نہیں لکھا ہے اس کے باوجود بھی مومن نے اپنے مرثیہ میں کسی سے کم اثر نہیں پیدا کیا ہے یہیں کا فر مومن کی شاعری پر ایمان لانا پڑتا ہے نمونہ کے لئے میں دو بند پر اکتفا کرتا ہوں جنھیں پڑھکر شاید آپ بھی میرے ہمخیال ہوجائیں کہ مرثیہ میں مومن کی کامیابی شاعرانہ اعجاز سے کم نہیں :۔

دل کی طرح سے یہ بھی چلی جاں کو کیسا ہوا　　　دم میں نہیں ہے دم مرے جاناں کو کیا ہوا
سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے　　　کیا جانے اس کی زلف پریشاں کو کیا ہوا
پیتی ہے اپنا خون دل افسوس سے حنا　　　اس دست رشک پنجۂ مرجاں کو کیا ہوا
شبنم کو پھر ہے جانب خورشید التفات　　　شرمندہ وساز مہر درخشاں کو کیا ہوا
دل میں شکن ہے زلف مسلسل کدھر گئی　　　برہم ہے حال کاکل پیچاں کو کیا ہوا
بوئے قبائے یوسف گل ہے نسیم میں　　　اس کی شمیم عطر گریباں کو کیا ہوا
لذت فزا نہیں الم اس لب پہ کیا بنی　　　کچھ زخم بیمزہ ہیں نمکداں کو کیا ہوا
گردش پہ اپنی ناز ہے پھر روزگار کو　　　اس چشم رشک فتنۂ دوراں کو کیا ہوا
دعویٰ ہے شوخیوں کا غزالوں کو دشت کے　　　اس خوش نظر کی جنبش مژگاں کو کیا ہوا
کتاں ہے سینہ چاک رخ ماہ دیکھ کر　　　اُس غیرت مہ تاباں کو کیا ہوا
عیب و حجاب شمع رخان جہاں گیا　　　وہ مہر آسمان نکوئی کہاں گیا

کھو دی خزاں نے رونق گلزار ہائے ہائے　　　پژمردہ ہو گئے گل رخسار ہائے ہائے
پھرتی نہ تھی جو پردہ نشین گھر میں بےحجاب　　　نعش اس کی جائے ہو سر بازار ہائے ہائے
سر دفتادہ قامت محشر خرام ہے　　　کیا ہو گئی وہ شوخی رفتار ہائے ہائے
ہم خواب مہر جبین کی مرے آنکھ مند گئیں　　　کیا سو گئے ہیں طالع بیدار ہائے ہائے
وہ شمع مہر پرتو مہ جلوہ بجھ گئی　　　دن رات ہے فروغ شب تار ہائے ہائے
ہے کچھ خبر بھی گھر مرا ویران ہو گیا　　　سر پھوڑ و اپنا اے در و دیوار ہائے ہائے
اب پوچھے مجھ سے عاشق بیکس کی داستان　　　اس میں نہیں ہے طاقت گفتار ہائے ہائے
روتا ہوں جاں کو ملک الموت کی ذرا　　　کہ میرے ساتھ تو بھی تو غمخوار ہائے ہائے
اے چرخ بارکش تجھے پاس وفا نہیں　　　میں اور رنج و محنت آزار ہائے ہائے
نظارہ ہے محرک ماتم ہزار حیف　　　ابرو ہوا ہلال محرم ہزار حیف

اس مرثیے میں بھی مومن کا کمال فن درجۂ کمال کو پہونچ گیا۔ فن کی اس سے بہتر مثال اردو شاعری پیش نہیں کر سکتی تاثیر صرف زور قلم سے

سے پیدا کی گئی ہے۔

واسوخت حکیم مومن خاں کے کلیات میں تین واسوخت بھی موجود ہیں مومن کی عاشقانہ طبیعت کے لئے یہ صنف سخن خصوصیت کے ساتھ موزوں تھی۔ انھوں نے معشوقوں کی بیوفائیاں دیکھی ہیں۔ واسوخت میں جو فرضی باتیں ہوتی ہیں وہ ان پر الف تا ے گذر چکی ہیں ظاہر ہے کہ ان کی واسوخت کی نشتریت کس بلا کی ہوگی لیکن میں بخوف طوالت انھیں نقل نہیں کر سکتا کہیں کہیں سے کوئی بند لے لیا گیا ہے بہت ممکن ہے ان مثالوں سے ان کے طرز کا پتہ چل سکے۔

کچھ زمانے کا اعتبار نہیں ۔۔۔ دور گردوں پہ اختیار نہیں
عشرت دہر پائدار نہیں ۔۔۔ چرخ کو ایک دم قرار نہیں
ہو نہ جائے ہماری بات بڑی
کبھی دن ہے کبھی ہے رات بڑی

زلف تھی ہم اثر شام غریباں کس دن ۔۔۔ صبح محشر تھا بھلا چاک گریباں کس دن
برق خرمن تھا کہو خندۂ پنہاں کس دن ۔۔۔ سر بسر تھا رشک بلائے شب ہجراں کس دن
خوبیٔ طرز تغافل کی خبر کا ہیکو تھی
شوخیٔ جنبش مژگاں بنظر کاہیکو تھی

میں ہی تو رہا ہوں کہیں جیکو خوش و خرم ۔۔۔ میں نے ہی تو کی بادہ کشی غیر سے باہم
میری ہی نظر سے ہے عیاں نیند کا عالم ۔۔۔ آتی ہے جمائی پہ جمائی مجھے ہر دم
انگڑائیاں لیتا ہوں یہ اب میں ہی تو بیم ۔۔۔ میری ہی تو گردن میں پڑا جاتا ہے کچھ خم
میری ہی تو آنکھوں میں غضب نیند بھری ہے ۔۔۔ میری ہی جبیں ہے کہ جو گھٹنے پہ دھری ہے

آخری بند کا طنز قابل ملاحظہ ہے۔ مومن کی کامیاب واسوخت نویسی کی داد مومن کی شاعرانہ منزلت کو کچھ ایسا بلند نہیں کر سکتی صرف انکی عاشق مزاجی اور موزونی طبیعت ان کے واسوخت کو واسوخت بنا سکتی ہے۔

تضمین شاعر کی زور طبیعت اور سخن فہمی کی آئینہ دار ہوتی ہے بعض اوقات اونچے شاعروں کی تضمین اصل غزل یا قصیدے کو بلند کر دیتی ہیں اور خود ان سے بلند ہوتی ہیں مثال میں محسن کاکوروی کا مشہور قصیدہ لے لیجئے جس کا مطلع ہے۔

مٹا نا لوح دل سے نقش ناموس اب وجد کا ۔۔۔ دبستان محبت میں سبق تھا مجھکو ابجد کا

خود منشی امیر احمد صاحب محسن کاکوروی سے بلند پایہ شاعر تھے اور میری رائے میں ان کی تضمین اصل قصیدے سے بلند مرتبہ رکھتی ہے

اسیطرح مومن نے اپنے شاگرد شیفتہ کے ایک غزل کی تضمین کی ہے اور غزل کو بلند کر دیا ہے -

"تضمین شعر طوطی شکرستان ہند:—

صبح دمید شب گذشت ماہ شبینہ خانہ رفت   روے سحر سیہ کنید یار باین بہانہ رفت

تضمین کے دو تین بند ملاحظہ ہوں:—

ہاے نظر میں پھرتی ہیں شب کی سیاہ مستیاں   بادۂ سرخ رنگ کے فرش پہ ہیں کئی نشاں
تا بکسل خمار ہو نشۂ وصل اب کہاں   سیل سرشک لالہ گوں چشم سے کیوں نہ ہو رواں
صبح دمید شب گذشت ماہ شبینہ خانہ رفت   روے سحر سیہ کنید یار باین بہانہ رفت

جلوۂ بزم عشرت و رونق خانہ ہای ہای   زمزمہ و ترنم و رقص و ترانہ ہاے ہاے
ساقی و مطرب و مے وصل شبانہ ہای ہای   گردش چرخ حیف حیف دور زمانہ ہاے ہاے
صبح دمید شب گذشت ماہ شبینہ خانہ رفت   روے سحر سیہ کنید یار باین بہانہ رفت

مومن یاوہ گو حریف تو نہیں اپنے راز کا   رات کو یاں گذر ہوا اس بت دلنواز کا
وقت اذان تلک رہا زمزمہ عیش و ناز کا   کس سے ادا ہو اب صلاۃ ہوش کہاں نماز کا
صبح دمید شب گذشت ماہ شبینہ خانہ رفت   روے سحر سیہ کنید یار باین بہانہ رفت

حافظ، نظیری، عرفی، کلیم، میلی، قدسی کی غزلوں پر تضمینیں موجود ہیں کلیات ملاحظہ ہو

معمے اور تاریخیں

مومن کی طبع رسا نے تاریخوں میں معمے و تخرجہ کو جن کا شمار عیوب میں ہوتا تھا محسنات تاریخ میں داخل کر دیا۔ مومن سے پہلے شعرا اور ان کے معاصرین نے بھی تاریخیں لکھی ہیں لیکن اعداد کو جمع کرنے کے علاوہ اور کوئی تکلیف گوارا نہیں کی ہے۔ مومن کی تاریخیں شاعرانہ نزاکتوں سے مالا مال ہیں -

تاریخ رحلت حضرت شاہ عبد العزیز صاحب قدس سرہ العزیز

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے   فقر و دین فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

فقر و دین فضل و ہنر علم و عمل کو بے سر و پا کر دیجئے سنہ ۱۲۳۹ھ نکل آئے گا -

تاریخ ولادت دختر مومن خاں

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے   کہی تاریخ دختر مومن

دختر مومن سے 'نال' کے اعداد خارج کر دیجئے سنہ ۱۲۵۹ھ نکل آئے گا

تاریخ وفات دختر

خاک بر فرق دولت دنیا　　من فشاندم خزانہ برسر خاک

سادہ تاریخوں میں مومن نے اپنے والد ماجد حکیم نبی خاں کی وفات کی تاریخ قد فاز فوزاً عظیماً اور اپنی جدہ کے انتقال کی تاریخ دخلت بالنعیم سے نکالی ہے۔

گلشن بیخار کی تاریخ مع قطعہ دیکھنے کی چیز ہے

کیا تذکرہ شیفتہ نے لکھا　　ہے شیفتہ جس کے جان معنی
یوں نکتہ شناس ہیں پر ایسا　　کوئی نہیں قدر دان معنی
افکار بلند سے بنایا　　نہ چرخ پہ آسمان معنی
ہر نقرہ نثر جان مضموں　　ہر شعر رواں روان معنی
کیا بات ہے منتخب کی تیرے　　اے منتخب جہان معنی
ہر نقطہ انتخاب تیرا　　خال رخ دلبران معنی
تیرے جو سخن ہے سرافراز　　الفاظ کا پایہ شان معنی
معنی ہیں شناطر از الفاظ　　الفاظ مدیح خوان معنی
ہے تذکرہ یا ریاض فردوس　　فردوس ہے یا جہان معنی
اے تازہ بہار باغ مضموں　　اے گلشن بیخزان معنی
مومن نے جب اس میں دیر تک کی　　سیر گل و ضمیران معنی
آیا ہے خیال سال اتمام　　تھا وہ بھی تو باغبان معنی
غنچہ کی طرح سے سر فرو تھا　　یک چند وہ ہمزبان معنی
جب نغمہ سرا نہ ہو سکا وہ　　دستاں زن داستان معنی
ہاتف نے کہا ہو اسکی تاریخ　　گلدستۂ گلستان معنی
１２５０

معموں میں ایک معمہ لاجواب ہے اور بقول آزاد ایسا تو سنا نہیں گیا۔

معمہ باسم مہتاب رائے

ہے کیونکر کہ ہے سب کار الٹا　　ہم الٹے بات الٹی یار الٹا

ہم بات یار کو الٹ دیجئے مہتاب راستے نکل آئے گا۔

مومن کی عدم مقبولیت کے اسباب

مومن کی کلیات پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد بھی جو پہلا سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اتنا بڑا جامع شاعر جس نے کوئی صنف سخن ایسی نہیں چھوڑی جسمیں اس نے کما حقہ داد سخنوری نہ دی ہو کیونکر اپنے معاصرین کی بہ نسبت گمنام رہا۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مومن خاں کے زیادہ مشہور نہ ہونیکا ایک سبب ان کی خودداری بھی جو خود پرستی تک پہونچ گئی تھی دوسرا سبب انکی ذہبیت تھی جسمیں تعصب کا رنگ آگیا تھا تیسرا سبب انکے کلام کی نازکخیالی تھی جس کی زمانہ قدر نہ کرسکتا تھا۔ یہی تین وجوہ در اصل اُن کی عدم مقبولیت کا باعث تھے اور مجھے یقین ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی آئے گا بلکہ آ رہا ہے جب یہی عیوب محاسن بنکر ان کی شہرت کا باعث ہوں گے۔ مومن کی خوداری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے احباب کا ادنی سا احسان بھی گوارا نہ کرتے تھے یہی خودداری تھی جنھوں نے اُن کو شاہی دربار سے کبھی وابستہ نہ ہونے دیا خود ان کا کلام ان کی خودداری کا شاہد ہے۔ خود پرستی بری چیز کہی جائے لیکن خود شناسی کا شمار عیوب میں نہیں ہو سکتا۔ اسی خود شناسی نے مومن میں خود اعتمادی پیدا کردی تھی جس نے یہ صورت اختیار کرلی تھی کہ وہ اپنے معاصرین کو شاعر ہی نہیں سمجھتے تھے۔ بارہا انھوں نے اُن کو سگان جیفہ خوار لکھا ہے لیکن کسی کی ذات پر حملہ نہیں کیا۔ ذاتی طور پر ان کو ذوق یا غالب کسی سے پرخاش نہیں تھی۔ جس طرح ذوق و غالب میں چوٹیں چلتی رہتی تھیں۔ مومن اس سے بلند نظر آتے ہیں اگر مومن نے غالب و ذوق پر چوٹیں نہیں کی ہیں تو اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ وہ ان شعراء کو اپنا مد مقابل سمجھنا گوارا ہی نہ کرتے تھے۔ مومن کے تبحر علمی اور جامعیت کے سامنے مفتی صدر الدین آزردہ جیسے فاضلوں کو خاموش رہنے کے سوا چارۂ کار نظر نہیں آتا ذوق و غالب غریب کس شمار قطار میں تھے۔ آزاد نے ذوق کو شیخ اکبر ابو حنیفہ فخر رازی سب کچھ لکھدیا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ شاہ عبد القادر اور شاہ عبد العزیز کے شاگرد مومن کے سامنے ذوق کے ادعائے علمیت کی کیا حقیقت رہجاتی ہے۔ مومن کی یہ ادا بری ہو یا بھلی مومن کے کلام میں نمایاں ہے:۔

ہیں یہ سگان جیفہ خوار مغز سخن سے بے نصیب　　　کافر استخواں پرست طرفہ سگی و کافری

یہ اپنے معاصرین کی طرف اشارہ ہے لیکن انداز کلام اس کا شاہد ہے کہ کسی کی ذات پر حملہ نہیں کیا گیا ہے

اپنے انداز کی بھی ایک غزل پڑھ مومن　　　آخر اس بزم میں کوئی تو سخنداں ہوگا

سخن گو تو کیا مومن مشکل سے کسی کو سخن فہم سمجھتے تھے۔

مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک　　　ہر ایک کو دعوی ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے　　　کہاں ہے لیک معنی بند مضمون یاب اپنا سا

مومن تجھے تو دھب ہے مومن ہی وہ نہیں　　　جو معتقد نہیں تری طبع سلیم کا

اپنے مذہب کی کیا پڑھی اک در مومن نے غزل
دل ہی دل میں یہ تو کیسا ہر فن ہو گیا

مومن اُسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو
جو پست فہم میرے اشعار تک پہونچا

حق تو یہ ہے کیا غزل اک در مومن نے پڑھی
آج باطل سارے استاد زمان کا دعویٰ ہو گیا

ایسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہے سب کا سر
مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

وہ مشق رہی اور نہ وہ شوق رہے مومن
کیا شعر کہیں گے اگر الہام نہ ہوگا

مومن سے اچھی ہو غزل تھا اسلئے یہ زور شور
کیا کیا مضامیں لائے ہم کس کس ہنر سے باندھ کر

پڑھتا ہے کہیں غزل جو مومن
لگ اُٹھتی ہے ایک بار آتش

اک اور پڑھ وہ مومن شعلہ زبان غزل
جل جائیں جس کے رشک سے جل لسان شمع

مومن یہ شاعروں کا مرے آگے رنگ ہے
جوں پیش آفتاب ہو بے نور تر چراغ

مردوں کو مجھ پہ دیتے ہیں ترجیح جو حسود
مومن یہ جان لے کہ سگ جیفہ خوار ہیں

شعر تر وہ ہیں مرے مومن کہ ہنگام جواب
خوف سے منہ اور زبان ہر سخنور خشک ہو

مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اس شعرا کے امام کو

یار مومن سے بھی ہیں مدعی طبع رواں
واہ افکار تر ان اوّ مغز یابس کے

عبث ترقی فن کی ہوس ہے مومن کو
زیادہ ہوئیگا کیا اس سے بےمثال تو ہے

اسی طرح قصاید میں تعلیاں کی گئیں لیکن مومن اسے تعلی نہیں کہتا امر واقعہ سمجھتا ہے۔ بہر حال معاصرین نظرتاً مومن سے خوش نہ ہو سکے اور نہ رہ سکتے تھے

دوسری بات مومن کی مذہبیت ہے۔ انھوں نے شیعوں پر اور حنفیوں پر جہاں موقعہ پایا ہے چوٹیں کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر مومن کی شہرت پر اچھا نہیں پڑا۔ پہلا بدلہ مومن سے شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے لیا کہ آب حیات کے پہلے اڈیشن میں مومن کا نام ہی نہ آیا۔ لیکن جب آب حیات میں مومن کی عدم موجودگی کی توجیہ لوگوں نے نئی نئی طرح کرنا شروع کر دی تو مجبوراً شمس العلما کو دوسرے اڈیشن میں یہ کہہ کر مومن کو بھی جگہ دینی پڑی۔ کہ مجھے بمجبوری اُن کا حال قلم انداز کرنا پڑا تھا۔ دنیا کے لوگوں نے اپنے اپنے حوصلہ کے بموجب اسپر جو چاہا سو کہا"

قصاید اور مثنویوں میں اثنا عشریوں پر حملے ہیں غزل اور رباعیاں حنفیوں کے لئے وقف ہیں۔
ایک قصیدہ کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ بدشعار طرحدار دلربا جس سے	امید وصل خطا ترک آرزو مشکل
وہ شوخ بے سبب آزاد بیگنہ خونریز	کہ جرم قاتل عثماں کا نہ ہو قائل
وہ نکتہ داں کہ تقیہ کو اصل دین کہیے	دم شکایت عاشق نہ ہو جفا سے خجل
وہ دور بیں کہ خدا پر کرے بدا ثابت	نہیں ہے غیر زبس اعتماد کے قابل
وہ کج ادا صنم خود پسند کافر کیش	کہ جس کے زعم میں باطل حق اور حق باطل
وہ فتنہ گر بت حق ناشناس نا انصاف	جو فرض عین گنے کین دور عادل

نرالا سب سے اسکا کیش و آئیں	رقیب اہل بیت و دشمن دیں
غضب خونریز و کافر ماجرا ہے	فضائے خانہ دشت کربلا ہے
گلے اپنے شہیدوں کے لگے خاک	جسد مردے کا اس مذہب میں ناپاک
نہ ڈھونڈھے قتل عاشق میں سبب کچھ	برائے مصلحت جائز ہے سب کچھ
طلسم شیعگی جادو کلامی	....

لیکن یہ دل آنے کی باتیں تھیں۔حنفیوں پر تو خالص مذہبی نقطۂ نظر سے حملہ کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

یہ چند منافق سراپا بدعت	ہے کفر و ضلال و فسق جن کی طینت
تبلاتے ہیں بدعتی امام حق کو	گویا کہ جہاد ہے خلاف سنت

یہ کچھ رہ سنت نہ طریق توحید	پھر کیا ہے ضرور سبکی یکساں تمہید
ہم سمجھے ہیں معنیٔ حقیقی یعنی	حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہل تقلید

ہر چند نہیں قیاس سے کچھ سروکار	پر تو بہ سے از بسکہ ہوا میں بیزار
ہے بہرِ دوا پینے کو مفتی کے حضور	تقلید ابو حنیفہ کا ہے اقرار

غرض ہر ممکن پہلو سے حنفیوں پر حملہ کیا گیا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ سنی کوئی ان سے خوش نہ رہا اور اس جرم میں انکا کلام جس داد کا مستحق تھا اس سے بھی محروم رہا۔ لیکن اس عصبیت کا کیا سبب ہے۔غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاسی ہے نہ کہ مذہبی مومن اپنے

عقاید میں وہ مذہبی ہوں یا سیاسی (نہایت شدید) واقع ہوئے تھے۔ ان کی شاعری بھی ان کی اسی خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے دلی بھر میں مومن خاں کے ہمخیال ایک مولوی اسمٰعیل شہید تھے۔ ہندوستان نصرانیوں کے پنجۂ آز کا رفتہ رفتہ شکار ہو رہا تھا مولوی سید احمد صاحب بریلوی رح کی دوربین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر اس نصرانی فتنہ کا سدباب نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب سارا ہندوستان ان کے قبضہ میں ہوگا چنانچہ جہاد اسی خیال کا نتیجہ تھا۔ مسلمانوں پر ہمیشہ یہ الزام رکھا جاتا ہے کہ انھیں ہندوستان سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی، ان کی ہمدردی ہمیشہ عربوں اور ترکوں کے ساتھ رہی، مسلمانوں کو یہ طعنہ دینے والے دیکھیں کہ انیسویں صدی کے وسط میں مولوی سید احمد صاحب بریلوی نے جو تحریک جہاد کی تھی وہ کس خیال پر مبنی تھی۔ مومن خاں مولوی صاحب کے سرگرم متبع تھے۔ دوسرے لوگ جب اس تحریک کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہے تو مومن خاں کو مجبور ہو کر اُن کے خلاف اپنی آواز بلند کرنی پڑی۔ مومن خاں کا انتقال غدر سے پہلے ۱۸۵۱ء میں ہوگیا۔ ہندوستان رفتہ رفتہ انگریزوں کے قبضے میں جا رہا تھا۔ یہ دیکھ دیکھ کر مومن خاں کا دل دکھتا تھا دلی میں کوئی ایسا نہ تھا جس سے وہ اپنا درد دل کہتا سارا غبار وہ شعر کہہ کر نکالتا۔ تحریک جہاد کی وجہ بھی سن لیجئے:-

مومن حسد سے کرتے ہیں ساماں جہاد کا   ترسا صنم کو دیکھ کے نصرانیوں میں ہم

کلیات میں ایک جہادیہ مثنوی بھی موجود ہے۔ افسوس دلی اس غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی کی قدر نہ کرسکی اور اس تحریک جہاد کو کماحقہ کامیابی نہ حاصل ہوسکی ورنہ آج ہندوستان آزاد ہوتا۔ بہر حال سطحی نگاہوں نے مومن کی اس عصبیت کو دیکھ کر ان کے کلام کو بھی ٹھکرا دیا۔ لیکن اس جذبے کی قدر نہ کی جس کا وہ نتیجہ تھا اردو میں فارسی کی چست بندشوں کے اول اول استعمال کرنے کا سہرا جو آج غالب کے سر ہے اس کے بانی اردو شاعری میں مومن خاں ہوئے ہیں۔ جس دلی نے اس دور میں غالب کی قدر نہ کی وہ مومن کی قدر کیا کر سکتی تھی۔ ذوق کے کلام سے لطف اٹھانے والے مومن کی شاعری کیا خاک سمجھ سکتے تھے، زمانے نے پلٹا کھایا اور دنیا ذوق کو چھوڑ کر غالب سے لطف اندوز ہونے لگی اب وہ زمانہ بھی دور نہیں کہ مومن اردو شاعری میں غالب کے دوش بدوش نظر آئیں، فلسفہ اخلاق و تصوف کو جو لوگ شاعری میں ڈھونڈھتے ہیں اُن کے لئے مومن کی کلیات میں کوئی سامان دلچسپی کا نہیں لیکن جو لوگ اظہار جذبات اور لطیف تاثرات کے لطیف انداز بیان کو شاعری سمجھتے ہیں وہی مومن کی قدر کر سکتے ہیں۔ مومن فلسفہ اخلاق و تصوف کو شاعری موضوع نہیں سمجھتے وہ جذبات کی شاعری کو شاعری جانتے ہیں۔

جذبات کے اظہار کے لئے مومن نے نئے نئے اسلوب بیان اختیار کئے جہاں کہیں جذبات کا تجزیہ مشکل ہو جاتا ہے وہاں شاعر کو اپنی قدرت بیان اور زور طبیعت کا جوہر دکھانا پڑتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات اُسے نئی نئی بندشیں اور ترکیبیں ایجاد کرنا پڑتی ہیں اور بعض موقعوں پر خیالات اتنی پیچیدگی اختیار کر لیتے ہیں کہ معمولی سمجھ کا آدمی اُن سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ذوق کی سادگی بیان کے سامنے مومن و غالب کا رنگ نہ جم سکا۔ لیکن اسلوب بیان کی ندرت بھی کوئی معمولی چیز نہ تھی وہ وقت بھی آیا

کہ مومن اور غالب نگاہوں پر چڑھے اور وہی وجوہ جو کبھی مومن کے عدم مقبولیت کا باعث تھے اب قبول عام کا سبب بن رہے ہیں

تصویر کا دوسرا رخ

ایک ناقد کا فرض یہ ہے کہ تصویر کے روشن رخ کی طرح اس کے تاریک رخ کو بھی منظر عام پر لائے اس لئے یہ ضروری ہے کہ محاسن کے ساتھ عیوب کا بھی بیان کیا جائے۔ اصل یہ ہے کہ عرفی کی طرح مومن کی اٹھان بھی خوب ہوئی مگر افسوس کہ ترقی کا موقعہ نہ مل سکا۔ اگر مومن کی عمر وفا کرتی اور ان کی مجتہدانہ ایجاد پسندی اور لاابالیانہ وارستہ مزاجی اتنی مہلت دیتی تو اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری میں ان کا جواب نہوتا۔ انھوں نے شاعری کو فن کی حیثیت سے کبھی اختیار نہیں کیا البتہ تفریح کی نیت سے کیا اور اپنے دوسرے مشاغل کی طرح سامان دلبستگی سمجھا۔ یہی سبب تھا کہ اُن کے کلام میں چند نقائص رہ گئے جنھوں نے کلام کو پیچیدہ بنا دیا۔ غلاق کی تہ میں خیالات کی پیچیدگی اور زبان کی ناہمواری دو خاص عنصر ہیں جو قابل بحث ہیں۔ مومن پر بحث کرتے ہوے اس امر کو کبھی نظر انداز نکرنا چاہئے کہ وہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے گو وہ شاگردی چند ہی دن کی کیوں نرہی ہو صاحب شعر الہند نے شاہ نصیر کو بجا طور پر دہلی کا ناسخ لکھا ہے۔ مومن نے جب آنکھ کھولی تو دہلی میں شاہ نصیر کی استادی کا ڈنکا بج رہا تھا جب جوان ہوے تو دہلی میں ناسخ کا دیوان پہونچ چکا تھا جس کا وہ شہرہ تھا کہ بقول غالب ہمنے اور مومن خاں نے یہ عہد کر لیا کہ ناسخ کا تتبع کرنا چاہئے۔ لیکن یہ عہد کسی سے نبھ نہ سکا مومن خاں اپنے پُرانے رنگ پر آگئے اور میں نے میر کا طرز اختیار کیا۔ نسخۂ حمیدیہ میں غالب کی ایسی غزلیں ہیں جنمیں ناسخ کا رنگ تیزی کے ساتھ جھلکتا نظر آتا ہے اسی طرح کلیات مومن میں بہت سی غزلیں ایسی نظر آئیں گی جن میں نصیر اور ناسخ کا تتبع صاف ظاہر ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ شاعری بحیثیت (آرٹ) فن ناسخ کے یہاں حد کمال کو پہونچ گئی لیکن شعرائے دلی کیلئے جن کی شاعری سراسر جذبات کی شاعری ہے یہ تتبع مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ کلام میں آورد جذبات کے اثر کو کھو دیتا ہے۔ ذیل کی مثالیں میرے اس بیان کو واضح کر دیں گی

بن ترے اے شعلہ رو آتشکدہ تن ہو گیا　　　شمع قد پر میرے پروانہ برہمن ہو گیا
بسکہ میں سارے برس روتا رہا غم میں ترے　　　جیٹھ اور بیساکھ کا بھی چاند ساون ہو گیا
آخر اشکوں کی بھر آنے نے ڈبویا ہے مجھے　　　چشم کا سوراخ لو کشتی کا روزن ہو گیا

ظلم کا ثمرہ یہی تھا دیکھ کر گلہائے داغ　　　بید مجنوں دیکھ کر وہ سرو رعنا ہو گیا
ہے مشبک بسکہ روتے روتے چشم اے ماہ رو　　　شب جو اخگر آیا تو اک عقد ثریا ہو گیا

ناش کا ہمدم کفن لا تا کہ بس میں مر گیا　　　چلونوں سے جلوۂ خورشید سیاہ دیکھکر

یاد آیا سوئے دشمن اسکا جانا گرم گرم   پانی پانی ہوگیا میں کیچ دریا دیکھکر

دستو مرتا ہوں اس روئے عرق آلودہ پر   لاش بھی میری بہانا بعد مردن آب میں

(۱) خیالات کی پیچیدگی

مومن خاں فارسی کے نہایت اچھے شاعر تھے اس لئے متاخرین کے طرز سے ان کو خاص دلچسپی تھی، اسی وجہ سے اردو میں بھی بلا ارادہ وہی طرز اختیار کی اگرچہ اس کی تقلید کا اعتراف کرنا اُن کی شان اجتہاد کے خلاف تھا۔ علاوہ بریں خاں صاحب طبعاً روشِ عام سے احتراز کرنا اپنی خودداری کا مقتضا سمجھتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اردو میں میر و میرزا، سید انشا، و شیخ مصحفی کسی کی پیروی نہ کی بلکہ اپنی راہ دنیا سے الگ نکالی۔ حد ہوگئی کہ خیالات کی پرواز اور اسلوب بیان کی جدت میں غالب بھی ان سے پیچھے رہجاتے ہیں سننے والے سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں یہی بلند پروازی اور نازکخیالی جب اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو معمہ بنکر رہجاتی ہے مثال ملاحظہ ہو:۔

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب   تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا؛

ان سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی   مجھکو مری شرم نے رسوا کیا

تاثیر بیقراری ناکام آفریں   ہے کام ان سے شوخ شمایل کو تھامنا

کیا رم نکروگے اگر ابرام نہ ہوگا   الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا

ذکر اغیار سے ہوا معلوم   حرف ناصح بُرا نہیں ہوتا

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے   فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہونگے

لیا ہے دل کے عوض جان دی رقیب تو دل   میں اور آپ کی سوداگری زیان کے لئے

(۲) زبان کی ناہمواری:۔

اساتذۂ دہلی باستثنائے ذوق معنی کو الفاظ پر ترجیح دیتے ہیں جس کا اکثر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود ان کے کلام میں صحت زبان اور درستی بندش کی خامیاں جا بجا نظر آتی ہیں یہی حال مومن خاں کا ہے کہ انھوں نے کبھی صحت زبان کی طرف توجہ نہ کی اس بات کو ان کے رتبے سے فروتر سمجھے یا بالاتر مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ اس بارے میں مرزا غالب سے بھی زیادہ بدنام ہیں اور بجا طور پر بدنام ہیں، خیالات کی نزاکت اور ندرت کے علاوہ بندش کی تعقید خاص طور پر ان کے کلام کے اغلاق کی ذمہ دار ہے۔ دیوان ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہے، یہاں چند مثالیں درج کیجاتی ہیں۔

بے حجابی کا گلہ کیجیے تو کہتا ہے ترے   پردۂ چشم کی تقصیر کہ حایل نہ ہوا

شوخ کہتا ہے بے حیا جانا   دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا

اس حصے میں زیادہ تر رسالہ اردو سے اکثر اخذ کیا گیا ہے مدیر ۱۲

ہاں جوشِ تپش چھیڑ چلی جائے کہ پر تو　　جھڑ جائیں گے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا
عزلتِ گریۂ خونیں رہا نکر ہمدم　　لباس یعنی پہنتے نہیں مسلمان سرخ
خدایا شکر اسلام تک پہونچا کہ آ پہونچا　　لبوں پر دم بلا ہی جوشِ خونِ شوقِ شہادت کا
ہے کفر و بدعت ایک نہیں تار سبحہ سے　　زنار مومن آئے پھر کیوں برہمن کی یاد
لکھ کے بدستیٔ غم تاکہ وہ میکش پڑھ لے　　باندھ دیتا ہوں سر شیشۂ صہبا کاغذ
غم خانہ تنگ و تار ہے اور ہم سیاہ روز　　جلتے ہیں یعنی چاہیے آٹھوں پہر چراغ
وہ گردن دیکھ یہ حالت ہوئی تغیرِ شیشہ کی　　کہ تھمتی ہی نہیں ہچکی ہوئی ہر دیر شیشہ کی
محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے　　منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

ان کی عادت ہے کہ جملے کا ایک ٹکڑا ایک مصرع میں اور دوسرا ٹکڑا دوسرے مصرع میں لاتے ہیں جن کی مثالیں اوپر گذری ہیں کبھی نامانوس ترکیبوں اور ثقیل الفاظ سے کبھی مشکل اصطلاحات اور اشارات بعیدہ سے شعر کو گورکھ دھندا بنا دیتے ہیں جیسے بندۂ شور حجر، ادراک سیمیاے عرش شموس، نہ فلک نو آفریں، وجہ عطاس غزدجاہ، تخجلت آب پیکری، زبان بیدہ سایل وغیرہ، یا اطلاؤس، انیوس، ادانیوس، شاموس بلیوس جام نمرود، فال اختر، قمر جاکر، مثلث عامل، تجدد امثال، اتنائے سدوم، حدیث صغانی وغیرہ۔

وہ نعرۂ عملۂ سحابی　　جس نے کہ اس آگ کو بجھایا

کو پڑھکر فوراً ذہن کا قصۂ حضرت خلیل کی طرف منتقل ہونا یا

جلتا ہوں اہل نار کی تبدیل جلد سے　　مومن غضب ہے لذت آتش فزائے داغ

سے معاً آیۂ کریمہ بدلناہم جلوداً غیرہا تک خیال کا پہونچنا۔ یا

تیشہ کچھ دشنۂ شیر ویہ نہیں اے غیرت　　اپنے ہی خوں سے مگر دامن فرہاد بھرے

کو سنکر شیرویہ کے اپنے باپ (خسرو پرویز) کو قتل کرنے کے تاریخی واقعے تک حافظے کا رسا ہونا دشوار اور یقیناً دشوار ہے۔

خاں صاحب نے باوجود تبحر علمی بے پروائی سے بعض الفاظ کا غلط استعمال کیا ہے مثلاً شمر بسکون میم کو شمر بفتح میم لکھا ہے یا مضاف الیہ کی نون آخر کا اعلان کیا ہے، جیسے "یہ دیکھ لو کہ مجھے طاقت بیان نہیں" اسی سلسلہ میں ہم اتنا اور اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ مومن نے بعض موقعوں پر ردیف بالکل بے کار رکھی ہے جیسے:۔

تجھ پہ طوفاں اٹھائے لوگوں نے　　مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے
کل دیکھ کے وہ عذار آتش　　کیا کیا ہی جلی ہے یار آتش

یہ نقائص ان کے کلام میں نہ ہوتے تو بہتر تھا، تاہم ان کے کمال میں فرق نہیں آسکتا۔

شاگردانِ مومن

مثنوی نہم الموسوم بہ جنین غم میں مومن نے اپنے بعض شاگردوں کا تذکرہ کیا ہے ملاحظہ ہو

کون سے شاگردرہ استاد فن　　بے سخن ہے دلربا جن کا سخن
وحشت ومضطر کرم تسکیں وہاں　　..................
اکبر وعظمت سرافراز سخن　　..................
شیفتہ سر دفتر اہل قلم　　نکتہ خاطر نشاں جن کا رقم

شاگردانِ مومن وغالب نے مومن اور غالب کی چست و نادر ترکیبیں بحال رکھیں اور صفائی زبان کا زیادہ اہتمام کیا۔ آج حسرت، فانی، جگر نے اردو شاعری میں جو رنگ اختیار کیا ہے اس کی بنا مومن اور غالب نے ڈالی تھی۔ اردو شاعری ذوق کے نقش قدم پر چلکر ترقی نہیں کرسکتی۔ آج تو وہی مومن کا اجتہاد کام آرہا ہے جو کبھی بری نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ مومن کے کئی ایک شاگردوں نے ان کے مرنے کے بعد مرزا غالب سے اصلاح لی۔ جن شاگردوں کا کلام تلاش وجستجو سے دستیاب ہوسکا اُن کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے۔

آشفتہ۔ حکیم سید منور علی خلف سید علی نواز رضوی سادات بارہا سے تھے۔ دلی ہی میں رہتے تھے:۔

بہت روئے تو اپنی جاں کھو لی　　کسی کا ہمنے مبتلا ہو لیا کیسا
سنا تھا ہمنے آشفتہ کو کوئی دم کا مہماں ہے　　کئی دن ہوگئے اسکو نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے

آہی۔ میر عبدالرحمٰن خلف میر حسین تسکین۔ مومن خان کے داماد اور ان کی کلیات کے مرتب ہیں:۔

اُٹھ کہیں ہے آمد آمد اس ستمگر کی وہاں　　اہل محشر مجھکو یہ مژدہ سنا کر لے گئے
ہے غلط دہوم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر　　شہر میں چاک کسی کا تو گریباں ہوتا

قلق حکیم مولا بخش میرٹھی۔

بے اعتباریوں نے مری تجھکو کھو دیا　　ہے مجھ میں جو نہاں وہی تیرا ظہور تھا
نہ ہو آرزو کچھ یہی آرزو ہے　　فقط میں ہی میں ہوں تو پھر تو ہی تو ہے
محبت میں کہاں شرکت گوارا　　او ٹھائے نالہ کیوں تہمت اثر کی
دیکھو ستم ظریفی دود دل وجگر کی　　اک آسماں کو پھونکا اک آسماں بنایا
فصل بہار یہی گذری یونہی ساری　　یاں آشیاں بنایا واں آشیاں بنایا
کچھ تماشا ہے کھیل ہے کیا ہے　　اک زمانے کو قتل کر بیٹھے

بیتاب نواب عباس علی خاں رامپوری

داد سے روز جزا کے بھی رہونگا محروم — یہ نظر آئی ہے طول شب ہجراں مجھکو
سحر نہ دیکھنی ہمسکو نصیب ہو یارب — شب فراق میں اپنی یہی دعا ہوگی

بیمار شیخ علی بخش سنبھل مراد آباد کے رہنے والے۔ طور کلیم۔ بزم سخن۔ خمخانہ جاوید میں مصحفی اور غفلت کے شاگرد بتائے گئے ہیں مولانا حسرت موہانی کی تحقیق ہے کہ بیمار قدرت اللہ شوق کے شاگرد ہیں۔ اڈیٹر نگار نے نظام شاہ رامپوری کے تذکرے میں انھیں مومن کا شاگرد لکھا ہے :۔

کون پرساں ہے حال بسمل کا — خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا
لب جو کون سیر کو آیا — موج منہ چومتی ہے ساحل کا
سانس آہستہ لیجیو بیمار — ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

تسکین میر حسین ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی۔ مومن خاں کے ارشد تلامذہ میں انکا شمار ہوتا ہے :۔

کوچۂ یار میں میں نے تسکیں — پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا
تسکین کروں کیا دل مضطر کا علاج اب — کمبخت کو مر کر بھی تو آرام نہ آیا
تسکین نے لے کے نام ترا وقت مرگ آہ — کیا جانے کیا کہا تھا کسی نے سنا نہیں
قاصد آیا ہے وہاں سے تو شماتم تو سہی — بات تو کرنے دے اس سے دل بیتاب مجھے
فتنۂ محشر کا تھا سب کو گماں — تجھکو پہچانا تری رفتار سے
اب یہ حالت ہو کہ اُن سا بیدرد — میرے مرنے کی دعا مانگے ہے
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے — کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

تنویر۔ مرزا غلام فخر الدین مرزا صابر کے بھائی تھے۔ کبھی کبھی مومن سے بھی اصلاح لی ہے

اب ہے کیا باقی جو کاوش ہو تری دست جنوں — چاک داماں ہو گیا ٹکڑے گریباں ہو گیا

برق۔ قاضی نجم الدین ابن سراج الدین سکندر آبادی۔

اے برق تیز دستی وحشت کو دیکھنا — دامن کو سیتے سیتے گریبان نکل گیا
وہ بھی نہ رہا جوش محبت میں الٰہی — پہلے جو مری آہ میں تھوڑا سا اثر تھا
وحشی نے تیرے خاک اڑائی یہاں تلک — ملتا نہیں زمیں کا پتہ آسماں تلک
حرم و دیر کے جھگڑے تری چھپنے سے پڑے — تو اگر پردہ اٹھا دے تو تو سہی تو ہو جائے

راحت۔ مرزا محمود بیگ دہلوی

ہم سو تو وہ بھی چھٹے اور دل شیدا چھوٹا		یاد کس کس کو کریں خیر جو چھوٹا چھوٹا

راسخ۔ سعادت علی خاں متوطن دہلی

ہوں تو آنکھوں میں پر نہیں یہ خبر		سرمہ ہوں یا غبار ہوں کیا ہوں

سالک میرزا قربان علی بیگ سالک غالباً مومن کی حیات تک خاں مرحوم سے اصلاح لیتے رہے۔ اس کے بعد غالب کے شاگرد ہو گئے صاحب دیوان ہیں۔

واں دخل وہم کو نہ گزر ہے خیال کا		اچھی جگہ ہے دل کو بھروسہ وصال کا
دل وہ کافر ہے کہ مجھکو نہ دیا چین کبھی		بیوفا تو بھی اسے لیکے پشیماں ہوگا
یوں عمر گذاری تری فرقت میں کہ ہر دم		جینے کا گماں تھا مجھے مرنے کا یقین تھا
جب تھک کے تری راہ میں بیٹھو تو کھلا		جو کھوئے ہوئے ہیں دہن کچھ پائے ہوئے ہیں
ہم بیٹھے ہیں یوں منتظر اس راہ گزر میں		گویا کہ اسی شرخ کے ٹھہرائے ہوئے ہیں

صاحب۔ نام امۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی صاحب گلشن بیخار نے لکھا ہے کہ "بتقریب مدادا با مومن خاں کار ش افتادہ ماہر چند کار با در دو دوا بود مثنوی قول غیں، نام کہ از مصنفات خاں معزے الیہ است شرح نسخہ حسن وجمال ہماں موزوں قد است القصہ بفیض شاش بشعر و شاعری میل کرد از موزونیٔ قامت بموزونیٔ طبع گرایندہ و از آرایش زلف پیچاں بموشگافی اشعار پیچیدہ ازدست :۔

گنہ کیا صنم کے نظارے میں زاہد		خدا نے یہ جلوہ دکھایا تو دیکھا
کھولے ہیں اس نے پیرہن تو سفی کے بند		تہ کر رکھے نسیم سے کہدو قبائے گل
جو خطا جبیں کا مرے کاتب ہر اسی کو		دکھلا تو مرا نامۂ اعمال الہٰی

شیفتہ۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ :۔

ہاے اس برق جہاں سوز پہ آنا دل کا		سمجھے جو گرمی ہنگامہ جلانا دل کا
کس لئے لطف کی باتیں ہیں پھر		کیسا کوئی اور ستم یاد آیا
کہتا تھا وقت نزع کے ہر اک سے شیفتہ		دینا کسی کو دل تو وفادار دیکھ کر
آشفتہ زلف چاک قبا نیم باز چشم		ہیں صحبت شبانہ کے ظاہر نشاں ہنوز
اے تاب برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی		کچھ رہ گئے ہیں خار و خس آشیاں ہنوز
یا اپنے جوش عشوہ پیہم کو تھام لے		یا کہئے میں بھی نالۂ شورش ادا کروں

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں
کچھ اور بیدلی کے سوا آرزو نہیں اے دل یہ یاد رکھیو کہ ہم ہیں تو تو نہیں
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
اک نیم ناز بس ہے ہماری ہلاک کو کچھ بھی نہ کیجیے دیکھ کے بس مسکرائیے

ظہور۔ ظہور علی ابن مولوی نسخ علی ہرپالوی مومن سے بھی اصلاح لی ہے۔

اے اشک مرے دیدۂ نمناک سے باہر جاتا ہے کہ ہر قطرہ تو لخت جگر ہے

عظمت۔ پیر عظمت اللہ ولد پیر قدرت اللہ جذب دہلوی۔

نام عظمت ہے نہ شوکت نہ شکوہ کیا ہی اس نام سے گھبراتا ہوں لو

شورش۔ نام غلام احمد

نامہ جو بنا لائے ہو قاصد تو صنم کا ایمان نکھو تا کسی مایوس کرم کا
کیا جانے عدو خون جگر پینے کی لذت شورش سے مزا پوچھیے تلخاب الم کا

صفیر۔ میاں جان دہلوی۔

کہتے ہو جان جائے تری اور تمہیں ہو جاں ہے ہے خدا نخواستہ یہ تم نے کیا کہا
ہوا ہو سہو تو پھر خوب یاد کر لیجیے کہ رہ نجائے کوئی جور آسماں کیجیے

قیصر۔ مرزا خدا بخش نواسہ شاہ عالم

تو لطف کرے یا کہ رہے خوش ہو کہ ناخوش اس بات پہ مرتا ہوں کہ عاشق ہوں ترا میں

کاظم۔ کاظم علی منڈاور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔

اے لعل اشک ہم تجھے آنکھوں میں لیں نہ کیں اور تو ہمارے راز کو یوں برملا کرے

کرم۔ شیخ غلام علی ضامن دہلوی کچھ دنوں حیدرآباد میں رہے۔ بھوپال میں انتقال کیا۔

ہاتھ ہو دیگا مرا اور ترا داماں ہوگا چاک جب صبح قیامت کا گریباں ہوگا
سوویں گے جور طاقت و تاب و تواں تلک لیکن یہ پوچھتے ہیں تجھی سے کہاں تلک

نسیم۔ مرزا اصغر علی نسیم کچھ دنوں اصغر بھی تخلص کیا۔

جب دیکھیے قرار نہیں ایک شکل پر میرا سا اب تو حال ہوا روزگار کا

جب اور کسی پر کوئی بیداد کروگے — یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے
کہے دیتی تھیں یہ نیچی نگاہیں — کہ بالائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا
نام میرا سنتے ہی شرما گئے — تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا
ہاتھ میں خنجر کمر میں تیغ تیز — یہ ارادے ایک مشت خاک پر
سفر ہے دشوار خواب کب تک بہت بڑی منزل عدم ہے — نسیم جاگو کمر کو باندھو اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

وحشت - میر غلام علی خاں وحشت ابن میر فرحت اللہ خاں مرادابادی

دل میں عدو کے بڑھ گئی کیا الفت آپ کی — کچھ ان دنوں میں پہلے سے لطف و کرم نہیں
میرے مرنے کی خبر غیر کو یوں دیتے ہیں — مرگیا وحشت جانباز تری جان سے دور
کیوں نہ باطل سمجھوں اقرار وفا — سحر ٹپکے ہے تری گفتار سے۔

یاس - خیر الدین دہلوی۔

وصل کی شب کیا ابھی ہے تو شرمایا ہوا — اب تلک ہے آنکھ میں شب کا سماں چھایا ہوا

یاس کا مصرع اولیٰ یوں تھا۔ اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا

شہرت وصل نہ پینے دو نہ سم کھانے دو — کیا قیامت ہے نہ جینے دو نہ مرجانے دو

سید امتیاز احمد

گذشتہ ماہ کے رسالہ کے متعلق بعض اشتباہات

(۱) ابوالخمر (ڈراما ترجمہ مجنوں گورکھپوری) کے متعلق غلطی سے یہ اطلاع درج ہوگئی ہے کہ یہ ڈراما برنارڈ شا کا ہے۔ یہ ڈراما اصل میں ٹالسٹائی کا ہے

(۲) "علماء کرام کی ذہنیت" کے عنوان سے جو مقالہ گذشتہ ماہ کے رسالہ میں شایع ہوا ہے اس کے متعلق جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے بہشتی زیور اور بہشتی گوہر میں کوئی امتیاز نہیں کیا میں نے بہشتی گوہر کے متعلق اظہار خیال کیا ہے جس کا تعلق بہشتی زیور سے کچھ نہیں ہے۔ (اڈیٹر)

اس ماہ کا رسالہ

مومن کا تغزّل

سن رکھو سیکھ رکھو اس کو غزل کہتے ہیں
مومن اے اہلِ فن اظہارِ ہنر کرتا ہے

مدت سے ارادہ تھا کہ مومن کی شاعری پر ایک مبسوط مضمون لکھوں مگر افکار و مشاغل نے کبھی اتنا موقع نہیں دیا۔ جب حضرت نیاز نے مومن پر بہترین مضمون کے واسطے انعام کا اعلان کیا میں نے تہیہ کر لیا کہ اب اس موضوع پر قلم نہ اٹھاؤں گا۔ مگر ان کے الٹیمیٹم نے مجبور کر دیا۔ اب جو کچھ لکھ رہا ہوں محض امتثالِ امر ہے۔ انعامی مضمون سے کوئی سروکار نہیں۔ کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میں اپنے مضمون کو انعام کا مستحق سمجھتا ہوں حاشا للہ اس کا وہم و گمان بھی نہیں۔

مومن کی شاعری میں چند ایسی خصوصیتیں ہیں (میں صرف غزل سے بحث کروں گا) جو اردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں یا الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتی ہیں۔

اوّل۔ اُس نے اپنے دائرہ تخیل کو بہت محدود کر دیا ہے۔ مسائل تصوف و سائنس و فلسفہ کی کہنا چاہئے کہ جھلک بھی نہیں صرف ایک متلون شاہدِ مجازی سے محبت ہے اور اسی کے تمام لوازم ہیں ادا و ناز و غمزہ و کرشمہ کی مصوری ہے اپنے یا غیر کے جذبۂ رشک و حسد و رقابت کی نقاشی ہے ادا بندی و معاملہ نگاری ہے واردات حسن و عشق کا تذکرہ و تجزیہ ہے مگر سب مجاز کا پہلو لئے ہوئے تاہم اس محدود دائرہ میں اُس نے ایسی حیرت انگیز جدت اور تنوع سے کام لیا ہے کہ جو شعر ہے نیا ہے اور اسی کے ساتھ بیحد دلکش۔

دوم۔ باوجودیکہ اشعار میں نہ تو اسرارِ حکمیہ ہیں نہ دقیق مسائل علمیہ۔ نہ الفاظ مشکل یا غیر مانوس ہیں نہ محذوفات ہیں نہ مقدرات فرض کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر بھی اکثر اشعار ایسے ہیں جن کا مفہوم سمجھنے میں نہایت کاہش اور دماغ سوزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف اندازِ بیان خیال کو مشکل بنا کر ایسی صورت میں پیش کرتا ہے کہ مطلب تک ذہن کی رسائی بآسانی نہیں ہوتی۔ خود کہتے ہیں ؎

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہاں ہے لیک معنی بند مضموں یاب اپنا سا

اس دشواری مطالب کا ایک سبب ایہام بھی ہے اپنے معاصرین میں غالباً مومن ہی ایسا شاعر ہے جس نے ایہام کا احیا کیا ورنہ یہ اسلوب متروک ہو چکا تھا کہیں ایجاز نے معنی میں تنوع پیدا کر دیا ہے مگر یہ صفت مومن اور دیگر اساتذہ میں مشترک ہے۔

صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

سوم جس خوبی سے وہ اپنا تخلص مقطع میں لاتا ہے دوسرے شاعر کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ تخلص ہی ایسا ہے جو کافی بات اسی قسم کے دوسرے الفاظ کے تقابل یا تناسب سے محض تخلص نہیں رہتا بلکہ اور معنی بھی دیتا ہے مگر اس قسم کے تخلص اور بھی ہیں مثلاً حسرت جرأت سودا وغیرہ وغیرہ۔ ان شاعروں نے اپنے تخلص سے مومن کی طرح فائدہ نہیں اٹھایا۔

مومن کا معشوق عورت ہے۔ میں نے جہاں تک مطالعہ کیا اس کے دیوان میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملا جس سے وثوق کے ساتھ کہا جا سکے کہ یہ معشوق کوئی امرد یا سبزہ آغاز نوجوان ہے۔ حالانکہ غالب بھی اس بلا سے نہیں بچے ؎

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا
(غالب)

اور صفات جو مومن کے لئے مخصوص نہیں بلکہ اس کے معاصرین میں بھی پائی جاتی ہیں مجملاً یہ ہیں۔

فارسی کی خوشنما ترکیبوں کو سلیقہ سے برمحل صرف کرنا۔ اس صفت میں وہ غالب کا مدمقابل ہی نہیں بلکہ اس لحاظ سے پیش پیش ہے کہ انکی طرح ایسی ترکیبوں کے استعمال میں بے اعتدالی نہیں برتی۔ جو ترکیب ہے خوبصورت ہے اور گویا اسی جگہ کے لئے وضع ہوئی تھی۔ بعض ترکیبیں فارسی شعراء سے مستعار لینے کے بجائے اس نے خود گڑھی ہیں۔ انمیں بھی وہی لطافت ہے۔ اصول صرف و نحو کے اعتبار سے ان کی صحت میں تامل نہیں البتہ ان حضرات کے اعتراض کا کوئی جواب نہیں جو ایسی ترکیبوں کو جائز نہیں سمجھتے جنکی سند شعرائے فارس کے دواوین میں نہ ملے۔

مومن کے دیوان میں ایک شعر بھی شاید آپکو ایسا نہ ملیگا جس کی بندش سست ہو یا انداز بیان شاعرانہ نہو یا خیال میں تازگی نہ ہو۔ فن کے لحاظ سے یہی شاعری کی معراج کمال ہے۔

نفسیات کے دشوار ترین مسایل کو سادہ الفاظ میں دلکش طریقہ سے بیان کیا ہے البتہ جیسا پہلے عرض کیا جا چکا تصوف نہیں ہے۔ دو چار شعر کھینچ تان کر شاید اس زمرہ میں آ جائیں ورنہ خیریت ہے مگر یہی کمی مومن کی شاعرانہ عظمت کو اور زیادہ نمایاں کرتی ہے۔ اور شاعروں کے بیشتر اشعار میں وسعت معانی صرف ان مسایل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے حقایق و معارف کی بحث کا یہ لازمی نتیجہ ہے لیکن مجردات کو چھوڑ کر نفسیات کے مسایل کو مختصر الفاظ میں نظم کر دینا آسان کام نہیں۔ مومن کو زبان پر ایسی قدرت ہے اور فطرت انسانی کا اسقدر گہرا مطالعہ کیا ہے کہ واردات قلبیہ محسوسات ذہنیہ کو متشکل کر کے آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے بعض اشعار قابل گرفت ہوں تو ہوں مگر جہاں تک فن کا واسطہ ہے اُس کا شعر مکمل ہے۔

مثال کے طور پر چند اشعار درج کر کے اس مضمون کو جس کی تشنگی کا اعتراف اور اسی کے ساتھ تاسف ہے ختم کرتا ہوں۔

انتخاب اشعار میں کوئی خاص التزام نہیں کیا گیا۔ اپنے انتخاب سے (اصل دیوان سے نہیں) الف کی ردیف شروع کی افسوس وہ بھی ختم نہو سکی۔ اسمیں سے بھی متعدد ایسے اشعار جو بہت اچھے اور شرح طلب تھے کلیجہ پر پتھر رکھ کے چھوڑ دیئے۔

کہتے ہیں ؎

عنایت کر مجھے آشوب گاہ حشر غم اک دل
کہ جس کا ہر نفس ہم نغمۂ شور قیامت کا

پہلے مصرع میں ایسے دل کی تمنا کی ہے جو صرف تمام عالم کے غم و رنج کا مجموعہ ہو (لفظ حشر میں یہ انبوہ و آلام مضمر ہے) بلکہ اس ہنگامہ زار میں بھی ایک شورش برپا کر دے "آشوب گاہ حشر غم" ہو تاکہ میرا ہر نفس شور قیامت کا ہمنوا ہو جائے۔ دل دردمند و غم آشنا کی اس سے بہتر کیا تعریف ہو سکتی ہے اور یہ صرف تراکیب فارسی کی تراش خراش اور ان کا برمحل استعمال ہے جس سے مطلب اس قوت کے ساتھ ادا ہو گیا ؎

کیا روؤں خیرہ چشمی بخت سیاہ کو
واں شغل سرمہ ہے ابھی یاں نیل ڈھل گیا

خط کشیدہ الفاظ کی ترکیب و معنویت قابل ملاحظہ ہے۔ دوسرے مصرع میں ہندی کا محاورہ نیل ڈھلنا نظم ہے جس کے معنی ہیں نزع میں آنکھوں کا بے نور ہو جانا، پتلیاں پھر جانا۔ وہاں معشوق سرمہ لگا رہا ہے یہاں نیل ڈھل چکا ہے یعنی محاورہ کے علاوہ سرمہ و نیل میں رنگ کے لحاظ سے جو مناسبت ہے ظاہر ہے مگر پہلے مصرع سے اس لفظ نیل نے جو عجیب و غریب ربط پیدا کیا ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ نیل کی سلائی آنکھوں میں پھرنے سے بصارت زائل ہو جاتی ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ شام وعدہ معشوق مصروف آرائش ہے مگر قسمت کی خوبی کہ اضطراب شوق نے عاشق کی حالت غیر کر دی۔ سرمہ اور آنکھ کی رعایت سے بخت کی شکایت ان الفاظ میں کرنا کہ ع

کیا روؤں خیرہ چشمی بخت سیاہ کو

کس قدر بلیغ ہے جس نے پورے شعر میں تازگی کی ایک روح پھونک دی ورنہ مضمون فرسودہ و پیش پا افتادہ ہے۔ اس فقرہ (خیرہ چشمی بخت سیاہ) نے شعر کے مفہوم کو اور وسیع کر دیا۔ معشوق مجھ سے ملنے کو آرائش میں اس قدر اہتمام کر رہا تھا مگر بدبخت ناساعد کی خیرہ چشمی کہ نہ سمجھا اور بیتابی انتظار نے قبل از وقت مجھے مار ڈالا ؎

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

بہت مشہور شعر ہے اور اس کی خوبیاں کسی شرح کی محتاج نہیں۔ معشوق کے نقش پا کا سجدہ ذریعۂ عشق ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ یہ نقوش کوچۂ رقیب کی رہبری کرتے ہیں۔ وہ اور دیکھنے والے یہ تو سمجھیں گے نہیں کہ عاشق نقش پا کے سجدے کر رہا ہے بلکہ یہ خیال کرینگے کہ رقیب سے مرعوب ہو گیا اور اس کی خوشنودی کے واسطے ناصیہ فرسائی کرتا ہے لہذا کوچۂ رقیب میں نقش پا کے سجدے باعث ذلت ہوئے۔ سر کے بل (لکھنؤ میں بھل) چلنا اظہار انکسار کے

موقع پر استعمال ہوتا ہے ؎

یہ جوشِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت
دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا

جذبۂ یاس کی تصویر کس خوبی سے کھینچی ہے۔ وصل سے مایوس ہو کر اپنے مرنے کی دعا مانگی جو اس طرح قبول ہوئی کہ معشوق قتل پر آمادہ ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ قربِ قاتل و مقتول ہے اب وصل کوئی مشکل نہ تھا مگر جوشِ یاس نے دعائے وصل سے باز رکھا ورنہ دعائے مرگ کی طرح وہ بھی مستجاب ہوتی ؎

ذرا ہو گرمیٔ صحبت تو خاک کر دے چرخ
مرا سرور ہے گلِ خندۂ شرر کا سا

گلِ خندۂ شرر کی ترکیب کتنی خوبصورت اور معنی خیز ہے۔ تناسباتِ لفظی نے معانی میں جو وسعت پیدا کر دی ہے اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں شعر کا مطلب صاف ہے اور کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ؎

گر وہاں بھی خموشی اثر افغاں ہوگا
حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

افغاں بجائے فغاں اب متروک ہے۔ یہاں بھی فارسی کی ایک خوبصورت اور مومن کی وضع کردہ ترکیب نے ایک بڑے مطلب کو مختصر الفاظ میں ادا کر دیا۔ خموشی اثر افغاں یعنی ایسی فغاں جس کا اثر خموشی ہے ؎

ان سے بدخو کا کرم بھی ستمِ جاں ہوگا
میں تو میں غیر بھی دل دے کے پشیماں ہوگا

معشوق بدخو ہے یہ اس کی سرشت ہے جو بدل نہیں سکتی۔ ایک مومن ہیں ایک غیر۔ کہتے ہیں کہ میں نشانۂ ستم ہوں اور غیر موردِ کرم ہے میں تو اسے بدخو سے محبت کر کے پشیمان ہوا اگر غیر خوش نہوا اُس کا بھی یہی انجام ہوگا کیونکہ معشوق کی تند خوئی کرم میں ایک زہر آلود تیر چھپا دے گی۔ حاصل یہ ہے کہ معشوق کی خوئے بد کا اثر کرم کو بھی ستم میں مبدل کر دے گا۔ ایسے معشوق کو چاہنے میں سوائے پشیمان ہونے کے اور کیا دھرا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ کو اخلاقاً رقیب سے بہتر ثابت کیا ہے ستم اٹھاتے اٹھاتے محبت سے پشیمان ہونا اسقدر مذموم نہیں جتنا معشوق کے کرم کے باوجود پشیمان ہونا ہے۔ ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ ممکن ہو کہ رقیب بوالہوس ان کا قول باور کر کے معشوق کی محبت سے ہاتھ اٹھالے اور اس طرح ان کی اشک شوئی ہو جائے ؎

خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

ہمیں اتنا نہ ستا کہ جان سے عاجز ہو کر مرنے کی آرزو کریں۔ ایسی صورت میں تیرے ارمان کے سوا دل میں خواہش مرگ کو بھی جگہ ملے گی اور اس میں تیری منفعت حسن ہے کیونکہ دل عاشق میں تیری آرزو کے سوا اور کسی خواہش کا امکان بھی نہ ہونا چاہیئے ؎

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

کیا مزے کا شعر ہے۔ معشوق (دم رخصت) کہتا ہے کہ میرے ہجر میں تیرا جینا مشکل ہے۔ بظاہر اظہار ہمدردی ہے مگر عاشق سمجھتا ہے کہ معشوق کا یہ قول محبت یا ترحم پر مبنی نہیں ہے بلکہ ادائے ناز ہے جس کا منشا یہ ہے کہ عاشق کو میری محبت اور میری جدائی کے صدمے کے علاوہ ان الفاظ کی یاد بھی دم رخصت کہی ہیں تڑپا تڑپا کے مار ڈالے۔ عاشق اپنے دل میں کہتا ہے کہ اگر اسے میرا کچھ بھی خیال ہوتا تو مجھ سے جدا ہی کیوں ہوتا۔ لہذا جس طرح معشوق نے بیدردانہ الفاظ سے زخموں پر نمک چھڑکا تھا ویسا ہی اس کو جواب دیا کہ ہجر میں جینا مشکل سہی مگر تم سے بے رحم پر مرنے (عاشق ہونے) سے آسان ہے۔ تمہارے عشق میں ہر طرح مشکل ہے ؎

کیونکر امید وفا سے ہو تسلی دل کو
فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

معشوق نے وعدہ کیا اور امید ہے کہ وعدہ پورا ہوگا تاہم دل کو تسکین نہیں ہوتی کیونکہ یہ فکر لگی ہوئی ہے کہ معشوق وعدہ کر کے پشیمان ہوا ہوگا اس لیے کہ ایفائے وعدہ تو بڑی چیز ہے وعدہ کرنا ہی اُس کی فطرت اور انداز ستم کے خلاف ہے خاطر مروت یا کسی مصلحت یا مجبوری سے وعدہ کر لیا ہے مگر پچھتاتا ہوگا کہ وعدہ کیوں کیا۔ عاشق کو گوارا نہیں کہ معشوق پشیمان ہو لہذا ایفائے وعدہ کی امید سے دل کو تسلی نہیں ہوتی وہی الجھن اور بے چینی ہے جو وعدہ خلافی یا وعدہ نہ کرنے کی صورت میں لاحق ہوتی ہے ؎

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

ہر لحاظ سے ایک لاجواب شعر ہے جب درد رگ و پے میں ساری ہو گیا تو اب درماں موجب ہلاکت ہے۔ یہ آخری ٹکڑا شعر کو غالب کے اس مطلع سے بھی بلند کر دیتا ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

مومن کے شعر میں دردِ بے دوا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے درمان کی فکر مہلک ہے۔ درد رگ و پے میں ساری ہے بہتوں نے کہا ہوگا مگر "جان کے عوض" کا اضافہ صرف مومن کا حصہ ہے اور اسی نے شعر میں تمام خوبیاں پیدا کر دیں ؎

بات کرنے میں رقیبوں سے ابھی ٹوٹ گیا
دل بھی شاید اُسی بدعہد کا پیماں ہوگا

معشوق نے وعدہ کیا تھا جس کا ایفا تو درکنار عاشق کی موجودگی میں رقیبوں سے ہمکلام ہوا اور اس سے ملتفت نہیں ہوتا معشوق کے اس طرز عمل سے عاشق کا دل ٹوٹ گیا جس طرح معشوق کا پیمان بات کی بات میں ٹوٹ گیا۔ دل کی تشبیہ معشوق کے پیمان سے (دونوں نہایت بودے) کسقدر لطیف ہو۔ اس کی خوبیاں یہیں تک ختم نہیں ہوتیں۔ اسی کے سبب سے پردے پردے میں معشوق کا بھی گلہ ہو گیا

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

حیرت عشق نے معشوق کو بھی محو کر دیا۔ یہ مطلع محاکات کی عمدہ مثال ہے ؎

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے
آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

لطف محاورہ و زبان ملاحظہ فرمائیے پہلے مصرع میں آنکھ نہ لگنا بمعنی نیند نہ آنا ہو اور دوسرے مصرع میں آنکھ لگ جانا بمعنی عاشق ہونا ہو۔ یہ امر بدیہی ہو کہ عشق میں نیند اڑ جاتی ہو ؎

غیر عیادت سے برا مانتے ہیں
قتل کیا آن کے اچھا کیا

دیکھئے ان سادہ الفاظ کے انداز بیان نے کسقدر معنی پیدا کئے ہیں معشوق دراصل عاشق زار کو قتل کرنے آیا تھا جو انتہائے بیرحمی ہے گو معشوق کی شان یہی ہو مگر ہائے عشق جو معشوق کے آنے کو عیادت پر محول کرتا ہو اور قتل کو حیائے معشوق کا پردہ بتاتا ہو اس کے ساتھ اظہار رشک کرتا ہو جو جان عاشقی ہو۔ کہتا ہو کہ تو دراصل میری عیادت کو آیا تھا مگر اُسی کے ساتھ تجھے غیروں کا بھی پاس تھا اور اسی لئے کہ وہ بدنما نہیں لگے سمجھانے کو تو نے مجھے قتل کر ڈالا تاکہ اب وہ عیادت کا شکوہ نہ کر سکیں بلکہ یہ سمجھیں کہ تو میری عیادت کو نہیں گیا تھا بلکہ قتل کرنا مقصود تھا۔

قافیہ "اچھا" سے ایک اور نازک مطلب پیدا ہوتا ہو۔ میں قتل ہوا اچھا ہوا اب رقیبان بوالہوس اگر بیمار ہوں گے تو اپنی جان کے ڈر سے تجھ سے عیادت کے متمنی نہ ہوں گے بلکہ اسی ڈر کے میں مر جائیں گے کہ تو کہیں عیادت کے بہانہ سے آکر مار نہ ڈالے ؎

رحم فلک اور مرے حال پر
تو نے کرم اے ستم آرا کیا

فلک سنگدل مشہور ہے مگر معشوق نے ایسے ستم توڑے کہ فلک بھی کانپ اُٹھا اور مظلوم عاشق کو رحم کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ یہیں سے مومن کا پیچ شروع ہوتا ہے۔ اب تیرا ستم ستم نہیں رہا بلکہ کرم ہو گیا کیونکہ فلک سے بیدرد کو میرے حال پر مہربان کر دیا ؎

ہنسے نہ غیر مجھے بزم سے اُٹھانے پر
سُبک ہے وہ جو تری طبع پر گراں نہ ہوا

معشوق نے عاشق کو بزم سے اٹھا کر غیر کو ہنسی کا موقع دیا۔ معشوق سے عاشق کہتا ہے کہ تو ایسا نازک مزاج ہے کہ جو شخص تیری طبع پر گراں نہ ہو اُس سے زیادہ ذلیل اور چھچھورا کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس شعر میں پہلے مصرع کا انداز بیان بلاغت کا عمدہ نمونہ ہے۔ غیر کو مخاطب نہیں کرتے نہ اُس سے آمادۂ پیکار ہوتے ہیں کیونکہ ایسے سبک وضع شخص سے جو دوسروں کی تذلیل سے خوش ہو گفتگو کسرِ شان ہے بلکہ معشوق کو مخاطب اور غیر کو سنا کر کہتے ہیں کہ میں سبک نہیں ہوں بلکہ سبک دراصل وہ ہے جو تیری طبع پر گراں نہ ہوا۔ ہم بزم ہونے کا مقتضا یہ تھا کہ غیر مجھ سے ہمدردی کرتا نہ کہ خندہ زن ہو۔ مگر غیر خوش نہ ہو ایک دن وہ بھی یونہی نکالا جائے گا۔ نازک مزاج معشوق اُس سے بھی ایسا ہی سلوک کرے گا۔ اور اُس کی حالت مجھ سے زیادہ قابل عبرت ہو گی کیونکہ میری مثال سے اُسے کان ہوتے معلوم نہیں ہوتے ورنہ میری توہین کا مضحکہ نہ اُڑاتا ؎

لگی نہیں ہے یہ چپ، لذتِ ستم سے ہیں
حریفِ کشمکشِ نالۂ و فغاں نہ ہوا

فارسی ترکیب کی لطافت قابل داد ہے ؎

کیا مجھ میں دم بھی لینے کی طاقت نہیں رہی
کیوں شورِ نالہائے عزا بار کم ہوا

نالہائے عزا بار کی ترکیب کے علاوہ شعر معانی کے لحاظ سے بھی بہت بلند ہے۔

عاشق کے نالہائے غم نے ایک شور برپا کر دیا تھا مگر کہاں تک آخر طاقت جواب دے گئی۔ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے کہ نالہ زاری کی نہ سہی کیا مجھ میں سانس لینے کی بھی طاقت نہیں رہی ورنہ ہر نفس نالہائے عزا بار کا کام کیوں نہیں دیتا۔ میں نے نالہائے عزا بار کا مفہوم نالہائے غم لکھ دیا مگر دراصل ان الفاظ سے ادا نہیں ہوتا۔ کیونکہ نالہائے عزا بار کا یہ مطلب ہے کہ وہ نالے نہ صرف غمگین دل سے نکلے ہیں بلکہ جو اُنہیں سن لیتا ہے مصروفِ شیون ہو جاتا ہے ؎

وصل کی شب شام سے میں سو گیا
جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا

مجازی وصل کی یہ بلند حقیقت مومن نے اپنے خاص رنگ میں نظم کی ہو۔ جب خود معشوق مل گیا تو کوئی حسرت و آرزو نہ رہی دل کو آرام ملا اور نیند آ گئی۔ غالب نے اپنے اس شعر میں یہی نکتہ ملحوظ رکھا ہو۔ اور اسی نے شعر کو دلکش بنا دیا ہے

نیند اُس کی ہو دماغ اُس کا ہو، راتیں اُس کی ہیں
جسکے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

آئینہ جلدی سے پٹک دو کہیں
دل ہی نہیں ہاتھ سے دیکھو گیا

اللہ رے رشک یہ بھی گوارا نہیں کہ معشوق آئینہ میں اپنے جمال کا نظارا کرے لیکن اس کا خیال کیونکر بٹے اور کس طرح باز رہو؟ ع

دل ہی نہیں ہاتھ سے دیکھو گیا

"پٹک دو" سے ایک خوبی یہ پیدا ہوئی کہ آئینہ ٹوٹ جائے گا اور آیندہ کے لئے بھی خود بینی کا سد باب ہو جائے گا۔

قریب قریب یہی مفہوم غالب کے اس شعر کا ہے۔ ے

آئینہ دیکھ اپنا سا مُنہ لیکے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

اِس میں رشک کا پہلو مفقود ہو صرف معشوق سے چھیڑ چھاڑ کا لطف ہے ے

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

مضمون جدید نہیں مگر انداز بیان انوکھا ہو۔ نہ معشوق پردہ کرتا نہ عاشق کا راز عشق انتہائے اضطراب کے باعث افشا ہوتا۔ یہ شعر اُن معدودے چند اشعار میں ہو جن کو حقیقت کی طرف منجر کر سکتے ہیں۔ اگر جلوۂ حسن مطلق حجاب میں نہ ہوتا تو اسقدر شہرہ نہوتا اب فریب شوق سے عاشق کو ہر شے میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہو ے

دل لگانے کے تو اُٹھائے مزے
جی بلا سے رہا رہا نہ رہا

نظم کی صفائی آپ اپنی نظیر ہے۔ مفہوم وہی ہے جو میر کے اس مطلع کا ہے ے

نہیں وسواس جی گنوانے کے
ہائے رے شوق دل لگانے کے

یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

۱- شب غم فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا
دم رکے تھا سینے میں کمبخت جی گھبرائے تھا

۲- بات شب کو اس سے منع بے قراری پر بڑھی
ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا

مطلع تاثیر درد میں ڈوبا ہوا ہے۔

شعر میں ذرا پیچ ہے۔ عاشق بے قرار تھا معشوق نے منع کیا کہ بے قرار نہو۔ اُسے اپنی رُسوائی کا خوف تھا یہ حضرت سمجھے کہ یہ مطلب ہے "بے قرار نہو تیری مراد پوری ہوگی"، غلط فہمی پیدا ہوئی اور تکرار کی نوبت پہنچی۔ انھوں نے کہا دو لے اب تو میں بے قرار نہیں ہوں وعدہ وفا کر، معشوق نے کہا "ہائیں کچھ پاگل ہوا ہے کیسا وعدہ" ؎

عبث الفت بڑھی تم کو وہ کب دیتا تھا دم تم پر
یہ مجھکو دیکھ کر دشمن کلیجا تھام لیتا تھا

دشمن (رقیب) مرگیا ہو (صیغۂ ماضی سے یہی ظاہر ہوتا ہو) معشوق اس کو یاد کرکے کہتا ہے کہ وہ بڑا سچا عاشق تھا ہمیں دیکھ کر اسقدر بیقرار ہوتا تھا کہ کلیجا تھام لیتا تھا بیچارے کا دل قابو سے باہر ہو جاتا تھا۔ مومن گھبرائے کہ یہ کیا غضب ہوا رقیب کے بعد اُسکے عشق نے اثر کیا۔ یہ رنگ جمنے نہیں پائے گا معشوق کو دشمن کی طرف سے بدظن کرنے کو اس کے اس فعل یعنی کلیجا تھام لینے کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ مجھکو دیکھ کر حسد سے اس کی جان پر بن جاتی تھی اور اسی سبب سے کلیجا تھام لیتا تھا تم کچھ کا کچھ سمجھے اس کی اُلفت دل سے نکالو ؎

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ میں سنتا تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمھارا نام لیتا تھا

بڑے مزے کا شعر ہے معشوق کو پرچہ لگا کہ آپ کا فلاں عاشق ناصح کی باتیں بڑے غور سے سنا کرتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ناصح کی نصیحت کارگر ہو چلی ہے معشوق کو اس کی تاب کہاں۔ اب جو یہ اُس کی بزم میں پہونچے تو معشوق نے آزردہ ہو کر کہا "تم تو میری محبت کا دم بھرتے تھے یا ناصح کا جادو چل گیا اس سے بیزاری کیسی گھنٹوں اُس کی باتیں سنی جاتی ہیں تمھیں عشق کا نام لیتے غیرت نہیں آتی"

مومن عرض کرتے ہیں کہ تم ناراض نہو میں اُسکی نصیحت نہیں مانوں گا مگر سنتا نہ تو کیا کرتا وہ بار بار تمھارا نام لیتا تھا اور میں تمھارے نام کا عاشق ہوں۔

غور فرمائیے کہ "نصیحت نہیں مانی" (صیغہ ماضی) کے بجائے "نہ مانوں گا نصیحت" (صیغہ مستقبل) نے زبان اور حسن بیان کا کیا معجزہ دکھایا ہے۔ اول تو صیغہ ماضی سے معشوق نے جو الزام دیا اس کی تردید ہوتی اور یہ آداب عاشقی کے خلاف تھا۔ صیغہ مستقبل نے نہ صرف اس پہلو کو بچایا بلکہ یہ اضافہ کیا کہ میں ناصح کی باتیں سننے سے تو باز نہیں رہ سکتا سنا کیا ہوں اور سنتا رہوں گا کیونکہ اس طرح بار بار تمہارا نام سامعہ نواز ہوتا ہے البتہ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس کی نصیحت پر عمل نہیں کروں گا۔ واضح رہے کہ "نصیحت نہ مانی" شعر میں کھپ سکتا تھا اور میرا دعویٰ ہے کہ ہزار شاعروں میں ۹۹۹ "نہ سنتا میں تو کیا کرتا" کے خیال سے پہلے ٹکڑے میں بھی صیغہ ماضی نظم کرتے

نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف
خون فرہاد سر گردن فرہاد رہا

بڑے پایہ کا شعر ہے۔ فرہاد کے خون کا مواخذہ سوائے فرہاد کے کسی سے نہیں ہو سکتا کیونکہ جرم عشق کی سزا میں جان جانا کوئی سزا نہیں اس سے بھی سخت سزا کا مستحق تھا ؎

یاد سہواً اسے اے غیر ہے نسیاں عمداً
یاد رکھ بھول گیا جس کو وہی یاد رہا

دیکھئے ایک معمولی خیال کو انداز بیان نے کس قدر دلکش بنا دیا ہے۔

یہ شیوۂ معشوق ہے کہ اپنے عاشقوں کو یاد تو بھولے سے کرتا ہے مگر جان کر بھول جاتا ہے۔

غیر محفل یار میں باریاب ہے مومن راندۂ درگاہ ہیں۔ رقیب سے کہیں راستہ میں مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ غیر نے بظاہر ہمدردی کرتا ہے۔ مگر دراصل اس کا منشا دل آزاری ہے کہتا ہے کہ اب تو اس بزم میں تمہارا تذکرہ بھی نہیں ہوتا وہ تم کو بالکل بھول گیا۔ مومن کہاں دبنے والے ہیں کہتے ہیں کہ تم اس کی محفل میں روزمرہ آتے جاتے ہو مگر اب تک اس کا مزاج نہیں پہچانا۔ ع

یاد سہواً اسے اے غیر ہے نسیاں عمداً

تم نے جو کہا کہ وہ مجھے بھول گیا تو میں سمجھ گیا اور خوش ہوا کہ اسے یاد ہوں ؎

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

شعر نہیں ایک کارنامہ ہے۔ پہلا مصرع بندش اور بلاغت کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ایک تو اس زمانہ میں جبکہ دنیائے شاعری گردش فلکی کی قائل تھی (میں یہ نہیں کہتا کہ گردش ارضی سے واقف نہیں تھی) ع

"کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری"

کہنا اختراع فائقہ ہے۔ مجھے علم نہیں۔ ممکن ہے کہ اوروں نے بھی کہا ہو مگر تپش عشق کو گردش ارضی کا سبب قرار دینا شاعری کی وہ منزلیں ہیں جنکے خیال سے بڑے بڑوں کے حوصلے پست ہو گئے ہونگے۔

مندرجہ بالا شعر کی بلندی و شکوہ ملاحظہ فرما چکے اب یہ شعر پڑھئے جو سہل ممتنع ہے

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا
میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

مطلع کے بعد پھر ایک دریا اُمڈا ہے

سر سے شعلے اُٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جاری ہے
شمع سے کس نے یہ ذکر اُس محفل آرا کا کیا

معشوق نے محفل آراستہ کی اور شمع کو رونق محفل بناکر خود روپوش ہو گیا۔ معشوق کے اشتیاق میں اب شمع کا یہ عالم ہے کہ

سر سے شعلے اُٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جاری ہے

حسن تعلیل کی عمدہ مثال ہے۔

اور ہائے یہ شعر ہے

کیا خجل ہوں اب علاج بے قراری کیا کروں
دھر دیا ہاتھ اُسنے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

مقطع بھی لاجواب ہے ہے

عرض ایماں سے صنم اُس غارتگر دیں کی بڑھی
تجھ سے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا

محاورہ "خدا سمجھے" نے اور چار چاند لگا دیے۔

یہ شعر بہت مشہور ہے ہے

کیا اُسنے قتل جہاں اک نظر میں
کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

اس طرح کے قتل میں مرنے والوں کی کتنی حسرتوں اور اُمنگوں کا خون ہوا ہوگا۔ ایک اور شعر ہے

✓ کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی   آشیاں اپنا ہوا برباد کیا ؟

نفسیات کے اہم مسایل کو مختصر الفاظ میں بیان کر دینا مومن پر ختم ہے۔

آشیاں سے ہزاروں اُمیدیں وابستہ تھیں اُس کا برباد ہونا تھا کہ قفس میں دل بہلنے لگا۔ ہائے وہ خانماں برباد جو قفس کو نشیمن سمجھنے لگے ؎

جب مجھے رنجِ دل آزاری نہ ہو
بے وفا پھر حاصلِ بیداد کیا؟

ایک اور تیز نشتر ہے۔ لفظ بیوفا جس خوبی سے صرف ہوا ہو اُس کی داد دینا ممکن نہیں۔ غالب کے دو شعر ہیں کہ اس مطلب کو پورا کرتے ہیں جو مومن نے چند الفاظ میں ادا کر دیا ہے ؎

۱- لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

۲- ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اِک چھیڑ ہے وگرنہ مُراد امتحاں نہیں

"بیوفا" کی دل آزاری میں تو "لاگ" کا پہلو نکلتا ہو نہ "لگاؤ" کا نہ مراد "چھیڑ" ہوسکتی ہے نہ "امتحان" تاہم بیداد ہے۔ عاشق حیران ہو کر اس بیداد کا حاصل کیا ہے۔

یہ وسعت معانی فیض ہے اس عقیدے کا کہ معشوق صرف اس لئے ظلم کرتا ہے کہ عاشق کو رنج ہو۔ اور اس سے بھی وفا کی صفت جو معشوق میں موجود نہیں ہے زایل ہو جاے۔ ترک وفا کی امید جبھی ہوسکتی ہے جب عاشق جفائے معشوق سے آزردہ ہو۔ جب یہ بات بھی نہیں ہو تو معشوق سے دریافت کرتے ہیں کہ اس بیداد کا حاصل کیا ہو ؎

گر بہائے خونِ عاشق ہے وصال
انتقامِ زحمتِ جلاد کیا؟

اس شعر میں ایہام ہے وصال کے معنی وصل کے بھی ہیں اور مرنے کے بھی۔ پہلے مصرع میں ایک زبردست نظریہ قائم کیا ہے کہ وصال قتل عاشق کا معاوضہ ہے مگر دوسرے مصرع میں اس کو غلط ثابت کیا ہے کہ وصال بہائے خون عاشق نہیں ہے (اب لفظ وصال بمعنی مرگ لینا ہوگا) بلکہ اس زحمت کا انتقام ہے جو جلاد کو قتل کرنے میں پیش آئی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس زحمت کا بدلہ کیا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ یہ بھی معشوق کا احسان ہے کہ اُسنے ہمیں قتل کیا۔ ہم نے قتل کو زحمت دی اس کی پاداش ملنا چاہیے یہ عشق کی خامی ہو اگر جان دیکر اپنے آپ کو وصال معشوق کا مستحق سمجھے ؎

لے خوب گئی ہو بے طرح منہ زانو ے جاناں کی
یہ سر تکیہ پہ ہمدم جس طرح رکھوں نہ ٹھہریگا

یک بے پناہ شعر ہے "بے طرح" کی تعریف نہیں ہو سکتی ؎

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اُس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

مومن کی جو شامت آئی تو معشوق کو اس کے طرز عمل پر الزام دینے بیٹھے کہ تمہیں میرا خیال بالکل نہیں۔ یہ ظلم کیا۔ وہ ستم توڑا۔ مجھ سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کی۔ بڑے بے وفا ہو۔ معشوق شوخ و شنگ جواب دیتا ہے کہ سنئے حضرت میری جفا جفا نہیں تھی میرا تغافل تغافل نہیں تھا بلکہ میں آپ کے جذب دل کا امتحان لیتا تھا۔ آپ کو میرا ممنون منت ہونا چاہئے تھا کہ کھرا کھوٹا عشق میں آپ کا معلوم ہوا۔ آپ ایسے ناشکرے ہیں کہ مجھے کو قصور وار ٹھہراتے ہیں آپ کا عشق خام ہے پہلے اپنا رستہ لیجئے۔

مومن منفعل ہو کر کہتے ہیں کہ ؎

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

امر مسلمہ ہے کہ ہر شے کی معرفت اُس کی ضد سے ہوتی ہے اگر معشوق جفا کار و تند خو تغافل آشنا نہ ہو تو عاشق کو اپنے عشق کے نقص یا کمال کا اندازہ دشوار ہو جائے۔

اسی قبیل کا یہ مطلع ہے ؎

روز جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا
میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

حضرت نے روز جزا اپنے "رکشندہ" کو قاتل دلجو کہکر پکارا اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ تو خود اپنی جان پر کھیلے ہوئے تھے قاتل کو دلجو کہتے ہیں داد و بیداد سب غلط کوئی سماعت نہ ہوگی۔ اُنکا خون انہی کی گردن پر ہے ؎

پھرنے سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سو رہے
آرام شکوہ ستم اضطراب تھا

شام وعدہ معشوق کے انتظار میں ٹہلتے رہے۔ دروازے سے ہزار دن چکر لگائے گلی کے سیکڑوں پھیرے کئے مگر معشوق نہ آنا تھا نہ آیا۔ آخر تھک کر گرے اور سو گئے (جس کا استعارہ مرنے سے بھی ہو سکتا ہے) اب الزام یہ آتا ہے کہ حضرت! آپ کو معشوق کا انتظار کیا

تھا کر سو گئے اس کا جواب دیتے ہیں کہ اضطراب نے میری جان پر ستم توڑا تھا مجھے آرام نہیں آیا بلکہ اس طرح میں نے ستم اضطراب کا شکوہ کیا
اضطراب و سکون دو متضاد کیفیتیں ہیں جب اضطراب کے بعد مجبوراً سکون اختیار کیا گیا تو یقیناً یہ فعل شکوہ پر مبنی سمجھا جائے گا
گویا خاموشی نے اضطراب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ؎

روزِ جزا خدا بُتِ جلاد کو ملا
گویا کہ خون ناحق مومن ثواب تھا

اس شعر میں بھی ایہام ہے۔ بت جلاد نے مجکو بے گناہ قتل کیا حشر میں پرسش ہوئی۔ خدا کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ سوال و جواب کی نوبت آئی اس کی یوں تاویل کی کہ بت جلاد کو میرے خون ناحق کے سبب سے خدا ملا گویا میرا قتل کا ثواب تھا۔ نہ مجھے قتل کرتا نہ خدا تک پہونچتا۔

یہ تو ظاہری معنی ہوے اصل مطلب یہ ہے کہ میں ایسا گنہگار تھا کہ اگر معشوق مجھے بیگناہ قتل نہ کرتا (اس کو شہادت کہتے ہیں اور شہید یقیناً جنتی ہے) تو میری بخشش نہ ہوتی۔ چونکہ بت جلاد میری نجات کا باعث ہوا۔ لہذا اُسے ثواب ہوا اور اس کا یہ فعل ایسا تھا جس نے اس کو بھی خدا سے ملا دیا ؎

دیکھ لو شوق ناتمام مرا
غیر لے جائے ہے پیام مرا

”شوق ناتمام“ کی بلاغت ملاحظہ فرمائیے۔ ایک مطلب تو یہ ہوا کہ غیر باوجود دشمن ہونے کے میرے شوق سے اتنا متاثر ہوا کہ میری طرف سے معشوق کو پیام پہونچانے پر آمادہ ہو گیا مگر یہ مومن کا خیال ہی خیال ہے۔ غیر کو معشوق تک پہونچنے کا بہانہ ہاتھ آیا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ غیر کا دل (جسے پتھر سے زیادہ سخت کہنا چاہیئے) پگھل گیا بجائے دشمن کے میرا دوست بن گیا اور میری طرف سے پیام لے چلا۔ اگرچہ میرا شوق اس درجہ پر تھا پھر بھی ناتمام تھا ورنہ میں خود اپنا پیام لے جاتا یا معشوق کو خودبخود میرے حال کی خبر ہو جاتی ؎

میری نگاہِ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بے طاقتی پہ سرزنش ناز دیکھنا

”سرزنش ناز“ کیسی خوبصورت ترکیب ہے۔ نظارۂ جمال دوست سے مومن کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ عاشق کے لئے یہ خیرہ چشمی ہی سرزنش ہے کہ تاب دیدار نہ لایا۔ مگر معشوق نے ”سرزنش ناز“ کا اضافہ کیا یعنی غیر سے کہا دیکھو مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں چوندھیا گئیں یہ سرزنش ناز مبہم ہے مومن اسے اپنی سرزنش سمجھتے ہیں حالانکہ معشوق غیر کو سرزنش کرتا ہے کہ مومن کی آنکھیں مجھے دیکھ کر خیرہ ہو گئیں یہ

مقتضائے عشق تھا مگر تو ایسا دیدہ دلیر ہے کہ مجھے گھور رہا ہے اگر عشق تجھ پر حاوی ہوتا تو مومن کی طرح تو بھی بے طاقت ہوتا اور میری طرف نہ دیکھ سکتا اور اگر شوق سے مجبور ہو کر اتنی جراءت کرتا تو تیری آنکھوں میں بجلی کوند جاتی۔ یا عورتوں کی زبان میں دیدے پٹم ہو جاتے۔

هم بھی تو ناداں ہیں آخر یاس مطلب کس لئے
خضر موسےٰ کو پئے تعلیم دانائی ملا

دوسرے مصرع میں تلمیح ہے خضرؑ و موسیٰؑ دونوں پیغمبران اولو العزم تھے مگر حضرت خضر کو بعض ایسے علوم باطنی خدا کی طرف سے تعلیم ہوئے تھے جن سے حضرت موسیٰ ناواقف تھے اور اُن کو حضرت خضر کے پاس پئے تعلیم بھیجا گیا۔ پورا قصہ قرآن مجید میں درج ہے۔ جس طرح خضر موسیٰ کو تعلیم دانائی کے واسطے مل گئے اُسی طرح مجھے بھی کوئی رہبر ملجائے گا۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ تلمیح نے شعر کو اس وجہ سے بلند کر دیا کہ خود حضرت موسیٰ کا درجہ بہت بلند تھا تاہم اُن کو ایک ایسا شخص ملا جس کے مقابلے میں گویا وہ نادان تھے۔

جستجو سے وصل دلبر کی تمنا کس لئے
کیا دل گم گشتہ اے ہنگامہ آرائی ملا

جب دل گم گشتہ تلاش سے دستیاب نہیں ہوا تو جستجو سے وصل دلبر محال ہوا اور ہنگامہ آرائی بیکار۔ ہنگامہ آرائی کو ایک ذات قرار دینے اور اُس سے تخاطب نے ہنگامہ آرائی کی اہمیت ثابت کی۔

جوش عشق و حُسن نے کیا رنگ بدلے دیکھنا
اشک خونی سے مرے مُنہ زرد اُس کا ہو گیا

افسوس دوسرے مصرع میں قافیہ کی قید نے ہلکی سی تعقید پیدا کر دی مگر مطالب کے لحاظ سے شعر کی جس قدر داد دیجائے کم ہے۔ عاشق کے چہرے پر اشک خوں بہتے دیکھ کر معشوق کا رنگ زرد ہو گیا (خوف رسوائی سے یا نزاکت سے یا «خون ہلکا» ہونے کے سبب سے یا باطنی ربط حُسن و عشق سے۔ بہت سی توجیہیں ہو سکتی ہیں) اس کیفیت کو جوش حسن و عشق کا رنگ بدلنا کہنا کسقدر بدیع ہے معشوق کا رنگ جو قدرتی طور پر سُرخ تھا زرد ہو گیا۔ اور عاشق کا رنگ زرد اشک خونی سے سُرخ ہو گیا۔ محاورہ رنگ بدلنا کس خوبی سے صرف ہوا ہے۔ جوش کے لفظ نے تعجب میں اضافہ کیا۔ یہ انقلاب جس کی شاعر نے مصوری کی ہے اُسیوقت رونما ہوتا ہے جب حسن و عشق دونوں اَوج کمال پر پہونچ چکے ہوں۔

بعض حضرات کو شاید یہ اعتراض ہو کہ «کیا رنگ بدلے» کے بجائے کیا کیا رنگ بدلے چاہئے۔ میں اَدب سے عرض کروں گا کہ اعتراض غلط ہو گا کیا کیا سے محاورہ کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو جائے گا ایک سے زیادہ رنگ بدلنے کا مطلب پیدا ہو گا جو شعر کو مضحک بنا دے گا۔

یہ کسی سے ہو کہ ان لطفوں پہ گستاخی نہ ہو
غیر ہم سالک ہوا ہر چند ہم سا ہو گیا

صفر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

انہی الفاظ کو اُلٹ پلٹ کر ایک نیا مضمون پیدا کر دینا مومن کا حصہ ہے۔ اس قسم کے متعدد اشعار اُس کے دیوان میں ملتے ہیں۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ تو مجھ پر مہربان اور مجھ سے بے تکلف تھا۔ میں طرح طرح کے الطاف کا مورد تھا تاہم میں نے پاسِ ادب کبھی ترک نہیں کیا مجھ سے کوئی گستاخی سرزد نہیں ہوئی مگر غیر کا اتنا ظرف کہاں۔ تیرے مہربان ہوتے ہی گستاخ ہو گیا۔

"ہم کس سے ہو" سوالیہ جملہ ہے یعنی اور کسی سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ غیر ہم سا ہو (یعنی ہم دونوں پر مہربانی ہو چکی ہو) غیر ہم سا کب ہوا یعنی میری طرح عالی ظرف و متحمل نہیں ہے، ؎

کیا رشکِ غیر تھا کہ تحمل نہ ہو سکا
میں جان کر حریفِ تغافل نہ ہو سکا

معشوق نے تغافل کیا مومن کی زبان پر بے اختیار شکوہ آ گیا فوراً الزام لگا گیا کہ شکوہ یا اظہارِ ملال شیوۂ عاشقی کے خلاف ہے مومن نے فوراً بات بنائی کہ یہ غیر کا رشک تھوڑی تھا جو مجھ سے برداشت نہ ہو کا معشوق نے غیر سے تغافل برتا میں نے اُس کی آگاہی اور تنبیہ کے واسطے جانکر دل بے قابو ہو کر نہیں، حریفِ تغافل ہونے سے انکار کیا۔ پہلا مصرع استفہامیہ ہے۔ یہی خیال تھوڑے تغیر سے اس شعر میں نظم ہوا ؎

دھیان ہے غیر کے تحمل کا
ہوش دیکھا ترے تغافل کا

یہاں تغافل ہے مگر اسقدر نہیں کہ غیر صبر کر بیٹھے ؎

اشک دا اثر و نہ اثر باعثِ صد جوش ہوا
ہچکیوں سے میں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا

ہچکیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک شدتِ گریہ کے بعد اور ایک وہ جو بغیر گریہ خود بخود آنا شروع ہوتی ہیں اور عام اعتقاد ہے کہ کسی نے یاد کیا مومن نے ان دونوں کیفیتوں کو پیش نظر رکھ کر مطلع کہا ہے۔

ایک الٹی بات کہتے ہیں کہ ہچکیاں آنے سے میں یہ سمجھا کہ معشوق نے مجھے فراموش کیا پہلے مصرع میں اسکی وجہ بیان کی ہے۔ یہ ہچکیاں جوشِ اشک کا نتیجہ ہیں وہ نہیں جو خود بخود آتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے جوشِ گریہ نے الٹا اثر کیا اور یہ ہچکیاں اس سے نہیں آتی ہیں کہ معشوق نے مجھے یاد کیا بلکہ اُس کے فراموش کرنے کی علامت ہیں۔ اشک دا اثر و نہ اثر کی ترکیب یادگار ہے۔

اثر۔ لکھنوی

موازنہ مومن و غالب

اس میں شک نہیں کہ مومن و غالب دونوں شاعر تھے اور شاعر بھی ایسے جن پر دنیائے شاعری بجا طور سے فخر و ناز کر سکتی ہے اور جنھوں نے اپنی اپنی جگہ خصوصیت استادانہ حاصل کر لی تھی لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ دونوں مختلف راہوں کے چلنے مختلف مذاق رکھنے والے تھے اور دونوں کے رنگ طبائع میں بہت اختلاف تھا۔

غالب آزاد مزاج۔ رندلاابالی غم و افکار کو کیف شراب سے دور کرنیوالا۔ زخم خوردہ۔ مگر مرہم کی جستجو سے بے پروا۔ دردمند مگر فکر چارہ سے مستغنی۔

مومن عاشق مزاج۔ الفت و محبت کی مضبوط زنجیروں میں جکڑا ہوا حسن پر جان دینے والا۔ زمانہ کے غم و الم سے اثر لینے والا۔ آن پر جان دینے والا۔

غالب فاقہ مست۔ مگر مزاج میں شاہانہ بو لئے ہوئے۔ مومن شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت کا بیٹھنے والا۔ غالب امرائے عہد کا ثناگو اور عقیدتمند۔ مومن رؤسا کی باتوں کو چین ابرو سے دیکھنے والا۔ انکی صحبتوں سے محترز۔ انکے مال و دولت پر نظر استحقار ڈالنے والا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ دونوں کا رنگ شاعری بھی جداگانہ ہوگا۔

سنتا ہوں کہ ہندوستان میں اگر کوئی مومن کا جواب ہے تو وہ غالب ہے اور اگر کوئی غالب کا جواب ہے تو وہ مومن ہے۔

کیا یہ صحیح ہے؟ اسی پر گفتگو کرنا موضوع بحث ہے۔

قبل اس کے کہ اصناف شاعری پر نظر ڈالی جائے صفات شاعری کو دیکھئے۔ تو بڑا فرق محسوس ہوگا۔ غالب و مومن کی شاعری میں تشبیہات۔ رنگ بلاغت۔ طرز فصاحت۔ استعارات۔ انداز بیان۔ محاکات۔ بیان جذبات۔ ادائے مضمون۔ جدت تخیل وغیرہ وغیرہ سب چیزیں مشترک اور یکساں طریقہ پر پائی جاتی ہیں لیکن نگاہ حقیقت شناس اس فرق و امتیاز کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتی جو ان دونوں میں پایا جاتا ہے۔

مثنوی | وہ مایۂ ناز صنف شاعری جو صرف اہل عجم کیلئے مایۂ ناز ہے اور عرب کی شاعری میں نمونہ یا مثال کے سوا اسکا وجود کہیں نہیں ہے مثنوی ہے۔ وہ متاع ادب جسنے فارس کے ذخیرۂ ادب کو گراں قدر اور گراں بہا بنایا۔ صرف مثنوی ہے۔ جسکے ثبوت میں شاہ نامہ سکندر نامہ منطق الطیر بوستان۔ زلیخائے جامی۔ تحفۃ العراقین۔ مثنوی زلالی۔ مثنوی مولانا روم وغیرہ وغیرہ سیکڑوں مثنویاں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہی وہ چمکنے والے جواہرات ہیں جنکی آب و تاب نے عرب کے ادبی متاع کو ماند کر دیا تھا۔ فارسی کی تمام اصناف شعر کے ساتھ یہ بھی ہندوستان میں آئی۔ اور عالی دماغ ادیبوں کے

ہاتھوں دوسرے اصناف سخن کے ساتھ یہ بھی پروان چڑھتی رہی مگر اس زمانہ کو جسمیں زبان اُردو اپنے بچپن کے گہوارے میں تھی، اور نکتہ سنجوں نے مثنویاں کہیں ہم ایام جاہلیت میں شمار کرتے ہوئے میر کے زمانہ تک پہونچتے ہیں۔ میر تقی میر نے اُردو میں اس صنف کو خصوصیت کے ساتھ ترقی دی۔ اور تیس سے زائد مثنویاں لکھیں جن میں بعض نہایت مختصر ہیں۔ مگر شعلۂ عشق۔ دریائے عشق۔ اعجاز عشق۔ شکار نامہ۔ اژدر نامہ۔ ہجو بعتال تنبیہ الجہال وغیرہ مثنوی کے بہتر نمونے ہیں۔ میر صاحب کی مثنویاں بعض بلا قید زمانی۔ اور بعض اس زمانہ کے لحاظ سے نہایت عمدہ اور دلچسپ ہیں مگر فی الاصل اس صنف کو عروج کمال پر پہونچانے والے میر حسن ثابت ہوئے۔ اور انکی مثنوی کی اتنی شہرت ہوئی کہ میر صاحب کی مثنویوں کی شہرت صرف انکی ذات بابرکات کی فضیلت کے ساتھ وابستہ رہ گئی۔ میر حسن کے بعد اگرچہ کئی مثنویاں بدر منیر کے جواب میں لکھی گئیں مگر مقبولیت اور شہرت نہ پا سکیں۔ آخری دور میں مثنوی گلزار نسیم کو لکھنؤ میں خاص شہرت ہوئی مگر دلی میں رنگین کے علاوہ اور کوئی دوسرا شخص مثنوی لکھنے والا نظر نہیں آتا یہاں تک کہ مومن و غالب کا زمانہ آجاتا ہے۔ مومن اور غالب دونوں نے اس صنف میں نہایت جانکاہی اور محنت سے کام لیا۔ اور اس مردہ صنف کے ساتھ اعجاز مسیحائی کیا غالب نے فارسی میں تقریباً گیارہ مثنویاں لکھیں۔ سرمہ بینش۔ درد و داغ۔ چراغ دیر۔ رنگ و بو۔ باد مخالف شان نبوت۔ تہنیت عید شوال، تہنیت عید۔ دیباچہ۔ تقریظ آئین اکبری۔ ابر گہربار۔ اور اُردو میں مختصر چند شعر مثنوی در صفت انبہ کہی۔

مومن کا یہ تمام کارنامہ جو انکی شاعری کا ایک درخشندہ گوہر شب چراغ ہے خزانۂ اُردو میں ہے۔

نالۂ مومن۔ دوسرا نامہ۔ شکایت ستم۔ قصۂ غم۔ قول غمیں۔ تف آتشیں۔ تپش مغموم۔ آہ و زاری مظلوم۔ مثنوی ناتمام۔ مثنوی مضمون جہاد۔

ہرچند مثنویوں میں دونوں کا موازنہ یا تقابل درست نہیں ہوسکتا کیونکہ غالب کی مثنویاں فارسی میں ہیں اور مومن کی اُردو میں تاہم اجمالاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کی مثنویاں زیادہ تر واقعات ضروری پر مبنی ہیں اور مومن نے باستثنائے بعض سب عشقیہ لکھی ہیں اور اس طرز میں گویا وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ہیں۔ ان کی مثنویاں حسن و عشق کے واقعات کے آئینے ہیں جنمیں دونوں تصویروں کا بال بال نظر آتا ہے۔ ان مثنویوں کے بعض بعض مناظر میر تقی اور میر حسن کی مثنویوں سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ خواہ فراق کا بیان ہو خواہ اشتیاق اور وصال کا اسمیں وہ آپ اپنی نظیر ہیں کیونکہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب وہ واردات ہیں جو سوختہ جانان عشق پر گزرتی رہتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ جو لطف ان کے بیان میں ملتا ہے وہ دوسروں کے بیان میں ہرگز نہیں ہے۔

اصناف سخن میں سے وہ اصناف جو اُردو میں مشترک طور پر غالب مومن کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ قصیدہ۔ رباعی۔ مرثیہ اور غزل ہیں سب سے پہلے ہم قصیدہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ قصیدہ کے لئے اول تو اُن الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے جنمیں عُلو اور شکوہ و شان پائی جائے اس کے بعد تشبیب آتی ہے جسمیں تمام زور شاعری صرف کردیا جاتا ہے۔ اس کے بعد گریز ہے یعنی وہ نازک موقعہ جہاں سے اس کو اپنے اصلی مقصد کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ روانی۔ جوش وغیرہ بھی اُس کے لئے ضروری ہیں۔ چونکہ قصیدوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہوتے ہیں اس لیے یہ کوشش تو بے سود ثابت ہوگی کہ غالب مومن کے ایک مضمون کے قصاید کو ڈھونڈا جائے اس واسطے صرف مندرجہ بالا باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہم ایک موازنہ

کی صورت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

مومن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں قصیدہ اس طرح شروع کرتے ہیں ؎

کٹتی ہے میری تیغ زباں سے زبان تیغ　　کیونکر سخن فروش ہوں سوداگران تیغ
نہلا دیا عدو کو لہو میں بسان تیغ　　میری زباں کے آگے چلے کیا زبان تیغ
پھر جوش آگیا دم خونابہ ریز کو　　پھر تیزی زباں پہ ہو قربان بان تیغ
میدان کشت و خوں نہیں مرا دست سوار　　جائے عناں کشیدہ تو ہو ہم عنان تیغ

میں نے صرف یہ چار شعر اس لئے لکھے ہیں کہ دیکھنے والوں کو قصیدہ کی اٹھان معلوم ہو جائے۔ ورنہ اس قصیدہ میں مومن کے یہاں تیس چالیس شعر تقریباً اسی انداز اور اسی شان کے موجود ہیں۔ سب سے پہلے شاعر کے شعور پر نظر ڈالئے کہ اُس نے چونکہ خداوند ذوالفقار کی مدح سنجی کرنا چاہی ہے لہٰذا زمین قصیدہ بالکل اُسی کے موافق تجویز کی۔ دوسری خوبی جو قصیدہ میں نمایاں ہے۔ وہ صنعت براعۃ الاستہلال ہے جس کی شان قصیدہ کے مطلع سے نمایاں ہو رہی ہے تیسری خاص بات جو مصنف کے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ اُن مناسبات کو جو ممدوح سے متعلق ہیں ایک ایک کر کے تشبیب میں لے آیا۔ مثلاً ؎

فردوسی ایک خارجان بیان تھا
گلریز میرے دم سے ہوئی داستان تیغ

اگر تھوڑا سا تامل کیا جائے تو فردوسی کو خارجان بیان بنانے کے اسباب نظر کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ کیونکہ گو فردوسی نے عمر بھر حرب و ضرب نظم لکھے مگر مومن کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ صرف کافروں کی مدیحہ سنجی میں رہا اور وہ دراصل باغ جنان مدح کے لئے ایک کانٹا ثابت ہوا مگر میں کہ حضرت علی ابن ابی طالب کی مدیحہ سنجی کا ارادہ کر رہا ہوں۔ دراصل یہ داستان تیغ گویا گلریزی داستان تیغ ہے۔ دوسرے مناسبات ممدوح دیکھئے ؎

یہ دل خراشیاں مرے اشعار شوخ کی　　سینے پہ منکروں کے ہیں لاکھوں نشان تیغ
جس جا ہے خطبہ خواں ہو مری تیزی زباں　　واں جانئے زمین سجدۂ منبر فشان تیغ
صد شرح جراحت منکر حسود کو　　کرتا ہوں رزم گاہ میں دم امتحان تیغ
مومن کو آرزوئے ثواب جہاد ہے　　کفار کاش آکے سنیں داستان تیغ

معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا اُمڈا ہوا چلا آرہا ہے۔ اسی روانی اور تسلسل کی حالت میں اس آسان طریقہ سے گریز کیا ہے جسکا جواب نہیں گویا مصنف نے گریز کا ارادہ نہیں کیا بلکہ بے اختیار اس کے قلم سے یہ اشعار نکلتے گئے ہیں ؎

آئی ہے دلب پہ مدح خداوند ذوالفقار لیجاؤ منکروں کے لئے ارمغان تیغ
شیرِ خدا علی کہ شجاعت سے جس کی ہے سرخیِ اسد پہ زنخ زن بنان تیغ

یہی وہ مقامات ہیں جو قصیدہ میں دشوار ہوتے ہیں۔
اب مرزا غالب کا وہ قصیدہ ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے حضرت علی کرم اللہ کی مدح میں کہا ہے قصیدہ سے مصنف کا کمال اور قادر الکلامی ظاہر ہے مگر وہ تناسبات جو مومن کے یہاں ہے اس میں نہیں ہے

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

پوری تشبیب اسی طریقے سے کہی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کی کہنہ مشقی نے اس میں بہت کچھ حسن پیدا کر دیا ہے مگر قصیدہ میں وہ بات نہیں ہے جو مومن کے یہاں ہے مخلص میں انھوں نے تشبیب کو ختم کرکے اس طرح پیچھا چھڑایا ہے

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
نقش لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

دیکھنے والا پہلی نظر میں دیکھ لیتا ہے کہ مصنف نے ایک تشبیب بغیر سوچے سمجھے محض اپنی شاعرانہ قوت بیان کے زور میں لکھی ہے اس کے بعد اس کو خیال پیدا ہوا ہے کہ اس قصیدہ کا منقبت کی طرف رخ پھیر دینا چاہیے اسی لئے اس کو دقت ہوئی ہے اور انہوں نے گریز کا یہ انداز پسند کیا۔ برعکس ان کے مومن کے یہاں پہلے ہی سے اہتمام کیا گیا ہے اور اس صفائی اور خوبصورتی سے گریز کیا ہے جو بہتر سے بہتر تھا۔

اس کے بعد رباعی پر جب نظر ڈالتے ہیں تو غالب کے یہاں اردو کی چند رباعیات نظر آتی ہیں مگر درحقیقت وہ قابل موازنہ نہیں ہیں کیونکہ مومن کے یہاں رباعیات کا ایک بہت کافی سرمایہ اور ذخیرہ موجود ہے جسمیں ہر قسم کے خیالات ادا کئے گئے ہیں۔ برعکس اس کے غالب کے یہاں چند رباعیات ہیں اور ان کے دیکھنے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انہوں نے بجبر لکھی ہیں یا بعض واقعات نے ان سے لکھوا دی ہیں۔ بہرصورت کم سے کم اردو میں غالب صنف رباعی کے مرد میدان نہیں سمجھے جا سکتے۔ ان سب کو چھوڑنے کے بعد موازنہ کے واسطے صرف ایک غزل کی صنف باقی رہ جاتی ہے جسمیں دونوں کا سرمایۂ عمر کافی موجود ہے۔

غزلوں کے موازنہ کے لئے دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ ایک غزل غالب کی لکھی جائے اور ایک مومن کی مگر یہ تحصیل حاصل ہے کیونکہ اگر صرف یہی بات مدنظر ہو تو بجائے خود دونوں کے دیوان علیحدہ علیحدہ موجود ہیں اسکے بعد موازنہ کے لئے

غزلوں پر نظر جاتی ہے جو ہم طرح ہیں یا جنمیں ایک زمین میں دونوں نے گلفشانیاں کی ہیں۔ یہ البتہ کارآمد ہے بشرطیکہ دونوں کے تواتی کو لیا جائے اور پھر دونوں کے رنگ طبیعت کے موافق اُن پر تنقید کیجائے۔ چنانچہ پہلے یہی کرتے ہیں۔ اگرچہ دونوں کی ہم طرح غزلیں بہت کم ہیں تاہم جو کچھ ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔

غالب کی ایک مشہور غزل کا مقطع ہے ؎

مجھ پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں　　اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

نہایت پاکیزہ مطلع کہا ہے یعنی معشوق مجھ پر امتحان لینے کے لئے جفا نہیں کرتا اور نہ اس کو یہ خیال ہے کہ جفا کرنے سے میں وفا چھوڑ دوں گا۔ بلکہ مقصود صرف ایک چھیڑ جاری رکھنا ہے۔ اس سے زیادہ عاشق کی حرماں نصیبی کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جفا بھی سہتا ہے اس میں بھی اس کو کوئی امید نہیں۔ اگر معشوق کی یہ جفا امتحان لینے کے لئے ہوتی تو کچھ امید افزا ہو سکتی تھی۔ یا کاش معشوق یہی سمجھتا کہ جفا کرنے سے یہ وفا چھوڑ دیگا۔ مگر وہ یہ سمجھ چکا ہے کہ عاشق وفا نہ چھوڑیگا۔ اس سے بد نصیبی عاشق کے پہلو کو شعر میں اور بھی تقویت پہنچتی ہے۔ یعنی وفا پر ثابت قدم سمجھتے ہوئے وہ جفا کرتا ہے۔ مگر حکیم مومن خان فرماتے ہیں ؎

کرتے وفا امید و فا پر تمام عمر　　پر کیا کریں کہ اس کو سر امتحاں نہیں

مضمون تقریباً یکساں ہے فرق یہ ہے کہ غالب کہتا ہے کہ وہ جفا کرتا ہے مگر امتحان کے لئے نہیں کرتا۔ حکیم صاحب کہتے ہیں کہ جفا کرتا ہی نہیں ورنہ ہم عمر بھر اُس سے وفا کیے جاتے۔ اس میں حرمان و مایوسی کا مضمون غالب کے شعر سے بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ جفا ہونے میں تو ایک امید ہی ہے یعنی اگر آج اس کو خواہش امتحان نہیں تو ممکن ہے کہ کسی وقت پیدا ہو جائے مگر وہ بد نصیب واقعی بڑا بد نصیب ہے جس پر جفا بھی نہیں کی جاتی۔ اس کے علاوہ پہلے مصرع کی صفائی بیان کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ "پر کیا کریں" کے ٹکڑے نے اور بھی زیادہ مجبوری کا رنگ پیدا کر دیا اور اس ابہام و ایہام نے کہ "اب کیا وفا کریں" اس بات پر بھی ایک کافی روشنی ڈالدی کہ ہم تو اظہار وفا کا بھی موقع نہیں پاتا ؎

غالب　　ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز　　نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

ہم ستم دوست ہیں اور وہ ستمگر ہے ہم کو ستم کی ضرورت ہے اور ستمگر کو ایک ستم دوست کی احتیاج ہے۔ اس صورت سے ایک رابطۂ اتحاد فی مابین قائم ہے۔ لہذا اگر وہ مہربان نہیں ہے تو نامہربان بھی نہیں ہے۔ غالب کے منطقی استدلال نے اس میں عجیب و غریب لطف پیدا کر دیا ہے اور یہی استدلال اس شعر کو مرزا کے خاص رنگ میں لے آیا ہے۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑی خوبی اس شعر میں انداز بیان کی ہے اور پھر یہ کہ منطقی رنگ کے ساتھ اس میں تغزل کا رنگ کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ مگر مومن کہتے ہیں ؎

اظہار دوستی کی خوشی کیا شب وصال　　دشمن سے سن چکا ہوں کہ تو مہرباں نہیں

مدتوں کے بعد ایک ہجراں نصیب کو شب وصال میسر ہوئی ہے معشوق گرم جوشیاں کر رہا ہے۔ مگر اس سے بھی اس ستم نصیب عاشق کو کوئی

تسکین نہیں ہوتی۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے دشمن سے سنا تھا کہ تو کسی کا دوست نہیں ہوتا اور اگر یہ سننا محض سننے ہی کی حد تک رہتا تو غنیمت تھا مگر چونکہ اس وقت اس کے قول کی تصدیق ہو رہی ہے کہ اب وہ دشمن کے پاس نہیں ہے اور ہم پر مہربان ہے لہٰذا یہی اس کی بے ثباتی محبت کا ثبوت ملتا ہے۔ استدلال کی صورت تقریباً یکساں ہے ؎

غالب — روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں ‌ ‌ پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی

اس شعر میں ایک تعلی شاعرانہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ روح القدس پر اپنی ترجیح بھی ایک بے لطف سی بات ہے مگر مومن خاں اسی قافیہ میں تغزل کی شان پیدا کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

قابو میں دل نہیں ہے کہ بس میں زباں نہیں ‌ ‌ پیش عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا

اول تو جس صفائی کے ساتھ کہا گیا ہے اس کی تعریف محال ہے اور اس کے علاوہ بلاغت اور شعر کی معنویت اور بھی قیامت ہے جس کی وجہ سے یہ شعر غالب کے شعر سے بہت بڑھ گیا ہے ؎

غالب — سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں ‌ ‌ نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب

یہ شعر غالب نے ایک شوخی کا انداز قائم رکھتے ہوئے تغزل کی حد میں کہا ہے اور نہایت ہی عمدہ صورت سے کہا ہے مگر مومن خاں کے یہاں ایک ناصحانہ انداز بیان ہے ؎

دنیا کی حسرتیں مرے دل پر گراں نہیں ‌ ‌ اتنے سبک نظر میں ہیں اطفاع روزگار

یعنی زمانہ کو میں اتنا ہیچ و پوچ سمجھ چکا ہوں کہ دنیا کی حسرتیں اب میرے دل پر کوئی گرانی پیدا نہیں کرتیں۔ اس میں لطف یہ ہے کہ حسرت بھی میری نظر میں سبک ہو گئی ہے۔ تاب و تواں کا قافیہ غالب نے قطعہ بند کہا ہے ؎

غالب
ہر چند پشت گرمی تاب و تواں نہیں ‌ ‌ ہر چند جاں گدازی قہر و عتاب ہے
لب پر دہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں ‌ ‌ جاں مضطرب ترانۂ ہل من مزید ہے

یعنی اگرچہ تمام ظلم ہو رہے ہیں۔ اگرچہ بیحد ناتواں ہوں۔ مگر پھر بھی جان خواہشمند ہے کہ اور بھی ستم ہوں۔ لب ہرگز نعرۂ الاماں نہیں کہتا یہ ایک کیفیت خاص ہے جو اکثر عشق میں ہوتی ہے۔ مگر شوکت الفاظ کے سوا شعر میں کوئی ندرت نہیں ہے ؎

مومن
ہر ذرہ میری خاک کا برباد ہو چکا
بس اے خرام ناز کہ تاب و تواں نہیں

انداز تغزل میں بے مثل ہے اور باوجود اس کے کہ مرزا نے اس کو قطعہ کی صورت میں کہا ہے مگر اس میں کوئی خاص خوبی نہیں پیدا کر سکے اور مومن نے ایک ہی شعر میں سوز و ساز کی دنیا بھر دی۔

دوسری غزل ملاحظہ فرمائیے۔ غالب کہتے ہیں ؎

ملتی ہو خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

یعنی مجھپر جو آگ کا عذاب کیا گیا ہو میں اُس سے بہت خوش ہوں کہ آگ جب ملتہب ہوتی ہو تو مجکو اپنے معشوق کی آتش خوئی یاد آتی ہو اور اس لئے اس عذاب میں ایکقسم کی راحت معلوم ہوتی ہو۔ کافر ہوں۔ کا ٹکڑا اس شعر میں نہایت سوچ سمجھ کر کہا گیا ہے جس سے وسعت معنی بہت بڑھ گئی ہو۔ مگر نار اور التہاب نہایت ثقیل ہیں ؎

مومن
جلتا ہوں ہجر شاہد و یاد شراب میں
شوق ثواب نے مجھے ڈالا عذاب میں

مفہوم بالکل ظاہر ہو مگر مومن کا انداز بیان: دوسرے مصرع میں نہایت ہی صفائی کے ساتھ اُستادی کی شان پیدا کر رہا ہو پہلے مصرع میں جلتا ہوں کے ایہام نے شعر کے معانی میں بہت زیادہ مدد کی ہو۔

غالب
کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

اس مضمون کو دیکھ کر کسیکی جرات نہیں ہوسکتی کہ کوئی نقص نکال سکے مگر افسوس کہ یہ مضمون غالب کا نہیں ہے بلکہ خسرو کے ایک شعر کا ترجمہ ہے ؎

زہی عمر دراز عاشقاں گر
شب ہجراں حساب عمر گیرند

مومن
کھولا جو دفتر گلہ اپنا زیاں کیا
گزری شب وصال ستم کے حساب میں

وہی انداز تغزل جو مومن کے کلام کی جان ہو اس میں بھی موجود ہو اگرچہ مضمون کو بلند نہیں کہا جاسکتا مگر صفائی اور سادگی مضمون نظر انداز بھی نہیں کی جاسکتی ؎

غالب
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

مضمون آفرینی جس کے لئے غالب کی شاعری خلق ہوئی تھی۔ اس شعر میں بھی بدرجہ اتم موجود ہو یعنی معشوق کی جفا و وفا کی صورت میں اور عاشق کی کامیابی ناکامیابی کے رنگ میں ہو۔ اور طرہ یہ کہ شاعر کا وہی خاص انداز بیان جس کا وہ عادی ہو اس لئے شعر بہت ہی ...

بے مثل ہو۔ مگر مومن نے اس قافیہ کو جس خوبی سے کہا ہو وہ باوجود اتنی زبردست مضمون آفرینی کے غالب کے شعر سے بہت بڑھا ہوا ہو۔ کہتا ہو

تیری جفا نہ ہو تو ہے سب دشمنوں سے امن

بدست غیر محو دل، اور بخت خواب میں

جس صورت سے مصرع اولیٰ لگایا گیا ہو اُس سے بہتر کوئی صورت خیال میں نہیں آتی۔ غیر اس وقت شراب عیش سے بدمست ہو۔ میرا دل محو ہوکر رہ گیا ہو۔ میرا نصیب محو خواب ہو اگر ایسے میں تو بھی جفا سے باز آ جائے تو مجھے تمام دشمنوں سے نجات ملجاے۔ تغزل کی حد میں ایسی مضمون آفرینی اور اُسی کے ساتھ بیان میں یہ شگفتگی مومن ہی کا حصہ تھا ؎

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں — غالبؔ

چونکہ بیان میں صفائی کو انتہائی طریقے سے ملحوظ رکھا گیا ہو اس لحاظ سے شعر کو جو درجہ دیا جائے کم ہے مگر مومن کے تغزل کا انداز کسی مضبوط سے مضبوط مضمون اور زبان کی عمارت کو قائم نہیں رہنے دیتا۔ ملاحظہ ہو ؎

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں

سارے گلے تمام ہوے اک جواب میں

اتنی لمبی داستان کہ عاشق معشوق کے پاس سیکڑوں گلے ہزاروں شکوے لئے ہوے پہونچا۔ تمام روتا رہا۔ رحم اور جواب کا منتظر رہا۔ مگر معشوق نے۔ ناز۔ شوخی۔ سادگی۔ ظرافت۔ غصے جھنجھلاہٹ کے لہجہ میں اتنا کہدیا کہ آپ کو اپنے اضطراب میں ہوش بھی ہو۔ تمام گلوں کا خاتمہ کر گیا۔ ایک جملہ نے معانی کا ذخار دریا شعر میں موجزن کر دیا۔ اس جواب میں جس قدر پہلو نکلتے ہیں بیان نہیں ہو سکتے ؎

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے

ڈالا ہو تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

میں شب وصال میں خوف رقیب سے مضطرب ہوں مگر خدا معلوم تمکو کیا وہم ہو رہا ہو۔ پہلے مصرع میں بہت سے پہلو ہیں اور بیان کی تہ میں ایک خاص قسم کی شوخی بھی ہو۔ مگر مومن کے بیان بھی ایہام کے ہونے سے ایک خاص لطف سا پیدا ہوگیا ہو اگرچہ اس قافیہ کو وہ غالب سے بڑھا نہیں سکے ؎

پھیلی شمیم یار مرے اشک سرخ سے

دل کو غضب فشار ہوا اضطراب میں

میں اور حظ وصل خدا ساز بات ہو جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

بے نالہ منہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے
اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں
مومن

غالب کے شعر میں شوخی اور شان عشق ہے۔ مومن کے یہاں مایوسی حزن و یاس پریشاں حالی۔ دونوں مضمون بالکل جدا ہیں۔ نازک خیالیاں دونوں میں ہیں مگر ایک دوسرے سے تجاوز نہیں۔ البتہ مومن کے یہاں اجزائے دل لکھکر شعر میں جان ڈال دی گئی ہے۔ اجزائے دل اضطراب میں جس صورت سے تباہ ہوتے ہیں اُن کی تشریح اس صورت سے ایک غالب ہی نہیں بلکہ شاید دیگر اساتذۂ عجم کے یہاں بھی نہ ملیگی اسی کے ساتھ اس مسئلہ پر ایک کافی روشنی پڑتی ہے کہ جب انسان نالہ کرتا ہے تو وہ آواز گریہ دل کے اجزا کی تباہ کن ہوتی ہے اور جب روتا ہے تو وہ آنسو دل کو برباد کر دیتے ہیں اس کے علاوہ شعر کا ظاہری حزن بھی شان عاشقانہ کی ایک مایوس تصویر ہے ؎

تیوری چڑھی ہوئی ہے جو اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں
غالب

غالب نے معشوق کی ایک ادا اور اس کے اثر کے مترتب ہونے کو یقینی ایک نئی صورت سے دکھایا ہے ؎

چین جبین کو دیکھ کے دل بستہ تر ہوا
کیسی کشود کار کشود نقاب میں
مومن

غالباً کسی ہجراں نصیب عاشق کے لئے اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ معشوق اس کے سامنے بے نقاب ہو مگر مومن اس وصل میں بھی اپنی حرماں نصیبی دکھاتا ہے اور اسی تیوری کو جس سے غالب نے ایک صورت محاکات پیدا کی ہے اپنے دل بستہ ہونے کی وجہ ٹھہراتا ہے۔ اگرچہ مضمون کو کوئی خاص درجہ دینا کھلی ہوئی ناانصافی ہے مگر دوسرے مصرع کا حسن بیان اہل نظر کو داد لئے بغیر نہیں رہ سکتا ؎

لاکھوں بگاڑ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
(غالب)

غالب نے حسن معشوق کی دو خاص کیفیتوں کا منظر دکھایا ہے اور سچ یہ ہے کہ اس طرح دکھایا ہے کہ غالب کے سوا دوسروں نے ان کے برابر اس قافیہ کو حسن کے ساتھ نہیں کہا۔ مومن کا یہ شعر اگرچہ انداز تغزل میں بُرا نہیں مگر وہ غالب کے برابر نہیں پہنچا ؎

ہے منتوں کا وقت شکایت رہے رہے
آئے تو ہیں منانے کو پردہ عتاب میں
(مومن)

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں ‌ ‌ بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں
مومن

اگرچہ مومن کا یہ شعر غالب کے مقطع سے

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

کی برابری نہیں کر سکتا۔ مگر اپنی معنی آفرینی کی وجہ سے اس میں بھی ایک قسم کا حسن پیدا ہو گیا ہے شب ماہ کو دیکھ کر خود بخود مست ہو جانا نہایت پاکیزہ مضمون آفرینی ہے مگر پھر بھی اسے شعریت کی حدود میں نہیں لا سکتے ؂

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں — غالب

یہ شعر غالب کے ادبی کارناموں میں سے ایک زبردست کارنامہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ مگر حد تغزل سے دور اور حکیمانہ خیالات سے معمور ہے۔ مومن نے اس قافیہ میں تغزل کا رنگ پیدا کر کے خاص چیز بنا دیا ہے ؂

قاتل جفا سے باز نہ آیا وفا سے ہم
فتراک میں جو سر ہے تو پا ہے رکاب میں

بجا ہوتا ہے جفا ہوتا ہے۔ اس زمین میں بھی دونوں استادوں کی غزلیں موجود ہیں مگر افسوس ہے کہ ہم قافیہ صرف ایک ہی شعر ہے ؂

پُر ہوں میں شکوؤں سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے — غالب

غالب کی تشبیہ نے بھی شعر کو بہت بلند کر دیا ہے اور اسکے مصرع ثانی کی بے تکلفی خصوصیت سے قابل داد ہے مگر مومن نے اسی عاشقانہ انداز کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک سانحے کا مضمون ادا کر دیا ہے ؂

اک نظر دیکھے سے سر تن سے جدا ہوتا ہے
بے جگہ آنکھ لڑی دیکھئے کیا ہوتا ہے

یہ شعر پڑھ کر مآل عاشقی اور حرماں نصیبی کی پُرحسرت تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ سب سے بڑی خوبی انداز بیان کی بے تکلفی ہے۔ جس کی وجہ سے کم از کم یہ شعر غالب کے شعر کے مقابلہ میں لایا جا سکتا ہے ورنہ اگر دونوں کی غزلوں کو دیکھا جائے تو دونوں بانغ و بہار ہیں مضمون۔ زبان۔ معنی آفرینی کسی لحاظ سے ایک دوسرے سے کم نہیں ہے۔ ہم طرح غزلوں میں سے ایک غزل یہ بھی ہے۔ آسمان کے لئے۔ جہان کے لئے۔ گرد و صورت بدستور قائم ہے۔ بہت کم قافیہ ملتے ہیں پھر بھی جو ہیں وہ حاضر ہیں ؂

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنے بھی مژگانِ خوں فشاں کے لئے

مژۂ یار نے اس قدر خون آشامی کی ہو کہ اب دل میں خون بہت کم رہ گیا ہو اور مجبور ہو کر کہتا ہو کہ اب مجکو اپنے مژگانِ خونفشاں کیواسطے بھی کچھ رکھنا چاہئے۔ شعر کی بندش کی چستی قابلِ داد ہو۔ مضمون میں جگر کاوی بھی کی گئی ہو مگر شانِ عشق سے منافی ہو۔ مومن اپنے خاص انداز میں کہتا ہو ؎

وہ لعلِ روح فزا سے کہاں تلک لیجے
کہ جو ہو کم ہو یہاں شوقِ جانفشاں کیلئے

مضمونِ شعر اس قدر صاف ہو کہ غالباً اس کی تشریح کی احتیاج نہیں مگر لعلِ روح فزا اور شوقِ جانفزا کی ترکیبوں نے اس کو بہت بلند کر دیا ہو ؎

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحان کے لئے
غالب

غالب کے یہاں یہ شعر بیت الغزل ہو۔ تعریف محال ہو۔ مومن کا اس قافیہ میں اتنا کہنا بھی کمال ہو لکھتے ہیں۔

بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے مرے
ہمیں بھی دینی تھی جاں اُس کے امتحاں کے لئے
مومن

وفا آزما ستم سے مرنا ہمارے لئے غنیمت ہوا ورنہ ہم کو تو ایک نہ ایک دن جان نذرِ امتحان کرنی تھی اپنے خاص انداز کو محفوظ رکھتے ہوئے کہا گیا ہو بات میں سے بات نکالی ہو

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے
غالب

سوائے شوخیِ بیان کے اور کچھ شعر میں نہیں ہو بلکہ اگر بدمذاقی نہ سمجھی جائے تو اس قسم کے شعروں کو ابنیار کے سوءِ ادب کی حد میں لایا جاسکتا ہو مگر مومن نے اس قافیہ کو غالب سے بہت اچھا کہا ہو ؎

خلافِ وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں
امید یکشبہ ہے یاس جاوداں کے لئے

یعنی ہم میں کل کی وعدہ خلافی کی تاب کہاں ہو ایک رات کی امید بھی یاسِ جاوداں کے لئے کافی ہو۔

شال یہ مری کوشش کی ہو کہ مُرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

غالب کے بہترین شعروں میں ایک شعر یہ بھی ہو حسرت واندوہ حرمان و آرزو کی ایک مکمل تصویر ہو مگر بعض لوگ کہتے ہین کہ یہ ایک نظری وہو کہ ہو اسپر اعتراض کیا جا سکتا ہو کہ مرغ اسیر قفس میں آشیاں بنانے کے لئے خس کیونکر فراہم کر سکتا ہو اسیر سے یہ آزادانہ حرکتین نہایت مستبعد ہین -

کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ اَمن قفس
ہو بیم برق بلا روز آشیاں کے لئے		مومن

مومن نے اپنے اصلی رنگ کو چھوڑ کر یہ شعر فلسفیانہ انداز میں کہا ہو اور اسپر مصرع اس قدر صاف اور سادہ لگایا ہو کہ یقینی یہ شعر غالب کے شعر سے بڑھ گیا ہو غالب نے اسی مفہوم کو ایک جگہ یوں ادا کیا ہو ؎

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روے دریا آتش است		غالب

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے		غالب

یہ وہ شعر ہو جس کی خوبی پر تمام شارحین غالب اور مولانا حالی بہ اتفاق رطب اللسان ہیں اور کوئی شک نہیں کہ یہ ایجاز و اختصار کے لحاظ سے بیت الغزل کہا جا سکتا ہو - مگر مومن نے اس قافیہ کے کہنے میں نہایت جگر کاوی کی اور لطف یہ کہ اپنے رنگ پر قائم رہ کر اتنا عمدہ کہا ہو کہ غالب کے شعر سے اگر زیادہ نہین تو کسی طرح کم بھی نہین ہو -

ہو اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کیلئے		مومن

خواب چشم پاسباں کا اپنے بخت خفتہ کو معتمد علیہ قرار دینا ایک عجیب و غریب مضمون ہو اسپر اسکے انداز بیان نے ایک اور قیامت ڈھا دی ہو جسکی تشریح ناظرین کے غور و تعمق کی محتاج ہو -

ایک غزل اور ہو جس کی ردیف و قافیہ - جائے ہو - آئے ہو ہے ہمطرح ہو مگر افسوس کہ ہم قافیہ شعر کوئی بھی نہیں - دوسری غزل وہ ہو جس کا ردیف و قافیہ حیا ہو - مزا ہو - اسمین دو تین توافی ملتے ہیں - غالب کہتا ہے ؎

شبنم بہ گل و لالہ نہ خالی ز ادا ہو		داغ دل بیدرد نظر گاہ حیا ہو .

بیان کرنے والوں نے اس شعر کے عجیب عجیب معنی بیان کئے ہیں۔ ممکن ہو کہ وہ سب کے سب صحیح ہوں مگر اصل میں یہ شعر وہی بیدل اور شوکت بخاری وغیرہ کے رنگ میں ہو جس سے آخر میں خود غالب بھی متنفر ہو گئے تھے۔ اسی لحاظ سے اس کو قابل اعتنا قرار دیکر کوہ کندن وکاہ برآوردن کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ سنئے مومن کا شعر سنئے جس کے بیان کی روانی۔ زبان کی خوبی قابل داد ہو۔

کس طرح نہ اُس شوخ کے رونے پہ ہنسو نہیں
نظروں میں مروت ہو نہ آنکھوں میں حیا ہو

بارہا سنا گیا ہو کہ معشوق عاشق کے رونے پر ہنستے ہیں۔ مگر جو صورت مومن نے بیان کی ہو وہ انتہائی درجہ ہو اس بدگمانی کا جو آخر میں عاشق کو پیدا ہو جاتی ہو اور کسی صورت معشوق کی بیوفائی کا خیال اُس کے دل سے نہیں ہٹتا ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
غالب

غالب کا یہ شعر بے مثل ہو جس کے مقابلہ پر مومن کا یہ شعر لکھنا صرف موازنہ کی ضرورت سے ہے ورنہ درحقیقت کوئی نسبت نہیں ہے۔

آزردۂ حرماں سے ملاقات نبھے کیا
یعنی کہ نہ ملنا ہی نہ ملنے کی سزا ہے

دونوں باکمال کے مقطعے بھی دونوں کے کمال کا آئینہ ہیں جنکو میں صرف نقل کئے دیتا ہوں۔ امتیاز ارباب ذوق کی نظر پر منحصر ہو۔ میں کوئی فرق نہیں نکال سکتا۔ میرے خیال میں ایک کی خوبیاں دوسرے پر غالب آئی جاتی ہیں ؎

بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے
غالب

مومن نہ سہی بوسۂ پا سجدہ کرینگے
وہ بت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے
مومن

موازنۂ مضامین

جہاں تک میرا خیال ہو غالب اور مومن کے ہم قافیہ شعر اب نہیں رہی۔ اگرچہ مجھے اسبات کا دعویٰ نہیں ہو کہ میں نے اس فرض کو اچھی طرح ادا کیا۔ مگر یہ کہنے کی گنجایش ہو کہ دونوں دیوانوں کے ہم قافیہ شعروں میں سے کوئی شعر شائد باقی نہیں رہا۔ اس سے زیادہ لطیف چیز میرے نزدیک وہ ہم مضمون شعر ہیں جو دونوں اُستادوں کے یہاں ملتے ہیں اور جن سے صحیح طریق پر دونوں کی افتاد طبیعت کا پتہ چلتا ہو ؎

اُس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا
مومن

یعنی مجھے نقشِ پا کے اوپر سجدہ کرنا فرض تھا اور معشوق کے نقشِ پا صرف کوچۂ رقیب ہی میں مل سکتے تھے اس واسطے وہاں سجدہ کیا اور رقیب کے کوچہ میں سجدہ کرنا میرے لئے باعث ننگ تھا۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں
غالب

معنی جو کچھ ہیں ظاہر ہیں صرف یہ لکھنا ضروری ہے کہ اشتراک جذبۂ رشک و رقابت۔ خودداری اور احترام عشق میں ہے۔ غالب کے رہ گذر کو ڈھونڈھتے اور اسی کی وجہ سے کوچۂ رقیب میں جاتے ہیں ان کے یہاں بہ نسبت عشق کے خودداری کا جذبہ غالب ہے جس سے تنگ ہو کر وہ کہتے ہیں کہ ع

اے کاش جانتا نہ تری رہ گذر کو میں

برعکس اس کے یہاں جذبۂ عشق کا غلبہ ہے کہ جہاں تک انکو نقش قدم ملے وہیں تک سجدے کرتے گئے۔ گو پھر بھی غلبۂ عشق اس کے سوا کچھ اور کہنے سے مانع ہے کہ میں کیا ذلیل ہوا ہوں مگر وہ غالب کی طرح اس ذلت کو صرف ذلت سمجھتے ہیں یہ نہیں کہتے کہ کاش میں ایسا نہ کرتا۔ اسی سے دونوں کے مزاج اور طبیعتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مومن کے یہاں احترام عشق کو ملحوظ رکھتے ہوئے شعر کو ترجیح دینا پڑتی ہے۔

غیر دل پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
مومن

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے
غالب

اشتراک مضمون صرف اس بات میں ہے کہ کھنچا کھنچا رہنا کسی تعلق کا پتہ دیتا ہے اور برعکس اس کے سب سے یکساں برتاؤ کرنا اس خیال کو زائل کرتا ہے خیال میں کسیکو کسی پر ترجیح نہیں دیجاسکتی۔ البتہ مومن کے یہاں غالب سے انداز تغزل بہت زیادہ ہے۔ غالب کے یہاں بندش میں ایک قسم کی الجھن ہے بعض الفاظ مخل فصاحت بھی ہیں مثلاً چھوڑا چاہیئے وغیرہ مگر مومن کے یہاں اس ثقالت کا نام نہیں ہے

کرتے ہیں اپنے زخم جگر کو رفو ہم آپ
کچھ بھی خیال جنبش مژگاں نہیں رہا
مومن

پھر جمع کر رہا ہوں دل لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مژگان کئے ہوئے
غالب

غالب کا شعر اس قدر بلند واقع ہوا ہو کہ بادی النظر میں مومن کا شعر اُس پایہ کا نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا خیال ہو کہ میرا جگر لخت لخت کو جمع کرنا ہی مژگاں کو دعوت دینا ہو۔ اس شعر کی تہ میں جو ایک ظرافتِ تلخ جسے زہرخند سے تعبیر کیا جا سکتا ہو بیحد لطیف ہے۔ مگر مومن کے یہاں اُس کی بجائے ایک استم کی حیرت ہے مگر پُرشوق ہو۔ اسی طرح غالب کے یہاں جیسا دوسرا مصرع ہے۔ مومن کے یہاں اُس ظرافت لطیف کی ایک ہلکی سی جھلک پہلے مصرع میں ہے۔

ہائے رے چھیڑ اُسنے سُن سُن کے
مومن		حال میرا کہا کہ کیسا صاحب

تغافل پیشگی سے مدعا کیا
غالب		کہاں تک اے سراپا ناز کیسا کیسا

غالب کا مقصد صرف اتنا ہو کہ میں اپنا حال کہتا ہوں وہ سنتا ہوا در پھر بھی تجاہل عارفانہ کی راہ سے کیا کیا کر رہا ہو نہ معلوم اس سے کیا مقصد ہو مگر مومن کا صاف انداز بیان نہ کہیں فارسی ترکیب کا منت کش ہے اور نہ اس بات کو مبہم چھوڑتا ہے کہ آخر اس سے کیا مقصد ہے وہ رموز عشق سے پوری آگاہی رکھتا ہے اور انداز حسن سے قطعاً خبردار ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بھی ایک چھیڑ ہے ایک انداز ہو اور پرسش پنہاں۔

مومن		مجھکو محشر میں وہ صنم نہ ملا		حشر اور ایک بار ہونا تھا

واے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہو
غالب		آجتک تو یہ توقع تھی کہ واں ہو جائے گا

غالب قبل از محشر ہی اپنے خیال کا اظہار کرتا ہو لیکن مومن کہتا ہو کہ حشر ہوا اور صنم نہ ملا یہی فقرہ اس بات کا مرادف ہے کہ انصاف نہیں ہوا۔ وہ اس بات پر افسوس کرکے نہیں رہ جاتا بلکہ کہتا ہے کہ یہ ایک ایسا قضیہ ہے ایسا اہم معاملہ ہو کہ اس کے لئے دوبارہ حشر ہونا چاہئے۔ گو اس کی خواہش بے سود رہتی اور اس کی کوشش بیکار رہتی ہو جو ردیف سے ظاہر ہو رہی ہو مگر اسکی یہ خواہش معانی کے دفتر کے دفتر پیش کر دیتی ہے اگرچہ غالب کے یہاں معشوق اور عاشق کی ایک گفتگو جو شعر کے مضمون سے پہلے ہونی چاہئے مقدر ماننی پڑتی ہے مگر پھر بھی وہ شعر کی ہر کمی کو پورا نہیں کرسکتی۔

چاہتا ہوں میں کہ مسجد میں رہوں مومن بنے
مومن		کیا کروں بتخانے کی جانب کھنچا جاتا ہے دل
غالب		جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد		پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مفہوم دونوں شعروں کا ایک ہو۔ مگر غالب کے یہاں بندش اس قدر چست ہے کہ مومن کے شعر کی یہ لطافت بھی کہ دل خود بخود تنہائی کی طرف کھنچا جاتا ہو اُس کا مقابلہ نہیں کرتی۔

مومن

پاتے تھے چین کب غم دوری سے گھر میں ہم
راحت وطن کی یاد کریں کیا سفر میں ہم

غالب

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس جو گلخن میں نہیں

مومن کا خیال ہو کہ گھر میں بھی دوری تھی اور اسی غم میں مبتلا تھے اب غربت میں ہیں تو غربت ہم کو کیا وطن کی یاد دلائے وہاں کونسی راحت تھی اور یہاں کیا نہیں ہو یہ ایک صاف اور سیدھا مضمون ہے مگر غالب کی جگر کاوی اور اُن کی مضمون آفرینی اسمیں عجیب شان پیدا کر دیتی ہو اور یہ کہنا کہ ہماری وطن میں کونسی شان تھی کہ غربت میں کسی قدر کی امید رکھیں۔ مایوسی و غم و حرمان کی ایک مکمل تصویر ہے اُس پر یہ تشبیہ کہ میں ایک مشت خس ہوں اور وطن میرے لئے گلخن ہے۔ اب وطن میں نہیں ہوں تو گویا گلخن میں نہیں ہوں شعر کو لے اُڑی ہے اور باوجود ناموزوں الفاظ کے بھی مومن کے شعر کو برابر نہیں آنے دیتی۔ مومن کے یہاں اگر کوئی خوبی ہو تو اس شعر میں صرف انداز تغزل ہو جسکے مقابلہ میں غالب کا یہ شعر بھی لایا جا سکتا ہے ؎

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری ارباب وطن یاد نہیں

مومن

ہو کے آزردہ پشیماں ہوں کہ میں جس سے کہوں
سنکے کہوے کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہو

غالب

رہی اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

غالب انتہائے حزن و یاس۔ خودداری اور غلبۂ عشق کا اظہار کرتا ہے۔ اکثر ہوتا ہے کہ جب ظلم و ستم حد سے گذر جاتے ہیں تو عاشق کے دل میں ایک جذبہ اس قسم کا پیدا ہوتا ہو مگر وہ ایک قسم کا جنون ہے جس کا نتیجہ سوائے اعتراف شکست کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اسی مضمون کو قائم چاندپوری نے خوب کہا ہے ؎

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر　　روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

مومن بھی اسی جذبۂ خودداری کا اظہار کرتا ہے مگر غلبۂ عشق کی کیفیت اور حسن کا احترام اور اپنی دیوانگی کا اس ٹکڑے سے اظہار کر دیتا ہے کہ "کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے"۔ اور یہی کیفیت ہے جو غالب کے اتنے بے مثل شعر سے بڑھا کر مومن کے انداز بیان کو تیسرے ملا دیتی ہے۔

مومن — بڑی مشکل پڑی کیا چارۂ دردِ نہاں کیجئے ‖ کہیں تو کیا کہیں اور بن کہے کیونکر دوا ہووے

غالب — ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال ‖ کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

غالب کا خیال ہے کہ اب ہماری قوت مدرکہ نے یہ بات طے کر لی ہے کہ وصال دراصل کوئی چیز نہیں بلکہ وصال نام ہے اس فکر کا کہ "گر نہ ہو" الخ مومن کہتے ہیں کہ عجب مشکل میں پڑے ہوئے ہیں اور ہمارا عجیب درد ہے جب سوچتے ہیں کہ اس کا علاج کریں تو درد بیان نہیں ہو سکتا۔ اور بغیر دوا کے گزر ہو نہیں سکتی۔ خیال قریب قریب الجھن اور کاوش کی وجہ سے مشترک ہے مگر غالب کے یہاں شعریت اور تغزل زیادہ ہے اور مومن کے یہاں بخلاف ان کے طرز کے منطقیت زیادہ ہو گئی ہے ؎

مومن — چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی ‖ ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

غالب — قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں ‖ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مومن اپنے عاشقانہ انداز میں کہتے ہیں کہ ناصح تو نے یہ سمجھا ہے کہ اگر میں بند غم سے آزاد ہو جاؤں تو زندگی بہ آرام گذرے حالانکہ تیرا یہ خیال غلط ہے کیونکہ یہ بند غم ہی دراصل قید حیات ہے اس کے بغیر کسی اسیر محبت کی زندگی ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسا ہی ایک شعر بھی ہے

مومن — درد ہی جان کے عوض ہر رگ و پے میں ساری

چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

مومن نے شعر مذکورہ کو دائرۂ عشق و محبت میں رکھا ہے اور غالب نے اپنی طرز کے موافق اس میں منطقی استدلال کی صورت پیدا کر دی ہے بلحاظ تغزل کے مومن کے شعر کو ترجیح دی جا سکے تو شاید صحیح ہو ورنہ بات بالکل ایک ہے اور ایک دوسرے سے کم نہیں۔

مومن — بدنامیوں کے ڈر سے عبث تم چلے کہیں ‖ ہوں تیرہ روز میری سحر بھی تو رات ہے

غالب — جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا ‖ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

وہی فرق ہے مومن صرف اپنی تیرہ روزی کو سبب قرار دے کر دن کو رات کہتا ہے اور غالب اس کلیہ کو عام کر دیتا ہے اور وہی شان منطقی جو ان کا خاصہ ہے اس میں پیدا کر کے قریب قریب ایک علمی مسئلہ کو عشقیہ شعر کی برابر بنا دیتا ہے۔ مومن کے یہاں آج بات زیادہ ہے کہ تم کیوں جاتے ہو میرے یہاں دن اور رات یکساں ہیں۔ مگر غور سے دیکھئے تو یہاں یہ سوال پیدا ہو جائے گا کہ عاشق کی تیرہ روزی صرف فراق سے ہوتی ہے مگر اب تو معشوق موجود ہے۔ پھر اب دل کیونکر تیرہ ہو سکتا ہے۔ اور سحر رات کی طرح کیونکر تاریک ٹھہر سکتی ہے

مومن — کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں ‖ گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے

غالب
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اشتراک خیال معشوق کی پشیمانی میں ہے۔ مگر غالب کے یہاں انداز بیان مومن سے بہتر ہے اگرچہ مومن کے یہاں بھی بندش وغیرہ نہایت چست ہو مگر۔ "

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غالب کو مومن کے درجہ سے ہٹا کر حافظ کے مقابل پہونچا دیتا ہے۔

حافظ
آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزہ خود را بنماز آمدہ

مومن
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے
اتنو مرجانا بھی مشکل ہو ترے بیمار کو

غالب
در کشاکش ضعفم نگسلد روان از تن
اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانی ہاست

دونوں خیال بالکل یکساں ہیں اور سوائے زبان کے اور کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ البتہ مومن نے وہی قید عشق اور غالب نے عمومیت پیدا کر دی ہو جس سے کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہو گیا ہے گر درجۂ امتیاز نہیں پیدا ہو سکتا۔

مومن — جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں — کیا کیجئے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں

غالب — جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیم روز — آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

اشتراک صرف اس خیال میں ہو کہ کوئی اس کو بے حجاب نہیں دیکھ سکتا۔ غالب کے یہاں وہی استدلال منطقی ہے مگر مومن کے یہاں "کیا کیجئے" اور۔ "

وہ جتنے بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

دونوں ٹکڑے نہایت ہی عجیب و غریب ہیں جن سے عشق کی محرومی مترشح ہوتی ہے اور اسی کی بنا پر اس شعر کو غالب کے شعر سے مرجح قرار دیا جا سکتا ہو۔ غالب کا ایک شعر اور بھی قریب قریب اسی مضمون کا ہے۔

غالب — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی — نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا

مومن — بس کب تک انتظار تقاضا دل کروں — جان دیدی ہو اُس آفت جاں کی معاملہ

غالب — ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا — ملا اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے بیٹھو

جان یا دل قبل تقاضا دینے کی وجہ سے دونوں خیال مشترک ہیں۔ غالب کے یہاں بربنائے وضع و خودداری تقاضائے حسن کو مکروہ سمجھا ہے اور مومن کے یہاں جان دینا اس وجہ سے ہے کہ حسن آفت جان ہے وہ خواہ مخواہ ایک نہ ایک وقت میں جان لیکر چھوڑے گا فرق دونوں خیالوں میں صرف اسی سبب کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ مومن کے یہاں صفائی ہے۔ بس کے لفظ نے حد انتظار قائم کرکے اور بھی ایک زور پیدا کر دیا ہے۔ غالب کے اس شعر پر علی حیدر صاحب نظم طباطبائی نے اعتراض کیا ہو کہ بجائے تقاضا کے تقاضے چاہئے۔ مگر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ ہرچند کہ (زبان پر (ے) کے ساتھ ہو) مگر یوں بھی غلط نہیں ہے۔ بلکہ صحیح اسی طرح ہے۔ میر ممنون دہلوی استاد اکبر شاہ ثانی کہتے ہیں ؎

میر ممنون　　الٰہی وہ جو دعدے ہیں وفا کس طرح ہووینگے　　نہ وال خو یاد آنے کی نہ یاں شیوہ تقاضا کا

مومن　　منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں　　آنا رہا ہوں دور کہ ہجران کا غم نہیں

غالب　　رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اشتراک خیال اس بات میں ہے کہ خوگر رنج ہونے پر رنج رنج نہیں رہتا۔ مومن کہتا ہے کہ اب میں جدا رہتے رہتے جدائی کا خوگر ہو گیا اور اسی وجہ سے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ لہذا اگر مجھے اب بھی تکلیف دینا چاہتے ہو تو یوں تکلیف دو کہ مجھ سے ملو تاکہ میں خوکردۂ ہجراں اس نئی صورت سے تکلیف پاؤں اور غالب صرف ایک فلسفیانہ مسئلہ بتا دیتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے۔ چونکہ مومن کے یہاں یہ مسئلہ بھی ہے مضمون آفرینی بھی ہے اور پھر حدود تغزل سے باہر نہیں اسی لئے ان کے شعر کو ترجیح دی جائے گی۔

مومن
کیسے مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں
مجھے فکر جواب نے مارا

غالب
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

معشوق کے تجاہل عارفانہ کے لحاظ سے دونوں خیالوں میں اشتراک ہے مگر غالب کے یہاں نہایت عمدہ طریقہ سے یہ مفہوم ادا کیا گیا ہے جو مومن اور نعمت خان عالی دونوں سے زیادہ ہے ؎

زمردم یار می پرسد کہ عالی کیست طالع بیں
کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسید اینجا

مومن

جب ہو گیا یقین کہ نہیں طاقتِ وصال
دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آگیا

غالب

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کا حال میں کیونکر کہے بغیر

معشوق کی ایک عیارانہ چال اور ایک التفات بیکار کے لحاظ سے دونوں خیال ایک ہیں مگر مومن کے بیان میں ایک قسم کی رکاکت ہو اور غالب کے ہاں چستی بندش کے ساتھ خیال میں ایک قسم کی پختگی ہے۔ پھر بھی مومن کا شعر غالب کے شعر سے میرے نزدیک کم نہیں بلکہ اس مصرع کی بلاغت ؎ جب ہو گیا یقیں کہ نہیں طاقتِ وصال

پر پورا پورا غور کیا جائے تو اس کو بہتر بھی کہا جا سکتا ہے۔

مومن

وقت جوشِ بحرِ گریہ میں جو گرمِ نالہ تھا
حلقۂ گرداب ہر اک شعلۂ جوّالہ تھا

غالب

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

میں نے غور کے باوجود بھی اُس فرق کو دریافت نہیں کیا جو ان دونوں شعروں میں ہے

مومن

رشکِ پیغام ہو عناں کشِ دل
نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے

غالب

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا

اشتراکِ خیال رشک کی وجہ سے ہے۔ مگر مومن کا اندازِ بیان کہ "نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے" عجیب و غریب ہے۔ پہلے مصرع میں جو ترکیب صرف کی ہے وہی مفید معنی ہے۔ اور ہر لحاظ سے شعر کو غالب کے شعر پر غالب رکھتی ہے۔

مومن

صبحِ فرقت ہے وہ نہ شامِ وصال
ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

خیالات صاف صاف ہیں مگر مومن کا دردناک للدازبیان آشنا زبردست ہے کہ کسی حیثیت سے غالب کا شعر اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

عبد الباری آسی

انتخاب کلام مومن

غزلیات

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے   نہیں بیزار دوزخ سے نہیں مشتاق جنت کا
عنایت کر مجھے آشوب گاہ حشر غم اک دل   کہ جس کا ہر نفس ہم نغمہ ہو شور قیامت کا

اُس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی   کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا
اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل   میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا
تنگ آنے سے نہ صبر کی تکلیف دے مجھے   مومن بس اب معاف کیا یاں جی بہل گیا

نہ جاؤنگا کبھی جنت میں میں نہ جاؤنگا   اگر نہ ہوئیگا نقشہ تمھارے گھر کا سا
یہ جوش یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت   دعائے وصل کی رقت تھا اثر کا سا

گر وہاں بھی خموشی اثر فغاں ہوگا   حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا
ان سے بد خو کا کرم بھی ستم جاں ہوگا   میں تو میں غیر بھی دل دیکے پشیماں ہوگا
خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ   دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا   مرگ کی آس پہ جینا شب ہجراں ہوگا
درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری   چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا
کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل   تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا
کیونکہ امید وفا سے ہو تسلی دل کو   فکر یہ ہے کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا
دوستی اس صنم آفت ایماں سے کرے   مومن ایسا بھی کوئی دشمن ایماں ہوگا

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا   دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے   آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا
غیر عیادت سے برا مانتے   قتل کیا آن کے اچھا کیا
زندگی ہجر بھی اک موت تھی   مرگ نے کیا کار مسیحا کیا
جور کا شکوہ نہ کروں ظلم ہے   راز مرا صبر نے افشا کیا
رحم فلک اور میرے حال پر   تو نے کرم اے ستم آرا کیا
سچ ہی سہی آپ کا پیمان ولے   مرگ نے کب وعدۂ فردا کیا
دشمن مومن ہی رہے بت سدا   مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

موئے نہ عشق میں جب تک، وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا
خدا کی یاد دلاتے تھے نزع میں احباب
ہزار شکر کہ اس دم وہ بدگماں نہ ہوا
ہنسے نہ غیر مجھے بزم سے اٹھانے پر تو
سبک ہے وہ کہ تری طبع پر گراں نہ ہوا
وہ آئے بہر عیادت تو تھا میں شادی مرگ
کسی سے چارۂ بیداد آسماں نہ ہوا
لگی نہیں ہے یہ چپ لذت ستم سے میں
حریف کشمکش نالہ و فغاں نہ ہوا
امید وعدۂ دیدار حشر پر مومن
تو بے مزہ تھا کہ حسرت کش بتاں نہ ہو

....

سب تا بہ فتنہ چونک پڑے تیرے عہد میں
اک میرا بخت تھا کہ وہ بیدار کم ہوا

کچھ قیس اور میں ہی نہیں سب کے سب موئے
اچھا تو درد عشق کا بیمار کم ہوا

ذکر بتاں سے پہلی سی نفرت نہیں رہی
کچھ اب تو کفر مومن دیندار کم ہوا

میں وہم سے مرتا ہوں وہاں رعب سے اس کے
قاصد کی زباں سے نہیں پیغام نکلتا

حوریں نہیں مومن کے نصیبوں میں جو ہوتیں
بت خانے ہی سے کیوں یہ بد انجام نکلتا

وصل کی شب شام سے میں سو گیا — جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا
آئینہ جلدی سے ٹک دو دیکھیں — دل ہی نہیں ہاتھ سے دیکھو گیا
صبر نہیں شام فراق آ چکو — جس سے کہ بیزار تھے تم سو گیا
ہائے صنم ہائے صنم لب پہ کیوں — خیر ہے مومن تمہیں کیا ہو گیا

ڈر تو مجھے کس کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا ہو
پر حال یہ افشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم
بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اے چارہ گرو قابل درماں نہیں یہ درد
ورنہ مجھے سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ہر وقت ہے دشنام ہر اک بات پہ طعنہ
پھر اس پہ بھی کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک
ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری — تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا
غم مرا کس لئے کہ دنیا میں — نہ رہا میں مرا فسانہ نہ رہا
مدعا غیر سے کہا تا وہ — سمجھے اب کچھ بھی مدعا نہ رہا
دل لگانے کے تو اٹھائے مزے — جی بلا سے رہا رہا نہ رہا
تو فلک مرگ ہم سے سب غافل — اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا
دل لگانے کے تو اٹھائے مزے — جی بلا سے رہا رہا نہ رہا

بسکہ اک پردہ نشیں سے دل بیمار لگا — جو طبیبوں سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا
کعبہ سے جانب بتخانہ پھر آیا مومن — کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

شب غم فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا — دم رکے تھا سینے میں کمبخت جی گھبرائے تھا
یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا — تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا
بات شب کو اُسکی منع بیقراری پر بڑھی — ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا
ناز و شوخی دیکھنا وقت تظلم دمبدم — مجھ سے وہ عذر جفا کرتا تھا اور جھنجھلائے تھا

ہو گئی دوری کی الفت میں کیا حالت ابھی — مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

....

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

....

عبث الفت بڑھی تم کو وہ کب بیتا تھا مجھ پر
یہ مجھ کو دیکھ کر دشمن کلیجا تھام لیتا تھا

سحر تک شام سے تجھ بن یہی حالت رکھی دل نے
نہ مجھ کو چین دیتا تھا نہ آپ آرام لیتا تھا

نہ مانو گے نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

اگر مومن ہی ہو تو تم دے لے میں تو نہ مانوں گا
جو عہد دوستی وہ دشمن اسلام لیتا تھا

میرے کوچے میں عدو مضطر و ناشاد رہا
شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا

نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف
خون فرہاد سر گردن فرہاد رہا

بیکسی نے نہ دیا ہائے تہ خاک بھی چین
تا قیامت الم گریہ جلاد رہا

لذت جور سے دم لینے کی فرصت نہ رہی
کیا اثر منتظر دعوت فریاد رہا

یاد سہواً اسے اے غیر ہے نسیاں عمداً
یاد رکھ بھول گیا جس کو وہی یاد رہا

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری

....

گر غم جور گئے عشق بتاں اے مومن
میں سدا سوختۂ حسن خداداد رہا

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا
میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

کشتۂ ناز بتاں روز ازل سے ہوں مجھے
جان کھونے کے لئے اللہ نے پیدا کیا

روز کہتا تھا کہیں مرتا نہیں ہم مر گئے
اب تو خوش ہو بیوفا تیرا ہی کہنا کیا

دلبروں میں بیوفا میری وفا کی دھوم ہے
بوالہوس سے کیوں کہا تھا راز جو افشا کیا

چارہ گر زنداں میں اس کے آستاں کو لے گئے
ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پٹکا کیا

کیا خجل ہوں اب علاج بیقراری کیا کروں
دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

عرض ایماں سے صدا اس غارتگر دیں کی بڑھی
تجھ سے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا
نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا

نہ میری سنے وہ نہ میں ناصحوں کی
نہیں مانتا کوئی کہنا کسی کا

کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں
کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

وہ کرتے ہیں بیباک عاشق کشی یوں
نہیں کوئی دنیا میں گویا کسی کا

ہم الحذر اور عشق بتاں سے　　مجھے ڈر ہے اے مومن ایسا کسی کا
دل کو قلق ہے ترک محبت کے بعد بھی　　اب آسماں کو شکوۂ بیداد آگیا
جب ہو چکا یقیں کہ نہیں طاقت وصال　　دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد ہو گیا

وعدۂ وصلت سے دل ہو شاد کیا　　تم سے دشمن کی مبارکباد کیا
کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی　　آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر　　ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا
نشۂ الفت میں بھولے یار کو　　سچ ہے ایسی بیخودی میں یاد کیا
. . . .　　. . . . .
جب مجھے رنج دل آزاری نہ ہو　　بیوفا پھر حاصل بیداد کیا
کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر　　ولولہ کیا، نالہ کیا فریاد کیا
ان نصیبوں پر کیا اختر شناس　　آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا
روز محشر کی توقع ہے عبث　　ایسی باتوں سے ہو خاطر شاد کیا
گر بہائے خون عاشق ہو وصال　　انتقام زحمت جلاد کیا
بتکدہ جنت ہے چلئے بے ہراس　　لب پہ مومن ہر چہ بادا باد کیا

کیا بہر عیادت گر ارادہ اُسنے آنیکا　　تو جب تک جان ہے درد دل محزوں نہ ٹھہریگا

یہ عذر امتحاں جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اُس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
خدنگ یار کے ہمراہ نکلی جان سینے سے
یہی ارماں اک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

کیا کیا شکن دئے ہیں دل زار کو مگر　　اس کے خیال میں ورق انتخاب تھا
عاشق ہوئے ہیں آپ کبھی گو اسی پہ ہوں　　شب حال غیر مجھ سے زیادہ خراب تھا
بے پردہ غیر سے نہ ہوا ہوگا شب کہ صبح　　آنکھوں میں شرم تھی نہ نظر میں حجاب تھا
وقت وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے　　یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا
ہوں کیوں نہ محو حیرت نیرنگہائے عشق　　جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آب تھا
کیا جی لگا ہے تذکرۂ یار میں عبث　　ناصح سے مجھکو آج تلک اجتناب تھا
روز جزا خضابت جلاد کو ملا　　گویا کہ خون ناحق مومن ثواب تھا

مجھکو تیرے عتاب نے مارا　　یا مرے اضطراب نے مارا
کیسے مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں　　مجھے فکر جواب نے مارا
مومن از بس ہیں بے شمار گناہ　　غم روز حساب نے مارا

دیکھ لو شوق ناتمام مرا　　غیر سے جا کہے ہے پیام مرا
ہو کے یوسف جو دل چراتے ہو　　کون ہو جائے گا غلام مرا
زانوئے بت پہ جان دی دیکھا　　مومن انجام و اختتام مرا
(ق)
بندگی کام آ رہی آخر　　میں نہ کہتا تھا کیوں سلام مرا

ناز بیجا سے سوا شرم کے حاصل نہ ہوا　　غیر پر ظلم کئے میرے مقابل نہ ہوا
کیا گلہ ہوتے اگر اور دل پہ رحم آجاتا　　شکر صد شکر کہ میرا سا ترا دل نہ ہوا
خوں چھپانے کو مری لاش سے کہتا ہے وہ شوخ　　مجھکو یہ غم ہے کہ میں کیوں ترا قاتل نہ ہوا
. . . .　　. . . . .

روز جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا　　میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا
پھرنے سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سو رہے　　آرام شکوۂ ستم اضطراب تھا

جواب خون ناحق میرا ایسا کیا دیا تو نے
کہ ظالم رہ گئے منہ دیکھتے سب احباب اپنا سا

اگرچہ شعر مومن بھی نہا خوب کہتا ہے
کہاں ہے لیک معنی بند مضموں یاب اپنا سا

بدکام کا مآل برا ہے جزا کے دن
حال سپہر تفرقہ انداز دیکھنا

....

کیا مرتے دم کے لطف میں پنہاں ستم نہ تھا
وہ دیکھتے تھے سانس کو اور مجھ میں دم نہ تھا

بیخود تھے غش تھے محو تھے دنیا کا غم نہ تھا
جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

دربان کو آنے دیجئے پہ میرے نہ کیجئے قتل
ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

صبح سے تعریف ہے صبر و سکون غیر کی
کس نے شب مجھکو تڑپتے بیش در دکھلا دیا

موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر
جو نہ دیکھا تھا تماشا عمر بھر دکھلا دیا

دیکھیں گے مومن یہ ہم ایمان بالغیب آپ کا
اس بت پردہ نشین نے جلوہ گر دکھلا دیا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

اڑتے ہی رنگ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں
اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا ساز گار طالع ناساز دیکھنا

....

میری نگاہ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بے طاقتی پہ سرزنش ناز دیکھنا

ترک صنم بھی کم نہیں سوز جحیم سے
مومن غم مآل کا آغاز دیکھنا

پندگو حال زلیخا یاد کر کچھ خیر ہے
کام دل جسکو ملا یاں بعد رسوائی ملا

جستجو سے وصل دلبر کی تمنا کس لئے
کیا دل گم گشتہ اے ہنگامہ آرائی ملا

کہ رہا ہو کون کس سے بے شکیبائی ملا
مجھ کو قسمت سے نصیحت گر بھی سودائی ملا

واعظ بتوں کو خلد میں لیجائینگے کہیں
ہے وعدہ کافروں سے عذاب الیم کا

واعظ کبھی ملا نہیں کوئے صنم سے میں
کیا جانوں کیا ہے مرتبہ عرش عظیم کا

جوں نکہت گل جنبش ہے دم کا نکل جانا
اے باد صبا میری کروٹ تو بدل جانا

عشق ان کی بلا جانے عاشق ہوں تو پہچانیں
لو مجھکو اطبا نے سودے کا خلل جانا

کیا ایسے سے دعویٰ ہو محشر میں کہ میں سنتے تو
نظارۂ قاتل کو احسان اجل جانا

دم لینے کی طاقت ہے بیمار محبت ہے
اتنا بھی غنیمت ہے مومن کا سنبھل جانا

محو جفا کشی الطاف کب ہوا
رحم اس کو میرے حال پر آیا غضب ہوا

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

بجلی گری فغاں سے مری آسماں پر
جو حادثہ کبھی نہ ہوا تھا سو اب ہوا

ربط بتان دشمن دیں اتہام ہے
ایسا گناہ حضرت مومن سے کب ہوا

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

ڈبو دیا اشک ندامت نے گناہوں کو مرے
تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہو گیا

ہچکی شکر نوید وصل شادی مرگ میں
لب تلک یہ زمزمہ آیا کہ شیون ہو گیا

زخم دل بھی مرہم زخم کہن ہو چارہ گر
بند تیر یار سے سینے کا روزن ہو گیا

مومن دیندار نے کی بت پرستی اختیار
ایک شیخ وقت تھا سو بھی برہمن ہو گیا

قابو میں نہیں ہے دل کم حوصلہ اپنا — اس جور پہ جب کرتے ہیں تجھ سے گلہ اپنا

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

تھے دشت میں ہمراہ مرے آبلۂ چند — سو آپ ہی پامال کیا قافلہ اپنا
اس حال کو پہنچے ترے غصے سے کہ اب ہم — راضی ہیں گر اعدا بھی کریں فیصلہ اپنا
انصاف کے خواہاں ہیں نہیں طالب زر ہم — تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

راز نہاں زبان اغیار تک نہ پہنچا — کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا
اللہ ری ناتوانی جب شدت قلق میں — بالیں سے سر اٹھایا دیوار تک نہ پہنچا
روتے تو رحم آتا سو اس کے روبرو تو — اک قطرہ اشک چشم خونبار تک نہ پہنچا
مفت اول سخن میں عاشق نے جان دی — قاصد ترا بیان اقرار تک نہ پہنچا
مومن اسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو — جو پست فہم میرے اشعار تک نہ پہنچا

ہمسری اس زلف سے اب یہ ہی ایسا ہو گیا
لو مرے بخت سیہ کو اور سودا ہو گیا

روز محشر کیا ہوا پھر کیوں شب دیجور ہے
کیا ہمارا نامۂ اعمال کچھ وا ہو گیا

بے وفائی ہے سرشت اس کی سو ہم میں وہ کہاں
ہم مزاجی کے سبب سے غیر اپنا ہو گیا

جوش عشق و حسن نے کیا رنگ بدلے دیکھنا
اشک خونیں سے مرے منہ زرد اس کا ہو گیا

سینہ زن یا جامہ در ہوتا ہے بن ماتم کوئی
آپ اپنے ہاتھ سے میں ہائے رسوا ہو گیا

یہ کسی سے ہو کہ ان لطفوں پہ گستاخی نہ ہو

غیر ہم سا کب ہوا ہر چند ہم سا ہو گیا

شربت مرگ آب حسرت شور بختی زہر غم
تلخکامی سے مجھے کیا کیا گوارا ہو گیا

نو فلک ہیں کیا کرے یہ نالۂ آتش فشاں
ایک دشمن سر سے کھویا اور پیدا ہو گیا

کیا رشک غیر تھا کہ تحمل نہ ہو سکا — میں جان کر حریف تغافل نہ ہو سکا
ہوتا ہے آہ صبح سے داغ اور شعلہ زن — کیسا چراغ تھا یہ کبھی گل نہ ہو سکا
ہجر بتاں میں تجھکو ہے مومن تلاش زہر — غم پر حرام خوار توکل نہ ہو سکا

شوخ کہتا ہے بے حیا جانا — دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا
شعلۂ دل کو ناز تابش ہے — اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا
شوق نے دور باش اعدا کو — اس کی محفل میں مر جیا جانا
اس کے اٹھتے ہی ہم جہاں سے اٹھے — کیا قیامت ہے دل کا آجانا
پوچھنا حال یار ہے منظور — سینے ناصح کا مدعا جانا

. . . .

شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا — تو نے مومن بتوں کو کیا جانا

اس وسعت کلام سے جی تنگ آگیا — ناصح تو میری جان لے دل گیا گیا

. . . .

کچھ آنکھ بند ہوتے ہی آنکھیں سی کھل گئیں — جی اک بلائے جان تھا اچھا ہوا گیا
آنکھیں جو ڈھونڈھتی تھیں نگہ ہائے التفات — گم ہونا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا
آہ سحر ہماری فلک سے پھری نہ ہو — کیسی ہوا چلی یہ کہ جی سنسنا گیا

آتی نہیں بلائے شب غم نگاہ میں — کس مہروش کا جلوہ نظر میں سما گیا

وہ ہنسے سن کے نالۂ بلبل کا — مجھے رونا ہے خندۂ گل کا
دھیان ہے غیر کے تحمل کا — ہوش دیکھا ترے تغافل کا

. . . .

جلوہ دکھلائے تا وہ پردہ نشین — میں نے دعویٰ کیا تحمل کا

اشک دارو نہ اثر باعث صد جوش ہوا
ہچکیوں سے میں یہ سمجھا کہ فراموش

جلوہ افزائی رخ کے لئے مے نوش ہوا
میں کبھی آپ میں آیا تو وہ بیہوش ہوا

مجھ پہ شمشیر نگہ خود بخود آ پڑتی ہے
عاجز احوال زبوں سے وہ ستم کوش ہوا

رہ ہے خالی تو یہ خالی یہ بھرے تو وہ بھرے
کاسۂ عمر عدو حلقۂ آغوش ہوا

آفریں دل میں رہی خنجر دشمن کے سبب
اپنے قاتل سے خفا تھا کہ میں خاموش ہوا

تو نے جو قہر خدا یاد دلایا مومن
شکوۂ جور بتاں دل سے فراموش ہوا

برق آہ کو جو میں نے کہا مسکرا دیا — دل گرمیوں نے اس کی کلیجا جلا دیا
فرماتے ہیں وصال ہے انجام کار عشق — کیا ناصح شفیق نے مژدہ سنا دیا
دیکھا نہ میرے نالۂ آہن گداز نے — آئینہ دیکھنے کا تماشا دکھا دیا

[illegible] فغاں کی ہائے رقیب [illegible] — محشر نے خفتگاں زماں کو جگا دیا
ہمدم دکھا اب اسکو کسی ڈھب کہ جرم آہ — ناصح کو میرے حال زبوں نے رلا دیا
دیسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہو سب کا سر — مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

صبر کر صبر ہو چکا جو کچھ — اے دل بیقرار ہونا تھا
وہ نمک پاش بھی نہیں ہوتے — یوں ہی دل کو فگار رہنا تھا
رات دن بادہ و صنم مومن — کچھ تو پرہیزگار رہنا تھا

بیکاری امید سے فرصت ہے رات دن — وہ کاروبار حسرت و حرماں نہیں رہا
کرتے ہیں اپنے زخم جگر کو رفو ہم آپ — کچھ بھی خیال جنبش مژگاں نہیں رہا
ناکامیوں کا گاہ گاہ شکر ہے — شوق وصال و اندوہ ہجراں نہیں رہا

کیا رام نہ کرو گے اگر ابرام نہ ہوگا — الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا
ناکامی امید پہ صبر آئے تو کیا آئے — ہر بات میں کہتے ہو کہ یہ کام نہ ہوگا
ہاں اے ہوس طپش چھیڑ چل جائے کہ پر تو — بھڑ جائیں گے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا
کم ظرفی اغیار پہ ساقی کو نظر ہے — افسوس ہے آلودہ لب جام نہ ہوگا
خو ہو گئی ہجراں میں تڑپنے کی شب وصل — گو چین ہو دل کو مجھے آرام نہ ہوگا
وہ عشق رہی اور نہ وہ شوق ہے مومن — کیا شعر کہیں گے اگر الہام نہ ہوگا

اثر اسکو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
بیوفا کہنے کی شکایت ہے — تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
اس نے کیا جانے کیا کیا ہوتا — دل کسی کام کا نہیں ہوتا
آہ طول امل ہے روز افزوں — گرچہ اک مدعا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
حال دل یار کو لکھوں کیونکر — ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو — دست عاشق رسا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمھارے سوا نہیں ہوتا
کیوں سنے عرض مضطرب مومن — صنم آخر خدا نہیں ہوتا

گر یہی بیخودی ہے صہبا میں — کون مشتاق سلسبیل ہوا
آسماں راہ پر نہیں آتا — دعوئ خضر بے دلیل ہوا
آپ کی کونسی بڑھی عزت — میں اگر بزم میں ذلیل ہوا
اثر حسن و عشق تھا بے مثل — میں ترا تو مرا عدیل ہوا
آتش آہ بے اثر سے مری — آسماں گلشن خلیل ہوا
کوتہی کی جواب میں جوں جوں — اور بھی خط مرا طویل ہوا
ہائے مومن شہادت بے اجر — مہر وصل صنم قتیل ہوا

کیا ہوا ہوا اگر وہ بدگماں اپنا — بے گنہ سزا پائی اب وہ دل کہاں اپنا
خار و خس میں گلشن کے بو کہ گل جو آئی تھی — رشک سے کیا برباد آپ آشیاں اپنا
روز کا بگاڑ آخر جان پر بنا دیگا — انکو شوق آرائش دل ہے بدگماں اپنا
بعد مدت اُن کو یوں پھری بتنگ آ کر — جا بجا پھرتے ہیں پوچھتے مکاں اپنا
دشنہ چھین لیگا کیا ہمنشیں شب فرقت — آپ جب نہیں اپنے کون ہے میری جاں اپنا
صبر بعد آسائش اس قلق پہ مشکل تھا — عیش جاوداں نکلا رنج جاوداں اپنا
عشق بتاں میں خود اب تو در خور پرستش ہیں — نام ہو گیا اتنا گم کیا نشاں اپنا
دل کی بیقراری سے ہر تپش نہ میں فرسا — مہر خرمن گردوں شعلہ ہر فغاں اپنا

دیکھئے بس مرد ن حال جسم و جاں کیا ہو
مدعی زمیں اپنی دشمن آسماں اپنا

دیر و کعبہ یکساں ہے عاشقوں کو اے مومن
ہو رہو وہیں کے ہم جی لگا جہاں اپنا

بنی تھی دوزخ بلا سے بنتی عذاب ہجر صنم نہ ہوتا

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا
مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا

ایک ایک ادا سو سو دیتی ہے پیام اسکے
کیونکر لب قاصد سے پیغام ادا ہوتا

جنت کی ہوس زاہد بیجا ہے کہ عاشق ہو
ہاں سیر میں جی لگتا گر دل نہ لگا ہوتا

اس تلخی حسرت پر کیا چاشنی الفت
کب ہمکو فلک دیتا گر غم میں مزا ہوتا

ہے بیخودی دائم کیا شکوہ تغافل کا
جب میں تھا اپنا وہ کیونکر مرا ہوتا

اس بخت پہ کوشش سے تھکنے کے سوا حاصل
گر چارۂ غم کرتا رنج اور سوا ہوتا

دیوانے کے ہاتھ آیا کب بند قبا اسکا
ناخن جو نہ بڑھ جاتے تو عقدہ یہ وا ہوتا

ہم بندگیٔ بت سے ہوتے نہ کبھی کافر
ہر جا اگر اے مومن موجود خدا ہوتا

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکر ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

پڑا ہے مرنا بس اب تو ہم کو جو اس نے خط پڑھ کے نامہ بر سے
کہا کہ گر سچ یہ حال ہوتا تو دفتر اتنا رقم نہ ہوتا

جہان تنگ و ہجوم وحشت غرض کہ دم پر بری بنی تھی
کہاں میں جاتا کہ جی ٹھہرتا کہیں جو دشت عدم نہ ہوتا

جو آپ مدے سے اٹھا نہ دیتے کہیں نہ کرتا میں جبہ سائی
اگرچہ یہ سرنوشت میں تھا تمھاری سر کی قسم نہ ہوتا

پردے میں ہے رشک ماہ میرا
کیونکر نہ ہو دن سیاہ میرا

اس سد سکندری کو توڑ دو
آئینہ ہے سنگ راہ میرا

میں کشتہ شہید بے دیت ہوں
ہے شوق ستم گواہ میرا

مرنا نہیں اختیار کی بات
خود جرم ہے عذرخواہ میرا

اس در پہ جو میں غبار ہوتا
سرگرم شعلہ بار ہوتا

اس زود گسل سے خود بگڑتے
گر عمر کا اعتبار ہوتا

دن پھرتے اگر کبھی مرے بھی
کیا گردش روزگار ہوتا

اے پند شعار ہوش میں آ
کوئی بھی ہے آپ خوار ہوتا

ہم کاہیکو دل کو جانے دیتے
اپنا اگر اختیار ہوتا

ویراں ہے خانہ جلوۂ حیرت طراز کا
آئینہ دیکھتا ہے منہ آئینہ ساز کا

تھے ہمیں مومن کی خودداری پر کیا کیا اعتماد
کیا خبر تھی یہ کہ یوں محو بتاں ہو جائیگا

قتل عدو میں عذر نزاکت گراں ہے اب
مجھ میں ستم اٹھانے کی طاقت کہاں ہے اب

سجدے پہ سر قلم ہو دعا پر زباں کٹے
گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب

ہوا مسلماں میں اور ڈر سے نہ درس واعظ کے سنکے مومن

کہدیں رقیب نے تری بے التفاتیاں

ناصح ہمارے حال پہ کچھ مہرباں ہے اب
چشم غضب سے مشورۂ قتل کھل گیا
جو بات دل میں تھی سو نظر سے عیاں ہے اب
رکھے ہے سر اپنے زانوئے نازک پہ شوق کر
تیرا مریض عشق بہت ناتواں ہے اب
وہ دن گئے کہ لاف و گزاف جہاد تھا
مومن ہلاک خنجر ناز بتاں ہے اب

سودا تھا بلائے جوش پہ رات　　بستر پہ بچھائے نیشتر رات
تارے آنکھیں جھپک رہے تھے　　تھا بام پہ کون جلوہ گر رات
اس لیل و نہار غم نے مارا　　ہے روز سیہ سیاہ تر رات

کرتے ہیں عدو وصل میں حرماں کی شکایت
تھی بارے موثر غم ہجراں کی شکایت
کس واسطے اے شمع زباں کاٹتے ہیں لوگ
کیا تو نے بھی کی تھی شب ہجراں کی شکایت
حوران بہشتی کو بتوں کا سا نہ پایا
مومن مجھے کیونکر نہ ہوا ایماں کی شکایت

ہے یہ بندہ ہی بیوفا صاحب　　غیر اور تم بھلے بھلا صاحب
کیوں الجھتے ہو جنبش لب سے　　خیر ہے میں نے کیا کہا صاحب
ستم آزار ظلم جور و جفا　　جو کیا سو بھلا کیا صاحب
کچھ بگڑتے تھے کچھ غصہ تھا　　رات تم کس پہ تھے خفا صاحب
کسکو دیتے تھے گالیاں لاکھوں　　کسکا شب ذکر خیر تھا صاحب
نام عشق بتاں نہ لو مومن　　کیجئے بس خدا خدا صاحب

محروم ہوا مومن ناکام محبت　　اے اہل محبت یہ ہے انجام محبت

اظہار شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث　　یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث
میں ایک سخت جان ہوں گزرو دل سے چھوڑ لو　　تم کو خیال ہے مرے آزار کا عبث
امید وعدہ بھی تو نہیں روز ہجر میں　　ہم سے وفائے زندگی بیوفا عبث
اس ضعف میں تو سینے سے آتا ہے لب تلک　　کہتے ہیں اپنے نالے کو ہم نارسا عبث
جس غم میں مر رہے تھے وہ غم ہی نہیں رہا　　افسوس مر کے سمجھے کہ جینا ہوا عبث
اے روز حشر کچھ شب ہجراں بھی کم نہیں　　بدنام ہو جہان میں تیری بلا عبث
ہرگز نہ رام وہ صنم سنگدل ہوا　　مومن ہزار حیف کہ ایماں گیا عبث

....

واں طعنہ تیر بار یہاں شکوہ زخم ریز　　باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب
مر جاتے کیوں نہ صبح کے ہوتے ہی ہجر میں　　تکلیف کیسی کیسی اٹھائی تمام شب
مومن میں اپنے نالوں کے صدقے کہ کہتے ہیں　　اسکو بھی آج نیند نہ آئی تمام شب

واں تو ہے زرد پوشش یہاں میں ہوں زرد رنگ
واں تیرے گھر بسنت ہے یاں میرے گھر بسنت

ہو نہ بیتاب ادا تمھاری آج　　ناز کرتی ہے بیقراری آج
نزع ہے اور روز وعدۂ وصل　　ہے بہر طور دم شماری آج

مومن اُس بت کو دیکھ آہ بھری   کیا ہوا لاف دینداری آج

ہم تو بچتے نہیں تا شام وہ آئے بھی تو کیا   اے دعائے سحری منت تاثیر نہ کھینچ
اتنی فرصت دے ستمگر کہ پہنچ جائے اجل   دم کے دم اور بھی سینہ سے مرے تیر نہ کھینچ
روز غم کون بھلا ان کے ہوتا ہے شریک   انتظار اے اثر نالۂ شبگیر نہ کھینچ
مومن آ کیش محبت میں کہ سب جائز ہے   حسرت حرمت صہبا و مزامیر نہ کھینچ

ہوتے ہیں پائمال گل اے باد نوبہار   کس سے اڑائی تو نے یہ رفتار کی طرح
محو رخ رشک غیر کی بھی ہکلو ہو گئی   اب اور کچھ نکالئے آزار کی طرح
دل میں ہوائے بتکدہ ظاہر میں کیا حصول   رہنا حرم میں مومن مکار کی طرح

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح   اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح
مرجائیں کہیں کہ تو غم ہجر آپ چھوٹ جائے   کہتے تو ہیں بھلے کی ولیکن بری طرح
نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں   کمبخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح
پامال ہم نہ ہوتے فقط جور چرخ سے   آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح
بے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین آئے   کیا کیجئے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح
معشوق اور بھی ہیں بتا دے جہان میں   کرتا ہے کون ظلم کسی پر تری طرح
ہوں جاں بلب بتان ستمگر کے ہاتھ سے   کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

عدو نے دیکھے کہاں اشک چشم گریاں سرخ   نہ آستین ہے نہ رومال ہے نہ داماں سرخ

ہم دام محبت سے ادھر چھوٹے ادھر بند   پرواز بھی کی آہ تو جوں طائر پر بند
یہ مشت پر سوختہ پھونکیں گے قفس کو   تو ساتھ کسی کے مجھے صیاد نہ کر بند

شاید کہیں تو نے بھی اسے خواب میں دیکھا   آنکھیں تری اے بخت ہیں کیوں آٹھ پہر بند
کیا حضرت مومن کہیں کعبہ کو سدھارے   سنسان ہے گھر کس لئے کیوں آج ہے در بند

غربت میں گل کھلائے ہے کیا کیا وطن کی یاد
جیسے قفس میں مرغ چمن کو چمن کی یاد
تا شکوہ غیر کا نہ کروں مجھ سے کہتے ہیں
کیوں سرگزشت تم کو بھی ہے کوہکن کی یاد
ایسے ہی روز گر ستم نو بنو رہے
تم کو بھلا رہیگی سپہر کہن کی یاد

یاں تلک تو ہوں سیہ کار کوئی پڑھ نہ سکا
حشر میں جب مرے اعمال کا کھولا کاغذ
قبر میں چھوٹے عذاب دل بیتاب سے ہم
نام جب لکھ کے ترا سینے پہ رکھا کاغذ
تو غزل سنج ہے یا مرثیہ خواں اے مومن
رو دیا جس نے کہ دیکھا ترا لکھا کاغذ

نہ کیونکر میں موا جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر
وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر
نوید اے دل کہ رشک غیر سے چھوٹے اُسے چھٹنے
ستم کا کر دیا خوگر جفا و جور سہ سہہ کر
لگی ہچکی ہے سرزانوے غم پر ہے کہ یاد آیا
کسی کا ہاتھ ہر دم مارنا زانو پہ تھم تھم کر

خدا کو بان اپنی راہ لے کعبے کو جا مومن
صنم خانے میں کیا یوں گا اے گم گشتہ رہ ہوکر

جل گیا جی لاش کو مومن کی جلتا دیکھکر

جراح کیا سوچا بتا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا
کیوں کھول لی پٹی مرے زخم جگر سے باندھ کر
شوق وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر
سو جا نہ کچھ مجھے شب مہتاب دیکھ کر
توبہ کہاں کدورت باطن کا ہوش تھا
غش ہوگیا میں رنگ مے ناب دیکھ کر
ہے ہے تمیز عشق و ہوس آج تک نہیں
وہ چھپتے پھرتے ہیں مجھے بیتاب دیکھ کر
مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو
کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر

امتیاز دلبری و دلبری میں فرق ہے   تم کو بھاتی ہو خزاں اور ہم کو بھاتی ہو بہار

دشمنی دیکھو کہ تا الفت نہ آ جائے کہیں   لے لیا منہ پر دوپٹہ حال میرا دیکھکر
سب تمہارے نہاں نظروں میں تھے ناصح نہ پوچھ
کیا کہوں میں غش ہوا کیا سوچ کر کیا دیکھکر
(ق)
جو نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا
کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشین کا دیکھکر
کر دیا خاک آپ کو اس بت کے در پر ہائے ہائے

چل پایا فلک نے کیا ستا کر   خاک آہ نے کر دیا جلا کر
مدت میں ہوئی دعا کی تاثیر   اس بت سے ملے خدا خدا کر
کچھ کام نہیں کسی سے ہم کو   کیا چھوٹ گئے ہیں دل پھنسا کر
غیروں سے ملے گا بعد میرے   اے عمر اسے بھی بیوفا کر
گھر آنکھوں میں کر گیا وہ بیدید   دل چھین لیا نظر ملا کر

عاشق تو جانتے ہیں وہ اے دل یہی سہی   ہر چند بے اثر ہے یہ آہ و فغاں نچھوڑ
زخمی کیا عدو کو تو مرنا محال ہے   قربان جاؤں تیرے مجھے نیم جاں نچھوڑ
جس کوچہ میں گزر صبا کا نہ ہو سکے   اے عندلیب اسکے لئے گلستاں نچھوڑ

ہجراں کا شکوہ لب تلک آیا نہیں ہنوز
لطف وصال غیر نے پایا نہیں ہنوز
باغ جہاں میں گو مہ خورداد آگیا
یاں ہے اسی بہار پہ فصل خزاں ہنوز
ناصح قریب ہے بد آموز تر کہیں
پر میں نے تیرا حال سنایا نہیں ہنوز
یک چند اور کاہش غم چشم التفات
میں یار کی نظر میں سمایا نہیں ہنوز
مومن تو مدتوں سے ہوئے پر بقول درد
دل سے نہیں گیا ہے خیال بتاں ہنوز

چاک سراپردہ سے جھانکے تھے وہ ایک دن
سجدۂ محراب در شغل جبیں ہے ہنوز

لیکے دل و عقل و دیں پھر پئے غارت ہے عشق
اے اجل آ چک کہیں جان حزیں ہے ہنوز

وصل بتاں کی دعا کرتے ہو شکر خدا
حضرت مومن تمھیں دعویٔ دیں ہے ہنوز

ڈوبا جو کوئی آہ کنارے پہ آ گیا — طغیان بحر عشق ہے ساحل کے آس پاس
کیا دعویٰ آہ جب نہ رہا میں ہی کس لئے — ہیں جمع اقربا مرے قاتل کے آس پاس
کافر ہے کون ہم میں سے مومن پھرے ہے تو — کعبے کے آس پاس تو میں دل کے آس پاس

میرے مرنے سے بھی وہ خوش نہ ہوا — جی گیا یونہی رائگاں افسوس
شکوہ آزار غیر کا جو کروں — ہنس کے کہتا ہے وہ کہ ہاں افسوس
تھا عجب کوئی آدمی مومن — مر گیا کیا ہی نوجواں افسوس

خبر لو مری تم کہاں تک رہے — یہ حالت کہ غش پر چلا آئے غش

ہر غنچہ رو سے عشق کا اظہار ہے غلط — اس بحث صحیح کی تکرار ہے غلط
کرتے ہیں مجھ سے دعویٔ الفت وہ کیا کریں — کیونکر کہیں مقولۂ اغیار ہے غلط
کرتے ہو مجھ سے راز کی باتیں تم اس طرح — گویا کہ قول محرم اسرار ہے غلط

میں تو دیوانہ ہوں مومن کا کہ ہے اُس شخص کو
اس قدر وحشی مزاجی پر بھی اک عالم سے ربط

آتا ہے بیکسوں پہ تو جلاد کو بھی رحم — روتی ہے شمع آپ سر کشتگان شمع
ہے تار گریہ تار نفس اہل سوز کو — یعنی روان شمع ہے اشک روان شمع
سب گرمیٔ نفس کی ہیں اعضا گدازیاں — دیکھو نہ زندگی ہے سراپا زیان شمع

محفل فروز تھی تب و تاب نہان شمع — پروانہ جل گیا کہ نہیں رازدان شمع
لائیں نہ تاب حرف بتاں کافران عشق — پروانے کو جحیم ہے مومن زبان شمع

ہے شام انتظار تماشائے سوختن — جلتے ہیں تا بہ صبح ادھر ہم اُدھر چراغ

کیا دکھ نہ دیکھے عشق میں کیا کیا نہ پائے داغ
زخموں پہ زخم جھیلتے ہیں داغوں پہ کھائے داغ
کیا کہئے گرمیاں دل بیتاب کی کہ ہے
سینے میں ایک شعلۂ جوالہ جائے داغ

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف
دیکھے ہے مجھکو دیکھ کے اغیار کی طرف
ظالم فراق خواب عدم کا ہے انتظار
آنکھیں لگی ہیں دولت بیدار کی طرف

شب ہجر روز وصال کی تری شوخیاں جو نظر میں تھیں
کہوں کیا تغیر حال دل کبھی تھا سکوں کبھی تھا قلق
کہا جاں بلب ہوں جو آئے مری زندگی ہو تو یوں کہا
ترے جینے کی مجھے کیا خوشی ترے مرنے کا مجھے کیا قلق

قہر ہے موت ہے قضا ہے عشق — سچ تو یہ ہے بری بلا ہے عشق
وصل میں احتمال شادی مرگ — چارہ گر درد لادوا ہے عشق
اثر غم ذرا بتا دینا — وہ بہت پوچھتے ہیں کیا ہے عشق
آپ مجھ سے نباہیں گے سچ ہے — باوفا حسن و بے وفا ہے عشق
سوجھے کیونکر فریب دلداری — دشمن آشنا نما ہے عشق
قیس و فرہاد و وامق و مومن — مر گئے سب ہی کیا بلا ہے عشق

وصل جاناں کہاں سوائے خیال — ہم ہیں مایوس امیدوار ہے دل
بے روا درد ہو فسادہ شوخ — بے اثر آہ و بیقرار ہے دل

کیا کروں کیونکر رکوں ناصح رکا جاتا ہے دل
پیش کیا چلتی ہے اُس سے جسپر آجاتا ہے دل
حیرت دیدار بس آئینہ رکھدے ہاتھ سے
اپنی حالت دیکھ کر ظالم کٹا جاتا ہے دل
چاہتا ہوں میں تو مسجد میں رہوں مومن ولے
کیا کروں بت خانے کی جانب کھنچا جاتا ہے دل

امتحان کے لئے جفا کب تک — التفات ستم نما کب تک
غیر سے بیوفا پہ تم تو کہو — ہے ارادہ نباہ کا کب تک
جرم معلوم ہے زلیخا کا — طعنۂ دست نارسا کب تک
ہوش میں آ، مجھ میں جاں نہیں — غفلت جرأت آزما کب تک
سے شب وصل غیر بھی کاٹی — تو مجھے آزمائیگا کب تک

تو چھوڑ مجھے چلا گیا دل — ہے اُس سے بھی زیادہ بیوفا دل
یہ دشمن جاں تمہیں مبارک — یعنی نہیں میرے کام کا دل
دیتا ہوں دم ایسے فتنہ گر پر — انصاف سے دیکھنا مرا دل
اُس چشم نے کر دیا خراب آہ — تھا ورنہ بہت ہی پارسا دل

سننے سے گھبرا کے آخر جان لب پر آگئی
حال پہنچا یاں تلک اور تم نہ آئے یاں تلک

وفور اشک و طغیان فغاں ہے — کدھر جاؤں ادھر پانی اُدھر آگ
دھواں اٹھتا ہے دل سے وقت گریہ — بجھا دی تو نے کیا اے چشم تر آگ

شب رہے تجھ بن زبس بے چین و بے آرام ہم
صبح تک رو رو کئے لیکے تیرا نام ہم
گر ترے کوچے کو دی کعبے سے نسبت کیا گناہ
مومن آخر تھے کبھی اے دشمن اسلام ہم

داغ جنون و سنگ در یار ہو نصیب — کرتا ہے رات دن ہوس تاج و تخت دل
الماس ریزہ تھے مرے آنسو کہ ضبط سے — ہے پاش پاش سب جگر و لخت لخت دل

پاتے تھے چین کب غم دوری سے گھر میں ہم
راحت وطن کی یاد کریں کیا سفر میں ہم
اس طرح خاک چھانتے پھرتے نہ دشت دشت

مرد عشق ستیزہ کار ہے دل — ملک الموت سے دوچار ہے دل

ہوتے جو پائمال کسی رہگزر میں ہم

نہیں پلٹے اثر اپنا یہ غیرت کا اثر دیکھا
کہا کرتے تھے بیتابی کو بے تاثیر اکثر ہم

ہوئے تم کیوں خفا تاثیر سے آہ رسا کے اب
کیا کہتے تھے یہ تو پہلے بھی تقصیر اکثر ہم

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

صاحب نے کس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم
تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم

اگر نہ ہنستا ہنسانا کسی کا بھا جاتا
تو بات بات پہ یوں رو دیا نہ کرتے ہم

شامت ہو جرم شکوہ نہ ظاہر گناہ رشک
حیراں ہیں آپ اپنی پشیمانیوں میں ہم

مارے خوشی کے مر گئے صبح شب فراق
کتنے سبک ہوئے ہیں گراں جانیوں میں ہم

پیش نظر ہے کس کا رخ آئینہ گداز
روتے ہیں اپنے حال پہ حیرانیوں میں ہم

جنجر تو نہ توڑ سخت جانی　　پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم
تو بخت، عدو، اجل، فلک، دل　　کس کس کے ستم اٹھائیں گے ہم
ٹھہرو کوئی دم کہ جان ٹھہرے　　مت جاؤ کہ جی سے جائینگے ہم
بتخانۂ چیں ہو گو ترا گھر　　مومن ہیں تو پھر نہ آئینگے ہم

شام سے اپنے سو رہو وہ اور ہم ان کے کوچہ میں
ولولہ ہائے شوق سے کیا کیا پھرتے ہیں گھبرائے ہیں
کیا کسی بت کے دل میں جگہ کی کوئی ٹھکانا اور ملا
حضرت مومن اب تمہیں کچھ ہم مسجد میں کم پاتے ہیں

عشق نے یہ کیا خراب ہمیں　　کہ ہے اپنے سے اجتناب ہمیں
غیر کے واسطے نہ ہو بیتاب　　طعنہ دیتا ہے اضطراب ہمیں
کس کی زلفوں میں بوئے نسیم میں تھی　　ہے بلا آج پیچ و تاب ہمیں
وہ جفاکش ہیں اے فلک کہ کیا　　اس ستمگر نے انتخاب ہمیں
اب کوئی کیا کرے علاج افسوس　　موت نے بھی دیا جواب ہمیں
اے تپ ہجر دیکھ مومن ہیں　　ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں

لذت جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا　　طعنے کیا کیا اُسے ارباب ستم دیتے ہیں

دم نہ لے آسے اثر آہ کہ معلوم ہوا　　جن پہ دم دیتے ہیں ہم وہ ہمیں دم دیتے ہیں　　چین آتا ہی نہیں تیرے بن جس پہلو ہمیں　　ہوش کیوں جلتے رہے اور دم ہوا کیوں نہ چلا

اہل بازار محبت کا بھی کیا سودا ہے　　عشرت عمر ابد قیمت غم دیتے ہیں　　اضطراب دل غرض جینے نہ دیگا تو ہمیں　　مجھسے اے باد صبا آئی یہ کس کی بو ہمیں

گر یہی شوق شہادت ہے تو مومن جی چکے　　مار ڈالے کاش کوئی کافر لجو ہمیں

ناصح ناداں یہ دانائی نہیں　　دل کو سمجھاؤں میں سودائی نہیں

کس توقع پر امید وصل اب　　طاقت صبر و شکیبائی نہیں　　ٹکٹکی لگائی ہے اب تو گو ہو رسوائی　　تا وہ گر ادھر دیکھیں مجھکو دیکھتا دیکھیں

کس نے اور کو دیکھا کس کی آنکھ جھپکی ہے　　دیکھنا ادھر آؤ پھر نظر ملا دیکھیں

کہے ہے چھیڑنے کو میرے گر سب ہوں مرے بس میں

نہ ملنے دوں کسی معشوق اور عاشق کو آپس میں　　بزم میں اس کی بیان درد غم کیونکر کریں

نہ میں اپنا نہ دل اپنا نہ تم میرے نہ جاں میری　　وہ خفا جس بات سے ہو وہ وہ ہم کیونکر کریں

اثر کس کس کو ہو ہو دے ہی گر فریاد بیکس میں　　مجھپہ بعد امتحاں بھی جور کم کیونکر کریں

در بت خانۂ عشق بتاں اور آپ اے مومن　　وہ ستائیں غیر کو ایسا ستم کیونکر کریں

یہ حضرت آگئی اک بار کیا طبع مقدس میں　　سب کو ہوتا ہے جہاں میں پاس اپنے نام کا

ہم بھی تو مومن ہیں دل نذر صنم کیونکر کریں

دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں

یا کہیں عاشق ہوے یا ہو گیا سودا ہمیں　　ہے جلوہ ریز نور نظر گرد راہ میں　　آنکھیں ہیں کس کی فرش تری جلوہ گاہ میں

ہر ستم صیاد کا کیا التفات آمیز تھا　　کیا زہر کھاکے غیر نے دی تھی دعائے وصل　　ظالم کہاں وگرنہ اثر میری آہ میں

بند کرنے کو قفس میں دام سے چھوڑا ہمیں　　جانے دے چارہ گر شب ہجراں میں مت بلا　　وہ کیوں شریک ہو مری حال تباہ میں

کیا کہیں کیوں رہ گئے حیران تجھکو دیکھکر　　ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا　　جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

آگیا دل یاد آئے آئینہ رو اپنا ہمیں　　مومن کو بیچ ہے دولت دنیا و دیں نصیب　　شب بتکدے میں گزری ہے دن خانقاہ میں

دست بوسی پر کر دہاں قتل اپنے ہاتھ سے

سچ تو کہتے ہیں قبول انصاف غیر نکا ہمیں　　تا نہ ٹہرے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں

مومن اُنکا تو نہ تھا ملنے میں آخر اختیار　　ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

یہ شکایت بھی خدا سے ہے بتوں سے کیا ہمیں　　خسرو عیش وصل یار کوہکن اور جانکنی

اپنا جگر تو خوں ہوا عشق کے امتیاز میں — پوچھا ہے اُس نے کیا مری بیخودی و قلق کا حال

کیا سبھی سینے جل چکے کیا سبھی دل پگھل چکے — ہوش نہیں حواس میں تاب نہیں قرار میں

بوئے کباب اب نہیں آہ جگر گداز میں — مرگ ہے انتہائے عشق یہاں ہی ابتدائے عشق

زندگی اپنی ہوگئی رنجش بار بار میں

جیب درست لائق لطف و کرم نہیں — خاک اڑائی گل نے یہ کس کے جنون عشق میں

ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں — آئی ہے کچھ اڑی ہوئی باد صبا غبار میں

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں — دہیاں میں مومن آگئی بحث جبر و اختیار

اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں — قابوئے یار میں ہیں ہم وہ نہیں اختیار میں

فریاد نالہائے عزا بار بیرا نہیں

آیا ہے رحم کب کہ ذرا مجھ میں دم نہیں — مانے نہ ملنے منع تپشہائے دل کروں

بے التفاتیاں جو عدو سے سنی نہ تھیں — میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

ہم جانتے تھے وصل میں رنج و الم نہیں — ہو جاں بھی جلکے کچھ تو مداوائے دل کروں

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا — کب تک میں دل پہ ہاتھ دھرے ہائے دل کروں

مجھکو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

ہوں آب آب اُف ری نگہ ہائے گرم گرم — نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدعا کہنے کو ہیں — لب نہیں کھلتے میں اب کیا جانئے کیا کہنے کو ہیں

اُس مہر وش کے سامنے آنکھوں میں نم نہیں — دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ — کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہیں

نام وصال لینے سے ہوتا ہے مضطرب — شکوہ حرف تلخ کا یا شور رنجی کا گلہ — ہم جو کچھ کہنے کو ہیں سو بے مزا کہنے کو تھا

کیونکر کہوں اُسے مرے مرنے کا غم نہیں — میں گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سن غیروں کی بات — ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں — غیر سے سرگوشیاں کر لیجے پھر ہم بھی کچھ — آہ دہائے دل رشک آشنا کہنے کو ہیں

سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں — ترجمان التماس شوق ہے تغییر رنگ — جو زبان شمع عاشق بے صدا کہنے کو ہیں

ہوگئے نام بتاں سنتے ہی مومن بیقرار — ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

دن بھی دراز رات بھی کیوں ہو فراق یار میں

کاہے سے فرق آگیا گردش روزگار میں — وہ علی الرغم عدو مجھ پہ کرم کرتے ہیں

ہے ستم لطف کے پردے میں ستم کرتے ہیں
نیم بسمل ہیں نہ چھیڑ اے تپشِ دل کہ ابھی
روئے قاتل کا نظارہ کوئی دم کرتے ہیں
اے اجل کاش الٹ جائیں شبِ ہجراں میں
وہ دعائیں کہ تری جاں کو ہم کرتے ہیں
کشتۂ یار ہوں اس رشک سے مرتا ہے جہاں
وہ بھی کیا ہیں جو مری موت کا غم کرتے ہیں
آبرو رہ گئی مرنے کی کہ روتے ہیں وہ
اشک شادی ہی وہ چشم کو نم کرتے ہیں
جاکے کعبے میں بھی مومن نہ گئی دیر کی یاد
جائے لبیک صدا ہائے صنم کرتے ہیں

نیرنگ عشق سے نہو غافل ہے ایک رنگ
اس دل کے جاگنے میں زلیخا کے خواب میں

دکھلاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں — کہو گے پھر بھی کہ میں تجھسا بدگمان نہیں
ہجو یا صلح پہ ہے اب تو آسمان نہیں — وہ مہربان ہوا تو یہ مہربان نہیں
ترے فراق میں آرام ایک آن نہیں — یہ ہم سمجھ چکے گر تو نہیں تو جان نہیں
نہ چاہوں سوز جزا دو ستم دیکھو — کب آزماتے ہیں جب وقت امتحان نہیں
نہ کیوں نثار ہو جاں خط کی جان تان ہے — کہ اسکو میرے سوا اور کا دھیان نہیں
نکل کے دیر سے مسجد میں جا رہا ہوں مومن — خدا کا گھر تو ہے تیرا اگر مکان نہیں

ہجراں میں بھی زیست کیوں نہ چاہوں

جاں دادۂ شوخیِ بیوفا ہوں
کیا شکوہ جفائے آسماں کا
میں آپ کو دور کھینچتا ہوں
دشمن سے ہے چشم مہربانی
محروم نگاہ آشنا ہوں
خودبینی و بیخودی میں ہے فرق
میں تم سے زیادہ کم نما ہوں
مجھ رمز شناس سے یہ باتیں
کیا خوب میں غیر سے برا ہوں
اے کاش عدو کو غیرت آوے
میں منتظر اپنی موت کا ہوں
اس نام کے صدقے جس کے دولت
مومن رہوں اور بتوں کو چاہوں

ہر دم رہیں کشمکش دست یار میں — چلون کے بند کسکے گریباں کے تار ہیں
کیا کیجئے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں — جتنے رہے حجاب میں ہم شرمسار ہیں
شبنم خراب مہر دکتاں سینہ چاک ماہ — لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں
کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا — تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں
ناصح سے مجھکو کیونکہ نہوں بدگمانیاں — دشمن ہیں جو مرے تری دوستدار ہیں

آہ فلک فگن ترے غم سے کہاں نہیں — جو فتنہ خیز اب ہے زمیں آسماں نہیں
کہنا پڑا مجھے پئے الزام بند گو — وہ ماجرا جو لائق شرح و بیاں نہیں
ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

باتیں تری وہ ہوش ربا ہیں کہ کیا کہوں — جو کوئی راز داں ہے مرا راز داں نہیں
پیش عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا — قابو میں دل نہیں مرے بس میں زباں نہیں
کرتے وفا امید وفا پر تمام عمر — پر کیا کریں کہ اسکو سر امتحاں نہیں
اسکو بھی جانتا ہوں فریب وصال غیر — تم کو عبث یقیں ہے کہ میں بدگماں نہیں
میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں — تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں
اتنے سبک نظر میں ہیں اوضاع روزگار — دنیا کی حسرتیں مرے دل پر گراں نہیں
میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا — آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں — بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں
چرخ و زمیں میں توبہ کا ملتا نہیں سراغ — ہنگامۂ بہار و ہجوم سحاب میں
کھولا جو دفتر گلہ اپنا زیاں کیا — گزری شب وصال ستم کے حساب میں
اے حشر جلد کر تہ و بالا جہاں کو — یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں
مومن یہ علم اس صنم جاں فزا کا ہے — دل لگ گیا جہان سراسر خراب میں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں — سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
چین جبیں کو دیکھکے دل بستہ تر ہوا — کیسی کشود کار کشاد نقاب میں
رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام — آباد ایک گھر ہے جہان خراب میں
بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے — اب عذر کیا رہا نگہ بے حجاب میں
مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا — حسرت بھی اب نہیں دل ناکامیاب میں
دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش — وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں
کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں — بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں
ہے منتوں کا وقت شکایت رہی رہی — آئے تو ہیں منانے کو پر وہ عتاب میں
تیری جفا نہ ہو تو ہے سب شکوہ کا من — بدست غیر محو دل اور بخت خواب میں
بیہم سجود پائے صنم پر دم وداع — مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

بیم بیداد و ستم کچھ دل مضطر میں نہیں — یوں ہوں نالاں کہ وہ گویا صف محشر میں نہیں
مجھ سے میکش کی طرف محتسب آتا ہے تو آئے — ایک قطرہ بھی سبو و خم و ساغر میں نہیں
قطع امید سے سرکاشی کو کیا نسبت — مجھ میں وہ دم ہے ابھی جو تیرے خنجر میں نہیں
کیا موثر ہو دعا وصل صنم کی مومن — ہم طلب کرتے ہیں وہ شے جو مقدر میں نہیں

مجھکو کیا کام کہ آئینے کی حیرت دیکھوں
دیکھ تو آئینہ اور میں تری صورت دیکھوں

جن سے منظور وفا ہے، ہو جفا بھی اُن پر
مجھ سے کچھ کام نہیں ہے تو ستاتے کیوں ہو
توڑنا جان کا ہو جائے گا دشوار آخر
چارہ ساز و مری امید بندھاتے کیوں ہو
کھل گیا عشق صنم طرز سخن سے مومن
اب چھپاتے ہو عبث بات بناتے کیوں ہو

کیسے مجھ سے بگڑے تم اللہ اکبر رات کو
ذبح کرتے ہی جو ہوتا پاس خنجر رات کو
بزم دشمن میں نہ بیہودہ نغمہ گر آتی رہی
ہر فغاں کے ساتھ لب پر جان مضطر رات کو
یاد دلوا دی تپش نے تیری شوخی وصل کی
مر گئے ہم دیکھ کر چیں ہائے بستر رات کو

کیا اسی بتخانہ کو فرماتے ہو ظلمت کدہ
حضرت مومن جہاں جاتے ہو چھپ کر رات کو

سن اے مومن یہ ایماں ہے ہمارا
نہ کہنا کفر پھر عشق بتاں کو

پروانہ وار گرم تپش ہیں قلق سے ہم
تم شوخیوں سے شعلۂ بیتاب جستہ ہو

مومن نہ توڑ رشتۂ زنار برہمن
مت کر وہ بات جس سے کوئی دل شکستہ ہو

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرت ناصح
طرز نگہ چشم فسوں ساز تو دیکھو

ارباب ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے
کم طالعئ عاشق جاں باز تو دیکھو

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ
بدنامئ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

دیں پاکئ دامن کی گواہی مرے آنسو
اس یوسف بیدرد کا اعجاز تو دیکھو

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے
جور اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشاروں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دمبدم
گلۂ ملامت اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وفا سکھلا رہے گا دل ہمارا
تمھاری خاطر نامہرباں کو

کہاں ہے تاب ناز برق آتش
جلا دے آتش گل آشیاں کو

سمجھتا کیونکہ دیوانے کی باتیں
نہ پایا محرم اپنے رازداں کو

ہمارا غش تو کیا مر جائیں تو بھی
نہ کھولے طرۂ عنبر فشاں کو

دل مضطر کی بیتابی نے مارا
کہاں سے لاؤں اس آرام جاں کو

باد بہار میں ہے کچھ اور عطر بیزی — تم آج کل ہیں شاید سوئے چمن گئے ہو
ہے کچھ تو بات مومن جو چھا گئی خموشی — کس بت کو دے دیا دل کیوں بت سے بنے بیٹھے ہو

اے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو — ہمکو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو
ذرات فکر جور میں یوں رنج اٹھانا کب تلک — میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو
مومن تم اور عشق بتاں ای پیر مرشد خیر ہو — یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

وہ آئے یا نہ آئے زیست میری ہو نہ ہو لیکن
ذرا اے چارہ ساز و زحمت تدبیر تو کھینچو
دکھا دونگا تماشا بس نہ چھیڑو مجھ سے مجنوں کو
ہلا دونگا زمین و آسماں زنجیر تو کھینچو

اعجاز جاں دہی ہے ہمارے کلام کو — زندہ کیا ہے ہم نے مسیحا کے نام کو
لکھو سلام غیر کے خط میں غلام کو — بندے کا بس سلام ہے ایسے سلام کو
اب شور ہے مثال جودی اس خرام کو — یوں کون جانتا تھا قیامت کے نام کو
گو آپ نے جواب برا ہی دیا و لے — مجھ سے بیاں نہ کیجئے عدو کے پیام کو
مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج — دیکھا بھی ہم نے اس شعرا کے امام کو

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہئے ستانے کو
صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال — ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
برق کا آسماں پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو
شکوہ ہے غیر کی کدورت کا — سو مرے خاک میں ملانے کو
سنکے وصف اس پہ مر گیا ہمدم — خوب آیا تھا غم بٹانے کو

کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں — آسماں نے ستم اٹھانے کو

صد حیف سینہ سوز فغاں کارگر نہ ہو
یاں جان پر بنے ترے دل پر اثر نہ ہو
ایسے سے قدر مہر و وفا کی امید کیا
جس کو ہنوز اپنے ستم کی خبر نہ ہو
پائے طلب شکستہ نہ کوتاہ دست شوق
ہم بھی وہ ستم کریں جو وہ نازک کمر نہ ہو
زیاد بیگناہ کشی جا بجا کردن نہ ہو
گر دہم جاں نثاری بیغا میر نہ ہو
عابد فریب شوخی و رغبت فزا نگاہ
میں کیا کسی سے صبر تجھے دیکھکر نہ ہو
سودا ہے مجھکو گرمی بازار عشق کا
اس کا کہاں خیال کہ اپنا ضرر نہ ہو
حزن و ملال میں ہے دل آزردگی کا وہم
کیسی بری بنے جو گلہ بے اثر نہ ہو
ہیں آرزوے مرگ کی بے التفاتیاں
جینا مرا محال تو دشمن اگر نہ ہو
اب کیجئے آہ تاب گسل ہر جفا کے ساتھ
جب جان سے گزر گئے پھر در گزر نہ ہو
سوتے سے اٹھکے آئے ہیں یا رب جائیں وہ
شرمندہ آہ شب سے دعائے سحر نہ ہو

اعجاز سے زیادہ ہے سحر اس کے ناز کا
آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں نہ ہو

کرنی نہ تھیں مجاز کی باتیں گلہ میں ہائے
کیسی بنے جو دل سے وہ نامہرباں نہ ہو

عزم سفر جہاں سے کروں کیا غضب فراق
میں جانتا ہوں چین کہاں تو جہاں نہ ہو

مومن بہشت و عشق حقیقی تمہیں نصیب
ہم کو تو رنج ہو جو غم جاوداں نہ ہو

کب تک سیوں پارہ پارہ دل کو　　رخصت ہو شکیب جان گسل کو
تھا ضعف بھی طاقت آزما رات　　توڑا کئے جان مضمحل کو

اک لحظہ نہیں قرار جی کو　　موت آئے بس ایسی زندگی کو
اُس آفت جاں کو دل دیا ہائے　　جو عیب گنے ہے دلدہی کو
کوئی نہ رہا جو پونچھے آنسو　　کیا روؤں میں اپنی بیکسی کو

جلوہ اُس بت نے دکھایا مجھ کو　　کب قیامت میں غش آیا مجھ کو

چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا منہ　　اے شب ہجر تیرا کالا منہ
آرزوئے نظارہ تھی تو نے　　اتنی سی بات پر چھپایا منہ
ہو گیا راز عشق بے پردہ　　اس نے پردہ سے جو نکالا منہ

سما رہے ہیں مگر تیرے تو بتو جلوے　　کہ بن گیا ہے طلسم بہار آئینہ

شکست رنگ پہ ستی ہیں منتیں ہم بھی　　دکھائیں گے انھیں وقت خمار آئینہ
مجھے تو کہتے ہو مست دیکھ میری حجاب تو　　اور آپ دیکھتے ہو بار بار آئینہ

سیماب ہے پہلو میں مرے دل تو نہیں ہے　　اس دل نے ستایا مجھے غارت ہو کہیں تو
حسرت سے کہا خضر نے دیکھ اسکی گلی کو　　مرتا ہوں ابھی گر ملے مدفن کو زمیں یہ
اس رحم کے صدقے وہیں گھبرا کے کہا ہاں　　جا کر کوئی دیکھو کہیں مومن تو نہیں یہ

کب تک نبھائے بت ناآشنا کے ساتھ　　کیجے وفا کہاں تلک اس بیوفا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی　　آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
ہے کس کا انتظار کہ خواب عدم سے بھی　　ہر بار چونک پڑتے ہیں آواز پا کے ساتھ
یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی　　نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ
سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر　　یوں روئے زار زار تو اہل عزا کے ساتھ
ہر دم عرق عرق نگہ بے حجاب ہے　　کس نے نگاہ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ
مرنے کے بعد بھی وہی آوارگی رہی　　افسوس جاں گئی نفس نارسا کے ساتھ
دست جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا　　رکھا ہے اُن سی شوخ کے بند قبا کے ساتھ
میں کینے سے بھی خوش ہوں کہ کہتے تو ہیں　　اُس فتنہ گر کو لاگ ہے اس مبتلا کے ساتھ

الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ

آتی ہی بوئے داغ شب تار ہجر سے
سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

تھے وعدہ سے پھر آنے کے خوش یہ خبر نہ تھی
ہے اپنی زندگانی اُسی بیوفا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

گر تازگی ہے یار ہے دشنہ تو یک نگاہ
ہم نیم بسملوں کو تڑپتا نہ چھوڑ دیکھ

آئینہ خانہ بن گیا دل توڑنا نہ تھا
یعنی اب ایسے جلوہ نما ہیں کروڑ دیکھ

کھائی ہے قسم ہمنے کہ پرہیز کریں گے
گر درد سے بھر جائے طبیعت تو مزا ہے

توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے واعظ
یہ بھی کہیں دل دیکے گنہگار ہوا ہے

تھا محو رخ یار میں کیا آئینہ دیکھوں
معلوم ہے یار و مجھے جو رنگ مرا ہے

مومن نہ سہی بوسہ یا سجدہ کریں گے
وہ بت ہی جو اور دکھا تو اپنا بھی خدا ہے

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنیکی   خبر ہے لاش پہ اس بیوفا کے آنیکی
ہر ایک خلق کا خوں سر پہ فلک کی مرے   سکھائی طرز اسی دہن اُٹھالے آنیکی
سمجھ کے اور بھی کچھ مر چلا میں ای ناصح   کہا جو تونے نہیں جان جا کے آنیکی
مجھے یہ ڈر ہے کہ تو مومن کہیں کہتا ہو   مری تسلی کو روز جزا کے آنیکی

میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آجائے

پھر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آجائے

کلفت ہجر کو کیا روؤں ترے سامنے میں
دل جو خالی ہو تو آنکھوں میں غبار آجائے

محو دلدار رہوں کس طرح نہ ہوں دشمن جاں
مجھ پہ جب ناصح بیدرد کو پیار آجائے

دیتے ہو تسکیں مرے آزار سے   دوستی تم کو نہیں اغیار سے
مجھسے وہ چھپتے پھریں اسکے سوا   اور حاصل عشق کے آزار سے
کر علاج وحشت دل چارہ گر   لادے اک جنگل مجھے بازار سے
ذکر اشک غیر میں رنگینا ں ہو   بوئے خوں آئی تری گفتار سے
گر دعا کرتا ہوں مومن وصل یار کی   ہاتھ باندھے ہے وہ بت زنار سے

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جلائے ہے
یہ ستم اے بیمروت کس سے دیکھا جائے ہے

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے
تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

حال دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے
سر اُٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

جاں نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیراں ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

تاب و طاقت صبر و راحت جان و ایماں عقل و ہوش

ہائے کیا کہئے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

خاک میں مل جائے یارب بیکسی کی آبرو
غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے

دیکھئے انجام کیا ہو مومن صورت پرست
شیخ صنعاں کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

ہوئی تاثیر آہ وزاری کی — رہ گئی بات بیقراری کی
شکوۂ دشمنی کریں کس سے — واں شکایت ہے دوستداری کی
یاس دیکھو کہ غیر سے کہدی — بات اپنی امیدواری کی

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بیجاں ہوں گے

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کرلے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
گر وہ ہوں گے بھی تو بیوقت پشیماں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موج ہوا بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

صبر یارب مری وحشت کا پڑیگا کہ نہیں
چارہ فرما بھی کبھی قیدئ زنداں ہوں گے

منت حضرت عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہوں گے؟

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خار مغیلاں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

آج اس بزم میں طوفاں اٹھا کے اٹھے
یاں تلک روئے کہ ان کو بھی رلا کے اٹھے

گر نہ ہو دل میں خیال نگہ خواب آلود
درد کیا کیا اثر خفتہ جگا کے اٹھے

گو کہ ہم صفحہ ہستی پہ تھے اک حرف غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

ہو عذاب شب یلدا سے رہائی یارب
زلف منہ سے کبھی اس مہر لقا کے اٹھے

اف ری گرمی محبت کہ ترے سوختہ جاں
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اٹھے

میں دکھاتا تمھیں تاثیر مگر ہاتھ مرے

ضعف کے ہاتھ سے کب وقت دعا کے اُٹھے
جی ہی مانند نشان کف پا بیٹھ گیا

پاؤں کیا کوچے سے اُس ہوش ربا کے اُٹھے
شعر مومن کے پڑھے بیٹھ کے اُسکے آگے
خوب احوال دل زار سنا کے اُٹھے

لازم تھا حذر مجھ سے ناچیز کے نالوں سے
پر تجھکو کہاں غیرت اے بے اثری اتنی
لو چھیڑے ہے نکہت کو گلہائے شبینہ کی
اب تم سے بھی چل نکلی باد سحری اتنی
یہ کون کہے اُس سے کی ترک وفا میں نے
کرتو ہی ذرا ناصح پیغامبری اتنی
کیا ہوگئی خود بینی اب غیر سے چشمک ہے
یا خوش نگہی وہ کچھ یا بد نظری اتنی
کہتا ہے مرے آگے وہ، مجھ پہ عدو غش ہے
ہے ہے مری الفت سے ہے بیخبری اتنی
سجدہ نہ کہیں کرنا مومن قدم بت پر
کعبہ ہی میں ہوتی ہے بیہودہ سری اتنی

منتظر کس کے یہ رہتے ہیں کہ ہم ہر شب کو
تا سحر شام سے اُٹھ اُٹھ کے ہیں گھر میں پھرتے
جنبش نرگس جنت نے رولایا مومن
چشم کافر کے اشارے ہیں نظر میں پھرتے

پامال اک نظر میں ثبات و قرار ہے | اُسکا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے
چھٹکر کہاں اسیر محبت کی زندگی | ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

وہ سر جو کل ترے زانو پہ تھا سو آج اے ظالم
کبھو رہتا ہے پتھر پر کبھو رہتا زمیں پر ہے

دیا ظالم کو دل، جاں غیر کو آرام وحشت کو
کسی کا شکوہ کیا کیجئے یہ خوبی اپنی قسمت کی
ستم پیشہ ہے بدخو ہے ستمگر ہے جفا جو ہے
کروں کیا کیا شکایت دوستو اس بیمروت کی
مبارک خفتگان خاک کو تصدیع بیداری
کہ گور تیرہ سے یاد آئی مجھکو رات فرقت کی
جفا کا شکوہ اب کیوں جو کیا اچھا کیا اُس نے
سزا ہے اے دل ناداں اس الفت کی اس محبت کی

مجھکو مارا مرے حال متغیر نے کہ ہو | کچھ گماں اور ہی دہڑکے سے دل دشمن کے
بخت پروانہ سے قربان عدو ہوں یعنی | آگ بجھ جائے ہے وہ گرد پھرا ہیں جسکے

مجھ پہ طوفاں اُٹھائے لوگوں نے | مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے
کر دیا مومن اُس صنم کو خفا | کیا کیا ہائے ہائے لوگوں نے

نہیں تقصیر اُس بت کی کہ ہے میری خطا گنتی
مسلمانو ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی ہے

تڑپنے لوٹنے رونے کا باعث تجھ پہ بھی کھلتا
ترے دل کو بھی میری سی اگر اے بیوفا لگتی

جب وہ حیرت زدہ چہرے پہ نظر کرتا ہے
آئینہ صد گلہ آئینہ گر کرتا ہے

کیا کیا دل نے کہ آنکھوں سے کہا راز نہاں
ایسے غماز کو بھی کوئی خبر کرتا ہے

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو
کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

بخت بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں
تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

ذکر کر بیٹھیں برائی ہی سے شاید میرا
اب وہ اغیار کی صحبت سے حذر کرتا ہے

اشک شادی نے دم وصل جلایا مجھکو
منع نظارہ مرا دیدۂ تر کرتا ہے

کیا بلا لاتی ہے مجھے فکر خیال دشمن
وصل میں جب وہ ادہر ہنسکے نظر کرتا ہے

فغاں کیا دم ہی لینا پارہ ہائے دل اڑاتا ہے
کہوں کیا درد پنہاں کی کلیجا منہ کو آتا ہے

گراں خوابی وہی ہے بخت خوابیدہ کی اے ظالم
مرا شور فغاں کاہیکو سوتوں کو جگاتا ہے

میں ایسا ہوں کہ رونگا تجھکو طعنہ بیوفائی کا

بگڑتا گر نہیں دشمن سے کیوں باتیں بناتا ہے
خیال خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا
وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے — کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ — غش تمہیں دیکھکر نہ ہو جائے
کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم — کہیں پامال سر نہ ہو جائے
میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ — تجھکو تیری نظر نہ ہو جائے
بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں — کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے
مانع ظلم ہے تغافل یار — بخت بد کو خبر نہ ہو جائے
غیر سے بے حجاب ملتے ہو — شب عاشق سحر نہ ہو جائے
اے دل آہستہ آہ تاب شکن — دیکھ ٹکڑے جگر نہ ہو جائے
مومن ایماں قبول دل سے مجھے — وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

جہاں سے شکل کو تیری ترس ترس گزرے
جو تجھ پہ بس نہ چلا اپنے جی سے بس گزرے

نہ جاؤں کیونکہ سوئے دام آشیاں سے جب
خیال حسرت مرغان ہم قفس گزرے

وفائے غیرت فکر جفا نے کام کیا
کہ اب ہوس سے بھی اعدائے بوالہوس گزرے

یہ نیم جان دغم ہجر ہے وہی انصاف
جو تیرے وصل میں اے مرگ دادرس گزرے

کہاں وہ ربط نہاں اب کہ اسکو تو مومن

ہزار سال ہوئے سیکڑوں برس گزرے

رہیں یاں آنکھ ایک آن لگی — نہ ہائے ہائے میں تا روز شب بان لگی
یر کا خلوتھا تیرا اٹھا کیا ذکر — عبث یہ بات بری تجھکو بدگمان لگی
کو بلاؤں گا روز وصل میں لو — اجل بھی کرنے محبت کا امتحان لگی

ے قتل پہ حامی کوئی جلاد بھرے
آ دجب دیکھ کے تجھ سا ستم ایجاد بھرے
وجائے وصال آہ بلا سے چھوٹوں
ہجر کا دکھ کوئی کب تک دل ناشاد بھرے
ں وہ صید جگر خون و اسیری مشتاق
جو بن ذبح بھی ہر دم دم صیاد بھرے
اس کی خطا کیا مرے تن میں نہ رہا
خوں اتنا کہ سر نشتر فصاد بھرے

ے قتل عام وہ اغیار کیلئے — دس بیس روز مرتے ہیں دو چار کیلئے
ں تیری نذر کیا جان کیونکہ رد ہو — رکھا ہے اُس کو حسرت دیدار کیلئے
دیکھا کہ قیامت نے بھی قدم — طرز خرام و شوخیٔ رفتار کے لئے
بد وصل پہ ہجراں میں سہل تھا — مرتا ہوں زندگانیٔ دشوار کے لئے

لے دم بخود رہئے نہ ہوں کیجئے نہ ہاں کیجئے
کہاں تک کھائیے غم کب تلک ضبط فغاں کیجئے
کے وہم سے تکتا ہوں بزم غیر میں ہر سو
نہیں ہے اور کچھ یوں آپ جو چاہیں گماں کیجئے
کہیں تو کیا کہیں اور بن کہے کیونکر دوا ہووے
بڑی مشکل پڑی کیا چارۂ درد نہاں کیجئے
رکھے سے ہاتھ سینے پر بھلا کب مانتا دل ہے
نہ جبتک رئیے دو چار آہ خونچکاں کیجئے
کچھ آخر حد بھی ہے جور و جفا و ظلم کی کب تک
تحمل درگزر ہر لحظہ ہر دم ہر زماں کیجئے
گلا ہم کاٹ لیں گے آپ تیغ رشک سے اپنا
عدو کو قتل کیجئے پھر ہمارا امتحاں کیجئے
عذاب ایزدی جانکاہ ہے مانا بس اے مومن
خدا کے واسطے ذکر ستمہائے بتاں کیجئے

اجل سے خوش ہوں کسی طرح ہو وصال تو ہے
نہ آئے نعش پہ وہ پر یہ احتمال تو ہے
ذرا تھم اے دل مضطر کہ فکر وصل کروں
شب تلق نہ سہی خواب ہے خیال تو ہے
کہاں تک گلہ ہائے تغافل قاتل
ہم آپ کاٹ لیں آخر یہ سر وبال تو ہے
جفائے یار کو سونپا معاملہ اپنا
اب آگے ہو نہ ہو امید انفعال تو ہے
شب فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں
کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے
عبث ترقی فن کی ہوس ہے مومن کو

زیادہ ہوئے گا کیا اس سے بیشال تو ہے — اے حضرت مومن یہ علم جو ہے ارشاد — بھولے سے بھی اب ذکر بتوں کا نہ کریں گے

(ق)

لیکن جو بتوں ہی نے بھلا آپ کی بات — پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کریں گے

تسلی دم واپسیں ہو چکی — ہمیں ہو چکے جب تمہیں ہو چکی
قلق کشتہ سخت جانی ہے پھر — امید اجل آفریں ہو چکی
بلا اس سیہ روز کو بزم میں — شب عیش اے مہ جبیں ہو چکی
خیال اجل سے تسلی کروں — وہ طاقت بھی جان حزیں ہو چکی

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے — وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے
ہو کے آزردہ پشیماں ہوں کہ میں جب سے کہوں — وہی کہوے کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے
ہو نہ بیتاب غم ہجر بتاں میں مومن — دیکھ دو دن میں بس اب فضل خدا ہوتا ہے

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کرینگے — کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کرینگے
ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں — اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کرینگے
بیمار اجل چارہ کو گر حضرت عیسیٰ — اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے
دیوار کے گر پڑنے ہی اٹھنے لگے طوفاں — اب بیٹھ کے کونے میں بھی رویا نہ کریں گے
ناصح کف افسوس نہ مل چل تجھے کیا کام — پامال کرینگے وہ مجھے یا نہ کریں گے
گر ذکر وفا سے یہی غصہ ہے تو اب سے — گو قتل کا وعدہ ہو تو تقاضا نہ کریں گے

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے — وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے

نہ کٹی ہم سے شب جدائی کی — کتنی ہی طاقت آزمائی کی
اشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے — بیٹھے ہی تم سے بیوفائی کی
دام عاشق ہے دلدہی نہ ستم — دل کو چھینا تو دلربائی کی
گر نہ بگڑو تو کیسا بگڑتا ہے — مجھ میں طاقت نہیں لڑائی کی
گھر تو اُس ماہ وش کا دور نہ تھا — لیک طالع نے نارسائی کی
مر گئے پر رہے بے خبر صیاد — اب توقع نہیں رسائی کی
مومن آؤ تمھیں بھی دکھلا دوں — سیر بت خانے میں خدائی کی

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے
پوچھا کسی پہ مرتے ہو اور دم نکل گیا — ہم جان سے عناں بہ عنان صدا گئے
اے آب اشک آتش عنصر ہے دیکھنا — جی ہی گیا اگر نفس شعلہ زا گئے
واعظ کے ذکر مہر قیامت کو کیا کہوں — عالم شب وصال کے آنکھوں میں چھا گئے
تابندہ رجوان تو بخت رقیب تھے — ہم تیرہ روز کیوں غم ہجراں کو بھا گئے
اے مومن آپ کب سے ہوئے بندۂ بتاں

بارے ہمارے دین میں حضرت بھی آگئے

رفتگی میں جین وہ پایا کہ کیا کہوں　　غربت جو مجھ سے پوچھو تو بہتر وطن سے ہے
یا جواب شکوہ میں باتیں بنا گیا　　لو اب بھی دل درست اسی دل شکن سے ہے

فائی کا عدو کے ہے گلہ　　لطف میں بھی وہ ستاتے ہیں مجھے
رت حسن سے یہ شکل بنی ہو　　کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے
یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں　　تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے
نک دے آتش دل داغ مرے　　اسکی خو یاد دلاتے ہیں مجھے
من و دیر خدا خیر کرے　　طور بیڈھب نظر آتے ہیں مجھے

ہر دل ہے داغ مطلع خورشید دیکھکر
از بسکہ یاد جلوہ بالائے بام ہے
ں آہوئے رمیدہ کو پھر ڈھونڈھتا ہے دل
رم کردہ شوق وصل پھر اک صید دام ہے
پھر آگیا ہے کون سے بیباک کا خیال
یہ کیا ہوا کہ رخصت ناموس و نام ہے
پھر کس نے غیر کو نہ دیا ناز سے جواب
پھر خواہش پیام اجل کا پیام ہے
دیکھا نگاہ ناز سے کس شوخ چشم نے
پھر مضطرب نظر کو جہاں نیم گام ہے
پھر کس ستم شعار نے پوچھا ہے میرا حال
پھر ناصحوں کو کیوں خطر انتقام ہے

پھر کچھ صدائے پاس دل مردہ جی اٹھا
پھر جلوہ ریز کون قیامت خرام ہے
پھر دردِ بتاں میں نہیں خواب کا خیال
مومن مرے بھی دین میں سونا حرام ہے

مجھے چپ لگی مدعا کہتے کہتے　　رکے ہیں وہ کیا جانے کیا کہتے کہتے
شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے　　زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے
چلے تم کہاں میں نے تو دم لیا ہے　　فسانہ دل زار کا کہتے کہتے

یوں بنا کر حال دل کہنا نہ تھا　　بات بگڑی میری ہی تقریر سے
لے گئی جاں یاد رونق ہائے وصل　　گھر مرا ویراں ہوا تعمیر سے
اے صنم مومن ہوں آخر کس طرح　　مجھکو تسکیں ہو تری تصویر سے

ہم حال کہے جائیں گے سنو کہ نہ سنو　　اتنا ہی تو یاں صحبت ناصح کا اثر ہے
وہ ذبح کرے اور بیاں جان فدا ہو　　ایسے سے نبھے یوں یہ ہمارا ہی جگر ہے
دل کھول کے مل لیجئے مومن صنموں سے　　اس سال میں گر سوئے حرم عزم سفر ہے

دل میں اس شوخ کے جو راہ نہ کی　　ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی
کون ایسا کہ اس سے پوچھے کیوں　　پرسش حال داد خواہ نہ کی
تھا بہت شوق وصل تو نے تو　　کمی اے حسن تاب گاہ نہ کی
تاب کم ظرف کو کہاں تم نے　　دشمنی کی عدو سے چاہ نہ کی
گریہ و آہ بے اثر دونوں　　کس نے کشتی مری تباہ نہ کی

تھا مقدر میں اُس سے کم ملنا کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی
دیکھ دشمن کو اُٹھ گیا بے دید میرے احوال پر نگاہ نہ کی
مومن اس ذہن بے خطا پر حیف فکر آمرزش گناہ نہ کی

وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے
نہ اب تک صنم سچ سہی دلے مومن
یہ کیا سبب کہ سناتے ہو بار بار مجھے

نہ آسماں کا رُخ پھیر دوں جدھر چاہوں
دیا ہے کیا تپش دل نے اختیار مجھے
وہ شام وعدہ جو آئی تو بیخود و سرمست
رہا وصال میں بھی وہی انتظار مجھے
نہ ہو وہ بات کہ جس سے وفا میں آئے خلل
کہیں نہ کیجیو ناصح سے شرمسار مجھے
بقدر جوشش تڑپنے کو تھا وے پس قتل
وہ بیقرار ہوئے آگیا قرار مجھے
امید مرگ پہ ہر فتنہ راحت جاں ہے
شب فراق میں کیا بیم روزگار مجھے
اگر حساب وفا امتحاں کے بعد نہ ہو
قبول عذر ستمہائے بیشمار مجھے
رقیب کھائے قسم تو وفا کا آئے یقیں
تو میری جان ہے کیا تیرا اعتبار مجھے
پس شکستن خم زجر محتسب معقول
گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے
نہ کام زور سے نکلا نہ عجز کام آیا تو
بس اب تو چین دے اے شوق ہرزہ کار مجھے
ہر آن آن دگر کا ہوا میں عاشق زار

دعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لئے
سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لئے
خلاف وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں
امید یکشبہ ہے یاس جاوداں کے لئے
سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں
کہ سخت چاہئے دل اپنے راز داں کے لئے
حجاب چرخ بلا ہے ہوا کرے بیتاب
فغاں اثر کے لئے اور اثر فغاں کے لئے
ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لئے
مزہ یہ شکوے میں آیا کہ بے مزہ ہوئے وہ
میں تلخ کام رہا لذت زباں کے لئے
ملے رقیب سے وہ جب سنا وصال ہوا
دریغ جان گئی ایسے بدگماں کے لئے
کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ ہم قفس
ہے بیم برق بلا روز آشیاں کے لئے
جنون عشق ازل کھیل نہ خاک اڑائیں کہ ہم
جہاں میں آئے ہیں ویرانی جہاں کے لئے
بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے موئے

ہمیں بھی دینی تھی جاں اُس کے امتحاں کے لئے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی — تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

موئے آغازِ الفت میں ہم افسوس — اُسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی

جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا — کہ تو نے کس توقع پر وفا کی

وہ سوتے بے حجابانہ رہے اور — نگاہِ شوق کام اپنا کیا کی

کہا اس بت سے مرتا ہوں تو مومن — کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے — جفا پر عدو لاؤں کہاں سے

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے — کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

شب وصل آپ کا عذرِ نزاکت — بجا ہے پر نہ مجھ سے نیم جاں سے

مرے گھر آپ یوں جاتے تھے کس دن — اُٹھانا مدعا ہے آستاں سے

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

نہ بولونگا نہ بولونگا کہ میں ہوں — زیادہ بدگمانی اس بدگماں سے

نہ بجلی جلوہ فرما ہے نہ صیاد — نکل کر کیا کریں ہم آشیاں سے

بُرا انجام ہے آغاز بد کا — جفا کی ہو گئی خو امتحاں سے

خدا کی بے نیازی ہائے مومن — ہم ایماں لائے تھے نازِ بتاں سے

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

اور کہیں بالکل سادگی ہے مثلاً:- وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

پہلے مصرعہ میں لفظ پشیماں سے یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ کہنے والا مرچکا ہے۔ لفظ اب سے نتیجہ کا بے معنی ہونا ظاہر کیا ہے اور دوسرے مصرعہ سے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ وقت ایسا تھا کہ میں پھر زندہ ہوتا اور تیری پریشانی سے فائدہ اٹھاتا، کیونکہ اس کے بعد ممکن ہے تو میری محبت کی قدر کرتا لیکن اس میں ایک اور لطیف مفہوم مومن نے پوشیدہ رکھا ہے، کہتا ہے "تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے" کیونکہ زندگی کی خواہش کیجاتی ہے، اس لئے کہ میری لاش پر وہ پشیمان آیا ہے اور یہ منظر ایسا ہے کہ مجھکو اسپر اپنی جان نثار کردینی چاہئے، مومن زندگی اس لئے نہیں چاہتا کہ وہ اس سے زندگی کا لطف اٹھائے بلکہ محض اس لئے کہ محبوب کی اس ادائے انفعال پر اس کو نثار کردے

مومن کا ایک مخصوص انداز بیان جو غالب کے ہاں کمتر اور دوسرے شعراء کے ہاں بالکل نہیں پایا جاتا، کسی واقعہ کے بیان میں درمیانی کڑیوں کو چھوڑ جانا ہے۔ وہ تمام حالات یا واقعات کو سلسلہ کے ساتھ نہیں بیان کرتا بلکہ کوئی کوئی بات لیکر انھیں مسلک کردیتے ہیں اور درمیانی کڑیوں کو ملانے کی خدمت ذہن سامع کے سپرد کردیتے ہیں پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سننے والا نہایت آسانی کے ساتھ اس خلا کو پر کرکے مفہوم تک پہونچ جاتا ہے جیسے:-

جیب درست لایق لطف و کرم نہیں ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں

مدعا یہ ہے کہ ناصح کہتا ہے اپنی جیب و گریباں کی حالت درست کروں لیکن اس کی دوستی بھی عداوت ہے کیونکہ اگر اس کے کہنے پر عمل کرکے چاک جیب و داماں میں رفو کرلونگا تو پھر محبوب کے لطف و کرم کا اہل کیونکر اپنے آپ کو ثابت کرسکونگا۔ اس شعر میں یہ ٹکڑا کہ "ناصح اپنا ایسا کہتا ہے" بالکل محذوف ہے۔

اسی زمین کا دوسرا شعر ہے:-

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا مجھکو خیال بھی تری سرکی قسم نہیں

اس شعر میں اور زیادہ محذوفات ہیں اور ایک پوری داستان بیان کی ہے۔ مومن محبوب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں نیاز عشق کو پیش کررہے ہیں، محبوب جس نے عدو کو بے جرم پامال کردیا ہے، مومن کی طرف مائل تو ہے لیکن اس خیال سے کہ مومن کو عدو کی بے جرم پامالی کا حال معلوم ہوگیا ہے کچھ رک رک کر مل رہا ہے اس خیال سے کہ مومن اس واقعہ کے علم کے بعد ممکن ہے التفات کی قدر نہ کرے یا بدظن ہوجائے۔ مومن محبوب کی اس کیفیت کا اندازہ کرکے یہ خیال اس کے دل سے نکالتے ہیں۔ اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر میرے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا تو مجھے کوئی پروا نہ ہوگی تم التفات کرو خواہ اس کا نتیجہ وہی کیوں نہ ہو جو عدو کو بے جرم پامالی کی صورت میں برداشت کرنا پڑا۔

دکھاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں
کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سے بدگماں نہیں

اس شعر کا سمجھنا اس علم پر موقوف ہے کہ جب کسی کو سکتہ ہو جاتا ہے یا کسی کی موت کے متعلق پورا یقین کرنا ہوتا ہے تو اس کے چہرہ کے قریب آئینہ لیجاتے ہیں کہ اگر ذرا بھی سانس ہو گی تو آئینہ پر نم پیدا ہو جائے گا، اور اس طرح حال معلوم ہو جائے گا کہ واقعی مرگیا ہے یا نہیں کبھی خلا پورا کرنے کے لئے بہت زیادہ غور کا اور فکر عمیق کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً :-

کیا رم نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا
الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا

عدو اس اوج پر شاکی ہو شاید غصہ آجائے
ملا دے خاک میں یہ تو بھی شکر آسمان کیجئے

کیا گلے ہوتے گر اوروں پہ بھی رحم آجاتا
شکر صد شکر کہ میرا سا ترا دل نہ ہوا

کس دن تھی اُس کی دل میں محبت جو اب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

تھی کمین غارت بوس و ہن ہنگام خواب
شب کی بیداری سحر کا خواب رہزن ہو گیا

قلق کشتۂ سخت جانی ہے پھر
امید اجل آفریں ہو چکی

مومن کبھی کسی بات کو معمولی طریقہ پر ادا نہیں کرتے اور اپنے مدعا کو ایک خاص پُر لطف پیچ سے ظاہر کرتے ہیں اور اس خصوصیت سے اُن کا سارا دیوان بھرا پڑا ہے۔

مثلاً انھیں یہ کہنا تھا کہ ناصح کی نصیحت بالکل بے اثر چیز ہے، اس کو اس طرح بیان کیا :-

بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں
کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

مومن کا محبوب بھی اُنھیں کی طرح ہے کہ جب وہ مومن کو تڑپتے ہوئے دیکھ طعن کرنا چاہتا ہے تو غیر کے صبر و سکون کا ذکر کرتا ہے شعر ملاحظہ ہو :-

صبح سے تعریف ہی صبر و سکونِ غیر کی
کس نے شب مجھ کو تڑپتے پیشِ رو دکھلا دیا

مومن کو یہ کہنا مقصود ہے کہ محبوب انکا ذکر کرنا ہی نہیں چاہتا خواہ وہ برائی سے کیوں نہ ہو اُس کے اظہار کے لئے تلاش مضمون ملاحظہ ہو

ذکر کر بیٹھے بُرائی ہے سے شاید میرا　　اب وہ اغیار کی صحبت سے حذر کرتا ہے

ایک جگہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ شب فرقت میں خود اپنے آپ کو ہلاک کر دونگا لیکن ملاحظہ ہو اس پامال مضمون کو کس رعنائی کے ساتھ بیان کیا ہے:۔

دشنہ چھین لیگا کیا ہمنشیں شب فرقت　　اب جب نہیں اپنے کون میری جان اپنا

اسی زمین کا ایک شعر ہے جسمیں یہ ظاہر کیا ہے کہ ہم نے اس کوچہ میں اتنا زمانہ صرف کر دیا کہ شہر کی حالت بالکل بدل گئی:۔

بعد مدت اُس کُے سے یوں پھرے تنگ آ کر　　جائے جائے پھرتے ہیں پوچھتے مکاں اپنا

مدعا یہ کہنا ہے کہ ہماری ہر تحریر وہ دشمن کو دکھلا دیتا ہے، اس کو اس طرح ظاہر کیا:۔

راز نہاں زبان اغیار تک پہونچا　　کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہونچا

یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ غیر کی تپش دل صحیح نہیں ہے بلکہ وہ صرف اس کی نمائش کرتا ہے اس کو یوں لکھتے ہیں:۔

مانے نہ مانے منع تپشہائے دل کروں　　میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

مومن اپنے محبوب سے صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اغیار سے سرگوشیاں نہ کیجئے اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

غیر سے سرگوشیاں کیجئے پھر ہم بھی کچھ　　آرزوہائے دل رشک آشنا کہنے کو ہیں

مدعا یہ کہنا ہے کہ تمھاری خود بینی جتنی بڑھتی جاتی ہے اس سے زیادہ میری وارفتگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس کے لئے مومن نے جو قیامت خیز انداز بیان اختیار کیا ہے، ملاحظہ ہو:۔

خود بینی و بیخودی میں ہے فرق　　میں تم سے زیادہ کم نما ہوں

محبوب کی بے التفاتی یا دشمنی عاشق کی موت ہوتی ہے، کہیں مومن اس کو اپنی زندگی کا سبب بتاتے ہیں، توجیہ ملاحظہ ہو:۔

ہیں آرزوے مرگ کی بے التفاتیاں　　جینا مرا محال تو دشمن اگر نہ ہو

مومن کے ذہن ہی میں یہ بات نہیں آسکتی کہ سوائے کاشانۂ محبوب کے کعبہ کوئی اور ہو سکتا ہے، انداز بیان ملاحظہ ہو:۔

مومن سوئے شرق اس بت کافر کا تو گھر ہے　　ہم سجدہ کدھر کرتے ہیں اور کعبہ کدھر ہے

گریباں کے چاک کی وسعت کو ظاہر کرنا تھا تو اس کے لئے یہ انداز بیان اختیار کیا:۔

دست جنوں کے جائے صدقے کہ چین سے　　پھیلائے پاؤں ہم نے گریباں کے چاک میں

الغرض مومن کا یہ انداز بیان ان کے کلیات میں ہر جگہ نظر آتا ہے اور کوئی غزل اس رنگ سے خالی نہیں ہے۔ مومن فارسی ترکیبیں استعمال کرنے میں بھی خاص ملکہ رکھتے تھے اور اس باب میں جو چیز انھیں غالب سے ممتاز کرتی ہے، وہ ترکیبوں کی نزاکت ہے نہ کہ ان کا اغلاق۔

غالب کی فارسی ترکیبوں میں اشکالِ لفظی کے ساتھ دقتِ معنی پیدا ہوتی ہے برخلاف مومن کے کہ ان کے ہاں ترکیبوں کی لطافت کیساتھ مفہوم وسیع ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مومن و غالب دونوں نے فارسی ترکیبوں کے استعمال میں عرفی و بیدل کا تتبع کیا اور بہت سی ترکیبیں وہی یا اسی نوع کے اختیار کیں جو عرفی و بیدل کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ اس باب میں مومن کو نہ صرف اولیت بلکہ افضلیت حاصل ہے اور غالب کے نقوش نقشِ ثانی کا حکم رکھتے ہیں گو "بہتر ز اول" نہ ہوں۔ ہرچند غالب کے اردو کلام کا بڑا حصہ محض انھیں ثقیل ترکیبوں کی وجہ سے حذف ہو چکا ہے لیکن موجودہ نسخہ میں بھی جا بجا اُن کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ مومن کے ہاں یہ ترکیبیں اُن کے کلام میں اس قدر حسن و لطافت کے ساتھ ملی ہوئی ہیں کہ نہ خود غالب کی طرح مومن کو ان کے حذف کرنے کی ضرورت پڑی اور نہ دنیا نے اُن کے قبول کرنے سے انکار کیا۔ ہرچند غالب کے اس شعر سے کہ :-

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ غالب نے بیدل کو سامنے رکھ کر فارسی ترکیبیں استعمال کیں، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ اس کی تحریک پیدا ہوئی مومن کے کلام کو دیکھ کر۔ پھر چونکہ غالب اپنی فطرت کی بنا پر یہ نہ چاہتے تھے کہ لوگ مومن کا متبع سمجھیں اس لئے انھوں نے اس میں بہت زیادہ گہرا رنگ پیدا کرنا چاہا اور اس طرح کلام مومن سے امتیاز پیدا کرنے کی کوشش میں اول اول ان کے قلم سے اس قسم کے اشعار نکلے جو باوجود ثقل تراکیب کے کوئی ندرت مفہوم نہ رکھتے تھے مثلاً :-

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغ جگر ہدیہ مبارکباد اسد غمخوار جانِ دردمند آیا

جز قیس کوئی اور نہ آیا بروئے کار صحرا مگر بتنگیٔ چشمِ حسود تھا

دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

شمار سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
بفیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا — جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے — خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ یہ اندازِ شاعری نہ محمود ہے نہ مقبول تو مجبوراً انھیں پھر مومن ہی کی سطح پر آنا پڑا اور اسمیں شک نہیں کہ غالب اس میں بہت کامیاب ہوئے ذیل کے اشعار کو اگر آپ مومن کے اشعار میں ملا دیجئے تو امتیاز دشوار ہو جائے گا:-

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں — شکایتہائے رنگیں کا گلا کیا
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں — تغافلہائے تمکیں آزما کیا
دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے — غمِ آوارگیہائے صبا کیا
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں — یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

مومن کے ہاں قسم اول کا اغلاقِ مفہوم یا ثقلِ ترکیب تقریباً مفقود ہے ان کے ہاں بالکل عرفی کی سی شگفتگی پائی جاتی ہے اور کہیں کہیں وہ عرفی سے پورا استفادہ بھی کرتے ہیں۔ عرفی کے قصیدہ کا ایک شعر ہے۔

دراں دیار بہ سودا رود دلم کہ دہند — جوے ملال بہ عمر ابد بہ بسیاری

مومن لکھتے ہیں:-

اہلِ بازارِ محبت کا بھی کیا سودا ہے — عشرتِ عمرِ ابد قیمتِ غم دیتے ہیں

ذیل کی چند مثالوں سے مومن کی فارسی ترکیبوں کا صحیح رنگ معلوم ہو جائیگا:-

دیتے تکلیفِ شبِ ہجر میں آہ ذی پاس — نقدِ جاں پیشکشِ مرگ کے قابل نہ ہوا

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا — میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

سرشکِ اعتراضِ عجز نے الماس ریزی کی — جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا
عنایت کر مجھے آشوب گاہِ حشرِ غم اے دل — ....

غالب [illegible]

نہ پوچھ گرمیِ شوقِ ثنا کی آتش افروزی ……………………

گر وہاں بھی یہ خموشی اثرِ افغاں ہوگا حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

کچھ نہیں ہے یہ چپ لذتِ ستم سے کہ میں حریفِ کشمکشِ نالہ و فغاں نہ ہوا

کیا مجھ میں دم بھی لینے کی طاقت نہیں رہا کیوں شورِ نالہ ہائے عزا بار کم ہوا

پہونچے وہ لوگ مرتبہ کو کب مجھے شکوۂ بختِ نارسا نہ رہا

کیوں جو متصل سے ترے غیر کھنچ گئے میں کیا حریفِ کشمکشِ دمبدم نہ تھا

شعلۂ دل کو ناز تابش ہے اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

بیکاریِ اُمید سے فرصت ہے رات دن وہ کاروبار حسرتِ حرماں نہیں رہا

…………………… از بس دماغ عطر گریباں نہیں رہا

صبر بعد آسایش اس قلق پہ مشکل تھا عیش جاودان نکلا رنج جاوداں اپنا

شعلۂ آہ فلک رتبہ کا اعجاز تو دیکھ ……………………

اظہارِ شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث ……………………

یہ تشنہ کامی نگہِ گرم دیکھنا ……………………

ہوش میں آ تو مجھ میں جان نہیں غفلت حرارت آزما کب تک

جرم معلوم ہے زلیخا کا طعنۂ دستِ نارسا کب تک

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے ہم بھی کچھ آرزو ہائے دل دردآشنا کہنے کو ہیں

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرت ناصح طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو

ارباب ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے — کم طالعیِ عاشقِ جانباز تو دیکھو

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے — جورِ اجلِ تفرقہ پرداز تو دیکھو

ان اشعار میں، اندیشۂ خوں گشتہ، آشوبگاہِ حشرِ غم، گرمیِ شوقِ ثنا، خموشیِ اثرِ افغاں، نازِ تابش، جورِ متصل، غفلت جراءت آزما، حریفِ کشمکشِ دمبدم، شوقِ شکوہ اثر کی ترکیبیں کس قدر پاکیزہ اور رنگِ تغزل میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بعض بعض جگہ ثقیل و نامانوس ترکیبیں بھی نظر آتی ہیں لیکن کم۔ محبت میں انسان پر دو کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، ایک وہ جس کا تعلق اس خیال سے ہوتا ہے کہ مستحقِ الفت ہمیں ہیں اور اس کیفیت کے ماتحت جو جذبات پیدا ہوتے ہیں ان میں نیازِ عشق سے زیادہ پندارِ عشق پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شکوہ و شکایت، طنز و طعن، "جلی کٹی" کی کیفیت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، دوسری حالت وہ ہے جب الفت میں ارتقا پیدا ہوتا ہے اور "مادی احساسات" ضعیف ہو کر ایک خاص انداز کی والہانہ شیفتگی، بے غرضانہ فنادگی، خود فراموشانہ بیخودی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اس وقت محبت، خیال، شوق، آرزو، بیان، غرض ہر چیز میں ایک بلند قسم کی سادگی پائی جانے لگتی ہے اور اس میں کلام نہیں کہ بلند معیار کی غزل اسی کیفیت کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

مومن کی شاعری کا عنصرِ غالب وہ ہے جو قسمِ اول کی کیفیت سے متعلق ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عاشقانہ زندگی کا اکثر حصہ اسی "عہدِ پندار" سے وابستہ رہا ہے، لیکن تجسس و تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ان پر دوسری قسم کی بھی کیفیت طاری ہوئی تھی اور اس کیفیت کے ماتحت جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ ویسا ہی ہے جیسا اسے ہونا چاہیے اور اس کو پڑھنے کے بعد ہم اس فضا میں پہونچ جاتے ہیں جہاں سے میر و درد کی شاعری کے حدود شروع ہوتے ہیں۔ غالباً ناموزوں نہ ہوگا اگر مثالاً چند اشعار یہاں درج کئے جائیں:-

چھوڑا تھا دل نے تھا یہ موسیٰ پر غل گیا — جب ٹھیس سانس کی لگی دم ہی نکل گیا

اس کو بھی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی — کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا — دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

وہ حال زار ہے میرا کہ گاہ غیر سے بھی — تمھارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا

کچھ قفس اور میں ہی نہیں سب کے سب ہوئے — اچھا تو دردِ عشق کا بیمار کم ہوا

صبر نہیں، شام فراق آچکو — جس سے کہ بیزار تھے تم سو گیا
سحر تک شام سے تجھ بن یہی حالت رہی اپنی — نہ مجھ کو چین دیتا تھا نہ آرام لیتا تھا
نہ مانونگا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا — کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا
روز کہتا تھا کہیں مرتا نہیں ہم مر گئے — اب تو خوش ہو بے وفا تیرا ہی لے کہنا کیا
چارہ گر زنداں میں اسکے آستاں سے لے گئے — ایک بھی میری نہ مانی لاکے سر پٹکا کیا
کیا خجل ہوں اب علاج بیقراری کیا کروں — دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا
سینہ پہ ہاتھ دھرتے ہی کچھ دم پہ بن گئی — لو جان کا عذاب ہوا دل کو تھامنا
بے سیر دشت و بادیہ لگنے لگا ہے جی — اور اس خراب گھر میں کہ ویران نہیں ہا
نارسائی سے دم رکے تو رکے — میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
شب ہی تجھ بن نہ بس بے چین و بے آرام ہم — صبح تک رویا کئے لے لیکے تیرا نام ہم
ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
کس کو خبر آپ آنیکی ہو کہتا ہے یہ بیتابی — کرتے ہیں ہم ہر دم پھرتے آتے میں ادھر جاتے ہیں
دمبدم رونا ہمیں چاہ دو طرف تکنا ہمیں — یا کہیں عاشق ہوئے یا ہو گیا سودا ہمیں
جانے دے چارہ گر شب ہجراں میں مت بلا — وہ کیوں شریک ہو مرے حال تباہ میں
نہ پوچھو کچھ مرا احوال میری جان مجھ سے — یہ دیکھ لو کہ مجھے طاقت بیان نہیں
کہاں ہے تاب ناز برق اے کاش — جلادے آتش گل آشیاں کو
اے ناصحو آہی گیا وہ فتنۂ ایام لو — ہمکو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دلکو تھام لو
صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال — ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
آتی ہی بوئے داغ شب تار ہجر میں — سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ
سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجاتا ہے — تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے
حال دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جاتا ہے — سر اٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جاتا ہے

بخت بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

دیوار کے گرتے ہی اٹھتے ہو طوفاں اب بیٹھ کے کونے میں بھی رویا نہ کرینگے

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

بقدر جوش تڑپنے کو تھا دے بس قتل وہ بیقرار ہوئے آگیا قرار مجھے

انتخاب بالا پر سرسری نگاہ سے بھی یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ مومن کے ان اشعار میں جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اُن سے بہت مختلف ہیں جو ان کے دوسرے اشعار میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مومن کا اصلی رنگ یہ نہیں ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں ہو سکتا کہ اگر ان کی محبت اگر ذرا اور بلند ہو جاتی تو پھر آج یہ جستجو نہ ہوتی کہ اردو شاعری میں دوسرا آمیر کون ہو سکتا ہے،

مومن کا کلیات مطالعہ کرنے کے بعد ایک شخص اس نتیجہ پر پہونچنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اُن کی محبت کا ہدف اگر شاہدان بازاری کا طبقہ نہ تھا تو اس کا استعمال ضرور بیجا ہو سکتا تھا اور ایک عام کیفیت جو کلام مومن کے مطالعہ کے بعد انسان پر طاری ہو سکتی ہے جسکا تعلق کچھ اسی قسم کے جذبات سے ہے۔ یہاں تک کہ اگر واقعی کوئی شخص اس کوچہ سے نابلد ہو تو بھی اس کے اندر اس قسم کی تحریک پیدا ہو سکتی ہے اور اگر نابلد نہ ہو تو پھر وہ اپنی کیفیات کے اندر جس قدر لطف کلام مومن سے پیدا کر سکتا ہے، اس کی کوئی حد پایاں نہیں ہے

مومن کے ہاں تشبیہات تقریباً مفقود ہیں، استعارات ہیں لیکن زیادہ نہیں کنایہ کی افراط ہے اور پوری تکمیل کے ساتھ، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جو کیفیات تشبیہات کے ذریعہ سے پیدا کیجا سکتی ہیں ان کا بھی فقدان ہے۔ مثلاً محبوب کی آواز کی تعریف ایک جگہ انھوں نے اس طرح کی ہے۔

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں اے ہمنفس نزاکت آواز دیکھنا

اس شعر میں کوئی تشبیہ و استعارہ نہیں ہے لیکن نزاکت آواز کا بیان جس انداز سے کیا گیا ہے اس میں وہی بلکہ اس سے زیادہ اثر موجود ہے جو ایک تشبیہ کے ذریعہ سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جگہ اس سے بلند ہو کر انھوں نے تشبیہ بھی دی ہے لیکن وہ تشبیہ بھی کیفیاتی ہے۔

شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

الغرض مومن نے اپنے سارے کلیات میں سوائے حکایات حسن و عشق کے اور کسی چیز سے سروکار نہیں رکھا اور اس سلسلہ میں جتنے پہلو گفتگو کے نکل سکتے ہیں یا جس قدر تلخ و شیریں تجربات حاصل ہو سکتے ہیں وہ سب کے سب کسی نہ کسی صورت سے اُن کے کلام میں پائے جاتے ہیں اور ان کا یہ رنگ تغزل اس قدر گہرا تھا کہ قصائد تک اسی کیفیت سے لبریز ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار کسی قصیدہ کے ہیں

تم اور حسرت ناز آہ کیا علاج کروں　　میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل
چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا　　غضب ہے شوق رسائی و دوری منزل
خدا سے ڈر بت بیدرد ہے یہ کیا انصاف　　کہ تو جفا سے نہ ہو اور وفا سے ہوں میں خجل
وہ تند خو کہ اگر جور سے پشیماں ہو　　تو بہر عذر کرے ناز ہائے تاب گسل

بدگمانی نے دعا سے بھی رکھا محروم آہ　　راز دل غیر سے کس طرح میں کرتا اظہار
دہوم ہے تابش خورشید قیامت کی مگر　　مجھ سے اشتر نہ پوچھے گا عذاب شب تار
غیر کو بام پہ آ جلوہ دکھایا تم نے　　یہ نہ دیکھا کہ پڑا ہے کوئی زیر دیوار
بیم رسوائی و اندیشۂ بدنامی سے　　کیا کروں کر نہ سکا وحشت دل کا اظہار
شاد و شاد آئے عیادت کو دم آخر تم　　ایسے بیدرد پہ کرتا ہے کوئی جان نثار
نیک نامی نہ سہی مجھکو ہے تم سے سروکار　　چھوڑ دوں آج وفا گر ہو وفا سے بیزار
وہ جلے محفل دشمن میں جو ہو شمع لقا　　مجھ کو چھیڑا نہ کرو تم سے کہا ہے سو بار
آپ دیکھا، نہ سنا اور سے اپر جھوٹ نہیں　　تیری آنکھیں کہے دیتی ہیں نہ کر نا انکار

جوش وحشت ہے یہ ناصح نہ پنھانا زنجیر　　دیکھ دیوانہ تھا میں نہیں پابند رسوم
نوجواں جب کوئی جاتا ہے جہاں سے ناشاد　　تازہ ہوتا ہے مجھے داغ امید مرحوم
کر دیا خواہش بیداد نے احوال تباہ　　تو تو ظالم نہیں زنہار یہ میں ہوں مظلوم
جب منایا مجھے اس نے وہی الفت وہی دل　　یہ غلط ہے کہ اعادہ نہیں بہر معدوم

اسی کے ساتھ جب شوکت الفاظ اور رفعت خیال کی طرف توجہ کرتے ہیں تو بہتر سے بہتر قصیدہ گو شعراء کے صف میں بھی ممتاز نظر آتے ہیں

ثبوت میں وہ قصیدہ ملاحظہ کیجئے جو اس مقطع سے شروع ہوتا ہے۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا، ہے وہی تیرہ اختری — کثرت دود سے سیہ شعلۂ شمع خاوری

مومن کی مثنویاں خاص چیز ہیں اور ان میں انھوں نے اپنی جولانی فکر کی پوری آزادیاں دکھائی ہیں ان کا ذکر کسی تفصیل کے ساتھ بیان کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ وہ یوں بھی ہر دیکھنے والے سے اپنی داد طلب کر لیتی ہیں۔

ان کی کلیات میں علاوہ غزل، قصیدہ، مثنوی کے تضمین، ترجیع بند، تخمیس، قطعات، رباعیات، تاریخیں اور معمے بھی نظر آتے ہیں اور سخت سے سخت نقاد بھی ان کو کسی جگہ سے گرا ہوا ثابت نہیں کر سکتا۔

پھر چونکہ مومن کے ہاں ہر رنگ کا کلام اور تمام اصناف سخن میں سے ہر صنف تکمیل کے ساتھ موجود ہے اسی لئے میں نے مضمون کی ابتدا میں جو عرض کیا تھا، اسی کا اعادہ میں اخیر مضمون میں بھی کروں گا کہ "اگر میرے سامنے تمام شعرا کا کلام رکھ کر صرف ایک کے انتخاب کی اجازت دیجائے تو بلا تامل کلیات مومن اٹھا لونگا"

نیاز فتحپوری

ملاحظات

نگار کی یہ اشاعت جیسا کہ اعلان کیا گیا تھا، اشاعت خصوصی ہے مومن و کلام مومن کے لئے اور ہر چند ۶۰ صفحات میں سوائے اسی ایک ذکر کے اور کوئی بات موضوع سے الگ نہیں لکھی گئی، لیکن مجھے اب بھی کلام ہے کہ مومن کی شاعرانہ خصوصیات کو نمایاں کرنے کی خدمت کسی حد تک ادا ہو سکی ہے یا نہیں۔

مومن کے متعلق کافی مضامین موصول ہوئے، لیکن سوائے ان تین مقالات کے جو شائع کئے جا رہے ہیں اور کوئی قابل اندراج نہ تھا البتہ جناب عشرت رامپوری کا مضمون صرف اس لئے درج نہ ہو سکا کہ جگہ پُر ہو چکی تھی۔

سب سے زیادہ اہم مضمون ہمارے عزیز دوست سید امتیاز احمد بی اے (علیگ) کا ہے جس میں انھوں نے پوری محنت و کاوش سے مومن کی اردو شاعری کی تمام خصوصیات پر کافی روشنی ڈالی ہے اور وہ ہدیۂ مختصر جو بہترین مضمون کے لئے نگار کی طرف پیش کیا جانے والا تھا صاحب موصوف کی خدمت میں پیش کر دیا گیا ہے۔

دوسرا مضمون جناب مرزا جعفر علی خان صاحب بی اے اثر لکھنوی کا ہے، جو نہ صرف اچھے سخن گو بلکہ بلند نظر سخن فہم بھی ہیں میں ممنون ہوں کہ آپ نے باوجود کثرت مشاغل و فقدان فرصت اس بزم میں شرکت منظور فرمائی

تیسرا مضمون، صدیق عزیز حضرت آسی کی دماغی جستجو کا نتیجہ ہے آپ نے مومن و غالب کے موازنہ میں بعض بعض جگہ خوب داد تاویل دی ہے اور مومن کی روح کو خوش کرنے کے لئے ہر امکانی سعی سے کام لیا ہے۔ میں نے اپنے لئے صرف شروع کے آٹھ صفحے خالی رکھے تھے، لیکن بات میں بات بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ملاحظات کے لئے بھی مشکل سے دو صفحہ کی گنجائش نکل سکی۔ چونکہ امتیاز صاحب کا بسیط تنقیدی مضمون موجود تھا اس لئے میرا تمہ "ایک سرسری نگاہ" سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

تصویر مومن جو شائع کی جا رہی ہے، وہی ہے جو اکتوبر کے رسالہ اردو میں شایع ہو چکی ہے۔ اصل تصویر ایک ایسے شخص کے پاس ہے جو خاندان مومن سے تعلق رکھتے ہیں اور نقاشی ہے خواجہ بدر الدین خان عرف خواجہ امان مترجم بوستان خیال کی جو مومن کے نہ صرف عزیز بلکہ عزیز دوست بھی تھے۔

خواجہ امان دہلی کے مشہور نقاش خاندان محمد فضل کے شاگرد تھے اور خود بھی نہایت مستند نقاش و مصور تھے۔ اس تصویر میں سر سے لیکر سینہ تک کا حصہ بالکل وہی ہے جو اصل تصویر میں پایا جاتا ہے لیکن طریقہ نشست کو بدل دیا گیا ہے کیونکہ دہلی کے مصور تصویر کا

چہرہ لاجواب بناتے تھے، مگر ہاتھ پاؤں ایسے بناتے تھے جیسے لکڑی کے ہوں اس لئے زمانۂ موجودہ کے مذاق کا خیال کرکے اُن میں تبدیلی پیدا کردی گئی ہے"۔ یہ بیان ہے جناب مرزا فرحت اللہ بیگ بی اے کا جو مالک ہیں تصویر مومن کے اس لئے تصویر کی صحت میں کلام نہیں ہوسکتا، لیکن میرے نزدیک بہتر ہوتا اگر ہاتھ پاؤں میں بھی کوئی تغیر پیدا نہ کیا جاتا۔

جناب عزیز لکھنوی نے مومن کی جس تصویر کے دینے سے انکار فرمایا تھا، وہ بھی بعد کو دریافت سے معلوم ہوا کہ بالکل یہی ہے، اسلئے مجھے ممنون ہونا چاہئے صاحب موصوف کے احتراز کا ورنہ خواہ مخواہ مجھے ازسرنو بلاک بنوانے کی زحمت برداشت کرنی پڑتی۔

آیندہ ماہ میں جناب آرگس کا ایک مضمون جس میں انھوں نے غالب کو بے نقاب دکھایا ہے قابل ملاحظہ ہوگا۔

جناب امین سلونوی جو اس سے قبل رسالہ نظر لکھنؤ کے فرائض ادارت انجام دے رہے تھے، دسمبر سے نگار کے حلقۂ تنظیم میں شامل ہوگئے ہیں اور شروع جنوری سے آپ بہ سلسلۂ توسیع اشاعت ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کریں گے اُمید ہے کہ ارباب ذوق اُن کی پذیرائی فراخدلی کے ساتھ کرینگے۔

میں بے انتہا شرمسار ہوں ان حضرات سے جن کے مضامین (اور اہم مضامین) اسوقت تک شائع نہیں ہوسکے، خیال کیا یقین تھا کہ اس ماہ کی ضخامت اُن میں سے بعض کی اشاعت کی متحمل ہوسکیگی، لیکن مومن کی رشک پسند طبیعت نے اجازت نہ دی کہ سوائے اُن کے کسی اور کا ذکر ان کی بزم میں شامل ہو اس لئے میرا وہ ارادہ پورا نہ ہوسکا، تاہم اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ خصوصیت بھی نگار کی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ اس نے اردو کے ایک ایسے شاعر کے متعلق جو باوجود بہترین سخنگو ہونے کے، اس وقت تک حد درجہ کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوا تھا، اس قدر معلومات فراہم کردیں کہ اس سے قبل ایک شیرازہ کے اندر کہیں نظر نہ آسکتی تھیں۔ کلام مومن کے حصۂ غزلیات کا انتخاب بھی اسی لئے دیدیا گیا، کہ ایک شخص کو جنوری کا رسالہ حاصل کرنے کے بعد مومن کے متعلق کسی امر میں تشنگی باقی نہ رہے۔ انتخاب میں ہر ذوق کا لحاظ رکھا گیا ہے اور امید ہے ......کہ پسند کیا جائے گا. ہرچند یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ مومن کا ہر اچھا شعر اس میں آگیا ہے، ممکن ہے کہ کوئی رہ گیا ہو لیکن یہ یقینی ہے کہ کوئی خراب شعر انتخاب میں آپ کو نظر نہ آئے گا۔

نیاز فتحپوری

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

جلد ۱۳ - شمار ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ کو شائع ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول عہ

فہرست مضامین سنہ ۱۹۲۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۳)　　فروری سنہ ۱۹۲۸ء　　شمار (۲)

ملاحظات

گزشتہ ماہ کے رسالہ نے جہاں "گوش سخن شنو" اور "دیدۂ اعتبار" کی کیفیتیں دیکھیں، وہیں بعض کی "چین پیشانی" کا بھی منظر سامنے آیا۔ اس پر بجائے شکریہ کے مجھے صرف اظہار مسرت کرنا ہے اور اس کو یہ کہکر ختم کر دینا کہ "سخن شناس نۂ دلبرا" بہرحال مجھے ہنوز یہی حجاب دامنگیر ہے کہ مومن کی شاعری کے متعلق اب تک اپنے حوصلہ کے مطابق کچھ نہیں کر سکا۔

خیال تھا کہ مومن کے متعلق بعض وہ مضامین جو جگہ کی کمی کی وجہ سے شائع نہیں ہوسکے فروری میں درج کر دئے جائیں گے لیکن میں نے یہ خیال ترک کر دیا، کیونکہ بار بار ایک ہی موضوع کی تکرار بھی بے لطف سی بات ہے۔ بعض وہ حضرات جو جنوری کے رسالے سے خائف ہوگئے ہیں امید ہے کہ اب یہ سنکر مطمئن ہوجائیں گے۔

اس مہینے کے مضامین میں ہمارے عزیز دوست جناب زور ام اے کا مضمون سلطان محمود غزنوی کے علم و فضل اور اس کی علم پرستیوں کے متعلق بہت دلچسپ و پر از معلومات ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے بعض ایسے مسائل پر بھی مخالف روشنی پڑتی ہے، جو اس وقت تک حقائق مسلمہ میں داخل تھے۔

جناب زور اس وقت ولایت میں تحقیق لسانیات کے لئے مقیم ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ بہت جلد ملک اُن کے اکتسابات علمیہ سے فائدہ اُٹھائے گا۔

دوسرا مضمون "افسانۂ اردو" جناب اقدس حیدرآبادی کا ہے جس میں دکن کے ایک پُرانے شاعر عاجز کا تذکرہ اور انکا کلام پیش کیا گیا ہے مجھے اس سے اختلاف ہے کہ عاجز اگر میر کے معصر ہوتے تو اُن کے ہمصفیر بھی تھے۔ عاجز کو میر کے رنگ کلام سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

تاہم جناب اقدس حیدرآبادی کے ہم ممنون ہیں کہ اُن کے ذریعہ سے اردو کے ایک ایسے شاعر کے حالات اور اشعار شائع ہوسکے جن سے لوگ بہت کم یا بالکل آگاہ نہ تھے۔

اس مضمون کا عنوان "افسانۂ اردو" اسی وقت موزوں ہوسکتا ہے جب ایک سے زیادہ ایسے قدیم اور نامعلوم شاعروں کے حالات اسی سلسلہ میں شائع ہوجائیں — ہمیں یقین ہے کہ جناب اقدس اس عنوان کے صحیح مفہوم سے باخبر ہوں گے۔

تیسرا مضمون "پریم کی چوڑیاں" جناب اعظم کریوی کا افسانہ ہے اور اس قدر لطیف و پُراثر ہے کہ اُس کو پڑھکر دیر تک مجھ پر کیفیت طاری رہی۔ گاؤں کی معاشرت کو پیش نظر رکھکر افسانہ لکھنا آسان نہیں، اور اس سے وہی شخص عہدہ برآ ہوسکتا ہے جو نہ صرف وہاں کی زندگی سے آشنا، بلکہ اس زندگی کی صحیح روح اور معصوم کیفیات سے بھی باخبر ہو۔ میں جناب اعظم کریوی کو مشورہ دونگا کہ چونکہ وہ اس مخصوص موضوع پر افسانے لکھنے کی بہت کچھ اہمیت اپنے اندر رکھتے ہیں اسلئے انھیں اسی میں کمال بہم پہونچانے کی سعی کرنی چاہئے

"غالب بے نقاب" وہی موعودہ مضمون ہے جس کا ذکر جنوری کے رسالہ میں کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ بھی جناب قبلہ آرگس کا ہے جو اس سے قبل حافظ اور ابن یمین کے متعلق آتش افشانی کرکے اپنے کو بجا اور مجھے بالکل بیجا طور پر زمانہ کا نشانۂ ملامت بنا چکے ہیں۔ مانا کہ جناب آرگس، "آرگس ہی کی طرح ہزار چشم سہی لیکن یہ کیا تماشا ہے کہ اُن کی ہزار آنکھوں میں سے ایک نگاہ بھی "صلح جو" نہیں نکلتی۔ اس میں کلام نہیں کہ انھوں نے اس مضمون میں بہت کچھ اپنا سرمایۂ تحقیق سامنے رکھدیا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ غالب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو اساتذۂ قدیم کے خیالات سے متاثر ہونے کے بعد لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، مگر یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ غالب باوجود اس "کشف حجاب" کے بھی غالب ہے اور اس کے شاعرانہ ابداعات اپنی جگہ بالکل عنصر غیر فانی کی حیثیت رکھتے ہیں مجھے اکثر جگہ جناب آرگس سے اختلاف ہے۔ اگر یہ بحث لطیف چھڑ گئی تو اُس وقت تفصیل کے ساتھ عرض کرونگا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ بعض حضرات اس مضمون کو بھی "حافظ اور ابن یمین" کے مضمون کی طرح میری ہی طرف منسوب نہ کردیں۔

مثنوی زہر عشق کی وجہ تصنیف کے متعلق جناب احسن لکھنوی کا مضمون ایک ایسا انکشاف ہے جو اس سے قبل بالکل تاریکی میں تھا ہم جناب احسن کے ممنون ہیں کہ انھوں نے تاریخ ادب کے ایک مختصر مگر ضروری واقعہ سے آگاہ کردیا۔

میرے مضامین میں چنگاری ایک افسانہ ہے جس کے افراد کا اس نمبر میں تعارف کرا دیا گیا ہے۔ میں ابھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ آئندہ اشاعت میں ختم ہو جائیگا یا نہیں، کیونکہ جس خیال کو پیش نظر رکھکر اس کی بنیاد ڈالی گئی ہے وہ تدریجی وضاحت چاہتا ہے اور ممکن ہے کہ وہ اس کو دو نمبروں تک کھینچکر لیجائے۔ ڈائری کا ورق بھی گویا ایک افسانہ ہی کا حصہ ہے جس کے باقی حصے آئندہ نمبروں میں شائع ہوکر ایک مکمل افسانہ کی صورت اختیار کریں گے۔

استفسارات کے سلسلہ میں اس مرتبہ حضرت یوسفؑ کے حسن وجمال پر بحث کی گئی ہے۔ اگر کوئی صاحب میرے دعوے کے خلاف کلام مجید سے حسن یوسفی کو ثابت کر دیں گے تو دنیائے شعر وادب" کی بڑی خدمت انجام دیں گے، مجھ سے تو یہ خدمت ادا نہیں ہوسکتی۔

جاوید مرحوم کی شاعری کے متعلق سلسلۂ کلام میں لکھنؤ اور دہلی کے رنگ شاعری پر بھی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ پڑ گئی ہے۔ کیونکہ یہ بحث خواہ کتنی ہی پارینہ کیوں نہ ہو اس وقت تک نہیں مٹ سکتی جب تک دنیا میں حقیقت و مجاز کا مسئلہ زندہ ہے۔

جناب اختر شیرانی اس دوران میں لکھنؤ آئے اور مجھے بھی انھوں نے کافی ستایا۔ ان کی نظم لکھنؤ کی اس فضا کی یاد میں ہے جہاں کی راتوں میں اب بھی بہت سے کبھی نہ طلوع ہوسکنے والے "چاند" جگمگایا کرتے ہیں، گو میرا تعلق ان سے ایسا ہی بعید کیوں نہ ہو جیسا جناب اختر کا تعلق اُس "حسن نازنیں" سے جس کی خلش کو وہ "یادگار لکھنؤ" سمجھتے ہیں۔ خدا کرے یہ سب "جوانی" کا جھوٹ ہو

مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے اپنی غزل اب سے بچاس سال قبل پیچھے ہٹ کر کہی ہے اور وہ بھی دہلی کی سرزمین میں ساری غزل ایک رنگ وکیفیت کی ہے اور مرزا صاحب کے میر پرستی کا عملی ثبوت۔ اور حضرات کی غزلیں بھی اچھی ہیں اور بعض بعض شعر تو نہایت پاکیزہ ہیں۔ جن احباب کی نظمیں یا غزلیں ابھی تک شائع نہیں ہوئیں وہ آئندہ رسالہ کا انتظار فرمائیں۔

آئندہ ماہ سے ایک سلسلہ نہایت ہی مفید و لطیف ظریف شعراء کے تذکرہ کا شروع کیا جائے گا جو بعد کو مستقل کتابی صورت میں شائع ہوگا۔ بعض اور اہم مضامین بھی زیر ترتیب ہیں

بعض احباب کے شدید اصرار پر اڈیٹر کی تصویر ماہ آئندہ کے رسالہ میں شائع کی جائے گی۔

نیاز فتحپوری

سلطان محمود غزنوی اور علم و فضل

سلطان محمود غزنوی کی ہستی کے متعلق اب تک متفرق غلط فہمیاں باقی ہیں، اس کی زندگی کا سیاسی پہلو متعدد شکایتوں کا آماجگاہ بنا رہا اور اسی لحاظ سے اس کی شخصیت مختلف النوع تعصبات کے لئے تختۂ مشق کا کام دیتی رہی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ جہاں اُس کی سیاسی کارگزاریوں کی تحقیق و تفتیش میں خاص طور پر سرگرمی دکھائی جاتی ہے، علمی خدمات کی طرف بہت کم کوئی توجہ کرتا ہے۔ اُس کی سب سے بڑی وجہ تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ محمود کو صرف ایک ثروت پسند اور جنگجو فرمانروا تصور کر لیا گیا ہے اور اس لئے اس سے علمی و ادبی ہمدردانی کی امید رکھنا اس کی شخصیت کے ساتھ ناانصافی کرنا خیال کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ اس کی ذات پر بہت بڑا ظلم ہے۔ محمود نہ صرف ایک ثروت پسند اور آزادہ رو بادشاہ تھا جیسا کہ عام طور پر اُس کو قرار دیا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُس نے دل بہلانے اور تعریف کے خاطر عالموں، فاضلوں اور شاعروں کی قدر کی بلکہ وہ خود بھی ایک پایہ کا شاعر اور بلند مرتبہ عالم تھا۔ اس نے اپنے زمانہ کے بڑے بڑے علما اور کاملین فن سے علوم شرعیہ کی تحصیل کی تھی۔ علامہ ابی الوفا القریشی المتوفی ۷۷۵ھ نے اسے ائمۂ فقہا میں شمار کیا ہے۔ حدیث فقہ میں اُس نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک "کتاب التفرید" نہایت مشہور ہے اور فقہ احناف کی کتب مستندہ میں شمار ہوئی ہے۔ اس میں ساٹھ ہزار مسائل مذکور ہیں[۱]

محمود عربی و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتا تھا۔ موشیو نے اپنی کتاب "منتخبات فارسی" (دیکھو گرسٹائی دیبر سال جلد دوم صفحہ ۲۵) میں "محمود نامہ" کو سلطان محمود غزنوی ہی سے منسوب کیا ہے۔ اگرچہ یہ غلط ہے لیکن محمود کے متفرق اشعار اب بھی موجود ہیں جن سے اس کے ایک اعلیٰ شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً بزم آرائے عنصری کی بیاض سے جو خود عنصری کے قلم سے لکھی ہوئی تھی محمود کی غزل مرقوم ہے:-[۲]

من گرد دل خویش ہوائے تو تنیدم	با مہر تو پیوستم و از خویش بریدم
دیگر ز بتاں چوں تو ندیدم ز پے آنک	بُت نیست بجائے کہ من آنجا نرسیدم
با من نخیند آن کہ چرا اوکس نہ گرفتم	نگرفت سر زلف تو ہر چند خچیدم
چون زلف شدم دست و چو بتخانہ شدم بلکہ	چون زلف تو کا دیدم و چوں روئے تو

[۱] ان معلومات کے مآخذ حسب ذیل ہیں:-
[۲] شعر العجم شبلی نعمانی جلد اول صفحہ ۴۲
[۳] لباب الالباب محمد عوفی حصہ اول صفحہ ۲۹۳ تا ۲۹۴
[۴] آثار الکرام مطبوعہ اردو صفحہ ۲۷۵

گفتم کہ یکے بندہ خریدم بدام من   نے نے غلط است ایں کہ خداوند خریدم

محمد عوفی نے شاہی شعرا میں محمود کا ذکر دوسرے نمبر پر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "غرض از تقریر ایں فصول آن است کہ او را طبع شعر بودہ است" (دیکھو لباب حصہ اول صفحہ ۲۴) گلستان نامی ایک کنیز تھی سلطان کو اس سے دلی محبت تھی جب اس کا انتقال ہوا تو محمود نے ذیل کا مرثیہ لکھا:-

چوں تو اے ماہ زیر خاک شدی   خاک را بر سپہر فضل آمد
دل جزع کرد گفتم اے دل صبر   این قضا از خدائے عدل آمد
آدم از خاک بود خاکی شد   ہر کہ زو زاد باز اصل آمد

سلطان محمود نے اپنی وفات کے قریبی زمانہ میں یہ نہایت مشہور قطعہ لکھا جسکو متاخر تذکرہ نویسوں نے اوروں کی طرف منسوب کر دیا ہے:-

ز بیم تیغ جہانگیر و گرز قلعہ کشائے   جہاں مسخر من شد چو تن مسخر رائے
گہے بعز و بدولت ہمی نشستم شاد   گہے ز حرص ہمی رفتمی ز جائے بجائے
بے تفاخر کردم کہ من کسے ہستم   کنوں برابر بینم ہمی امیر و گدائے

....

ہزار قلعہ کشادم بیک اشارت دست   بسے مصاف شکستم بیک فشردن پائے
چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نکرد   بقا بقائے خدا است و ملک ملک خدائے[51]

ان اشعار کو دولت شاہ نے سلطان سنجر سلجوقی سے منسوب کیا ہے۔[52]

ایتھے کا خیال ہے کہ کچھ غزلیں بھی محمود غزنوی سے منسوب پائی جاتی ہیں لیکن ان کے متعلق شبہ ہے کہ آیا وہ محمود غزنوی کی بھی ہیں یا نہیں؟ افسوس ہے کہ موجودہ تاریخوں سے کوئی ایسا ٹھوس مواد حاصل نہیں ہو سکتا جس کے ذریعہ سے ہم محمود کی ذاتی لیاقت اور ذوق علم کا صحیح اندازہ لگا سکیں اور اس پر کافی بحث کریں اگر ابو الفضل بیہقی کی تاریخ یمینی، یا مقامات محمودی یا تاریخ محمودی، تاج الفتوح، مقامات ابو النصر مشکان، تاریخ ملا محمد غزنوی اور تاریخ محمود وراق موجود ہوتیں تو ہم کو محمود کی ذات کے متعلق بہت کچھ معلومات دستیاب ہوتیں تاہم اب بھی کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ محمود خود بھی ایک شاعر اور عالم شخص تھا۔[53]

محمود کی زندگی کے علمی و ادبی پہلو کے متعلق جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ سب سے پہلے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ عالموں شاعروں کا حقیقی قدر دان نہ تھا بلکہ انھیں اپنی شہرت کے بھینٹ چڑھایا کرتا تھا۔ اس بارے میں پروفیسر براؤن جیسا محقق اور سنجیدہ مذاق رکھنے والا شخص بھی جادۂ اعتدال و انصاف سے ہٹ گیا ہے۔[54] محمود کی اس قسم کی طرز عمل کی مثال ابوریحان بیرونی کے اس واقعہ سے دکھائی

[51] ماخوذ از تنقید شعر العجم محمود شیرانی۔ مطبوعہ اردو جلد دوم حصہ ہشتم صفحہ ۵۰۸   [52] دیکھو براؤن کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحہ ۱۱۷

[53] ان کتابوں کے لکھنے کے متعلق خود بیہقی نے اپنی تاریخ مسعودی میں ذکر کیا ہے اگرچہ وہ اب کہیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ دیکھو تاریخ بیہقی مصحح مارلے مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۲ء صفحات ۱۵۰ اور ۱۶۷

[54] دیکھو لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحات ۱۹۵ اور ۱۵۲۔

جو چہار مقالہ کی ایک حکایت میں بیان کیا گیا ہے کہ :-

"یمین الدولہ سلطان محمود بن ناصر الدین شہر غزنین بر بالائے کوشکے در چہار دری نشستہ بود بباغ ہزار درخت روے با بوریحان کرد و گفت من ازیں چہار در از کدام در بیرون خواہم رفت حکم کن واختیار آں بر پارۂ کاغذ نویس و در زیر نہالی کن نہ - وایں ہر چہار در راہ گذر داشت ابوریحان اسطرلاب خواست و ارتفاع بگرفت : طالع راست کرد و ساعتی اندیشہ نمود و بر پارہ کاغذ بنوشت - و در زیر نہالی نہاد - محمود گفت حکم کردی - گفت کردم - محمود فرمود تا کندہ و تیشہ و بیل آوردند، بر دیوارے کہ بجانب مشرق ست درے پنجمین بکندند و ازاں در بیرون رفت و گفت آن کاغذ پارہ بیاوردند - بوریحان بروے نوشتہ بود کہ ازیں چہار در ہیچ بیروں نشود بر دیوار مشرق درے کنند و ازاں در بیروں شود - محمود چوں بخواند طیرہ گشت - گفت او را بمیاں سرائے فرو اندازند - چناں کردند مگر بابام میانگین دامے بستہ بود بوریحان براں دام آمد ودام بدرید و آہستہ بر زمین فرود آمد - چنانکہ بروے افگار نشد - محمود گفت او را برآرید برآوردند گفت یا بوریحان ازیں حال باری ندانستہ بودی؟ گفت اے خداوند! دانستہ بودم گفت دلیل کو؟ غلام را آواز داد و تقویم از غلام بستد و تحویل خویش از میاں تقویم بیروں کرد - در احکام آں روز نوشتہ بود کہ مرا از جائے بلند بیندازند و لیکن بسلامت بزمین آیم و تندرست بخیزم این سخن نیز موافق رائے محمود نیامد طیرہ تر گشت - گفت او را بقلعہ باز دارید - او را بقلعہ غزنین باز داشتند و شش ماہ دراں حبس بماند"

اسی کے سلسلہ میں ایک دوسری حکایت بھی پیش کی گئی ہے جس میں محمود ابوریحان کو قید خانہ سے بلا کر معافی چاہتا ہے اور انعام و اکرام سے سرفراز کرکے کہتا ہے کہ "یا بوریحان! اگر خواہی کہ از من برخوردار باشی سخن بر مراد من گو نہ بہ سلطنت علم خویش"

اس واقعہ کے صحیح یا جھوٹ ہونے کے متعلق فی الحال کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ ضرور ہے کہ یہ حکایت نہایت شک آمیز ہے اور بہت ممکن ہے کہ غلط ہو - اس کی وجہ یہ ہے کہ نظامی عروضی نے چہار مقالہ میں اس سے زیادہ غلط امور قلمبند کر دئے ہیں نہ صرف سنی سنائی باتوں اور قصہ کہانیوں بلکہ تاریخی امور میں بھی نظامی نے جگہ جگہ نہایت بے موقع اور لغو واقعات لکھے ہیں - مرزا محمد قزوینی نے چہار مقالہ (مطبوعہ گب موریل سیریز) پر جو مقدمہ لکھا ہے اسمیں نظامی کی جن غلطیوں کو پیش نظر کر دیا ہے اُن کے کچھ نمونے ہم یہاں نقل کرتے ہیں جن پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ نظامی نے کس قسم کی اہم تاریخی غلطیاں کی ہیں :-

(۱) ابوالقاسم علی بن محمد اسکافی نیشاپوری کو نوح بن نصر بن احمد سامانی کا وزیر لکھا ہے حالانکہ وہ اس کے دادا نوح بن نصر کا

وزیر تھا۔ اور اس کے جلوس سے بیس سال قبل ہی انتقال کر چکا تھا۔ (دیکھو چہار مقالہ صفحات ۱۲ - ۱۶ - اور ۱۰۳)

(۲) الپتگین بانی خاندان غزنویہ کو متذکرہ بالا نوح بن منصور کا معاصر قرار دیا ہے حالانکہ وہ بھی نوح کے جلوس سے ایک عرصہ قبل ہی انتقال کر چکا تھا۔ (دیکھو صفحات ۱۳ - ۱۴، ۱۰۳ اور ۱۰۴)

(۳) یہ فرض کیا ہے کہ سبکتگین نے مجبوریوں سے ملک خراسان پر لشکر کشی کی اور الپتگین سے جنگ کی حالانکہ الپتگین اس واقعہ سے تقریباً بیس سال قبل ہی وفات پا چکا تھا اور اس وقت بھی خود سبکتگین نے مجبوریوں سے جنگ کی تھی نہ کہ ان سے ملک کسی اور کا مقابلہ کیا یہ نہایت مشہور تاریخی واقعہ ہے (صفحات ایضاً)

(۴) سامانیوں کے ایک مشہور سردار ابوعلی احمد بن محتاج چغانی کو (علاوہ ان غلطیوں کے جو اس کے نام شہر اور منصب کے متعلق کی ہیں اور اس کو ابوالحسن علی بن محتاج کسانی حاجب الباب لکھا ہے) نوح ابن منصور سامانی کا معاصر خیال کیا ہے حالانکہ وہ نوح کے جلوس سے بائیس سال قبل مر چکا تھا (صفحات ۴، ۱۰۴، ۱۰۵)

(۵) سامانیوں کے اس لشکر کے سردار کو جس نے ماکان بن کاکی سے جنگ کی اور اس کو مار ڈالا "تاش سپہ سالار" کے نام سے موسوم کیا ہے حالانکہ تمام مورخین اسپر متفق ہیں کہ اس جنگ میں ابوعلی بن محتاج چغانی سپہ سالار تھا (صفحات ۱۵، ۱۶، ۱۰۶)

(۶) حسن بن سہل کو اس کے بھائی فضل بن سہل سے ملا دیا اور حسن کو ذوالریاستین لکھا ہے حالانکہ یہ اس کے بھائی فضل کا لقب تھا۔ بوران زوجۂ مامون رشید کو فضل بن سہل کی دختر قرار دیا ہے حالانکہ وہ اس کے بھائی حسن بن سہل کی لڑکی تھی (صفحات ۱۹، ۱۰۹، ۱۱۰)

(۷) سلطان مسعود سلجوقی اور سلطان سنجر میں اشتباہ کر دیا ہے۔ اور المسترشد باللہ کی لشکر کا مقصد سلطان سنجر سے جنگ کرنا قرار دیا حالانکہ تمام مورخین اسپر متفق ہیں کہ المسترشد سلطان مسعود سے جنگ کرنے نکلا تھا نہ کہ سلطان سنجر سے (صفحات ۲۱ - ۲۲، ۱۰۷)

(۸) ایلک خان کو جو ماوراء النہر کے ملوک خانیہ سے تھا بغراخاں کے نام سے یاد کیا ہے اور بغراخاں کو سلطان محمود کا معاصر قرار دیا ہے حالانکہ اس کا معاصر ایلک خاں تھا (صفحات ۲۴ - ۲۵، ۱۲۱ - ۱۲۳)۔

(۹) مسعود سعد سلمان کے متعلق کئی تاریخی غلطیاں کی ہیں جسکے متعلق مرزا محمد قزوینی نے حواشی میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے (صفحات ۴۴، ۴۵، ۱۶۸ - ۱۸۲)

(۱۰) ایک جعلی شخصیت موسوم بہ امیر شہاب الدین قتلمش الب غازی (دیکھو صفحہ ۴۵) کا جہاں ذکر کیا ہے تو ایک دو سطروں ہی میں پانچ سات ایسی غلطیاں کر دی ہیں کہ اُن کی اصلاح ناممکن سی معلوم ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ مصنف نے اُس کو اپنے ذاتی تجربہ کے طور پر لکھا ہے۔

(۱۱) یعقوب ابن اسحٰق کندی کو جو فیلسوف عرب کے نام سے مشہور ہے جسکے آباؤ اجداد مشہور ترین مسلمانوں میں سے اور خلفائے بنی امیہ و بنی عباس

کے معتمد حاکم اور عامل تھے اور جس کے جد امجد اشعث بن قیس حضرت رسول خدا صلعم کے صحابہ میں سے تھے یہودی قرار دیا ہے اور اسی بیہودہ بنیاد پر ایک طویل حکایت لکھی ہے جو اول سے آخر تک غلط اور لایعنی باتوں سے بھری ہوئی ہے (دیکھو صفحہ ۵۵۔ ۵۶، ۲۰۳، ۲۰۴)

(۱۲) خواجہ نظام الملک طوسی کا قتل بغداد میں ظاہر کرتا ہے حالانکہ وہ نہاوند میں قتل ہوا۔ (دیکھو صفحہ ۹۶ اور ۲۴۰)

(۱۳) مشہور سلطان طبیب محمد بن ذکریا رازی کو منصور بن نوح سامانی کا وزیر لکھدیا ہے حالانکہ وہ منصور کے سنہ جلوس سے تقریباً تیس سال قبل وفات پا چکا تھا۔ اسی باطل بنیاد پر ایک بڑی حکایت لکھی ہے جو سرتاپا بیہودگیوں سے معمور ہے (صفحات ۴۳، ۴۷، ۲۴۵، ۲۵۱)

(۱۴) ابو علی ابن سینا کو علاء الدولہ کا وزیر قرار دیا ہے حالانکہ وہ شمس الدولہ کا وزیر تھا اسی طرح اسی کا مقام وزارت ہمدان قرار دیا ہے حالانکہ وہ رے میں وزیر ہوا تھا۔

غرض جس شخص نے مشہور تاریخی واقعات کے متعلق اس قدر فاش غلطیاں کی ہیں (جن میں سے بعض کو وہ اپنا ذاتی تجربہ بھی قرار دیتا ہے) اس سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ ابوریحان کے واقعہ میں صحت کا لحاظ رکھتا بہت ممکن ہے کہ ابوریحان یا کسی دوسرے حکیم یا منجم کے ساتھ کسی اور بادشاہ نے اس قسم کا سلوک کیا ہو اور نظامی تک روایت اس طرح پہونچی ہو یا خود اُس نے اس کو اس طرح لکھدیا ہو۔

دوسرے قسم کا اعتراض جو محمود پر کیا جاتا ہے وہ اس کا بخل ہے۔ اس کے متعلق ابن اثیر نے چند پر لطف قصے نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے کردار میں صرف ایک چیز خراب ہے جو اس کا لالچی اور بخیل ہونا ہے۔ اسی قسم کے اعتراض میں فردوسی کا مشہور عالم فسانہ بھی آجاتا ہے۔ لیکن متذکرہ بالا قصہ کی طرح فردوسی کے واقعہ کے متعلق بھی کوئی قطعی تصفیہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات ضرور ہے کہ فردوسی محمود کے دربار سے نامراد واپس گیا۔

اس کا اصلی سبب محمود غزنوی کا بخل تھا یا یہ قصہ بھی پہلے قسم کے اعتراضوں میں شامل ہے اس کی نسبت کسی ایک رائے تک پہونچنے کے لئے ہماری موجودہ معلومات ناکافی ہیں اگر بفرض محال ہم ان دونوں قصوں کو صحیح بھی تسلیم کریں تو ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کا محمود کے عام کردار اور علمی احسانات پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

اگر اسوقت ہمارے علمی ذخیرہ میں محمود کے زمانہ کی تاریخیں محفوظ رہتیں تو ہم محمود کی فیاضی، سرپرستی، علوم و فنون اور قدردانی شعرا کے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کرتے تاہم اس قسم کی جس قدر بھی معلومات ہمیں دستیاب ہو سکتی ہیں انہی کے ذریعہ سے ہم یہاں محمود کے متعلق اعتراضات پر بحث کریں گے۔

(۱) ابوالفضل بیہقی نے ابوالخیر خمار نصرانی کے متعلق لکھا ہے کہ "سلطان محمود با او در نہایت اکرام و غایت تجلیل اختیار نمود بحدیکہ گوئید زمین را در مقابل او بوسید" تعجب ہے کہ محمود ایک نصرانی حکیم خمار کی تو اس قدر قدر و منزلت کرے اور ابوریحان اور فردوسی کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آئے۔

(۲) عضائری غزنین آنے سے پہلے جب بہاءالدولہ بویہ کے دربار میں تھا تو ہر سال محمود کی خدمت میں ایک قصیدہ روانہ کیا کرتا تھا جس کے صلہ میں محمود اس کو ایک ہزار دینار عطا کیا کرتا تھا۔

(۳) ایک دفعہ محمود کی فرمائش عضائری نے ایک رباعی لکھی جس کے صلہ میں سلطان نے دو ہزار دینار عنایت کئے اُسکے بعد عضائری نے ایک غزل پڑھی جو سلطان کو پسند آئی اور اس نے صلہ کو المضاعف کر دیا۔ اس عنایت کے شکریہ میں عضائری نے ایک مطول قصیدہ لکھا جسکا مطلع یہ ہے:—

اگر مراد بجاہ اندرست و جاہ بمال		مرا ببیں کہ ببینی جمال را بکمال

فرشتہ لکھتا ہے کہ جب یہ قصیدہ سلطان کے ملاحظہ میں پیش ہوا تو اس نے چودہ ہزار درم بھر عنایت کئے۔ اس عطیہ بے کراں کو دیکھ کر عنصری نے بے حد پیچ و تاب کھایا اور اسی قصیدہ کے جواب میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے

خدائگاں خراسان و آفتاب کمال		کہ وقف کرد بر او ذوالجلال عز و جلال

سلطان نے عنصری کو بھی اسی قدر قسم عنایت کی۔

(۴) عنصری کی بھی سلطان نے خاصی قدر و منزلت کی۔ ملک الشعرا کا خطاب دیکر دربار کے شاعروں کا افسر مقرر کیا اس کے جاہ و جلال اور دولت و ثروت کا یہ حال تھا کہ مشہور ہے کہ اس کا کھانا سونے چاندی کے برتنوں میں پکتا تھا اور جب وہ مکان سے باہر نکلتا تھا تو چار سو زرین کمر غلام اس کے ہم رکاب رہا کرتے تھے۔

(۵) چہار مقالہ میں لکھا ہے کہ عنصری نے جب یہ رباعی سلطان کے سامنے جاکر پڑھی ؎

کے عیب سر زلف بت از کاستن است		چہ جائے بغم نشستن و خاستن است
جائے طرب و نشاط و مے خواستن است		کاراستن سرو ز پیراستن است

تو سلطان کا سارا غم دور گیا اور اس نے حکم دیا کہ تین بار عنصری کا منہ جواہرات سے بھرا جائے۔ (دیکھو صفحات ۴۴-۴۵)

(۶) عنصری کی طرح فرخی بھی سلطان کی بزم ادب میں اس قدر سرفراز ہوا کہ جب باہر نکلتا بیس زریں کمر غلام اس کی سواری کے جلوس میں چلا کرتے تھے۔

ؔ عضائری کو جو انعامات محمودی دربار سے حاصل ہوئے ہیں ان کی تفصیل خزانہ عامرہ میں مذکور ہے۔

(۷) ۴۱۳ھ میں سلطان محمود نے قلعہ کالنجر کا محاصرہ کیا تو وہاں کے راجہ نندا نے ۳۰۰ ہاتھی دیکر صلح کرلی اور ہندی زبان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھکر سلطان کی خدمت میں روانہ کیا دربار میں ہند اور عرب و عجم کے جو علما تھے انھیں سلطان نے یہ قصیدہ سنایا سبھوں نے اس کی تعریف و توصیف کی تو سلطان نے اُس کے صلہ میں نندا کے تمام علاقے واپس کردئے اور علاوہ اس کے چودہ قلعوں کو اپنی طرف سے اُسے دیدیا۔[1]

(۸) محمود کی "پیل بار انعام بخشیاں" ضرب المثل کے طور پر ہوگئی تھیں۔ وہ ہاتھی بھر بھر اکر انعامات دینے کا عادی تھا۔ فارسی شاعری میں ایسی تلمیحیں موجود ہیں جن میں سلطان محمود کے انعامی ہاتھیوں کا ذکر آتا ہے نظامی فرماتے ہیں[2] ؎

مرا پیل بار از تو مقصود نیست		کہ پیل تو چوں پیل محمود نیست

عضائری ایک موقع پر رقمطراز ہے ؎

امید دارم کس بار صد ہزار تمام		بمن بیار د بر پائے پیل برقتیاں

ایک دوسری جگہ عضائری لکھتا ہے ؎

مرا دو بیت بفرمود شہریار جہاں		بر اں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال
دو بدرہ زر بفرستاد دو ہزار درم		بہ غم حاسد و تیمار بدسگال نکال

خاقانی عنصری کی دولتمندی کا ذکر کرتا ہے ؎

شنیدم کہ از نقرہ زد دیگداں		ز زر ساخت آلات خواں عنصری

انوری کہتا ہے ؎

چند گوئی عنصری را شعر نیکو آمدست		دولت محمود بود است آں نہ طبع عنصری

(۹) سلطان محمود اپنے دربار کے شعرا پر سالانہ چار لاکھ دینار صرف کیا کرتا تھا۔ ہر نئے شاعر کو اس کے دربار میں عزت کے ساتھ جگہ دیجاتی تھی وہ شاعروں کو دیکھکر خوش ہوتا تھا۔ فرخی کہتا ہے ؎

تو از دیدار ما ہم ہمچناں شاداں شوی شاہا		کہ ہرگز نیم از اں وامق نگشت از دیدن عذرا
طواف شاعراں بینم بگرد قصر تو ہر دم		ہمانا قصر تو کعبہ است و گرد قصر تو بطحا

کیا فیاضیوں کے ایک ایسے ناپید اکراں بحر مواج سے تشنہ لب جانا فردوسی کی بدقسمتی نہیں ہے؟ محمود کے نزدیک ۔ اس محمود کے نزدیک جس نے ابر نیساں بنکر شاعروں پر لکھو کھا اشرفیوں کی بارش کی ــــ ساٹھ ہزار اشرفیاں

---

[1] ماخوذ از آثار الکرام صفحہ ۹، ۳ جسمیں تاریخ فرشتہ اور طبقات اکبری سے مواد حاصل کیا گیا ہے۔
[2] دیکھو تنقید شعر العجم محمود شیرانی مطبوعہ اردو

دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن جب فردوسی کا ظرف قسمت ہی ایسا نہ ہو کہ ان کو حاصل کر سکے تو اُس کا کیا علاج ؟ یہ بھی دنیائے ادب کا ایک معمہ ہے کہ معمولی سے معمولی شاعر تو لکھو کھا روپے انعاموں میں حاصل کریں اور فردوسی جیسا زبردست شاعر اور رزمیہ نگار قطعاً محروم رہجائے لیکن کیا صرف ایک بدقسمت فردوسی کے قصہ کو چمکانا اور محمود کی دوسری تمام فیاضیوں کو تاریکی میں رکھنے کی کوشش کرنا اور اس امر کا دعویٰ کرنا کہ محمود بخیل اور حریص تھا" انصاف کا خون کرنا نہیں ہے ؟

محمود بالطبع حریص سہی بخیل سہی، لیکن اُس نے عام شاعروں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ فردوسی کے ساتھ بھی سلوک کر سکتا تھا لیکن نہ معلوم کونسا ایسا منحوس واقعہ تھا کہ فردوسی کو اس کی بارگاہ سے مایوس جانا پڑا اور اس کی باعث محمود کی مخالفت میں خیالات پھیلانے والوں کو ہمیشہ کے لئے موقع مل گیا کہ وہ اس کو برا کہہ کہہ کر اس کی علمی و ادبی خدمات سے اس کی زندگی کے عظیم الشان کارناموں کو محروم کر دیں۔

اگر محمود دراصل شاعروں اور عالموں کا قدرداں نہیں تھا اور اگر اس نے اپنے دربار میں ان کے ساتھ برا برتاؤ کیا تھا تو کیا آج سوائے چہار مقالہ کی ایک مشکوک روایت کے جو البیرونی کی نسبت ہے اور کیا سوائے اس طشت از بام افسانہ کے جو فردوسی سے متعلق ہے ہمیں اس کی ناقدردانی اور بدسلوکی کی کوئی اور مثال بہم دست نہو سکتی کیا اس کے مخالفین جنھوں نے اس کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے ان دو قصوں کے علاوہ اس قسم کے اور واقعات ثبوت کے لئے نہیں پیش کر سکتے تھے۔ اگر انہیں کہیں بھی ذرا سا ان امر کی طرف اشارہ نظر آتا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اُس کو اجاگر کر کے محمود کی برائیوں کا ایک زبردست قلعہ تعمیر کر دیتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ محمود کی عالمگیر فیاضیوں اور قدردانیوں نے اس امر کا کہیں موقع نہیں دیا۔

اگر محمود علم و ادب کا حقیقی قدرداں نہ ہوتا اور البیرونی کے شک آمیز واقعہ کے مطابق وہ اپنے دربار میں علما و فضلا کو ذلیل کیا کرتا تو کیا اُس کے بعد کے مصنفین اس امر کی طرف کہیں بھی اشارہ نہ کرتے ؟ اس قسم کی شکایت کے برخلاف جب ہم محمود کے بعد کی چند تاریخوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں حسب ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں :- (۱) محمد عوفی نے لباب الالباب میں محمود کی جہانگیری اور کشور کشائی وغیرہ کے ذکر کے بعد لکھا ہے :-

"با این ہمہ مشاغل از تربیت علما و اماثل ہیچ دقیقہ اہمال نکردے و بمجاورت ایشاں رغبت صادق داشتے و بمجاورت ایشاں استیناس جستے و شعرا را صلات فاخرہ و جواہر سنی فرمودے تا لاجرم ہر یک بقدر وسع و طاقت خود ذکر جمیل و نام نیک او را مخلد گردانیدند و بنظم و نثر تازی و پارسی در محامد و ماثر او دفترہا ساختند (دیکھو جلد اول صفحہ ۲۳)

(۲) حمد اللہ مستوفی اپنی تاریخ گزیدہ میں محمود کے متعلق رقمطراز ہے :-

"ماثر او از آفتاب روشن تر است و مساعی او در روزگار از شرح و وصف مستغنی کتاب یمینی مقامات

ابو لفر مشکان و مجلدات ابو الفضل شیبانی شاہد حال اوست۔ علما و شعرا را دوست داشتے و در حق ایشاں عطاے خبزیل فرمودے۔ ہر سال زیادت از چہار صد دنیا را در ایدین جماعت صرف شدے (دیکھو صفحہ ۳۹۵)

(۳) مجمع الفصحا میں محمود کے متعلق لکھا ہے :-

چوں دولت ملوک آل ناصر دغزنویہ ملبند آوازہ آمد سلطان محمود بن ناصر الدین سبکتگین در تربیت شعرا کوشیدہ و بہ تکمیل مستعدان عہد جہد کرد چنانکہ ثروت حکیم ابو القاسم عنصری از دولت عبداللہ رودکی درگذشت و چہار صد تن شاعر ماہر نادر دران والا دولت تربیت یافتند" (دیکھو جلد اول ذکر محمود)

(۴) سلطان کی علم دوستی کے متعلق بحر القواعد میں جو نصف قرن ششم ہجری کی فارسی زبان میں ایک تصنیف ہے اور ملک شام میں اتابک ابی سعید ارسلان کے لئے لکھی گئی ہے روایت ذیل مرقوم ہے :-

سلطان غازی محمود سبکتگین گفت ہمہ مراد ہائے جہاں در جہاں یافتم مگر یک آرزو در دلم خواندن خبر ہائے گذشتگاں دانستن پس بفرمود تا در شہر غزنین کتب خانہ بساختند چوں شب در آمدے علما را جمع کردے تا میخو انندے" (ماخوذ از تنقید شعر العجم مطبوعہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۵۲۵)

(۵) سلطان محمود کے انتقال کے بعد فرخی نے جو مرثیہ لکھا ہے وہ بھی یہاں نقل کئے جانے کے قابل ہے کیونکہ وہ ایک دل کی پرخلوص صدا ہے جو اپنے محسن کی وفات سے متاثر ہونے کے بعد بغیر کسی خاص غرض کے اس سے ظاہر ہوئی ہے اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنوی درحقیقت شعرا کا کس قدر سرپرست و مربی تھا اور وہ اس کو کس درجہ دل سے محبت کرتے تھے۔ بعض شعر ملاحظہ ہوں :-

شہر غزنین نہ ہماں است کہ من دیدم پار	چہ فتاد است کہ امسال دگرگوں شد کار
کوہہا بینم پر شورش و سرتا سرکوے	ہمہ پر جوشن و پر جوشن دو پر خیل و سوار
مہتراں بینم بر روے زناں ہمچو زناں	چشمہا کردہ ز خوں نابہ برنگ گلنار
ملک امسال دگر بار نیامد ز غزا	دشمنے روے نہاد است دریں شہر و دیار
سیر ہمچو رہ مگر وی کہ بخفتہ ست امروز	دیر تر خواست مگر بیخ رسیدش ز خمار

خیز شاہا کہ رسولان شہاں آمدہ اند
بدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار
کہ تو اندکہ بر انگیز دازیں خواب ترا
خفتنی فتنہ کز خواب نگردی بیدار
خفتن بسیار اے خواجہ خوے تو نبود
ہیچ کس خفتہ ندیداست ترا زیں کردار
شعرا ہم تو باز اربرافروختہ بود
رفتی و با تو بیکبارہ برفت آں بازار

(۴) جب سلطان علاءالدین حسین غوری نے اپنے دو بھائیوں، قطب الدین محمد اور سیف الدین سوری کے خون کا بدلہ لینے کے لئے غزنین پر حملہ کرکے اُس کو تاخت و تاراج کر دیا اور تمام غزنوی حکمرانوں (سوائے محمود مسعود اور ابراہیم) کی لاشوں اور قبروں کو اُکھاڑ پھینکا، اور محمودی نشانیوں کو ملیامیٹ کر دیا تو اس وقت فرط جوش میں اُس کی زبان پر یہ اشعار جاری تھے جو فردوسی نے محمود کی مدح میں لکھے تھے ؎

چو کودک لب از شیر مادر بشست
ز گہوارہ محمود گوید نخست
بہ تن زندہ پیل و بجاں جبرئیل
بکف ابر بہمن بدل رود نیل
جہاندار محمود شاہ بزرگ
بہ آبشخور آرد ہمی میش و گرگ

ایسے نازک موقع پر جبکہ بھائیوں کے خون کے انتقام کے لئے علاءالدین سراپا آگ بنکر جہانسوزی میں مشغول تھا اپنے دشمنوں کے بادشاہ اور اپنے بھائیوں کے قاتل کے دادا کو اس طرح بار بار یاد کرنا سوائے سلطان محمود کی علمی اقبالمندی کے ثبوت کے اور کوئی بات نہیں۔

محمود کی علمی و ادبی قدر دانیوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے اور اس کے متعلق بعض مشہور مصنفین کے خیالات پیش کرنے کے بعد اب ہم محمودی عہد کے ان کارناموں کا ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے فارسی نظم و نثر میں کافی اضافہ ہوا، جن کے باعث ادبیات ایران ہمیشہ محمود کی مرہون منت رہنگی اور جن کے معلوم کرلنے کے بعد محمود کی حقیقی علمی خدمات کا صحیح نقش ہمارے ذہنوں پر مرتسم ہو سکتا ہے۔

(۱) سلطان محمود نے اپنی بزم کے ایک رکن محمد بن محمود البدالیعی سے فرمائش کرکے نصیحت نامہ نوشیرواں کو بحر تقارب میں منظوم کرایا۔ یہ کتاب اس وقت کمیاب ہے۔ صاحب مجمع الفصحا نے اس کے متفرق اشعار نقل کئے ہیں۔

(۲) سلطان محمود ہی کے دربار کے ایک اور فرد منشوری نے صنعت ملون کو مختصر کیا۔ اس کا ذکر رشید الدین وطواط نے حدائق السحر میں کیا ہے۔ خوارشیدی نے منشوری کی شرح لکھی ہے جس کا نام کنز الغرایب ہے۔

(۳) سلطان محمود کے دربار کے ایک بڑے شاعر فرخی نے صنایع بدایع فارسی کے متعلق نثر میں ایک کتاب ترجمان البلاغت لکھی جو اس وقت ناپید ہے۔ رشید الدین وطواط نے اُسے دیکھا تھا۔

لے اس حصۂ مضمون کی بعض معلومات آثار الکرام حکیم شمس اللہ قادری سے ماخوذ ہیں۔

(۴) البیرونی نے سنسکرت زبان کی تحصیل سلطان محمود ہی کے طفیل میں کی تھی۔ اگر اس کا تعلق سلطان محمود کے ساتھ نہوتا تو وہ سنسکرت کی بیس سے زیادہ کتابوں کا ترجمہ یا خلاصہ ہرگز نہ کر سکتا۔ نیز کتاب الہند جیسی مشہور و معروف کتاب سلطان محمود ہی کے زمانہ میں لکھی گئی۔ اس کے علاوہ بیرونی کی چند اور کتابیں بھی غزنوی درباری کی مرہون منت ہیں +

(۵) بیرونی کی طرح امام ثعالبی کی بھی کئی کتابیں سلطان محمود کی قدر دانیوں کی پیداوار کہی جاسکتی ہیں۔

(۶) سلطان محمود نے غزنین میں مسجد کے پاس ایک عظیم الشان مدرسہ بنوادیا۔ اس میں کتب خانہ بھی قائم کیا جس میں نفیس و نادر کتابیں جمع کیں اور مدرسہ کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہات وقف کر دئے۔

(۷) فارسی زبان کے قصیدوں میں مناظرہ نگاری کو اسی کی بزم ادب کے ایک رکن احمد اسدی نے معراج کمال پر پہونچا دیا۔ اس کے متعلق ایتھے نے ایک نہایت فاضلانہ مضمون لکھا ہے۔

(۸) قصیدہ میں مخلص اور گریز سب سے زیادہ اہم چیزیں ہیں۔ سلطان محمود کے دربار کا ملک الشعرا عنصری سب سے پہلا شخص ہے جس نے اس کی طرف گریز کرنے کے نہایت پر لطف اور جدت آمیز پیرائے اختیار کر کے فارسی قصیدہ گوئی میں نئے عنصروں کا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ عنصری اور فرخی نے قصیدہ کو جو اس وقت صرف مدحت طرازی اور خوشامد کے لئے وقف ہوگیا تھا واقعہ نگاری سے بھی روشناس کرایا۔ عنصری نے اپنے اکثر قصیدوں میں سلطان محمود کی معرکہ آرائیوں کے دلچسپ مرقع پیش کئے ہیں۔ فرخی نے بھی واقعہ نگاری کا خاص طور پر لحاظ رکھا اور ایسی زبان استعمال کی جو اس زمانہ کے لحاظ سے ایک معجزہ کہی جاسکتی ہے۔ قاآنی نے جو بات ایک ہزار برس کے بعد حاصل کی فرخی نے اسی زمانہ میں اس پر قابو کر لیا تھا ہر قسم کے واقعات کو بے تکلفی کے ساتھ نہایت سلیس اور صاف زبان میں ادا کرنا فرخی ہی کی ایجاد ہے۔ اس نے واقعہ نگاری کی ایک شاندار شاہراہ قائم کر کے آئندہ شاعروں کے لئے راستہ صاف کر دیا۔

(۹) اگرچہ سلطان محمود سے پہلے بھی فارسی شاعری میں صنائع بدائع وغیرہ کا استعمال کیا جاتا تھا لیکن اسی زمانہ میں اس کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی۔ یہ اگرچہ کوئی قابل وقعت بات نہیں ہے لیکن جہاں تک ادبیات کا تعلق ہے اس قسم کی چیزیں نئے اسالیب کے اضافہ کا باعث ہونے کی وجہ سے قابل قدر ہوتی ہیں خاص کر عنصری نے لف و نشر، ترصیع، تقسیم، سوال و جواب وغیرہ صنعتوں نیز مبالغہ اور معنی آفرینی میں اور فرخی نے صنعت تلمیح کے استعمال میں ید طولیٰ حاصل کیا تھا۔ یہ اولین نقوش تھے جن پر متاخرین نے اچھے اچھے مرقع تیار کر لئے۔

سید محی الدین قادری زور (بی اے)

افسانۂ اردو

شمالی ہند

محمد شاہی عہد میں سب سے پہلے جو حسن قبول ولی کے کلام کو حاصل ہوا وہ اور کسی شاعر کو نصیب نہ ہو سکا۔ دلی میں شاہ مبارک آبرو محمد شاکر ناجی، شیخ شرف الدین مضمون اور مصطفےٰ خاں یکرنگ جیسے اساتذہ گزرے دلی میں ولی کے کلام کے اثر سے اردو شاعری کی بنیاد پڑی اس دور میں شعرائے دلی کی شاعری ایہام گوئی اور رعایت لفظی میں ڈوبی ہوئی تھی اسوقت اردو کا کالبد تیار ہوا تھا لیکن بہت بھدا۔

آبرو :—
سیج اوپر غیر کے رہتا ہے اب لوٹا ہوا　　زر کی لالچ اس قدر وہ سیمتن کھوٹا ہوا
مجھ ناتواں کی حالت واں جا کہو ہے اڑ کر　　میرا یہ رنگ رو ہے گویا کبھی کبوتر

شاکر ناجی :—
نہ پوچھو خود بخود اس عارض خورشید کی خوبی　　لیا ہے داد حسن ماہ رویوں سے وہ کر چنڈ
رنگ تراگندی دیکھ اور بدن مخمل ساصاف　　ہوش کھو کر آدمی ہوتے ہیں اپنے خور و خواب
وظیفہ زاگنی کے سر میں زاہد کفر ہے مت پڑ　　نہیں تسبیح تیرے ہاتھ میں یہ راگ مالا ہے

مضمون :—
نظر آتا نہیں وہ ماہ رو کیوں　　نظر آتا ہے مجھکو چاند خالی
خوبوں کو جانتا تھا گرمی کرینگے مجھ سے　　دل سرد ہو گیا ہے جب سے پڑا ہے پالا

یکرنگ :—
مجھکو معلوم یوں ہوا گل سے　　بھول جاتے ہیں اس سے دولت مند
جدائی سے تری اے صندلی رنگ　　مجھے یہ زندگانی درد سر ہے

احسن :—
یہی مضمون خط ہے احسن اللہ　　کہ حسن خوبرویاں عارضی ہے

ان سب میں شاہ مبارک آبرو کا میلان طبیعت ایہام گوئی کی طرف زیادہ تھا چنانچہ تذکرہ قدرت میں یوں لکھا ہے

"بعد از طبقہ شاعران دکن کہ معاصر دلی بودند رواج ایہام بسیار شد سر دفتر و سر آمد ایہام گو نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو" محمد شاہی دور تک جو شاعری کا رنگ تھا بڑا ترمیم طلب اور اصلاح کا محتاج تھا یہ دور ختم ہونے کے بعد جب شاہ عالم کا زمانہ آیا خواجہ میر درد، فقیر دہلوی، مرزا سودا، میر حسن، مظہر جانجاناں جیسے علمبرداران شاعری پیدا ہوئے ان میں سب سے پہلے مرزا مظہر جانجاناں نے اس طرف توجہ کی ایک مستقل دور تجدید و اصلاح کی داغ بیل ڈالی،

چنانچہ قدرت اللہ شوق اپنے تذکرے میں یوں فرماتے ہیں :—

می گویند اول کسے کہ طرز ایہام گوئی ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوے معلی شاہ جہاں آباد کرد الحال پسند خاطر عوام و خاص وقت گردیدہ مروج ساختہ زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین واقف رموز خیاب اکبر کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا جانجاناں متخلص بہ مظہر است

۱۷

تمہید جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں اورنگ آباد اسوقت منتخب بلاد ہند سے تھا عالمگیر کے زمانہ میں جو رونق اسکو حاصل ہوئی تھی بدستور قائم تھی بلکہ اس میں نمایاں اضافہ ہوگیا تھا۔ نواب نظام الملک آصف جاہ کے عہد میں اس کی آبادی دس لاکہ کے قریب پہونچ چکی تھی شہر کے اطراف میلوں تک لذیذ میووں کے باغ پھیلے ہوئے تھے تجارت کا مرکز صنعت و حرفت کا گھر تھا برتن ...... ریشمی، سوتی کپڑے یہاں سے دور دور تک جاتے تھے اُس کی تصدیق مشرو ہمرد کی اُجڑی ہوئی صنعت سے اب بھی ہو سکتی ہے اس کی گلی گلی گوچہ کوچہ عالیشان اور خوبصورت مکان رکھتا تھا اس وقت کے اورنگ آباد کا دھندلا سا خاکا نواب ناصر جنگ بہادر خلف آصف جاہ کے اس نظم سے ذہن نشین ہو سکتا ہے جو اورنگ آباد کی تعریف میں لکھی ہے ؎

نو بہار خجستہ بنیاد است — روزگار خجستہ بنیاد است
دل شکار خجستہ بنیاد است — بیقرار خجستہ بنیاد است
چوں نگر دو سفید دیدۂ خلق — انتظار خجستہ بنیاد است
انتفاعے کہ سرمہ می بخشد — در غبار خجستہ بنیاد است
دلنشین طرز خنجر مژگان — خار خار خجستہ بنیاد است
سلسبیلے اگر بعالم ہست — جوئبار خجستہ بنیاد است
دلربا طرز کاکل خوباں — شب تار خجستہ بنیاد است
روز و شب جلوہ گاہ سرو قداں — رہ گذار خجستہ بنیاد است
شاہ برہان الدین قطب زماں — شہسوار خجستہ بنیاد است
دولت آباد قلعۂ بے مثل — در جوار خجستہ بنیاد است
ہر متاعے کہ ہست در عالم — در دیار خجستہ بنیاد است
شوخ تر از غزال دشت ختن — ہر شکار خجستہ بنیاد است
آں شرارے کہ نخل ایمن سوخت — در چنار خجستہ بنیاد است

می کشد آنکہ دامن دل را ۔ خارزار خجستہ بنیاد است
شکر اللہ کہ حضرت آصف شہر یار خجستہ بنیاد است
ناصر دہر کہ ہست از دو جہاں دوستدار خجستہ[۱] بنیاد است

ذرا خیال فرمائیے حکمران والاشان جس زبان میں طبع آزمائی فرمائیں اس زبان کی قسمت کے کیا کہنے دلی نے اپنے کمال کا نقش چھوڑا تھا پھر دربار میں اردو پہونچ چکی تھی اس کی ہر دلعزیزی کی انتہا نہ رہی ہر معمولی لکھا پڑھا شخص بھی طبع آزمائی کرنے لگا چنانچہ اس دور میں شاعر دکنی اور خصوصاً اردو شاعروں کی ایسی کثرت ہے کہ تذکروں میں ان کے حالات پڑھتے ہوئے طبیعت گھبراتی ہے آج ہم عاجز اورنگ آبادی کو قارئین سے روشناس کرائیں گے،

مرزا عارف الدین خاں عاجز اورنگ آبادی

جنوبی ہند ان کے والد اورنگ زیب کے زمانہ میں بلخ سے ہند آئے نواب فیروز جنگ کی نظر خاص نظر تھی ان کی کوشش اور سعی سفارش سے شاہی منصب بھی ملگیا تھا ابھی عاجز بچے ہی تھے ان کے والد نے دار ناپائدار سے کوچ کیا دربار آصف جاہ کے ایک سردار تھے لشکر جنگ بہادر وہ ان کے کفیل اور مربی ہوئے اور ان کی رفاقت میں رہے اور بچپن ہی میں ان ساتھ دکن چلے آئے اور اورنگ آباد میں پل کر جوان ہوئے وہاں کے مشہور اہل علم و فضل سے تربیت حاصل کی خداداد قابلیت ان میں پوشیدہ تھی فوراً چمک اٹھی آصف جاہی دربار میں رسائی ہوئی لشکر جنگ کی وساطت سے نواب ناصر جنگ بہادر کی سرکار سے منصب عطا ہوا خانی کا خطاب بھی ملا لیکن آمدنی قلیل تھی تنگی سے گذران کرتے تھے پھر ناصر جنگ شہید نے بخشی گیری کی خدمت سے بھی سرفراز فرمایا خود کبھی دست طلب نہیں پھیلایا اپنی خدمت کو بڑی تندہی سے بجا لاتے جہاں قلم کے جوہر سے آشنا تھے وہاں تلوار کے کمالات سے بھی متصف تھے ۔

گل رعنا مولفہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی نے لکھا ہے کہ عاجز بڑے نڈر و دریدہ دہن اور عوغائی اور اونچا سننے کے عادی تھے ——— اسوقت اورنگ آباد میں عرب عجم خراسان عراق عجم ماوراءالنہر و اطراف ہند سے فضلا مشایخ آصف جاہ بہادر کی قدردانی کی شہرت سنکر آئے تھے۔ اورنگ آباد میں اسوقت ایسی باکمال ہستیاں جمع تھیں جن پر نہ صرف اورنگ آباد کو بلکہ تمام ہندوستان کو بجا فخر ہو سکتا ہے۔ حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی جن کو فخر تھا کہ ہندوستان کے سب سے پہلے عربی کے شاعر تھے جن کا مکمل دیوان مرتب ہو چکا تھا اور جنکو ایکطرف تو ان کو عربی کے سات دیوان مرتب کرنے پر ناز تھا دوسری طرف وہ بلند رتبہ مورخ ہونے پر بھی فخر و مباہات کے مستحق ہیں۔ سید قمر الدین جیسا علوم مشرقیہ کا جید عالم علوم و فنون کا ماہر اسی

[۱] مطبوعہ دیوان میں اس کے ۱۰۹۰ شعر ہیں نمونتاً کلام دیا۔ خجستہ بنیاد اورنگ آباد کا تاریخی نام ہے۔

زمانہ میں ——— حضرت سید خواجہ شریف الدین جیسے اہل دل بزرگ ——— جن کے آستانے پر بسی جیا فرانسیسی سپہ سالار جبین سائی کرتا تھا۔ اورنگ آباد ہی میں تھے۔

اورنگ آباد میں ایک طرف تو ماہرین علوم و فنون کا مجمع تھا تو دوسری طرف شاعروں کا بھی ہجوم تھا آصفیہ سرکار علوم و فنون کے لحاظ سے ہارون اور مامون کا دربار تھی تو شعر و شاعری کے اعتبار سے سنجر کی محفل،

خود فرماں روائے وقت شاعری کے دلدادہ تھے خود بھی شاعر تھے حضرت آصف فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے نواب ناصر جنگ شہید نے فارسی کے تین ضخیم دیوان چھوڑے ہیں جو چھپ چکے ہیں انھوں نے فارسی کے ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے ذیل میں ہم اپنے قلمی پارینہ کشکول سے اردو شعر کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

یار خورشید نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا — ذرے ذرے میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

دل جو لعل لب کا فرپہ گرا ٹوٹ گیا — جام بلور تھا پتھر پہ گرا ٹوٹ گیا

چھوڑ کر مار سیاہ لاتا ہے افعی ڈھونڈھ کر — دل بے سودا زلف کا بچھانہ چھوڑا اس نے کا

قید سے چھوٹا ہے دجال قیامت آئی — جو بلا یاں سے گئی تھی وہ سلامت آئی

- -

عاجز [illegible]ھ میں مرض اسہال سے مبتلا ہو کر سخت علیل ہو گئے تھے اور اپنی زندگی سے مایوس ہو کر مرزا معز الدین موسوی قمی خوانی کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ آپ میری رحلت کی تاریخ لکھ دیجئے میرا پیمانہ عمر لبریز ہو چکا مرزا صاحب یہ پیغام سنکر ہنس پڑے اور جواب میں لکھ بھیجا کہ آپ کو تاریخ گوئی پر عبور حاصل ہے۔ خود ہی تکلیف فرمالیں تو اچھا ہے عاجز مرزا کا یہ جواب سنکر ہنس دئے اور اپنے نام اور تخلص کے اعداد جمع کر کے فرمایا کاش مجھے مری موت ایک سال مہلت دے تو یہ تاریخ ہم نام وہم رحلت ہو جائیگی حسن اتفاق سے آپ کی دعا قبول ہوئی اور آپ تندرست ہو گئے اور ایک سال گذرنے پر آپ کا طائر روح گلشن خلد کی طرف پرواز کر گیا۔ میر اولاد حسین ذکا بلگرامی نے یہی مادہ تاریخ آپ کے نام و تخلص سے نکالا ہے یہ عجب توارد تھا تاریخ فوت (عارف الدین خاں عاجز) آپ کا مزار محلہ وزیر آباد کے متصل ضلع ناندیڑ میں ہے۔ عاجز کی تصنیفات یہ ہیں فارسی کا دیوان اردو دیوان مثنوی لعل و گوہر جو (۵۰۰) ابیات پر مشتمل ہے تعجب ہے کہ حکیم سید شمس اللہ قادری مولف اردوے قدیم نے اُس کو محمد علی عاجز دکنی کی تصنیف بتلائی ہے حالانکہ شفیق نے جو ان سے مل چکا تھا اور ان کا ہموطن تھا عاجز اورنگ آبادی سے منسوب کیا ہے۔

دوسرے غلام قادر سامی جو اسی دور کے شاعر اور عاجز کے ہمعصر تھے انھوں نے عاجز اورنگ آبادی کی رد میں طالب و موہن ایک مثنوی لکھی ہے۔

مثنوی لعل وگوہر پر مولانا عبدالباری فاضل فرنگی محلی کا ایک مضمون رسالہ کیف ماہ اگست ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا ہے تاریخی وتحقیقی نقطۂ نظر سے ان کے تبصرے میں جابجا خامیاں پائی جاتی ہیں فاضل مقالہ نگار کا بیان ہے کہ یہ مثنوی طبع نہیں ہوئی ہے حالانکہ یہ مثنوی بمبئی اور مدراس میں چھپ چکی ہے اور میرے کتب خانہ میں ہر دو نسخے موجود ہیں۔ ذیل کے تذکروں میں انکا ذکر آتا ہے:-

محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن ص۶۸۷ گل رعنا مولفہ عبدالحی لکھنوی تاریخ اردوے قدیم ص۹۲ مولفہ حکیم سید شمس اللہ قادری تاسی جلد اول ص۱۶۵ اسپرنگر ص۵۹۹ اسٹوارٹ ص۱۴۳ ایتھے نمبر ۱۶۱۷ لسان العصر جلد اول نمبر ۵ ص۳۵ رسالہ کیف اگست ۱۹۲۷ء ص۱۱۵ تذکرہ شعرائے اورنگ آباد۔ تذکرہ تمنا موجودہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی

چمنستان شعرا گل رعنا مولفہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی قلمی موجودہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی۔

تحفۃ الشعرا محمد افضل بیگ قاقشال قلمی موجودہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی

تذکرہ نویسوں کی رائے

محمد افضل بیگ قاقشال مولفہ تحفۃ الشعرا (شعر ریختہ نظیر خود نداشت)

تذکرہ نویس تمنا (بر علوم عربی وکسبی قادر بود تمام فنون شریفہ ماہر)

لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی چمنستان شعرا۔

عارف الدین خاں عاجز پہلوان شہ زور سخنوری ورستم معنی پروری بہنگ دریلئے شیریں مقالی ضیغم نیستان رنگین خیالی شاعر زبردست ومعنی آفریں است صاحب قدرت زمینہاے سنگلاخ ریختہ گوئند وقوافی تازہ دلچسپ بکار می بردو ہیچ عاجز نمی ماند چنانچہ خودمی گوئید۔

کہتے ہیں سنگلاخ زمینوں میں ہم تو شعر پاتا ہماری شوخی معنی کو ہے بکٹ

نکات الشعرا میر تقی میر:-

دوازدہ سال شدہ باشد کہ در شاہجہان آباد تشریف داشت بندہ شور او شنیدہ بودم از چندیں سمت دکن رفتہ اکنوں از زبان سید مذکور بوضوح می پیوندد کہ برہانپور است دیگر بر حسب ونسبش اطلاع ندارم زبانش بزبان اوباشاں است اکثر ریختہ بحر کبت می گوئید۔

دس بارہ سال ہوے دلی میں موجود تھے اور میں نے انکا شہرہ سنا تھا کچھ دنوں سے دکن کیجانب گئے ہوئے ہیں اور سید مذکور کی زبانی معلوم ہوا کہ برہانپور میں مقیم ہیں ان کے حسب ونسب کی خبر نہیں اُن کی زبان بازاری لوگوں کی سی زبان ہے بحر کبت میں زیادہ شعر کہتے ہیں۔

میر کو عاجز کے بارے میں بڑی غلط فہمی ہوئی (سید عبد العلی عزلت) کی زبانی جو کچھ سنا تھا وہ عارف الدین خاں عاجز اورنگ آبادی کے نسبت نہ تھا بلکہ عارف الدین خاں رفیق برہانپوری کے تعلق ہے اسی دور میں اس نام کے برہانپوری شاعر گذرے

ہیں برہانپوری عارف الدین خان کے لئے دیکھو محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن ص۶۶۸
مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے تو اور بھی غضب کیا میری تردید تو کیسی ایک اور عاجز کو عاجز اورنگ آبادی کی شخصیت پر گمان کیا
حالانکہ میر حسن نے جس عاجز کا ذکر کیا ہے وہ غیر اورنگ آبادی ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو ص۱۳۵

محب مکرم مولوی عظمت اللہ خاں صاحب اورنگ آبادی جنھوں نے اپنے کتب خانہ سے عاجز کا قلمی دیوان عنایت فرمایا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ عاجز اور ان کے دادا کا یارانہ تھا اور انہی کا قول ہے کہ عاجز شاہ شریف الدین اورنگ آبادی کے مرید بھی تھے یہ تو ضرور ہے کہ عاجز شاہ ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اس لئے کہ جسوقت شاہ صاحب ممدوح نے ایک مسجد تعمیر کرائی تو عاجز نے اس کی تاریخ لکھی :-

این مسجد شریف حریم جہاں نما
۱۱۶۴ھ

عاجز اورنگ آباد کے مشہور تاریخ گو گذرے ہیں انھوں نے کئی تاریخیں لکھی ہیں چنانچہ محمد افضل بیگ قاقشال مولفہ تحفۃ الشعرا کے مکان کی تاریخ فی البدیہ یہ لکھی ہے۔

منزل عیش بہ از چار محل کرد بنیاد چو مرزا افضل
گفت تاریخ بنائش ہاتف منزل جاہ و مکان افضل
۱۱۶۴ھ

محض تاریخ کہدینے سے وہ مرید نہیں ہوسکتے یہ ممکن ہے کہ وہ مرید ہوں مگر جب تک واقعات اس کی تائید نہ کریں ہم اس پر یقین نہیں کرسکتے۔ عاجز کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شیعی عقیدہ رکھتے تھے۔

روز محشر میں بچا لینگے تجھے بارہ امام مت سقر کے ڈر سیں عاجز فکر سات اور پانچ کر
نعمت امید سیں معمور ہے کجکول دل جب سے عاجز ہم ہوے ہیں شاہ مرداں کے گدا
دور آیا ہے زبوں یا اسد اللہ مدد دل ہوا ساغر خوں یا اسد اللہ مدد
گلشن بے ہنری سبز ہے آب زر سیں شاد ہے خاطر دوں یا اسد اللہ مدد
اپنے عاجز کو سنبھالو کہ ہے اسکے سر پر حشر کا شور جنوں یا اسد اللہ مدد

عاجز کی شخصیت

عاجز اورنگ آبادی خواجہ میر درد فقیر دہلوی مرزا سودا میر حسن مظہر جانجاناں کا ہمعصر تھا عاجز نے دنیائے شاعری میں وہ شہرت عام نہیں پائی جو ان کے معاصرین کو حاصل تھی ان کے دیوان کے مطالعے سے اُن کی محاورہ بندی اور ندرت پسندی نازک خیالی معنی آفرینی اور خیالات کی بلندی پر طبیعت بے اختیار داد دینا چاہتی ہے ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ میر اور سودا شعرائے دلی اپنے کلام میں جن محاوروں کو لکھ چکے ہیں وہی محاورے

عاجز کے کلام میں کثرت سے ملیں گے اورنگ آباد اور دلی کی زبان میں اسوقت نہایت ہی خفیف سا فرق تھا جس کو فرق نہیں کہنا چاہئے تھا لیکن عام طور پر جو محاورات دلی میں استعمال ہوتے تھے وہی بے کم وکاست عاجز کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں چنانچہ ملاحظہ ہو۔

آنکھ بھر کر دیکھنا	(عاجز اورنگ آبادی)	جو اس کے زلف و رخ کو دیکھے ہے آنکھ بھر کر	آنکھوں پر اس کے عاجز شام و سحر تصدق
"	(درد دہلوی)	کبھو ہم نے نہ پایا مہرباں اے تند خو تجکو	نہ دیکھا آنکھ بھر کر ایک دم خورشید رو تجکو
جان پر کھیلنا	(عاجز اورنگ آبادی)	پڑا جو عشق بازی میں وہ اپنی جان پر کھیلا ؎	پھر اس سین کون ہے واقف کہ کیا کیا ملینا بیلا
"	(میر دہلوی)	یہ تیغ ہے یہ طشت ہے لے ہم ہیں کشتنی ؎	کھیلے ہیں کون ایسی طرح جان پر کہ ہم
زنجیر کردن قید کرنا	(عاجز اورنگ آبادی)	جو مصور کہ تری زلف کو تصویر کرے	اس کو لازم ہے کہ اول مجھے زنجیر کرے
"	(سودا دہلوی)	دیوانہ کون گل ہے ترا جس کو باغ میں	زنجیر کرنے موج نسیم سحر گئی
چھاتی کوٹنا	(عاجز اورنگ آبادی)	جب سین سیکھا ہے مرا طناز دل کو کوٹنا	دل مرا بیتاب ہو سیکھا ہے چھاتی کوٹنا
"	(میر دہلوی)	کبھو میر اس طرف آکر جو چھاتی کوٹ جاتا ہے	خدا شاہد ہے اپنا تو کلیجہ چھوٹ جاتا ہے
دامن جھٹکنا	(عاجز اورنگ آبادی)	اڑائیں سر پہ ہم کیونکر نہ اب خاک	گئے وہ ہاتھ سے دامن جھٹک کر
"	(میر دہلوی)	حاصل بجز کدورت اس خاکداں سے کیا ہے	خوش وہ کہ اٹھ گئے ہیں دامن جھٹک کر
خوں بہا	(عاجز اورنگ آبادی)	قاتل ہمارے سر کو اڑا کر دریغ کہہ	دے خوں بہا یہ رنگ سیں یوں خوں بہا نہ بیچ
"	(سودا دہلوی)	قاصد کو میں بھی اپنے جو کچھ کہ دوں بجا ہے	جیتا پھرے تو اجرت ورنہ یہ خوں بہا ہے
بچکنا	(عاجز اورنگ آبادی)	اے شوخ ترا جلوہ ہے بجلی کا یہ چمکنا	رفتار ترا ہیگا غزالوں کا بچکنا
"	(درد دہلوی)	بارے وہ مہرباں ہوا ہے	بے طرح وہ بچگیا تھا
شکار افگن کے ہاتھوں سے	(عاجز اورنگ آبادی)	اس شکار افگن کے ہاتھوں سے رہیگا کس کا دم	جان عزرائیل کی جاتی ہے جس کے تیر سیں

....

سر پٹکنا	(عاجز اورنگ آبادی)	بولے اگر وہ ہنس کر بھیجا ہے تجکو کس نے	ہٹ کر پٹک کے سر کو عاجز کا نام کہو
"	(میر دہلوی)	یوں کانوں کان گل نے نہ جانا چمن میں آ	سر کو پٹک کے ہم پس دیوار مر گئے
نگاہ کرنا	(عاجز اورنگ آبادی)	دل ہوا ہے مبتلا تیری نگاہ پر کر نگاہ ؎	اے کمال ابرو ہدف پر تیر کھینچا چاہیئے
"	(میر دہلوی)	اگرچہ سہل ہے پر دیدنی ہیں ہم بھی میر	ادھر کو ابرو قاتل سے گر نگاہ کریں

۱؎ خاک بر سر کردن، سر پر خاک کرنا یعنی ڈالنا

چٹ پٹ (عاجز اورنگ آبادی) تیرے دہن کی باتیں شاید نسیم بولی — جو اس طرح سیں غنچے کھلتے ہیں لال چٹ پٹ
" (میر دہلوی) ہم عاشقوں کو مرتے کیا دیر کچھ لگی ہے — چٹ جن نے دل پہ کھائے وہ ہو گیا ہے چٹ پٹا
ہوش اڑنا (عاجز اورنگ آبادی) مو سفیدی نے مرا ہوش اڑایا عاجز — خبر مرگ کو لایا ہے یہ کاگا کورا
" (میر دہلوی) ہوش اڑ گئے سبھوں کے شور سحر سے اُسکے — مُرغ چمن اگرچہ اک مشت بال و پر تھا
گلوں کا رنگ اُڑنا (عاجز اورنگ آبادی) عزم گلشن جب کرے وہ گلشن رنگیں ادا — اس کے استقبال کو اڑ اڑ کے رنگ گل چلے
" (میر دہلوی) رنگ اڑ چلا چمن سے گلوں کا تو کیا نسیم — ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا

ان کے علاوہ عاجز کے کلام میں اور بھی محاورے ہیں جن کو اب تک اہل دلی و لکھنؤ دونوں استعمال کر رہے ہیں۔

گھر گھالنا — اپنی آنکھوں کا لقب کیوں نہ رکھوں گا خراب — کہ انھوں نے مری ارمان کے گھر گھالے ہیں
ہاتھوں ہاتھ — ہمارے دل کو لئے سب نگار ہاتھوں ہاتھ — اسی سے ہم ہوئے محشر برار ہاتھوں ہاتھ
تہ و بالا — ڈال کر سیلی گلے میں قمریوں کے طوق میں — خانۂ گل میں خانۂ بلبل تہ و بالا کرو
ہاتھ پر ہاتھ مارنا — تمھارے ہاتھ پہ ماری تھے ہاتھ ملنے کو — اڑا دئے ہو سجن وہ قرار ہاتھوں ہاتھ
جھڑی باندھنا کڑکڑانا — نہیں یا تمارے رونیکو اور فریاد کوں بادل — برس دیکھا جھڑی کو باندھ دیکھا کڑکڑا دیکھا
دم ناک میں اور غصہ ناک پر — جب سیں تم اے نازنیں سمجھے ہوئے ہو تب سیں ہم — دم ہمارا ناک میں غصہ تمھارا ناک پر رکھا
کس کی خاطر — آ جان دیکھ مجکوں قرباں ہوں کسکی خاطر — مانند چشم بلبل حیراں ہوں کسکی خاطر
سویرا — عاجز ترے بالونیں پڑی آکے سفیدی — چل گھر کوں سویرے کہ ہوا خوب سویرا
الٹ پلٹ — لکھتا ہوں جب تمھاری صفت دیکھکر فلک — کرتا ہے مہر و ماہ کے اوراق الٹ پلٹ
بچھڑنا — جدائی کی حکایت تو اگر گلشن میں جا سن لے — گلوں سے رنگ بچھڑے بلبلوں سے آشیاں بچھڑے
آنکھیں سفید ہونا — کیا شرح انتظار مہ بیکراں کروں — آنکھیں سفید ہو گئیں یہ غم کہاں کروں

عاجز نے اپنے اس شعر میں شوخی کے ساتھ اپنے ہمعصر شاعر مرزا رفیع السودا کو مخاطب کرکے تعلی کی ہے۔

شاعر نہی ہے شہر میں مرزا کہیں جسے — پربت میں یوں تو قرس بھی مرزا رفیع ہے

خاک پائے گجرات سے ایسی ہستیاں اٹھی ہیں جن پر نہ صرف خطہ گجرات کو بلکہ تمام ہندوستان کو بجا ناز ہے لیکن عاجز اپنے کمال کے ترنگ میں یوں فرماتے ہیں۔

نہ ڈھونڈ مردم گجرات میں خرد کی بات — کہ ان لنگوروں کی بستی میں بوعلی ہے ہیچ

عاجز نے اپنے دیوان میں سودا اور میر کی طرح جا بجا تعلی کی ہے اور ان کی قادر الکلامی کی آوازیں دکن سے عجم تک گونج رہی ہیں

کیا ہو گیا جو جیب کے سخن کہتا ہوں عاجز
ہے دھوم مرے شعر کی دکن سیں عجم تک

عاجز نے اپنے بعض اشعار میں مرزائیت کا بھی اظہار کیا ہے۔

نہ سمجھا تا دم آخر سخن کے کچھ سلیقہ کو — رکھے ہیں کیا سمجھ کر نام اس عاجز کا مرزائی
شاعر وہی ہے شہر میں مرزا کہیں جسے — پربت میں یوں تو قرس بھی مرزا فیع ہے

میر تقی میر۔ سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا

بقول مولوی عبد الحق صاحب تعلی کی انتہا ہو گئی ہے کسی دوسرے شخص کی کیا مجال ہے کہ وہ فرمانے کا لفظ اپنے لئے اس طور سے لکھے۔ یہ میر صاحب ہی کو زیبا تھا،

عاجز نے اپنے ایک شعر میں اسی انداز سے تعلی کی ہے۔

اقلیم شاعری کا تسخیر سب کیا ہوں — ہر کوچۂ سخن میں میری دہائیاں ہیں

عاجز اور میر کا انداز بیان دوش بدوش ہے سچ تو یہ ہے کہ دونوں دنیائے شاعری کے آفتاب و مہتاب تھے اسی قافیہ اور دیف میں میر کی بھی غزل ہے۔

تلوار غرق خوں ہے آنکھیں گلابیاں ہیں — دیکھیں تو تیری کب تک یہ بد خرامیاں ہیں

مثال ماضی کیلئے	آنکھیں ترسیاں ہیں	چنگاریاں برسیاں ہیں
مثال ماضی بعید کیلئے	باتیں بہت بنائیاں تھیں	چہرے پر چھائیاں تھیں
مثال ماضی ناتمام کیلئے	تم سے ڈرتیاں تھیں	وہ آنکھیں مارتیاں تھیں
مثال ماضی احتمالی کیلئے	وہ آئیاں ہوں گی	مٹھائیاں کھلائیاں ہونگی

اس دور میں خواہ شمالی ہند کے شعرا ہوں یا جنوبی ہند کے دونوں نے اسکو ضروریات شاعری میں جائز کر لیا تھا، عاجز کی شاعرانہ خصوصیت بہت ممتاز حیثیت رکھتی ہیں ان کا پیرایہ بیان الفاظ کا صحیح استعمال بلند خیالی صفائی بیان سادگی فصاحت یہ ایسی خوبیاں ہیں جو ایک باکمال استاد کے کلام میں ضروری ہیں عبرت، یاس کی جھلکیاں ان کے دیوان میں پائی جاتی ہیں ان کے طرز اور میر کے طرز میں کوئی ایسا اہم فرق نظر نہیں آتا اور انداز بیان بھی دوش بدوش ہے نقادان ادب انتخاب کلام میر کا مطالعہ کر چکے ہیں اب انتخاب کلام عاجز کا بھی مطالعہ فرمائیں۔

بہار آئی ہماری آہ کو صیاد کیا سمجھے اسیروں کی نوائے درد کو جلاد کیا سمجھے
جدا ہو ہمنواؤں سے قفس میں شور کرتے ہیں کوئی عاجز ہمارا نغمۂ ناشاد کیا سمجھے

اٹھ بر سے چلے جان تم آؤ گے پھر اب کب ملجاؤ گے جیتا مجھے پاؤ گے پھر اب کب
گلزار میں گل ہنسنے لگے روتا ہے عاجز اے غنچہ دہن اسکو ہنساؤ گے پھر اب کب

سخن کہنا ہمارا بے تکلف تصرف ہے تصرف ہے تصرف
منایا ہمسکو وہ گل رو چمن میں تکلف ہے تکلف ہے تکلف

ہمارے دل کو لئے سب نگار ہاتھوں ہاتھ اسی سے ہم ہوئے صحبت برار ہاتھوں ہاتھ
تمھاری پنجۂ رنگین کو گر چمن دیکھے اڑے گلوں سے رنگ بہار ہاتھوں ہاتھ

مست آتا ہے وہ طناز خدا خیر کرے آج آے عاشق جانباز خدا خیر کرے
درد کے زور سے آنکھوں سے نکلتے آنسو فاش ہوتا ہے مرا راز خدا خیر کرے
بلبلو آج ہے صیاد کے آنے کی خبر ہم میں نیں طاقت پرواز خدا خیر کرے
یاد ہیں اس نگہ مست کی عاجز دل میں نشۂ غم ہے فلک تاز خدا خیر کرے

باتیں ہمارے دل کی اے بے نیاز سن لے ہے جام جم کا قصہ اے مست ناز سن لے
ہو پست تیرے غم سے نقش قدم بنا ہوں یہ عرض خاکساری اے بے نیاز سن لے

گیا ہے جاں آنکھوں سے سرک کر رہے ہم خوب رو کر سر پٹک کر
بہار آئی ارے صیاد فریاد قفس میں ہم پڑے ہیں تجکو تک کر
اڑائیں سر پہ ہم کیونکر نہ اب خاک گئے وہ ہاتھ سے دامن جھٹک کر

اس زندگی میں پار وسارا ہو دم کا جھگڑا　　آئے تو جی کا جھگڑا جائے تو غم کا جھگڑا
اس عمرِ بے وفا کا جھگڑا چکا چکے جب　　ہم کو عیاں ہوا ہے تب دم بدم کا جھگڑا
جنجال زندگی سے کیا ہو گیا جو چھوٹے　　عاجز ابھی پڑا ہے ملکِ عدم کا جھگڑا

مہربانی بھی کبھی کرتا رہے ظالم مزاج　　کون کہتا ہے کہ تو بالکل ستم کو بھول جا

رہتا ہے جو بلند قدروں کے خیال میں　　اس کا تو آسمان کے اوپر دماغ ہے

یارب آہ سے مٹ بیٹھے سینہ میرا　　یا د طوفاں سے مقابل ہو سفینہ میرا
اشک آنکھوں میں ترے غم سے ہیں ورد دل میں داغ　　دیکھ لے گوہر نیلم کا خزینہ میرا
جاں کنی مجکوں ہے فرہاد کو ہے کوہ کنی　　دردمندوں میں زیادہ ہے قرینہ میرا
اس سیہ چشم کی جب بزم میں ہوتا ہے حجاب　　سرمہ آلود ٹپکتا ہے یہ سینہ میرا
میں وہ گمنام ہوں خود نام نہ کھودوں عاجز　　گر بنے مردم عنقا سے نگینہ میرا

جان کنی کا سخن تلخ کہوں کس سے جان　　سارے انجان ہیں فرہاد سا محرم نہ رہا

اے دُرد نوش غم کے یہ دور کیا چلا ہے　　ہم جس کو صاف سمجھے نکلا وہ دل کا میلا

میں ترے غم میں اری قاتل نپٹ بیخواب تھا　　شکر تری تیغ سے لیکے دم سونے لگا
باغباں جب سے ترے آنے کی پایا ہے خبر　　آب شبنم سے غبار رنگ گل دھونے لگا

ازل سے مجکو دیا ہے خدا زبان فصیح　　مرا کلام ہے اسبات میں گواہ صحیح
ترے جمال اوپر حور و پری ہیں قرباں　　تری ادا کے اوپر حور و پری تصدق

سرگرم ناز ہو جو مست شباب اُٹھی — خورشید کے جگر سے بوئے کباب اُٹھی

تیرے دہن کے اوپر تیری کمر کے اوپر — اے نازنیں ہمارے وہم و نظر تصدق
دندان و لب کو پیارے دیکھا ہی جسنے آنکھ بھر — آنکھوں پہ اُس کے عاجز شام و سحر تصدق

تم نے مکتوب سے ہمکو نہ کیا یاد کبھی — دل ناشاد ہمارا نہ ہوا شاد کبھی

وہ کماں ابرو کرم سے جسکی مہمانی کرے — دمبدم تیغ نگہ سے اُس کی قربانی کرے

ساقی مرا چمن میں کرے گر نگاہ قہر — نرگس کے جام چشم سے ٹپکے شراب زہر

جب ناز کا سمند وہ چنچل ڈپٹ چلے — جی گرد ہو کے اُس کے قدم سے لپٹ چلے
ٹھہرے گی کس طرح نظر اُس کے جمال پر — جس سیں نگاہ دیدۂ حیرت لپٹ چلے
ظالم نگاہ کے تیغ تغافل سرک گیا — عاجز طناب عمر کی اب کیوں نہ کٹ چلے

سحر اس حسن کے خورشید کو جاکر جگا دیکھا — ظہور حق کو دیکھا خوب دیکھا باضیا دیکھا
سجن کس کس مرے سیں آج دیکھا ہم طرف دو — اشارت کرکے دیکھا ہنس کے دیکھا مسکرا دیکھا
نہیں پایا مری روزنیکو اور فریاد کون دل — برس دیکھا جھڑی کو باندھ دیکھا گڑگڑا دیکھا

الٰہی کب دل غمگیں ہمارا شاد ہووے گا — یہ اجڑا شہر یارب کس طرح آباد ہووے گا
بہار آنے سے پہلے عندلیبوں نے کہا مل مل — کہ آخر گھر ہمارا خانۂ صیاد ہووے گا
نہ رکھنا اے صبا ہرگز قدم لا کے غنچوں پر — کہ پھٹ پھٹ کر شہیدوں کا کفن برباد ہووے گا

دل مرا آتش غم میں جو جلا تھا سو جلا — اشک آنکھوں سے اُبل کر نہ چلا تھا سو چلا

اپنے صنم کے ہجر میں ہو غم سے آشنا عاجز عزیز جان سے بیگانہ ہو چکا

مت پوچھ مرے دیدۂ گریاں کی حقیقت دریا کا ابل چلنا ہے یا دل کا ٹپکنا
دیکھا ہے بگولے نے مرے حال کو جب سیں سر پر وہ اڑا خاک کو سیکھا ہے بھٹکنا

چھاتی تمھاری سخت ہے فولاد کی قسم خوں ریز تم سدا کے ہو جلاد کی قسم
رخصت دی ہمکو باغ کی جب تک بہار ہے صیاد تجکو مردم آزاد کی قسم
عاجز ہم اپنے دلبر خوش دل کے ہجر میں غمگیں صدا ہیں خاطر ناشاد کی قسم

ہجر میں دل جب ستے بیتاب ہے جب سے تیرے لب کو میر الب لگا
اشک مرے انکھ میں سیماب ہے لب میں میرے شربت عناب ہے
بہار آئی چمن میں بے تحاشا مرا ئن سنکے مجنوں روکے بولا
ملولاں آجو دیکھیں بے تحاشا نہیں سنتا ہیں حاشا تم حاشا
سجن کا آنا سجن کا مڑنا سجن کا ہنسنا بہار گلشن غضب خدا کا نپٹ قیامت کلی کا کھلنا
خوبروئی اس سیں کیا ہوئیگی خوب جس نے دیکھا تجکو سر کو دھن گیا
عرق جب اس پری کے چہرۂ پرنور سیں ٹپکے خجل ہو گل سیں شبنم جیوں لہو ناسور سیں ٹپکے
اگر کیفی سخن میرا نہال تاک کوں پہونچے صراحی شاخ ہو جائے شراب انگور سیں ٹپکے

خیال اس شوخ کا کب مجھ دل بیتاب میں ٹہرے کہاں بجلی کا سایہ چشمۂ سیماب میں ٹہرے
لکھوں اپنی ستارے کی اگر گردش کو کوئی دم ورق اڑ کر مرے ہاتھوں سے جا گرداب میں ٹہرے
کہاں ٹہرے سیہ افعی تری زلفوں کی لہروں میں اگر ٹہرے تو حلقے مار پیچ و تاب میں ٹہرے

کیفی نگاہ بن دل رنجور ہو رہا ہے یہ شیشہ مے کی خاطر سب چور ہو رہا ہے

اے کیری آنکھ والے اب دیکھ تیری غم میں دل بچانک بچانک ہو کر انچور ہو رہا ہے
اے مست ناز مجھ سے مت پوچھ میری دلکو مرہم لگے ہیں اُسکو انگور ہو رہا ہے
اس خوش گلو کے غم سیں ہر سوز آہ ہر دم عاجز جگر ہمارا طنبور ہو رہا ہے

مرا جب اشک سُرخ اس گلبدن کی یاد سیں ٹپکے دل نالاں ہو ہو ہو لب فریاد سیں ٹپکے
اگر تصویر اس کیفی نگہ کی کھینچوں مستی میں شراب ارغوانی خامۂ بہزاد سیں ٹپکے
وہ صید ناتواں ہو کر پھنسوں جا دام میں عاجز عرق شرمندگی کا جبہ صیاد سیں ٹپکے

قدم رکھتا ہوں جب دشت جنوں میں بے سر و پا ہو پھپھولے پاؤں کے کہتے ہیں نوک خار صحرا ہو
جدھر جاتا ہوں عاجز اسطرف فریاد کرتی ہیں جنوں کے تخت کے ہم بادشاہ تم سر بصحرا ہو

عاشقی میں لباس کیا حاجت سوزن و تار پاس کیا حاجت
عاجز کا دل نہ توڑ ارے اے سنگدل صنم یہ شیشہ خانہ حق کا ہے قہر خدا سے ڈر
بڑا عجزہ بڑا شملہ بڑا کلاہ بڑا اُڈ ہا اڑا بڑا پایا ہے بڑی محنت سے زاہد نے وقار اپنا
بدی سے یاد نکر کوچہ گرد عاجز کو دہن میں خاک ہے مشت غبار کا شکوا

خواجہ میر درد دہلوی اردو ادبیات میں صوفیانہ شاعری کے باوا آدم ہیں اور انھوں نے انسان کے عرفانی ساز کو چھیڑا ہے عاجز کے کلام میں کہیں کہیں جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

ہمکو تو جان ظاہر و باطن ہے تیری یاد رکھتے ہیں ذکر تیرا ہی ہر دم خفی و جہر
بگولا خاکساری کا بنے وہ دشت غربت میں جگر میں جس کے نقش حرف وحدت آشنا بیٹھے
ذکر حق سے ہو غنی اے طالب مولا سمجھ حجرۂ دل میں ذخیرہ حرص کا رکھنا نہیں
مجھے ترے کرم کی لذتوں کی بھوک ہے باللہ کرم فرما کہ اب دل میں غضب کی بھوک ہے باللہ
جس جواں کے دل میں ہوگا زور یاد حق اس کی آنکھوں میں نظر آتا ہے رستم زال سا
کر آرسی مثال تماشائے نیک و بد مت کہہ کسی کے سامنے حرف قبول و رد

آج آیا ہوں سخن میں شعر اعشق اللہ ہمت نیاز و رقلندر نیا عشق اللہ
عاشقی کی راہ میں سر رکھ قدم کو بھولجا راہ جانیاز دلکی ہمت بھول دم کو بھولجا

ز کے دیوان میں کم وبیش ڈہائی سو غزلیات ہیں یہ دیوان عاجز کے انتقال کے بعد لکھا گیا ہے۔ ختم پر یہ عبارت درج ہے
لمی عارف الدین خاں عاجز مرزائی دولت آباد تحریر یا نزدہم محرم الحرام ۱۱۸۱ھ باتمام رسید کاتب الحروف
رقائم ولد شیر محمد ساکن دولت آباد

اردو کے تیسرے دور میں نہیں کی جگہ نیں، اسے کی جگہ سیں، شام کی جگہ سانجھ، جدائی کی جگہ برہ چہرہ کی جگہ، مکھ، خوشبو کی جگہ باس
قول کی جگہ، بچن، ہوا کی جگہ باؤ، پون دنیا کی جگہ، جگ، دیر کی جگہ بیجن۔ شہر کی جگہ، نگر، جدائی کی جگہ برہ، ذرا کی جگہ ٹک،
ا ظ ولی کے زمانے سے میر کے زمانہ تک بولتے تھے، بلکہ آگے چل کر ذوق اور غالب کے زمانے میں بھی شمالی ہند اور جنوبی ہند کے شعرا
ال کرتے تھے۔

اقدس

مجموعہ رباعیات فارسی میر ولی اللہ صاحب بی اے عہ/
ن:۔ مجلد فلسفہ اتحاد اسلام پر ایک بےمثل تصنیف عہ/
:۔ حضرت ہوش بلگرامی کے مضامین کا مجموعہ ع/
سکر اور ملٹز کا نہایت مشہور ڈراما مترجمہ گورکھپوری ۱۲/
احت :۔ عربی فارسی اردو کے بہترین علمی ادبی تاریخی لطائف عہ/
شاہ :۔ پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات ۸/
بیگم :۔ شاہزادی جہاں آرا بنت شاہجہاں کی نہایت مستند تاریخ ۸/
ام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "العبودیت" کا بےمثل ترجمہ حقایق
کی بےنظیر کتاب .... ع/
م:۔ عمر خیام کے مفصل حالات زندگی اور مکمل شرح اس
پہلی کتاب .... ے/
یعنی اخلاقی مضامین پر احادیث نبوی کا ایک بےمثل مجموعہ عہ/
قرآن :۔ امام عبدالعزیز بن یحییٰ کی کتاب "الحیدہ" کا ترجمہ
کے متعلق ایک بےنظیر محاکمہ .... (۱۰/)
:۔ حافظ شیرازی رح کی سوانح عمری اور ان کے دیوان کی

بہترین شرح جلد اول ے/ جلد دوم ع/
یادگار غالب :۔ مرتبہ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی ے/
کلیات نظم حالی :۔ شمس العلما حالی کے تمام منظوم کلام ۱۲/
نقش از رنگ :۔ جلال الدین صاحب اکبر کی غزلوں کا مجموعہ عہ/
الفاروق : مکمل ہر دو حصہ معہ نقشہ دنیائے اسلام مصنفہ مولانا شبلی عہ/
شہاب کی سرگذشت :۔ مولانا نیاز فتحپوری کا بےمثل فسانہ عہ/
تاریخ دولتین :۔ جرجی زیدان کے تاریخ تمدن اسلامی کا ترجمہ عہ/
صحابیات :۔ عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات عہ/
جذبات بھاشا :۔ از مولانا نیاز ہندی شاعری کے بےمثل نمونے ۱۲/
دیوان ولی دکھنی :۔ اردو شاعر کے ابوالاباء کا مجموعۂ کلام عہ/
کلیات وفا رامپوری اس عہد کے بہترین غزلگو جناب وفا کا اردو فارسی کلام عہ/
ایک شاعر کا انجام :۔ مولانا نیاز فتحپوری کا بےمثل فسانہ ۱۲/
انتخاب اودھ پنچ :۔ ۱۸۷۷ء کے اودھ پنچ کا انتخاب عہ/

ملنے کا پتہ
"منیجر نگار لکھنؤ"

پریم کی چُوڑیاں

-: افسانہ :-

نورپور گنگاجی کے کنارے الہ آباد کے ضلع میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، پنڈت گردھاری لال اس گاؤں کے زمیندار تھے رماشنکر اُن کا اکلوتا لڑکا تھا۔ کھیتی باڑی میں بڑی برکت تھی، گھر میں غلہ کا انبار لگا تھا کسی بات کی کمی نہ تھی۔ پنڈت گردھاری لال کا لڑکا رام جیاون ذات کا برہمن تھا کسی زمانے میں اُس کے خاندان میں بھی لکشمی دیوی کا راج تھا۔ لیکن غدر میں اس کا خاندان تباہ ہوگیا جب اس نے ہوش سنبھالا تو وہ یتیم تھا۔ پنڈت گردھاری لال نے اُس کی پرورش کی اور بڑے ہوتے ہی اپنے یہاں پیادوں میں نوکر رکھ لیا۔ رام جیاون بڑا کسرتی پہلوان تھا گو اب اس کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ ہوگئی تھی پھر بھی نورپور کا تو کیا ذکر آس پاس کے گاؤں میں بھی اس کی جوڑ کا کوئی دوسرا پہلوان نہ تھا۔ پنڈت گردھاری کے یہاں چار روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ پھر فصل میں دس بارہ من اناج بھی مل جاتا تھا۔ گھر میں ایک اچھی ذات کی گائے تھی اس کے لئے بھوسہ وغیرہ اسامیوں سے مل جاتا تھا۔ جب پنڈت رام جیاون اکھاڑے میں ڈنڈ پیل کر صبح کو اپنی گلئے کا تازہ دودھ پی کر لمبی پگڑی باندھے ہوئے اور الہ آبادی موٹی لاٹھی کندھے پر رکھکر گاؤں میں اسامیوں سے لگان وصول کرنے چلتے تو رعب چھا جاتا جو کام اور کسی پیادہ سے نہ ہوتا تو اسے رام جیاون مہاراج کے سپرد کیا جاتا۔ گھر میں اُن کی بیوی درگا اور ایک لڑکی پریم پیاری کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

رماشنکر اور پریم پیاری میں ایک سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ رماشنکر کی پیدائش کے ایک سال کے بعد رام جیاون مہاراج کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی تو رماشنکر کی ماں تلسی نے لڑکی کا نام پریم پیاری رکھا۔ گاؤں میں ایسے نام کم رکھے جاتے ہیں لیکن زمیندارن کا نام رکھا ہوا کوئی کیسے بدلتا پھر بھی پریم پیاری کو لوگ پیار میں پریما کہنے لگے۔

رماشنکر اور پریما بچپن ہی سے ایک جگہ اُٹھتے بیٹھتے کھیلے کودے اور گروجی کے یہاں ایک ساتھ پڑھے بھلا انہیں محبت کیوں نہ ہوتی۔ صبح کے وقت خاک دھول میں لت پت ہوکر گھروندے بنانا دونوں کا ایک نہایت ہی پُرلطف کھیل تھا پریما جب گڑیا گڈے کا کھیل کھیلتی تو رما بھی اس میں حصہ لیتا۔ ساون کے مہینے میں جب رم جھم برکھا کی بہار آتی اور نورپور کے پرفضا میدان میں گنگاجی کے کنارے گڑیوں کا میلا لگتا تو گڑیاں اپنے سسرال جاتیں پریما ہاتھ پاؤں میں مہندی رچاتی اپنی گڑیوں کو گہنے کپڑے سے سجا کر بدا کرتی گنگاجی کے کنارے جاتی تو رما بھی ساتھ جاتا اور جب پریما اپنی خوبصورت

گڑیوں کو پانی میں پھینکتی تو راما اپنی خوش رنگ نیم کی چھڑی سے پریما کی گڑیوں کو پیٹتا اور خوب خوش ہوتا۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ کھیل ہی کھیل میں دونوں میں لڑائی ہوئی کوسا کاٹا مارا پیٹا اور پھر تھوڑی دیر میں ملاپ ہوگیا۔ پریما کے روٹھنے پر راما اُس کی دلجوئی کرتا اور جب راما بگڑتا تو پریما اُسکو منالیتی۔ اسی طرح ہنسی خوشی میں بچپن کا کھیل ختم ہوگیا اور دونوں نے بہار عمر کے سہانے سبزہ زار میں قدم رکھا۔ پنڈت گردھاری لال کے ایک چچیرے بھائی گلزاری لال الہ آباد میں وکیل تھے انھیں کے پاس راما کو انگریزی پڑھنے کے لئے پنڈت جی نے بھیجدیا۔ الہ آباد جانے سے پہلے جب راما پریما سے ملا تو پریما نے کہا۔ راما دیکھو الہ آباد جاکر مجھے بھول نہ جانا

"پریما تیرا کدھر خیال ہے بھلا میں تجھے بھول سکتا ہوں۔ میں جب الہ آباد سے آؤنگا تو تیرے لئے بڑی اچھی اچھی چیزیں لاؤنگا"

"الہ آباد سے کب آؤ گے"

"مہینے میں ایک مرتبہ ضرور آؤنگا"

جب راما رخصت ہونے لگا تو اُس نے دیکھا کہ پریما کی کنول کی سی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ اس نے کہا پریما تو روتی کیوں ہے پریما نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اس نے جلدی سے اپنے آنچل سے آنسو پونچھ ڈالے اور پھر بغیر کچھ کہے سنے اپنے گھر کے اندر بھاگ گئی

راما جب نور پور ایسے چھوٹے گاؤں سے نکل کر الہ آباد ایسے بڑے شہر میں پہنچا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اپنے چچا کی عالیشان کوٹھی دیکھکر راما کی نظر میں اپنے نور پور والے کچے مکان کی کوئی وقعت نہ رہ گئی۔ اس کا الہ آباد میں اتنا جی لگا کہ وہ عرصہ تک نور پور نہ گیا اپنے نئے دوستوں سے مل کر وہ پریما کو بھول گیا۔ اس کے چچا نے اس کے لئے کوٹ۔ پتلون اور انگریزی جوتا بنوا دیا۔ وہ فٹن پر سوار ہوکر شام کو خسرو باغ کی سیر کرتا۔ ادھر تو راما شہر کی دلچسپیوں میں اپنی دیہاتی زندگی کو محو کئے تھا اور ادھر نور پور میں پریما اس کی یاد میں تڑپتی رہتی تھی۔ وہ روز شام کی ڈھلتی ہوئی چھاؤں میں اپنے گھر کے سامنے چبوترہ پر بیٹھکر راما کی راہ دیکھا کرتی۔ بسنگ اور دھمنی کے پھول جو قدرتی راگ پیدا ہوتا وہ ایک لمحہ بھر کے لئے بھی اس کو مسرور نہ کر سکتا۔ برسات کے موسم میں جب کالی بھنور راتیں سر پر ہوتیں بجلی چمکتی بادل گرجتا۔ مور جھنگارتے۔ جھینگر الاپتے تو راما کی یاد میں پریما کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح جھڑیاں لگا دیتیں۔

خدا خدا کرکے گرمیوں کی چھٹیوں میں پورے ایک سال کے بعد راما الہ آباد سے واپس ہوا جسوقت وہ گاؤں میں پہنچا دن ڈوب رہا تھا۔ گائیں اور بھینسیں چراگاہ سے واپس ہو رہی تھیں۔ سورج دیوتا کی سنہری شعاعوں میں گائیں رنگی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے گنگا جی میں چمکتے ہوئے تارے گوالے "برہا" گاتے ہوئے چلے آرہے تھے کہیں کہیں پر چھوٹے چھوٹے بچے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ گاؤں کی بہوویں گھڑے لئے گنگا جی سے پانی بھرنے جارہی تھیں ان میں سے ایک شوخ اور چنچل عورت نے گھونگھٹ کی اوٹ سے راما کو دیکھکر اپنی ایک سہیلی سے کہا "اری! دیکھ تو یہ کون کرستان کا بچہ آگیا ہے"

اس کی سہیلی نے غور سے راما کو دیکھکر کہا "یہ تو راما ہے کیا تو نہیں جانتی یہ ہمارے زمیندار کا لڑکا ہے"

ارے یہ وہی راما ہے جو دھوتی کرتا پہنے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ مٹی میں کھیلتا پھرتا تھا میں نے بالکل نہیں پہچانا تھا اور پہچانتی کیسے آج تو یہ انگریزی کپڑے پہن کر آیا ہے۔

دیہاتی زندگی میں ایک برادرانہ انس ہوتا ہے جو شہری زندگی میں نہیں پایا جاتا۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے امیر و غریب سب اسی رشتہ میں بندھے رہتے ہیں۔ چنانچہ راما کے آنے کی خبر پاکر جگدیو لہار۔ بھلی بنیا۔ رمضان جلاہہ۔ جگرو دھوبی۔ کالکا کاچھی۔ ادھین اہیر۔ رام جیاون مہاراج وغیرہ راما کو دیکھنے آئے اور دعا دیکر چلے گئے۔

گاؤں میں بیٹھکر راما کو پریا یاد آئی رات تو کسی طرح سے اُس نے بسر کی لیکن صبح اُٹھتے ہی وہ اس کے مکان پر پہنچا۔ رام جیاون گنگا اشنان کرنے گئے ہوئے تھے درگا وہاں کوٹ رہی تھی۔ راما نے کہا "موسی! پرنام"

"کون! راما! جیتے رہو بھیا بھگوان تمھیں بنائے رکھیں۔ آؤ۔ آؤ اچھے تو رہے" یہ کہتی ہوئی درگا نے آواز دی۔ پریا! ارے او پریا۔ دیکھ تیرے راما بابو آئے ہیں ان کو بیٹھنے کے لئے کچھ آسن تو دے" راما چوکے میں دودھ گرم کر رہی تھی۔ ماں کی آواز سنکر وہ جلدی سے اٹھی اور ایک کھٹولہ لاکر بچھا دیا۔ راما کو خیال تھا کہ پریا سامنے آتے ہی خوب کھل کھل کر باتیں کرے گی اس سے الہ آباد کا حال پوچھے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پریا بدن چرائے آنکھیں نیچے کئے ہوئے آئی اور کھٹولہ بچھا کر پھر چوکے میں واپس چلی گئی راما نے درگا سے کہا "موسی! پریا بھاگ کیوں گئی مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتی"

درگا نے چلاکر کہا۔ پریا کہاں چلی گئی ذرا ایک گلاس دودھ اور ملائی تو ڈالکر بھیا کو کھلادے (ہنسکر) پریا بڑی پگلی ہے تم کو جو سال بھر کے بعد دیکھا ہے تو سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے۔ دیہاتی لڑکیاں بڑی ناسمجھ ہوتی ہیں"

راما "موسی میں بھی تو دیہاتی ہوں"

درگا "بھیا تمھاری اور بات ہے تمھارا اور پریا کا مقابلہ ہی کیا۔ تم پڑھے لکھے ہو لیکن پریا تو بالکل گنوار ہے۔ بس وہی تمھارے ساتھ گروجی سے کچھ ہندی کتابیں پڑھی تھیں کیا اتنے ہی سے وہ سمجھدار ہو گئی۔ نہیں بھیا نہیں وہ بڑی جاہل ہے، دیکھو نہ کئی مرتبہ پکار چکی ہوں لیکن ابھی تک دودھ لیکر نہیں آئی"

راما نے اٹھکر کہا "اچھا تو موسی میں خود ہی اس کے پاس جاتا ہوں دیکھوں تو وہ مجھ سے کیسے نہیں بولتی ہے" یہ کہتا ہوا راما چوکے میں گھسا اور درگا ہنس ہنس کر لوٹ گئی "ہاں بھیا ہاں تو ضرور پریا کو ٹھیک بنائے گا" یہ کہتی ہوئی درگا نے پھر اپنا موسل اٹھایا اور دہان کوٹنے لگی۔ جب راما چوکے میں پہونچا تو اُس نے دیکھا کہ پریا ایک گلاس میں دودھ لئے ہوئے سر جھکائے چپ چاپ کھڑی ہے راما نے ہنسکر کہا "اوہو! ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مجھے پہچانتی ہی نہیں کہو اچھی تو رہیں" پریا نے دودھ سے بھرا ہوا گلاس اور ایک لٹیا میں جل بھرکر راما کے سامنے رکھدیا اور پھر دیوار کا سہارا لیکر ایک طرف کو چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ لیکن کن انکھیوں سے راما کو

دیکھتی جاتی تھی۔

راما نے کہا۔ "نہ۔نہ پریما اس طرح سے کام نہیں چلیگا جب تک تم مجھ سے نہ بولوگی میں تمھارے یہاں کی کوئی چیز نہ کھاؤں گا تھوڑی دیر انتظار کرکے جب راما نے دیکھا کہ اس کا بھی کوئی جواب پریما نے نہیں دیا تو اُس نے اداس ہوکر کہا۔ اچھا پریما نہ بولو جب تم میری بات کا کوئی جواب نہیں دیتیں تو میں اب جاتا ہوں یہ کہتا ہوتا راما اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت لجائی ہوئی پریما نے ایک عجیب انداز سے کسمسا کر دھیمی آواز میں کہا "ہائے راما۔ تم تو نہ جانے کیسا کرتے ہو"

راما کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پریما کی پیاری آواز نے اُس کا غنچۂ دل کھلا دیا۔ اب اس نے دو دھی لیا اور ہنستا ہوا چوکے سے باہر نکل کر کہنے لگا "موسی آخر کار میں نے پریما سے بات چیت کر ہی لی اس کی ضد میں نے توڑ دی" درگا نے خوش ہوکر کہا "وہ تمھارے ساتھ بچپن سے کھیلتی آئی ہے کہاں تک شرما سکتی تھی"

گھر سے باہر نکلتے ہوئے راما نے کہا "او ہو میں ایک بات بھول ہی گیا۔ موسی یہ دیکھو میں پریما کے لئے ایک جوڑہ چوڑیوں کا لایا ہوں۔ پریما کو دیدینا" چوڑیوں کو دیکھکر درگا بہت خوش ہوئی چوڑیاں تھیں تو کانچ کی لیکن اس قسم کی قیمتی اور خوبصورت چوڑیاں اُسوقت تک گاؤں میں کسی کو نصیب نہ ہوئی تھیں۔

درگا کے بلانے پر پریما چوکے سے باہر نکلی "دیکھ راما تیرے لئے کتنی خوبصورت چوڑیاں لایا ہے" یہ کہتے ہوے درگا نے چوڑیاں پریما کی طرف بڑھائیں۔ پریما نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُن کو لے لیا اور دزدیدہ نگاہوں سے راما کی طرف دیکھا۔ زبان سے تو اُس نے کچھ نہ کہا لیکن شرمیلی آنکھوں نے سوال کیا "کیوں جی یہ چوڑیاں کانچ کی ہیں یا پریم کی ؟"

راما نے بھی اس کا مطلب سمجھ لیا اور اشاروں میں جواب دیا "یہ پریم کی چوڑیاں ہیں"

آسمان نے کروٹیں لیں زمین نے موسم پلٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے ۵ برس گذر گئے۔ اس دوران میں پنڈت گردھاری لال اور مہاراج رام جیاون بیکنٹھ سدھارے۔ راما اب ایک وجیہ نجیم شجیم جوان تھا۔ اُس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور اُس نے اپنی زمینداری کا کام سنبھالا۔ لین دین بہی کھاتہ اُس کے ہاتھ میں آیا تو اس کے مزاج میں رعونت پیدا ہوگئی۔ سب نشوں سے زیادہ تیز۔ زیادہ قاتل ثروت کا نشہ ہے راما اسی نشہ میں بیخود ہوگیا۔ وہ اپنے کاروبار میں اتنا منہمک ہوا کہ وہ لڑکپن کی محبت کو پریما کے پریم کو۔ رام جیاون مہاراج کی وفاداری کو بالکل بھول گیا۔ اس نے ایک دن بھی بھولے سے خبر نہ لی کہ یتیم پریما اور دکھیا درگا کی کیسی گذر رہی ہے۔

رام جیاون مہاراج کے کوئی جائداد تو تھی نہیں جس سے درگا کی جیون سے بسر ہوتی مہاراج کے مرنے پر جو دس بیس روپے گھر میں تھے بھی تو وہ اُنھیں کی کریا کرم میں ختم ہوگئے۔ صرف ایک گائے گھر میں تھی ماں بیٹی کی زندگی کا اب ایک یہی سہارا تھا اُس کا

دودھ اور گھی بیچ کر ان کی بسر اوقات ہوتی کبھی کبھی فاقے بھی کرنا پڑ جاتے۔ اسی حالت میں ایک دن درگا نے پریا سے کہا۔ جی میں آتا ہے کہ اپنی مصیبت کا حال راما بابو سے جا کر کہوں۔ کیا وہ ایسی حالت میں ہماری مدد نہ کریں گے۔

پریا نے اداس ہو کر جواب دیا "نہیں نہیں اماں ان کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے" ——— "کیوں ؟"

——— "جب ان کو خود خیال نہیں ہے تو ہمارے کہنے سے ان پر کیا اثر ہوگا"

"ایک دن کہکر تو دیکھوں مجھے تو پوری امید ہے کہ وہ ہماری غریبی پر رحم کریں گے۔ کیا تیرے باپ کا بھی ان کو کچھ خیال نہ ہوگا" مہاراج کا ذکر کرتے ہی دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ تھوڑی دیر تک دونوں خوب جی بھر کر روئیں جب کچھ جی ہلکا ہوا تو درگا نے کہا "بیٹی تو سچ کہتی ہے میں کسی کے پاس نہ جاؤنگی۔ جب ان کے جیتے جی میں نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تو اب ان کے مرنے پر بھیک مانگ کر ان کی آتما کو دکھ نہ پہنچاؤنگی" اس کے بعد پھر دونوں میں اس قسم کی باتیں کبھی نہ ہوئیں ایک مرتبہ راما کی ماں تلسی نے درگا کو اناج بھیجا بھی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

سال بھر تک جس طرح سے بھی ہو سکا درگا نے دن کاٹے پھٹے کپڑوں کو سی کر کسی طرح کام چلایا۔ لیکن برسات میں ایک نئی مصیبت آئی۔ اس کا گھر چھایا نہ گیا تھا۔ برسات میں کئی دن تک موسلا دھار پانی برسا تو اس کے مکان کا ایک حصہ گر پڑا گائے وہاں بندھی ہوئی تھی دب کر مر گئی۔ اس نئی مصیبت نے ان کی پریشانیوں میں اور اضافہ کر دیا۔ گھر میں دو چار چاندی کے زیور بھی تھے وہ بک گئے پریا نے راما کی دی ہوئی چوڑیاں ایک کپڑے میں باندھ کر پٹاری میں رکھ دی۔ راما کی یہی ایک یادگار رہتی۔ پریا نے سوچا کہ اگر وہ ان کو پہنیے رہیگی تو ٹوٹ جائیں گی۔ فکر معاش بڑی بری بلا ہے درگا اب کھیتوں اور چراگاہوں سے گوبر اٹھا لاتی پریا اپلے تھاپتی اور درگا گاؤں میں پھر کر بیچ لاتی۔ کبھی گوبر نہ ملتا تو اور بھی مصیبت ہوتی کبھی کوئی اپلے چرا لیجاتا تو فاقے کرنے پڑتے دنیا کا بھی عجب حال ہے کوئی ہنس رہا ہے اور کوئی رو رہا ہے۔ کسی کا گھر بھرا ہوا ہے کھانے والے نہیں۔ کوئی رو رو کر زندگی کے دن کاٹتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔

راما کی بیسویں سالگرہ کا دن تھا دروازہ پر مردوں کا اور گھر میں عورتوں کا ہجوم تھا۔ ایک طرف گھی کی اور دوسری طرف تیل کی پوریاں پک رہی تھیں۔ گھی کی معزز موٹے برہمنوں کے لئے تیل کی فاقہ کش نیچوں کے لئے۔ راما کا گھر سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ عورتیں سہانے گیت گا رہی تھیں بچے خوش ہو ہو کر دوڑتے پھرتے تھے مالن پھولوں کا گجرا کیلے کی شاخیں لائی کمہار نئے چراغ اور ہانڈیاں دے گئے "تباری" سرسبز ڈھاک کے پتل اور دونے دے گیا۔ کہار نے آکر کلسہ میں پانی بھرا۔ بڑھئی نے راما کے لئے نئی پیڑھی بنائی۔ نائن نے آنگن لیپا اور چوک بنائی۔ راما جب نہا دھو کر اچھے نئے کپڑے پہن کر تیار ہو گیا تو ایک پنڈت جی کھڑاؤں کھٹ پٹ کرتے براجمان ہوئے۔ راما کو پیڑھی پر کھڑا کر کے اشلوک پڑھا ایک کچا دھاگا

سر سے پاؤں تک ناپ کر بیسویں گرہ لگائی تل ملا ہوا کچا دودھ پلایا ماتھے پر تلک لگا کر گلے میں پھولوں کا ہار ڈالکر اشیرباد دی پنڈت پنڈت جی بھلا چوک سے خالی ہاتھ کیسے اُٹھتے ان کا پیٹ بہت بڑا اور خوب پھولا ہوا تھا تلسی نے بھی اس موقع پر پنڈت جی کو خوب دکچھنا دی اور پنڈت جی ہنسی خوشی گھر سے رخصت ہوئے اُن کے بعد نائی۔ دہوبی۔ بھاٹ۔ کمہار۔ لہار۔ مالی وغیرہ کی باری آئی اور اُن کو بھی انعام سے خوش کر دیا گیا۔ غرضکہ اس دن نور پور میں سوائے درگا اور پریا کے کوئی اور راما کی چشم عنایت سے محروم نہ رہا۔ ادہر تو جشن کا یہ ساماں تھا اور ادہر غریب درگا کے یہاں فاقہ تھا۔ کیونکہ ثروت کے نشہ میں جو زمیندار اپنے اس غریب اسامی کو نیوتہ دینا بھول گیا تھا۔ شام کو جب سب لوگ کھاپی کر چلے گئے تو اُس کو اتفاقاً پریما کی یاد آئی اور اس نے اپنی ماں سے جاکر پوچھا "ماں جی! کیا رام جیا دن مہاراج کے یہاں سے کوئی نہیں آیا تھا؟"

تلسی "نہیں تو!:۔ —————— "کیا تم نے اُن کو نیوتہ نہیں دیا تھا"

راما "کیا وہ بغیر نیوتہ کے نہیں آسکتی تھیں وہ ہمارے اسامی ہیں"۔

تلسی "اسامی ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ مہاراج کے گھر کی اکڑ تو سارے گاؤں میں مشہور ہے ابھی تھوڑے دن ہوئے میں نے دو من اناج بھیجا تھا لیکن درگا نے واپس کر دیا۔ وہ عورت اپنے کو نہ جانے کیا سمجھتی ہے جب تک مہاراج زندہ رہے اس کا آنا جانا بھی رہا اُن کے مرتے ہی اُس نے میرے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا۔ بھلا بغیر نیوتہ کے وہ ہمارے یہاں کیوں آنے لگی"۔

راما چپ چاپ اپنی ماں کی باتیں سنتا رہا اس کے بعد بولا۔ خیر درگا نہیں آئی تو اس سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا مجھے ایک تھالی میں کچھ سیدھا دیدو میں اُس کو جاکر دے آؤں۔

تلسی "جب تمھاری یہی مرضی ہے تو میں کل سیدھا کسی کے ہاتھ بھجوا دونگی۔ تمھارے جانے کی وہاں کیا ضرورت ہے لوگ سنینگے تو کیا کہیں گے۔ تم خود سیدھا لے کر جاؤ گے تو درگا کے اور مزاج بڑھ جائیں گے"۔

لیکن راما نے ماں کا کہنا نہ مانا اسوقت اس کے سامنے اس کا گذرا ہوا زمانہ تھا۔ پریما کی بچپن کی بے لوث محبت اُس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اُس نے تلسی سے سیدھا کی تھالی منگوائی اور اسی وقت درگا کے دروازہ پر پہونچکر آواز دی درگا نے دروازہ کھولکر کہا۔ "کون"؟ "راما نے جواب دیا میں ہوں راما"۔

"ہمارے دھن بھاگ۔ آئے اندر آئیے کہئے آج اس طرف مالک کیسے بھول کر آگئے"۔ راما کے دل میں چوٹ سی لگی اُس نے شرمندہ ہوکر کہا۔ "ایشور جانتا ہے کہ میں گھر کے کاروبار میں ایسا پھنسا رہتا ہوں کہ کسی وقت فرصت ہی نہیں ملتی"۔

اس کا کچھ جواب نہ دے کر درگا نے پریما کو آواز دی "بیٹی ذرا دیا جلادے مالک اندھیرے میں کھڑے ہیں"۔

پریما ایک طرف کونے میں میلی کچیلی دہوتی اوڑھے پڑی تھی۔ آج اُس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ ماں کی آواز سنکر وہ اُٹھی اور

آہستہ سے کہا" ماں جی دیا میں تیل نہیں ہے" اس کی آواز میں حسرت بھری تھی۔ گو پریا کو راما نے نہ دیکھا لیکن اس کی آواز سن لی اور کہا دیا جلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں اب جا رہا ہوں ماں جی نے تمھارے لئے اس تھالی میں کچھ بھیجا ہے اسکو لے لو" یہ کہکر راما نے تھالی بڑھائی۔ لیکن درگا پیچھے ہٹ گئی اُس نے اپنے کو سنبھال کر کہا "مالک ہم اس کے بھوکے نہیں ہیں" یہ سوکھا جواب سُن کر راما سناٹے میں آگیا۔ غریبوں میں بھی خودداری کا مادہ ہوتا ہے یہ اس کو معلوم نہ تھا۔ ایک غریب برہمنی نے اس کو ذلیل کیا اُس کا اُسے سخت صدمہ ہوا اور وہ سیدھا کی تھالی لیکر درگا کے گھر سے نکل کر اپنے گھر واپس آگیا۔

راما کے جانے کے بعد پریا نے اپنی ماں سے کہا "معلوم ہوتا ہے بابوجی ناراض ہو گئے ہیں"

درگا نے جواب دیا" بھگوان راضی رہیں کسی کی ناراضگی کی کچھ پروا نہیں ہے۔

پریا اب انیسویں سال میں تھی اس کی جوانی کا چاند بڑی آب وتاب سے چمک رہا تھا حسن و رعنائی کی تمام خوبیاں قدرت نے فیاضی سے پریا کو عطا کی تھیں اس کے انداز میں بھولا پن۔ باتوں میں نغمہ کی دلفریبی۔ آنکھوں میں حیا اور خیالات میں پاکیزگی تھی لیکن ان سب خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی اب تک اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ غریب کی جوانی جاڑوں کی چاندنی تھی کوئی قدردان نہ تھا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک غریب برہمن کی لڑکی تھی۔ دان دہیز دینے کے لئے درگا کے پاس کچھ نہ تھا جوان جہان لڑکی کو دیکھ دیکھ کر اس کے گلے سے پانی نہ اترتا تھا۔ دو چار جگہ اُس نے نسبت کا پیام بھی دیا لیکن کوئی دو سو سے کم دان لینے پر راضی نہ ہوا۔ دو سو روپے تو بہت ہوتے ہیں اُنکے گھر میں اتنے ٹھیکرے بھی نہ رہے ہوں گے۔ درگا گاؤں میں جس طرف سے نکلتی لوگ اُس کو سنا سنا کر کہتے جوان لڑکی گھر میں بٹھا رکھی ہے بیاہ نہیں کرتی نہ جانے اس کا کیا ارادہ ہے۔" درگا لوگوں کے طعنے سنکر شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتی اس لئے گاؤں میں اُپلے بیچنا بند کر دے ایک دوسرے گاؤں میں اُپلے جا کر بیچنے لگی وہاں بھی کچھ دنوں کے بعد لوگوں نے درگا کو دق کرنا شروع کر دیا۔ بیچاری کی جان بڑی مصیبت میں تھی کبھی سوچتی کہ گنگاجی میں ڈوب کر اپنی جان دیدے لیکن جب پریا کا خیال آتا تو اپنے ارادہ سے باز آجاتی۔ اب درگا دن رات اسی فکر میں رنجیدہ رہنے لگی بسا اوقات وہ پریا پر بھی خواہ مخواہ خفا ہو جاتی ذرا سی بات پر اسکو جھڑک دیتی اس پر اگر پریا رونے لگتی تو خود بھی اس کے ساتھ روتی ایک دوسرے کے دل کا حال جانتی تھی لیکن زبان پر نہ لاسکتی تھی۔ اسی طرح دن گذر رہے تھے۔ ایک دن درگا کی ایک سہیلی گورا اُس سے ملنے آئی تو اُس نے کہا "جیجی! پریا کا بیاہ کب کرو گی لڑکی بہت سیانی ہو گئی ہے اُس کو کواری بٹھا رکھنا بڑے شرم کی بات ہے گاؤں بھر میں تمھاری بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔" درگا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا" بہن کیا بتاؤں بہت تلاش کرنے پر بھی ابھی تک کوئی بَر ہی نہیں ملا۔"

گورا۔" یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن خاموش رہنے سے تو کام نہیں چلے گا میرے خیال میں تو تم کو اب دیری نہیں کرنی چاہئے۔"

درگا۔" بہن تمھیں پریا کو کہیں ٹھکانے سے لگا دو بڑی کرپا ہوگی۔

گورا نے کہا اچھا میں دیکھوں گی۔ یہ کہکر گورا چلی گئی۔ دو چار دن کے بعد وہ پھر آئی اور اُس نے آتے ہی درگا سے کہا "جی مٹھائی کھلاؤ میں نے پریا کے لئے بَر ڈھونڈھ لیا ہے"۔

درگا نے خوش ہوکر کہا "کہاں ہے"۔

گورا "مہاراج بنسی دھر کو تو جانتی ہی ہو"۔

درگا۔ "وہی نا جو امرجیہ میں رہتے ہیں"۔

گورا "ہاں ہاں وہی وہی"۔

درگا "اُن کی عمر تو بہت زیادہ ہے۔ وہ اب شادی کیوں کر رہے ہیں"۔

گورا "عمر ضرور زیادہ ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے وہ مرد ہیں ان کی عمر کون خیال کرتا ہے۔ ان کی جتنی عمر ہے اس عمر میں تو بہت لوگ بیاہ کرتے ہیں اور جیجی برا نہ مانو تو کہوں کہ تمھاری لڑکی بھی تو بہت سیانی ہے۔ بر بالکل چھوکرا ہونے سے بھی تو کام نہیں چلے گا۔ میرا کہنا مانوں تم اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو بڑے امیر ہیں بیس پچیس بیگھے موروثی کاشتکاری ہے۔ تالاب۔ باغ سب ہی کچھ تو ہے اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ کچھ دان دہیز بھی نہ لیں گے۔ کہو منظور ہے کہ نہیں"۔

درگا بنسی دھر کے ساتھ پریا کا بیاہ کرنے کے لئے کبھی نہ راضی ہوتی لیکن جب اُس نے سُنا کہ کچھ دان دہیز بھی نہ دینا پڑے گا تو وہ مجبوراً راضی ہوگئی۔

گورا نے کہا "ایک بات اور ہے وہ یہ کہ کل کچھ عورتیں مہاراج بنسی دھر کے یہاں سے پریا کو دیکھنے آئیں گی"۔

درگا "بہن ایسا تو میرے یہاں کبھی نہیں ہوا۔ میرا میکہ کھاگا میں ہے وہاں جب تک بیاہ نہیں ہولیتا سسرال والے لڑکی کو دیکھ نہیں سکتے"

گورا "خیر تم ایک کام کرو کل سویرے پریا کو نہلا کر صاف کپڑے پہنا دینا امرجیہ سے جب عورتیں میرے یہاں آئینگی میں کسی بہانے سے پریا کو اپنے گھر بلا لیجاؤنگی اس طرح سے پریا کو وہ دیکھ لیں گی اس میں کوئی حرج نہ ہوگا"۔

درگا نے خوش ہوکر کہا "ہاں یہ ترکیب تو ٹھیک ہے"۔

"اچھا تو میں اب جاتی ہوں" یہ کہکر گورا اپنے گھر چلی گئی۔ درگا آج بہت خوش تھی۔ اس نے اپنی پٹاری کھول کر ایک پھٹی پُرانی دھوتی اور شلوکہ نکال کر دھو دیا اور اُس کی مرمت کردی۔ صبح کو گورا سے یہ سب باتیں ہوئیں اور شام تک گاؤں بھر میں اُس کی خبر ہوگئی جس کسی نے بھی سُنا کہ درگا اپنی پھول سی لڑکی کا بیاہ بوڑھے کھوسٹ بنسی دھر سے کرنے والی ہے اسی نے افسوس کیا لیکن درگا نے کسی کے کہنے سننے کی کچھ پروا نہ کی اُسکو اس کے سوا کچھ خیال ہی نہ تھا کہ جس طرح بھی ہو پریا کا بیاہ ہوجائے اور دان دہیز نہ دینا پڑے بدنامی ہوگی تو کیا اپنے فرض سے سبکدوش تو ہوجائے گی۔ پریا سے بھی کوئی بات چھپی نہ رہی سب کچھ جان بوجھ کر بھی وہ کہہ ہی کیا سکتی تھی۔ وہ دردِ سر کا بہانہ

رکے سر شام ہی سے لیٹ رہی اور چپکے چپکے ساری رات آنسو بہاتی رہی۔
صبح کاذب کا وقت تھا۔ چاند دھندلی دھندلی روشنی ڈال رہا تھا کہ درگا نے پریا کو بلا کر کہا "بٹیا جلدی سے اُٹھ گنگا مائی میں
نان کر آ۔ یہ لے شلوکہ اور دھوتی اسکو نہا کر پہن لینا۔ ہاں خوب یاد آیا ذرا ٹھہر جا" یہ کہتی ہوئی درگا نے اپنی پٹاری کو کھولا اور اُس میں سے
ماکی دی ہوئی کانچ کی چوڑیاں نکالیں اور بولی "تیرے بدن پر کوئی زیور نہیں ہے میں اب تجھے بنوا دونگی آج تو یہ چوڑیاں پہن لے یہ بھی بہت خوبصو
ر قیمتی ہیں" پریا جو اب تک خاموش سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھی چوڑیوں کو دیکھکر یکبارگی چلا اُٹھی "نہیں ماں نہیں میں تمھارے پاؤں
تی ہوں میں اِن چوڑیوں کو نہیں پہنوں گی" درگا نے ڈانٹ کر کہا "پہنے گی کیسے نہیں۔ بس یہی تو تجھ میں ایک بڑا عیب ہے۔ کہنا نہیں مانتی
لہکر درگا نے زبردستی چوڑیاں پہنا دیں اور پریا کو نہانے کے لئے بھیج کر آپ کسی دوسرے کام میں لگ گئی۔ آج ہی امرچند سے عورتیں پریا
دیکھنے آئیں گی درگا کو جلدی تھی کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو پریا نہا دھو کر فارغ ہو جائے۔ پریا جب گھر سے نکلی اسوقت بھی اندھیرا تھا وہ
ہستہ آہستہ کچھ سوچتی ہوئی دریا کے کنارے پہنچی۔ ستاروں کی مدہم روشنی کے عکس سے دریا کا بعض بعض حصہ سانپ کی کینچل کی طرح
لمگ جلمگ کر رہا تھا۔ تمام دنیا سنسان تھی دریا کے کنارے پریا نے دھوتی شلوکہ ایک طرف پھینک دیا گنگا مائی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا
ر بولی "ماتا! میں نے کون پاپ کیا ہے جو سب کی آنکھوں کا کانٹا بن رہی ہوں۔ کیا میرے لئے دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے
میری ماں مجھے آگ میں جھونکنے کے لئے تیار ہو گئی ہے۔ ماتا! میرے دل میں جس کی محبت بچپن سے تھی جب وہی میرا نہ ہوا تو اب
نیا میں مجھے کسی سے کچھ امید نہیں ہے۔ ماتا کیا تم بتا سکتی ہو کہ راما نے مجھے کیوں بھلا دیا۔ ماتا تم جواب کیوں نہیں دیتی ہو۔ اچھا میں
بجھ گئی تم کہتی ہو کہ اُن کا نام جپو۔ لیکن میں تو انکا نام آج سے نہیں بالے پن سے جپتی ہوں پھر بھی وہ میرے نہیں ہوئے۔ ماں
بن دھرتی ماتا کی پیٹھ کا بوجھ ہو رہی ہوں تم اس دکھیا کو اپنی گود میں چھپا لو میں تمھارے سرن میں آئی ہوں۔" پریا کی فریاد سنکر
پاند کی تھرکتی ہوئی کرنیں بالو پر لوٹنے لگیں اور گنگا مائی کی لہریں اپنا سر پٹکنے لگیں۔ پریا آگے بڑھی پھر کچھ سوچ کر رُکی اور اپنے
ہاتھوں سے چوڑیاں اتار ڈالیں اور یہ کہکر کہ "میں تو پریم کی چوڑیاں پہنے ہوئے ہوں ان کانچ کی چوڑیوں کی ضرورت نہیں ہے"
ن کو توڑ کر ایک طرف زمین پر پھینک دیا۔ جن چوڑیوں کو وہ کبھی اپنے جان و دل سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی تھی انھیں چوڑیوں کو
ج اُس نے خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالا اور پانی میں ایک قدم بڑھایا ٹھیک اسی وقت کسی کی آواز سنائی دی۔
"پریا! پریا! ٹھہرو۔ مجھ سے غلطی ہوئی مجھ سے بھول ہوئی تم مجھے معاف کر دو۔ تم میری غلطی کی سزا تمھارا جو جی چاہے دے سکتی ہو
لیکن تم جو کچھ کرنے جا رہی ہو یہ سزا میرے لئے ناقابل برداشت ہوگی۔ پریا! زور اور طاقت سے کانچ کی چوڑیاں توڑی جا سکتی ہیں
لیکن پریم کا بندھن پریم کی چوڑیوں کا تعلق کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اس کے توڑنے کی طاقت نہ تم میں ہے اور نہ مجھ میں ہے۔
پریا! جو میں نہیں کر سکا اس کو تم بھی نہیں کر سکیں" یہ راما کی آواز تھی وہ اتفاقاً اسوقت گنگا اشنان کرنے کے لئے وہاں پر آگیا تھا

اُس نے پریا کی فریاد سنی - پریا کا خوبصورت مگر اداس چہرہ دیکھا - پریا کو چوڑیاں توڑتے اور ان کو پھینکتے دیکھا تو اس نے آگے بڑھکر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کو اٹھا لیا - ثابت رہنے پر بھی جن کی اُس نے کبھی کچھ قدر نہ کی تھی وہی معمولی کانچ کی چوڑیاں آج ٹکڑے ٹکڑے ہوکر اُس کے دل پر تیر و نشتر کا کام کر گئیں - دل کی گہرائیوں میں خوابیدہ محبت نے ایک کروٹ لی بچپن کی محبت نے زور مارا اور قبل اسکے کہ پریا اپنی چاند سی صورت کو گنگا مائی کی لہروں میں چھپالے راما نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھکر پریا کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑکر پانی سے باہر نکال لیا - جسطرح ہوا کے جھونکے سے درخت کا ایک ایک پتہ کانپنے لگتا ہے اسی طرح راما نے جب پریا کی بانہہ پکڑی تو جوشِ محبت سے پریا کا ایک ایک عضو کانپ اُٹھا اور وہ راما کے چرنوں میں جھک گئی - محبت کے آنسو دونوں کے آنکھوں سے بہہ نکلے - اُسوقت بادِ سحر مستی سے جھومنے لگی، رات کے جھلملاتے تارے غائب ہوگئے اور صبح ہوگئی - رنج و غم کا کہیں نشان بھی نہ رہا -

کچھ دنوں کے بعد اچھی ساعت میں راما نے پریا کے ساتھ بڑی دھوم دھام کے ساتھ بیاہ کیا - درگا اس مبارک شادی کے بعد بھی کئی سال تک زندہ رہی لیکن اس وضعدار اور آن پر مرنے والی عورت نے اپنی جھونپڑی چھوڑ کر داماد کے یہاں رہنا کبھی گوارا نہ کیا -

اعظم کریوی (سابق مدیر اکبر)

غالب بے نقاب

اور

ان کے الہامات شعری کے صحیح خط و خال

میرزا نوشہ غالب اپنے ایک قطعہ میں فرماتے ہیں:-

زامعنی سرجوش خاص نطق من است — کز اہل ذوق دل وگوئی از عمل بردا
رفتگاں بہ یکے گر توارد م رود اد — مداں کہ خوبی آرائش غزل بردا
است تنگ دے فخر اوست کاں بہ سخن — بسعے فکر رسا جا بداں محل برداست
رگماں توارد یقین شناس کہ دزد — متاع من ز نہانخانۂ ازل برداست

غالب کا مدعا یہ ہے کہ میرے شعر یا میرے مضمون کا کسی سے
وارد ہو جائے تو میرے لئے باعث ننگ ہے مگر اس کے واسطے
فخر ہے۔ وہ توارد نہیں ہے بلکہ یوں سمجھو کہ چور میرا متاع نہانخانۂ
زل سے اڑا لیگیا ہے۔ مرزا نے خدا جانے کس عالم میں یہ شعر کہدئے
ہم حیراں ہیں کہ یہ ننگ غالب کے لئے اگر واقعی ننگ ہے تو اُس کی
وئی انتہا بھی ہو یا نہیں اور دوسروں کے واسطے اگر در اصل فخر ہے
تو اس کی حد و نہایت کیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ دیوان غالب کے
چند صفحوں میں معانی کا بڑا ذخار دریا موجزن ہے۔ مگر تعجب کی
کوئی انتہا نہیں رہتی جب دیکھنے والا دیکھتا ہے کہ اس دریا کے اکثر
چشمے مستعار اور اس بحر ناپید اکنار کے بہت سے موتی حاصل
دریوزہ گری ہیں۔

دیوان غالب اگر بقول ڈاکٹر بجنوری مرحوم ہندوستان کی
الہامی اور مقدس کتاب ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بعض الہامی
کتابوں کے الہامات بھی مستعار ہوا کرتے ہیں۔ یہ دیکھکر کہ غالب کے
یہاں بہت سے مضامین ایسے ہیں جو دوسروں کے ہاں سے لئے گئے
ہیں۔ ایک مبصر کی سب سے پہلی نظر سرقہ۔ اور توارد کی بحث پر جاتی
ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اصولی نگاہ ان پر ڈالی جائے

توارد کہتے ہیں دو شاعروں کے یہاں اتفاقیہ ایک ہی مضمون کا بلا تامّل
لفظ بہ لفظ یا بہت تھوڑے سے تغیر کے ساتھ بندھ جانا۔ مگر یاد رکھنا
چاہئے کہ توارد ہمیشہ مشہور و معروف یا بالکل سطحی مضامین میں ہوا
کرتا ہے۔ باوجود تلاش بھی کوئی ایسا مضمون نہ ملے گا جو دو شاعروں
کے یہاں متوارد ہوا ہو۔ اور معروف و مشہور نہ ہو۔ مثال کے لئے
اشعار مندرجہ ذیل دیکھئے

صائب کعبہ کی مدح میں کہتا ہے۔

ہیچ تعریفی ترا زین بہ نمیدانم کہ شد — در تو پیدا گوہر پاک امیر المومنین

علامہ آزاد بلگرامی اپنے اس شعر کو توارد کی مثال میں پیش کرتے ہیں۔

مطلع خورشید گر خوانم ترا الحق بجاست — از تو سر زد آفتاب آسمان سروری

حالانکہ بجز مضمون کے توارد کے اسمیں لفظی توارد کا کہیں نشان
نہیں مگر غریب آزاد نے اس خوف سے کہ صائب متقدمین میں سے
ہے اس مضمون کو اپنے یہاں سے اڑا دیا اور یہ فقرہ لکھکر دل کی
بھڑاس نکالی کہ "آلہی خانہ توارد خراب شود"

کہ چہ انتہا[1] بر سر معنی آفریناں مے آرد۔

اسیطرح آزاد توارد عجیب کی مثال میں شریف تبریزی کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

چو نکرد یار رحمے ز تو ای فغاں چہ حاصل ز تو بود امید آنم کہ نظر کنی نکردی

میر محمد احسن ایجاد۔ گلہ آہ از تو دارم کہ چہ کردۂ تو با من

بہ فلک ترا رسا ندم کہ اثر کنی نکردی

مگر یہ علامہ مرحوم کی نیک نیتی پر مبنی ہے ورنہ یہ کھلا ہوا سرقہ ہے۔ اسیطرح سرقہ کی مختلف قسمیں ہیں، ایک انتحال اور نسخ جس کی تعریف یہ ہے کہ کسی شعر کی صورت تبدیل کئے بغیر اپنے یہاں رکھ لیا جائے اگرچہ ایسے لوگ کم یاب ہیں۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی بعض کی زیارت ہو جاتی ہے۔

دوسری قسم اغارہ ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ کسی کے شعر کے الفاظ میں کمی بیشی کر کے اپنا کام نکال لیا جائے۔ اس کی مثال میں مصنف بحر الفصاحت یہ اشعار پیش کرتے ہیں۔ میر ضمیر۔

پہچانتے ہو کسکی مرے سر پہ ہے دستار دیکھو تو عبا کس کی ہے کاندھے پہ نمودار

یہ کسکی زرہ کسکی سپر کسکی ہے تلوار میں جسپہ سوار آیا ہوں کسکا ہے یہ رہوار

باندھا ہے کمر میں جسے یہ کسکی ردا ہے

کیا فاطمہ زہرا نے نہیں اسکو سیا ہے

یہ قبا کسکی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جسے میں سینہ فگار

بر میں کس کا ہے بیچارِ آئینۂ جوہر دار کس کا رہوار یہ ہے آج میں جسپہ ہوں سوار

کس کا یہ خود ہے یہ تیغ دو سر کسکی ہے

(میر انیس) کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کسکی ہے

تیسری قسم سرقۂ غیر ظاہر۔ وہ یہ ہے کہ اُس کے سمجھنے میں غور و فکر

کی ضرورت پڑے اور شاعر نے پہلے خیال کو اس طریقہ سے بدلا ہو کہ عام اس پر بادی النظر میں نہ پہونچ سکیں۔ مثلاً شعر ذیل ملاحظہ ہو۔

میر تقی:- عجب صحبت ہے کیونکر صبح اپنی شام کرے اب

جہاں تک آن بیٹھے ہم کہا آرام کرے اب

آتش:- جب میں جاتا ہوں تو منہ پھیر کے یوں کہتے ہیں

نیند آئی ہے ہمیں آپ بھی آرام کریں

یا کسی پہلے شاعر کے کلام میں اس طریقہ سے تصرف کیا ہو کہ دوسرا شعر پہلے کی ضد معلوم ہو۔

ظہیر فاریابی:- نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا

تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں زند

سعدی:- چہ حاجت کہ نہ کرسئ آسماں

نہم زیر پائے قزل ارسلاں

مگر در اصل یہ سرقہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک قسم کا اقتباس ہے جو معیوب نہیں

شاہد معنی کہ باشد جامۂ لفظش کہن نکتہ دانے گر حریر تازہ پوشاند خوش است

یہ سب اقسام جو لکھے گئے صرف علم معنی و بیان کی رو سے لکھے ہیں ورنہ اگر در اصل دیکھئے تو سرقہ وہی ہے کہ کسی کا خیال لے لیا جائے اور بغیر کسی ترقی کے اُس کو اپنے یہاں باندھ لیا جائے۔

غالب اپنے زمانہ کے نکتہ سنج و ہوش سارقان معنی کی شان میں یہ قطعہ کہتے ہیں۔

غالب درین زمانہ ہر کس کہ وا رسی

مضمون غیر و لفظ خودش بر زبان اوست

زین مایہ از کجا کہ بنالد بہ خویشتن

ہر گنج شائگاں کہ بود رائگان اوست

[1] تذکرہ شعراء مطبوعہ نولکشور پریس صفحہ ۲۹۱

کس راز دست بُرد خیالش نجات نیست
گر پیش از و گزشتہ دگر و زمان اوست

مضمون ہر کہ راخوش ادا میکند بتاز
گوئی بہ بزم اہل سخن ترجمان اوست

اما بہ کہ حسن ادا نارسیدہ است
مے لرزد از نہیب و دلم راز دان اوست

جز من کسے بہ دزد سخن وانمے رسد
گو خوش بجز اں کہ انجمنے مدح خوان اوست

آرے نہ چک بود نہ تمسک نہ ہر کہ ہست
نے دستخط نہ مہر نہ نام و نشان اوست

مضمون شعر نوٹ بود نے زمانہا
یعنی بدست ہر کہ بیفتاد آن اوست

غالب کا عقیدہ بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ بدلنا اور حسن ادا میسر نہ ہونا سرقہ ہے الفاظ کے بدل دینے سے کوئی مضمون کسی کا نہیں ہوجاتا۔

ایک مرتبہ ملا شیدا جو اپنے حسن طبع پر مغرور بھی تھا۔ اکابر شعرا کی مجلس علم و فضل میں آیا حاضرین میں صلاح ہوئی کہ اس کی تعلی بیجا نے قافیہ تنگ کر رکھا ہے لاؤ اس کو پریشان کریں۔ ملا فیروز کو آمادہ کیا کہ جو شعر یہ پڑھے اُس کے جواب میں شعر پڑھا جائے۔ اور اس کو سارق مضمون ثابت کر دیا جائے چنانچہ صلاح کے بعد ملا شیدا سے کہا گیا کہ کچھ سنائیے اُس نے اصرار کے بعد یہ شعر پڑھا۔

چیست میدانی نئے گلگوں معنا چہرے حسن را پیمود گارے عشق را پیغمبرے

ملا فیروز نے کہا کہ یہ مضمون رودکی کا ہے اور فوراً یہ مصرع پڑھا۔

عشق را پیغمبر و نیکوی حسن را آفریدگار توئی۔ ملا شیدا خاموش ہوا اور اپنا یہ شعر پڑھا:-

زبسکہ کرد ہمت بند در جگر ناخن چو پشت ماہیم از پائے تا بسر ناخن

ملا فیروز نے کہا یہ غیاثائے حلوائی کا مضمون ہے۔

از بسکہ سینہ کندم و ناخن بر آن شکست چون پشت ماہی ہست سراپائے سینہ ام

ملا شیدا اگرچہ بگڑا اور کہا کہ بڑے سخنداں ہو تو لو اور سنو۔

گر بصحرا موفشانی دشت پر سنبل شود در بدریا روشوئی خار ماہی گل شود

ملا فیروز نے کہا کہ سبحان اللہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے گھر کا ایک مضمون بھی نہیں ہے۔ یہ تو ملا کاہی کا شعر ہے۔

گر بدریا افتد از عکس جمال او فروغ
خار ماہی را رود در قعر دریا پا بہ گل

اب تو ملا شیدا بہت برہم ہوا۔ اور کہا بڑے ہمہ داں ہو تو بتاؤ کہیں یہ بھی مضمون یاد ہے اور اپنا یہ شعر پڑھا۔

ذات تو بود صحیفۂ کون کہ کرد از روئے ادب مہر خدا بر پشت

ملا فیروز نے کہا بس رہنے دیجئے ہاتفی نے آپ سے ڈیڑھ سو برس پہلے یہ مضمون کہا ہے۔

نبوت را توئی آن نامہ در مشت کہ از تعظیم آمد مہر بر پشت

ملا شیدا نہایت خفا ہوا شعر پڑھنا بند کر دیا اور اٹھ کر چل دیا۔ مگر یاروں نے باتیں بنا کر پھر بٹھا لیا اور شعر پڑھنے کی فرمائش کی شیدا نے پھر یہ شعر پڑھا۔

زلف او در رشتہ جان گفتم و گشتم خجل زانکہ ایں معنی چو نقش پیش پا افتادہ است

ملا فیروز نے کہا کیا کہا جائے بڑا افسوس ہے عزیزی نے یہ مضمون آپ سے پہلے کہا ہے۔

کس نیارد مصرع پیچیدہ زلف گفت لیک ایں مضمون تراپیش پا افتادہ است

بیچارہ شیدا عاجز ہوگیا۔ اور کہا بھائی خدا کے لئے معاف کرو۔ یہ تو بتاؤ میرا کوئی شعر تمہیں پسند بھی آیا ہے ملا فیروز نے کہا جو کچھ تم نے کہا ہے اس میں سے ایک شعر مجھے پسند ہے۔

ــلے بروئے تو کز دو آئینہ را چشم نیاز شانہ را دست دعا در شب لف تو دراز

میرے لمتید مضمون سے جو کچھ مطلب نکالا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ میں غالب کے شعروں کو بھی حد سرقہ میں لانا چاہتا ہوں۔ ہرگز نہیں میرا مقصود یہ نہیں ہے۔ میرے قلم کو جنبش دینے والے دو خیال ہیں۔ ایک یہ کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اپنے مقدمۂ دیوان غالب میں لکھا ہے کہ "دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے ایک لفظ کو جہاں تک ہو سکا ہے دوبارہ استعمال نہیں کیا ہے اس کی وجہ سحبان وائل کی طرح یہ نہیں ہے کہ وہ کسی لفظ کی تکرار نہیں کرتے۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ کسی خیال کا اعادہ نہیں کرتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی یقین کیا جاتا ہے کہ مرزا غالب کا ہر خیال اسی کا خیال ہے اور کہیں سے مستعار نہیں ہے۔

میں جب دیوان غالب اردو کو دیکھتا ہوں تو میری نگاہ اولین اس کو چار حصوں پر تقسیم کر دیتی ہے ایک جزو وہ جو متقدمین یا معاصرین غالب کے کلام سے مل جاتا ہے، دوسرا وہ جس میں خود غالب نے اعادہ و تکرار مضامین سے کام لیا ہے۔ تیسرا وہ جسکو سنکر سخنوران کامل آسمان کہنے کی فرمائش کرتے ہیں اور چوتھا وہ جو صرف مرزا کے دماغ کا نتیجہ ہے لیکن یہ حصہ بہت مختصر ہے۔

مومن، ذوق، آتش، ناسخ، تھوڑے سے تقدم اور تاخر کو ملحوظ رکھتے ہوئے غالب کے ہمعصر ہیں۔ ان کے اور غالب کے متوارد خیالات میں شناخت نہیں ہو سکتی کہ اصل مالک کون ہے مگر یہ دعوی سراسر بے دلیل ہے کہ وہ سب غالب کی ملک ہیں۔

یہ بھی ہوا ہے کہ متقدمین کے خیال کے کسی جزو خاص سے غالب نے فائدہ اٹھایا۔ مگر یہ استفادہ استحصال بالجبر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا زبان عام اور محاورات خواص کی عدم پابندی، دلی اور لکھنؤ کی زنجیر تقلید سے آزادی کے باوجود بھی خزانۂ ادب اردو کو مالا مال کرنے اور دفتر شعر ہندی کو نگارخانۂ چین بنانے کا غالب کو ہمیشہ خیال رہا ہے اسی وجہ سے انھوں نے دوسری زبانوں کے خیالات خواہ لیما نیا کر آپ کے سامنے رکھدئے بہر حال حقیقت جو بھی ہو ہم اپنی جستجو کی بنا پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ غالب کے بہت سے خیالات مستعار ہیں۔ غالب کا شعر ہے:۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

لیکن ظہوری اس خیال کو اس طرح کہہ چکا تھا:۔

شہ طبیب ما محبت منتش بر جان ما محنت ما راحت ما درد ما درمان ما

مضمون اور طرز ادا دونوں ایک ہیں۔ اسی مضمون کو مولانا روم نے یوں ادا کیا ہے۔

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علتہائے ما

غالب:۔ شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

غنی کشمیری:۔ بگوشم ایں صدا از مقری تسبیح می آید
کہ صد دل مضطرب گردد چو یکدل یاد آمد

غالب کے شعر میں جاندار ٹکڑا ۔ "یک کف بردن صد دل آئے" اور وہی غنی کے ہاں سے لیا گیا ہے۔

غالب کہتا ہے :- دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہوا

جو سعدی کے اس شعر سے لیا گیا ہے:-

یا وفا خود نبود در عالم یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

غالب :- میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

عالی شیرازی :- خواستم آتش دل را بہ نشانم بہ سرشک
انقدر ہم تب سگر سوختہ ام آب نداشت

دونوں خیال بظاہر جدا ہیں۔ مگر انداز بیان اور مقصد دونوں ایک ہیں

غالب :- بقدر شوق ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

علی سرہندی :- تو چوں ساقی در دتنگ ظرفی نمی ماند
بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحل ہا

بجز ایک آدھ لفظ کے اور کوئی کمی بیشی خیالات میں نہیں ہوئی۔

غالب کا نہایت مایہ ناز مشہور شعر ہے

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عرفی :- ہر کس نہ شناسندۂ راز ست وگرنہ
اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است

مگو کہ نغمہ سرایان عشق خاموش اند کہ نغمہ نازک و اصحاب پنبہ در گوش اند

ممکن ہے کہ دونوں شعر جدا سمجھے جائیں مگر غور کرنے پر ذوق سلیم ایک ہی طرف رہبری کرتا ہے۔ دوسرا شعر بھی ویسا ہی ہے۔

غالب :- بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

عالمگیر :- انچہ بر جستیم کم دیدیم و بسیار است و نیست
نیست جز انساں دریں عالم کہ بسیار است و نیست

شعر کی جان غالب کا دوسرا مصرع اور اس کا انداز بیان ہے۔ مگر عالمگیر کے یہاں دونوں مصرعے برابر کے ہیں اور دونوں کے انداز بیان میں بھی فرق نہیں ہے۔

غالب :- کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حافظ :- آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ

خیال دونوں کا یکساں ہے غالب کے یہاں زود پشیماں ہے۔ اور حافظ کے یہاں دل نرم، غالب کے یہاں جفا سے توبہ۔ حافظ کے ہاں بہر ثواب بنماز آمدہ۔

غالب :- دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

ناطق مکرانی :- لذت ز زخم بسکہ دل زار من گرفت
ناخن زدم بسینہ اگر بہ شدن گرفت

جو کچھ میں لکھتا آ رہا ہوں اس موضوع کے خلاف ایک مزیدار بات سنئے۔ غالب نے ناطق مکرانی کے شعر سے استفادہ کیا یا نہیں کیا مگر حضرت شاد لکھنوی پیرو میر مرحوم نے تو کمال ہی کر دیا سنئے
کوئی دم راحت جنوں کے ہاتھ سے پائیں گے کیا

زخم بھر جائیں گے تو ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا

حال عاشق اُن کو سننے کا مزا ہے اس قدر
ہم کہے جائیں گے جتنا وہ کہے جائینگے کیا

میرے سر آنکھوں پہ بیٹھیں حضرت ناصح جو آئیں
پر جو میں سمجھوں نا وہ پھر مجھکو سمجھائینگے کیا

فاقہ مستی ہے یہی اے شاد تو مثل کباب
فاقہ مستی میں سوائے داغ ہم کھائینگے کیا

غالباً غالب کے ان مضامین کے شعر سب کو یاد ہوں گے لکھنا بے سود ہے اسی بحر اور اسی قافیہ میں دیکھئے

غالب :- آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

عرفی :- منم آن سیر زجان گشتہ کہ با تیغ و کفن
تا در خانۂ جلاد غزل خواں رفتم

عرفی کے یہاں غزلخواں رفتم والا ٹکڑا اس قیامت کا ہے کہ جواب ہی نہیں۔

غالب :- ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد
ہمنے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

سعدی :- سعدیا حب وطن گرچہ حدیثی است صحیح
نتواں مُرد بہ سختی کہ من اینجا زادم

یہاں خیال بالکل ایک ہے۔ گو ظاہر الفاظ میں فرق بھی ہو مگر موضوع مضمون سے باہر نہیں ہے۔

غالب :- ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

شیخ شرف الدین نیشاپوری :- بیم از وفا داریدہ وعدہ کہ من
از ذوق وعدۂ تو بیفزود آنی رسم

میں نے کہا تھا کہ تو وعدہ کر اور ایفائے وعدہ کا خیال ہی نکر ادھر تونے وعدہ کیا اور ادھر خوشی سے ہمارا دم نکلا بالکل یہی خیال غالب کے یہاں ہے فرق کی ہے کے یہاں قبل وعدہ ہے اور یہاں بعد وعدہ۔

غالب :- ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

لا اسلم :- غرقۂ بحریم ما را در دیار ما مپرس
لقمۂ کام نہنگیم از مزار ما مپرس

غالب کے شعر میں جان خیال یہی بات ہے کہ دریا میں ڈوب جاتے نہ تو جنازہ اُٹھتا نہ مزار بنتا۔ دوسرے شعر میں بھی یہی ہے۔ مگر غالب کے یہاں حسرت غرق ہے اور فارسی شعر میں اخبار بعد الغرق

غالب :- دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ملا غنیمت :- ز بس جوش سینہ با جولانگہ برق
دل ہر ذرہ در جوش انا الشرق

ذرہ اور قطرہ ۔ انا البحر ۔ اور انا الشرق میں کوئی فرق ظاہر نہیں ہوتا

غالب :- بلائے جان ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

لا اعلم :- ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اگرچہ الفاظ ظاہر میں فرق ہے مگر مضمون دونوں ایک ہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب نے زیادہ صراحت سے کام لیا ہے۔

غالب :- بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

عرفی :- وقت عرفی خوش کہ نکشود ند چوں در بر رخش
بر درِ نکشودہ ساکن شد در دیگر نزد

غالب کہتے ہیں کہ بندگی اور ذوقِ طاعت گذاری میں بھی ہم آزاد ہیں اگر کعبہ کا دروازہ بھی نہ کھلا تو واپس آگئے۔ عرفی کا خیال ہے کہ درِ دوست نہ کھلا تو اسی بند دروازہ کے پاس ٹھہر گئے۔ مگر دوسرے دروازہ پر نہیں گئے۔ تقریباً ایک خیال دوسرے خیال کی ضد ہے۔

غالب :- گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

بیدل :- دل شوریدۂ ما شورِ امکاں در نظر دارد
گہر دزدیدہ ایجازِ زبانِ موجِ دریا را

تقریباً ایک مضمون ہے جسمیں کوئی خاص فرق سوائے زبان کے نہیں ہے۔

غالب :- ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

فیضی :- در ہر بنِ مو کہ مے نہی گوش
فوارۂ فیض اوست در جوش

غالب کا خیال ہے کہ ہر بُنِ مو چشمِ بینا بن گیا ہے مگر میں اب تک محرمِ حسن نہیں ہوا۔ فیضی کہتا ہے کہ ہر بال ایک فوارۂ جوشانِ فیضِ الٰہی ہے بناءِ اشتراکِ خیال بنِ مو پر رکھی گئی ہے۔

غالب :- میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

بیگی دختر امیر علی جلائر :- من اگر توبہ ز مے کردہ ام اے سروِ سہی
تو خود ایں توبہ نکردی کہ مرا مے نہ دہی

شیخ علی حزیں :- چہ شد از توبہ اگر دامن خشکے داریم
پیش ابرِ کرمِ پیرِ مغاں اینہمہ نیست

بجنسہ خیال بیگی کے شعر سے ملتا ہے۔ رہا علی حزیں کا شعر وہ بھی کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ غور کرنے پر اُسی منزل پر جا پہونچتا ہے۔

غالب :- مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

عمر خیام :- مے خوردنِ من نہ از برائے طرب است
نے بہر فساد و ترکِ دین و ادب است
خواہم کہ بیخودی بر آرم نفسے
مے خوردن و مست بودنم زین سبب است

یہ کہنا بیکار سی بات ہے کہ دونوں مضمون ایک ہیں۔ مگر یہ لکھنا ضروری ہے کہ یہ مضمون عمر خیام کا خاص مضمون ہے جو اکثر اُن کی رباعیوں سے ظاہر ہوتا ہے

غالب :- مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

فیضی :- آں شکارم من کہ ہم لایق بہ کشتن نیستم
شرم مے آید مرا زانکس کہ صیادِ من است

بنائے خیال دونوں شعروں میں یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ فیضی کہتا ہے میں ایسا شکار ہوں کہ مار ڈالنے کے قابل نہیں ہوں اسیوجہ سے مجھے اپنے صیاد سے شرم آتی ہے۔ غالب بھی یہی کہتے ہیں کہ میں اس کے لائق نہیں کہ وہ مجھکو ہلاک کرے لہذا کوئی اور تدبیر کرنی چاہئے

غالب :- ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

عرفی :- از من مگیر عبرت و کسب ہنر مکن
با بخت خود عداوت ہفت آسمان مخواہ

ہنرمندی پر آسمان کا دشمن ہونا دونوں شعروں میں موجود ہے یہی بتلانے اشتراک خیال ہے۔

غالب :- پوچھتے وہ ہیں کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

عالی :- زمردم یارسی پرسد کہ عالی کیست طالع ہیں
کہ عمرم در محبت رفت و کارم آخر رسید اینجا

اگرچہ پہلا مصرع بالکل ملتا جلتا ہے۔ مگر مضمون بالکل عام اور پیش پا افتادہ ہے۔ جو ہر شخص کے ذہن میں آسکتا ہے

غالب :- کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

گر دغا شدند حریفان بزم عشق برخاک ریز جرعۂ مرد آزمائے ما

مئے مرد افگن - اور جرعۂ مرد آزما مشارکت خیال کا سبب ہیں۔ اور خیال بھی تقریباً یکساں ہیں۔ مرزا فاخر مکیں کا بھی یہی مضمون ہے

زاں سیر تان دور جہاں را خبر کنید ساقی گرفت جرعۂ مرد آزمائے ما

غالب :- چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

خسرو :- خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند
آرے آرے میکند با خلق و عالم کار نیست

خیال عام اور معمولی ہیں۔ مگر اتنے قریب ہیں کہ جدائی مشکل ہے۔

غالب :- گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر

عرفی :- نہ کوتہی ز عطا بود و عشق مے داند
کہ بر کرشمۂ ما تنگ بود خلعت طور

عرفی نے کہا تھا کہ ہم پر جو برق تجلائے طور نہیں گری تو یہ عطا کی کوتاہی نہیں تھی عشق کو یہ راز معلوم ہے کہ ہمارے جسم پر خلعت طور تنگ تھی یعنی وہ ہمارے قابل نہ تھی۔ غالب کے یہاں خیال اس سے گھٹا ہوا ہے وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ طور پر برق تجلی کیوں گری ہم پر گرتی۔

غالب :- یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

خسرو :- زبان شوخ من ترکی و من ترکی نمیدانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من

دوسرے مصرعوں میں ایک قسم کا فرق ہے۔ خسرو کا مصرع نہایت چست ہے اگرچہ غالب کا بھی فلسفیانہ انداز کا نہایت کامیاب مصرع ہے۔

غالب :- صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر
تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

بیدل :- در طینت فسردہ صفا ہا کدورت است
آئینہ میکند ہمہ زنگار آب را

دونوں شعر الجھے ہوئے ہیں سلجھائیے تو ماحصل ایک نکلے گا۔

غالب :- نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا داغ زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

بیدل :- منزل عیش تو وحشت کدۂ امکاں نیست
چمن از سایۂ گل پشت پلنگ ست اینجا

در وحشت ایں بزم بعشرت نتواں زیست
ہر چند حیرا غانش کنی پشت پلنگ ست

غالب کہتے ہیں کہ :- عیش وجاہ سے وحشت کا سدباب نہ ہوسکا۔ زہرہ کا داغ بھی میرے لئے داغ پلنگ یعنی سرمایۂ وحشت بن گیا۔ بیدل کہتا ہے کہ وحشت کدۂ عالم میں یہ صلاحیت نہیں کہ منزل عیش بن سکے چمن سایۂ گل سے پشت پلنگ بنگیا ہے۔ دوسرے شعر کا مضمون یہ ہے کہ اس بزم میں جس قدر عشرت کا سامان کروگے باعث وحشت ہوتا جائیگا۔ اور چراغان میں پشت پلنگ کا جلوہ نظر آئے گا۔

غالب :- فلک سے ہمکو عیش رفتہ کا کیا تقاضا ہے
متاع بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

نظیری :- نقدے کہ دزداں بردہ است از کیسۂ عمرم برون
جاوید مستغنی شوم ار صد دہد گر نیمہ را

بنائے خیال رہزن سے متاع بردہ کی اُمید واپسی پر مبنی ہے جو دونوں شعروں میں موجود ہے۔

غالب :- نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگادے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

شیخ علی حزیں :- کتان طاقتم را پردہ داری مے کند خطش
رخش در شام خط ماہ سحاب آلودہ را ماند

غالب کا خیال ہے کہ آئینہ کے خس جوہر کو اُس کے سبزۂ خط سے طراوت پہونچی رہتی ہے ورنہ میرے معشوق کا چہرہ خانۂ آئینہ میں آگ لگادے شیخ علی حزین کا خیال تھا کہ میرے کتان صبر کی پردہ داری اس کا حسن کرتا ہے خط جو اسکے رخسارہ کو ڈھانک رہا ہے وہ ایک سحاب ہے جسکی وجہ سے میرے کتان صبر پر اس چاند کا پورا اثر نہیں پڑسکتا ورنہ اگر یہ سحاب یہ سبزہ ہو تو کتان صبر پارہ پارہ ہوجائے۔ اس شعر میں پرواز خیال یکساں ہی مضمون میں کچھ نہ کچھ فرق ہے :-

غالب :- پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

شیخ علی حزیں :- گرانجاں تر ز شبنم نیست جسم ناتوان من
اگر مے بود با من روے گرمی آفتابش را

غالب کا خیال ظاہر ہے شیخ کا خیال ہے کہ میرا جسم ناتوان شبنم سے زیادہ تو گرانجاں ہے نہیں کہ وہ مجھ پر نظر عنایت کرے اور فنا ہوجاؤں

صائب کہتا ہے :- بہ اندک روئے گرمی پشت بر گل میکند شبنم
چرا در آشنائی اینقدر کس بیوفا باشد

آفتاب کی تھوڑی سی توجہ میں شبنم پھول پر لات ماردیتی ہے۔ بڑا افسوس ہے آشنائی اور پھر یہ بیوفائی۔

غالب :- کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

خسرو :- زہے عمر دراز عاشقان گر
شب ہجران حساب عمر گیرند

دونوں شعر ایک ہی مضمون کے ہیں کیا فرق کیا جائے۔ البتہ مندرجہ ذیل خیال کچھ شاید علحدہ ہے

سپہری مدینۃ السادات :- ز خضر عمر فزون نیست عشقباز انرا
اگر ز عمر شمارند شام ہجران را

غالب :- قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

بیدل :- آنجا جواب نامۂ عاشق تغافل است
بیہودہ انتظار خبر مے کشیم ما

مضمون دونوں ایک ہیں مگر عام مضمون ہیں بہت ممکن ہے کہ بغیر پہلا شعر دیکھے ہوئے دوسرا شعر کہا گیا ہو۔

غالب:- اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

خاقانی:- من وبلائے تو نطع ادیم وتاب سہیل
من وجفائے تو شاگرد وسیلیِ استاد

ظہیر فاریابی:- صد بھلائے عشق را کے بو الہوس را قبول
کے شناسد طفل قدر سیلیِ استاد را

غالب کے یہاں بصورت عمومیت، خاقانی کے یہاں بصورت خصوصیت، ظہیر کے یہاں بصورت نفی ایک ہی مضمون کو باندھا گیا ہے بنائے اشتراک خیال سیلیِ استاد کے سوا کچھ نہیں ہے۔

غالب:- سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

خسرو:- اے گل چو آمدی ززمیں گو چگونہ اند
آنرو نہا کہ در تہ گرد فنا شدند

عمر خیام:- ہر سبزہ کہ بر کنار جوئے رستہ است
گویا زلب فرشتہ خوئے رستہ است
پا بر سر سبزہ تا بخواری ننہی   کاں سبزہ زخاک ماہروئی رستہ است

اگرچہ خسرو کے یہاں کچھ تفاوت کے ساتھ کہا گیا ہے۔ مگر دراصل یہ مضمون عمر خیام کا حصہ ہے جو ادنے ادنے تغیر کے ساتھ متعدد مرتبہ کہا گیا ہے۔

غالب:- میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سنکر مرے نالے غزلخواں ہوگئیں

عالی شیرازی:- آب ورنگ گلستاں عشق اکنوں از منست
عندلیباں ہر چہ میگویند مضمون از منست

دونوں مضمون تقریباً یکساں ہیں۔ عالی کے یہاں دبستاں نہیں ہے مگر اُس کے نہ ہونے سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

غالب:- وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

عرفی:- بکیش برہمناں آنکس از شہیدانست
کہ در عبادت بت روئے برزمیں میرد

دونوں کی بنائے خیال وفاداری پر مبنی ہے مضمون قریب قریب ایک ہے۔

غالب:- جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

عرفی:- زفروغ آفتابم بخود خبر کہ بے تو
چہ دو زلف تست یکساں شب وروزم از سیاہی

دونوں شعروں کی بنا اس مضمون پر ہے کہ سیہ نصیبی کی وجہ سے ہمارے یہاں دن رات یکساں ہے۔

غالب:- بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

فیضی:- دریاب کہ ما نیست زدل قطرۂ خونے
آں قطرہ ہم از دست تو لبریز چکیدن

مضمون دونوں کا تقریباً ایک ہی ہے۔ کوئی خاص بات قابل تفریق نہیں۔ میر عبدالجلیل بلگرامی نے ایک عجیب طریقہ سے دل کو آمادۂ چکیدن بنایا ہے، ایک رحمت اللہ کی تعریف میں کہتے ہیں۔

ز مژہ ارید بینی نگاہ دیدن   چو قطرۂ دل بہائے چکیدن

غالب :- مے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

مولانا جامی :- آسمان جام نگوں دان کز مے عشرت تہی است
جستن مے از تہی ساغر نشان ابلہی است

تقریباً ایک مضمون ہے چند الفاظ کی کمی و بیشی پر ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

غالب :- مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

از مکر نقش ناف زمین ناف غزال است مشکیں ز چہ شد ورنہ لباس حرم آیا

خاقانی :- ناف زمیں است کعبہ مگر ناف مشک شد
کاندر سموم کرد اثر مشک از نفس

نافۂ آہو شد ست ناف زمین از صفا عقدۂ دہیکر ست بیکر باغ از ہوا

خیال کی جان اتنی سی بات ہے کہ کعبہ ناف زمین ہے اور وہ ناف غزال ہوگیا۔ یہی غالب کے یہاں ہے اور یہی خاقانی کے یہاں

غالب :- کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

خاقانی امروز کم خور اندہ فردا چہ دانی آنکہ
ایام قفل بر در فردا بر افگند

خیال صرف اتنا سا مشترک ہے کہ آج کل کا غم نہ کرنا چاہئے۔ مگر اسمیں خاقانی کا خیال بہت ہی ارفع و اعلیٰ ہے

غالب :- دل سے مٹنا تیرے انگشتِ حنائی کا خیال
ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

خاقانی :- وصل تو بے ہجر تواں دید نے
گوشت جدا کے شود از استخواں

خاقانی کا پہلا مصرع اس مفہوم کا ہے کہ تیرا وصل بغیر ہجر نا ممکن ہو دوسرا مصرع تمثیلی بالکل ایک ہے۔

غالب :- کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

نظیری :- راز دیرینہ ز رخ پردہ بر انداخت دریغ
حال من شہرہ بانشاد غزل کرد دریغ

تقریباً دونوں مضمون ایک ہیں۔ کوئی خاص فرق نہیں ہے

غالب :- ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

مینائے مے از تندیٔ این مے بگدازد بیجام غمت در خور تحویل صبا نیست

اصل خیال یہ ہے کہ شیشہ شراب کی گرمی سے پگھل گیا' یہ دونوں میں موجود ہے۔

غالب :- سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ایسے ہی موقع پر سعدی لکھتے ہیں :-

رہ عقل جز پیچ بر پیچ نیست بر عارفاں جز خدا ہیچ نیست
تواں گفتن این با حقائق شناس ولے خورده گیرند اہل قیاس
کہ پس آسمان و زمیں چیستند بنی آدم و دام و دد کیستند

گو الفاظ نہیں ملتے لیکن خیال بالکل ملجاتا ہے۔ اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے

غالب :- جلاد سے لڑتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

لا اعلم :- ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوشش
من انداز قدرت را می شناسم

خیال عام سا ہے۔ لیکن مشابہت کی وجہ سے لکھ دیا گیا

غالب :- ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

فسونی تبریزی :- با وجود بیرسم آسودہ میشوم از دور
نہ دیدہ حال مرا وقت بیقراری حیف

غالب کے یہاں یہ خیال نہایت عمدگی سے ادا ہوا ہے مگر خیال ایک ہے
فسونی کہتا ہے کہ میں جب اُس کو دیکھتا ہوں آسودہ ہو جاتا ہوں
وہ مجھے اچھا اور تندرست جانتا ہے۔ غالب کے یہاں برعکس ہے

غالب :- غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

نظیری درخور اگر نیم سے لالہ فام را
اے کاش تر کنند بہوسے مشام را

اگرچہ خیال عام ہے۔ مگر مشابہت ضرور ہے

غالب :- تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

بیدل زجیب ہر مژہ آغوش میچکد اینجا
کہ جائے تو ہمہ در چشم مردماں خالی است

ظاہرا دونوں خیال جدا معلوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے پر دماغ
یکساں ہی نتیجہ پر پہونچتا ہے۔

غالب :- بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

ظہوری :- تو نظر باز نہ ورنہ تغافل نگہ ہست
تو سخن فہم نہ ورنہ خموشی راز ہست

مشابہت یہ ہے کہ دونوں نے تغافل کو نگاہ مانا ہے :-

غالب :- زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے

سیلی ہروی :- دارد خموش تا من حسرت کشیدہ را
گوید شنیدہ ام سخن ناشنیدہ را

دونوں شعر کے خیالات بالکل ایک ہیں اور دونوں جگہ نہایت دلکشی
سے ادا ہوئے ہیں

غالب :- زبسکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے
کشاد و بست مژہ سیلیٔ ندامت ہے

بیدل :- دیدہ را کہ بنظارۂ دل محرم نیست
مژہ برہم زدن از دست ملامت کم نیست

دونوں خیال ایک دوسرے کی ضد ہیں مگر مژہ برہم زدن دونوں کے
یہاں سیلی ملامت مانا گیا ہے اور اصل خیال یہی ہے۔

غالب :- پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

عرفی :- بیار بادہ کہ جانم دے زنالہ برآید
ہزار زمزمہ از دل بیک ترانہ برآید

خیال عام ضرور ہے۔ مگر دونوں میں مشابہت پوری پوری موجود ہے

غالب :- نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں
وہ زخم تیغ ہے جسکو کہ دلکشا کہیے

علی سرہندی :- مسرت گردم بزن تیغ دو سہ بالا دل کشا
دلم تنگ است کار از زخم پیکاں برنمی آید

اسیطرح ناصر علی نے اس مضمون کو یوں بھی کہا ہے

اے زتیرت جستہ از چشم غزالاں خوابہا
سینہ را از تیغ بیدا دِ تو فتح البابہا

غالب نے اپنے کسی خط میں لکھا ہے کہ زخم تیغ کو دلکشا کہنا میرا ایجاد کردہ مضمون ہے ۔ مگر سرہندی اور ناصر علی کے شعر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کو غالب سے پہلے ظاہر کیا جاچکا ہے :۔

غالب :۔ تا کجا اے آگہی رنگ تماشا باختن
چشم وا گردیدہ آغوش وداع جلوہ ہے

بیدل :۔ چشم وا کردن کفیل فرصت نظارہ نیست
پرتو ایں شمع آغوش وداع محفل ست

غالب کہتے ہیں کہ اے آگہی دیکھنے کو دیکھنا نہ سمجھ بلکہ دیدۂ وا شدہ وہ آغوش ہے جو وداع کے وقت کھولی جاتی ہے ۔ بیدل کا خیال ہے کہ آنکھ کھولنا فرصت نظارہ کا کفیل نہیں بلکہ اس شمع کا پرتو وداع محفل کے لئے آغوش وا شدہ ہے ۔

غالب :۔ کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

لا اعلم :۔ سیہ بختیاں قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ مے آرد سکندر را

دونوں عالم خیال ہیں چونکہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں صرف اسلئے لکھے گئے ہیں۔

غالب :۔ باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

عالی شیرازی :۔ کشد چو خونے چمن بے تدرت جمال ترا
گزد چو مار حسیبہ سایۂ نہال ترا

مولانا حالی نے اس شعر کو مضمون غالب کا ہم مضمون بتایا ہے جو ذیل میں درج ہے ۔ مگر در اصل وہ نہیں ہے بلکہ جو اوپر لکھا گیا ہے وہ ہم مضمون ہے ۔

نظیری :۔ بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نوا گران نخوردہ گزند را چہ خبر

ذوق :۔ سایۂ سرو چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے
اژدہا بن بن کے شب اے رشک گل آتا ہے مجھے

غالب :۔ اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

عرفی :۔ حلہ ہا سوختہ اند اہل بہشت از غیرت
تا شہیدان تو گلگوں کفنے ساختہ اند

دونوں خیالوں کی یکسانیت ظاہر ہے کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے

غالب :۔ بیان کس سے ہو ظلمت گستری میرے خرابے کی
شب مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

خاقانی :۔ آں اسیر تیرہ روزستم کہ عمرے در جہاں
آفتاب از روزن دیوار زنداں دیدہ ام

غالب پنبہ کو شب مہ ۔ اور خاقانی روزن دیوار زنداں کو آفتاب کہتا ہے عنوان بیان ملتا جلتا ہے ۔

غالب :۔ در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
اینکہ من نمے میرم ہم ز ناتوانیہاست

بیگی دختر امیر علی جلائر :۔ جاں بہ لب از ضعف تو نامد رسید
ما بزور ناتوانی زندہ ایم

مومن :- اب تو مرجا نا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

خیالات میں کوئی فرق قابل بیان نہیں معلوم ہوتا ایک دوسرے کا چربہ ہے۔

غالب :- بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہیلی ہروی :- زبیخودی شدہ ام محو گر یہ سے خواہم
کہ ہرچہ مے شنوی ناشنیدہ انگاری

میلی کہتا ہے میں جنوں میں بک رہا ہوں جو تو سنے اسکو نہ سنا ہوا سمجھنا

غالب :- زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

خاقانی :- زیں نام چو تر کنم زباں را
صد بوسہ دہد لبم زباں را

بالکل ایک خیال ہیں بلکہ خاقانی کے یہاں بہت بہتر ہے

غالب :- چھوڑا اسد رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

غیاثی استرآبادی :- ناصت زرشک پیش کسے چوں نمی برم
آیا سراغ از کہ کنم منزل ترا

بالکل ایک خیال ہے۔ کوئی فرق قابل بیان نہیں معلوم ہوتا۔

غالب :- بیخود بوقت ذبح طپیدن گناہ من
دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

بیجرم عذر جرم نگفتن گناہ من باصد گنہ قصاص نکردن گناہ کیست

اس شعر میں صرف انداز بیان ملتا ہے مضمون دونوں علحدہ ہیں

اس قدر شعر غالباً کچھ کم نہیں ہیں جنسے ہمارے پاس اس حملہ کی توثیق ہوتی ہے کہ غالب کے توارد سے اگر لوگ فخر کرسکتے ہیں تو وہ کس قدر ہیں

اب ہم اساتذہ اردو کے شعر لکھتے ہیں جو غالب سے بہت پہلے گزری ہیں ملاحظہ ہو۔

غالب :- کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

یاسمن :- یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اگر کوئی فرق ہے تو صرف اس قدر کہ غالب کے شعر کو زیادہ اسکی شرح کہہ سکتے ہیں ورنہ اور کچھ نہیں۔

غالب :- دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میر :- عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھک گیا

دونوں کے خیالات پامال اور فرسودہ ہیں مگر یکسانیت ضرور ہے۔

غالب :- یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ذوق :- کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

غالب اور ذوق دونوں نے ایک ہی بات کہی ہے صرف دونوں کا انداز بیان دیکھئے باقی خیالات کو نظر انداز کر دیجئے

غالب :- ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

میر ممنوں :- تفاوت قامت یار اور قیامت میں ہے کیا ممنوں
وہی فتنہ ہے لیکن یہاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

غالب :- موسم گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
خوب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

سودا :- زباں ہے شکوہ میں قاصر شکستہ بالی کے
کہ جیسے دل سے اٹھایا خلش رہائی کا

بنائے خیال بے پروائی کے شکر یہ پر ہے۔ جو دونوں شعروں میں موجود ہے مضمون بھی قریب قریب ایک ہی ہے

غالب :- ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

میر درد :- خلوت دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل
حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبال گوش ہے

مفہوم دونوں کا تقریباً ایک ہے پہلے مصرع میں کچھ تباین ہے جو قابل توجہ نہیں۔

غالب :- نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خواجہ حسن اللہ بیاں :- عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آ سکتی نہیں
رحم آتا ہے بیاں اب مجھکو اپنی آہ پر

دونوں مضمونوں میں سوائے چند لفظوں کے تغیر کے کوئی فرق نہیں ہے

غالب :- عشق و مزدوری عشرت گہہ خسرو کیا خوب
ہم کو منظور نکو نامی فرہاد نہیں

انعام اللہ خاں یقیں :- نہ تھا عیش کی خسرو کو فرصت قصر شیریں میں
جو میں ہوتا تو بجائے شیر جوئے خوں رواں کرتا

طرز ادا میں فرق ہے مگر مفہوم دونوں کا وہی رشک رقابت پر ختم ہوتا ہے

میر :- مت ڈھلک مژگاں سے میرے اے سرشک آبدار
مفت ہی جاتی رہیگی تیری موتی کی سی آب

غالب :- توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

مضمون دونوں تقریباً ایک ہیں مگر غالب کا انداز بیان نہایت چست اور مصرع اولیٰ بہت ہی اعلیٰ ہے۔

غالب :- ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

میر :- منتظر قتل کے وعدہ کا ہے اپنے یعنی
جیتا مرنے کے لئے ہے یہ گنہ کار ہنوز

دونوں شعروں کی بنائے خیال اسبات پر ہے کہ ہم مرنے کے لئے زندہ ہیں

غالب :- ہمنے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک

میر :- بالیں پہ میرے گھرسے وہ روے گا جب تلک
کر جاؤں گا سفر ہی میں دنیا سے تب تلک

خواجہ میر درد :- کی تو تھی تاثیر آہ آتشیں نے اُس کو بھی
جب تلک پہونچے ہی پہونچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

غالب اور میر درد اور میر کے شعروں میں کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوتا مفہوم سب کا یکساں ہے۔ الفاظ جدا جدا ہیں۔

غالب :- ہے ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

دونوں شعر یکساں ہیں کوئی خاص بات ایسی نہیں جو قابل اظہار ہو

غالب:- نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

میر:- سراہا اُن نے ترا ہاتھ جس نے دیکھا زخم
شہید ہوں میں ترے تیغ کے لگانے کا

مفہوم دونوں شعروں کا یکساں ہے۔ الفاظ و زبان مختلف ہیں

غالب:- آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

میر:- سر سے باندھا ہے کفن عشق میں تیرے یعنی
جمع ہم نے بھی کیا ہے سر و ساماں یکجا

غالب کا شعر میر کے شعر سے بہت چست ہے۔ اور مضمون میں بھی کچھ تھوڑا سا فرق ہے۔

غالب:- قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

میر حسن:- گرچہ دل کو ہے یقین خط تو نہیں لکھنے کا وہ
پر تقاضہ شوق کا لکھنے سے کب ہٹتا ہے باز

غالب:- ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

سودا:- یہ تمنائے جبیں بدر بھی ہوتا ہے ہلال
بسکہ یاں سجدے کے مشتاق ہیں ارباب کمال

بنائے خیال دونوں شعروں میں یہ ہے کہ بدر تیرے آستاں پر ناصیہ سائی کی تمنا میں ہلال ہو جاتا ہے۔

غالب:- ہے کیا جو کس کے باندھیئے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

آبرو:- آبرو کے قتل کو حاضر ہوے کس کر کمر
قتل کرنے کو چلے عاشق پہ تہمت باندھکر

دھمکاؤ تے ہو ہمکو عبث باندھکر کمر کھولوں ابھی تو جائے میاں کا بھرم نکل

آبرو کے پہلے شعر میں ایہام ہے لفظ تہمت میں جس سے شعر نہایت ہی لطیف ہو گیا ہے۔

اس قدر شعر نمونتاً لکھے گئے ہیں ورنہ بہت سے شعر متقدمین کے ایسے ہیں جن کے لکھنے کے لئے مجھکو ایک مستقل مضمون کی ضرورت پڑے گی اَب اسکو ختم کر کے چند شعر معاصرین کے بھی لکھتا ہوں۔

غالب:- ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

آزردہ:- ہیں تو احباب فراہم نہ ہو سامان طرب
بزم ماتم تو ہے گو انجمن سعد نہیں

بجز الفاظ کے دونوں شعروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بالکل ایک ہیں

غالب:- دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا

ذوق:- ذکر کچھ چاک جگر سینے کا مُن سن اپنے
دیکھ کر زخم کو میں دیکھوں ہوں ناخن اپنے

اگرچہ غالب کے یہاں نہایت چستی سے یہ مضمون بندھا ہے مگر اس سے کیونکر انکار کیا جائے کہ مضمون ایک ہی ہے۔

غالب:- نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

ذوق:- وہ ہوں میں رہ نورد شوق میرے ساتھ جاتا ہے
برنگ سایۂ مرغ ہوا نقش قدم میرا

بات ایک ہی ہے فرق صرف یہ ہے کہ غالب نقش قدم کو حباب موجِ رفتار اور ذوق سایہ مرغ ہوا بتلاتے ہیں۔

غالب :- لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

ذوق :- بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج
کہہ تو ہی اے مسیح کہ پھر تیرا کیا علاج

غالب :- منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

آتش :- ہو گیا سلسلہ مہر و محبت برہم
نازنیں بھول گئے ناز و ادا میرے بعد

غالب :- آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

مومن :- تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے   ہم تو کل خواب عدم میں شبِ ہجراں ہونگے

ذوق و غالب کے شعر میں کوئی فرق نہیں۔ آتش اور غالب کے شعر میں صرف الفاظ کا فرق ہے۔ مومن کے شعر میں شبِ ہجر۔ اور غالب کے یہاں اس کا بدل عشق ہے۔

غالب :- کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
مرتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھکر

شیفتہ :- کس توقع پہ جئیں شیفتہ مایوس کرم
غیر پر بھی ستم یار کی افواہیں ہیں

مقصد ایک ہے صرف انداز بیان میں کچھ فرق ہے۔

غالب :- یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

ذوق :- کیا اعتبار ہستی ناپائدار کا ہو
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

اگرچہ غالب کا شعر انتہائی بلیغ ہے۔ مگر تشبیہ ذوق سے علیٰحدہ نہیں ہے

غالب :- غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

آغا جان عیش :- اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنسکر گزار یا اسے رو کر گزار دے

غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مآل اور مفہوم دونوں شعروں کا ایک ہی ہے

غالب :- آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

شیفتہ :- اُنسے میں شکوہ کی جا شکر ستم کر آیا
کیا کروں تھا مرے دلمیں سو زباں پر آیا

غالب کے یہاں فکر قبل از وقوع واقعہ۔ اور شیفتہ کے یہاں فکر بعد وقوع واقعہ ہے۔ اور کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔

غالب :- میں اور صد ہزار نوا ہائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

ذوق :- یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

غالب کے یہاں نہ شنیدن۔ اور ذوق کے یہاں شنیدن و خموشی صرف اسیقدر فرق ہے خیال ایک ہے

غالب :- جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

مومن :- اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

طرزِ بیان میں چونکہ دونوں مشاق ہیں اس لئے فرق معلوم ہوتا ہے ورنہ مآل ایک ہی ہے۔

غالب:- قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مومن:- چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

غالب:- مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

ذوق:- مئے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم
کہ آخر جب اُسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا

ایک ادنیٰ سا فرق ہے اور کچھ نہیں۔ ذوق کے یہاں ذکر بعد الواقعہ غالب کے یہاں ذکر قبل الواقعہ۔

غالب:- عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی   میری وحشت تری شہرت ہی سہی

شیفتہ:- عشق ذلت ہے تو ذلت ہی سہی
میری ذلت تری عزت ہی سہی

اندازِ بیان یکساں ہے۔ مضمون ناقابلِ تقابل ہے اگرچہ یکساں ہو

غالب گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مومن:- کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

غالب کے یہاں پہلے مصرعہ میں ایک کلیہ دوسرے میں واقعہ۔
مومن کے یہاں دونوں مصرعوں میں واقعہ ہے یہی فرق ہے۔

غالب:- نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

ناسخ:- شکل نظر نہیں پڑی آیا نہیں پیام بھی
برسوں ہوئے کہ ایک سی حالتِ چشم و گوش ہے

غالب:- خوب تھا ہوتے جو پہلے سے ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

مومن:- مانگا کرینگے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

دونوں خیال بالکل یکساں ہیں طرزِ ادا اور الفاظ میں البتہ فرق ہے مگر چست دونوں ہیں۔

غالب:- قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

عارف شاگردِ غالب:- نہ خداوند کو گر پاک و منزہ سمجھوں
کب گوارا ہو مجھے تیرا نگہباں ہونا

حاصل خیال یہ ہے کہ تو ایسا نہیں ہے کہ میرا رشک تجھے خدا کو سونپنے دے

غالب:- نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

مومن:- مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر اک بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

اصل خیال یہ ہے کہ تمہارا نام ایسا نہیں ہے کہ اس کو نہ سنا جائے
انداز بیان جداگانہ ہیں۔

غالب:- چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

آتش:- قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مرے
خط دیا لیکن نہ بتلایا نشانِ کوئے دوست

اگرچہ دونوں نئے نئے عنوان سے بیان ہوئے ہیں مگر اصل خیال یہ ہے کہ دوسروں کے سامنے ہم تیرا نام نہیں لے سکتے۔ پہلے ہی لکھا جاچکا ہے کہ معاصرین کے خیالات بہت سے غالب سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لئے جس قدر خیالات جمع کرکے لکھے گئے وہ ایک خردبین نظر کے سامنے کم نہیں ٹھہر سکتے۔ اور میں مضمون کو زیادہ طویل نہیں لکھنا چاہتا اس واسطے یہیں ختم کرتا ہوں۔ اب وہ حصہ باقی رہجاتا ہے جن میں غالب نے بار بار اپنے ہی خیالات کا اعادہ کیا ہے۔ مگر وہ دو قسم کے خیالات ہیں ایک قسم وہ جسمیں انھوں نے اپنے خیالات فارسی کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اور دوسرے وہ جسمیں خود اپنے ہی اُردو کلام سے فائدہ اُٹھایا ہے گر کوئی سوال کرے کہ وہ کس قدر ہیں تو میں کوئی صحیح جواب دینے سے مجبور ہوجاوں گا۔ میں چاہتا تھا کہ فارسی کے ترجموں کو بالکل چھوڑ دوں۔ مگر اس خیال میں کچھ استقلال پیدا نہیں ہوا۔ لہذا پانچ چھ شعر نمونہ کے لئے لکھے دیتا ہوں:۔

غالب:۔ سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

خود را ہمی بہ نقش طرازی علم کنم تا با تو خوش نشینم و نظارہ ہم کنم

غالب:۔ ہم ہیں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

گرد ہم شرح ستمہائے عزیزاں غالب رسم اُمید ہمانا ز جہاں برخیزد

غالب:۔ مشکین لباس کعبہ علی کے قدم سے جاں
ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

غالب:۔ از مکر تمثل ناف زمیں ناف غزال ست
مشکیں زچہ شد ورنہ لباس حرم آیا

غالب:۔ بے نذر کرم تحفہ ہے شرم ... ون سے خالی ہوجائے تو پھر
بجون غلطی ... آئین و سکون نام تھا صرف دماغ
خستۂ عجز ہیم داز ماجز گنہ مقد ... وہ ذہن کے سادہ اور اکات کو چند ضروری

غالب:۔ زندی شاعر تھا جس کے ذکر کو وہ سن لیتا تھا
ہم بھی کیا یاد ... نے کہہ زیادہ بہتر یہ ہے

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت میتواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

غالب:۔ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملی داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش آنروز کہ وقت باز پرس آید پیش
بگزار مرا کہ من خیالے دارم با حسرت عیشہائے ناکردہ خویش

یہ خیال کچھ مرزا غالب کے اس قدر دلنشین ہوگیا تھا۔ کہ انھوں نے بار بار اس کا اعادہ کیا ہے۔ چنانچہ مثنوی ابر گہر بار میں بھی اسکا اعادہ کیا ہے۔

میں اسیقدر لکھکر مضمون کو ختم کرتا ہوں چونکہ اردو کے تکرار خیالات کے لئے مستقل مضمون چاہئے لہذا اسپر کسی دوسرے وقت روشنی ڈالونگا بہت ممکن ہے کہ بعض حضرات اشعار مذکورہ میں الفاظ سے دھوکہ کھاکر شرحیں پیش کریں۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا ہوسکتا ہے مگر میں نے جس خیال کی بنا پر دو خیالوں کو یکساں ٹھہرایا ہے اسکو دفع کرنے کی بھی کوشش کریں۔ ورنہ یہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ ہر شعر کے لفظ جدا ہیں۔ بہرحال یہ ایک سعی ہی جو پیش کیجاتی ہے۔ اور وہ بھی محض ایک دوست کے اس اصرار پر کہ غالب کا ہر خیال نیا ہے اور اُس کے خیال بلند کی جگہ پر کسی دماغ کی رسائی نہیں۔ شاید اب اُن کی سمجھ میں آجائے۔ میرے عزیز دوست کو یاد رکھنا چاہئے کہ فن شاعری ایک ایسا فن ہے کہ اس میں کوئی بڑے سے بڑا شخص اپنے ذاتی اچھوتے خیالات پیش نہیں کرسکتا چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے بقول شخصے سہ یک چراغ ست دریں بزم کہ از پرتو آن ؞ ہر کجا مے نگرم انجمنے ساختہ اند۔

"آرگس"

چنگاری

(فسانہ)

ست مادہ پرست، بے انتہا سطحیات پسند اور ضرورت سے زیادہ جامد انسان تھا۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ قوت تنقید اس کی نہایت زبردست تھی۔ اور اگر وہ دنیا اور اس کے کاروبار کو ہمیشہ صرف "دو اور دو" کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھتا بلکہ کبھی کبھی وہ سطح سے گذر کر عمق تک بھی پہونچ جایا کرتا تو اس میں کلام نہیں کہ وہ نہایت اچھا نقاد ثابت ہوتا۔ شعر و شاعری سے اسے مطلقاً کوئی لگاؤ نہ تھا۔ لیکن جب وہ اپنے اصول کے لحاظ سے اس پر اظہار رائے کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ شاید وہ ایک حد تک صحیح کہہ رہا ہے۔

ایک دن آئینہ سامنے لئے بیٹھا تھا کہ دفعتہً کھڑا ہو گیا اور بولا کہ یوں تو میرے والدین کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں، لیکن ایک ظلم انھوں نے اتنا بڑا مجھ پر کیا ہے کہ میں شاید عمر بھر اُسے معاف نہیں کر سکتا۔ فرض کیجئے کہ آپ کو کسی چیز سے نفرت ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے آپ پر لازم کر دی جائے تو آپ کو دیوانہ ہو جانا چاہیئے یا نہیں۔ ذرا میری صورت کو ملاحظہ کیجئے اور اسی کے ساتھ میرے نام (یوسف) پر غور کیجئے کیا اس سے زیادہ ملعون مثال مبالغہ کی اور کوئی ہو سکتی ہے۔

جس وقت کوئی میرا نام لیکر پکارتا ہے تو فوراً والدین کی یہ شاعری میرے سامنے آجاتی ہے اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ کوئی نہایت مکروہ چیز میرے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے اور ہر شخص میرا نام لے لیکر گویا مجھے بدصورتی کا طعن دیا کرتا ہے۔"

وہ اپنے اطوار کے لحاظ سے نہایت سادہ انسان تھا اور چاہتا تھا کہ ہر چیز کو اسی سادگی سے دیکھے جیسی وہ نظر آتی ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ سطح سے گزر کر عمق کی طرف بڑھنا فطرت کی توہین ہے کیونکہ جس حقیقت کو اُس نے ہم سے چھپایا ہے اس کا احترام ہم پر واجب ہے اور اُس کو بے نقاب کرنا اپنے حدود سے بڑھ جانا ہے۔ وہ کہا کرتا کہ اگر آسمان نیلا نظر آتا ہے، تو اسے نیلا ہی کہو، اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ حقیقتاً نگاہ کا دھوکا ہے، نظر کا فریب ہے۔ علی الخصوص اُس وقت جب کہ ہماری کوئی غرض اُس سے وابستہ نہیں۔ تحقیق و تفتیش کے مفاد و نتائج کا وہ قایل ضرور تھا، لیکن اسی حد تک کہ خود اپنے استنباط و استقرا سے وہ کسی نتیجہ تک پہونچے، دوسرے کی مسلمات پر وہ خود اپنا کوئی نظریہ قائم نہیں کرتا تھا۔ وہ اُس کو ایسا ہی ناجائز سمجھتا تھا جیسے کسی اور کی ڈالی ہوئی بنیاد پر کوئی شخص اپنی عمارت طیار کرے حالانکہ اسے بالکل علم حاصل نہیں ہے کہ یہ بنیاد کس حد تک مستحکم ہے اور کس نوع کی عمارت کی متحمل ہو سکتی ہے۔

اس کا خیال تھا کہ دنیا میں ہر شخص ایک جداگانہ کام کے لئے پیدا ہوا ہے اور یہ وضعی اختلاف کسی تدبیر سے دور نہیں ہو سکتا اور نہ ایک انسان کو اپنے ان حدود سے متجاوز ہونا چاہیئے جو فطرت کی طرف سے مقرر ہیں۔ اسی لئے وہ سب سے زیادہ جن جماعتوں سے متنفر تھا، ان میں

پہلا درجہ اُس نے حکما و فیلسوف کا رکھا تھا اور دوسرا شعرا کا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر دنیا ان دونوں جماعتوں سے خالی ہوجائے تو پھر نہ کوئی فساد پیدا ہوسکتا ہے اور نہ عالم میں مکر و فریب کی اشاعت ہوسکتی ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی امن و سکون نام تھا صرف دماغ کی سادگی کا اور اخلاق کی بلندی صرف راست گوئی کا اور زبان کا وجود صرف اس لئے ہے کہ وہ ذہن کے سادہ اور اکات کو چند ضروری الفاظ سے بغیر کسی فضول اضافہ کے ظاہر کردے۔ شعرا میں صرف میرؔ ہی ایک ایسا خوش نصیب شاعر تھا جس کے ذکر کو وہ سن لیتا تھا اور غالب کا نام لینا تو اس کے سامنے کفر تھا۔ وہ کہا کرتا کہ "سرپنجۂ مژگان آہو" کی حقیقت پر غور کرنے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ میں اپنی بھینس کے لئے خود اپنے ہاتھ سے بھوسہ طیار کرنے میں وقت صرف کروں، یہاں تک خیر کوئی مضائقہ نہیں کہ

چلا نہ اُٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میرؔ
ابھی میں اُس کی گلی سے پکار لایا تھا

ایسا ہوتا ہے، ہوسکتا ہے اور محبت کی اس کیفیت کو نہایت سادہ اور بالکل ضروری الفاظ سے ظاہر کردیا ہے، لیکن 'ہوائے سیرِگل آئینہ بے مہری قاتل' کے کیا معنے؛ اگر صرف سیرِگل کافی ثبوت بے مہری کا ہوسکتا ہے تو دنیا کا ہر شخص بے مہر قاتل ہے اور اگر ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ قاتل کی سیرِگل صرف بے مہری کی بنا پر ہے تو اس کا ثبوت کیا الغرض وہ شاعرانہ مفروضات کا سخت دشمن تھا اور خصوصیت کے ساتھ وہ شاعری جس میں صرف واویلا اور گریہ وزاری ہوتی، اسے نہایت مکروہ سمجھتا، کیونکہ وہ ایسی شاعری کو قواء عمل کا دشمن سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ کی صحبت کا لطف میں کبھی نہ بھولونگا۔ یوسف اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا چند ضروری خطوط دیکھ رہا تھا کہ ایک شاعر جو یوسف سے بھی بے تکلف تھے مجھ سے ملنے کے لئے وہاں آگئے۔ دوران گفتگو میں انھوں نے اپنا ایک شعر سنایا جس میں "خونِ دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو" ذرا مختلف انداز سے بیان کیا گیا تھا۔ یہ شعر سنتے ہی یوسف نے خطوں کو علٰحدہ رکھ کر شاعر صاحب کی صورت کو غور سے دیکھا اور بولا کہ "معاف فرمائیے، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ غذا کس ملک کے انسانوں کی ہے اور کیا ایک درندہ کی طرح خون پینے والا اور کچا جگر چبانے والا آدمی دعوائے محبت بھی کرسکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے محبوب نے آپ کا یہ شعر سنا ہے یا نہیں، لیکن اگر اب تک وہاں نہیں پہونچا ہے تو مہربانی فرماکر اُسے اپنی طرف منسوب نہ کیجئے ورنہ ممکن ہے آپ کو کسی حدیقۂ حیوانات میں پہونچادے۔ اور اگر اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ کی غذا بالکل ترک ہوگئی ہے تو بھی اس کا کیونکر کسی کو یقین آسکتا ہے جبکہ پورے ساڑھے سولہ انچہ کا کالر آپ کی گردن کے لئے اب بھی درکار ہوتا ہے۔

تعلیم کے لحاظ سے وہ ایک جامع شخص تھا اور تمام فنون متداولہ میں فاضلانہ آگاہی رکھتا تھا، چونکہ اس کے والد خود عربی فارسی کے عالم تھے اس لئے انھوں نے سب سے پہلے یوسف کو وہی پڑھایا جو خود انھوں نے پڑھا تھا اور پھر اس کے بعد انگریزی شروع کرائی جس وقت وہ فلسفہ کا بی اے ہوکر کالج سے نکلا تو لوگوں کو سخت حیرت ہوئی کہ اس جیسے سطح بیں انسان نے کیسے فلسفہ کی گہرائیوں

و انبساط ہوا کرتا تھا، اور جب اس کو فلسفہ و تاریخ کے عمیق مطالعہ کے بعد تفریح کی ضرورت ہوتی تو یوسف کے پاس آجاتا اور چھیڑ چھیڑ کر اُسکی باتیں سُنا کرتا۔

پروفیسر حبیب اور مس ہلن کی ملاقات اول اول ٹگور کے شانتی نکیتن میں ہوئی تھی جب ایک مرتبہ سالانہ اجتماع کے موقع پر یہ دونوں بھی وہاں مدعو ہوئے تھے۔ مس ہلن کا ذکر تو حبیب اس سے قبل بھی سن چکا تھا، لیکن، چونکہ وہ خود بڑی حد تک دشوار پسند طبیعت رکھتا تھا اس لئے اس کے اندر کوئی خاص جستجو پیدا نہ ہوئی تھی۔ اب جو شانتی نکیتن میں اس سے تعارف ہوا تو وہ اس کے سحر جمال سے اس قدر متاثر نہیں ہوا جتنا یہ معلوم کرکے کہ مس ہلن ایک عورت سے زیادہ شاعرہ اور ایک شاعرہ سے زیادہ معبودہ تھی۔ حبیب کے ایک دوست نے جب اُسکی رائے مس ہلن کے متعلق دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ "میں ابھی تک کوئی صحیح رائے مس ہلن کے متعلق قائم نہیں کرسکا کیونکہ وہ ایک ایسی تیتری ہے جو ہنوز ریشم کے خول سے باہر نہیں آئی اور جس کے صحیح خط و خال کی نسبت کوئی پیشین گوئی نہیں کیجا سکتی، لیکن یہ یقینی ہے کہ اس کی فطرت جس "عورت" کو اس کے اندر طیار کر رہی ہے، وہ ایک ایسا دُرِ خوش آب ہے جس کے لئے فرق شاہانہ کی ضرورت ہے"

اُس کے بعد رفتہ رفتہ حبیب کے جذبات نے جو صورت اختیار کی وہ بہت زیادہ سنجیدہ تھی، یعنی یہ بات اب زیادہ شہرت پذیر ہو چلی تھی کہ حبیب مس ہلن کے ساتھ شادی کرنے کے خواہشمند ہیں اور غالباً یہ بھی کہ مس ہلن ان کی اس خواہش کو گوارا کر رہی ہیں۔

(۳)

مہمانوں کو خلد آباد آئے ہوئے دو دن گزر چکے ہیں، شام کا وقت ہے، حبیب مس ہلن اور یوسف باہر کے صحن میں جہاں سے دریا سامنے نظر آتا تھا، بیٹھے ہوئے گفتگو میں مصروف ہیں۔ حبیب پہلے ہی یوسف کی خصوصیات سے مس ہلن کو آگاہ کر چکا تھا لیکن اب تو خود اس نے بھی اس کا کافی مطالعہ کر لیا تھا اور وہ اس کی معصومیت سے خاص دلچسپی لینے لگی تھی، اور جب یوسف موجود ہوتا تو وہ قصداً ایسی گفتگو کرتی کہ یوسف کو زیادہ اختلاف کا موقع ملے۔

افق میں سنہرے بادلوں کے انعکاس سے فضا زراندود ہو رہی تھی، دریا کی لہریں ایسی نظر آتی تھیں جیسے پانی میں کسی نے بادلہ اور مقیش کتر کے منتشر کر دئے ہوں۔ موسم پر گفتگو ہو رہی تھی کہ دفعتہً مس ہلن نے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے مغرب اور مشرق کی شاعری کا مطالعہ یقیناً کافی کیا ہوگا کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟" یوسف کچھ دیر خاموش رہا اور اس کے بعد بولا "وہی فرق ہے جو مجھ میں آپ میں ہے" مس ہلن مسکرائی اور بولی "یعنی مغرب کی شاعری میں نسائیت زائد ہے، یہ مدعا ہے آپ کا؟"

یوسف: میرا مدعا کچھ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ مختصر سے مختصر فقرہ میں آپ کے سوال کا جواب دیدوں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے شاعری سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں ہے اور اس قسم کے جذبات جن کو نسائیت، موسیقیت، شعریت وغیرہ عجیب و غریب الفاظ سے ظاہر کیا جاتا ہے، میری فہم کے حدود سے بالا یا فروتر ہیں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ مغرب کی شاعری میں نسائیت ہے یا نہیں جب کہ شروع سے نسائیت کا مفہوم ہی

ہی میرے ذہن میں نہیں آیا۔

مس ہلن نے اس انداز سے جس طرح وہ کسی بچہ کو درس دے رہی ہو پہلو کی میز سے ایک زریں نقش و نگار کا گلاس اٹھا لیا اور یوسف کو دکھا کر بولی کہ "آپ اس کے نقوش دیکھتے ہیں اور ان کی بابت کیا رائے ہے"؟

یوسف: "صرف یہ کہ بنانے والے کے پاس وقت ضائع کرنے کے لئے وقت کی کمی نہ تھی، کیونکہ پانی پینے کا مقصد تو ایک سادہ گلاس سے بھی حاصل ہو سکتا ہے اور یہ بھی آپ کی رعایت سے، ورنہ میرے نزدیک تو میرا مٹی کا پیالہ ان سب سے بہتر ہے۔"

مس ہلن اس جواب کو سنکر ہنسی، لیکن اس کی ہنسی میں انبساط سے زیادہ انقباض اور نشاط سے زیادہ ناکامی کی الجھن شامل تھی۔ وہ یہاں صرف تبدیل آب و ہوا کے لئے آئی تھی، لیکن یوسف سے ملنے کے بعد اس نے ایک ایسی عجیب و غریب ہستی اپنے سامنے پائی کہ اس کا غائر مطالعہ کرنے کے لئے وہ مجبور ہو گئی اور جوں جوں اس کا مطالعہ زیادہ وسیع ہوتا گیا، وہ یہ محسوس کرنے لگی کہ کوئی چیز یوسف میں ایسی موجود ہے جو اس پر غالب ہوتی چلی جا رہی ہے اور یہ یقیناً اس کی زندگی کا سب سے پہلا تجربہ تھا۔ اس وقت تک دنیا والوں نے جس انداز سے اُنکی پزیرائی کی تھی، وہ عجز و فتادگی کے سوا اور کچھ نہ تھا اس لئے اُسکو یقین ہو گیا تھا کہ دنیا کو میرے ہی خیال کا محکوم ہونا چاہئے، لیکن جب اُس نے یوسف کو دیکھا، جو نہ اُس کے حسن و جمال سے متاثر ہوتا نظر آتا تھا، نہ اس کی پاکیزگی ذوق و خیال سے، تو اس کو ایک قسم کا صدمہ پہونچا۔

عورت اپنے دماغی نشو و نما کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، لیکن جس وقت اس کے پندار کو شکست ہونے لگتی ہے تو وہ اس سطح پر آجانے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے جہاں وہ اکثر ناکام ثابت ہوئی ہے اور اس کی ناکامی مرد کی کامیابی ہوا کرتی ہے، لیکن اگر وہ اس طرح کامیاب ہو جائے تو اُس کے بعد اس کی پرواز کی بلندی کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور پھر مرد کے لئے کوئی چارہ کار سوائے اس کے نہیں ہوتا کہ وہ یا تو فرشتہ ہو کر رہجائے، یا شیطان بنکر دنیا میں آفت برپا کر دے۔

مس ہلن، جو ضرورت سے زیادہ ذہین تھی اور ہر بات اپنے ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتی تھی جب یوسف کی سطحی باتوں پر غور کرتی تو ان میں بہت زیادہ گہرائی محسوس کرتی اور اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیوں حبیب نے اس قدر غلط تعارف اس کا کرایا تھا۔ اور جب اس کا یہ خیال زیادہ قوی ہو جاتا تو حبیب کی اس نارسائی ذہن کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگتی۔ اُسے یوسف کے ساتھ اس وقت تک کوئی لگاؤ پیدا نہ ہوا تھا اور نہ اس کی کوئی وجہ ہو سکتی تھی، کیونکہ سوائے شباب کے یوسف کے پاس کوئی اور چیز ایسی نہ تھی جسے وہ ہدیۃً کسی عورت کے سامنے پیش کر سکتا، اور مس ہلن اس سے بہت بلند تھی کہ محض کسی کا شباب اُس کو متاثر کر سکے۔ اس لئے زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ اُسے لاگ پیدا ہو گئی تھی اور ایک قسم کا حریفانہ رشک محسوس کرتی تھی، وہ چاہتی تھی کہ یوسف بھی اسی کے سامنے جھک جائے، اُس کی بلندئ ذوق کو حیرت کی نگاہ سے دیکھے، اُس کے خیال سے اپنے زندگی کے ہر لمحہ کو معمور کر دے اور پھر اُس کے بعد وہ ایک پامال و مغلوب شکار کی طرح اس کی درماندگی کے مطالعہ سے لطف اُٹھائے اور چونکہ یوسف کی سنگدلی اس باب میں اس کا بالکل پہلا تلخ تجربہ تھا، اس لئے

پھر ناکامی کے بعد اس کی ضد بڑھتی جاتی تھی اور اس کی ہر ضد بالکل غیر محسوس طور پر اسے اس سطح پر آہستہ آہستہ لارہی تھی جہاں پہونچنے کے بعد ایک عورت کی نازک کلائی خواہ مخواہ کسی مضبوط گرفت کی آرزومند ہو جاتی ہے

وہ یہاں صرف ایک ہفتہ کے لئے آئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ خلدآباد کی صحیح آب وہوا سے اپنے دماغ کو تازہ کرکے پھر کلکتہ واپس چلی جائے گی، لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ یہاں آکر اس کا دماغ اور زیادہ خستہ ہو جائے گا۔ چونکہ اب وہ یوسف کو شکست دینے کے لئے اپنے ترکش کا ایک ایک تیر استعمال کرنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ اس لئے بلا لحاظ اس کے کہ مصلحت کا اقتضا کیا ہے، اُس نے تار کے ذریعہ سے ایک ماہ کی اجازت اور حاصل کی اور حبیب کو رخصت کرکے تنہا یہاں رہنے پر آمادہ ہوگئی، بہانہ تو صرف یہ تھا کہ آب وہوا خوشگوار ہے اور وہ ہنوز سیر نہیں ہوئی، لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے جلوت کے نشتروں کو ناکام پاکر اب خلوت کے تیروں سے کام لینا چاہتی تھی۔ اس جیسی ذہین عورت کے لئے خوش اسلوبی کے ساتھ حبیب کو رخصت کر دینا اور یوسف سے مزید قیام کی اجازت حاصل کر لینا چنداں دشوار نہ تھا، حبیب چلے گئے، اور وہ خلدآباد کی سنسان گڑھی میں ایک خلوت نشین ساحرہ کی طرح اسباب سحر کی طیاری میں مصروف ہوگئی۔

باقی ــــــــــ باقی

نیاز فتحپوری

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(ملاحظہ ہو "نگار" ماہ دسمبر ۱۹۲۷ء)

مسلمانوں کا مسئلہ

اس باب میں میں ہندوستان کا زیادہ روشن پہلو پیش کروں گا جس کا مشاہدہ میں نے گزشتہ موسم سرما میں کیا۔ اس کی زراعتی آبادی کے مادی مصائب کا بیان پوری شرح و بسط سے کیا جاچکا ہے اور یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ اس کی شہری آبادی مفتوح قوم کی حیثیت سے اپنی حالتِ زوال پر کس قدر ماتم کناں ہے اور اب صرف یہ دکھانا باقی رہ گیا ہے کہ وہ کونسی بھلائی ہے جو اِن کم ہونے والے مصائب کی کسی حد تک تلافی کر رہی ہے۔ انگریزی حکومت کے طرفدار شیخی بگھارا کرتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان میں امن و امان پیدا کر دیا ہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ امن شریفانہ نعمت ہے۔ لیکن انگریزی حکومت نے اسے اس سے بڑھکر نعمت عطا کی ہے جس کے لئے بلاشبہ تمام ہندوستان کے شکریہ کی مستحق ہے اور جو بجائے خود ایک قیمتی برکت ہے اس لئے کہ اس میں باقی تمام کھوئی ہوئی چیزوں کو دوبارہ فتح کر لینے کی قوت موجود ہے، وہ یہ ہے کہ انگریزی عہد حکومت نے خیالات کی آزادی عطا کی ہے۔ یہ ایک نئی چیز ہے۔ جو ہندوستان کو اس سے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی اور ممکن ہے کہ انگریزی اثرات کے بغیر کبھی حاصل نہ ہوتی اور یہ ناممکن ہے کہ ایسی چیز کو نعمت سے تعبیر نہ کیا جائے جو فتح کی لعنت کو امید کی برکت میں تبدیل کر دینے کے لئے تقدیر کی گئی ہو +

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو مشرق کو صرف اُس کے دلربا نظاروں کے باعث پسند کرتے ہیں اور میرا جھگڑا یورپ سے اس وجہ سے نہیں ہے کہ اُس نے مشرق میں کیوں تبدیلی پیدا کر دی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مغربی طریقوں کی حماقت آمیز اور بسا اوقات خودغرضانہ طرز عمل کی وجہ سے ماضی کی بہت سی شریفانہ اور مفید چیزیں تباہ کر دی گئیں ہیں، لیکن میری یہ خواہش نہیں ہے کہ ماضی اپنی مجموعی حیثیت سے واپس آجائے اور نہ مجھے اس کا افسوس ہے کہ وہاں خیالات کے جدید نظام کی تحریک کیوں شروع کی گئی۔ مجھے معلوم ہے کہ وقت پیچھے نہیں لوٹتا اور مجھ سے بڑھکر اور کوئی شخص اس اصول کا قائل نہ ہوگا کہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں جو چیز کہ گزر چکی ہے وہ ہمیشہ کے لئے گزر چکی ہے اور کبھی واپس نہیں آسکتی۔ برخلاف اُس کے مجھے مشرق و مغرب کے باہمی تعلقات میں دونوں کا فائدہ نظر آتا ہے۔ اور اگرچہ اس کی قدیم خوبصورتی سرعت کے ساتھ تباہ ہو رہی ہے اور اس کی رسوم کا قدیم نظام بدلا جا رہا ہے، تاہم میں غیر محدود توقعات کے ساتھ اس جدید دور کی آمد کا انتظار کر رہا ہوں جس کی تعمیر پرانے کھنڈرات پر کیجائیگی۔ بلاشبہ میری یہ خواہش ہے کہ خاص ملکی چیزوں میں جو کچھ بچایا جا سکے بچا لیا جائے اور اُسے از سر نو تعمیر کے کام میں لایا جائے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ جدید عمارت پرانی عمارت سے بہتر بنائی جا سکتی ہے اور مجھے بے انتہا مسرت ہوگی اگر میں اس کی دوبارہ تعمیر میں ایک حصہ لے سکوں گا

جدید آغاز کی کوئی علامت موجود نہ تھی۔ خیالات ایسے تنگ دائرے میں محدود ہو گئے تھے کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل تھا اور قوم کا بیکار دماغ جو اپنی ذہنی جکڑ بندیوں میں مبتلا تھا، نسلاً بعد نسل کمزور ہو رہا تھا۔

ہم اس قسم کے جمود کا انتہائی نتیجہ دوسرے ممالک مثلاً ایشیائے کوچک اور ایران میں دیکھ چکے ہیں اور نیز ان ممالک میں جو ہم سے بہت قریب واقع ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کی بالعموم یہی حالت تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی اقوام کی نشو و نما میں قدرتاً ایک ایسی منزل آتی ہے جب کہ اُن کی حالت بالکل خراب ہو جاتی ہے اگر یہی جمود عرصۂ دراز تک جاری رہے تو ایسا معلوم ہوگا کہ بابل کی طرح وہ بالکل مر گئی ہیں اور انکی جگہ خالی پڑی رہ گئی ہے یا زیادہ طاقتور اقوام میں وہ جذب ہو گئی ہیں جیسا کہ اس زمانے کے جاندار اور طاقتور ترکوں میں لاطینی جذب ہو گئے تھے۔ تقریباً ہر حالت میں ذہنی بیداری بیرونی اثرات کا نتیجہ رہی ہے۔ مثلاً یہ کہ ایسی ذہنی بیداری کسی قریب کے ملک میں پائی جاتی ہو جو اپنے ہمسایہ ملک سے زیادہ طاقتور ہو اور اس کا مخالف بھی ہو۔ ایسی حالت میں بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مختلف اقوام کا ایک دوسرے کی ذہنی زندگی پر اثر ڈالنا باہمی ترقی کا قدرتی اور ضروری قانون رہا ہے۔ مثال کے طور پر ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ پر نظر ڈالو تو معلوم ہو جائیگا کہ ان کی جدید ذہنی زندگی کی ابتدا اس حملہ سے ہوئی جو مہذب اور بہادر عربوں نے اسپر اسپین میں سے ہو کر کیا۔ اسی طرح کیتھولک گرجا نے اپنے کہنہ اور بوسیدہ نظام کی اصلاح اُسوقت کی جبکہ مغربی ایشیا سے حملے ہونے شروع ہو گئے۔ بعینہ یہی عمل ابن جم ابی حملہ کی تہ میں کام کر رہا ہے جو گزشتہ سو سال سے یورپ کے وجوہ کو ایشیا کے لئے باعث خطرہ ثابت کر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ایشیا اب مغرب کی فاتح عقل سے واقف ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور اس ذہنی ہتھیار سے فائدہ اُٹھا رہا ہے جو اس کے حریف کی طاقت کا حقیقی راز ہے اور یہ کشمکش سب سے زیادہ ہندوستان میں واقع ہو رہی 1
ہے۔ اپنے طویل خواب غفلت کے بعد ہندوستانی دماغ ہر جگہ بیدار 2
ہو رہا ہے اور ہر روز ان مسائل میں سے نئی باتیں پیدا کر رہا ہے جنہیں پہلے وہ ایسی بُری طرح مقید تھا کہ ہر طرف نا اُمیدی دکھائی دیتی تھی۔

اس بیداری کے لئے ہندوستان بلاشبہ انگلستان کا رہین منت ہے مغرب کے ذہنی طریقوں کا اثر سب سے زیادہ ایشیا کے مذاہب پر پڑا ہے۔ قدیم مذہبی مشاغل جس میں فہم و فراست کو کچھ دخل نہ تھا۔ رفتہ رفتہ ایسی قلبی واردات کے لئے جگہ خالی کر رہے ہیں جنکی تسکین محض نقلی حوالوں سے نہیں ہو سکتی۔ اور اب یہ حالت ہے کہ تمام مذاہب کے پیرو ان اُمور پر عقلاً بحث کرتے ہیں جنھیں سو سال پیشتر وہ محض نقلاً بیان کر دینے پر اکتفا کرتے تھے تقریباً اسی قسم کی کیفیت مغربی ایشیا میں ہر جگہ رونما ہو رہی ہے لیکن ہندوستان میں غالباً وہ بہت نمایاں ہے اور یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ خواہ ہمارے عہد حکومت نے دوسرے فوائد کو نقصان پہونچا دیا ہو تاہم اُس کے مذاہب کو غیر دیدہ و دانستہ اور شاید غیر رضامندانہ طریقہ سے مگر واقعاً اس سے فائدہ پہونچا ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ امر غلط معلوم ہوتا ہے تاہم اصلیت یہ ہے کہ اجنبی لوگوں کی دنیوی حکومت نے جنھیں اس بات کا فخر ہے کہ حکومت کا کوئی مقررہ مذہب نہیں ہے مذاہب کی زندگی میں جدید طاقت پیدا کر دی ہے اور انھیں زیادہ

استوار بنیادوں پر قائم کردیا ہے۔ روحانی عقاید رکھنے والے کو بھی طاقت پہنچی ہے، وحشی بھی اب ایسے مذہب میں اپنی پرورش پاتا ہے جو نہ مذہب ہے اور جو اسپرون بدل زیادہ نیکی کا اثر ڈال رہا ہے +

ہندوستان میں عام طور پر چار بڑے مذاہب پائے جاتے ہیں۔ ہندو مذہب جو مختلف شکلوں کے ۲/۳ حصہ آبادی پر مشتمل ہے اسلام جو پنجاب اور بنگال میں بہت زیادہ طاقتور ہے اور جس کے نام لینے والوں کی تعداد ۵ کروڑ ہے۔ کیتھولک عیسائی جو زیادہ تر جنوبی ہند میں پائے جاتے ہیں اور پارسی +

ان میں صرف ہندو مذہب ہی ایسا ہے جو یہاں کا قدیمی مذہب ہے اور جو کلیتہً دیہاتی آبادی کی فطری رجحانات کے عین مطابق ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی سیاح ان اوہام پرستیوں سے متاثر نہ ہو جنپر وہ سختی کے ساتھ کاربند ہیں اور جو گویا اس کی بنیاد ہیں۔ جس جدید معنی میں ہم مذہب کا استعمال کرتے ہیں یعنی اخلاق کا مجموعہ جس کی بنیاد کسی الہامی کتاب پر ہو، اُس معنی میں ہندو مذہب مذہب نہیں ہے بلکہ قدیم یونان اور روما کے عام عقاید کے مانند یہ ایک قسم کی مائی تھولوجی (اصنام پرستی) ہے۔ یہ مذہب قومی اور مقامی ہے۔ وہ بنی نوع انسان کو اپنے دائرہ میں لانے کی کوشش نہیں کرتا یہ حق صرف ہندوستانی اقوام کا ہے کہ وہ ہندو کہلائیں اور جتنی پاکیزگی کے ساتھ ہندوستان میں اسپر عملدرآمد ہو سکتا ہے اتنا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ برہمنوں کی تعلیمات کے مطابق ہندوستان ایک مقدس سرزمین ہے اور دیوتاؤں کے مندر صرف وہیں تعمیر کئے جاسکتے ہیں۔ وہیں انسان مکمل زندگی بسر کرسکتا ہے یا عبادت کے ذریعہ سے روحانی فوائد سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ بعض مقامات خصوصیت سے متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ مقدس ہستیوں کو اپنے پہلو میں رکھتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہاں خدائی اثرات خاص طور پر جلوہ گر ہیں۔ مثلاً قدیم اٹلی کے باغات کی طرح ہندوستان کے تمام دریا مقدس سمجھے جاتے ہیں اور ان کے کناروں پر دیوتاؤں کے مندر تعمیر کئے جاتے ہیں اور روحانی اثرات سے فیض حاصل کیا جاتا ہے +

خوبصورتی کے نقطۂ نظر سے کوئی شے اس قدر حیرت انگیز نہیں ہو سکتی جس قدر کہ ان قدیم مندروں میں ہندوؤں کی عبادت کا نظارہ ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص جوش کا اظہار کئے بغیر اسے نہیں دیکھ سکتا اسی طرح یہ ناممکن ہے کہ وہ جنوبی ہند کے عالیشان مندروں میں لاکھوں ہندوؤں کے مجمع کو سفید لباس میں اپنا سالانہ تہوار مناتے ہوئے دیکھے اور قبل از عیسائیت یورپ کے لوگوں کی حالت کا جدید ہندوستان کی حالت سے موازنہ نہ کرے یا یکسانیتِ تخیل کا اعتراف نہ کرے۔ یہاں بتوں کی عبادت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اندازہ غیر جہاندیدہ انگریز پرانی کتابوں کے مطالعہ سے کرسکتا ہے۔ مدورا اور سرنگم کے مندر اپنی بناوٹ کے اعتبار سے یورپ کی تمام عمارات سے زیادہ حیرت انگیز اور موثر ہیں اور خاص دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ مردہ چیزیں نہیں ہیں۔ اس کے دروازوں میں خریدار اور دکاندار ابھی تک اپنی تجارت میں مصروف ہیں اور پرندے اس کے چھجوں میں اپنا بسیرا رکھتے ہیں۔ متبرک بندر اور متبرک ہاتھی وہاں موجود ہیں۔ پجاری ابھی تک روغن چراغوں کے گرداگرد بیٹھکر اپنے بھجن گایا کرتے ہیں۔ تہواروں کے موقعوں پر پیتل کے بیلوں پر تیل ملا جاتا ہے اور جاتریوں کی پیشانیاں قشقہ سے معطر کی جاتی ہیں۔ دن بھر پھولوں اور لوبان وغیرہ کی خوشبو آتی رہتی ہے۔ مذہب کا یہ کام قدیم الایام سے جوں کا توں چلا آرہا ہے

شاید لوگوں کی مفلسی کے باعث اس میں کچھ کمی آگئی ہو مگر وہ ابھی تک عوام کی روزانہ زندگی کا زندہ جزو بنا ہوا ہے۔ جب میں نے مدورا کا مندر دیکھا تو اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ میں نے بالآخر بابل کا مندر دیکھ لیا اور سمجھ لیا کہ مصر میں ایپس* کی پرستش کیونکر ہوتی ہوگی۔ دیوتاؤں کی پرستش (نہ کہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم) ہندو مذہب کی بنیاد ہے اور ابھی تک اس کا نمایاں پہلو بنی ہوئی ہے +

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس کے ساتھ ہی زیادہ تربیت یافتہ برہمنوں میں اس بات کا رجحان بڑھتا جاتا ہے کہ عقاید کو روحانی معانی پہنائے جائیں۔ ویدوں کا فلسفہ اعلیٰ ہے اور مذہبی خیالات میں اصلاح کا معیار پیش کرتا ہے اور اگرچہ برہمنی نظام اخلاق کی کسی تحریری کتاب سے معرا ہے تاہم اعلیٰ ترین نظام سے اس کا تطابق کیا جاسکتا ہے اور یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی بہترین تعلیم کے مشابہ ہے مگر......... روایات باپ بیٹے کے تعلقات یا خاوند بیوی کا رشتہ جس قدر ہندوؤں میں شریفانہ اور متبرک سمجھا جاتا ہے اتنا اور کسی مذہب میں نہیں۔ لہذا وہ برائیاں جنہیں صدیوں کے ذہنی جمود نے اضافہ کر دیا ہے، اب جبکہ ذہن بیدار ہو گیا ہے کھلم کھلا برائیاں تسلیم کی جارہی ہیں اور روشن خیال جدید برہمن از خود عیسائیوں کے بہترین اخلاق کا تتبع کر رہے ہیں اور اسے اپنے نظام میں داخل کرتے جاتے ہیں۔ مذہبی اصلاح کا یہ پہلو مشترکہ ہے۔ ذہنی جمود کے ساتھ قوم میں بری رسوم بھی آجاتی ہیں اور جب جمود زائل ہونا شروع ہو جاتا ہے تو جس شے نے اسے اصلاح پر آمادہ کیا ہو، بالعموم اسی کی نقل کیجاتی ہے +

چنانچہ اب ہم جدید برہمنوں کو بے غرضی کے اخلاقی پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ سچائی، انصاف اور صیانت کے بارے میں بھی ان کی تلقین عیسائیوں سے ملتی جلتی ہے وہ بھی ضمیر کو انسان کا بہترین رہنما قرار دیتے ہیں۔ وہ بہترین چیز کو لیکر اپنے یہاں بہترین روایات کے مطابق کر لیتے ہیں +

اس قسم کی تحریکات میں ایک خطرہ یہ ہے کہ غلامانہ نقل کی عادت پڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نسل کے ہندوؤں میں ہم ایک ایسا فریق پاتے ہیں جس کا مطمح نظر یہ ہے کہ یورپ کی پوری پوری تقلید کیجائے۔ ان میں سے صرف چند ہی اشخاص نے عیسائی مذہب اختیار کیا ہے لیکن اکثر اپنے عقاید سے دستبردار ہونے کے بعد فلسفہ کے مختلف فرقوں کے ہم خیال ہو گئے ہیں۔ جو کم و بیش لامذہب ہیں بعض اگرچہ اپنے تئیں ہندو کہتے ہیں تاہم انھوں نے ذات پات کی قیود سے اپنے تئیں آزاد کر لیا ہے۔ بنگال اور شمالی ہندوستان میں برہمو سماج والوں کی ایک وسیع جماعت پیدا ہو گئی ہے۔ جن کے اصول ان فرقوں سے ذرا ہی مختلف ہیں جو خدا کی ہستی کے قائل ہیں ہندوستان کے جنوبی حصص میں جہاں برہمنوں کا زور ہے، اس قسم کی بدعات بے اثر رہی ہیں اور بجائے اس کے وہاں روایتی عقائد کو معقول بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ وشنو اور شیو یا دیگر قومی دیوتاؤں کے پجاریوں میں اتنی طاقت موجود ہے یا نہیں کہ وہ اپنے عقائد کو خیر باد کہے بغیر اخلاقی اصلاح کے انقلاب کو برداشت کر لیں، لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ ان میں اصلاح کی تحریک جاری ہے اور نتیجہ اب تک اس قدر نکلا ہے کہ ہندو سوسائٹی کے لیڈروں نے اپنے مذہبی فرقوں کی

* Apis ۔ ثور مصریوں کا دیوتا

بہبودی اور معاشرتی ترقی میں دلچسپی لینی شروع کر دی ہے اور اس کا اظہار ان کوششوں سے ہو سکتا ہے جو تعلیم پھیلانے مذہبی اوقاف کا بہتریں انتظام کرنے، مندروں کو سابقہ حالت میں بحال کرنے صغر سنی کی شادی کا سدباب کرنے اور بیواؤں کی شادی کا رواج دینے میں ظاہر کر رہے ہیں +

ایسی تحریک پارسیوں میں بھی جاری ہے۔ اگر یہ لوگ ہندوستان کی پولیٹکل زندگی میں نمایاں حصہ نہ لیتے تو انھیں مشکل سے ہندوستانی قرار دیا جا سکتا تھا۔ آبادی کے لحاظ سے وہ نہ ہونے کے برابر ہیں اور صرف ایک ہی جگہ پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں بمبئی ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں وہ زیادہ تعداد میں آباد ہیں۔ لیکن اُن کی دولت، اُن کی تجارتی حوصلہ مندی اور ہر قسم کی تعلیم سے مستفید ہونے کی خواہش نے اُنھیں نہایت بارسوخ اور اہم درجہ عطا کر دیا ہے۔ یہ لوگ ایران کے آتش پرستوں کی اولاد ہیں اور ابھی تک قدیم روایات پر قائم - مذہب زرتشت ابتدا میں سادہ اور فلسفیانہ تھا۔ مگر ان دیگر مذاہب کی طرح جو ہندوستان میں آئے ہیں، اس میں بھی کھوٹ اور خراب رسوم شامل ہو گئی ہیں اور اس نے ان بہت سے اوہام باطل کو اختیار کر لیا ہے جو ہندوستان کے لئے مخصوص ہیں۔ اُن میں سے بعض تو وہ ہیں جو ان کے پہلی مرتبہ آباد ہونے کے موقع پر ہندو راجاؤں نے ان سے زبردستی قبول کروائے تھے اور بعض ایسے عام جہالت کا نتیجہ ہیں جو سیاسی حالات کے باعث پیدا ہو گئی تھی۔ بہر حال پارسیوں نے سب سے پہلے اس ذہنی آزادی سے فائدہ اٹھایا جو انگریزی حکومت کا طغرائے امتیاز رہی ہے اور چونکہ وہ تجارت پیشہ ہیں اس لئے موجودہ زمانہ کے تجارتی دور سے انھوں نے دوسروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ فائدہ اُٹھایا ہے اور اب وہ خاصے مالدار ہو گئے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بااخلاق ہونے اور قدرتاً نیکی کی جانب رجوع ہونے کا یہ اثر ہے کہ اب وہ پھر اپنے مذہب کی قدیم سادگی کو زندہ کرنا چاہتے ہیں اور ہندوؤں سے کہیں زیادہ ان میں یہ خواہش پیدا ہو گئی ہے کہ اپنے عقاید کو روحانی معانی پہنائیں اور اپنے رسوم و رواج کی اصلاح کریں۔ جس شخص کو کبھی کسی تعلیم یافتہ پارسی کے ساتھ "برج خموشاں" میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اُس نے اندازہ کیا ہوگا کہ وہ اپنے مُردوں کو کھلا رکھنے کی قدیم رسم کی تشریح کس فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں پارسیوں اور جنوبی ہند کے عیسائیوں کے ذکر کو میں طوالت نہیں دینا چاہتا اس لئے کہ مجھے ان دونوں کے حالات سے بہت کم واقفیت ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی وسیع آبادی ہی انہیں عام توجہ کا مستحق ٹھہراتی ہے +

مگر میری خاص توجہ قدرتی طور پر مسلمانوں کی جانب مبذول ہے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے مسلمان دو مختلف راستوں سے اور دو مختلف حالات میں ہندوستان میں داخل ہوئے۔ پہلی مرتبہ وہ عرب تجار کی حیثیت سے اس کے مغربی ساحل پر نمودار ہوئے یہ لوگ اسلام پھیلانے اور روپیہ پیدا کرنے کی غرض سے آئے تھے یہ امن پسند مبلغین تھے جنھوں نے اپنی کامیابی کا دارومدار تلوار پر رکھنے کے بجائے ترغیب و تعلیم پر رکھا تھا اور اس طریقہ سے جو اسلام پھیلا اس کا وجود آج بھی مغربی ساحل پر بمبئی کے کوکنیوں مالا بار کے ملباریوں اور سیلون کے موروں میں ملتا ہے۔ یہ سب لوگ خوشحال اور تجارت پیشہ ہیں اور تعمیرات کے کاموں میں بہت شہرت رکھتے ہیں +

کولمبو میں مجھے یہ دیکھ کر بہت دلچسپی پیدا ہوئی کہ آٹھویں اور نویں صدیوں کے آباد ہونے والے عرب تجار کی اولاد عرب کی تجارتی روایات کو اب تک برقرار رکھے ہوئے ہے۔ تمام سیلون میں ان کی تعداد ۲½ لاکھ ہوگی اور وہ نہایت خوشحال ہیں۔ وہ بہت قدامت پسند ہیں اور دین کے بجائے اس دنیا کے کاموں میں بہت انہماک رکھتے ہیں۔ جدید خیالات کا ان پر معمولی اثر پڑا ہے اور یہی عربی اور ان کے جلاوطن ساتھیوں کا طفیل سمجھنا چاہئے جنھیں اسلامی دنیا کے وسیع حصہ کا تجربہ تھا اور جو مذہب کے لئے سینہ سپر ہو چکے تھے اُن کی آمد سے پیشتر جزیرہ کے مسلمان کبھی تبادلۂ خیالات کی غرض سے مجتمع نہیں ہوئے اور بہت کم لوگ ایسے تھے جنکے بچے اسکول میں جاکر پڑھتے۔ مگر جلاوطنیوں کی تقلید کا آغاز جلد ہی ہوگیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ عربوں میں تعلیم کی خواہش پیدا ہوئی اور باقی مسلمانوں سے تعلقات رکھنے کا خیال آیا۔ مصر کے معتاب کا یہ عجیب و غریب نتیجہ ہوگا۔ اگر اُس کے محب وطن سرداروں کی تکالیف جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں میں مذہبی آزادی کے خیالات پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔ لیکن یہی وہ بات ہے جو ظہور میں آرہی ہے کاش یہاں کے عرب دور دور پھیل جائیں کیونکہ ان کا تجارتی شوق اُن کی زندگی کا نہایت خوشگوار عنصر ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں میں اسی چیز کی بہت کمی ہے!

سیلون سے جب میں براعظم کی طرف گیا تو مجھے جو مسلمان ملے وہ شمالی حملہ آوروں کی اولاد سے تھے۔ یہ لوگ مذکورۂ بالا تجارت پیشہ مسلمانوں سے بالکل مختلف تھے اور نہ ویسے خوشحال دکھائی دیتے تھے۔ اور نہ ترقی کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ صوبہ مدراس کے مسلمان ہندوستان میں سب سے زیادہ غریب ہیں وہ مغلوں کے انتہائی عروج کے زمانہ میں یہاں آئے تھے۔ یہ مبلغین یا نومسلموں کی اولاد نہیں ہیں بلکہ شمالی افواج کی اولاد ہیں اور چونکہ ان کی سرکاری ملازمت جاتی رہی ہے اس لئے وہ افلاس کے باعث بہت جلد صفحۂ ہستی سے ناپید ہو رہے ہیں۔ تانجور اور ترچناپلی جیسے شہروں کے مسلمانوں کی حالت نہایت ہی قابل رحم ہے۔ وہ ہندوؤں کی آبادی سے گھرے ہوئے ہیں، روایتی صنعتوں سے بالکل معرا ہیں، تجارتی شوق سے بالکل بے بہرہ ہیں اور تلوار کے ہنر کے سوائے باقی ہر ہنر سے ناواقف ہیں اور گونگوں کی طرح اپنی تباہی کے منتظر ہیں۔ اُن میں جو چند مالدار صاحب جائداد اشخاص دکھائی دیتے ہیں وہ دن بدن کم ہوتے جاتے ہیں اس لئے کہ محتاج اور غریب رشتہ داروں کی فوج کی فوج ان پر گزر اوقات کرتی ہے۔ وہ ہندو مہاجنوں کے مقروض رہتے ہیں، سال بسال ان کے قرضہ جات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جو کچھ بچتا ہے اسے عدالتیں ہڑپ کر جاتی ہیں۔ جو لوگ صاحب جائداد نہیں ہیں معمولی قسم کی محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ یہ نہایت سخت زندگی ہے مگر اس سے چھٹکارا کہاں ہوسکتا ہے۔؟ اُن کی قسمت کا دارومدار بظاہر اس قانون پر ہے کہ جو شخص روزی نہیں کماسکتا وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ جنوبی ہندوستان کے مسلمان اُن خرابیوں کے انتہائی نتائج پیش کرتے ہیں جو کم و بیش انکی تمام قوم میں پائی جاتی ہیں۔ جنوب میں اُن کی تعداد بہت کم ہے اور وہ اسقدر محتاج ہیں کہ اُن میں کشمکش حیات کی کوئی رمق نہیں پائی جاتی شمال میں انکی حالت کا خطرہ انھیں نئی جد و جہد کے لئے آمادہ کر رہا ہے +

(باقی آئندہ)

ع ، ا ، ب ، بی ۔ اے

مثنوی "زہر عشق" کیونکر وجود میں آئی

ایک سے زائد مرتبہ مجھ سے سوال کیا گیا کہ میں "زہر عشق" کی شان نزول بتاؤں اور یہ اس لئے کہ حکیم نواب مرزا صاحب مصنف زہر عشق میرے نانا تھے۔

قبل اس کے کہ میں اس مثنوی کے سبب تصنیف پر روشنی ڈالوں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں حکیم صاحب اور ان کے خاندانی حالات مختصراً بیان کر دوں۔ حکیم نواب مرزا صاحب کے چچا، حکیم الملک مرزا علی خاں، شاہان اودھ کے دربار میں بڑے مرتبہ پر فائز تھے اور طبابت میں ان کی حذاقت مسلم تھی۔ اُن کے صاحبزادے حکیم مسیح الدولہ بہادر علاوہ اور معزز عہدوں کے منصب سفارت پر بھی ممتاز رہے اور دربار میں مخصوص عزت رکھتے تھے۔

حکیم مسیح الدولہ بہادر، حکیم نواب مرزا صاحب سے عمر میں بڑے تھے اور اپنے چھوٹے بھائی (چچازاد) سے بہت محبت رکھتے تھے۔ چونکہ حکیم نواب مرزا صاحب بہت خوش باش، عیش پسند اور رنگین مزاج تھے، اس لئے حکیم مسیح الدولہ بہادر نے اُنھیں دربار سے ہمیشہ علٰحدہ رکھا اور محلات کا علاج اُن سے کبھی متعلق نہ کیا۔ لیکن جب اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کا زمانہ آیا تو نواب مرزا صاحب کی رسائی دربار میں پوری طور پر ہوگئی۔ نواب واجد علی شاہ، ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ۵۰۰ روپیہ ماہوار اُنکا مشاہرہ مقرر تھا اور انعام واکرام کی کوئی حد نہ تھی۔

حکیم نواب مرزا صاحب ایک ذی علم شخص تھے، طبیب حاذق تھے اور فنون مختلفہ میں انکا ذوق بہت اچھا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اپنے احباب میں جب کبھی شاعری کا ذکر کرتے تھے تو کھلے الفاظ میں اس کا اعتراف کرتے تھے کہ مجھے فن شعر سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ اور وہ اس کے مدعی تھے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن بہت کم اور محض بغرض تفنن۔ انھوں نے رند کی غزل پر مصرعے بھی لگائے جو کلیات رند میں موجود ہیں۔ رند کی غزل یہ ہے:— جاتے ہیں وہ دریا کے کنارے کئی دن سے۔

ان مختصر حالات کے بعد اب میں زہر عشق کے سبب تصنیف کے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کرتا ہوں، چونکہ وہ واقعہ جس کی بنا پر یہ مثنوی لکھی گئی ہمارے ہی گھر کا تھا اور بچپنے میں، خود میں نے اپنی نانی سے اُس کو سنا تھا اس لئے غالباً میرے بیان سے زیادہ قابل وثوق بیان اس باب میں اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔

زمانۂ شاہی میں دستور تھا کہ لونڈیاں باندیاں خریدی جاتی تھیں اور ان بیع و شرا کے لئے قانون مانع نہ تھا۔ ہر شخص کو حقیقتاً

کہ وہ اپنی لڑکی یا بیوی کو فروخت یا رہن کردے۔ چنانچہ ایک دن کا واقعہ ہے کہ حکیم نواب مرزا صاحب کے پاس ایک شخص اپنی بیوی کو جس کا نام ستارہ تھا رہن رکھنے کے لئے لایا، معاملہ طے ہونے کے بعد ایک رقم اُس کو دی گئی اور وہ اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ شخص غالباً عراق جانے والا تھا۔ ستارہ جوان عمر کی خوش رو عورت تھی اور اسی کے ساتھ سلیقہ و تمیز بھی رکھتی تھی۔

حکیم صاحب کے ایک سالے مرزا عباس جن سے حکیم صاحب کو بہت الفت تھی اور جو حکیم صاحب کے ساتھ ہی رہتے تھے، عیاش طبع آدمی تھے۔ ان کی نظر التفات ستارہ پر پڑی۔ اُس وقت یہ دستور بھی تھا کہ ایسی زرخرید عورتوں کو ان کے مالک جائز یا ناجائز تعلق کے ساتھ اپنے تصرف میں لے آتے تھے، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ مرزا عباس سا رنگین مزاج شخص، ستارہ ایسی خوش ادا اور جوان عورت کو ہر وقت گھر میں دیکھتا اور اس کا یہ التفات صرف التفات کی حد تک رہجاتا، یہ تعلق بڑھا اور اس حد تک کہ حکیم نواب مرزا صاحب کو بھی معلوم ہو گیا۔

ایک زمانہ اسی طرح گزر گیا اور یہ دونوں بادہ کشان الفت اپنی جگہ یہی سمجھتے رہے کہ موجودہ کیفیت ایک لطف دوام ہے۔ لیکن ایک دن ناگہاں ستارہ کا شوہر آ ہی گیا اور اُس نے زرِ رہن واپس دیکر اپنی بیوی کا مطالبہ کیا۔ حکیم نواب مرزا صاحب نے اُس وقت اس کو یہ کہکر ٹالدیا کہ ستارہ محلات کے ساتھ کسی تقریب میں گئی ہے اس وقت موجود نہیں ہے اسی طرح ایک ہفتہ ٹل گیا، لیکن آخر کب تک، بہرحال وہ رات آئی جس کی صبح کو ستارہ کو رخصت کرنا تھا، اور یہی وہ تاریخی رات ہے جسمیں مثنوی زہرِ عشق کی بنیاد پڑی۔

حکیم نواب مرزا صاحب کی خوابگاہ خانہ باغ کے ایک بنگلہ میں تھی جو وسط چمن میں واقع تھا اور حکیم صاحب گرمی اور برسات کی فصل میں رات کو یہیں آرام کرتے تھے۔ اسی بنگلہ کے قریب ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں ان کے سالے مرزا عباس رہتے تھے۔ اس رات میں جسکی صبح کو ستارہ رخصت ہونے والی تھی، حکیم صاحب کی آنکھ کھلی اور وہ استنجا کی ضرورت سے باہر نکلے۔ جب مرزا عباس کے کمرہ کے قریب سے گزرے تو باتیں کرنے کی بھنک اُن کے کان میں پڑی۔ اُنھوں نے اور قریب جاکر دروازے سے کان لگائے تو معلوم ہوا کہ مرزا عباس اور ستارہ آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور اس قدر تاثر کے ساتھ کہ حکیم نواب مرزا صاحب بھی بہت متاثر ہوئے۔ ستارہ رو رو کر اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی اور مرزا عباس اُس کو تسکین دے رہے تھے۔ حکیم نواب مرزا صاحب پر اس واقعہ سے اتنا اثر پڑا کہ وہ اپنے اندر ایک خاص جذبۂ شعر گوئی محسوس کرنے لگے اور اسی جگہ جو تاثرات اُن کے اندر پیدا ہوئے اُن کو کوئلہ سے بنگلہ کی دیواروں پر لکھنا شروع کیا۔

رات کو حکیم نواب مرزا صاحب کے علم میں یہ بات نہ آئی تھی کہ مرزا عباس اور ستارہ کی یہ ملاقات ایک نہایت ہی خونیں صبح کے انتظار میں صرف ہو رہی تھی۔ جب صبح کے وقت یہ حقیقت واضح ہوئی کہ "زہر غم کر چکا ہے اپنا کام" اور ستارہ نزع کے عالم میں ہے تو سب کو سخت صدمہ ہوا اور آخرکار اس کے شوہر کو جو بنارس کا رہنے والا تھا مایوس جانا پڑا۔

نانی صاحبہ کہتی تھیں کہ جب میں صبح کو اُٹھی اور حکیم صاحب کے بنگلہ کی دیواروں کو سیاہ پایا تو میں بچوں پر خفا ہونے لگی کہ تم لوگوں نے

دیوار کو خراب کیا ہے اور ایک عورت کو حکم دیا کہ کپڑا اتر کر کے صاف کر دے لیکن جب حکیم صاحب کو خبر ملی تو وہ گھبرا کر باہر نکل آئے اور آواز دی کہ مٹانا نہیں۔ اسی وقت ان اشعار کی ایک نقل حکیم صاحب نے کر لی جو بڑھکر آج مثنوی زہر عشق کی صورت میں نظر آتی ہے۔

حال ہی میں مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی کا ایک مضمون حکیم نواب مرزا صاحب اور اُن کی مثنوی زہر عشق کے متعلق رسالہ سہیل میں شائع ہوا ہے مجھے اُن کی رائے سے کچھ اختلاف ہے۔

اسوقت چار مثنویاں لذت عشق، بہار عشق، فریب عشق، زہر عشق حکیم نواب مرزا صاحب سے منسوب کیجاتی ہیں۔ اُن میں سے لذت عشق کے متعلق عبدالماجد صاحب کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ وہ شوق کی زبان نہیں ہے (کیونکہ یہ آغا حسن نظم کی تصنیف ہے اور آخر میں اُن کا تخلص بھی موجود ہے) لیکن فریب عشق کے متعلق یہ کہنا کہ "وہ بمشکل اُن کی تسلیم کی جاسکتی ہے" درست نہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ بہار عشق، فریب عشق، اور زہر عشق یہ تینوں مثنویاں حکیم نواب مرزا صاحب کی ہیں جن میں پہلی مثنوی زہر عشق تھی اور ان کے جذبات صحیحہ کا نتیجہ تھی۔ اس کے بعد انھوں نے کئی مثنویاں اپنے احباب کے تقاضہ سے لکھیں اور اس لئے ممکن ہے کہ اُن میں وہ بات نہ پیدا ہوئی ہو۔ اُن کے علاوہ ایک اور مثنوی انھوں نے قیصر باغ کی تعریف میں لکھی تھی جو طبع نہیں ہوئی۔

مولانا نے ان کی سیرت کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکیم صاحب موصوف کو سفیہ سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ سنہ کے لکھنؤ کو پیش نظر رکھکر اور اوس وقت کے ارباب کمال و تہذیب کے دائرہ کا خیال کر کے مولانا قلم اٹھاتے تو ان کی ذات ان عیوب سے بھی پاک وصاف نظر آتی۔ اگر کچھ غلطی حکیم صاحب سے ہوئی ہے تو یہ کہ بجائے اصلی ہیرو کے انھوں نے اپنے آپکو پیش کر دیا۔ یہ میں بآواز بلند کہنے کو تیار ہوں کہ متقدمین کی تعلیم میں ظرافت و زندہ دلی کا عنصر غالب ہوتا تھا، علی الخصوص وہ لوگ جو شاہانہ دربار کے رکن اعظم سمجھے جاتے تھے اس میں شک نہیں کہ مولانا نے عالمانہ تہذیب کے خیال سے بعض ——— جذبات محبت کو روحانیات سے متعلق کر کے کچھ تاویلیں کی ہیں لیکن اگر وہ اس زمانہ کے لوگوں کی صحیح زندگی کو پیش نظر رکھکر تنقید کی زحمت گوارا فرماتے تو اتنا شبہ بھی پیدا نہ ہوتا علاوہ اس کے یوں بھی ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اگر وہ اس موضوع کو اختیار نہ کرتے جس کے لحاظ سے زبان اور محاورات کا استعمال ضروری تھا تو آج نصاب زبان کہاں سے دستیاب ہوتا۔ کیونکہ متقدمین کی کوئی مثنوی اس لحاظ سے زہر عشق کے برابر نہیں رکھی جاسکتی۔

حکیم صاحب کی بعض متفرق اشعار جو اس وقت مجھے یاد آگئے درج ذیل ہیں۔

آپ کی گر مہربانی ہو چکی　　تو ہماری زندگانی ہو چکی
بیٹھ کر اُٹھے نہ کوئے یار سے　　انتہائے ناتوانی ہو چکی

....　　..............

ہنس دئے رونے پہ وہ لیے چشم تر　　آبرو اشکوں کی پانی ہو چکی

چمن میں شب کو گھرا ابر تو بہار رہا　　حضور آپ کا کیا کیا نہ انتظار رہا

تصور مژہ اشکبار باقی ہے　　برس کے کھل گیا بادل ہوا رہا باقی ہے
گئے جو عیش کے دن میں شباب کیا کرتا　　لگا کے جان کو اپنے عذاب کیا کرتا
خیر سے موسم شباب کٹا　　چلو اچھا ہوا عذاب کٹا

احسن لکھنوی

میری ڈائری کا ایک ورق

از ماہ تابہ ماہی ———

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

۶ ....

آج صبح ہی سے ایک خاص قسم کی خستگی محسوس کر رہا ہوں، جسم کی نہیں روح کی۔ موسم کا تقاضا ہے کہ بسنت کی حسین دیوی کے شگفتہ قہقہوں کا لطف اٹھاؤں۔ اس کے زرد آنچل کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھ کر اس کا تعاقب کروں، اور گزر جانے والے موسم سرما کی تمام غیر شاعرانہ کیفیات کو محو کر کے پری بہار کی نزاکتوں اور رعنائیوں کی حضور میں تجدید محبت کروں اور اس سے بھی زیادہ وہ کروں جس کی ترغیب میں خیام کا یہ مصرع پیش کیا جاتا ہے :— "زان پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما" کیونکہ جب فضا رنگ برسے، بھر جائے، ہوا جب چنگ ورباب چھیڑنے لگے جسے صرف دل ہی سن سکتا ہے تو دنیا بھی عبیر و گلال ہی سے کھیلنا پسند کرتی ہے اس کا بھی ہی جی چاہتا ہے کہ اپنے اندر اہتزاز رقص پیدا کرے، لیکن یہ بات نہ کہنے کی ہے نہ سننے کی کہ ایک حزین روح بھی نہایت نازک دیوی ہے، طبیعت کا ملال بھی ایک خاص رنگ رکھتا ہے اور ٹوٹے ہوئے دل کی صدا بھی ایک مستقل نغمۂ سرود ہے۔

دنیا کی آبادی بہ لحاظ احساس دو قابل ذکر جماعتوں میں منقسم ہے۔ ایک طربیہ یا متفاول (Optimistic) جو فلسفۂ خیام کی مقلد ہے اور وعدۂ فردا پر لذت امروز کو قربان کرنا پسند نہیں کرتی۔ دوسری حزنیہ یا متشائم (Pessimistic) جو ہر بات کے طول و حزین رُخ کو سامنے رکھ کر، نشاط حاضر کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے وہ پھول کو دیکھ کر قہقہہ و خندہ سے تعبیر کرتی ہے یہ اُسے صرف ایک زخم سمجھتی ہے، وہ نسیم کو زمزمۂ محبت خیال کرتی ہے اور یہ اس کو صرف آہ جانتی ہے۔ ایک ایرانی ادیب، عباس شاہ صفوی کے باغ کی تعریف کرتا ہوا صبح و شفق کی تعبیر ایک نہایت ہی لطیف مگر طربیہ استعارہ کی صورت میں اس طرح کرتا ہے کہ۔

صبح نسیمے ست از نسترن زارش گزشتہ ، و شفق ہوائے ست از لالہ زارش برگشتہ

لیکن اسی منظر کے متعلق دوسری جماعت کے ادیب سے پوچھو تو وہ صبح کو "چہرۂ پریدہ رنگ" اور شفق کو "دامن خونیں زیر سنگ" کہے گا۔ عالم وجود یکسر مناظر و مرایا سے مرکب ہے اور یہ وہ نشانات باطلہ ہیں جن کی تعبیر ہر شخص اپنے ذہن و تصور کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ کر سکتا ہے

آگ روشن ہوکر چاروں طرف کی فضا کو منور کردیتی ہے، ابھر رہی ہے لیکن شعلہ کا انعکاس اسے رنگین بنائے ہوئے ہے۔ سطحی نگاہ سے دیکھنے والے کہہ سکتے ہیں کہ ہوا رنگین ہے حالانکہ رنگ ہوا میں کہاں، شفق چہرۂ آفتاب کا صرف آئینہ ہے، لیکن دنیا نے اس کا ایک علیحدہ نام رکھدیا ۔ یہی وہ تاثرات تھے جن کی بنا پر بیدل یہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔

بیدل آن گوہر نایاب سُراغ	بہ محیطے ست کہ پرسیدن نیست
عکس افتادہ در آئینۂ ہوش	گُل تو ان گفت ولے چیدن نیست

میں انھیں خیالات میں محو تھا کہ میرے ایک گم گشتہ دوست کی تحریر دوپہر کی ڈاک سے موصول ہوئی، لکھا تھا:۔

بمبئی آئے، اور اس چیز کو جسے آپ نے فتحپور کی ویرانیوں میں گم کیا تھا، ساحل قلابہ پر ڈھونڈھ لیجئے جسوقت آخری بار میں آپ سے ملا تھا اس کے بعد سے دنیا کے ساتھ میں بھی اب بقدر دس سال ضعیف ہوگیا ہوں لیکن اس کا کیا علاج کہ شباب میرا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہیں ۔۔۔ اگر حسن کی پیداوار جاری ہے تو سمجھ لیجئے کہ میری بست سالگی بھی ایک مستقل بالذات جوہر غیر فانی ہوکر رہگئی ہے۔ آپ کو یقین نہ آئے گا، لیکن میرا تجربہ ہے کہ جس چیز کی زکوٰۃ ادا کرتے رہئے اس میں ترقی ہوتی رہیگی۔ زکوٰۃ حسن سے افزونیِ جمال کا حال تو مجھے معلوم نہیں لیکن شباب کے باب میں اس مسئلہ کی صداقت پر مجھے کامل اعتقاد ہے ۔ آپ کہیں گے کہ ایک جُگ کے بعد میں نے آپ پر اثباتِ وجود بھی کیا تو اس انداز سے۔ لیکن کیا کروں۔ آپ کو یاد کرنے کی فرصت مل گئی ہے تو جی نہیں چاہتا کہ آپ کو اس نشہ سے بیگانہ رکھوں جو مجھ پر ایک مرض کی طرح طاری ہے۔ غالب کی اس حسرت کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ:۔

"کجا زہرۂ صبح و جام بلور"

اور یقیناً یہ اجتماع بڑی "خدا ساز" بات سمجھی جاتی ہے، یعنی مذہب اس زندگی میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ اس کی شکایت بھی کیجاتی ہے، حالانکہ جو چیز ترک اسلام کے بعد حاصل ہوسکتی ہے وہ ترک اسلام ہی کے بعد ملے گی۔ یہاں نہ کوئی دعا ہے نہ اس کے رد و قبول کا جھگڑا، فکر فضول بھی اور جرات رندانہ بھی پھر کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا "کہ زہرۂ صبح بھی ہے اور جام بلور بھی" ماہ چہاردہم بھی ہے اور بادۂ انگور بھی۔ آپ کو یاد ہوگا جب میں ساری دنیا کا غم دل میں لئے ہوئے تڑپتا تھا، اب کائنات کو فراموش کرنیکے بعد معلوم ہوا کہ دنیا نام ہے صرف اپنا اور اُن کا ۔۔۔۔ ہمیں جائے سن رجائے تو باشد! کیا آپ کبھی میرا یہ احسان فراموش کرسکتے ہیں کہ میں نے اس عالم میں بھی آپ کو یاد کیا!

اس دس سال کے زمانہ میں مجھ پر کیا گذر گئی، آسمان کا ایک ایک ستارہ اس سے واقف ہے، فضائے بسیط اس داستان درد سے شاید اب بھی لبریز ہوگی، اگر آپ اس نوائے راز کی محرم ہوں تو سُن لیجئے، سمجھ لیجئے مجھے اس کے اعادہ و تکرار پر مجبور نہ کیجئے، مجھ سے تو اب صرف یہ پوچھئے کہ "جب ساری دنیا سوتی ہوتی ہے تو تم کیا کرتے ہو؟" میر کی طرح میں آہیں نہیں کرتا، کروٹیں نہیں بدلتا، آنسو نہیں بہاتا ——— میں جاگتا رہتا ہوں، میرا طالع جاگتا رہتا ہے، نہ سوتا ہوں، نہ سونے دیتا ہوں، ہنستا ہوں، ہنساتا ہوں مجروح ہوتا ہوں، مجروح کرتا ہوں، یہاں تک کہ جب میری دنیا میں صبح کا آفتاب دن کو بارہ بجے طلوع ہوتا ہے تو اس وقت بھی، کوئی یہ کہکر ایک ریشمی معطر چادر میرے سر پر کھینچ کر ڈال دیتا ہے کہ "ہوگا بھی" اور میں پھر غافل ہو جاتا ہوں ——— "دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم"

ذرا صبر کیجئے، میں آپ کو ابھی اور جلانا چاہتا ہوں ——— آپ کو یاد ہوگا جب ہم آپ کسی وقت ایک "رند شاہد باز" کی فرضی تصویر کھینچکر گھنٹوں خیالی لطف حاصل کیا کرتے تھے ـــ مجھے خبر نہیں آپ کس عالم ہیں، لیکن باور کیجئے کہ عملی دنیا میں آنے کے ہی بعد یہ حقیقت روشن ہو سکتی ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کا خیال بھی، اُس ایک دا کی حقیقت تک نہیں پہونچ سکتا جو بے اختیارانہ طور پر بیک وقت تمام وہ قیامتیں جو ابھی تک ابد میں پوشیدہ ہیں کسی کے لب یا جنبش چشم و ابرو سے نکل کر دل کو مسحور کر لیتی ہیں ——— خدا کی قسم رند ہونا بھی کتنی بڑی نعمت ہے ——— لوگ اپنی تباہیوں پر مذہبی تسکین کی جستجو کرتے ہیں جہاں لے دیکے بڑی کائنات "دعا ہے" "یا تقدیر" ——— ذرا ان دونوں کی بے نمکی کو ملاحظہ کیجئے ـــ معاذاللہ ——— اور پھر اس کے بعد بھی سکون معلوم ـــ برخلاف اس کے، میری دنیا کے مراتب و مدارج کو ملاحظہ کیجئے کہ یہاں ہر بربادی ایک ایثار ہے اور ہر ناکامی اعترافِ لطف ـــ آپ ہی انصاف کیجئے کہ شکایت و شکر میں کتنا تفاوت ہے ـ ایک وہ ہیں جو ظلم سے ڈرتے ہیں اور ایک وہ جو ستم کو دعوت دیتے ہیں، اور ستم بھی شدید ترین ـــ آپ جانتے ہیں وہ شدید ترین ظلم کیا ہے ؟ التفات فراواں ـــ لطف بسیار ـ اچھا اندازہ کیجئے ـــ "وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے" اگر صرف اپنی آغوش کے لئے وقف ہو، تو کیا ہو؟ ——— غالب کے فلسفہ کے لحاظ سے یہ ہو کہ خدا بھی رشک کرے، دنیا کا کیا ذکر ہے، اور میں ———

اب یہ نہ پوچھئے، کیونکہ اس بربادی کا افسانہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، سننے کی چیز نہیں ———

اب میں ختم کرتا ہوں، لیکن ایک بات اور سُن لیجئے ——— نگاہ اولین کا افسانہ ہے اس کی لذت

کو میں اب تک چھپائے ہوئے تھا۔ خیر تفصیل کا موقع نہیں اور نہ جرأت، مختصر کہنے میں خدا جانے آپ سمجھ سکیں یا نہیں۔ خیر، یوں سمجھئے کہ ———، پیام روح تھا، نوید فردوس تھا، اور زیادہ غیر دلچسپ ہی زبان میں اشارۂ غیبی تھا، الہام فطرت تھا — ہاں لبوں سے زیادہ پُرلطف وہ بوسہ ہے جو ایک نگاہ جھک کر دوسری نگاہ کو دیتی ہے — اسی کے یہ مختلف نام ہیں — آپ کو جو پسند ہو انتخاب کر لیجئے، میں اُسے صرف "خدا کو بھلا دینا" کہتا ہوں۔ کیونکہ انتہائی لذت وہی ہے جس کی ابتدا اس کیفیت سے ہو۔ شام کا وقت تھا لیکن شفق سے شرابور، اُدھر سورج ڈوب رہا تھا اور اِدھر ایک بدر کامل طلوع کر رہا تھا، اگلی چاندنی سمٹ کر ایک نقطہ میں تبدیل ہوئی اور پھر بڑھکر تار نظر میں آپ کو شاید نہ معلوم ہوگا کہ اس ترکیب سے جو پیکاں تیار ہوتا ہے وہ الٹ کر صاحب ترکش کو بھی مجروح کر دیتا ہے۔ یہ جراحت نام ہے اس تبسم کا جو ہونٹوں پر نہیں بلکہ چتونوں پر نمایاں ہوتا ہے — مجھے اس کا ہوش اُس وقت ہوا جب ساحل قلابہ کی تاریکی میں صرف ایک ہی روشنی جگمگا رہی تھی۔ کہاں؟ میرے پہلو میں، میری آغوش میں، میری نگاہ کے سامنے میرے لبوں سے نزدیک اور میری روح کے اندر — طلوع و غروب کا مفہوم بدلکر اب صرف یہ رہگیا ہے کہ وہ "ہیں" اور "نہیں" ہیں، لذت و الم کے حقیقی فلسفہ کا راز منکشف ہوگیا اور اس طرح کہ میں اُن سے دور ہوں، یا نزدیک — ہائے وہ رات جس کی صبح کا مفہوم میرے لئے سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ "بوئے یاسمن باقی ست" — میرے لئے قائم ہو کر رہگئی ہے، میں نے یا کسی اور نے زمین سے اس کی گردش سلب کر لی ہے ہیئت کے نظام کو بدل دیا ہے اور گرمی کی دوپہر کا آفتاب بھی مجھ پر چاندکی خنک شعاعیں ڈالتا ہوا نظر آتا ہے —

"حکم بر ستارہ کنم" تو نہایت ضعیف سی بات ہے، یہاں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میری محکوم ہے اور اگر میں برہم ہو جاؤں تو شاید خدا ساری دنیا سے بیزار ہو کر منہ موڑ لے ——— فرصت ہو تو آئیے اور دیکھ لیجئے کہ خلیفۃ اللہ فی الارض، زمین پر کیا آفتیں ڈھا رہا ہے۔..................

....

....

....

یہ وقعہ آپ سمجھے کیا تھا — میں وہاں تک لکھ چکا تھا کہ چپکے چپکے پشت کی طرف سے ایک ہاتھ سے آنکھیں بند کر لی گئیں اور دوسرے ہاتھ سے خط چھین لیا گیا ——— میری آنکھیں نازک حنائی انگلیوں کو چوم رہی تھیں

اور ان کی نگاہیں تحریر کے ایک ایک حرف کو ——— آنکھ سے ہاتھ ہٹا کر ہونٹوں کو مسلتا ہوا، خطوط سے پھینک دیا گیا لیکن مجھے "شریر" بناتا ہوا ——— اب آپ سے بھی باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا، اجازت دیجئے تاکہ اس فضا معطر میں آنکھیں بند کر کے بیہوش ہو جاؤں ———

آپ کا

آپ سے باہر

......

پورے دس سال کے بعد ...... کی یہ تحریر مجھے ملی۔ اس زمانہ میں مجھے اور اس کے تمام احباب کو یقین ہو گیا تھا کہ یا تو وہ مر گیا ہے یا ہندوستان سے باہر کسی دور دراز مقام کو چلا گیا ہے۔ اس لئے مجھے اس کا خط دیکھ کر بہت مسرت ہوئی اور تھوڑی دیر کے لئے میرا حزن و ملال دور ہو گیا ——— اس وقت اُس کی تمام باتیں ایک ایک کر کے مجھے یاد آ رہی تھیں اور اس کی تمام وہ رعنائیاں اور خوش ادائیاں جنکو دیکھ کر میں "جوانمرگی" کی پیشین گوئی عرصہ ہوا کر چکا تھا۔ نگاہوں کے سامنے تھیں ——— آخر کار وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ اس سے زیادہ "جوانمرگی" اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کے لئے صرف ایک نگاہ ادا شناس کی ضرورت ہے۔ اور اگر کبھی مل گئی تو پھر نہ اسے زندہ چھوڑ سکتی ہے، نہ خود عرصہ تک زندہ رہ سکتی ہے۔

اس وقت میں بیقرار تھا کہ کسی طرح اُس کی گزشتہ زندگی کی ساری داستان سُن سکتا۔ گھڑی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ابھی ایکسپرس کے روانہ ہونے میں ایک گھنٹہ کی دیر ہے ——— فوراً ایک ضروری تار لکھا کہ ——— "صبح کو پہونچونگا" اور سامان سفر کی طیاری میں مصروف ہو گیا

نیاز

نوٹ:۔ بمبئی پہونچنے کے بعد کے واقعات ڈائری کے دوسرے صفحہ میں ملاحظہ فرمائیے جو آئندہ ماہ میں شایع ہوگا۔

لکھنؤ کی صحیح رنگ کی شاعری

اور

جاوید مرحوم

عنوان بالا کا اقتضا یہ تھا کہ پہلے لکھنؤ کی صحیح رنگ کی شاعری کو واضح کیا جاتا اور پھر یہ بتایا جاتا کہ جاوید مرحوم کو اس سے کیا تعلق تھا، لیکن میں اس بحث میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا، کیونکہ اب یہ مسئلہ کوئی رازِ مخفی نہیں رہا اور یوں بھی اس سے قبل جنابِ یاس خیرآبادی کے متعلق ایک مضمون کے دوران میں اصولی گفتگو اسپر کرچکا ہوں، بہرحال بغیر اس بحث کو چھیڑے ہوئے آج کی صحبت میں لکھنؤ کے ایک ایسے شاعر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جو اب سے صرف چھ سال قبل یہاں کی فضا میں سانس لے رہا تھا اور جس کی شاعری حقیقت یہ ہے کہ لکھنوی شاعری کا نہایت دلکش نمونہ تھی۔

عام طور پر دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں وجہ امتیاز یہ بتائی جاتی ہے کہ وہاں جذبات وکیفیات سے بحث کی جاتی ہے اور یہاں صنعت زبان اور محاورات سے، لیکن میرے نزدیک یہ درست نہیں، کیونکہ جذبات وکیفیات سے خالی تو کوئی شعر ہو ہی نہیں سکتا خواہ میر کا ہو یا امیر کا، البتہ جذبات وکیفیات کی نوعیت اور اُن کے اظہار میں ضرور فرق ہوتا ہے اور یہیں سے دہلی اور لکھنؤ کی راہیں جدا ہوجاتی ہیں شاعری الفت ومحبت کی زبان ہے اور اس کے ماتحت جو جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں اُن کے لئے دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کی گلیاں یکساں حکم رکھتی ہیں، لیکن شاید یہ سرزمین یا اختلاف آب وہوا کا اثر ہے کہ دہلی کا شاعر خرابِ الفت ہونے کے بعد ایک دنیا اپنی علحدہ قائم کرلیتا ہے جہاں وہ کائنات سے بے نیاز ہوکر شعر نہیں کہتا بلکہ اپنے جذبات ایک حزین راگنی میں گنگنایا کرتا ہے اور لکھنؤ کا شاعر طالع ناساز کی تمام یاس آفرینیاں دیکھنے کے بعد بھی کوچۂ محبوب کو نہیں چھوڑتا۔

محفل یار میں غیروں سے "اُن" کا التفات دیکھ دیکھ کر جل رہا ہے، مر رہا ہے، لیکن ایک سرکش گدا کی طرح وہاں سے ٹلتا نہیں، یہاں تک کہ وہیں دم دیتا ہے، ذبح ہوجاتا ہے اور اُس کی زندگی نہیں بلکہ موت کا بڑا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کا محبوب بھی بازلفِ پریشاں اس کے جنازہ کے ساتھ ساتھ ہے۔ لکھنؤ میں تاثرات محبت کی یہ فضا پیدا ہوجاتا جس میں دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے نزع، جانکنی، ماتم، واویلا، بین، شیون، جنازہ کے مناظر سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ ایک حد تک ضروری تھا کیونکہ یہاں کے اکثر شعراء ایسے مسلک کے پابند ہیں جس کی رو سے اُنھیں سال کے بارہ مہینوں میں تقریباً ہر مہینے کسی نہ کسی طرح اس نوع کے جذبات کو زندہ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ پھر انسان کے جذبات پر ماحول ہی کا اثر نہایت قوی ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ خود ذاتی معاشرت اور مذہبی معتقدات کہ

اس کے اثرات سے بچنا کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ اسی لئے لکھنوی شاعری کا یہ دردمند پہلو جس میں مرثیہ کا رنگ زیادہ جھلکتا ہے۔ دردناک تو ہے، لیکن خودداری اور وقار کی بلندی نہیں رکھتا۔

لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا رخ وہ ہے جس کا تعلق صرف "محفل طرازیوں" سے ہے اور جہاں عامۃ الورود جذبات الفت سے بحث کی جاتی ہے۔ اس رنگ میں لکھنؤ کا شاعر ہرچند "اہل نظر" کی حیثیت سے اپنے آپکو پیش نہیں کر سکتا لیکن ایک بوالہوس کی حسن پرستیاں بھی ہمیشہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہوتیں میرے ایک دوست نے مرزا تعشق مرحوم کا یہ مصرع "نام سے تعویذ کے باندھے گئے بازوئے دوست" نہایت کراہت کے ساتھ پڑھا اور فرمایا کہ یہ بھی کوئی شاعری ہے۔ میں خاموش ہوگیا، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اُن غریب کو کبھی کسی کے گورے گورے بازو دیکھنے ہی نصیب نہیں ہوے، چہ جائیکہ وہ وقت آرائش اُن پر رنگین ریشمی فیتوں کے تعویذ بندھتے دیکھتے۔ دوسرے دن اتفاق سے شاہ میناصاحب کی نوچندی میں میرا ان کا ساتھ ہوگیا ایک مغنیہ اور کافی حسین ــــ گا رہی تھی اور وہی مابہ النزاع تعویذ اس کے بازو پر بندھا ہوا تھا۔ خیر اس وقت تو وہ صرف مسکرا کر رہ گئے لیکن سنا ہے کہ اس کے بعد کسی اور جلسے میں جب مرزا تعشق کی شاعری کا ذکر آیا تو اُنھوں نے اس مصرع کی بھی تعریف کی کہ "نام سے تعویذ کے باندھے گئے بازوئے دوست"

الغرض لکھنوی شاعری کا یہ رُخ ضرور قابل لحاظ ہے اور ایک "رند شاہد باز" کی زندگی کے بہت سے نکتے اس میں تلاش سے ملجاتے ہیں حیات انسانی کے واقعات میں یہ جستجو کرنا کہ فلاں امر موزوں ہے اور فلاں ناموزوں، لغو سی بات ہے۔ حقیقت کے لحاظ سے دیکھئے تو میر درد بھی ویسے ہی ناکارہ نظر آتے ہیں جیسے جان صاحب، کیونکہ انقلاب عالم اُن میں سے کوئی نہیں پیدا کر سکا، پھر جب سوال صرف وقت ضایع کرنے کا ہے تو اس میں یہ جستجو کرنی کہ کس نے اچھی طرح وقت ضایع کیا اور کس نے بُری طرح، لالعنی سی بات ہے۔ مولویانہ انداز میں زیادہ سے زیادہ فرق اگر کوئی ظاہر کیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ بلند جذبات سے ہمارا خیال معصیت سے ہٹتا ہے اور پست کیفیات کا شعر اس طرف مائل کرتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ایک مولوی کو اس بحث میں پگڑی اچھالنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ گناہ کی لذتوں سے واقف ہوئے بغیر، خواہ مخواہ گناہ کو گناہ کہدینا کہاں کا انصاف ہے ــ علی الخصوص اس وقت جبکہ موت کی نگاہ میں ایک زاہد شب زندہ دار اور ایک رند بادہ خوار دونوں ایک درجہ رکھتے ہیں موت کے بعد کا سوال نہ اٹھائیے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے اور سب سے بڑا شاعر وہی ہے جو سب سے زیادہ مذہب سے علٰحدہ ہو۔ بہرحال، مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ لکھنؤ کی شاعری بھی اپنی جگہ خاص چیز ہے۔ اگر کوئی اسی کو تکمیل کے ساتھ ادا کر سکے، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ دنوں سے شعرائے لکھنؤ میں دہلی کی تقلید کا خیال قوی ہوتا جا رہا ہے اور حقیقتاً مجھے افسوس ہوتا ہے جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ دہلی کی آب و ہوا یہاں آ نہیں سکتی اور لکھنؤ کی وہ مخصوص فضا بھی اس کوشش میں برباد ہو رہی ہے اور بیان کی روانی، زبان کی پاکیزگی، الفاظ کی شائستگی، محاورات کی شگفتگی جو اہل لکھنؤ کا حصہ تھی مفقود ہوتی جاتی ہے۔

ایک دن میں اپنے عزیز دوست مولوی عبدالباری صاحب آسی سے اس مبحث پر گفتگو کر رہا تھا کہ اُنھوں نے مجھے جاوید مرحوم کے

دو چار شعر سنائے۔ چونکہ ایک زمانہ کے بعد میں نے لکھنؤ کے صحیح رنگ کے یہ شعر سنے اس لئے مجھے بہت لطف آیا اور میں نے خواہش کی کہ انکا کلام فراہم کیا جائے، لیکن جستجو کی گئی تو مایوسی ہوئی کیونکہ سوائے چند اشعار کے ان کا سارا کلام ضائع ہوچکا ہے اور اب کوئی اُمید اُس کے ہاتھ آنے کی نہیں ہے۔ چونکہ جناب جاوید مرحوم کو حضرت آسی سے خصوصیت خاصہ حاصل تھی اور وہ اپنی ہر غزل آسی صاحب کو سنادیا کرتے تھے، اس لئے کچھ شعر ان سے ملے اور کچھ جناب جاوید کے بھائی سید مجاور حسین تمنا سے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اُن کے کلام پر کیا تنقید ہوسکتی ہے لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے چند دن بعد یہ اشعار بھی گم ہوجائیں، میں اُنھیں نگار میں درج کئے دیتا ہوں۔

مختصر حالات آپ کا نام سید محمد کاظم تھا۔ اور بعض لوگ آپ کو صرف بندۂ کاظم کے نام سے یاد کرتے تھے، تخلص جاوید تھا اور ۱۲۸۰ھ میں یا اس سے کچھ قبل یا بعد آپ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مولوی سید محمد جعفر اللہ اور دادا کا مولوی سید باقر تھا۔ زمانۂ شاہی میں آپ کے دادا جی کی خدمت پر مامور تھے۔ آپ کے نانا مولوی سید علی حسین بھی نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیمی حالت کے متعلق مفصل حالات معلوم نہیں ہو سکے لیکن یہ یقینی ہے کہ آپ بے علم شخص نہ تھے۔ انتقال کے وقت آپ کی سکونت محلہ پاٹا نالہ میں تھی۔ لیکن اپنے والد کے زمانہ میں سرائے مغل خاں میں رہتے تھے جہاں آپ کے دادا کے کئی ذاتی مکان موجود تھے۔

شاعری کا شوق آپ کو نہایت صغیر سنی سے تھا، چنانچہ سب سے پہلے آپ نے اپنے والد جناب اُمید ہی کو اپنا کلام دکھایا، اُس کے بعد سید اصطفا صاحب عرف لڈن صاحب خورشید لکھنوی سے اصلاح لی۔ سنا جاتا ہے کہ آپ بہت زود گو تھے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ کو دو روز تک سانجر میں مبتلا رہنے کے بعد (۶۰ سال کی عمر میں) وفات پائی اور جناب غفران مآب کے امام باڑے میں دفن کئے گئے۔ ان کا مجموعۂ کلام دو جلدوں پر مشتمل تھا جن میں علاوہ غزلوں اور رباعیوں کے تقریباً ۵۰ مرثیے بھی تھے۔ لیکن یہ مجموعہ ایک صاحب جو اُن کے دور کے عزیز تھے اُٹھالے گئے اور پھر اس کا پتہ نہ چلا۔

آپ نہایت وسیع الاخلاق، منکسر مزاج اور ہر دل عزیز انسان تھے اور محرم کے زمانہ میں دور دور مقامات سے حدیث خوانی کیلئے طلب کئے جاتے تھے۔

کلام ان کے جو اشعار دستیاب ہوئے ہیں ان کی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جاوید صحیح معنی میں لکھنوی شاعر تھے اور جتنی باتیں اس رنگ کی شاعری میں ہونی چاہئیں وہ سب آپ کے ہاں پائی جاتی تھیں ممکن ہے کہ آپ نے کبھی اس رنگ سے ہٹ کر بھی کچھ کہا ہو لیکن اس کا ثبوت دشوار ہے۔ ان کے ہاں یقیناً تخئیل بلند نہیں ہے اور جذبات بھی عمیق نہیں ہیں، لیکن معاملات حسن و عشق کے بیان کے جتنے اسلوب ہوسکتے ہیں وہ سب ان کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اُن کا جوش معمولی سطح سے بھی بلند ہوجاتا ہے۔ مثلاً آپ کا ایک شعر ہے:-

یہ اپنے چاہنے والوں سے آپ کا برتاؤ یہاں تک آتی ہے آواز لن ترانی کی

لن ترانی کا مضمون نہایت پامال چیز ہے، لیکن جاوید صاحب نے جس جوش اور اسلوب کے ساتھ اُس کو ظاہر کیا ہے اس نے ایک ایسی خاص کیفیت پیدا کر دی ہے جس سے مضمون میں تازگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اسی زمین میں ایک شعر اور جوانی کے قافیہ کا ہے:۔

جو بچنا ہے تو میری طرف سے پھیر لو منہ
یہ کوئی کھیل نہیں موت ہے جوانی کی

جناب جاوید نے جوانمرگی کا منظر دکھانے کے لئے الفاظ سے جو فضا پیدا کی ہے وہ یقیناً ایک ایسی مصوری ہے جو باوجود عامیانہ تخاطب کے بھی سننے والے کے دماغ کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی قافیہ میں ایک شعر اور ہے لیکن دوسرے عالم کا کہتے ہیں۔

ہماری عمر سے کچھ روز گھٹتے جاتے ہیں
قسم حضور نہ کھایا کریں جوانی کی

کسی کے جوانی کی قسم کھانے پر شاعر کے خیال کا اس طرف منتقل ہونا کہ ہر قسم کے ساتھ اس کے عمر کے دن گھٹتے جاتے ہیں۔ ایسا شدید جذبۂ شوق ہے کہ مشکل سے اسمیں کوئی اضافہ ہو سکتا ہے۔ ہر چند جوانی کی قسم کھانا کوئی شائستہ و مہذب بات نہیں ہے لیکن اگر کوئی ایسا کرے تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ اس طرح ذکر شباب کیا جائے اور سننے والا ٹھنڈے دل سے اسے سُن لے۔ جاوید صاحب نے اپنے تاثر کو پہلے مصرع میں جس خوبی سے ظاہر کیا ہے وہ یقیناً معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔

لطف زبان، سلاست ادا کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

اب اک بوسہ پہ اتنی بحث زیبا ہے نہ شایاں ہے
نگاہیں نیچی کر لو، خیر، اچھا، لے لیا ہوگا

ابتداء محبت کی کیفیات پر غور کر کے مستقبل کی طرف سے جو اندیشہ چاہنے والے کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ بہت عام بات ہے لیکن اس جذبہ کو ایسے اسلوب سے بیان کر دینا کہ دل کی صحیح کیفیات ظاہر ہو جائیں۔ بہت دشوار ہے۔ جاوید صاحب اس میں جسقدر کامیاب ہوئے ہیں ذیل کے شعر سے معلوم ہو سکتا ہے:۔

ابھی تو آگ سی دل میں کہیں کم ہو کہیں زائد
اگر مل جائیں گے آپس میں سب چھالے تو کیا ہوگا

مسرت و نشاط یا حزن و ملال نام ہے صرف اپنے احساس کا دنیا میں کوئی شے ان کیفیات کی حامل نہیں ہے، اگر اپنا جی خوش ہے تو ہر منظر اچھا معلوم ہوتا ہے، ورنہ دنیا کی نشاط انگیزیاں بھی ماتم سے کم نہیں۔ اس فلسفہ کو جاوید اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کفن پہنے ہوئے خود چاندنی آئی مرے گھر میں   خدا عالم نہ دکھلائے شب مہتاب ہجراں کا

ان کے بعض شعر یہ ہیں :-

اداسی چارہ گر کے منہ پر جب آتی ہوئی دیکھی — میں سمجھا یہ کہ ٹوٹا زخم کا میرے کوئی ٹانکا

ملا شباب میں جو دل، بجھا وہ پیری میں — چراغ صبح تھا اب اُس کا اعتبار نہ تھا
ہزار بار رکھا ہاتھ اُس نے سینہ پر — کہ میرے دم کے نکلنے کا اعتبار نہ تھا

حد سے افزوں ہے یہ کہ کر میں بھی اک مشکل میں تھا — سب سہی پر درد اتنا تھا کہ میرے دل میں تھا
حال دنیا پوچھتے ہیں اہل محشر تو نہیں — مرنے جینے کا مزہ سب کو جیۂ قاتل میں تھا

اُٹھائیں دست نازک سے وہ خنجر ذبح ہوتا ہوں — میں کر لوں امتحاں انکا وہ کر لیں امتحاں میرا

نہ جانے وصل میں کیا تھا ہوا ہی ہجر میں کیا — جو پھول کل تھے وہ کانٹے ہیں آج بستر پر

مرنے کی اک امید یہ جی جائیں بے نصیب — تم بھی کسی کے غم میں اگر سوگوار ہو

کہتے ہیں دیکھ کر مری صورت یہ اُن سے غیر — اب اس کے رنج کی نہ کوئی بات کیجئے
کیا آشنائے لذت دید اُس طرف نہیں — محفل میں منہ کو پھیر کے کیوں بات کیجئے

ہم جس کو عمر سمجھے مدت ہی اُس کی کیا تھی — اتنا نہ کہنے پائے کس فتنہ گر نے مارا

اب کہاں تھا میں جو دیتا اس محبت کا جواب — جس کی تربت دیکھ لی مجھکو صدا دینے لگے

ارے یہ حشر ہے ہیں سیکڑوں ترے مشتاق — یہاں یہ ہم بھی ہیں راضی نقاب ڈال کے چل
کہیں یہ تفرقہ انداز چہرۂ رخ دیکھ نہ لے — نہ اس طریق سے باہیں گلے میں ڈال کے چل

کل بھی گر پہچانیئے تو مان لوں　　دیکھ لی ہے آج صورت آپ نے

اک حیا ہی سی اسے محفل میں آکر رہ گئی　　میں یہ سمجھا اک کلی تھی مسکرا کر رہ گئی
اب نہیں معلوم زخمی کون محفل میں ہوا　　تیر کی آواز کچھ کانوں میں آکر رہ گئی

شب تاریک ہجر آتی ہے جاوید　　سویرے سے چراغوں کو جلا لو

رات کو دریا میں موجیں کس طرح اچھلی ہیں　　اک کنارے چاند ہو اور اک کنارے آپ ہیں

جمع آنکھوں میں ہیں اتنے کہ کھٹک ہوتی ہے　　کچھ تو آنسو مری آنکھوں سے نکل جانے دو

نیاز فتحپوری

استفسارات

حسن یوسفی

(جناب معزالدین صاحب ۔ کمال گنج)

مشہور شعر ہے :- حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری

شاعر نے موسیٰ کے ید بیضا اور عیسیٰ کی مسیحا نفسی کے سلسلہ میں حسن یوسف کو بھی ایک معجزہ کی صورت میں پیش کیا ہے، لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ حسن یوسفی اگر معجزہ تھا تو کس طرح اور کس فائدہ کی غرض سے۔

نگار) الغرض کبھی نہ کبھی آپ حضرات مجھے ایسے مسائل پر لکھنے کے لئے مجبور کر ہی دیتے ہیں، کوئی نہ پوچھے تو مجھے خیال بھی نہیں آتا لیکن استفسار کے بعد خاموشی یا خلاف ضمیر گفتگو میرے کیش کے خلاف ہے۔ آپ تو شاید نہیں، لیکن اور حضرات غالباً یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ کلام مجید سے یوسف کا غیر معمولی جمیل ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا اور ایک جگہ بھی اس کی طرف اشارہ نہیں ہے، معجزہ ہونا تو خیر بڑی بات ہے چونکہ قصۂ یوسف آپ کے سامنے ہوگا اس لئے میں اس کو شروع سے نہیں بیان کرتا بلکہ جن مقامات کے بیان کی ضرورت ہے انھیں کی طرف اشارہ کروںگا۔

کلام مجید میں پہلے یوسف کے خواب دیکھنے کا ذکر ہے کہ انھوں نے چاند سورج اور گیارہ ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا، اس کے بعد بھائیوں کا اُن کو کنوئیں میں ڈالدینے کا بیان ہے اور پھر ایک قافلہ کا آکر اس کنوئیں سے نکالنے کا ذکر کیا گیا ہے یہاں تک ایک جگہ بھی یوسف کے حسن کا ذکر نہیں ہے حالانکہ وہ موقع جب اُن کے بھائیوں نے آپس میں باتیں کی ہیں کہ ہمارا باپ یوسف اور اس کے بھائی کو زیادہ چاہتا ہے ایسا تھا کہ اس چاہنے کی وجہ اُن کا جمال ظاہری قرار دیجاتی، لیکن اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اُس کے بعد جب کارواں کنوئیں پر آیا اور اُس نے ڈول ڈالکر یوسف کو نکالا تو اس وقت کھینے والے نے صرف یہی کہا کہ "یا بشریٰ ہذا غلام" اگر یوسف غیر معمولی جمیل ہوتے تو ناممکن تھا کہ وہ دفعتہً ٹھیر کر یہ نہ کہہ اُٹھے کہ کیسا خوبصورت لڑکا ہے۔ بہرحال یہاں سے بھی آپ کے جمال کی نفی ہوتی ہے۔

اس کے بعد جب آپ مصر پہنچے ہیں اور ایک مصری سردار یا عزیز مصر (عزیز مصر سے شاہ مصر مراد نہیں ہے) آپ کو مول لیکر

اپنی بیوی زلیخا کو دیتا ہے تو صرف یہ کہتا ہے کہ "اکرمی مثواہ عسیٰ ان ینفعنا او نتخذہ ولدا" یعنی اس کو اچھی طرح رکھو شاید کسی وقت تمھارے کام آئے یا ہم اسے متبنیٰ کرلیں" اس نے بھی ان کے حسن و جمال کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اُس کے بعد خدا یوسف کو جوانی تک پہونچانے کا ذکر کرتا ہے تو ان الفاظ میں :-

"ولما بلغ اشدہ آتینٰہ حکما وعلما"

یعنی جب وہ جوان ہوا تو ہم نے اُس کو علم و حکمت سکھائی۔ اس جگہ بھی ان کے جمال کا کوئی ذکر نہیں ہے حالانکہ اگر اللہ ان کو علم و حکمت کے ساتھ صورت ظاہری بھی غیر معمولی عطا کرتا تو ضرور اس کا اظہار فرماتا۔

اس کے بعد زلیخا کی لگاوٹ کا بیان ہے کہ دروازہ بند کرکے یوسف کو اپنی طرف مائل کرنے لگی لیکن آپ راغب نہیں ہوئے، پھر قمیص کے پھٹنے اور یوسف کے الزام سے بری ہونے کا بیان ہے، اس میں بھی کہیں آپ کی خوبصورتی کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

پھر اس دعوت کا ذکر ہے جب زلیخا نے مصر کی بعض عورتوں کو طلب کرکے یوسف کو اُن کے سامنے پیش کیا۔ اور انھوں نے یوسف کو دیکھکر بجائے پھل کاٹنے کے اپنی انگلیاں کاٹ لیں اور یہی ایک واقعہ ایسا ہے جس سے جمال یوسف پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ یعنی وہ اس قدر جمیل تھے کہ عورتیں انھیں دیکھکر مبہوت ہوگئیں اور اپنے ہاتھ زخمی کرلئے اور چیخ اٹھیں کہ ما ہٰذا بشرا۔ ان ہٰذا الا ملک کریم" یعنی یہ انسان نہیں ہے کوئی بڑا شریف فرشتہ ہے۔ لیکن چونکہ لوگوں نے اس واقعہ کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے

کلام مجید کے الفاظ اس واقعہ کے متعلق یہ ہیں :-

وقال نسوۃ فی المدینۃ امرات العزیز تراود فتٰھا عن نفسہ۔ قد شغفھا حبا۔ انا لنرٰھا فی ضلل مبین۔ فلما سمعت بمکرھن ارسلت الیھن واعتدت لھن متکا و آتت کل واحدۃ منھن سکینا وقالت اخرج علیھن فلما رأینہ اکبرنہ وقطعن ایدیھن و قلن حاشا للہ ما ھذا بشرا۔ ان ھذا الا ملک کریم قالت فذلکن الذی لمتننی فیہ ولقد راودتہ عن نفسہ فاستعصم ولئن لم یفعل ما آمرہ لیسجنن ولیکونا من الصاغرین۔ قال رب

اور کہا چند عورتوں نے شہر میں کہ عزیز کی عورت اپنے غلام سے لگاوٹ کرتی ہے اور اس کی محبت میں بیقرار ہے۔ بیشک ہم دیکھتے ہیں، اُس کو علانیہ گمراہی میں۔

جب عزیز مصر کی عورت نے اُن کی مکر کی باتیں سنیں تو انھیں بلاکر ان کی دعوت کی اور ہر ایک کے ہاتھ میں چھری دیدی اس کے بعد یوسف سے کہا کہ سامنے آجاؤ۔ پھر جب دیکھا عورتوں نے یوسف کو تو اسکو بڑا جانا اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور بولیں حاشا یہ انسان نہیں ہے بلکہ بزرگ فرشتہ ہے۔

زلیخا نے کہا کہ یہ وہی ہے جس کی بابت تم مجھ کو ملامت کرتی تھیں

السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ والا تصرف عنی کیدھن اصب الیھن واکن من الجاھلین:-

بیشک یوسف نے اس سے لگاوٹ کی اور وہ بچا رہا، لیکن اس نے میرا کہنا نہ مانا تو وہ ضرور قید کیا جائے گا اور ذلیل ہوگا۔

یوسف نے کہا اے میرے پروردگار قید میں جانا مجھے زیادہ محبوب ہے اس چیز سے جس کی طرف وہ مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو اُن کے مکر کو دور نہ کریگا تو میں اُنکی طرف جُھک جاؤنگا اور جاہلوں میں سے ہوجاؤنگا۔

حاصل ان آیات کا یہ ہے کہ شہر کی بعض عورتوں نے (جو بعض مفسرین کے بیان کے مطابق خود عزیز مصر کے ہاں کام کرنے والی یا آنے جانے والی تھیں) زلیخا کی محبت کا چرچا کیا تو زلیخا نے ان کے مکر کو سمجھ کر دعوت دی اور یوسف کو سامنے بلایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ یہاں سب سے زیادہ اہم لفظ مکر ہے عربی میں لفظ مکر کے وہی معنے ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں یعنی فریب، خدع یا عورتوں کے لحاظ سے اس جگہ تریا چرتر کہہ لیجئے۔ ظاہر ہے کہ محض کسی کی محبت کا ذکر کرنا یا محبت پر کسی کو ملامت کرنا مکر تو نہیں ہو سکتا اس لئے صاف ظاہر ہے کہ یا وہ عورتیں خود یوسف سے محبت کرتی تھیں جس کا علم زلیخا کو تھا اور اس لئے ان کے اس تجاہل کو مکر سے تعبیر کیا گیا یا پھر یہ کہ پہلے سے ان عورتوں میں اور زلیخا میں یوسف کو رام کرنے کے لئے کوئی حیلہ طے ہوگیا اور اس لئے اس کو مکر سے تعبیر کیا گیا۔ بہر حال انہیں سے جو بات بھی ہو، یہ یقینی ہے کہ جب یوسف انکے سامنے آئے تو انھوں نے بھی اُن کے ساتھ لگاوٹ شروع کی اور جب قابو میں نہ آئے تو ڈرانے کے لئے یا اُن کو قید خانہ بھیجنے کے لئے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ اس کا ثبوت خود اس سے بھی ملتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد یوسف نے کیا کہا۔ یوسف کے الفاظ یہ ہیں السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ یعنی قید خانہ مجھے زیادہ محبوب ہے اُس چیز سے جس کی طرف وہ بلاتی ہیں۔ اس میں لفظ یدعوننی قابل غور ہے، یعنی آپ نے صیغۂ جمع میں فرمایا۔ اگر صرف زلیخا کی لگاوٹ کا اظہار مقصود ہوتا تو صیغہ جمع کی ضرورت نہ تھی۔ دوسرا ثبوت انہیں آیات سے اور بھی ملتا ہے۔ وہ یہ کہ جب یوسف نمودار ہوے اور ان کو دیکھ کر انھوں نے ہاتھ کاٹ لئے تو اُنھوں نے اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ سے کیا: "ان ھذا الا ملک کریم" یعنی یہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔ لفظ فرشتہ ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو یوسف کے حسن و جمال پر حیرت نہیں ہوئی، بلکہ اُن کے تقدس پر تعجب ہوا یعنی جب اُنھوں نے دیکھا کہ یوسف ان کی طرف مائل نہیں ہوئے اور ہاتھ کاٹ ڈالنے پر بھی نہ اُن کو رحم آیا نہ خوف سے اُن کی جانب راغب ہوئے تو انھوں نے کہا کہ یہ آدمی نہیں فرشتہ ہے جو کسی طرح معصیت پر آمادہ ہی نہیں ہوتا۔

اس امر کی تصدیق کہ ان عورتوں نے قصداً ہاتھ کاٹ ڈالنے کا مکر کیا تھا تاکہ یوسف کسی نہ کسی طرح ان کی طرف مائل ہوجائیں یا پھر اس بہانہ سے قید خانے بھیجدئے جائیں۔ بعد کی آیتوں سے بھی ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جب یوسف قید خانے بھیجدئے گئے کچھ عرصہ

بعد بادشاہ نے اُن کے علم تعبیر رویا کا حال معلوم کرکے ایک آدمی اُن کے پاس بلانے کو بھیجا تو یوسف نے اس آدمی سے کہا کہ "ارجع الی ربک فسئلہ ما بال النسوۃ اللتی قطعن ایدیھن ان ربی بکیدھن علیم" (اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ اور دریافت کرو کہ اُن عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔ میرا خدا ان کے مکر سے واقف ہے)

جب بادشاہ کے پاس یوسف کا یہ پیغام پہونچا تو اُس نے ان عورتوں سے دریافت کیا کہ ما خطبکن اذ راودتن یوسف عن نفسہ قلن حاش للہ ما علمنا علیہ من سوء (کیا ہوا تھا جب تم نے یوسف سے لگاوٹ کی تھی، انھوں نے کہا کہ ہم نے یوسف میں کوئی بُرائی نہیں پائی یعنی یہ کہ اس میں کوئی لغزش نہیں پائی) ان آیات سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ ان عورتوں نے یوسف سے لگاوٹ کی اور قصداً اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تاکہ شاید اسی طرح وہ مائل ہوجائیں۔

پھر جب ہاتھ کاٹنے کی صورت یہ قرار پائی تو اس کی وجہ حُسن یوسفی نہیں ہوسکتی۔ الغرض کلام مجید میں صراحۃً وکنایۃً کسی جگہ یوسف کے حسن وجمال کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ عورتوں کے ہاتھ کاٹ لینے سے یہ امر مستنبط ہوسکتا تھا، سو اس کی بھی حقیقت ظاہر کردی گئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یوسف کی خوبصورتی ہونے میں کوئی استحالۂ عقلی ہے۔ ممکن ہے وہ بہت جمیل رہے ہوں، لیکن گفتگو صرف اتنی ہے کہ کلام مجید میں کہیں اس کا ذکر ہے یا نہیں؟

نیاز

چند روز لکھنؤ میں!

بعد مدت کے نظر آیا دیارِ لکھنؤ!
دل فدائے لکھنؤ! آنکھیں نثارِ لکھنؤ!

عرش ساماں کیوں نہ ہو خاکِ دیارِ لکھنؤ
ہے بہارِ خلد سے بڑھکر بہارِ لکھنؤ!

مٹ چکے ہیں گرچہ تاج و تاجدارِ لکھنؤ
پھر بھی زندہ ہے ابھی روحِ وقارِ لکھنؤ

مشرقی رنگِ تمدن کی ہے خالص یادگار
کیوں نہ ہو ہر مشرقی دل سے نثارِ لکھنؤ

نو بہارِ خلد کے کھوئے ہوئے کچھ خواب ہیں
مایۂ حیرت نہیں نقش و نگارِ لکھنؤ

یہ محل اسلاف کی تہذیب کا گہوارہ ہیں
ہند میں کافی ہے یہ تنہا وقارِ لکھنؤ

یہ فلک رتبہ مکاں! یہ خلد ساماں گلستاں!
رشکِ مہر و ماہ ہیں نقش و نگارِ لکھنؤ

وہ ہے تنہا آسماں پر، ہیں یہاں لاکھوں نہاں
کیوں نہ ہو زہرہ کو رشکِ نغمہ زارِ لکھنؤ

"ماہ" در آغوش ہے ہر ذرہ اس کی خاک کا
اے زہے حسنِ "نظر گاہِ" دیارِ لکھنؤ!

محفلِ شعر و ادب ہے مستِ صہبائے نیاز
ہے "نگارِ" لکھنؤ! بیشک نگارِ لکھنؤ

خامۂ جالب کہ ہے جس پر صحافت کو غرور
ایک مدت سے ہے مخمورِ بہارِ لکھنؤ

کس ادب سے لب پر آتا ہے مرے احسن کا نام
جن کی ہستی ہے فروغِ افتخارِ لکھنؤ

حضرت شہزادۂ باقر علیخاں کا خلوص
دل میں ہے پنہاں بطورِ یادگارِ لکھنؤ

چونک کر خوابِ لحد سے اپنے ویرانوں کو دیکھ!
جانِ عالم! آہ او جانِ بہارِ لکھنؤ!!

آہ میری پارسائی کی یہ سادہ بیکسی!
ہائے یہ رنگینیٔ لیل و نہارِ لکھنؤ!

مجھکو اِن روشن شبستانوں میں مر جانے بھی دے!
اے طرب آبادِ ہند! اے حسن زارِ لکھنؤ!

ایک حسنِ نازنیں تڑپائیگا برسوں ہمیں
یہ "خلش" دل میں رہیگی یادگارِ لکھنؤ

اگلی عظمت یاد آتی ہے یہ رونق دیکھکر
ہم تو اختر اب بھی ہیں ماتم گسارِ لکھنؤ

اختر شیرانی

عہد گزشتہ کی یاد

اب کہاں دورِ بادۂ گلفام — اب کہاں وہ سحر کجا وہ شام
اب کہاں حسن و عشق کی باتیں — اب کہاں زندگی کا لطفِ دوام
اب کہاں شعر و شاعری کا جنوں — اب کہاں آرزوئے حسنِ کلام
وہ زمانہ بھی یاد ہے مجھ کو — فکرِ اشعار میں تھی نیند حرام
گاہ اقبال کی نواؤں میں گم — گاہ غالب کے میکدے میں قیام
بتکدے میں کبھی سیاہ عمل — صومعہ میں کبھی بہ اسلام
فلسفے کی فضا میں گہ پرواز — گاہ مذہب کے دشت میں ضرغام
گاہ آغوشِ حسن میں بے کل — گاہ راہِ طلب میں بے آرام
اب نہ وہ دل نہ وہ زمانہ ہے — اللہ اللہ رے گردشِ ایام
فکرِ دنیا سے کس کو فرصت ہے — یاد ہے اب کسے غزل کا نام
ذوق و غالب کے شعر بھول گئے — رہ گئے یاد دفتری احکام
شعر کہئے کہ نوکری کیجئے — دل کی سنئے کہ کیجئے پیٹ کا کام
آج فرصت کی شکل دیکھی تھی — چند اشعار ہو گئے ارقام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا — توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

"زہرِ غم کر چکا ہے میرا کام" — اے دلِ ناتواں چلا میں تھام
حسن پر جاں نثار کرتے ہیں — کتنا محبوب ہے یہ خوں آشام
تم کو لاتی جو چاند کے بدلے — میرے غمخانہ میں نہ آئی وہ شام
بچ کے چل شہرِ حسن سے اے دل — کہ یہاں خنجر و تفنگ ہے عام
گلستاں میں بہار آ بھی چکی — ہائے لایا نہ کوئی تیرا پیام
اُن کے غم میں وہ لطفِ مے نہ رہا — اب کہیں اس کو کس بنا پہ حرام
تیری شمشیر نے گلے مل کر — کس ادا سے کیا ہے کام تمام

آہ عاشق کبھی نظیر بھی تھا
سنتے ہیں اب بھی ہے مگر ناکام

نظیر لودھیانوی

غزلیات

آزاد انصاری

کیا خاک مان لوں کہ وہ نامہرباں تھا — اک طرز التفات سے کیا کچھ عیاں نہ تھا
یوں یاد آؤ گے ہمیں اصلا خبر نہ تھی — یوں بھول جاؤ گے ہمیں وہم و گماں نہ تھا
اُمید کے لحاظ سے میرا گماں غلط — برتاؤ کے خیال سے تو مہرباں نہ تھا
تم آئے اور بزم کا نقشہ بدل گیا — دم بھر میں وہ طرازِ طرب کا سماں نہ تھا

مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی

بالیں پہ نہ لائے کوئی اُسے کیا فائدہ شرما جائیگا — اب حال زبون و زار مرا اُس سے نہ بھی دیکھا جائیگا
وہ صید ضعیف و لاغر ہوں سب دیکھ کے مجھکو کہتے ہیں — اس بیچارے سے زخمی ہو کر کیونکر تڑپا جائیگا
میں اُس سے کہوں دکھ درد ترا اُن میری تو اے دل توبہ ہے — سب آئی گئی مجھپر ہو گی کمبخت ترا کیا جائیگا
آہ سوزاں رد کی تو رد کی آنسو پینا قہر ہوا — اب چھالے پہ چھالا چھالے سے چھالا پڑتا جاتا جائیگا
فریاد کا شنوا کوئی نہیں بیکس کا سہارا کوئی نہیں — کچھ دیکھ لیا اس دنیا میں کچھ حشر میں دیکھا جائیگا
کیا عرض تمنا کا حاصل وہ ایک ہی پرفن ہے او دل — یا باتیں بنائی جائیں گی یا باتوں میں ٹالا جائیگا
دیدار کی حسرت جو ہے سو ہے دل کی تپش کو کیا کیجئے — بیہوشی سی چھا جائیگی جب پردہ اٹھایا جائیگا
الزام نہ دو ناراض نہ ہو اس دل سے بہت مجبور ہوئے — اب تم جو سہارا دو انھیں یوں ہم سے نہ اٹھا جائیگا
جب یاد دلایا روز جزا کافر نے کہا دیکھ کے کہا — سی جائیں گے تیرے ہونٹ اثر جب نام وفا آجائیگا

اثر رامپوری

پہلی سی درد عشق میں لذت نہیں رہی — یعنی جو زندگی کی تھی صورت نہیں رہی
عہد جفا میں تیرے ہوئے لوگ ہوشیار — دنیا فریب خوردۂ الفت نہیں رہی
خوگر جفائے عشق کا جب دل مرا ہوا — ایذا پسند ان کی طبیعت نہیں رہی
مجکو جواب طاقت رفتار دے گئی — جب دو قدم بھی منزلِ الفت نہیں رہی

میری ہستی عجیب ہستی ہے — خود ہے جویائے راز خودی راز
موت ہے زندگی کا دور جدید — میرا انجام ہے مرا آغاز
عکس آئینہ تجلی ہوں — ہائے رے اتصال ناز و نیاز
حدِ منزل وہی ہے اے فرخ — ختم ہو جائے جس جگہ پرواز

جلد ۱۳۔ شمارہ ۳ رجسٹرڈ نمبر ل ۱۰۴۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

پریس کی مصروفیت سے اِس ماہ کا رسالہ دو چار دن کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ منیجر

فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۲۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۳)	مارچ ۱۹۲۸ء	شمارہ (۳)

ملاحظات

ایک ترکی شاعر اپنی محبوبہ کے پاس اپنی تصویر بھیجتا ہے اور اس پر ایک شعر لکھتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ تو مجھے دیکھے بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میری چشم حیراں تجھے دیکھا کرے"۔ غالب کہتا ہے :-

تاچہ آئینۂ حسرت دیدار توام
جلوہ بر خود کن و مارا بہ نگاہے دریاب

بہرحال میں اپنی تصویر پیش کرتے وقت نہ یہ کہہ سکتا ہوں نہ وہ، بلکہ دنیائے شاعری سے بالکل علیحدہ ہو کر مجھے نہایت سادگی کیساتھ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس تصویر کی اشاعت سے اگر ایک طرف بعض احباب کے حکم کی تعمیل مقصود ہے تو دوسری طرف یہ خیال بھی ہے کہ آپ جس شخص کی سیرت کا مطالعہ بہ وساطت اس کے آدا و افکار کے سات سال سے کرتے چلے آرہے ہیں اگر آپ اسکی صورت کو بھی ایک مرتبہ دیکھ لیں تو کیا حرج ہے۔

ممکن ہے بعض حضرات اس ذہنی تصویر کے لحاظ سے جو انھوں نے قائم کی ہو گی مجھے بہت مختلف پائیں، لیکن اب کہ میں خود آپ کے مواجہہ میں حاضر ہوں، سابق تصور و قیاس کے نتائج کو محو کر ڈالئے اور اب پھر غور کرکے فیصلہ کیجئے کہ آپ کسی ایسے شخص سے معاملہ

نہیں کرتے ہیں، جس کے ظاہر و باطن دونوں بالکل یکساں ہیں ------- آپ اپنی جگہ جو بھی چاہے فیصلہ کریں، لیکن اگر میرے سامنے یہ تصویر پیش کی جاتی تو میں صاحب تصویر کی سیرت کے متعلق اول نگاہ میں فیصلہ کر دیتا کہ

"گو زشت رو است امّا طبع جمیل دارد"

اس سے قبل متعدد رسایل میں میری تصویریں شائع ہو چکی ہیں، لیکن وہ سب فن کے لحاظ سے اس قدر ناقص ہیں کہ اُن کے دیکھنے کے بعد میرے متعلق کوئی صحیح حکم نہیں لگایا جا سکتا، کہیں موقف و محل نے میری صحیح فطرت پر پردہ ڈال دیا ہے، اور کسی میں نور و ظل کی عدم مناسبت نے وہ بات پیدا کر دی ہے جو حقیقتاً مجھ میں نہیں ہے۔ بہر حال اس وقت جو تصویر پیش کی جا رہی ہے وہ میری تازہ ترین شبیہ ہے جس میں بطون کے چھپانے کے متعلق کوشش نہیں کی گئی۔ اس لئے میں ذمہ دار نہ ہونگا اگر آپ میرے متعلق یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے کہ "ہے ملی پوشیدہ اور کافر کھلا"

اس ماہ کے مضامین میں پہلا مقالہ جناب سید محمد قادری بی اے کا ہے جو تاریخ ادب کی حیثیت سے قابل مطالعہ ہے۔ فسانۂ نیرنگ عشق کے متعلق میں نے اپنی مفصل رائے اختتام فسانہ پر درج کر دی ہے اسے ملاحظہ کیجئے۔ نقد الشعر بہت مفید و کارآمد مضمون ہے اگر انجام تک پہونچ جائے۔ سید فیاض علی صاحب بی اے نے اپنے خواب میں جس لطف و کیفیت کے ساتھ پردۂ نسواں کے مسئلہ پر بحث کی ہے اس کی داد دینا ظلم ہے گو میں اصل مسئلہ میں فاضل مقالہ نگار کی رائے سے اختلاف رکھتا ہوں۔ "فلسفۂ مذہب" کے عنوان سے جو مضمون شروع کیا گیا ہے وہ ایسے روشن دماغ کا نتیجہ ہے جس نے تمام اسلامی ممالک کی ناقدانہ سیاحت اور عالمانہ مطالعہ کے بعد، مذہب کو موجودہ نظام تمدن کے لحاظ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور جو مذہب کا حقیقی فلسفہ وہ پیش کرنا چاہتے ہیں اس کو "دیوبند اور فرنگی محل" سے انتہائی بُعد حاصل ہے جتنا وہ حقیقت سے قریب ہے۔ یہ مضمون فی الحال مسلسل درج ہوتا رہیگا اور بعد کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا۔

"فسانۂ زلزلہ" جناب افسر میرٹھی کے نشار دماغ کا نتیجہ ہے۔ "نشار دماغ" اس لئے کہ انھوں نے واقعتاً شراب پی کر اس کی کیفیات کو اس میں قلمبند کیا ہے۔ یہ میرا خیال ہے ممکن ہے کہ غلط ہو۔ پلاٹ مختصر ہے مگر عجیب۔ اخیر کی دو سطریں اگر حذف کر دی جائیں تو ایک پر لطف خلا ذہن سامع کے پُر کرنے کے لئے پیدا ہو جاتا۔ مضامین چنگاری اور ڈائری کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ گو معمولی ہیں لیکن ہیں میرے اپنے ہی (A poor thing but mine own)

باب استفسار میں حسن یوسف کے متعلق جو مضامین میرے مضمون کی تردید میں آئے تھے، ان کا جواب دیا گیا ہے۔

حصۂ نظم میں جناب اختر شیرانی کا ترانہ زیادہ لطف کے ساتھ پڑھا جاتا اگر وہ ڈراما بھی سامنے ہوتا جس کا یہ آخری ورق ہے۔ جناب جگر بریلوی نے "ہمالیہ سے دو دو باتیں" کرتے ہوئے جذبات وطن پرستی کا اظہار نہایت کامیاب طور پر کیا ہے۔ تحدکی پہلی شب بہ لحاظ بصیرت و اعتبار خاص پایہ کی نظم ہے۔ چاند کی نظم میں جناب افسر نے جس پاکیزہ و لطیف تخیل سے کام لیا ہے وہ اس قدر

اخیری (Ethereal) کیفیت رکھتی ہے کہ اس سے لطف اُٹھانے کے لئے ہر دماغ مستعد نہیں ہو سکتا۔

"دور جدید کا آغاز" ملی نظم ہے اور اس قسم کی نظمیں لکھنے میں جناب محمود اسرائیلی کو خاص سلیقہ حاصل ہے۔ مصطلحات ایسی نہایت ہی دلچسپ لیکن قریب حقیقت تاویلیں ہیں۔ جناب امین حزیں کی شاعری کی یہ خصوصیت کہ وہ اپنے "پیام" خصوصی سے کبھی انحراف نہیں کرتے۔ میرے نزدیک بہت زیادہ قابل قدر ہے۔

مجھے حد درجہ افسوس ہے کہ جناب اقدس حیدرآبادی جن کا مضمون "فسانۂ اردو" کے عنوان سے گزشتہ ماہ کے نگار میں شائع ہوا تھا، پلیگ میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے۔ جناب اقدس بہت ہونہار نوجوان تھے، لیکن فطرت جس کے لب و دندان، دست و ناخن بقول ٹینی سن ہمیشہ خوں آلود رہتے ہیں اس کا بہترین مشغلہ یہی ہے کہ پھولوں کو مرجھانے کے لئے مہلت دے اور کلیوں کو پھول ہونے سے قبل توڑ کر برباد کر دے۔ میں ان کے اعزہ و احباب کے ساتھ اس ماتم میں شریک ہوں اور حد درجہ تاثر کے ساتھ۔

جناب اعظم کریوی کی تحریر سے معلوم ہوا کہ لاہور کے اخبار "بھیشم" نے اُن کے فسانہ کو جو "پریم کی چوڑیاں" کے عنوان سے فروری ۱۹۲۸ء کے نگار میں شائع ہو چکا ہے، مسخ کر کے ۲۶ فروری کے سنڈے ایڈیشن میں شائع کیا ہے، لیکن نہ اس نے نگار کا حوالہ دیا نہ جناب اعظم کا نام درج کیا۔

نیاز

اس کو ضرور پڑھ لیجئے

گزشتہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا کہ اس ماہ سے تذکرۂ ظرفاء شروع کیا جائے گا، لیکن چونکہ اس کو کتابی صورت میں شائع کرنا تجویز کیا گیا ہے اس لئے رسالہ میں اس کی اشاعت روک دی گئی

اس تذکرہ میں تقریباً ۳۰۰ قدیم و جدید ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے منتخب کلام کے درج ہوں گے اور ضخامت کے لحاظ سے اس کی قیمت تین روپیہ سے کم نہ ہوگی۔ اس تذکرہ کی کتابت شروع ہو گئی ہے اور جلد سے جلد پبلک کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جو حضرات ابھی سے اس کے خریدار ہو جائیں گے ان سے بجائے تین روپیہ کے صرف دو روپیہ لئے جائیں گے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اخیر مارچ تک ان کی رقم وصول ہو جائے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

خلیل علی خاں اشک اور اُنکی تالیف کا تنقیدی مطالعہ

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ارباب قلم میں خلیل علی خاں ہی ایک ایسے مولف ہیں جن کی کتاب تو بے حد مقبول اور رائج ہوئی مگر وہ انکی بدولت مشہور ہونے کے بجائے بالکل پردۂ گمنامی میں رہے۔ قصۂ امیر حمزہ سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اس زمانہ میں بھی جبکہ اردو زبان نے ترقی کے کئی مدارج طے کر لئے ہیں اور اس میں ناولوں قصوں اور مختصر افسانوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے اور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، قصہ امیر حمزہ کے شائق اکثر جگہ نظر آتے ہیں اور اب بھی اس کتاب کی تھوڑی بہت قدر قصہ پسند پبلک کو ہے۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ خلیل علیخاں کی محنت شاقہ نے اُن کو نام و نمود سے اب تک بالکل محروم رکھا اور شاید یہ پہلی مرتبہ ہے کہ انکا نام اُن کے اپنے کارناموں کے ساتھ اردو داں پبلک سے متعارف کرایا جا رہا ہے۔ اُنھوں نے جس کاوش اور محنت سے داستان امیر حمزہ سی ضخیم کتاب جو کئی سو صفحات پر مشتمل ہے، لکھی ہے، اس کی داد دینا تو کجا آج تک کسی نے اس خصوص میں انکا ذکر بھی نہیں کیا۔

ہم نے اردو شاعروں کے تقریباً تمام تذکروں کی ورق گردانی کر ڈالی مگر ان کا حال کسی میں بھی نہیں ملا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اُن کے حالات وغیرہ کے متعلق بہت ہی کم معلومات رکھتے ہیں۔ ان کی مولفہ کتابیں بھی ان کے حالات پر کچھ روشنی نہیں ڈال سکتیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے مولوی عبدالحق صاحب مدیر رسالہ اردو نے "اہل یورپ نے اردو زبان کی کیا خدمت کی" کے عنوان سے جو مضمون فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارناموں پر لکھا ہے اس میں خلیل علی خاں کا ذکر کیا ہے۔ مگر صرف اتنا ہی کہ انھوں نے ۱۸۰۹ء میں کپتان ٹیلر کے حکم سے اکبر نامہ علامہ ابوالفضل کو "واقعات اکبر" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا جو شائع نہیں ہوا[1]۔ پھر مولوی محمد یحییٰ تنہا نے اپنی کتاب میں جو ذکر کیا ہے وہ سراسر مولوی عبدالحق صاحب کے بیان کی نقل ہے اور اس میں ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں ہوا[2]۔ ان دونوں نے خلیل علیخاں کو خلیل اللہ خاں لکھا ہے مگر اُن کی جو کتاب ہمارے پیش نظر ہے اس میں صاف طور پر خلیل ہی خاں مندرج ہے۔ لہذا اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہم آگے کسی موقع پر اشک کا وہ بیان نقل کر دیں گے جس سے انکا اصلی نام معلوم ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اشک نے اپنے آبا و اجداد اور مولد و وطن کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات تو کہاں، مقام پیدائش و تعلیم و تربیت تک کا حال معلوم نہیں۔ بہرحال صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی اہل قلم میں سے ہیں۔ ان کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتداً کالج کے تنخواہ یاب منشی نہیں تھے غالباً ڈاکٹر گل کرائسٹ کی ایما سے اپنے طور پر یہ کتاب مرتب کی ہوگی اور پھر کالج کے متوسل ہو گئے۔

اب تک انکی تالیفات میں صرف دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہی دو کتابیں اُن کی یادگار ہوں اور ان کے علاوہ

[1]: رسالہ اردو ۱۵ صفحہ ۵۰۵ [2]: سیر المصنفین صفحہ ۱۳۶

کسی دوسری تالیف مرتب کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ ان میں سے پہلے قصۂ امیر حمزہ ہے۔ یہ طولانی اور ضخیم قصہ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ایما سے ۱۲۱۵ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس قصہ کے اصل مصنف کے متعلق مختلف خیالات ہیں۔ اور کوئی قطعی و یقینی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ ہمارے سامنے جو نسخہ ہے اس میں اشک نے لکھا ہے کہ ابتداً یہ قصہ سلطان محمود غزنوی (۳۸۹ھ تا ۴۲۱ھ) کے خوش کرنے اور اس فاتح اعظم کو ملک گیری و کشور کشائی کے لئے آمادہ و تیار رکھنے کے لئے کئی ایک راویوں اور داستان گویوں نے چودہ جلدوں میں تصنیف کیا۔ ایک اور موقع پر میں نے ہی اُس کو ملا جلال بلخی سے منسوب کیا ہے۔ برٹش میوزیم میں ایک فارسی نسخہ محفوظ ہے اس میں اس کا مصنف شاہ ناصر الدین محمد کو بتایا گیا ہے۔ اس میوزیم میں دوسرا نسخہ ابوالمعالی کے نام سے منسوب ہے۔ بعض لوگوں نے اُس کو فیضی کے تخلیقی دماغ کی پیداوار بتایا ہے۔ غرض وہ مثل ہے جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہماری دسترس میں اصل فارسی نسخے نہیں ہیں اور شاید ہندوستان میں بہت کم جگہ فارسی نسخے ہونگے پھر یہ بھی شبہ ہے کہ یہ قصہ ابتداً عربی میں لکھا گیا یا فارسی میں تصنیف ہوا۔

خلیل علی خاں اشک اور دیگر ہندوستانی مولفین کے جو نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اصل قصہ فارسی میں اتنا طویل نہیں تھا۔ ان لوگوں نے اس میں ہندوستانی عنصر کو داخل کرکے اپنا لیا ہے۔ آگے اس پر ہم ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔
جیسا کہ ابھی ہم نے اوپر لکھا ہے۔ اشک نے اس کو ۱۲۱۵ھ میں مرتب کیا اور معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے اردو میں کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ اور سب سے پہلے اشک نے ہی اس صاف زبان میں تو آموزان اردو کے لئے تالیف کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصہ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے اور اس زمانہ میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے انھوں نے آپس میں مل کر واسطے سنانے اور دلانے منصوبے لڑائیوں اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے امیر حمزہ صاحبقراں کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں۔ ہر رات کو ایک ایک داستان حضور میں سناتے تھے۔ انعام و اکرام پاتے تھے۔ اب شاہ عالی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق ۱۲۱۵ھ اور ۱۸۰۱ء کے خلیل علی خاں نے جو متخلص بہ اشک ہیں حسب فرمائش مسٹر گل کرسٹ صاحب عالیشان والا مناقب بنا بر تو آموزان زبان ہندی اس قصہ کو مختصر لکھا تھا کہ صاحبانِ مبتدیان کے پڑھنے کو آسان ہوئے۔[1]

اشک کے نسخہ پر بحث کرنے سے قبل ایک نظر مروجہ اور جدید نسخوں پر بھی ڈال لینی ضروری ہے۔ مروجہ نسخوں میں سب سے پہلے منشی نولکشور کا مرتب کرایا ہوا نسخہ ہے۔ اُس کو حافظ سید عبداللہ بلگرامی نے ترتیب دیا تھا اور بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے بڑی محنت سے تعقید عبارت دور کر کے اردوئے معلیٰ کا جامہ پہنایا۔ یہ نسخہ بہت مقبول ہوا۔ چنانچہ چند ہی مہینے میں پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا پھر دوسرا ایڈیشن اور شائع ہوا۔ چوتھی مرتبہ نولکشور پریس کے مشہور مصحح سید تصدق حسین مرحوم نے جو عربی فارسی کے بڑے ماہر تھے اور جن کی یادگار فارسی کی معتد والہ و مشہور لغت "لغات کشوری" اب تک مقبول خاص و عام ہے اس کی نظر ثانی کی۔ تصدق حسین لکھنؤ کے باشندے تھے اور انکی زبان عربی فارسی سے اس قدر متاثر تھی کہ ہر عبارت میں عربیت اور رنگینی ٹپکتی ہے۔ انھوں نے نظر ثانی میں اُس کو تکلفات و تصنعات

[1] قصہ امیر حمزہ مطبوعہ مطبع پرکاش دہلی ص ۲

لفظی سے فسانۂ عجائب کا جواب بنا دیا اور جابجا اپنی طرف سے بے حد اضافہ کیا۔ اور خود بھی بڑے افتخار کے ساتھ دعوی کیا ہے کہ "بطور نثر فسانۂ عجائب ترتیب دیا"۔ اس سلسلہ میں انھوں نے در پردہ خلیل علی خاں کی عبارت کو تعقید سے معمور بتایا ہے اور اس کو صاف زبان میں لکھنے کا سہرا حافظ سید عبداللہ بلگرامی کے سر باندھا ہے۔ مگر یہ سراسر غلط ہے اشک کی عبارت بے حد صاف اور سیدھی ہے۔ آگے ہم دونوں کی تھوڑی سی عبارت جو ایک ہی مضمون کے متعلق ہے نقل کرکے اس غلط بیانی کا پردہ فاش کردیں گے۔

تصدق حسین کا مصححہ نسخہ بھی بہت مقبول ہوا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا طرز بیان جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے بالکل فسانۂ عجائب کی تقلید ہے اور ان کو خود بھی نہ صرف اس کا اعتراف بلکہ اس پر افتخار ہے۔ اس میں سادگی و صفائی نام کو نہیں اس نقص کے بعد بھی اس کا مقبول ہونا قوم کی تکلف پسندی اور بگڑے ہوئے مذاق کی دلیل ہے۔ ہر ملک و قوم کی تاریخ ادبیات میں ایک دور ایسا ضرور ملتا ہے جبکہ ادب سے اصلیت دور ہو جاتی ہے اور بجائے معنوی خوبیوں کے لوگ ظاہری محاسن اور لفظی آرائش کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ صفائی اور سادگی پر تکلفات اور صنائع بدائع کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ایسا زمانہ حقیقی ادب کی پیداوار سے محروم رہتا ہے اور اس کا لٹریچر "ادب عالیہ" نہیں بن سکتا ہے۔ اس کی بہار صرف چند روزہ ہوتی ہے اور کاغذی پھولوں کی طرح وہ بھی ایک محدود عرصہ تک پبلک کے مرغوب طبع رہ کر فنا ہو جاتا ہے۔ انگریزی ادبیات میں پوپ (Pope) اور اس کے مقلدین کی شاعری کا بھی یہی حال ہے۔ فارسی کے متاخر غزل گویوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ خیالات میں اصلیت، سادگی اور جوش مفقود ہے۔ صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں جن میں تاثیر نہیں۔ اسی طرح فارسی کے متاخر نثر نویسوں کے کارنامے بھی اصلیت سے دور ہیں۔ چہار مقالہ نظامی عروضی سفرنامہ حکیم ناصر خسرو کے مقابلہ میں سہ نثر ظہوری اور رسائل طغرائے مشہدی کو ہمیشہ ہمیشہ فروغ حاصل نہیں ہو سکتا ایک میں بقائے دوام کے آثار ہیں اور دوسرے میں چند روزہ لطف اور موقتی پسندیدگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اردو میں فسانۂ عجائب اور تصدق حسین کی مصححہ داستان امیر حمزہ اور اسی قسم کی دوسری کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔ جس طرح اردو شاعر کا مذاق بگڑتے بگڑتے صرف لفاظی اور نقالی رہ گئی نثر نویس بھی اس قعر میں گر پڑے اور چونکہ ایک زمانہ میں رنگینی طبع اور غفلت سے یہی طرز بیان مقبول تھا۔ ان کتابوں کو بھی قبولیت مل گئی مگر اب علوم جدید کی ترقی کے ساتھ قوم کے مذاق میں بھی تبدیلی پیدا ہو چلی ہے اور اس قسم کی کتابوں سے عوام کو وہ دلچسپی باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اسی داستان امیر حمزہ کو لیجئے۔ اب سے گیارہ سال پیشتر اس کا بارھواں ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اب تک دوبارہ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس ایڈیشن کے بیسیوں نسخے قصہ فروشوں کے ہاں پڑے ہوئے ہیں اور کوئی پوچھتا نہیں۔ حالانکہ اس سے پیشتر اس کتاب کی اس قدر مانگ تھی کہ چند ہی سال میں گیارہ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔

اس کے برخلاف خلیل علی کا ترجمہ سیدھی سادی زبان، سلاست اور صفائی کا اچھا نمونہ ہے اس کی عبارتیں گنجلک اور تعقید سے پاک ہیں اور اس کی سادگی و صفائی میں اس کی دلکشی کا راز پنہاں ہے۔ مگر قوم کا مذاق بگڑ جانے سے اس کی مقبولیت زیادہ نہ ہوئی

اور اب تک تصدق حسین والا ترجمہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے رہا۔ اگرچہ اب قدیم قصوں کی طرف سے انکی فوق العادت اور خلاف فطرت باتوں کی وجہ سے لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے مگر اشک کا "قصہ امیر حمزہ" اور اس کے ساتھ بعض دیگر کتابوں میں ایسے جوہر ضرور موجود ہیں جو پھر ایک بار اُن کو مقبولیت دلا سکتے ہیں۔ جب افسانہ کا احیا ہوگا تو بلحاظ اصلیت و سادگی ان قصوں کو بعد کی مرصع اور پر تکلف کتابوں پر ترجیح حاصل ہو جائے گی۔ اور خود اس وقت بھی اس کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آج کل فسانۂ عجائب کو وہ مقبولیت حاصل نہیں جو باغ و بہار کو ہے۔

خلیل علی خاں کا طرز بیان نہایت سلیس اور بے تکلف ہے۔ انھوں نے میر امن اور شیر علی افسوس کی طرح دہلی کے ٹھیک محاورے اور روزمرہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا بلکہ سنجیدہ عبارت آرائی کی ہے۔ زبان میں گھلاوٹ بھی ہے اور سادگی بھی۔ ہندی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال نہایت مناسب تناسب کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ مولوی اکرام علی مولف اخوان الصفا کی طرح زبان میں روانی اور صفائی بے حد ہے۔ کوئی فقرہ ضرورت سے زیادہ طویل نہیں معلوم ہوتا۔ بعض الفاظ جواب متروک ہو گئے ہیں اس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر اُن کے دیگر معاصرین کے مقابلہ میں اشک کے ہاں ایسے متروکات کی مقدار بہت تھوڑی ہے۔ بعض جگہ فارسی ترکیبیں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی رکھے گئے ہیں۔ مگر ایسی طویل کتاب میں انکا استعمال بُرا نہیں۔ اس سے بجائے مصنوعیت پیدا ہونے کے اصلیت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

امیر حمزہ کی داستان اردو ادبیات میں عجیب اہمیت رکھتی ہے۔ پہلے ہی یہ قصہ چار جلدوں میں لکھا گیا تھا۔ منشی محمد حسین جاہ اور منشی احمد حسین قمر نے اس کے مضمون کو طوالت دیکر اور حاشیے چڑھا کر طلسم ہوش ربا کی جلدیں تیار کیں۔ پھر دوسروں نے اس سلسلہ کو اور آگے بڑھایا اور اپنے شبدیز قلم کی جولانیوں سے طلسم ہفت پیکر، طلسم نوخیز جمشیدی، ایرج نامہ، اختر نامہ وغیرہ خدا جانے کتنے ناموں سے اس سلسلہ کی جلدیں تیار کیں۔ غرض انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (قاموس العلوم برطانیہ) کی طرح اس سلسلہ کا ایک اچھا خاصہ کتب خانہ ہو گیا۔ اور داستان پسند پبلک کی ضیافت طبع کے لئے اتنا وافر ذخیرہ جمع ہو گیا کہ عمر کا بہت بڑا حصہ اس کے مطالعہ کی نذر ہو جائے۔

قصہ امیر حمزہ کے رجال داستان میں عرب و عجم کی مشاہیر ہستیوں کی عجیب آمیزش ہے۔ ایک طرف امیر حمزہ، عمرو عیار، مقبل کی سیرتیں عربی ہیں تو دوسری طرف بزرجمہر، بختک، قباد اور نوشیرواں وغیرہ خالص ایرانی ہیں۔ پھر تاریخی اور افسانوی شخصیتوں کو عجیب انداز سے مدغم کیا گیا ہے۔ بعض رسمیں اور طریقے خالص ایرانی ہیں جن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ قصہ ابتداً فارس ہی میں تصنیف ہوا تھا جیسے اڑتے ہوئے پرندوں میں سے کسی خاص پرندے کو تاک کر تیر مارنا اور اگر تیر اس کے لگے تو اس سے اپنے مقصد میں کامیابی و موافق مرام نتیجہ نکلنے کی فال لینا جس کو فال گوش کہتے ہیں، خالص ایرانی دستور ہے۔ مگر اس کے علاوہ ساری داستان میں بہت سی باتیں خالص ہندوستانی بھی ہیں جن سے صاف طور پر ثابت ہے کہ اردو میں منتقل کرتے وقت مترجم کے مطالعے نے یہ اضافے کئے ہیں۔ اور اصل قصہ

کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ مثلاً مدرسہ میں عمرو عیار کی شرارتوں کی جو تفصیل دی ہے وہ سب ایسی شرارتیں ہیں جو نہ صرف ہندوستانی طلبہ میں پائی جاتی ہیں بلکہ خاص اسی ملک کی چیزیں ہیں مثلاً عمرو عیار ایک مرتبہ نوشدارو حاصل کرنے کے لئے مداین جاتا ہے اور وہاں اپنے آپ کو گاؤں کا باشندہ بتاتا اور نوشیرواں سے دیہاتی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ اس موقع پر قصہ نویس نے جو زبان استعمال کی ہے وہ صوبہ اودھ کے ایک گاؤں کی ہے۔ عمرو عیار کا ایک دفعہ سمندر میں کشتی سے کود پڑنا اور پھر ساحل پر اترتے ہی تسمہ پا اشخاص کا نظر آنا یہ ٹکڑے الف لیلہ سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح سراندیب کے بادشاہ لندھور سے لڑنے جانے سے قبل امیر حمزہ کا محل نوشیرواں میں بلایا جانا اور اُن کی اس شرط پر کہ فتح و کامیابی کے بعد مہر نگار دختر نوشیرواں سے انکا عقد کر دیا جائے، اُن کو شربت پلانا اور پان کی گلوریاں دینا خالص ہندوستان کی رسمیں ہیں جن کو ایران سے کچھ علاقہ نہیں۔ قصہ نویس نے النقش وزیر کے اس تخت کی ساخت کا تخیل جو اُس نے بادشاہ قباد کے لئے بنایا تھا، شاہجہاں کے تخت طاوس سے لیا ہے۔ غرض پوری داستان میں ایسی بیسیوں باتیں ہیں جن سے بخوبی واضح ہے کہ یہ مترجم کے حواشی ہیں اور اس نے اس واقعہ کو اپنا لیا ہے۔

یوں تو اس قصہ کے اکثر و بیشتر رجال داستان میں فوق العادت اور بعض مرتبہ خلاف عقل باتیں بھی دکھائی گئی ہیں مگر ساری داستان میں سب سے زیادہ اہم کردار عمرو عیار کا ہے۔ عمرو عیار اس قصہ کی جان و مرکز ہے۔ اس کے کردار میں عجیب عجیب گل کاریاں کی گئی ہیں اور اُس کو ایسا چالباز و زر طلب اور ہم باز دکھایا گیا ہے کہ اس کے آگے یورپ کے ازمنۂ وسطے کے جنگجو نایٹ اور اڈونچرر کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ مگر اس کے کردار میں شروع ہی سے بری خصلتیں اور طمع و چالبازی کے عناصر شامل کر کے اسکو بھی سوہو بنایا ہے۔ غرض اس "سردار عیاران" سے ایسے ایسے کارنامے منسوب کئے گئے ہیں کہ عقل انسان سے باہر ہیں۔

ذیل میں ہم ایک ہی مضمون کے متعلق اشک اور تصدق حسین دونوں کے نسخوں سے ایک ایک بیان نقل کرتے ہیں۔ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو اصل اور نقل، اصلی پھول اور کاغذی پھول میں ہوتا ہے۔ ایک سرتاپا صفائی، سادگی اور اصلیت کا نمونہ ہے تو دوسرا بالکل مرصع مسجع، پُرتکلف اور مصنوعیت کا منظر ہے۔

حکایت: یہاں سے دو کلمہ داستان ملک النقش کے ملاحظہ فرمائیے۔ جبکہ وہ باغ تیار ہوا ایک دن بادشاہ کے حضور میں عرض کی۔ غلام نے ایک باغ حضور کی بدولت بنایا ہے اور بندہ امیدوار ہے کہ ظل سبحانی وہاں رونق افروز ہو کر ایک چمچہ آش نوش جان فرمائیں کہ باعث اعزاز خانہ زاد ہے۔ مصرع: شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را۔ فرمایا کیا مضائقہ ہے تم جا کر تیاری کرو ہم بھی آتے ہیں۔ النقش حضور سے رخصت ہو کر واسطے تیاری کے آگے گیا۔ بعد اس کے جانے کے بادشاہ بھی زمرد کے تخت پر سوار ہو کر اور تمام وزرا و امرا ہمراہ لیکر طرف باغ بیداد کے رونق افروز ہوئے۔ جبکہ سواری قریب باغ کے آئی ملک النقش نے ایک تخت ہوا دار واسطے بادشاہ کے ایسا تیار کیا تھا کہ اس میں گل اور بوٹے لعل اور الماس کے تھے۔ اور چاروں کونوں پر اس کے چار طاؤس زمرد کے بنائے تھے کہ جنھوں کے پیٹ میں نکلنے

خوشبو کے رہتے تھے اور واسطے تخت کی شان کے طاؤس کے پہلو میں دونوں طرف ایک ایک نرگس دان رکھا تھا کہ جن کے کونے مرصع کے مثل زمرد سبز تھے۔ اور الماس کے پھول جھنوں کی زردی پکھراج کی سی تھی۔ اس کو معہ ہودجوں اور چالیس ہاتھیوں جن پر جھولیں زربفت کی پڑی ہوئیں اور عماریاں کا رزری وجواہر نگار اُنھوں کی پیٹھ پر کسی ہوئیں اور دوسو گھوڑے عربی، عراقی، ترکی، تازی معہ جواہر مرصع، زرکئی اونٹ بغدادکے معہ کوہانی کہ جن کے کجاؤں پر کارچوبی زربفت کی چادریں کسی ہوئیں اور کتنے خیمے اور کتنی کشتیاں سلاح کی اور جواہرات کی اور پارچہ جات سوتی اور ریشمی اور پشمینے اپنے ساتھ لے اور باہر کے جلوخانہ تک استقبال کرکے بادشاہ کو یہ سب نذر گزرانا اور تخت کا پایہ پکڑ کر بوسہ دیا اور ہمراہ ہوا۔ جبکہ بادشاہ اندر باغ کے گئے دیکھا تو واقعی عجب گلزار ہے کہ شاید اورکہیں ایسا نہ ہوگا۔ اس کی وہ چار دیواری سنگ مرمر کی جس میں تمام فیروزے کی تحریر اور طرح بطرح کی بیل ہے اور نیچے ان دیواروں کے ہر طرف سنہری چوبوں کی دار پشت بنی ہوئی کہ اس میں پتے زمرد کے اور خوشے موتیوں کے لگے ہوئے ہیں۔ اور وہ صاف روشنی، سبزہ کا عالم، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، پھولوں کی خوشبو ہر دم جس سے دماغ کو قوت ہوتی تھی۔ کیاریاں اقسام اقسام کی گلزار اور ہر قسم کے پھول جن میں پھولے ہوئے مثل گل لالہ، نافرمانی، بابونہ، گیندا، جوہی، سوسن، چنبیلی، موتیا، موگرا، رائے بیل، گلاب، سیوتی۔ گلنار، گل مہدی، گل شبو، نرگس، داؤدی، ہر ایک طرح کی بہار تھی۔ اور دونوں طرف روش کے دو پیڑ چمپا ور مولسری کے بہت خوبصورت پھولے جن کی تمام ٹہنیوں پر اور شاخوں پر غزارے اور بادلے چڑھے ہوئے۔ وہ مہدی اور رائے بیل کی ٹہنیوں پر نشان، وہ چوپڑ کی نہر مثل لوح الماس لبلب، پانی کے ہر چہار طرف گئی کہ جن کے فواروں پر ہزارہ کی جا طوطے، بلبل، فاختہ اور عندلیب جواہرات کے بنے ہوئے کہ جن کے پروبال سے ہزارہ چھٹتا ہوا ایک لطف دیتا تھا۔ اور سفید عالم عمارت کا کہ جس میں سنہری رو پہلی الماس تراش استادوں پر تمام تامی کے سائبان کھنچے ہوئے کہ جن میں سراسر موتیوں کی جھالر تھی۔ اور سونے کی تھیلیوں چلمنیں مینا سے رنگی ہوئیں۔ پوئی داروں پر کلابتوں کی ڈوریوں کی زربفت کے پردوں کے ساتھ بندھی ہوئی غرض بادشاہ اس باغ کو دیکھکر اپنے باغ کو بھول گیا۔ (قصہ میرزا از اشک صفحہ ۷) +

نخلبندان بوستانِ اخبار چمن پیرایانِ اظہار تختۂ کاغذ میں اس طرح اشجار الفاظ موقع موقع پر نصب فرماتے ہیں صحن شفاف قرطاس کو گل وریاحین مضامین رنگا رنگ سے یوں رشک تختۂ ارژنگ بناتے ہیں کہ جب باغ بیداد تیار ہوا نمونہ بہشت نمودار ہوا۔ القصہ خوشی سے پھول گیا فکر دارین بھول گیا۔ فرط مسرت سے پھولا نہ سماتا تھا۔ جامۂ تن سے باہر ہوا جاتا تھا۔ بادشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ غلام نے حضور کی بدولت و اقبال ایک باغ تیار کیا ہے۔ انواع انواع کے درخت ثمردار اور گل بوٹے کے لگائے ہیں۔ دور دور سے بصرف زر کثیر نادر درخت منگوائے ہیں۔ باغبان نادر کار نخلبندی میں ہوشیار بہم پہنچائے ہیں۔ ہزار ہا روپے صرف کر کے سیکڑوں استادان فن کے بلوائے ہیں۔ ہر ہر شخص یکتائے زمانہ ہے۔ اپنے اپنے ہنر میں یگانہ ہے۔ بیل بوٹے ایسے لگائے ہیں کہ مانی و بہزاد اپنی صنعت سے شرمائے ہیں مگر جان نثار کی نظروں میں سماتا نہیں۔ خزاں کا رنگ باغ میں معلوم ہوتا ہے۔ جب تک ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی کا قدم مبارک اس میں جاتا نہیں۔

ناسخ:— سرسبز ہو جو سبزہ تیرا پائمال ہو ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

امیدوار ہوں کہ حضرتِ خاقانِ جہاں نوشیرواں زماں بطریقِ گل گشت کبھی اس طرف توجہ فرمائیں۔ خانہ زاد موروثی کا رتبہ فلک اعظم تک پہونچائیں۔ حضرت کے قدموں کی برکت سے باغ میں بہار آجائے ہر گل و غنچہ اپنا اپنا رنگ دکھائے۔ از راہ غلام نوازی اگر دو ایک میوے نوشِ جاں فرمائیں غلام کو ثمر مراد حاصل ہو۔ اشجارِ امید بار لائیں۔ بادشاہ نے اس کے التماس کو قبول فرمایا۔ معروضہ اس کا درجۂ اجابت میں لایا النقش نے تسلیم بجالاکر نذر گزرانی۔ رخصت ہوا۔ باغ میں آکر سامان دعوت کرنے لگا۔ انًا فانًا سب اسباب ضیافت کا مہیا ہوگیا۔ اقسام اقسام کے کھانے تیار ہونے لگے طرح طرح کے میوے کشتیوں میں چنے گئے۔ ارباب نشاط کی حاضری کا حکم ہوا۔ آتش بازوں نے آتش بازی چھوڑنے کا موقع ڈھونڈ رکھا۔ روشنی کا سامان ہونے لگا۔ ہزارہا گلاس چڑھ گیا۔ جھاڑ فانوس دیوارگیریاں صاف ہونے لگیں مومی کافوری شمعیں چڑھائی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ جمجاہ فلک رفعت خورشید طلعت داد گر انصاف پرور معہ ارکان دولت داعیان سلطنت بہار افزائے باغ بیدا ہوا۔ النقش کا شجر مقصود بارلایا۔ (داستان امیر حمزہ از تصدق حسین صفحہ ۱۵)

اشک کے نسخہ سے اوپر ہم نے جو حکایت نقل کی ہے وہ انکی رنگیں بیانی کا بہترین نمونہ ہے اور ساری کتاب میں اس سے زیادہ مرصع اور رنگین کوئی بیان نہ ملیگا۔ مگر تصدق حسین کے نسخہ سے جو عبارت نقل کی گئی ہے ہم نے قصداً اس پر اکتفا کیا اور یہ بھی طویل ہے۔ اس کے بعد تخت اور باغ کا جو نقشہ انھوں نے کھینچا ہے وہ اتنا طویل ہے کہ ہم کو بخوف طوالت ترک کر دینا پڑا۔ اس کی رنگینی و آرائش کے لئے یہ کہنا کافی ہے بمصرع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اشک کا دوسرا اور قابل قدر کارنامہ "واقعات اکبر" ہے۔ انھوں نے ۱۸۰۹ء میں کپتان ولیم ٹیلر کے ایما سے علامۂ ابوالفضل کی مشہور کتاب اکبرنامہ کا اردو میں اس نام سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ بدقسمتی سے شائع نہیں ہوا۔ یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی اس کا قلمی نسخہ یا مسودہ موجود نہیں ہے۔ اکبرنامہ جیسی اہم اور مفید کتاب ہے اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہم نہیں کہہ سکتے کہ اشک کا ترجمہ دست بردِ زمانہ سے محفوظ ہے یا نہیں۔ اگر یہ کتاب دریافت و شائع ہوجائے تو ہمارے تاریخ کے سرمایہ میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوگا۔

خلیل علی خاں کے تخلص اشک سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضرور شاعر ہوں گے اور اس زمانہ میں شاعری کا گھر گھر چرچا بھی ان کے شاعر یا ناظم ہونے کا خیال پیدا کرتا ہے۔ اول تو ان کا ذکر ہی کسی تذکرہ میں نہیں۔ پھر انتخابی اشعار ملیں تو کہاں سے۔ اُن کا کوئی دیوان نہیں جس سے دو چار شعر مل سکیں قصۂ امیر حمزہ میں کہیں کہیں ایک آدھ انکا طبعزاد شعر مل جاتا ہے۔ مگر وہ انکی شاعری کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ہوسکتا۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ بہت ہی پست درجہ کے شاعر تھے ہم اُن کو زیادہ سے زیادہ ناظم یا قافیہ پیما کہہ سکتے ہیں۔ انکا یہ حال معلوم ہوتا ہے کہ تفنن طبع کے طور پر کبھی کچھ کہہ لیا اور کسی موقع پر قافیہ پیمائی کر دی۔

سید محمد قادری (حیدرآبادی)

نبردِ عشق

(فسانہ)

(۱)

مس بہار کی یونیورسٹی میں آج پہلی تقریر تھی۔ سامعین پر ایک دھندلی کیفیت طاری تھی ہر شخص ہمہ گوش بنا مبہوت بیٹھا تھا۔ الفاظ کی آمد۔ بیان کی سلاست آواز کا ترنم اور مقررہ کی صورت دل موہے لیتی تھی۔ ایک سیلاب تھا جو دلوں میں طوفان اٹھاتا عقل کے بند توڑتا بہا چلا جا رہا تھا اور سارے مجمع کی فہم و فراست تنکے کی طرح بے بس اس دھارے کے ساتھ تھی۔

پروفیسر رعنا بھی ایک گوشے میں بیٹھے سب کچھ سن رہے تھے۔ جب مس بہار ہاتھ جھکا کر کوئی خاص فقرہ ذرا زور دیکر کہہ دیتیں تو یہ گھبرا کر اپنے ہاتھ مونچھوں تک لیجاتے اور ان کے بال انگلیوں سے کھینچنے لگتے اور جب وہ مسکرا کر کوئی طنزیہ جملہ دوسری جماعت کے خلاف کہتیں تو اور لوگ تو ہنسی سے بیتاب ہو جاتے لیکن یہ جلدی جلدی اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگتے۔ اور اگر کبھی مقررہ کی نظر انکی طرف مڑ جاتی تو انھیں ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی کرن انکی آنکھوں کے اندر گھسی جاتی ہے اور یہ سراسیمہ ہوکر عینک اتار کر اسے رومال سے صاف کرنے لگتے۔ اور اسپر غور کرنے لگتے کہ تقریر میں شراب کی سی تیزی اور مدہوشی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ کہ سارے جسم میں ایک حدت دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔

ممکن ہے آپکو انکی یہ حرکتیں انوکھی اور عجیب معلوم ہوتی ہوں لیکن اتنا یاد رکھئے کہ پروفیسر رعنا جوان و نا کتخدا ہی نہ تھے بلکہ فلسفی بھی تھے۔ انکے ہاں ہر چیز کے متعلق "کیوں؟" اور "کیسے؟" کی بڑی بھرمار تھی۔ وہ ہر امر کی کنہ دریافت کرنے پر تلے رہتے۔ حیات انسانی کا معمہ اُن کے لئے بہت ہی دلچسپ تھا۔ تخیل و تصور کا ہر جز اُن کے پیش نظر تھا اور ممکن و واجب کے اسرار سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اگر وہ کسی شے لاعلم تھے تو وہ جذبات و حسیات کی دنیا تھی۔ اس کا بھی انھیں کتابی علم تو ضرور تھا لیکن ذاتی تجربہ نہ تھا۔ اور اس لئے مس بندہ روز سے جب سے کہ مس بہار اُن کے درجے میں داخل ہوئیں تو وہ بار بار یہی سوچتے کہ اس نو بہار ناز کے دیکھنے سے ان کے دل میں گدگدی سی کیوں محسوس ہوتی ہے۔ اور آخر اس نئی حس کا باعث کیا ہے؟ درجہ میں اور بھی لڑکیاں ہیں لیکن انکی وجہ سے یہ کیفیتیں کیوں نہیں پیدا ہوتی ہیں؟ اسی کو نظر نے کیوں انتخاب کیا اور اسی کی طرف دل کیوں کھنچتا ہے؟

آج بھی جبکہ تقریر کی روانی۔ فقروں کی برجستگی اور دلائل کی کثرت و مضبوطی۔ مخالفین کو موافق بنائی جا رہی تھی تو وہ بھی غور کر رہے تھے کہ ان پر اس آواز کا خاص اثر کیوں ہے۔ اور وہ دوسرے پروفیسروں کی طرح، شاباش، کہنے اور تعریف کرنے سے کیوں عاری ہیں؟ وہ اسی اُدھیڑ بن میں گرفتار تھے کہ دفعتاً آوازوں کی اور تالیوں سے سقف فلک شگاف شور نے اُنھیں چونکایا۔ مقررہ کو بیٹھتے دیکھ

اُن سے اپنی جگہ نہ بیٹھا گیا اور یہ اپنے کمرے میں چلے آئے اور پھر پچھلی غور و فکر میں ڈوب گئے۔

(۲)

پروفیسر رعنا پانی برسے۔ اولے پڑے یا پتھر گرے۔ لیکن ٹھیک پانچ بجے شام کی تفریح کے لئے ضرور باہر جاتے۔ ہمسایہ انکی پابندی وقت سے اتنا واقف تھے کہ اکثر ان کے برآمد ہوتے ہی تیز و سست رفتار گھڑیوں کی سوئیاں ٹھیک پانچ پر کر لیتے۔ اور اس لئے پروفیسر صاحب کو معلوم ہو یا نہ ہو۔ لیکن محلہ بھر اُنھیں گھنٹا گھر کہکر پکارتا تھا۔

جس طرح پابندی وقت اُن کی وضع میں داخل تھی۔ اسی طرح یہ بھی اُن کی عادت تھی کہ ہر فصل میں چھڑی ہی پر بھروسا کرتے۔ کبھی چھتری لیکر یا واٹر پروف پہنکر باہر نہ نکلتے اکثر بھیگے اور بُری طرح بیمار بھی ہوئے بخار بھی آیا۔ نزلہ و زکام بھی ہوا۔ لیکن انھوں نے پروا نہ کی ضعیفہ ماں اور بوڑھی دایہ۔ دونوں سمجھاتے سمجھاتے عاجز آگئیں لیکن نہ ٹھیک پانچ بجے کی سیر بند ہوئی اور نہ بلا چھتری کے نکلنا۔

مگر یہ اس لئے نہیں کہ طبیعت میں ضد تھی بلکہ محض اس وجہ سے کہ دنیا کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی طرف سے بے پروا تھے۔ اور پھر فلسفی۔ وہ کہتے کہ جتنی دیر میں ان باتوں پر غور کروں گا اتنی دیر میں فلسفہ کا کوئی بڑا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ خواہ مخواہ عادت کے خلاف کام کر کے اپنے دماغ کو پریشان کیوں کروں؟ پانی کا برسنا ضروری۔ دنیا کا میل دُھلتا ہے۔ درخت و سبزہ نکھر جاتا ہے۔ پھولوں میں تازگی آجاتی ہے اور چڑیاں چہک اُٹھتی ہیں۔ پھر مجھے کیوں تکلیف ہوگی جسم کو شاید زحمت ہو۔ روح کو انبساط ہوتا ہے اور دماغ کو فرحت سو اُن کے آگے جسم کا خیال بے سود۔ نزلہ اور بخار کا ڈر سب بیجا!

اس لئے لکچر کے دوسرے ہی دن ہمارا بے پرواہ وضع کا پابند پروفیسر صرف چھڑی ہاتھ میں لئے گھر سے نکلکر سیر کے لئے چل کھڑا ہوا۔ نہ سدرہ بدہ کی لی اور نہ منگل کی لی نکل شہر سے راہ جنگل کی لی!

ادھر آسمان پر ابر کے دیوتاؤں میں سے ایک کی شادی تھی۔ عالم کی تمام گھٹائیں۔ ڈھول تاشہ۔ دہل دمامہ بجاتی چلی آرہی تھیں ہموار راستوں پر یوں ہی تاریکی میں سرگرم خرام لیکن بھیڑ۔ کھانچے سے بھری سڑکوں پر بجلی کی روشنی کام آتی ہے۔ سب کو جلدی اس کی کہ کسی طرح دلہن کے گھر پہونچکر دل کا بخار نکالیں اور ذرا سی چھیڑ چھاڑ پر گھر والیوں پر برس پڑیں۔ کہ اتنے میں دوسری طرف بادلوں نے بڑھکر خیر مقدم کیا۔ اور اس خوشی میں جو آپس میں گرم فقرے اور چست جملے چلے تو دونوں طرف قہقہہ پڑا۔ بارات کی آرائش لٹنے لگی اور آتشبازیوں کو آگ دکھا دی گئی اور انکے پھول مینہ کی صورت میں زمین کی طرف آنے لگے۔

پروفیسر رعنا نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کی جانب۔ وہاں چھتری کی جگہ چھڑی ہی تھی۔ اسے ذرا مضبوط پکڑا کوٹ کا کالر بند کیا اور گھر کی طرف لوٹے۔ بوندیں آہستہ آہستہ تیز ہوئیں یہاں تک کہ پانی کی چادر گرنے لگی اور یہ سر سے پانوں تک بھیگ کر شرابور ہو گئے۔ رفتہ رفتہ راستہ پر بھی پانی کی زیادتی ہونے لگی۔ جوتوں کے تلے بھیگے۔ پھر سارا جوتہ ڈوبا پھر گھٹنوں گھٹنوں تک پروفیسر صاحب پانی ہی میں تھے۔ اب تو فلسفہ بھی ڈھلگیا اور منطق بھی۔ اور جسم ہی نہیں بھیگا بلکہ شاید روح بھی۔ اس لئے کہ پروفیسر صاحب کو مسرت کی جگہ تکلیف محسوس ہوئی اور انبساط کے عوض سردی۔

پھر تاریکی ایسی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ کئی مرتبہ گرے۔ عینک کہیں کیچڑ میں گر کر پھنس رہی اور چھڑی ہاتھ سے چھوٹکر کسی جانب نکلی۔

خدا خدا کر کے دور سے کچھ روشنی دکھائی دی۔ اسیطرف کا رُخ کیا۔ تھوڑی دور چلنے پر بنگلہ ملا۔ غیرت کیچڑ سے زیادہ مضبوط قدم پکڑتی رہی۔ لیکن ضرورت نے سب کو دھکا دے کنارے کیا اندر داخل ہوئے برامدہ میں پناہ لی۔ صاحب مکان نے آدمی کی چاپ پائی۔ دروازہ کھول اُنھیں بغور دیکھا۔ مرد شریف سمجھکر بڑے تپاک سے پیش آئے۔ کپڑے بدلوائے اور کمبل اڑہاکر اندر کمرے میں بٹھایا۔ انگیٹھی میں آگ روشن کرا کے پاس رکھوائی اور چائے کیلئے آواز دی۔ ایک ماما چا کا سامان لئے ہوئے آئی اور اُس کے پیچھے پیچھے مس بہار!

-:(۳):-

پروفیسر رعنا فلسفی تو ضرور تھے لیکن جوان اور ناکتخدا بھی تھے فلسفہ تو ابھی ابھی دہلکر خس وخاشاک کی طرح سڑک کے میلے پانی میں بہا جارہا تھا۔ جوانی اور اس کی اُمنگیں ناکتخدائی اور اُس کے دور کرنے کی خواہش۔ جو ہمیشہ اس بارِ ثقیل سے دبی رہتیں۔ اُسوقت اُبھر کر سطح پر آگئیں اور پھر کمرے کی کرسی۔ کوچ کی لچک۔ لیمپ کا سُرخ فانوس فرش کا موٹا قالین اور سب سے زیادہ آگ کی قربت ٹھٹھری ہوئی جسمی حیوانیت کو ہمت دلاکر آگے بڑھا رہی تھی۔ کہ اس کے ساتھ مس بہار کی آمد نے جس میں چنگاری کا کام کیا اور یہ ایک مرتبہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور ذہن نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ مس کی خوش پوشی کا اپنی بے سر وسامانی سے مقابلہ تھا اور اپنے چہرے پر بھیگے ہوئے پریشان بالوں کا اس کے رُخ گلنار پر کالی زلفوں کے پیچ سے تقابل تھا۔ اور یہ جلدی جلدی ایک ہاتھ سے کمبل سمیٹنے لگے اور دوسرے ہاتھ سے اُلجھے ہوئے بالوں کو کو برابر کرنے لگے۔

وہ بھی اُن کو کمبل میں اس طرح لپٹا لپٹایا دیکھکر پہلے تو کچھ جھجھکی۔ پھر پہچانکر منہ پھیر کر مسکرائی صاحب خانہ متبسم آگے بڑھ کر بولے "پروفیسر صاحب یہ اس گھر کی بہار۔ میری سالی ہیں"۔ وہ جھککر بولی "آپ کے تعارف کرانے کا شکریہ۔ لیکن پروفیسر صاحب مجھکو جانتے ہیں میں اُن کی شاگرد ہوں۔ ہاں شاید آپ کو نہ جانتے ہوں گے۔ یہ حضور شمیم۔ ڈاکٹر شمیم ہیں اور جس گھر میں جاتے ہیں اسے نیتھلین کی سی خوشبو سے معطر کر دیتے ہیں"۔ پھر بہنوئی کی طرف مڑکر بولی اور آپ ڈاکٹر رعنا ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ہماری یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں"

ڈاکٹر صاحب ہنسکر بولے "اخاہ تب تو بڑا ہی لُطف ہے۔ جہاں بہار ہو اور رعنا بھی اور اسی کیساتھ شمیم بھی تو سوکھے سے سوکھے منطق کا غنچہ دل کھل جانا چاہئے"۔

پروفیسر رعنا نے کہا "لیکن اسوقت تو منطقی بھیگا ہے!

ڈاکٹر صاحب ہنسکر بولے "جب خشکی ہی باقی نہ رہی تو مسرت و دلبستگی میں پھر کاہیکی کسر رہی؟"

سب ہنس ہی رہے تھے کہ دفعتاً پروفیسر صاحب کو کچھ یاد آگیا اور وہ متانت سے بولے "لیکن ان باتوں میں یہ تو بھول ہی گیا کہ مجھے گھر جانا ہے۔ وہاں سب منتظر ہوں گے"۔

ڈاکٹر صاحب نے آگے بڑھکر خاموشی سے دروازہ کھول دیا اس غضب کی تاریکی تھی کہ اللہ اکبر۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ابر کے

دیوتاؤں کے ہاں شادی میں حبشیوں کا ناچ ہو رہا ہو سوائے شور ہنگامے کے کچھ سنائی نہ دیتا تھا نہ تال ٹھیک نہ سر۔ بس جھا جھم کی آواز تو ذرا قرینے کی تھی ورنہ اور صدائیں ان کے خط و خال کی طرح بے قرینہ۔ بے ہنگام۔ بے ربط!

کواڑ کھلتے ہی ہوا کے ایک جھونکے کیساتھ اُن کے سر و در کے پھول کمرے کے فرش پر بکھر گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے "مزید داخلہ کی گنجائش نہیں" کہکر دروازے بند کر لئے اور پروفیسر سے بولے دیکھی حضرت۔ اُن کی سینہ زوری جب یہ کمرے میں اس طرح گھسے آتے ہیں تو پھر آپ کو گھر تک کیسے جانے دیں گے؟"

پروفیسر رعنا کی ہمت مردانہ کو اُس سے ٹھیس لگی۔ وہ بولے "لیکن مجھے جانا ضروری ہے۔ میں گھر سے رات بھر باہر نہیں رہ سکتا اور پھر ایسے موسم میں!"

ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے بولے "کیوں؟ کیا بیوی تنہائی میں گھبرائیں گی یا بجلی سے ڈرتی ہیں؟

پروفیسر صاحب نے کہا "جی بیوی تو بحمدہ اب تک ہی نہیں" ڈاکٹر صاحب نے کہا "اچھا تو آپکے ہاں ابھی بہار نہیں آئی!" اور پھر مس بہار کی شرمندہ صورت اور خشمگیں آنکھیں دیکھکر جلدی سے بولے "تب پھر کون پریشان ہونے والا ہے؟"

پروفیسر صاحب نے کہا "جی ضعیفہ ماں ہیں وہ پریشان ہونگی" اور ڈاکٹر صاحب کے "پھر؟" کہنے پر بولے۔

"مجھے جانا چاہیے!" ڈاکٹر صاحب نے تھوڑی دیر اور روکنے کا بہانہ نکالا اور بولے "اچھا تو گھر کی مالکہ سے اجازت لے لیجئے!" پروفیسر صاحب مس بہار کی طرف بڑھے تو وہ بولے "جی یہ تو بد قسمتی سے میری سالی ہی ہیں۔ گھر کی مالکہ تو میری بیوی اُن کی بہن نسترن ہیں۔ ان سے پوچھکر کیا کیجئے گا۔ یہ تو اس غلطی سے اور خفا ہو جائیں گی!"

پروفیسر صاحب نے جلدی سے یہ کہکر جھینپ مٹائی "جی تو بیگم شمیم کہاں ہیں؟ اُن کی تو زیارت ہی نہیں ہوئی!" ڈاکٹر بولے "اچھا تو تشریف رکھئے۔ میں اُنھیں بلائے لاتا ہوں" اور یہ کہتے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

-:(۴):-

دلوں میں جب محبت کا چور ہو اور تخلیہ و تنہائی ہو تو زبان بند ہو جاتی ہے اور گفتگو کا کوئی پہلو نہیں ملتا۔ سارے موضوع تمام مباحث دماغ سے چہرے کی سرخی کی طرح کافور ہو جاتے ہیں۔ بس کچھ دیر دزدیدہ نگاہیں ہوتی ہیں۔ کچھ سرد آہیں اور پیشانی پر بکھرے ہوئے عرق کے قطرے سے سرنگوں موتی!

پروفیسر رعنا کا دل اپنے کو مس بہار کے قریب تنہا پاکر زور زور اچھلنے لگا۔ انھوں نے گردن اس طرح جھکائی جیسے اس کی حرکتوں کو بغور دیکھے جاتے ہیں اور یہ پوچھتے جاتے ہیں کہ "کیوں؟ کیوں؟ یہ کیا ہے؟ یہ کون سا نیا انداز ہے۔ اس میں اضطراب کا ہیکا اور بیچینی کیسی ہے؟"

یہ اسیطرح اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں تھے کہ بڑے زور کی کڑک ہوئی اور سارا کمرہ یکبارگی چمک اٹھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے بجلی کہیں بنگلہ ہی میں گری اور مس بہار چیخکر اُن کے کوچ پر آکر گر پڑیں۔ نصف لمحہ یا اس سے بھی کچھ کم اِن کا جسم اس پھول سے مس ہو گیا۔ زلفوں کی شمیم نتھنوں کے ذریعہ دماغ میں جا بسی

پروانۂ فلسفہ کے پروبال شمعِ عشق نے جلادئے۔ اور اُن کے
دل میں درد انبساط۔ خوف اور خواہش کا جام لبریز چھلکنے
لگا۔ کانپکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور معمولی انسانی ہمدردی بھی
بھول گئے گھبرا کر بولے "مجھے گھر جانا چاہئے"۔
وہ نرمی سے بولی "آپ کی خوشی۔ لیکن باجی سے مل لیجئے"۔
اُنھوں نے کہا "انھیں کا انتظار کر رہا ہوں"
اُس نے پوچھا "تو میں بلالاؤں"۔ انھوں نے کہا "ہاں"
لیکن جب وہ اُٹھنے لگی تو جلدی سے بولے "نہیں بیٹھی رہئے!"
اُس نے ان کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں نیچی کر لیں۔ اس نظر نے
انہیں ہمت دلائی۔ دل کڑا کر کے اُنھوں نے پوچھا "آپ بجلی سے
بہت ڈرتی ہیں؟" وہ خجالت سے سر جھکا کر بولی "جی ہاں"۔
انھوں نے مسکرا کر پوچھا "اور بجلی گرانے سے؟" اس کے چہرے
کی طرف اتنی سرعت و کثرت سے خون دوڑ آیا کہ چہرہ گلنار ہو گیا
لیکن سر اور جھک گیا۔ ان کی ہمت اور بھی بڑھی۔ جواب کے لئے اصرار
شروع کر دیا۔ "کیوں صاحب اس کا جواب نہیں ملیگا؟"
اُس نے سر اُٹھایا۔ کچھ عجیب انداز سے۔ گردن کو جنبش دیکر
چشم و ابرو سے خاص کام لیتی ہوئی بولی "میں آپ کی شاگرد ہوں"
انھوں نے جواب کے ہلکے پہلو کو نظر انداز کر کے کہا "اُونھ شاگردی
و استادی کا یہاں کیا ذکر۔ یہاں تو صاعقۂ حسن اور خرمنِ دل
کی بحث ہے"۔ وہ بولی "تو پھر کسی شے کے بیجا اور غیر فطری استعمال پر
بازپرس کی گنجائش ہو سکتی ہے نہ کہ صحیح و با محل استعمال پر"
انھوں نے پوچھا "یعنی"۔ وہ بولی "آفتاب کا فطری کام
روشنی پہونچانا۔ چاند کی غایت جلتی ہوئی دنیا کو سیمابی چادر
میں سلانا۔ مرد کا مقصد قوانین قدرت پر ظفریاب ہونا اور کمزور عورتوں
کی غرض فاتح مردوں کو شکست دینا۔ ہمارے ناتوان ہاتھوں میں
صرف ضعف ہی ایک آلہ ہے اور یہی ایک حربہ!"
یہ بولے "لیکن پھر بھی اس دیدہ دلیری اور اس بے دردی سے
اس کا استعمال اور پھر اس پر یوں فخر!"
وہ مسکرائی اور آنکھیں نیچی کر کے بولی "ہم نے تو مبدء حسن سے
جس طرح صاعقہ پایا ہے اسی طرح اسی سے لن ترانی بھی سیکھی لیکن جب
بار بار کہنے پر بھی مردوں کی آنکھیں نہ کھلیں اور انہیں سجھائی نہ دے
تو ہمارا کیا قصور؟"
پروفیسر صاحب نے سوال کو پھر شخصی اور ذاتی بنا یا اور بولے
"لیکن میں تو دو کی جگہ عینک لگا کر چار آنکھوں سے سب کچھ دیکھا
کیا۔ پھر بھی آنکھوں میں خیرگی سی ہوئی اور اب تو بیہوشی سی ہے"۔
پروفیسر صاحب کی بات کا پہلو بدلکر
بیساختہ مسکرا کر بولی "اور پھر ایسی حالت میں یہ اصرار کے گو جائیگی
لیکن ہاں جب آدمی اپنے ہوش ہی میں نہ ہو تو پھر اُس کی بات کب
گرفت کے قابل! اچھا ذرا کوچ پر بیٹھ جائے۔ میں ہوش میں لانے کی
کوشش کروں"۔ یہ بھی کچھ لاجواب سے ہو کر مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے
وہ میز سے سگریٹ کیس اُٹھالائی۔ انہیں سگریٹ دیا اور دیا سلائی
خود ہی جلائی اور ہاتھوں کے کٹوروں میں اسے بند کر کے انکے منھ
کے قریب لے گئی انھوں نے سگریٹ نہیں سُلگایا بلکہ روشنی میں اُسکے
نازک ہاتھوں کا تیز گلابی رنگ اور اُن میں سبز سبز رگوں کی
دلفریبیاں دیکھنے لگا۔ اُس نے انھیں محو دید دیکھکر روشن دیا سلائی
پھونککر گل کر دی۔ اور جب انھوں نے قدرے استعجاب سے

اس کی طرف دیکھا تو اُس نے بڑی متانت سے دونوں ہاتھوں پر دیاسلائی کی ڈبیہ رکھکر ایک طرف بڑھا دی۔ انھوں نے مسکرا کر پوچھا "کیوں۔ کیا اب دوسری دیاسلائی نہ جلائیگا؟"

وہ بولی "جی مجھے منظور نہیں کہ آپ علم سدرک کا مطالعہ میرے ہاتھوں میں کریں!" انھوں نے بات بنائی اور کہا "نہیں۔ نہیں میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ ان ہاتھوں میں میری قسمت کا کیا فیصلہ لکھا ہے"

وہ شوخی سے بولی "تو بہت خوب۔ دوسری دیاسلائی جلائے دیتی ہوں۔ غور سے ملاحظہ فرمائیے اور یہ کہتے کہتے پھر دیاسلائی روشن کی اور کفِ دست کا فانوس بنا کر۔ اُن کی طرف بڑھائی۔ انھوں نے ابکی سگریٹ پہلے جلالیا۔ پھر ہاتھ دیکھنے کو (؟) جھکے۔ اُس نے پھر دیاسلائی بجھا دی اور روٹھے ہوئے بچوں کی طرح منہ پھلا کر بولی "ہونھہ۔ دیاسلائی تو جلوائی سگریٹ جلانے کے لئے اور غرض بتائی ہاتھ دیکھنے کی!"

وہ بولے "وہی غرض تو آپ کی بھی تھی۔ اس لئے کہ تقدیر پر نہ آپ یقین رکھتی ہیں اور نہ میں!"

اُس نے کہا "لیکن میں تو مانتی ہوں!"

یہ چپکے سے بولے "ہاں؟ آخر کن باتوں میں؟" وہ رک کر بولی۔ "مثلاً موت و زندگی کے معاملے میں۔" انھوں نے پوچھا "اور؟" اُس نے شرما کر گردن نیچی کرلی۔ اُن کا اصرار اور بھی بڑھا۔ وہ بولی "اور شادی بیاہ کے بارے میں" انھوں نے ہنسکر کہا "تو پھر تو ہاتھ ضرور دیکھونگا۔ یہ تو میرے مطلب کی بات ہے"

وہ شرم سے عرق آلود ہوگئی کہ اتنے میں ڈاکٹر صاحب مع اپنی بیوی کے آگئے اور ان کا پروفیسر صاحب سے تعارف کرکے بولے "دیکھتی ہو یہ اس طوفان میں گھر جانے کے لئے مصر ہیں"

وہ بولیں "یہ ناممکن ہے۔ دسترخوان چن دیا گیا ہے کھانا حاضر ہے۔ اول طعام بعدہٗ کلام" انھوں نے پھر ماں کا نام لیا۔ تومس بہار نے بڑھ کر کہا۔ یہاں ٹیلیفون موجود ہے اور آپکے ہاں بھی یقینی ہوگا۔ انھیں اطلاع دیدیجئے کہ اس آفت میں آپ آنے سے رہے"

یہ بولے "ہاں یہ صورت معقول ہے" اور جلدی جلدی ٹیلیفون دیا۔ وہاں غریب ماں پریشان ہورہی تھی کہ اطلاع ملی اور یہ جانکر کہ ایک گھر میں آرام سے موجود ہیں۔ مطمئن اور خوش ہوکر بولیں "وہیں رات بھر رہجانا۔ اس آفت میں آنے کا قصد نہ کرنا"

انھیں جب اس طرح بطیب خاطر اجازت ملی تو پھر میزبانوں سے بولے "بن بلایا مہمان حاضر ہے۔ اب جو حکم ہو"

بیگم شمیم نے کہا "تو پھر آئیے کھانا ٹھنڈا ہورہا ہے"

(۵)

کھانا کھانے کے بعد تاش کی ٹھہری۔ ڈاکٹر صاحب کا جوڑہ تو سلامتی سے موجود ہی تھا۔ اُن کی ساتھی مس بہار بنیں۔ آکسفورڈ اور کیمرج کے برج کھیلے ہوئے۔ خوب خوب جیتے۔ اور ہارے ہوئے حریف ہنس ہنسکر اُن سے یہ فن حاصل کرتے رہے۔ کھیل کے اثناء میں ڈاکٹر صاحب اور اُن کی ساتھی میں گرم گرم نقرے ہوا کئے لیکن انھوں نے اپنا کام دور کا جلوہ رکھا۔ اور چپکے چپکے لطف لیتے رہے۔ اور دل ہی دل میں مس بہار کی ذہنیت و ذکاوت کی

دادیتے رہے۔

گھنٹہ دو گھنٹہ اِس لطف سے کٹا پھر یہ طے ہوا کہ مس بہار کوئی چیز پیانو پر بجا کر سنائیں۔ پروفیسر صاحب فطرتاً گانے کے عاشق تھے۔ اور خود بھی اس فن میں دسترس رکھتے تھے۔ پیانو کا چھڑنا تھا کہ بیتاب ہو گئے۔ کمرے میں ٹہلنے لگے اور مس بہار کی موقع موقع سے داد دینے لگے ڈاکٹر صاحب اور انکی بیوی اُن کے چہرے سے بھانپ گئیں کہ یہ بھی اس فن سے اچھی طرح واقف ہیں اور اسپر مصر ہوئے کہ یہ خود بھی کچھ گائیں۔ انھوں نے پہلے تو انگریزی گانے گائے پھر سردر اور برج بھاشا اور اردو کی چیزیں گانے لگے۔ فن پر قدرت۔ آواز میں گداز۔ داغ دہلوی کی غزلیں۔ اور پھر موسم یہ کہ کالی گھٹا ہے پانی برس رہا ہے۔ رات کا وقت ہے اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ حالت تھی کہ آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے اور سب کی نظریں بچا کر اپنی بیوی کی طرف اس طرح دیکھتے کہ وہ شرما شرما جاتیں۔ مس بہار ایک کونے میں علٰحدہ جا کر بیٹھی تھیں لیکن چہرے کی یہ حالت تھی کہ ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ غریب چھوٹے ریشمی رومال کی شامت تھی۔ کہ کبھی مٹھیوں میں دبا کر گیند بنایا جاتا تھا۔ کبھی دونوں ہاتھوں میں اینٹھ کر مارپیچاں کی صورت اختیار کرتا اور کبھی اُس کے گوشے دانت سے دبا کر کھینچے جاتے۔

بارے یہ ہیجانی کیفیت پروفیسر صاحب کے گانے کے رُک جانے سے ختم ہوئی۔ اب ان کے دل کا بوجھ بھی کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اور رات بھی اچھی طرح بھیگ چکی تھی۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ اب "شب بخیر" ہی کہہ لینا زیادہ اچھا ہے اور دونوں مہوشوں سے رخصت ہو کر پروفیسر صاحب ڈاکٹر صاحب کی ہمراہی میں اس کمرے کی طرف چلے جس میں اُن کے سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔

انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی مہمان نوازیوں کا شکریہ ادا کرتے وقت ان سے کچھ رک رک کر کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی ماں کو۔ آپ کی بیوی اور سالی سے ملنے کے لئے لے آؤں؟"

وہ بولے "عزت افزائی۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے"

پروفیسر صاحب نے کہا "ہاں۔۔ مجھے صرف اس کا خیال ہے کہ وہ پرانی ریت اور رسم کا خیال رکھنے والی پردہ کی پابند ہیں!"

ڈاکٹر صاحب نے ذرا منہ بنا کر کہا "یہ تو دقت ہے۔۔۔۔ لیکن خیر میں اسوقت اندر نہ جاؤنگا۔ آپ ضرور لائیں"

پروفیسر صاحب نے کہا "بہت خوب۔ آپ گھبرائیں نہیں میں اُنھیں سمجھا دونگا وہ آپ حضرات پر کوئی اعتراض نہ کریں گی"

ڈاکٹر صاحب نے متانت سے کہا "ہاں صاحب۔ ان پرانے خیال کے لوگوں سے یہی ڈر لگا رہتا ہے۔۔۔۔ میری تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سا تعلیم یافتہ اُن کے ساتھ کیونکر زندگی بسر کر لیتا ہے"

پروفیسر صاحب مسکرا کر بولے "بہت ہی آسانی سے اور خوشی خوشی۔ اس لئے کہ میرے اور ان کے خیالات میں تصادم کا خوف ہی نہیں!"

وہ بولے "اچھا تو پھر آپ بھی پردہ کے موافقین میں سے ہونگے ———— لیکن آپ ایسے فلسفی سے بہت بعید ہے"

پروفیسر صاحب نے کہا "اگر آپ میری بات توجہ سے سنیں اور اسپر غور کرنے کا وعدہ فرمائیں تو میں عرض کردوں" ڈاکٹر صاحب نے

کہا "ضرور ضرور ارشاد فرمائیے"

انھوں نے متانت سے کہا "میرا خیال یہ ہے کہ جس طرح پوشاک ستر کے لئے ضروری ہے اسیطرح صنفی عریانیوں کے لئے پردہ۔ یہ ایسی عقلی قیود ہیں جن کی پابندی کیوجہ سے ہم میں اور حیوانات میں ایک امتیازی خصوصیت پیدا ہوگئی ہے اور ہم نے یہ حدیں اور یہ پابندیاں سیکڑوں برس کی آزادی کی زندگی بسر کرنے کے بعد قائم کی ہیں۔ یہ کہنا کہ ہمیں آزادی کی زندگی کا تجربہ نہیں بالکل غلط ہے۔ ہم نے بہت زیادہ آزاد زندگی بسر کی اور اس کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ ہماری یہ زندگی بالکل بہایم کی سی ہے اور اسی بنا پر ہم نے معاشرت کے چند اصول و ضوابط مقرر کئے اور اُن کی پابندی اپنے اوپر لازم کرلی۔ پردہ کی مخالفت وہی جماعت کررہی ہے جس نے آزادی کی حدوں کو حیوانیت سے ملا دیا ہے جنکے ہاں انسان اور بہایم سب ایک ہی صنف کی چیزیں ہیں۔ میں اپنے کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہوں اس لئے میں اُن آزادوں سے اپنے کو علحدہ ہی رکھنا چاہتا ہوں" پروفیسر صاحب دم لینے کے لئے ذرا رُکے تو ڈاکٹر صاحب نے مغرب کا نام لیا۔ وہ مسکرا کر بولے "مغرب؟ جی میں نے کئی برس مغربی معاشرت کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس کے بعد مصر و عرب و ایران کی بھی سیر کی ہے۔ اور میں ذاتی تجربہ کے بعد کہتا ہوں کہ صنف نازک کی موجودہ آزادیاں عفت و عصمت۔ عزت و شرافت کی بنیادیں کھوکھلی کررہی ہیں۔ اور ایک دن اخلاقیات کی یہ ساری عمارت مسمار و منہدم ہوکر رہجائیگی بے حیائی و عریانی بہیمیت و حیوانیت۔ انسانی جامہ میں روز بروز نمایاں ہوتی جارہی ہیں۔ اور اگر ہندوستان بھی اسیطرح کورانہ تقلید پر مصر رہا تو چند ہی سال بعد ہندوستانی شریف عورتیں بھی عریانی کو کا مقابلہ بہت خوشی سے منظور کرلیں گی۔ اور عجب نہیں کہ ہمارے ہاں بھی جرمنی کے نام نہادی فطرت پرستوں کی طرح شرفا میں ننگا گروہ بہت جلد پیدا ہوجائے۔ سچ مانئے ہم میں نسلوں کا امتیاز حلال و حرام کے مدارج اور شریف و رذیل کا فرق اسیوقت باقی ہے جب تک کہ یہ پردہ باقی ہے ورنہ وہ خلط ملط ہوگا کہ اس تالاب میں سب ننگے ہی ننگے دکھلائی دیں گے! ۔آج جس شرافت پر ہمکو ناز ہے بالکل اسمیں شک ہوگا اور جو غیرت ہماری مخصوص شے ہے وہ بالکل مفقود ہوجائیگی!"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "تو آپکے نزدیک پردہ اُٹھتے ہی ساری خرابیاں پیدا ہوجائینگی"

پروفیسر صاحب نے کہا "نہیں۔ یہ تو نہیں لیکن ننانوے فی صدی برائیوں کے موقع بڑھ جاتے ہیں۔ معاف کیجئیگا۔ اب جاکر آرام فرمائیے۔ پھر کبھی اسپر بحث ہوگی"

(۶)

صبح سویرے جب پروفیسر صاحب نے نماز سے فراغت پائی اور رات کے بھیگے ہوئے کپڑے زیب بدن کرکے کمرے سے نکلے تو انھیں سارا گھر سوتا ملا۔ انھوں نے جیب سے "فاؤنٹن پن" نکالا اور ایک پرزے پر یہ لکھ کر کہ "ڈاکٹر صاحب رات کی مہمان نوازیوں کا شکریہ۔ اب بندہ رخصت ہوتا ہے" وہیں میز پر رکھدیا اور سیدھے گھر چلے گئے۔ اور وہاں سے دیر تک اپنے میزبانوں کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔ اور یونیورسٹی سے واپسی پر شام کو وہاں کو ہنڈگاڑی میں بٹھا کر ڈاکٹر صاحب کے بنگلہ پر

پہونچے۔ خود ڈاکٹر صاحب کے پاس علیٰحدہ بیٹھ گئے اور پردہ کرکے اس ضعیفہ کو بیگم شمیم کے پاس بھیجدیا۔ مس بہار کہیں ٹینس کھیلنے گئی تھیں اس لئے ——— اُن سے ملاقات نہوئی

جب گھر لوٹے تو ماں نے بھی بیگم شمیم کی تعریف کی۔ دو تین روز کے بعد پھر ڈاکٹر صاحب کے پاس پہونچے اور ادہر اُدہر کی باتیں کرکے کہنے لگے کہ "میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ حضرات پسند کریں اور مس بہار میری ماں اور مجھے خوش کرنے کے لئے پردہ میں رہنا منظور کرلیں تو میں اپنے کو اُن کی غلامی میں دینا چاہتا ہوں"

ڈاکٹر صاحب کچھ متفکر سے ہوگئے۔ تھوڑی دیر سوچکر بولے "میرے نزدیک تو مس بہار قابل رشک ہیں کہ ان کو آپ کا سا کفو ملا لیکن یہ پردہ۔ شاید آپ دونوں کے درمیان حائل ہی ہو کر رہیگا"

انھوں نے کہا "بہرحال آپ میرا پیغام پہونچا دیں۔ اس کے بعد جو میری قسمت" اور اُن سے رخصت ہو کر چلے آئے۔

آج طلبا آئے گئے۔ لکچر بھی دیا۔ پڑھایا بھی۔ لیکن جس کو آنکھیں ڈھونڈہتی تھیں وہ کہیں نہ دکھائی دی۔ گاڑی پر گھر بھی لوٹے مگر لیکن بادل ناخاستہ۔ راستہ بھر سوچتے رہے کہ دریافت خیریت کیلئے آج ہی ڈاکٹر صاحب کے ہاں جائیں یا نہ جائیں۔ دل کا چور قدم پکڑ دیتا تھا۔ لیکن فطرت کی کشش یہی کہتی کہ بن دیکھے رات کیونکر کٹ سکتی ہے۔ عقل سمجھاتی کہ ابھی ——— ابتدا ہے ابھی سے روک تھام لازمی ہے ورنہ ساری دنیا بہار ہی ہو کر رہجائیگی۔ اور اُس کے سوا سب کچھ چھوٹ جائیگا سُوا کہتا۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ غرض ایک طوفان تھا کہ اس فلسفی کے دل و دماغ میں برپا تھا۔ آندھیاں بھی آتی تھیں اور جھکڑ بھی۔ صرف برسوں کی منجی ہوئی طبیعت۔ اپنے کو لئے دئے رہنے کی عادت آڑے آتی جب جذبات میں تلاطم اُٹھتا تو وہ جھیل کے کنارے کے بید کے درختوں کی طرح لچک جاتی۔ جھک جاتی۔ لیکن جہاں اس طوفان میں ذرا سی کمی۔ تھوڑی سی کیفیت ہوتی وہ پھر اُٹھ کھڑی ہوتی ہزاروں مرتبہ ہاری لیکن پھر اپنی جگہ پر موجود۔ سیکڑوں مرتبہ دب گئی اور پھر اُبھر آئی۔ نہ کسی طرح ٹوٹتی اور نہ جڑ سے اکھڑتی تھی۔ مقابلہ تھا کہ جاری تھا۔ جنگ تھی کہ بے دست و پائی میں بھی نہ رکتی تھی۔ اُس پر اُدھیڑ بُن کا سلسلہ گاڑی رکنے سے ٹوٹا۔ اترے اور اندر داخل ہوئے وہاں ایک خط ملا۔ لکھا تھا۔

"ڈیر پروفیسر صاحب۔ میں نے آپ کا پیام دونوں جگہ پہونچادیا میری بیوی تو آپ پر اسی رات سے عاشق ہیں۔ انھوں نے تو خوشی خوشی منظور کرلیا۔ لیکن صاحب معاملہ پردہ کے معاملہ سے بظاہر گریزاں ہے۔ جب میں نے آپ کی وکالت شروع کی تو اس نے مدعی سُست اور گواہ چست، والی مشہور پھبتی مجھ پر کسی اور چپ ہو رہی۔ آپ چاہے۔ اس کے معنی السکوت کالاقرار سمجھیں لیکن مجھے تو تیور بتلاتے ہیں کہ "خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید"۔ بہرحال آپ تشریف لائیں اور خود اپنے کانوں اپنی قسمت کا فیصلہ سُن لیں

"خیر اندیش شمیم"

پروفیسر صاحب خط پڑھکر آرام کرسی پر دراز ہوگئے دیر تک سگار پیا کئے اور یہی سوچا کئے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر کا خیال صحیح ہے۔ جواب نفی میں ہے۔ کس سے رائے پوچھیں۔ کس سے مشورہ کریں۔ کوئی تجربہ کار ہو تو بتائے۔ کوئی عقل والا ہو تو اسپر بھروسا کیا جائے۔ جلدی سے اٹھے۔ کانٹ۔ اسپنوزا

ڈیکارٹ۔ ہیوم۔ بارکلے۔ سب کی کتابیں اُٹھالائے۔ اُن کی ورق گردانی کرڈالی۔ سب اس موضوع پر خاموش۔ عقلِ کل لیکن جذبات سے معرا۔ خیال آیا شاید جمیس امریکہ کا رہنے والا زندہ دل تھا، اس کے ہاں کوئی کام کی بات ملے۔ اس کی کتاب اٹھائی۔ محبت کا بیان نکالا۔ حرف حرف پڑھ ڈالا۔ کوئی مشورہ نہ ملا۔ عاجز آکر سب پھینکدیا اور سر تھامے دیر تک بیٹھے سوچا کئے۔ پھر بچپن سے پڑی ہوئی عادت کام آئی۔ سیدھے ماں کے پاس پہونچے۔ انکی گود میں سر رکھ کر لیٹ رہے۔ اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ خط کا مضمون اپنی خواہش اور پردہ کی رکاوٹ۔ ضعیفہ نے سب کچھ اس طرح ٹھنڈے دل سے سنا جس طرح وہ اس وقت کی باتیں سنا کرتی حب یہ پانچ سات برس کے تھے۔ اور ان کی خشک اُنگلیاں ان کے سر کے بالوں سے برابر کھیلتی رہیں۔ جب انھوں نے تتمۂ کلام میں یہ کہا کہ "امی اب یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں" تو اس نے مامتا سے کانپتے ہاتھوں سے انکا چہرہ کلیجہ سے ہٹاکر سیدھا کیا جُھک کر دیر تک ان کی آنکھوں میں کچھ دیکھا کی۔ عجب نہیں کہ اُن میں اس نے انھیں پالنے میں ہمکتے۔ ہاتھ پیر پھینکتے پھر ننھی ننھی ٹانگوں سے دوڑتے۔ پھر عنفوانِ شباب میں سبزہ آغاز۔ پھر جوانی میں پروفیسر کی حیثیت سے۔ پھر آج عاشقِ بے تاب کی طرح پریشان خاطر سب کچھ ایک ہی نظر میں دیکھ لیا ہو۔ اس لئے کہ ماں کی نظر میں بیٹے کی ہر صورت۔ ہر وقت یکساں طور پر موجود رہتی ہے۔

بہرحال وہ تجربہ کار بی بی بولی "بیٹے یہ تمھاری ناتجربہ کاری ہے کہ تم اس قدر پریشان ہو۔ دل لگانا اور دل کا آنا تو دنیا میں عام ہے۔ اس میں کوئی بُرائی نہیں۔ ہاں پردہ کی رکاوٹ البتہ .... لیکن ہمارے ہاں تو یہ رسم صرف بزرگوں ہی سے نہیں چلی آئی ہے بلکہ ایمان و شرافت کا جز ہے میری خواہش تو یہی ہے کہ جب چاند سی بہو گھر میں آئے تو وہ بھی شریفوں کے دستور کی پابند ہو۔ ۔ ۔ لیکن میرے خیالات پُرانے۔ میری عقل دقیانوسی میں آج کل کا طور طریقہ کیا جانوں۔ میرے ماں باپ نے بھی پڑھایا لیکن اردو۔ فارسی اور تھوڑی سی عربی۔ میں تم لوگوں کے خیالات کیا سمجھوں۔ میں تو عورت ذات تھی۔ میرا کیا ذکر۔ لیکن میرے میکے کے مردوں میں سے بھی کوئی نہ فرنگیوں سے ملا اور نہ فرنگیوں کے ساتھ اُٹھا بیٹھا۔ تم ماشاء اللہ تمام دنیا کی سیر کر آئے ہو سمندر پار ملکوں میں تم نے تعلیم پائی ہے تم ہمارے طریقوں اور ہماری رسموں کی کہاں پابندی کر سکتے ہو اس لئے اگر تم کسی بے پردہ سے شادی کروگے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ ہاں اتنی ضرور تمنا ہے کہ کسی کو بیاہ کے لاؤ۔ مگر شریف ہو۔ قوم و ذات کی شریف نہ سہی۔ لیکن افعال شریفوں کے ہوں۔ دل شریف کا ہو اور طبیعت شریف کی۔ ایسا نہ ہو کہ تمھاری بیوی اور میری بہو ہوکر تمھارے باپ کا نام ہنسوائے"۔

پروفیسر صاحب اُٹھکر بیٹھ گئے اور ماں سے بڑی محبت سے بولے "امی میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کا ضرور خیال رکھونگا؟"

وہ بولیں "اللہ تمھیں سلامت رکھے۔ اور تمھارے سر پر سہرا مجھے دیکھنا جلد نصیب ہو۔ اب تمھیں اختیار ہے جو جی چاہے کرو"

اُنھوں نے بالکل بچوں کے انداز سے پوچھا "تو پھر آج جاؤں؟"

وہ جہاندیدہ مسکرا کر بولی "نہیں بیٹا جلدی نہ کرو۔ میں نے

آج تک اُس لڑکی کو نہیں دیکھا۔ ذرا پہلے میں خود دیکھ آؤں۔ اُسکے بعد تم بھی چلے جانا"

یہ وہاں سے اُٹھکر باہر آئے۔ کوچبان کو گاڑی تیار کرنے کا حکم دیکر اپنے کمرے میں جاکر بیٹھ رہے۔

(۷)

بڑی بی نے واپسی پر صرف اتنا کہا کہ "بیٹا لڑکی ہر طرح اچھی ہے۔ لیکن طور طریقہ سارا فرنگیوں کا ہے" اور چپ ہو رہیں۔ جب اُنھوں نے بہت اصرار کیا تو ــــ کہنے لگیں "بڑی تو آج پھر بڑے تپاک سے ملیں۔ اُن کے انداز سے تو صاف ٹپکتا ہے جیسے انھیں یہ بات دل سے منظور ہے چھوٹی بھی سلام کرکے قریب آکر تہذیب سے بیٹھی۔ لیکن ذرا سا نہ جھجکی نہ شرمائی۔ اگر اسے بھی منظور ہوتا تو یوں قریب نہ بیٹھتی۔ بیٹا بُرا نہ ماننا۔ وہ تم سے ابھی محبت نہیں کرتی۔ میں اتنی دیر کی ملاقات میں اتنا ضرور اندازہ کر سکی کہ اگر وہ تم کو چاہتی ہوتی تو وہ اس طرح کی لڑکی ہے کہ تمھارے لئے ایک پردہ میں کیا ہزار پردہ میں بیٹھنا قبول کر لیتی اور پھر جب میں نے اُسے دیکھا ہے تو ایک سُرخ انگریزی کپڑا پہنے تھی۔ گردن کے پاس سے کھلا ہوا۔ یہ ہندوستان کی کنواری لڑکیوں کا دستور نہیں۔ اُسپر سے ماشاءاللہ بنی سنوری بھی تھی۔ تم چاہے ہنسو یا اُسے بُرا کہو۔ لیکن ہمارے ہاں شرفا میں بن بیاہی لڑکیوں کو موٹا کپڑا پہناتے تھے۔ ایک تو اس لئے کہ خود پسند ہی نہ آئے۔ دوسرے اللہ جانے غریب سے بیاہی جائے یا امیر سے۔ اگر میکہ میں ریشم پہنتی رہے اور غریب شوہر کے پاس اتنا نہ ہوا تو پھر زندگی دوبھر ہو جائیگی یہاں ماشاءاللہ ابھی سے سب کچھ ہے۔ اب بیٹے جو تم انگریزی کپڑے نہ پہنا سکے تو پھر؟ ...... مجھ بڑھیا کی اگر رائے مانو تو تم اس خیال کو اپنے دل سے نکال ڈالو۔ ابھی میرے گھر میں بہو آنا خدا کو منظور نہیں!"

یہ وہاں سے چپکے چلے آئے اور پلنگ پر آکر لیٹ رہے۔ ماں کا پاس۔ خاندانی روایات کا لحاظ۔ شرافت وغربت کا خیال ایکجانب حسن کی کشش۔ محبت کا جذب۔ مغربی تعلیم کا اثر۔ دوسری طرف۔ نتیجہ یہ تھا کہ ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ کبھی اٹھے۔ کبھی بیٹھے کبھی ٹہلے۔ کبھی پھر لیٹ رہے۔ نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ ہاں مس بہار کی تصویریں تھیں کہ قطار در قطار ــــ نئے نئے انداز سے چلی آتیں۔ کبھی تقریر کرتی ہوئی۔ زیر لب مسکراتی ہوئی کبھی سبق پڑھتی ہوئی۔ ایک خاص انداز سے گردن ٹیڑھی کئے۔ ہونٹوں پر پنسل کی نوک رکھے کبھی بجلی سے ڈرتی ہوئی زرد رد۔ کبھی بجلی گراتی ہوئی سرخرو۔ اور ایک دلربا۔ دلکش۔ دلآویز۔ عجیب معمہ اور طرفہ اسرار یہ تھا کہ آنکھ کھولے رہتے جب بھی دیکھتے۔ آنکھیں بند کر لیتے جب بھی دیکھتے۔ گویا ہر تصویر پردہ ہائے چشم پر ثبت تھی!

صبح کے وقت جب موذن نے اذان دی تو یہ بھی الا اللہ کہکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور نماز پڑھ کپڑے پہن چھڑی گھماتے چل کھڑے ہوئے اور پہونچے وہیں جہاں رات کی نیند تھی۔ بنگلہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ بہار گلگشت چمن میں مصروف ہے۔ انھیں دیکھتے ہی سلام کرکے بولی۔ "رات آپ کی والدہ سے ملکر بیحد دل خوش ہوا۔ بہت ہی نیک پُرانے طرز کی آدمی ہیں"

یہ بولے "آپ کی عنایت میں بھی اسوقت مخصوص شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا کہ آپ نے کم از کم اُنھیں چھیڑا نہیں اور اُنھیں خوش ہی کرنے کی کوشش کی"

وہ بولی:"سچ کہوں جی تو بیساختہ یہی چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بات کہدوں کہ ذرا وہ اُلجھ جائیں۔ لیکن پھر آپ کا خیال آگیا۔"

یہ بولے:"میں اس کا اور زیادہ ممنون ہوں کہ میرا خیال تو آیا۔"

اس نے مسکرا کر کہا "کیوں اسمیں شکریہ کی کونسی بات ہے؟ پروفیسروں کا تو ہر روز سبق کے سلسلے میں خیال آہی جاتا ہے۔"

وہ بولے:"میں آپکے بنگلہ پر شاگرد و استاد کی طرح باتیں کرنے نہیں آتا بلکہ دوستوں کی طرح۔"

اس نے بیساختہ جواب دیا "دوستی میں سن کا فرق جنس کا اختلاف۔ علم کی کمی و زیادتی۔ یہ سب امور مانع ہیں۔"

انھوں نے کہا ——— "لیکن محبت میں تو نہیں! عشق میں تو یہی اختلافات جذب وکشش کی زیادتی کا باعث ہوتے ہیں۔"

وہ بولی "ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن اُسمیں بھی درجے ہوتے ہیں......."

انھوں نے جلدی سے بات کاٹکر کہا "بس اسی سے سمجھ لیجئے کہ میری محبت کس درجہ کی ہے کہ میں آپ کی غلامی میں آنے کیلئے تیار ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولی "آپ کی عنایت و محبت کا شکریہ۔ لیکن وہ تو کچھ شرطوں پر مبنی ہے۔ انھیں شاید آپ بھول گئے۔"

انھوں نے کہا "بہت معمولی سی۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ علانیہ بے پردہ نہ نکلو بلکہ برقعہ پہنکر!"

اُس نے کچھ منفعل ہوکر "ہوں!" کہا اور پھر پوچھا "اور کچھ؟"

انھوں نے کہا "بالکل نہیں!"

وہ تھوڑی دیر چپ پھول چنا کی جب انھوں نے کہا "کیوں کبھی کیا لائق جواب بھی نہیں؟ ہاں نہیں کچھ تو بولو!"

وہ ان کی طرف منہ پھیر کر بولی:"اگر آپ سے دو چار ہفتہ میں نے تعلیم نہ حاصل کی ہوتی اور آپ کی قابلیت اور علمیت کی قایل نہ ہوتی تو شاید میں "چار پایہ برو" والا شعر پڑھدیتی۔ لیکن شاگرد ہونے پر بھی جب آپ منہ کھلواتے ہیں تو اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ سی ذہنیت کے آدمی کو فلسفہ نہ پڑھنا چاہئے تھا۔ آپ کو عقلیات سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ محض رسم و رواج کے پابند اور پرانی لکیر کے فقیر ہیں!.... میں اپنے کو ایک شخص کے اختیار میں دیکر اپنی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتی!"

انھوں نے غصہ اور درد بھری آواز سے پوچھا "تو پھر یہ آخری جواب ہے؟"

اس نے کہا "بالکل! مجھے تو سخت تعجب ہے کہ جب میرے اور آپ کے درمیان کا اصولی اختلاف ہے۔ تو پھر آپ کے دل میں یہ خیال ہی کیونکر پیدا ہوا!"

وہ بولے "خیر۔ یہ تعجب تو آپ کا اُس وقت رفع ہوجائیگا جب آپ آئینہ سامنے رکھکر اپنی صورت پر غور کریں گی!"

اُس نے ترش روئی سے کہا "تو صورت تو کوئی ایسی چیز نہیں جسپر زندگی کی بنیادیں رکھی جائیں۔ دیکھئے پھر وہی فلسفیت کے خلاف بات!" وہ عجیب طرح جھنجھلا کر بولے "ارے تو میں مرد بھی تو ہوں جوان بھی تو ہوں۔ یا خالی فلسفی ہی ہی؟"

اسپر وہ کنکھیوں سے انھیں دیکھ کر مسکرائی اور چپ ہو رہی۔ اور

پھر پھول چننے لگی۔

انھوں نے پوچھا" تو بس جاؤں ؟" وہ بھویں اونچی کرکے متعجب آواز بناکر بولی" کیوں ؟ کیا دولہ بھائی اور باجی سے نہ ملئے گا ؟" انھوں نے کہا " نہیں ..... اچھا خدا حافظ ...... اور اگر فلسفہ اجازت دے تو دوچار پھول مجھے عنایت فرمائیے یادگار کی طور پر رکھ چھوڑوں گا۔"

اُس نے دو تین مرجھائے ہوئے پھول گود سے چُنکر نکالے اور انہیں ایک طرف [illegible] بڑھاتے عمداً زمین پر گرا دیا۔ اور پھر "ارے !" کہکر اُنھیں اُٹھاکر اُنکی جانب بڑھایا۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کرکے جیب میں رکھ لیں اور تعظیماً جھککر بولے :-

شکریہ ! لیکن مرجھائے ہوئے بھی ہیں اور خاک آلود بھی رکھ چھوڑئیے اور انھیں میرا دل سمجھکر پیروں سے کچل ڈالئے گا یہ کہتے۔ لانبے لانبے ڈگ رکھتے بنگلہ کے باہر نکل آئے۔ ادہر اُس نے پھولوں کی جانب دیکھا اور پھر اُن کی طرف نظر جمائے دیکھتی رہی۔ اور جب یہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو واقعی اُس نے ان بیگناہوں کو زمین پر ڈال کر پیر سے مسل ڈالا ! اور پھر ساری ڈلیا وہیں بکھیر کر جلدی جلدی اپنے کمرے میں گئی اور اپنے پلنگ پر گرکر دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی ....

اصول ومحبت کی اس لڑائی میں بظاہر تو اصول کی جیت رہی لیکن فتح دراصل ہوئی محبت ہی کی اور آنسوؤں نے اُسکی مصحف فتح پر آب زر سے جلی حرفوں میں لکھ دیا !"

(۸)

پروفیسر رضا وہاں لوٹتے ہی سینیٹ سے وائس چانسلر کے یہاں پہونچے اور ان سے ایک مہینہ کی رخصت لیکر رخت سفر باندھ۔ اسی دن پہاڑ چلے گئے۔ اور وہاں پہاڑوں کی سختی انکی متانت اور ان کے استقلال وجبروت سے دو ہی چار روز میں پامردی کا سبق حاصل کرکے فلسفہ الٰہیات میں ڈوبے اور معشوق مجازی کا خیال ترک کرکے معشوق حقیقی کے حسن جہاں سوز کے مطالعہ میں مشغول ہوگئے اور اس بحث پر ایک مستقل کتاب لکھنا شروع کردی شب کو دس بجے تک اور صبح تڑکے سے نو بجے تک لکھتے رہتے اور پھر سارا دن چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کی کوشش میں صرف کرتے۔ غرض دماغی وجسمانی محنت نے دل کا درد اس طرح مٹایا کہ اب صرف داغ ہی داغ رہگیا اور بیچینی کی جگہ سکون واضطراب کے عوض تسکین عود کر آئی۔

ممکن ہے کہ اس کامیابی میں ماں کی دعا بھی شریک رہی ہو اس لئے کہ وہ ضعیفہ دن رات خالق سے اپنے بچے کے لئے صرف استقلال وپامردی ہی مانگتی، آخر ماں کی آواز جب اس طرح در اجابت کو کھٹکھٹائے تو کب تک سنوائی نہ ہو اور انکو بھی سوائے اس کے اور کام ہی کیا تھا۔ کھانا کھانا۔ نماز پڑھنا۔ یا بیٹے کے کپڑوں اور کتابوں کا الٹنا پلٹنا اور اُنھیں دھوپ دکھاکر صاف کرکے شکنیں مٹاکر پھر سلیقہ سے رکھدینا یہی روزمرہ کا کام تھا اور یہی زندگی کی غایت وغرض !

ہاں دو تین مرتبہ اس معمول میں کچھ فرق آیا اور وہ اس لئے کہ بیگم شمیم ملنے چلی آئیں بڑی بی اُن سے یا ان کی بچی سے کچھ زیادہ خوش نہ تھیں اور وہ بھی اُن کے بشرے سے یہ سمجھ گئیں اور جب انھوں نے پروفیسر صاحب کے متعلق پوچھا تو بڑی بی کے

واب نے اس کی بالکل وضاحت کردی - وہ بولیں "بی بی وہ
پنے دل سے مردانہ وار لڑنے گیا ہے - اور سچ جانو میرا بچہ وہاں
ے کامیاب لوٹیگا - وہ مرد بچہ ہے - اور خود بھی مرد ہے!" وہ بھی
ی ہاں، کہکر بات ٹال گئیں - جب دوبارہ بیگم شمیم آئیں تو بڑی
ں بولیں کیوں بی بی تم ہی اکیلی آئی ہو - تمھاری بہن نہیں
ئیں؟ ماشاء اللہ مزاج تو اچھا ہے" وہ بولیں "جی وہ آپ کا سامنا
رنے سے شرماتی ہیں" انھوں نے کہا کیوں - ارے اُنھوں نے میرا
یا بگاڑا ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ انھوں نے مجھ پر بڑا احسان کیا
میرے بچہ کی آنکھیں کھولدیں - اب وہ ذرا آسانی سے عشق و
بت کے پھندے میں نہیں پھنسے گا........ ان کو اب کی اپنے
ساتھ ضرور لانا - اب انھیں کاہیکی شرم اور لاج - اب تو وہ خیال ہی
ل سے جاتا رہا!"

غرضکہ بی بہار بھی آئیں - لیکن یہ عجیب بات تھی کہ ہندوستانی
ساری اور معمولی پمپ پہنکر آئیں - نہ سینہ پر کھلا ہوا گاؤن زیب
بدن تھا اور نہ میموں والا اونچی ایڑی کا بوٹ پاؤں میں تھا - اور
تنی دیر بیٹھی رہیں نیچی نظریں کئے متانت سے جواب دیتی رہیں
ور جب گھر دیکھنے کے سلسلے میں اس کمرے میں پہونچیں جو خاص
پروفیسر صاحب کے سونے اور پڑھنے کا کمرہ تھا - تو سب وہاں
سے چلی آئیں لیکن یہ ٹھٹھک رہیں اور دیر تک سارے کمرے
کو بغور دیکھتی رہیں - پھر سامنے میز پر جو قلمدان میں آلپین پڑی
ہوئی تھی - اُس کو اُٹھالیا اور شلوکہ کا بٹن کھول کر دل کے اوپر
اُسے اس طرح چبھاتی گئی کہ "رعنا" کا لفظ وہاں بنا ہوجائے
اور جو خون ان زخموں سے نکلتا اُس وسے "بلوٹنگ پیڈ"

میں جو سوختہ کے نیچے دفتی ہوتی ہے اس پر کچھ لکھا - پھر جلدی
سے بٹن بند کرکے ادھر اُدھر دیکھا خون آلودہ آلپین کاغذ میں
لپیٹکر جیب میں رکھی اور وہاں سے چلی آئی -

(۹)

پروفیسر صاحب جو واپس آئے تو پیشانی پر گہرے نشانات
ہونٹوں پر سختی اور دل و دماغ میں صحت کی قوت بھی ساتھ لائے - ماں
نے جب مسکرا کر بلائیں لیں تو اسی کے ساتھ دو آنسو بھی بے اختیار
آنکھوں سے گر پڑے -

پہلے ہی دن جب یونیورسٹی میں مس بہار کا سامنا ہوا اور
انھوں نے سلام کیا تو جواب اسی لاپرواہی سے ملا جس سے کہ
اور شاگردوں کو ملتا تھا اور جب وہ درس کے بعد کمرے میں
کھڑی رہیں تو اُنھوں نے بے رخی سے انکی طرف دیکھکر پوچھا
"کیوں؟ آپ کو کچھ پوچھنا ہے؟"

وہ اپنا ریشمی رومال دونوں ہاتھوں میں اینٹھتی رہی اور
نظریں نیچی کئے بولی "صرف دریافت حال کرنا تھا کہ آپ
مزاج کیسا ہے؟"

یہ بولے "کیوں کیا میں بیمار معلوم ہوتا ہوں؟ میں تو پہلے
سے علیل نہیں ہوا!"

وہ بولی "جی نہیں - صرف اس طرح دفعتاً مہینہ بھر کے لئے
پہاڑ چلے جانے سے خیال ہوا کہ شاید دشمنوں کی طبیعت
کچھ ناساز ہوگئی تھی؟"

انھوں نے کہا "نہیں - ایک کتاب فلسفہ الہیات پر لکھنا
تھی اور اس کی داغ بیل ڈالنے کے لئے بڑی یکسوئی درکار تھی

اطمینانِ قلب کی ضرورت تھی۔ سو وہ یہاں نصیب نہ تھی اسی لئے پہاڑ پر چلا گیا تھا۔"

مس بہار نے اپنے سوکھے ہونٹوں کو زبان سے تر کیا اور بولیں تو کتاب شروع ہو گئی!"

انھوں نے کہا "جی ہاں بلکہ قریب ختم ہے۔ اب انشا اللہ ہفتہ عشرہ میں مطبع بھیجدونگا" اور یہ کہتے کہتے وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی الماری میں رجسٹر اور کاپیاں بند کر کے کمرے سے چلتے وقت بولے "اور اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد آپ چاہے چار پایہ بر و کتابے چند" ہی کہیں لیکن دنیا تو مجھے فلسفی مان ہی لے گی!"

مس بہار خیالات سے غرق غرق ہو گئیں اور کچھ کہنے ہی کو تھیں کہ وہ کمرے سے چلے گئے اور یہ سر جھکائے اپنی سائیکل پر بیٹھیں اور گھر چلی آئیں۔ بہن نے اترا ہوا چہرہ دیکھکر پوچھا "کیوں خیر تو ہے کیسا مزاج ہے" یہ بولیں "کچھ نہیں سر میں درد ہے" اور پلنگ پر منہ لپیٹکر پڑ رہیں۔ گھنٹوں پڑی رویا کیں۔ تڑپا کیں۔ سوچا کیں۔ پھر اٹھیں منہ دھویا اور بہن کے پاس آئیں اور اُن سے کہنے لگیں کہ "پروفیسر صاحب پہاڑ سے واپس آگئے ہیں۔ انھیں کھانے پر کسی دن نہ بلائیگا؟" نسترن نے ان کی صورت دیکھی سر ہلایا اور خط کا کاغذ کھینچکر لکھا "جناب پروفیسر صاحب بہار سے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ پہاڑ سے واپس آگئے چونکہ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی اس لئے جی چاہتا ہے کہ آج شام کو کھانا ہمارے ساتھ کھا کر ہم لوگوں کو بھی رُخِ انور کی زیارت کا موقع دیجئے۔ بیگم شمیم"

جب بیرہ خط لیکر پہونچا تو یہ ٹہل رہے تھے۔ خط لیکر پڑھا جواب لکھا کہ "بہت خوب۔ آٹھ بجے حاضر ہوں گا" اور گاڑیبان کو گاڑی پیچھے پیچھے لانے کا حکم دیکر ٹھیک پانچ بجے پیدل اپنی تفریح کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ خیال یہ تھا کہ گھومتے گھماتے آٹھ بجے تک وہاں پہونچ جائیں گے۔ اس لئے بڑے گھماؤ کا راستہ اختیار کیا کہ جس میں پانچ چھ میل سے کم چلنا نہ پڑے۔ گاڑی اس لئے ساتھ لے لی تھی کہ اگر راہ میں تھک گئے تو بیٹھ لینگے۔

ادھر نسترن نے خط پڑھکر بہار کو دیا۔ سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ کئی روز سے تفریح کے لئے نہیں گئی تھیں۔ ذرا سی امید نے غنچۂ ناشگفتہ کو کھلا دیا۔ اپنی ریشمی چھتری لی ٹہلنے نکل گئیں اور خیالات میں غرق معلوم کہاں سے کہاں پہونچ گئیں اور یہ نہ سوچا کہ آج کل کا زمانہ اندھیرے اور ویرانے میں مردوں کے تنہا نکلنے کا تو ہے نہیں چہ جائیکہ کسی عورت کے۔ وہ بھی دوشیزہ اور پُر جمال۔ مذہب کی آڑ پکڑنے والے بدمعاش ایسے موقعوں کے ہمیشہ متلاشی رہتے ہیں چنانچہ یہ اپنے خیالات میں غرق۔ رعنا کو منانے کی صورتوں پر غور کرتی چلی جا رہی تھیں کہ ——— دو آدمیوں نے انھیں دیکھا۔ آپس میں کچھ اشارے ہوئے اور وہ اُن کے پیچھے لگ لئے جب یہ آبادی سے بہت دور نکل گئیں اور آفتاب نے بھی اپنا رخِ روشن سیاہ چادر میں چھپا لیا تو وہ دونوں اُن کے برابر آکر بولے "میم صاحب یہ بٹوا اور چھتری ادھر لائیے" انھوں نے صیدِ گرفتار کی طرح گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اپنے کو آبادی سے دور اُن کے بس میں پایا۔ انگریزی تعلیم نے جہاں خرابیاں پیدا کر دی تھیں وہاں اتنی بھلائی بھی کی تھی کہ ہمت پردہ میں بیٹھنے والیوں سے

کئی گونا زیادہ تھی۔ بلا تکان چھتری گھما کر دونوں کے منہ پر تڑاق تڑاق ماری۔ وہ جھجھک کر پیچھے ہٹے اور یہ بے تحاشا بھاگیں۔ چوٹ کھائے ہوئے حریف جھلا کر پیچھے دوڑے۔ عورت اور مرد کی دوڑ ہی کیا پھر وہ بھی اس وقت جبکہ گاؤن زینت جسم ہو۔ اور ہر بد کی چوبچ سی ایڑی والا جوتا پاؤں میں ہو تھوڑی دور تو نسیم سبک روی بھرتی دکھائی۔ پھر دم پھولنے لگا۔ گاؤن میں پیر الجھا۔ جوتے کی ایڑی کی وجہ سے قدم ڈگمگائے اور یہ منہ کے بل سڑک پر گر پڑیں۔ لب لعلیں کو لہو نے اور لال کر دیا۔ کہ اتنے میں دونوں بدمعاش پہونچ گئے اور ایک نے چھرا نکال کر بھرپور وار کیا۔ پہلو کو زخمی کرتا چھرا گاؤن میں در آیا۔ یہ چیخیں اور پھر اٹھ کر بھاگیں۔ دوسرے نے لپک کر ہاتھ تھاما۔ اور نازک کلائیاں اینٹھ کر بولا "بس اب بٹوا لاؤ" اتنے میں پہلے نے پھر چھرا تانا۔ دوسرا بولا "بیوقوف ہوا ہے۔ یہ چیز جان سے مارنے کی ہے یا سینے سے لگانے کی؟" اور اس نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر ان کی کمر میں ڈالا۔ یہ پھر چیخیں اور بیساختگی میں دل پر کندہ لفظ زبان پر آیا۔ اور "رعنا رعنا" کی آواز فضا میں گونج اٹھی! خدا کا کرنا کہ وہ بھی قریب ہی تھے۔ اپنا نام سنکر بے تحاشا دوڑے۔ گاڑیبان نے بھی گھوڑے کو چابک لگائی۔ قریب پہونچکر دیکھا تو بہار کو ایک بدمعاش گود میں اٹھائے ہے۔ اور وہ تڑپ رہی ہے۔ یہ للکارتے آگے بڑھے۔ بدمعاشوں نے انکی آواز سنی اور گاڑی پیچھے آتے ہوئے دیکھی تو انھیں جلدی سے گود سے پھینک بٹوہ لے ایک طرف بھاگ نکلے۔ بس بہار گرتے ہی بیہوش ہو گئیں۔ انھوں نے جلدی سے انھیں گود میں اٹھا کر گاڑی میں ڈال دیا اور گاڑیبان سے اسپتال چلو کہکر انکا سر زانو پر رکھکر خود بھی بیٹھ گئے۔

(۱۰)

پروفیسر رعنا نے مرہم پٹی بھی کرائی تو گود میں لئے ہوئے۔ جسوقت پہلو کا زخم باندھا جا رہا تھا تو دل کے قریب انھوں نے اپنا نام کھدا ہوا دیکھا۔ لاکھ ضبط کیا لیکن آنکھوں سے آنسو نکل ہی پڑے۔ وہ اسی طرح بیہوش پڑی تھیں کہ یہ نرسوں کی مدد سے اسپتال سے انھیں اپنے گھر جو قریب ہی تھا لے آئے اور اپنے بستر پر لٹا کر ماں کو لخلخہ سونگھانے کی تاکید کر کے ڈاکٹر شمیم کو ٹیلیفون دینے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ بہار نے آنکھیں کھولیں سہمی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر نقیہہ آواز سے پوچھا "میں کہاں ہوں؟" بڑی بی نے مسکرا کر جواب دیا "پردہ کے حامیوں کے مکاں میں! میرے گھر میں!" اس کی غزالی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ آہ کر کے بولی "اماں میں نے اپنے کئے کی سزا پائی! نہ پردہ سے نکلتی نہ یہ گت بنتی!"

بڑی نے کہا "بیٹا سبق حاصل کرنے کے لئے اتنی تکلیف اٹھانا ضروری تھی خدا کرے اب بھی آنکھ ہو جائے!"

اتنے میں رعنا آگئے۔ اس نے انھیں دیکھا اور آنکھیں چرالیں بڑی بی چپکے سے کمرے سے کھسک گئیں۔ رعنا ان کے پاس آئے اور آہستہ سے بولے "مزاج کیسا ہے؟" بہار نے آنکھیں کھولیں ادہر ادہر دیکھا۔ رعنا پھر مسکرا کر بولے "وہ چلی گئیں!" وہ بھی مسکرا دی اور چپکے سے بولی "پہلو میں درد ہے۔ لیکن دل مسرت سے لبریز!"

"کیوں"

وہ بولی "اس لئے کہ آپ نے جان و آبرو بچائی۔ اب۔۔ اب تو۔۔ شاید اس کی ملکیت سے انکار نہ ہوگا"

یہ بالکل نہ سمجھے اور گھبرا کر استعجاب سے بولے "کیا؟ کہا؟"

اس نے کہا "جس دل پر آپ کا نام کندہ ہے وہ حاضر ہے!"

اللہ رے فلسفیت۔ بولے "یہ نام کس نے کندہ کیا؟"

وہ بولی "انھیں ہاتھوں نے!" پوچھا "کیسے؟" اُسنے بلاٹنگ پیڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا "اسے اٹھائیے" یہ متعجب ہو کر اٹھالائے اس نے سرخیتہ ہٹا کر انھیں دکھا دیا "لکھا تھا" میں نے ہاری مان لی!" اور گاؤن میں ہاتھ ڈال کر ایک پرزے میں لپٹی ہوئی زنگ آلود آلپین نکالی اور کہا "دونوں جگہ اسی سے لکھا گیا۔ اور روشنائی خونِ دل کی تھی۔

یہ ایک مرتبہ کانپے۔ پھر بیساختہ جھک کر ان ہاتھوں کا آلپین سمیت پیار کر لیا۔ اور اُس نے ان کی جھکی ہوئی گردن میں اپنی باہیں حمایل کر دیں اور بولی "میں ہندوستانی بنکر پردہ میں رہوں گی مجھے اب سوائے آپ کے دنیا میں کچھ اور نہ چاہئے للٹر۔ اب تو "پیشانی کی ان شکنوں کو مٹا ڈالئے!"

اُنھوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر پوچھا "تو مولوی بلاؤں"

وہ کچھ شرمائی پھر بولی "اسی حالت میں؟"

پروفیسر نے کہا "ہاں!"

اس نے اپنے ہونیوالے شوہر کے ان مضبوط ہاتھوں کو جنھوں نے زبردستی اس سے اُسکا دل چھین لیا تھا کھینچکر اپنی آنکھوں سے لگالیا اور مسکرا کر بولی "جیسی مالک کی خوشی!"

علی عباس حسینی۔ ام۔ اے

(نگار) یہ فسانہ جناب علی عباس حسینی ام اے کا ہے، جو ہیں لکھنؤ میں ایک استاذ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آجکل میرے اوقات بعض علائق قلب و روح کی وجہ سے ایسی گمشدگی کی حالت میں بسر ہو رہے ہیں کہ مضامین کو بغور مطالعہ کرنے کی اجازت نہیں ملتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کاپیاں میرے پاس آتی ہیں تو بعض اوقات ان میں اس قدر حذف و اضافہ کرنا پڑتا ہے کہ صحت ناممکن ہوجاتی ہے اور بار دگر اُن کی کتابت کی ضرورت پڑتی ہے۔

جسوقت یہ فسانہ مجھے ملا تو میں نے اس کو بھی بغیر دیکھے ہوئے کاتب کے حوالہ کر دیا، لیکن جب کاپیاں سامنے آئیں اور مجھے لفظاً لفظاً اُسے پڑھنا پڑا تو معلوم ہوا کہ اشاعت سے قبل مجھے صاحب مضمون سے گفتگو کر لینا ضروری تھا تاکہ کم ازکم وہ غلطیاں جو فن افسانہ نگاری کے لحاظ سے اس میں نظر آتی ہیں دور ہو جائیں۔

جناب علی عباس حسینی جیسا کہ اُن کے اس فسانہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے بہت ذہین آدمی ہیں، لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ وہ ہنوز اپنے افسانہ کے ہیرو پروفیسر رعنا کی طرح بالکل نوجوان ہیں اور شاید انھیں مشکل سے یقین آئے گا اگر میں یہ کہوں کہ وہ اس افسانہ کے ذریعہ سے اپنے جس مقصد کو پیش کرنا چاہتے تھے اس میں اُنھیں مطلقاً کامیابی نہیں ہوئی۔ فاضل فسانہ نگار نے یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ مردوں عورتوں کا ایک ہی اسکول یا کالج میں تعلیم پانا مضر نتایج پیدا کرنے والا ہے اور اسی سلسلہ میں چونکہ قدرتاً پردہ کی بحث کا آجانا ضروری تھا۔ اس لئے ضمناً یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ پردہ عافیت ہے اور بے پردگی مصیبت کا گھر۔ فسانہ میں جو واقعات اس نتیجہ پر پہونچانے کے لئے درج کئے گئے ہیں وہ صرف یہ ہیں کہ:۔ (۱) پروفیسر رعنا چونکہ دوسرے طلبہ کے ساتھ مس بہار کو بھی پڑھاتے ہیں اس لئے باہم محبت ہوجاتی ہے اور اُس کے بعد شادی۔ (۲) مس بہار

چونکہ بے پردہ پھرنے کی عادی ہیں اس لئے ایک شام کو انھیں دو بدمعاش گھیر لیتے ہیں ۔لیکن اتفاق سے پروفیسر رعنا آجاتے ہیں اور انھیں بچاکر پہلے اسپتال اور پھر گھر لیجاتے ہیں ۔

اگر لڑکیوں کا لڑکوں کے ساتھ تعلیم پانا صرف اسی حد تک مضر ہو سکتا ہے کہ ایک پروفیسر کسی لڑکی سے یا کوئی لڑکی کسی پروفیسر سے شادی کرے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس طریق تعلیم کے محاسن کے اظہار میں اور کیا زبردست دلیل پیش کی جا سکتی ہے ۔ضرورت یہی تھی کہ مس بہار کے اخلاقی انحطاط کو مکمل طور پر دکھایا جاتا اور پھر ایک عام فسانہ نگار کی طرح علی عباس صاحب حسینی کو اختیار تھا کہ اسکی حالت میں ردعمل (Reaction) دکھاکر اصلاح پر آتے یا ایک بلند تخیل رکھنے والے ادیب کی طرح اُس کو ایسی حالتیں رکھکر صرف چند نقوش عبرت چھوڑ جانے پر اکتفا کرتے ۔بے پردگی کی مذمت کے ثبوت میں جو واقعہ انھوں نے پیش کیا ہے وہ ایسا حقیر، ضعیف اور کمتر درجہ کا ہے جو صرف بازاری ناولوں کےلئے موزوں ہو سکتا ہے ۔بدمعاشوں کا کسی خاتون کو گھیر کر زخمی کر دینا، یا اس کی چیزیں اچک لے جانا بلکہ اس سے بھی زیادہ دیگر مکروہ مناظر پیدا کرنا، ایسی باتیں نہیں ہیں جو بے پردگی ہی کی حالت میں رونما ہوتی ہوں ۔ہزاروں اسی قسم کے واقعات پردہ نشین خواتین پر بھی گزر چکے ہیں اور گزرتے رہتے ہیں ۔افراد فسانہ کا جو کیرکٹر پیش کیا گیا ہے وہ حد درجہ نامکمل و ناقص ہے ۔اور خصوصیات سیرت کے لحاظ سے جو گفتگو اُن کی درج کی گئی ہے وہ یکسر عامیانہ ہے

پروفیسر رعنا کو پورا فلسفی اور خشک منطقی بتایا جاتا ہے لیکن اولین ملاقات میں مس بہار سے جس بیباکی و عریانی کے ساتھ گفتگو کرتا ہے وہ صرف غیر فلسفیانہ بلکہ ایک حد تک غیر شریفانہ بھی ہے ۔کم از کم پروفیسر رعنا کی گفتگو کو جو پردہ کا حامی تھا افسانہ کے تاروپود (پلاٹ) کے لحاظ سے حد درجہ مہذب ہونا چاہئے تھا ۔مگر فسانہ نگار نے یہی نہیں کیا کہ اُن کی گفتگو کو ان کی سیرت کے خلاف پیش کیا بلکہ مس بہار کے مکان پر پہونچاکر انھیں بیانو کے ساتھ آزادانہ نچاگوا بھی دیا ۔پروفیسر رعنا نے جو تقریر پردہ کی حمایت میں کی ہے وہ اس قدر سطحی، اس درجہ پامال اور کمزور خیالات پر مبنی ہے کہ ایک فلسفہ کے پروفیسر کیا معنے معمولی پڑھے لکھے آدمی سے بھی اس کی توقع نہیں ہو سکتی ۔

یہ تو وہ بڑی بڑی نقائص ہیں جو سارے فسانہ پر یکساں طور سے حاوی ہیں ۔رہے چھوٹے چھوٹے نقائص ہیں جو زیادہ تر آپس کی گفتگو میں نظر آتے ہیں ان کے اظہار کی ضرورت نہیں، ذوق سلیم اُن کے بے محل ہونے کو آسانی سے سمجھ سکتی ہے ۔مس بہار زخمی ہوکر پروفیسر رعنا کے مکان پر غشی کی حالت میں پہونچتی ہے اور جب آنکھ کھولکر وہ تعجب سے سوال کرتی ہے کہ میں کہاں ہو تو پروفیسر رعنا کی ماں جواب دیتی ہیں کہ "پردہ کے حامیوں کے گھر میں"۔ یہ وقت ہرگز طعن و تشنیع کا نہیں ہو سکتا تھا ۔ اس جواب سے علی عباس صاحب نے پروفیسر رعنا کی ماں کی سیرت کو کافی نکرزہ کر دیا ہے ۔ الغرض یہ فسانہ پلاٹ کے لحاظ سے ناقص، سیرت نگاری کے لحاظ سے متباین الاقوال، افراد کی گفتگو کی حیثیت سے یکسر عامیانہ ۔اور زبان کے لحاظ سے بہت ژولیدہ ہے

تخیل اور انداز بیان البتہ کہیں کہیں ضرور پرلطف ہے ۔امید ہے کہ جناب عباس حسین صاحب میری اس تنقید کو تنقیص نہ سمجھیں گے بلکہ دوستانہ مشورہ سمجھکر آئندہ ان باتوں کا لحاظ رکھنے کی کوشش کریں گے

نیاز

نقد الشعر

سلسلہ کے لئے

(ملاحظہ ہو نگار ماہ دسمبر ۱۹۲۶ عیسوی)

مناقضہ و تناقض تمام کلام میں یہ ہے کہ دوسرے معنے، اول معنے کے منافی استعمال کئے جائیں جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:-

درش بخشم بوسہ ندہر جور کند

بدرم جامہ کہ بوسہ نفر دشد بدرم

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں تناقض کی یہ صورت ہے کہ پہلے میں شاعر بخششِ درم کا ذکر کرتا ہے۔ دوسرے میں بیع و شرا کا معاملہ پیش کرتا ہے۔

بعض ناقدانِ فن کے نزدیک تاویل بعید کے اعتبار سے یہ شعر اس سقم سے پاک ہے ان کے نزدیک یہ معنے ہوں گے کہ اگر درم بخشتا ہوں تو بوسہ نہیں دیتا، اگر چاہتا ہوں کہ خرید لوں تو بعوض درم بیچتا نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ مطلب شعر کے ظاہری الفاظ سے بغیر تاویل کے پیدا نہیں ہوتا اس لئے اس کا دامن "سقم" سے پاک نہیں ہو سکتا۔ ایک شاعر کہتا ہے:-

ہجرانِ تو با مرگ برابر کنم زیراک

از مرگ بتر باشد ہجرانِ تو دانی

پہلے مصرع میں ہجراں کو شاعر نے مرگ کے برابر کہا ہے دوسرے میں مرگ سے بتر کہتا ہے۔

انوری کہتا ہے:-

اے ملکِ تراعرصۂ عالم سبر کوئے

وز ملک تو تا ملک سلیماں سر موئے

پہلے مصرع میں ممدوح کے ملک کو انوری نے وسعتِ عالم سے زیادہ قرار دیا ہے۔ دوسرے میں ملکِ سلیماں سے کم۔ یہ درست نہیں ہوتا۔ بعض کے نزدیک اس کا نام نزول فی المدح ہے، اس صورت میں اس کے معنے میں تناقض نہیں بلکہ انوری کا مدعا یہ ہے کہ ممدوح کے ملک سے سلیماں کا ملک کم ہے۔ باوجود اس کے کہ سلیماں کے ملک کی وسعت وحوش و طیور کو بھی شامل ہو اس کا یہ اغراق اور مبالغہ ہے۔

بہرحال یہ شعر شائبہ و شک تناقض سے خالی نہیں باوجودیکہ اس کی تاویل بھی کی گئی، ہمارے خیال میں جو شعر تاویل اور تعبیر کا محتاج ہو وہ معیوب ہے۔

تضمین تضمین کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم تو یہ ہے کہ شعر اول معنے کے اعتبار سے بالکل دوسرے شعر سے متعلق ہو، اس شعر کا نام مُضَمَّن ہے۔

"ضمان" شریعت میں خاص قسم کے مال اور دَین کو کہتے ہیں۔ یہ صورت بھی عیب کی مشہور ہے۔ استادانِ فن کے نزدیک ہر شعر کو بجائے خود مستقل ہونا چاہئے اور باعتبار ترتیب معانی، دتنیق کلام ایک دوسرے سے تعلق نہ رکھیں۔ جن اشعار میں اس قسم کی خصوصیت جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر معیوب سمجھے جائیں گے یہ صورت اشعار عرب میں زیادہ ہے۔ مثلاً:—

لما بث للاظعان وَلّت ام لرس

م مقفرا وحش منهم ودرس

اس شعر میں پہلا مصرع "لرسم" تھا لیکن اس کو ٹکڑے کرکے پہلے میں صرف "لرس" رہنے دیا اس کا قافیہ دوسرے مصرع میں "درس" رکھا اور "میم" کو اس کے متعلق کر دیا۔

یہ صنعت یعنی صنعت قبیح ہے، عربی میں بھی استادانِ فن بنظر استحسان نہیں دیکھتے لیکن جا بجا استعمال کرتے ہیں، فارسی میں اس کا استعمال ہزلیات اور ظرافت کے علاوہ مذموم ہے

ایک شاعر نے اسی صنعت مضمن میں اسی اعتبار سے ذیل کے اشعار کہے ہیں:—

شادماں باد مجلسِ مستو — فی مشرق حمید دیں آجو
ہری آں صدر کز جواہر آل — فاظِ او اہل دین ودانش دو
مست تفاخر کنند وجلے تفا — خر بود زآنکہ زاں جواہر طو
قی مرصع شود بگرد ل آب — ناسے ارباب فرد زینت ودرد
نق آں طوق ہر کہ یافت براص — حاب دیوان ودیں بود مستو
لی با قبال وجاہ مجلس مے — مونِ روز انک کلکِ دست صنو
بر بستان نظم ونثر دمعا — ملتِ ملک ودیں داز ہر نو
عے کہ جوئی درو بست حیلہ دہا — زبانست مثلِ رو مستو
فی زہے خط دخامۂ تو مسل — سل ومشکیں چو زلف لعبتِ لو

شادو زو شاد مشد بخطِ تو دی

دآنِ شاہ نو زینت شادی نو

توقیت معنوی اس قدر ناقص نہیں کہ اس کا شمار عیب میں ہو بلکہ اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے کہ اس کا استعمال بالکل نادر اور شاذ ہے۔ مثال کے طور پر "مسعود سعد" کے اشعار دیکھئے:-

جواد کفی عادل ولی کہ در قسمت — ز ظلم و بخل نیابد نصیب او الّا کہ
کہ جام بادہ بہ ساقی دہد ز دست تہی — بہ تیغ سر بزند کلک را نکرد خطا

معزی کہتا ہے:-

آواز تو خوشتر ہمہ روئی — نزدیک من اے لعبت فرخار
ز آواز نماز یا ندا دیں — در گوش غمین مرد بیمار

ان دونوں مثالوں میں معنوی اعتبار سے ہر پہلا شعر دوسرے شعر میں اس قدر ملحق ہے کہ بغیر اُن کے مفہوم و مقصد شاعر سمجھ میں نہیں آتا بعض متکلفین شعراء نے اس کا نام استدراک رکھ کر جائز کرنا چاہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصولاً دونوں صورتیں قبیح ہیں

تضمین کی دوسری قسم یہ ہے کہ کوئی شاعر کسی دوسرے شاعر کا کوئی مصرع یا شعر لیکر اس میں اپنا شعر ضم کرے، لیکن شرط یہ ہے کہ عذوبت اور شیرینی میں فرق نہ آنے پائے۔ بلکہ دونوں ٹکڑے ایک معلوم ہوں۔

رشید نے عنصری کے مصرع کو لیکر اپنے مصرع میں اس طرح ضم کیا ہے کہ پتا لگانا اور ایک کو دوسرے سے جدا کرنا دشوار ہے:-

منور تیغ تو آثار فتح و گفت فلک — چنین نماید شمشیر خسروان آثار

دوسری احتیاط یہ بھی ہے کہ "شاعر" اس کا اظہار بھی کر دے کہ "میں تضمین کر رہا ہوں یہ مصرع یا شعر فلاں شاعر کا ہے۔

انوری کہتا ہے:-

دریں مقابلہ یک بیت ارزنی بشنو — نہ از طریق تنحل بوجہ استدلال
زمرد و گیہہ سبز ہر دو ہم رنگ اند — ولیک زین بنگین داں کنند وزان بجوال

عدول

اس کی چند صورتیں ہوتی ہیں۔

صحت وزن یا درستیٔ قافیہ کے لئے "شاعر" اپنے شعر میں "لحن" کا لحاظ کر کے خطائے لفظی و معنوی کو جائز رکھے پھر بھی عیب میں شمار ہوگا۔ اگرچہ اس کے جواز کے دعوے کے لئے "یجوز للشا ع " کی دلیل بھی لائی جائے لیکن بقول قدیر ازی اس عیب کے لئے زبان عربی کا ہنر درکار ہے، کیونکہ شعرائے عرب کلام منظوم کے واضع اور موجد ہیں، زبان عربی میں وسعت بھی بہت ہے، اس لئے قیاسات لغوی کی نوعیتیں بھی بکثرت ہیں، صرف و نحو کا تصرف بھی نسبتاً اس زبان میں زیادہ ہے۔ اس لئے اگر شعرائے عرب اس قسم کے خط و خال حسن شاعری میں پیدا کر سکیں تو اباحت کی حد میں ہوں گے۔ فارسی اور اس کے مقلد اردو کے شعرا کا یہ منہ نہیں ہو سکتا۔ "سیبویہ" کی رائے "ابن بدعت" کے متعلق یہ ہے کہ "شعرائے عرب جو کچھ تغیرات اور ترمیمات جائز رکھتے ہیں ان کے

مواقع سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ ان کے پاس ہر دعوے کی دلیل ہوتی ہے۔ اس کے خلاف اُن کے مقلدین ہیں جن کے بساط دلیل میں تقلید کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔

ہمارے ایک دوست اکثر مواقع پر کہا کرتے ہیں کہ فلاں شاعر فارسی نے یہ لکھا ہے لہذا اُن کو اردو میں بھی لکھنا چاہئے۔ ایسی ناقص دلیل ہے کہ دعوے کو اپنے حال پر قائم نہیں رکھ سکتی۔

قیس رازی نے اس موقع پر حسب ذیل نہایت معقول صلاح دی ہے :-

"شاعر مفلق" و صاحب سخن حاذق کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنی نظم کو نثر سے بالکل مختلف نہ کردے، فارسی اور تازی کلمات جو حکایات سلیس اور خطب و رسائل میں مذکور ہیں اپنی نظم میں استعمال کرے۔ ارباب فضل و اہل طبع کی پیروی کرے ایسا نہ کرے جیسا کہ آج کل اردو کے شعرا فارسی پر یا خود زبان اردو پر ظلم کر رہے ہیں، تراکیب عجیب، الفاظ غریبہ، محاورات ثقیلہ آج کل سند قابلیت ہے۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو زبان اردو کا جنازہ اُٹھ جائے گا۔

زیادات

یہ بھی مہلک سقم ہے، اس کی مثال "بہرامی" کے شعروں میں دیکھئے :-

چگوئی کز ہمہ خراں جنو بودست کس نیزا
نہ ہست اکنوں و نہ باشد و نہ بودست ہرگیزا

نگاہ خشم او، گوہر شود ہمرنگ شونیزا
جنو خوشنود باشد من کنم ز انفاس قرمیزا

ان اشعار میں تشبیہات بارد، استعارات رکیک، تراکیب نامہذب کے علاوہ دو عیب ایسے ہیں کہ ان کے بیان سے چشم پوشی کرنا "علم شعر" پر نا قابل معافی ستم ہوگا :-

اوّل۔ لفظ "ہرگز" میں "ی" کا اضافہ یعنی اسکو "ہرگیز" کہنا۔ اسی طرح "قرمز" کو "قرمیز" استعمال کرنا ہے۔

دوم۔ الف اشباع کا اضافہ۔

یہ دو غلطیاں اور غلطیوں کے ساتھ لفظی ہیں، معنوی استقام ان پر مستزاد ہیں۔ بہرامی صاحب فرماتے ہیں کہ :-

ممدوح کو جب غصہ آتا ہے تو گوہر صاف و شفاف سیاہ اور بے نور ہو جاتا ہے اور جب خوش نظر آتا ہے تو میں اپنے سیاہ چہرے کو سُرخ کر لیتا ہوں، بہرامی صاحب نے ممدوح کی خاطر سے اپنے کو سیاہ رو کہہ ڈالا

فیروز مشرقی کہتا ہے :-

نوحہ گر کردہ زماں چنگ حزیں از غم گل سرے بکشادہ و بر روے زناں ناخونا

"ناخن" کو کھینچ کر "ناخون" بنادیا۔

رودکی کہتا ہے:۔ بوونے بودے بیا اکنوں کہ

رطل بر کن مگوے بیش سخون

سخن کی بات بڑہاکر "سخون" کردیا۔

ازرقی کہتا ہے:۔ بمدح ناکساں نکنم کنہ بر بنیز — زاں باک نایدم کہ بود کہنہ پیرہن

"نیز" پہ "بہ" بڑہاکر بنیز کردیا۔

خاقانی صاحب فرماتے ہیں:۔

زاں عقل بدو گفت کہ اے عمّر عثماں

ہم عمّر خیامی و ہم عمّر خطاب

سنائی نے ایک جگہ لکھا ہے۔ بود مر شرع را بدو عمّر

لفظ عُمر کو مشدد کردیا۔ بدترین عیوب شعر ہے۔ علی ہذا القیاس رودکی نے فارسی الفاظ کو اس طرح مشدد کیا ہے

خزّ بجاے علم و خرگاہ — بدل باغ و بوستاں آمد

مور بجاے سوسن آمد باز — مے بجاے ارغواں آمد

خزّ، بجاّے، مےّ کو مشدد کردیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی زیادات لفظی ایسے ہیں جو ابتداے غلط مستعمل ہیں۔ مقلدین آنکھیں بند کرکے تقلید کرتے ہیں اور اس تقلید کو دلیل صحت سمجھتے ہیں:۔

ناگاہیاں، ناگاہ کے معنے ہیں۔ فرداد، فردا کے معنے ہیں، اسی طرح الفاظ دیباہ برناہ۔ دوتاہ۔ آسیاب۔ دریاب ہیں۔

خاقانی کہتا ہے:۔

ہست بہ پیرامنش طوف کناں آسماں — آرے بگرد قطب چرخ زند آسیاب

"آسیاب" اصل میں آس آب تھا۔ اس میں "ی" زیادہ کی گئی۔ کثرتِ استعمال سے "ب" ساقط ہوگئی اس لئے یہ لفظ "آسیا" ہوگیا۔ پس آسیاے باد۔ یا دست آسیا کہنا غلط ہوگا۔ اسی اصول پر خراس کہتے ہیں۔ خر آسیا نہیں کہتے۔ دریا بھی اصل میں دُر آب تھا یعنے دریدۂ آب "کثرت استعمال" سے دریا ہوگیا بعضے متقدمین نے "دریاب" استعمال کیا ہے۔ وہ زیادات میں داخل ہے۔

حذوف بھی عیب میں داخل ہے۔ مثلاً مشدد حروف مخفف کردئے جائیں۔ جیسا کہ سنائی نے کہا ہے:۔

مصطفیٰ را زحال کرد آگاہ یلمزون المطوعین ناگاہ

مطوعین کی "ط" مشدد ہے لیکن ضرورت شعری کی وجہ سے تخفیف جائز رکھی، "اسقاط حروف" بھی مذموم ہے منصور منطقی کہتا ہے:-

باز گرم دل زتو چنانکہ بدام صبر کنم صبر ہرچہ باداباد

"گرم" گیرم کی جگہ ضرورت شعری کی وجہ سے مذموم و معیوب ہے۔
سنائی کہتا ہے:-

آدمی چوں بداشت بست ہمیت ہرچہ خواہی بکن کہ فاصنع مشیت

"فاصنع شیت" مخفف ہے۔ اذا لم تستحی فاعمل ما شئت کا، جو بالکل نادرست اور ناجائز ہے۔ اسی طرح الفاظ خمش مخفف خاموش، فرموش مخفف فراموش، جہن مخفف جہان ننن بجائے نہان شند بجائے شنید معیوب ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس

اس تغیر الفاظ کو بھی اسی زمرے میں سمجھنا چاہئے صراط مستقیم سے بھٹکائے گئے ہوں مثلاً معروفی کہتا ہے:-

بار خدا العبیدلی را چہ بود کز بس پیران سر دیوانہ شد

عبدلی۔ ابو عبد اللہ کی خرابی ہے۔
ابو شکور کہتا ہے:-

آب انگور و آب نیلوفل مر مرا از عبیر و مشک بدل

قافیہ کی رعایت سے نیلوفر بگاڑ کر نیلوفل بنایا گیا ہے۔ اسی طرح الفاظ ہنیز بمعنی ہنوز۔ غنویدں بمعنی غنودن، شنویدن بمعنی شنودن، خفتیدں و چفیدں بمعنی خفتن، رسائدں و ہاندن بمعنے رسایندں و رہایندں وغیرہ مذموم اور مقدوح ہیں۔

خطاہائے معنوی

لفظی غلطیوں کی طرح معنوی غلطیاں بھی عام طور پر ساری و جاری ہیں ان کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

رافعی کہتا ہے:- معطی نشود مردم ممسک بہ تعاطی احور نہ شود دیدۂ ازرق بہ تکحل

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ:- بخیل بزور سخی نہیں ہو سکتا۔ "تعاطی" یعنی عطا باب تفاعل میں اس معنی میں مستعمل نہیں۔ تعاطی کے معنے جرأت اور اقدام کے ہیں۔ اس ارتکاب کا سبب "معطی" کے ساتھ مجانست کا خیال ہوا۔ دوسرا شعر کہتا ہے:-

اے اختر سخا کہ ز سیر نوال خویش ہر روز در سپہر تفاخر کنی قران

اس شعر میں نجوم کے ساتھ تفاخر کنی قران کہا جاتا تو درست ہوتا کیونکہ ستارے کا قران ستارے کے ساتھ ہوتا ہے، بغیر تعیین "مقارن" نہیں کہا جا سکتا۔

باقی ۔۔۔ باقی

کیفی چریا کوٹی

ایک عجیب وغریب خواب

گزشتہ شب کو میں ایک بیحد پیچیدہ مگر بہت دلچسپ مقدمہ اعادۂ حقوق زناشوئی کا طیار کر رہا تھا۔ اسی ادھیڑبن میں رات کے دو بج گئے۔ میں نے کتابیں بند کیں۔ لیمپ کی بتی کم کی اور پلنگ پر سونیکی نیک نیت سے لیٹ گیا۔ ایک عرصہ تک مقدمہ کے خیالات کی منتشر فوج نے نیند کو قریب آنے نہ دیا۔ مگر میں بھی نہایت مستقل مزاجی سے آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ پھر میں کب سو گیا مجھے خبر نہیں۔ .... آنکھ لگی ہی تھی کہ ایک عجیب وغریب خواب کا سلسلہ شروع ہوا جو رات بھر ختم نہ ہوا۔ خواب تو میں نے بہت دیکھے ہیں اچھے۔ برے۔ دلچسپ۔ ڈراونے۔ غرض سب ہی قسم کے اور خاص کر ان راتوں میں جب دسترخوان پر بیٹھکر مکہ میں ضرورت سے زیادہ جھاڑو دیدی ہے مگر ایسا عجیب وغریب خواب میں نے بیسویں صدی میں تو کبھی نہیں دیکھا اور اس کے پہلے کا مجھے ہوش نہیں ———— ایک بہت بڑا لق ودق میدان ہے اور اس میدان میں ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں مردوں اور عورتوں کا ہجوم ہے۔ پہلے تو مجھے یہ دہشتناک خیال پیدا ہوا کہ کہیں یہ میدان حشر تو نہیں ہے۔ مگر جب آفتاب کو آنکھ اٹھاکر دیکھا اور وہ بجائے سوا نیزہ کے کئی کروڑ میل دور دکھائی دیا تو یہ وہم جاتا رہا۔ ہر طرف ایک عجیب شور و ہنگامہ تھا۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بڑے بڑے گروہوں میں لوگ منتشر تھے اور ہر گروہ میں عورتوں اور مردوں کے حقوق و فرائض پر پرجوش مباحثے ہو رہے تھے۔ زنانہ اخبار اور رسالے خوب بک رہے تھے کہیں کسی پلیٹ فارم سے کوئی عورت چیخ چیخ کر اور ہاتھ پٹک پٹک کر مردوں کے خلاف اشتعال انگیز تقریر کر رہی تھی۔ کہیں کوئی مرد کھڑا عورتوں پر جا بجا اعتراضات کی آگ برسا رہا تھا۔ الغرض ہر طرف زندگی اور نہایت متحرک زندگی کے آثار نمایاں تھے میں سخت پریشان تھا کہ یا اللہ یہ کیسا مجمع ہے جس میں اتنی کثیر تعداد میں عورتیں اور بالخصوص کمسن اور شریف لڑکیاں انتہائی لاپروائی اور بیباکی سے منہ کھولے مردوں کے سامنے ادھر ادھر پھر رہی ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ بعض بعض ان میں مردوں سے مباحثہ کیا ہنگامۂ خلاف قانون برپا کئے ہوئے ہیں۔ میں یہ تعجب خیز سین عالم محویت میں دیکھ رہا تھا کہ میری نظر ایک حسین کمسن لڑکی پر پڑی جو جلوس سے پنجاب کے طرف کی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک ڈنڈا اور دوسرے میں ایک کپڑے کا گڈا (مرد کا مجسمہ) لئے ہوئی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد نہایت جوش وغضب کے ساتھ اس گڈے کو گالیاں دے دیکر اسی ڈنڈے سے پیٹنے میں مصروف ہوجاتی تھی۔ اور پیٹتے ہوے ہانپ ہانپ کر ایک پرخروش تقریر بھی کرتی جاتی تھی۔ جس کے چند جملے مجھے یاد رہ گئے ہیں مثلاً ظلم! ظلم! ظلم۔ سب اسی کی ذات سے ہے (گڈا مار اگیا) میرے کو اس کا یقین ہے۔ نہیں۔ میرا اسپر ایمان ہے۔ کہ یہی ہے ہماری آزادی کا چور۔ یہی ہمارے حقوق کا رہزن ہے۔ جہاں یہ اور اس کی قوم ملے اسے مارو۔ چنانچہ خود قرآن پاک میں آیا ہے فاقتلوہم حیث ثقفتموہم۔ (گڈا پھر بہت مارا گیا) پیاری بہنو کیا باریتعالی کے اس ارشاد کے بعد بھی تمھیں اسپر اور اس کی قوم پر جہاد کرنے میں کوئی تامل ہے۔ (ایک زنانی آواز۔ ہرگز نہیں۔) اور بہنو! اگر تم اس کو اور اس کی قوم کو اپنی جہالت کر۔ وری یا اپنے نازک حنائی ہاتھوں کے دکھ جانے کے خوف سے نہ مار سکو تو کوسو! خوب پانی پی پی کر کوسو! ہاتھ اٹھا اٹھاکر کوسو! دامنت پھیلا پھیلا کر کوسو کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس ظالم قوم کو مارنا گو تمام عبادتوں میں افضل ترین عبادت ہے۔ مگر کسی وجہ سے اگر اسے مار نہ سکو تو اسے کوسنے میں بھی ستر ہزار نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ بس میری پیاری بہنو! آؤ ثواب کی طرف آؤ ثواب کی طرف (موذنوں کی طرح دونوں کانوں میں انگلیاں دیکر) حی الی الفلاح حی الی الفلاح۔ .... اور پیاری بہنو! عقلمند بہنو! مظلوم بہنو! حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے کہ اگر سو بھول جاؤ یا دماغ میں درد پیدا ہونے کی وجہ سے تم ظالموں کی اس قوم کو نہ کوس سکو تو انہیں جس طرح سے ہوسکے فرضی قصے لکھ لکھ کر خوب بدنام کرو کیونکہ مستند راویوں سے روایت ہے کہ بدنام کرنے میں بھی چالیس ہزار نیکیوں کا ثواب ملتا ہے .... مظلوم بہنو! میں نے اسی جہاد اکبر کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کردی ہے۔ چنانچہ خود حافظ شیرازی بوستاں میں فرماگئے ہیں:—

باش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

(گڈّا پھر ڈنڈے سے مارا گیا) خوب بدنام کر دو اس کو اور اس کی قوم کو کیونکہ پچھلی مردم شماری میں مردوں کی آبادی میں ۹۹ فیصدی خلیفۃ الشیاطین نکلے تھے۔ (گڈّے کو ایک دھپ مار کر اس کے کان پھر شدید بیدردی سے اینٹھے گئے) پیاری بہنو! ابھی میں نے اور بہت کچھ کہنا ہے مگر وقت تھوڑا ہے اور (گڈّے کے پھر کان اینٹھ کر) ظالموں کی قوم کے اس نمائندہ کو پٹنا بہت ہے۔ لہذا اپنی مختصر تقریر ختم کرتی ہوں۔" عورتوں کے گروہ نے خوب تالیاں بجائیں اور زندہ باش۔ زندہ باش کے پرجوش نعرے بلند کئے .... عورتوں کے اس گروہ میں خال خال کچھ مرد بھی دکھائی دیتے تھے۔ جو قیافہ سے کسی نہ کسی اخبار کے اڈیٹر یا مخصوص نامہ نگار معلوم ہوتے تھے اور جو اس تقریر کو سُن سُن کر حد درجہ محظوظ ہو رہے تھے اور کبھی اپنی ناک کو — کھجا کھجا کر تبسم فرماتے اور کبھی آگے بڑھکر اس لڑکی کی چٹ چٹ بلائیں لینے لگتے تھے .... میں انکی ذہنیت پر فاتحہ پڑھتا ہوا ایک بظاہر خوش مزاج لڑکی کی طرف بڑھا اور اس سے ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ خاتون کون ہیں۔ اور انکی پرورش کس آب و ہوا میں ہوئی ہے؟" اس لڑکی نے مجھے ایک حقارت آمیز نظر سے۔ سر سے پیر تک دیکھا اور کہا: "اور آپ کی پرورش کس جنگلستان میں ہوئی ہے جو آپ فلک نامہ نگاری کے اس ماہتاب شب چار دہم سے واقف نہیں .... مردوں کی جہالت کی کوئی حد و انتہا ہی نہیں۔ اور پھر بھی یہ اپنے تئیں کامل العقل اور ہم کو ناقص العقل کہتے ہیں"

میں :- "اے گلستاں خوش مزاجی کی بہار جانفزا۔ آپ میری جہالت پر ناحق برافروختہ ہیں کیا کروں پردے کی بیہودہ رسم کی وجہ سے میں ہندوستان کی ہر ایک حسین اور کمسن لڑکی کو صورت سے نہیں پہچانتا۔ اب یہی دیکھئے نا کہ مجھے اور در اصل سارے ہندوستان کو اصولاً آپ کو بھی جاننا چاہئے مگر اسے اپنی شوئی قسمت کہوں یا خوبی قسمت میں آپ کو بھی نہیں پہچانتا ——

لڑکی :- (دانت پیسکر) او گستاخ مرد۔ خدا تیری جنس کو اگر کل غارت کرنیوالا ہو تو آج ہی غارت کر دے۔ بجز ہم لوگوں کی دل آزاری کے تم انسان نما درندوں کا دنیا میں کوئی اور کام نہیں۔ اختر جہاں سچ کہتی ہیں کہ جو گت اس گڈّے کی انھوں نے بنائی ہے وہی ہم سب کو تمھاری اور تمھاری ساری قوم کی بنانی چاہئے ......" اور اس کے بعد نیستان نسائیت کی اس بپھری ہوئی شیرنی نے جو جو گل افشانیاں میرے اور میری جنس کے متعلق کی ہیں وہ غالب بھی پیمانہ صہبا سامنے رکھکر نہیں کر سکتے تھے۔ میں ایک مظلوم مرد کی طرح سر جھکائے سنتا رہا اور کبھی جب آتشبازی کے انار سے پھولوں کی بارش شدید ہو جاتی تھی تو میں دو ایک باتیں مسکرا کر اپنی بریت میں کہدیتا تھا۔ مگر اُن بے گنہ الفاظ سے بھی جلتے ہوئے پھولوں کی بارش کی شدت میں یک بیک چوگنی ترقی ہو جاتی تھی۔ اتفاق سے ایک جوشیلے اور تنک مزاج مولوی صاحب جو کچھ عرصے سے میرے پاس ہی کھڑے ہوئے یہ گلابو شتابو کا تماشا دیکھ رہے تھے دفعتاً پٹرول کے پیپے کی طرح بھڑک اُٹھے اور فلک نامہ نگاری کے ماہتاب شب چار دہم اور گلستان خوش مزاجی کی بہار جانفزا (یعنی گلابو اور شتابو) سے مخاطب ہو کر یوں آتش فشاں ہوئے :-

"بس بس! خاموش او بدزبان لڑکیو خاموش! میں بہت سن چکا۔ اب زیادہ سننے کی مجھے تاب نہیں .... خدا کی پناہ! ہماری ہی پسلی سے تم پیدا ہوئیں اور ہمارے ہی سینہ پر تم کودوں دلو! ہماری ہی بلی اور ہمیں سے میاؤں۔ او دیدہ دلیر لڑکیو! اگر دنیا میں کسی جنس کی ضرورت نہیں ہے تو قسم ہے اس ریش مبارک کی (اپنی مختصر مگر عزیز داڑھی پر ہاتھ پھیر کر) تمھاری جنس کی ضرورت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ تمھاری جنس ہے ہی کس مصرف کی۔ سوائے بچہ پیدا کرنے کے دنیا کا کوئی ایسا کام نہیں جو ہم تم سے بہتر اور ہزار اور لاکھ درجہ بہتر نہیں کر سکتے۔ تم لوگ بھلا کس بات پر پھولی ہو۔ اصل تمھارا اکلوتا وصف بچے پیدا کرنا۔ تو اس پر بہت نہ اتراؤ۔ کیونکہ ہمارا خدا تمھارے اس توسط کا بھی محتاج نہیں۔ جس طرح ہمارے جد امجد آدم کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا ساری بنی نوع انسان کو بھی خدا یوں ہی پیدا کر سکتا ہے۔ او گستاخ لڑکیو احسان مانو ہمارے دادا جان آدم کا اور دعا دو ان کو کہ محض اُن کی سفارش پر اور صرف انکی خدمت اور دلجوئی کیلئے تمھاری

نانی جان پیدا کی گئیں اور وہ بھی ہمارے دادا جان ہی کی بائیں پسلی سے ورنہ آج جتنی سا، یاں پہنے مانگ نکالے۔ انگھڑیوں میں سرمہ دانی جھونکے ہوئے تم لوگ ادھر ادھر بغاوت کرتی پھرتی ہو کہیں ایک بھی نہ دکھائی دیتیں۔ عنقا کی طرح لاپتہ ہوتیں اور یاد رکھو کہ اگر تم نے اپنے طور طریقے نہیں بدلے اور اس شور و فساد و بلوے اور بغاوت سے باز نہ آئیں تو اب بھی ہم سب کی متفقہ عرضداشت پر تمھاری جنس کی پیدائش یکقلم مفقود ہو سکتی ہے غضب خدا کا جس جنس سے دنیا کے تمام اولوالعزم انبیا اور جلیل القدر پیغمبر پیدا ہوے ہوں اسی جنس کو تم کوسو کاٹو اور بُرا بھلا کہو......

ڈرو! ڈرو! لڑکیو! خدا کے قہر سے ڈرو! نہیں تو چشم زدن میں دیکھتے ہی دیکھتے تم سب صفحۂ ہستی سے گدھے کی سینگوں کی طرح غائب ہو جاؤ گی اور یہ بھی نہ معلوم ہوگا کہ تم کب آئیں تھیں اور کہاں چلی گئیں" ادھر مولوی صاحب جل جلالہ اسی سلسلے میں کچھ اور آتش فشانی کرنے کا مستحکم ارادہ رکھتے تھے۔ ادھر عورتوں کی ایک زبردست فوج جیسا کہ کی آندھی کی طرح ہمارے اردگرد جمع ہوتی جاتی تھی۔ یورپ کی جنگ عظیم سے ابھی ابھی دنیا نے نجات پائی تھی اور چونکہ دوسری جنگ عظیم کے المناک نتائج برداشت کرنے کی ہمارا تھکا ہوا خستہ حال سیارہ تاب نہیں لا سکتا تھا لہذا میں نے فوراً مولوی صاحب ممدوح کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں ایک طرف کو کھینچکر مجمع سے علیحدہ کرنے لگا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے کسی طرح ٹلتے نہ تھے۔ بہزار دشواری انہیں کھینچکر الگ لے گیا اور ٹھنڈا پانی پلایا مگر مولوی صاحب اسوقت چھوٹے موٹے کوہ آتش فشاں ہو رہے تھے بڑی بڑی مشکلوں سے ٹھنڈے ہوے میں نے انہیں سمجھایا کہ مولوی صاحب آپ تو خواہ مخواہ بگڑ جاتے ہیں۔ آپ لوگوں کے کہے کا کیوں بُرا مانتے ہیں۔ یہ جو کچھ بھی کہیں انہیں کہنے دیجئے کہیں اس سے ہم لوگوں کی عزت جاتی ہے؟"۔

مولوی صاحب:۔ (سیاہ سانپ کی طرح پھنکار مار کر) فونہہ۔ جی بجا فرماتے ہیں۔ آپ لوگ یہ برداشت کریں مگر بندے سے یہ نسائی بدزبان برداشت نہیں ہو سکتا۔........... فو۔ و۔ ہنہ۔...... !"

میں:۔ (مولوی صاحب کی داڑھی میں ہاتھ ڈال کر) اچھا۔ اچھا جو ہوا سو ہوا۔ مولوی صاحب! آپ کو والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس کی آیت کی قسم بس اب آپ خاموش ہو جائیے۔ لڑکیاں ہی تو ہیں۔ ابھی نئی نئی جوانی ہے۔ کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ ابھی یہ کیا جانیں کہ ہمارے حقوق اور ان کے فرائض کیا ہیں۔ جب بال سفید ہوں گے اور سر کسی بڑے دن کے بوے کی طرح ہلنے لگیگا اسوقت ان کو ہوش آئیگا ابھی الکا لڑکپن ہے اور لڑکپن یا آغاز جوانی کی آزادیاں اور بیباکیاں کون نہیں جانتا.......... اور گستاخی معاف ہو تو عرض کروں۔ مجھے تو انکی شوخیاں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں"۔

مولوی صاحب:۔ ہاں صاحب آپ کو بھلی معلوم ہوتی ہونگی۔ ہمیں تو ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔

میں نے مولوی صاحب کو اس مجمع سے ڈیڑھ دو فرلانگ الگ لیجا کر چھوڑ دیا تاکہ پھر واپس نہ آسکیں۔ اور اس کے بعد آگے بڑھا۔ وہاں سے چلتے چلتے ایک مقام پر پہونچا۔ وہاں ایک عجیب شور و غل سنا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ سامنے سے ایک بہت بڑا مجمع چلا آرہا ہے۔ اس میں مرد بھی ہیں عورتیں بھی اور ہر سن و سال کی۔ میں ایک طرف کو ہٹ گیا۔ مجمع سامنے سے گزرنے لگا۔ جب سب قریب آئے تو میں نے دیکھا کہ کسی کا جنازہ ہے۔ اور اسے نہایت جوش و خروش سے نوجوان مرد اور نوجوان عورتیں کاندھا دے رہی ہیں مگر بجائے غم آلود ہونے کے ان کے چہرے کسی قلبی مسرت سے چمک رہے تھے میں سخت حیران تھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے جس کی موت پر لوگ خوشیاں منا رہے ہیں اور گاتے بجاتے جا رہے ہیں خیال ہوا شاید کسی امیر چند گھر نسل کی بڑی بوڑھی کا جنازہ ہو۔ اس مجمع کے آخر میں کچھ مقدس سفید ریش بزرگ۔ کچھ سنجیدہ اور متین انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کچھ بوڑھی شریف مستورات دکھائی دیں۔ ان سب کی صورتیں غمگین اور پریشان تھیں۔ ان کے الجھے ہوے گرد آلود بال ان کی پیشانیوں پر پڑے ہوے تھے۔ اور ان میں سے کچھ لوگ تو آہستہ آہستہ آنسو بہا رہے تھے۔ اور کچھ ڈھاریں مار مار کر رو رہے تھے۔ مجھے ان سب کو دیکھ کر ایک قلبی صدمہ ہوا۔ اور میں سوچنے لگا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے کہ اس جنازہ کے ساتھ کچھ لوگ گا بجا رہے ہیں اور کچھ لوگ آہ و زاری کر رہے ہیں"۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے بڑھ کر ایک انگریزی تعلیم یافتہ شریف صورت صاحب کو سلام کیا اور اُن سے پوچھا "کیوں صاحب یہ کس کا جنازہ ہے اور آپ کس کی موت کا ماتم کر رہے ہیں"

میرے بیہودہ سوال سے ان صاحب کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور ایک گریہ آلود آواز میں انہوں نے جواب دیا۔ صاحبزادے کیا پوچھتے ہو کہ یہ کس کا جنازہ ہے …… آہ! یہ مرحوم پردے خاں رضی اللہ عنہ کا جنازہ ہے۔ ہائے کیا کروں مجھے ابھی تک انکی موت کا یقین نہیں آتا۔ مرحوم ایک عرصہ سے بیمار تھے اور حال میں ان کی علالت خطرناک ترقی کر گئی تھی۔ مگر یہ کسے معلوم تھا کہ وہ دنیا سے یوں سدھار جائیں گے ہم لوگوں نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ کوئی دوا ایسی نہیں تھی جو نہ دی ہو کوئی علاج ایسا نہ تھا جو نہ کیا ہو! مگر۔ آہ ۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

بکے جو گرے تو مرحوم پھر نہ سنبھلے!۔ تیمارداری میں ہم سب لوگ دن کو دن رات کو رات نہ سمجھے مگر …… حالت نہ سنبھلنا تھی نہ سنبھلی! ………
(آنسو پونچھکر) رات کو بیچارے جنت کو سدھارے …… …… وہ تو اچھے گئے …… …… مگر ہم سب کو زندہ درگور کر گئے … ہوا! جو ہوا ہوا "بیچارے زیادہ ضبط نہ کر سکے زار و قطار رونے لگے۔ اُس پر ایک ضعیفہ بولیں۔

" ہائے میں تو پہلے ہی سے کہتی تھی کہ ان موئے انگریزوں کا علاج نہ کرو۔ مریض پر انکا سایہ بھی نہ پڑنے پائے اور کچھ بھی ہو انگریزی دوائیں نہ استعمال ہوں مگر اس وقت کسی نے میری نہ سنی۔ سب انہیں موئے انگریزوں کا جامہ پہنے ہوئے تھے …… آخر کار انکی جان ہی لیکر چھوڑا اور اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے …… … وہ بیچارے اپنی جان سے گئے۔ تمہیں کیا؟ - ارے کچھ دنوں رو پیٹ کر خاموش ہو جاؤ گے۔ اور کیا کرو گے! - سچ ہے تقدیر کے آگے کسی کی نہیں چلتی "

دوسری ضعیفہ: - نہیں بوا! انگریزوں کی دوا سے جو نقصان ہوا سو ہوا۔ یہ سب لڑکے اور لڑکیاں جو اس کا اسوقت خوش خوش جنازہ اُٹھائے لئے جاتی ہیں ان کو ان سے ہمیشہ کا للہی بغض تھا …… … ان کی حالت بُری ضرور تھی مگر ایسی بھی نہ تھی۔ ہو نہ ہو۔ ان سب نے ڈاکٹروں سے ملکر اُن کو زہر دلوا دیا ورنہ انکی بیماری کوئی ایسی مہلک نہ تھی۔ کھانسی بخار کی شکایت ہی تو تھی …… یہ تو موسم کی تبدیلی سے اکثر ہو ہی جایا کرتی ہے اور آب و ہوا کی تبدیلی سے جاتی رہتی ہے۔ !! تم کچھ بھی کہو۔ مجھے یقین ہے کہ مرحوم کو زہر دیا گیا اور ضرور دیا گیا "

میں: - (تعجب سے) مگر آخر ان لوگوں کو مرحوم سے ایسی جلن اور دشمنی کیوں تھی؟

وہی تعلیم یافتہ بزرگ: - میاں جلن اور دشمنی کیوں نہ ہوتی۔ ان ہی کی وجہ سے تو ان کا سارا کام رکا ہوا تھا۔ ٹینس بیڈمنٹن۔ ہاکی فٹ بال کھیلنے وہ نہیں جا سکتی تھیں! سینما۔ تھیٹر۔ میلوں ٹھیلوں میں وہ شریک نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ یوسف زلیخا بننے میں ان کو رکاوٹیں ہوتی تھیں۔ غرضکہ ان کی غیر محدود آزادی میں پردے خاں مرحوم کی ذات سے سخت خلل پڑتا تھا۔ جیسا کی سے ایک دوسرے سے وہ مل نہیں سکتی تھیں۔ دل امنگیں انکی پوری نہیں ہونے پاتی تھیں۔ کھل کھیلنے کا انہیں موقع نہیں ملتا تھا۔ اسی سے تو ان بیچارے کو زہر دیا۔ اور کس لئے؟ وہ تو کہو اب تک ہم بڑے بوڑھوں کی روک تھام تھی —— ہمارا پاس و لحاظ تھا۔ آنکھوں کا پانی نہیں مرا تھا۔ دلوں سے خدا رسول کا خوف نہیں رخصت ہوا تھا ورنہ یہ سب کب ہی اُنکا کام تمام کر چکے ہوتے …… … اور اب کیا ہے …… اب وہ ان کے جنازے پر شادیانے بجائیں انکی قبر پر ناچیں کودیں۔ رنگ رلیاں منائیں جو کچھ نہ کریں وہ تھوڑا ہے۔ مگر صاحبزادے میری بات یاد رکھنا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ یہی لوگ انکی موت پر ہم لوگوں سے زیادہ پھوٹ پھوٹ کر روئیں گے "

میں: - وہ کب اور کیوں؟

وہی حضرت: - ارے بھئی اس وقت تو ان سب کو جوانی کا جوش ہے۔ آج کل انکی زندگی کی بہار ہے۔ گلابی فضا میں ہر چیز گلابی اور نظر فریب

معلوم ہوتی ہے .... آزادی کو وہ سمجھتے نہیں مگر آزادی کے بت کو پوجنے کے لئے اندھے گرے پڑتے ہیں، اور یہ نہیں جانتے کہ اگر آزادی کی ہوش ربا شراب کو آنکھ بند کر کے غٹ غٹ پی لینے سے پہلے اُسے وہ عقل سلیم کی خوردبین سے دیکھیں تو انھیں اس چھلکتی ہوئی شراب کے ہر قطرے میں سیکڑوں اور ہزاروں مکروہ اور زہریلے کیڑے نظر آئیں اور بجائے منہ میں لگانے کے وہ اس جام بلوریں کو نفرت سے زمین پر پٹک کر چور چور کر ڈالیں۔ دہوکا دینے اور دہوکا کھانے کے لئے بھلی وہ جو چاہیں رنگ امیزیاں کریں مگر غور سے دیکھیں تو جس آزادی کے وہ مدعی ہیں اس کا دوسرا نام اخلاقی برہنگی ہے .... مگر ابھی یہ سب تھوڑا ہی کسی کو دکھائی دیگا .... ہاں جب بڑھاپا آئیگا۔ بال سفید ہوں گے خون ٹھنڈا پڑجائیگا۔ اور اُن کے بچے اور بچیاں جوان ہوکر اسی آزادی کے دلدادہ ہوں گے جس پر اب یہ جان دیتے ہیں۔ بہ وقت اس شراب کے خمار کی کیفیت معلوم ہوگی۔ اس وقت یہ اپنے کئے پر پچھتائیں گے۔ اور سر پکڑ کر رودیں گے .... اور ابھی کیا ہے؟ .... ابھی تو راوی چین لکھتا ہے"

ان تعلیم یافتہ بزرگ کی یہ بات میرے دل میں تیر کی طرح لگی کیونکہ آزادی کے صحیح مفہوم کی بابت میں اسی وقت کھٹکا تھا جب میں نے ایکمرتبہ چند اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا تھا کہ آزادی بڑی اچھی چیز ہے۔ یہ تو ہم بھی مانتے ہیں مگر سچ پوچھو تو بھئی اپنے گھر کی عورتوں کو ہم باہر نکالیں تو چاہے کچھ بھی ہوجائے اور ہاں یوں تو ہماری دلی آرزو مدتوں سے یہی ہے کہ اور سب عورتیں باہر نکلیں۔ اور آزادی سے سب سے ملے ملائیں۔ یہی صحت کی خرابی۔ تمدن کا اہتمام۔ اور دنیا بھر کی بقیہ فلسفیانہ دلیلیں اور دیدہ زیب منطق یہ تو سب خوبصورت خوبصورت بہانے ہیں۔ جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہماری ہی زندگی میں دوسروں کی عورتیں پردے سے باہر نکل پڑیں۔ پھر کیا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است　　　ہمین است و ہمین است و ہمین است

کا نقشہ ہوگا۔ ہماری ہی زندگی اور خاصکر جوانی میں پردہ اٹھ جائے! ہمکو اسی سے مطلب ہے۔ پھر اس کے بعد کیا ہو کیا نہ ہو۔ ہمکو پروا نہیں جو لوگ ہمارے بعد آئیں گے وہ جانیں انکا کام جانے۔ خوب کھاؤ خوب پیو خوب لطف اڑاؤ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ تم کل ہی مرجاؤ یہی بہترین اصول ہے اور یہی ہر ایک کی زندگی کا اصول ہونا چاہئے بقول ظفر۔

صبح تو جام سے گزرتی ہے　　　شب دلآرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے　　　اب تو آرام سے گزرتی ہے

ان سب باتوں کے سننے کے بعد میرے دل میں یہ خطرہ گزرا کہ اسی قسم کا پاکیزہ فلسفہ کہیں ان لوگوں کا بھی نہ ہو جو تقریروں اور تحریروں میں تو پردہ اٹھا دینے کے نہایت جوشیلے محرک ہوتے ہیں اور جب کوئی اُن سے یہ ٹیڑھا سوال کر بیٹھتا ہے کہ حضرت آپ خود کیوں اپنے گھر کی مستورات کو باہر نہیں نکالتے تو وہ لاجواب ہوکر اپنا کھسیانا سا منہ کھول دیتے ہیں یا کھنکھارتے ہیں اور کھنکھار کر خاموش ہوجاتے ہیں ...."

انہیں تمام خیالی گتھیوں کو سلجھاتا ہوا میں آگے بڑھا۔ بہت دور نہیں گیا تھا کہ مجھے سامنے سے کچھ نوجوان مرد اور کچھ نوجوان عورتیں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ عورتوں کی وضع قطع تراش خراش قابل دید تھی۔ کاندھوں تک تو ان کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ کہنیوں کے ذرا اوپر ایک ہلکا سا سوتے کا کڑا پہنے ہوئے تھیں گلے اور سینہ کے نصف سے زیادہ حصہ کی نہایت آزادانہ نمائش ہورہی تھی۔ بال اُن کے پیچھے سے کٹے ہوئے تھے۔ واجد علی شاہ مرحوم کے درباریوں کی طرح شریٹے رکھے ہوئے تھیں۔ انکی بھنویں اور پلکیں سیاہ اور ہونٹ اور رخسار سرخ رنگے ہوئے تھے۔ اور دانت بہت خوبصورت مگر سب مصنوعی تھے۔ اور اُن کی خوبصورتی دکھانے کی دردناک خواہش کیوجہ سے وہ باربار اپنے منہ کو اس کان سے اس کان تک چیرنے کی کوشش کرتی تہیں یعنی مسکراتی تھیں۔ ساریاں انکی نفیس اور بیحد مہین ریشم کی تہیں۔ ایسا مہین ریشم کہ آفتاب و ماہتاب کی شعاعیں بلا تکلف اور بلا روک ٹوک ادہر سے اُدہر اور ادہر سے ادہر آجا سکتی تھیں۔ قدرتی حسن کی دلفریبی میں انسانی دستکاری

اپنی ہلکی نظر فریب نقاب سے اور چار چاند لگا رہی تھی۔ الغرض وہ عورتیں کیا تھیں اچھی خاصی رنگی ہوئی متحرک نیم برہنہ تصویریں تھیں! وہ بے حجاب پھر رہی تھیں۔ اپنے دیو زاد ساتھیوں کی بغل میں ہاتھ ڈالے ہنسی مذاق کرتی۔ لجاتی۔ اٹھلاتی۔ بل کھاتی۔ مسکراتی چلی آرہی تھیں۔ میں دہقانیوں کی طرح منہ کھولے ٹکٹکی لگائے حیرت کا پتلا بنا دیکھتا رہا۔ وہ آئیں بھی اور گزر بھی گئیں اور مجھے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب آئیں کب گزر گئیں...... جب ذرا مجھے ہوش آیا تو میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کس ملک کی عورتیں تھیں تو اس نے جواب دیا: "تم جانتے نہیں۔ یہ ۱۹۵۵ء کے ہندوستانی شریف گھرانوں کی تعلیم یافتہ خواتین ہیں" میرا دل و دماغ حیرت و استعجاب۔ غیرت و شرم کے صدمے سے ہل گیا اور میں خواب ہی میں دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ یہ حقیقت نہ ہو خواب ہو۔ اگر ہماری قوم کی تہذیب کا معیار اور ترقی اور تعلیم کا نقطۂ عروج یہی ہے تو یا اللہ ۱۹۵۵ء کے قبل ہی یہ ملک بحر ہند یا خلیج بنگال کی موجوں کے نیچے آجائے تو اچھا۔" قریب ہی ایک چشمہ تھا۔ وہاں میں نے پانی پیا۔ منہ دھویا۔ اور اپنے منتشر حواس خمسہ کو مجتمع کرکے پھر آگے بڑھا۔ بہت دور نہیں گیا تھا کہ میں نے ایک بلند اور عالیشان عمارت دیکھی۔ اس کے اندر آنے جانے والوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ مرد بھی تھے عورتیں بھی اور سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں۔ میں بھی وہاں پہونچا اور گھستا ہوا کہنیاں مارتا ہوا۔ لوگوں کے پیروں کو کچلتا ہوا ایک عظیم الشان کمرے کے اندر داخل ہوا۔ کمرہ کم از کم ساٹھ فٹ اونچا تھا اور اس کی چوڑائی ساڑھے تین سو فٹ اور لمبائی پانچ سو فٹ سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ اس میں بھی خلقت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ بلا مبالغہ تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ کمرے کے ایک سرے پر تقریباً ۱۰ فٹ اونچا ایک چبوترہ تھا جس کے اردگرد لوہے کا خوبصورت کٹہرا لگا ہوا تھا۔ چبوترے کے بیچ میں ایک عالیشان کرسی اور میز رکھی ہوئی تھی۔ ادھر اُدھر عمّال دست بستہ کھڑے تھے۔ کرسی خالی تھی۔ لوگ اس کرسی کی طرف پنجوں پر کھڑے ہو ہو کر اور سارس کی طرح گردنیں نکال نکال کر دیکھ رہے تھے۔ ایکبارگی چبوترے کے ایک طرف کا دروازہ کھلا اور ایک نہایت جسیم و شحیم۔ قدآور۔ بارعب۔ قوی ہیکل بزرگ آفتاب کی کرنوں سے بنی ہوئی عبا پہنے اور دستار باندھے ہوئے کمرے میں حاکمانہ انداز سے داخل ہوئے۔ انکی داڑھی بہت لمبی سفید اور نورانی تھی۔ آنکھیں بہت بڑی۔ خوبصورت چمکدار اور پُرجلال تھیں جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے اللہ اکبر کا ایک پرجوش نعرہ بلند ہوا۔ وہ بزرگ آکر چبوترے کی عالیشان کرسی پر متمکن ہوئے۔

میں نے آہستہ سے پوچھا کہ یہ بزرگ کون ہیں تو ایک شخص نے کہا۔ "یہ امیر القضاۃ ہیں۔ جتنے دعوے اللہ میاں کے اجلاس پر کرنا ہوتے ہیں وہ پہلے ان ہی کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ اور پھر یا تو انھیں خود کرتے ہیں یا اگر وہ بہت اہم اور پیچیدہ ہوئے تو انہیں کسی فرشتہ کے ہاتھ اللہ میاں کے فیصلے کے لئے بھیج دیتے ہیں۔"

اتنے میں امیر القضاۃ نے اپنی گرجتی ہوئی آواز میں کہا "خاموش!۔ اب مقدمات کی کارروائی شروع ہوتی ہے! پکارو۔ مسماۃ حوا خانم بنام آدم خاں۔ کوئی حاضر ہے؟"

نقیبوں نے باواز بلند پکارنا شروع کیا۔ کمرے میں ایک ہلچل پڑ گئی۔ تھوڑی دیر میں ایک کمسن حسین عورت پارسی ساری اور سپید اونچی ایڑی کا لیڈیز شوز پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی چال دیکھکر لوگ حیران تھے کہ یا اللہ یہ عورت ہے یا کوئی نئے قسم کی بطخ! اور اس کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان بیرسٹر صاحب ہاتھ میں مثل لئے نظر پڑے۔ دوسرے دروازے سے ایک قدآور خوش رو جوان مع ایک سنجیدہ سن رسیدہ وکیل کے کمرے میں داخل ہوا۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی بھیڑ دریائے نیل کی طرح پھٹ گئی اور چبوترے تک ایک لمبا سا راستہ بن گیا۔ چبوترے کے داہنی طرف جاکر وہ عورت اور بیرسٹر صاحب کھڑے ہوئے اور بائیں طرف وہ خوش رو جوان اور اس کے سن رسیدہ وکیل صاحب۔

بیرسٹر صاحب:۔ (عدالت سے) حضور۔ مسماۃ حوا خانم مدعیہ حاضر ہے

وکیل صاحب:۔ اور آدم خان مدعا علیہ بھی حضور حاضر ہے

امیر القضاۃ :- ہوں! .... تو کیا اس مقدمے میں صلح کی اُمید نہیں ہے -؟
بیرسٹر صاحب :- (چالاکی سے) حضور ہم تو ہر طرح سے راضی ہیں مگر مدعا علیہ اس قدر ضدی اور بدمزاج شخص ہے کہ کسی عنوان سے کسی شرط پر راضی ہی نہیں ہوتا۔ حضور میری موکلہ پر سخت ظلم ہو رہا ہے۔ اور بالکل عاجز ہو کر اُس نے عدالت میں چارہ جوئی کی ہے۔
وکیل صاحب :- اس قسم کی مہمل اور بے سرو پا بیش بندیوں سے آپ عدالت کو مدعا علیہ سے بدظن نہیں کر سکتے۔ دراصل یہ مدعا علیہ ہی کا کلیجہ ہے کہ وہ مدعیہ کی غیر ذمہ دارانہ عنوانیاں بلا چون و چرا خاموشی سے اَب تک برداشت کرتا چلا آ رہا ہے۔ اور اب بھی مدعیہ اگر مدعا علیہ کے ساتھ رہنے پر راضی ہو تو مدعا علیہ اس کی ہر قسم کی خاطر اور دلجوئی کے لئے دل و جان سے طیار ہے۔
بیرسٹر صاحب :- حضرت۔ ساتھ رہنے کا سوال تو اٹھائیے ہی نہیں۔
وکیل صاحب :- اسی پر میرے لائق دوست کو دعویٰ ہے کہ انکی موکلہ ہر طرح سے راضی ہے۔ معلوم ہو گیا کہ مدعیہ کی طرف سے صلح کی کوشش نہیں بلکہ سب زبانی داخلہ اور قانونی مکاری ہے۔
بیرسٹر صاحب :- (خفا ہو کر) میں ان نا ملائم اور غیر مہذب الفاظ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔
وکیل صاحب :- واقعات کا اظہار، اور مکر و فریب کی پردہ دری عین تقاضائے قانون و تہذیب ہے۔
امیر القضاۃ :- بس! بس! یہ لفظی جنگ ختم کیجئے۔ میں آخری مرتبہ دریافت کرتا ہوں کہ صلح کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟
مدعیہ :- (دگر مچھ کی طرح آنسو بہا کر) دہائی ہے حضور کی۔ میں (مدعا علیہ کی طرف اشارہ کر کے) اس شخص کے ظلم سے نیم جان ہو رہی ہوں۔ میری زندگی تلخ میرا جینا حرام ہو گیا ہے۔
امیر القضاۃ :- کیا ہوا اینگلینت کیا ہوا؟ مدعا علیہ تجھ پر کیا ظلم کرتا ہے؟
مدعیہ :- حضور میرے تمام خداداد حقوق سے انکار کرتا ہے اور میری خداداد آزادی کو مجھ سے زبردستی چھین لینے کی کوشش کرتا ہے۔
مدعا علیہ :- حضور! یہ سب اس کے تریا چرتر ہیں۔ اس کا رونا بناوٹی۔ اُس کے آنسو مصنوعی۔ اس کی شکایتیں سب جھوٹی ہیں۔ حضور اسکے سر پر ولایتی جن سوار ہے اور کچھ نہیں۔
امیر القضاۃ :- اچھا اَب خاموش۔ صلح کی فی الحال کوئی امید نہیں معلوم ہوتی (پیشکار سے) پیشکار مقدمہ کی کارروائی شروع کرو۔
پیشکار :- بہت اچھا خداوند جیسا حکم ہوا!
امیر القضاۃ :- مدعیہ کا عرضی دعویٰ پڑھو۔
پیشکار نے عرضی دعویٰ با آواز بلند پڑھنا شروع کیا۔ عرضی دعویٰ اس قدر دلچسپ تھا کہ میں نے جلد جلد اس کا مضمون یاد کر لیا۔
• جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے عرضی دعویٰ کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

بعدالت جناب اللہ میاں صاحب جل شانہٗ و جل جلالہٗ

مسماۃ حوا خانم زوجۂ آدم خان عمر تخمیناً ۱۹ سال ساکن شہر لاہور صوبہ پنجاب

بنام

آدم خاں ولد لا معلوم پیشہ ڈپٹی کلکٹر عمر تخمیناً ۲۵ سال ساکن شہر لاہور صوبہ پنجاب

دعویٰ استقرار حق و صدور احکام امتناعی

مدعیہ حسب ذیل عرض پرداز ہے :۔

دفعہ (۱) یہ کہ مدعیہ کا نکاح ہمراہ مدعاعلیہ بموجب شرع محمدی و رواج قوم و برادری فریقین بتاریخ یکم جنوری سنہ ۱۹۵۸ء ہوا اور اس وقت سے مدعیہ ہمراہ مدعاعلیہ حقوق زناشوئی ادا کرتی رہی۔

دفعہ (۲) یہ کہ نکاح مذکور کے بعد تخمیناً ۲ ماہ تک مدعاعلیہ نے بہترین برتاؤ رکھا۔ اس کے بعد مدعاعلیہ کے ربط ضبط میں رفتہ رفتہ فرق ہوتا گیا یہاں تک کہ ایک سال کے بعد کوئی ایسا دن یا رات نہیں گذری کہ مدعاعلیہ نے مدعیہ سے بہت چھوٹی چھوٹی اور مہمل باتوں پر حجت اور تکرار نہ کی ہو

دفعہ (۳) یہ کہ فریقین کی باہمی رنجش بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہونچی کہ مدعاعلیہ، مدعیہ کی صورت سے بیزار ہو گیا۔ (حالانکہ مدعیہ کے حسن و جمال کی تعریف زبانی و تحریری اکثر تعلیم یافتہ مردوں نے بارہا تخلیہ میں و نیز پبلک کے سامنے کی ہے جسکا ثبوت مدعیہ بعد میں پیش کریگی)

دفعہ (۴) یہ کہ اب ایک عرصے سے مدعاعلیہ نے مدعیہ سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ اور باوجود طلب و تقاضانہ مدعاعلیہ مدعیہ کا مہر دیتا ہے اور نہ اس کا ماہواری گزارا ادا کرتا ہے۔ مدعیہ کو مدعاعلیہ کے اس ظالمانہ برتاؤ سے بیحد رنج اور تکلیف ہے اور اس کی سخت حق تلفی ہو رہی ہے۔

دفعہ (۵)۔ یہ کہ علاوہ مظالم متذکرہ دفعہ ماسبق کے مدعاعلیہ مدعیہ کے چند ناقابل انکار خدا داد حقوق سے (جن کی تشریح دفعہ دادرسی میں ہے) ازراہ دل آزاری و نقصان رسانی مدعیہ انکار کرتا ہے۔ اور چونکہ مدعاعلیہ کے اس طرز عمل سے مدعیہ کے حقوق پر آئندہ زوال آنیکا قوی احتمال ہے لہذا ضرورت نالش ہوئی۔

دفعہ (۶) یہ کہ بنا مخاصمت دعوی ہذا بتاریخ یکم جنوری سنہ ۵۸ء بروز نکاح فریقین و بعد اس کے جب مدعاعلیہ نے مدعیہ کے حقوق سے انکار کیا یا انکار کرنے کی صورت بنائی یا اس کی نیت کی مدعیہ کو بمقابلہ مدعاعلیہ پیدا ہوئی۔

دفعہ (۷) یہ کہ مالیت دعوی ہذا بغرض سماعت عدالت ہذا مبلغ ایک لاکھ روپیہ ہے مگر چونکہ دعویٰ استقراریہ ہے لہذا صرف مبلغ دس روپیہ کورٹ فیس ادا کی گئی۔

دفعہ (۸) یہ کہ مدعیہ مستدعی دادرسی ہائے ذیل کی ہے۔

(الف) یہ کہ ڈگری استقراریہ و احکام امتناعی دوامی بحق مدعیہ بمقابلہ مدعاعلیہ بدین مضمون صادر فرمائے جائیں۔

(۱)۔ یہ کہ مدعیہ بموجب احکام شرع محمدی پردے کی ہرگز پابند نہیں ہے اور اس کو حق حاصل ہے جہاں اور جسکے پاس اسکا جی چاہے وہ بے پردہ جائے اور مدعاعلیہ کو ان امور میں کسی قسم کی مداخلت یا اعتراض کرنے کا قانوناً استحقاق نہیں ہے۔

(۲)۔ یہ کہ مدعیہ کو اختیار ہے کہ جس قسم کی وہ چاہے پوشاک پہنے خواہ اس سے ستر پوشی ہو یا نہ ہو۔

(۳)۔ یہ کہ مدعیہ کا فرض بچہ پیدا کرنا نہیں ہے۔ اور اگر باوجود نا رضامندی مدعیہ بچہ یا بچے پیدا ہوں تو مدعیہ کو ایسے بچوں کی رضاعت۔ پرورش و تعلیم و تربیت سے کوئی سروکار و تعلق نہ ہوگا۔

(۴)۔ یہ کہ مدعیہ کو اپنے دوستوں سے تنہائی میں ملنے کا پورا حق حاصل ہے۔ خواہ وہ دوست مرد ہوں یا عورت اور مدعاعلیہ کو ان اوقات میں مدعیہ کے قریب آنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

(۵)۔ یہ کہ مدعیہ اپنے احباب مذکور اور خاصکر احباب ذکور سے حسب خواہش خط و کتابت کر سکتی ہے اور مدعاعلیہ کو مدعیہ کے خطوط کے لفافوں کو دور سے بھی دیکھنے کا کوئی حق اور اختیار نہیں ہے۔

(۶)۔ یہ کہ مدعیہ بعدم موجودگی مدعاعلیہ و بغیر ہمراہی مدعاعلیہ اپنے احباب مذکور اور خاصکر احباب ذکور کے ساتھ سیر کرنے یا سینما یا تھیٹر دیکھنے یا ک

اور کام کرنے کے لئے پیدل یا موٹر یا کسی اور سواری پر باہر جاسکتی ہے

(۷) یہ کہ مدعا علیہ کا یہ فرض قرار دیا جائے کہ وہ مدعیہ کے لئے ایک علٰحدہ بنگلہ خریدے یا کرایہ پر لے اور بدون اجازت مدعیہ مدعا علیہ کے بھائی بہن والدین اور دیگر رشتہ داروں کو اس بنگلے کی چہار دیواری کے ایک فرلانگ کے اندر آنیکا یا مدعا علیہ کو انہیں بلانے کا اختیار نہ ہوگا۔

(۸) یہ کہ مدعا علیہ کو ہدایت ہو کہ وہ اپنی تنخواہ کا ۹/۱۰ حصہ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو آفتاب کے غروب ہونے سے قبل تک مدعیہ کے حوالے کردے اور اگر نہ کرے تو مدعیہ کو اختیار ہوگا کہ اس کی کل تنخواہ فوراً قرق کرالے۔

(۹) یہ کہ مدعا علیہ کو بذریعہ حکم امتناعی دوامی داڑھی یا مونچھیں رکھنے سے فوراً ممنوع فرمایا جائے۔ کیونکہ مدعا علیہ کے اس فعل ناجائز سے مدعیہ کی سخت دل آزاری وحق تلفی ہوتی ہے۔

(۱۰) یہ کہ مدعا علیہ کو ممانعت فرمائی جائے کہ بجز مدعیہ کے وہ کسی ۶۵ برس سے کم عمر کی عورت سے قولاً یا فعلاً کوئی سروکار۔ تعلق میل جول یا اتحاد نہ رکھے

(۱۱) یہ کہ مدعا علیہ کو بذریعہ حکم امتناعی دوامی ممانعت فرمائی جائے کہ بجز کم خوردہ بڑھیوں یا کریہ المنظر عورتوں کے کوئی جوان یا قبول صورت عورت بطور خادمہ کے گھر میں نہ رکھے اور نہ رکھنے کی نیت کرے۔

(۱۲) یہ کہ اس امر کا استقرار فرمایا جائے کہ انگریزی قاعدے سے گانا اور ناچنا نہ صرف شرعاً جائز ہے بلکہ طبی نقطہ نظر سے تندرستی کے لئے بیحد ضروری ہے۔ اور ان امور میں مدعا علیہ کو کوئی قولی یا فعلی مزاحمت کرنیکا مطلقاً استحقاق نہیں ہے۔

(۱۳) یہ کہ مدعا علیہ کو ہدایت ہو کہ وہ مدعیہ کو سال میں کم از کم چھ ماہ کے لئے پہاڑ پر بھیجے اور وہاں مدعیہ کی ہر ممکن و غیر ممکن ضروریات کا معقول انتظام کرے۔

(۱۴) یہ کہ مدعا علیہ کو ہدایت ہو کہ وہ ہر اس زیور یا لباس کو جو کوئی عورت مدعیہ کے پاس پہنکر آئے یا جسکو مدعیہ کسی عورت کو پہنے ہوئے دیکھے مدعیہ کی فرمائش کے ایک ہفتہ کے اندر مہیا کردے۔ اور اگر اندر میعاد معینہ مذکور مہیا نہ کرے تو مدعا علیہ اس مدت تک سول جیل میں رکھا جائے جبتک وہ اشیاء مذکور حسب پسند مدعیہ فراہم نہ کردے۔

(۱۵) یہ کہ اگر مدعیہ محض دلچسپی چاہنگیا پہنکر مردوں کیساتھ دریا میں نہائے یا ہاکی یا فٹ بال کھیلے یا مردوں کی طرح گھوڑے پر سواری کرے تو مدعا علیہ مدعیہ کی ان خوش فعلیوں پر کسی حالت میں نہ قولاً یا فعلاً کوئی اعتراض کرے اور نہ اعتراض کرنے کی صورت بنائے۔

(۱۶) یہ کہ مدعا علیہ کو بذریعہ حکم امتناعی دوامی ممانعت فرمائی جائے کہ جبتک وہ مدعیہ سے کم از کم ۲۴ گھنٹے پہلے باتیں کرنے یا اس کے پاس بیٹھنے کی باقاعدہ اجازت نہ لے ہر گز افعال مذکورہ کے ارتکاب کی جرأت نہ کرے

(۱۷) یہ کہ مدعا علیہ کو ممانعت فرمائی جائے کہ وہ ہرگز کسی صورت یا کسی ضرورت سے مدعیہ کو سونے سے نہ جگائے۔

(۱۸) یہ کہ اس امر کا استقرار فرمایا جائے کہ یہ مدعیہ مدعا علیہ پر اسکی غیر فرمانبرداری۔ گستاخی۔ یا تساہل پر مبلغ ایکہزار روپیہ تک جرمانہ کرسکتی ہے۔

(۱۹) یہ کہ مدعا علیہ کو ہدایت فرمائی جائے کہ وہ علاوہ اس وقت کے جب وہ کچہری میں سرکاری کام کر رہا ہو بقیہ اوقات پر مدعیہ کے بنگلے پر حاضر رہے اور بدون اجازت مدعیہ بنگلہ مذکور کی چہار دیواری کے باہر قدم رکھنے کی نیت نہ کرے

(۲۰) یہ کہ منجملہ حقوق مذکورہ دفعہ ہذا کے اگر مدعا علیہ کسی فعل ممنوعہ کا ارتکاب کرے یا کسی فعل محکومہ کو حسب خواہش مدعیہ سرانجام نہ دے یا مدعیہ کے انہی حقوق سے انکار کرنے کی صورت بنائے تو مدعیہ کو اختیار ہوگا کہ مدعا علیہ کو فوراً طلاق دیدے اور اس کی تنخواہ حال و آئندہ اور اس کی کل جائداد منقولہ و غیر منقولہ بلا استثناء کسی شے وحق کے اسوقت تک قرق کرکے اپنے قبضہ و تصرف میں رکھے جبتک مدعیہ کسی دوسرے مرد سے حسب منشاء شرع حسب [illegible] نکاح ثانی نہ کرلے۔

(ب) یہ کہ خرچہ مقدمہ مدعیہ کو مدعاعلیہ سے دلایا جائے۔
(ج) یہ کہ دیگر یا مزید دادرسی جو بنظر حالات و نوعیت مقدمہ ہذا اقرین انصاف عدالت ہو مدعیہ کو بمقابلہ مدعاعلیہ عطا فرمائی جائے۔

فدویہ مسماۃ حوا خانم معروضہ یکم جنوری ۱۹۶۰ء

عرضی دعوے کو پڑھکر امیر القضاۃ ایک گہرے سوچ میں پڑ گئے۔ اور دیر تک خاموش رہے۔ پھر سر اٹھا کر مدعیہ سے پوچھا۔ "حوا خانم! کیا یہی وہ ناقابل انکار خداداد حقوق ہیں جن سے مدعاعلیہ انکار کرتا ہے اور کیا یہ وہی ناقابل انکار خداداد آزادی ہے جسے مدعاعلیہ تم سے چھیننے کی کوشش کرتا ہے"

حوا خانم:- (ہاتھ جوڑکر) جی حضور۔ انہیں حقوق اور اسی آزادی سے یہ ظالم انکار کرتا ہے (خوبصورت آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لاکر) حضور خود فیصلہ فرمائیں۔ ظلم کی کوئی انتہا ہے۔ میں تو نیم جان ہو رہی ہوں۔ میری جوانی برباد میری زندگی حرام ہوگئی ہے۔ ہو! ہو! ہو! ہو!۔ یہ کہکر بیچاری مظلوم حوا خانم زار و قطار رونے لگی۔

امیر القضاۃ:- حوا خانم رو نہیں تمہارے اس مقدمہ کا فیصلہ صرف خدا کر سکتا ہے جس نے بقول تمہارے یہ حقوق اور آزادی تمہیں دی ہے۔ لہذا آج یہ مقدمہ ہم ملتوی کرتے ہیں اور اللہ میاں سے استفسار کریں گے کہ وہ اس کا خود فیصلہ فرمائیں گے یا میرے سپرد کریں گے۔ آئندہ پیشی پر تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ اس مقدمہ میں کارروائی کہاں ہوگی! فریقین کو پیشی آئندہ کی تاریخ کی اطلاع کر دو۔ اجلاس برخاست ہوتا ہے"

یہ کہکر امیر القضاۃ کھڑے ہو گئے۔ اور جس دروازے سے تشریف لائے تھے اسی دروازہ سے باہر چلے گئے۔ کچہری برخاست ہونے پر سارا مجمع منتشر ہو گیا اور میں بھی مسماۃ حوا خانم کو ایک آخری رخصتی نگاہ سے دیکھکر اُن کی مظلومیت انکے خداداد حقوق اور خداداد آزادی کے پامال ہونے کے مسئلے پر غور کرتا ہوا عدالت کے کمرے سے نکلا دور سے مجھے ایک نہر دکھائی دی۔ اور میں اسی نہر کی طرف تفریح کے خیال سے روانہ ہو گیا جب میں نہر کے کنارے پہونچا تو مجھے اس کے اردگرد کسی آبادی کا نشان نہ دکھائی دیا۔ بجز میرے نہ وہاں کوئی آدم تھا نہ آدم زاد مگر نہر کے کنارے اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا الفریب قدرتی مناظر کا لطف اٹھاتا نہیں معلوم کتنی دور چلا گیا۔ یک بیک مجھے کچھ عورتوں کے کھلکھلا کر ہنسنے اور قہقہہ لگانے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک کر ادہر ادہر دیکھنے لگا مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔ اتنے میں پھر وہی آواز فضا میں رقص کرتی ہوئی میرے کانوں میں پہونچی اب مجھے احساس ہوا کہ وہ آواز نہر کے اسی کنارے سے جس کنارے پر میں تھا آرہی ہے۔ میں آگے بڑھا۔ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ میں نے نہر کے کنارے ایک ایسا ہوشربا اور جاذب قلب دلنظر منظر دیکھا کہ میں دم بخود ہو کر تصویر حیرت بنا جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔

میں نے دیکھا کہ نہر کے کنارے سنگ مرمر کی نہایت صاف شفاف اور بے انتہا خوبصورت سیڑھیوں کا ایک سلسلہ ہے جو اوپر سے لیکر دریا کے پانی کے نیچے تک چلا گیا ہے اور ان سیڑھیوں پر چالیس یا پچاس مختلف سن و سال کی عورتیں ہیں اور یہ سب مادر زاد برہنہ ہیں قسم کھانے کو بھی سر سے پاؤں تک اُن کے جسم پر کپڑے کا ذکر کیا ایک تار یا دھجی تک نہ تھی۔ اُن کے لمبے لمبے سیاہ سیاہ بال کسی کی کمر کسی کے پیروں تک لٹکتے ہوئے ہوا میں لہرا رہے تھے حسن و جمال اُن پر ختم تھا۔ بہترین بت تراشوں کی نقاشیاں ان حسین جادوگرنیوں کے سامنے گرد تھیں۔ مشہور ترین مصوروں کی صناعیاں ان ماہ پیکروں پر قربان کی جا سکتی تھیں۔ میں نے بچپن میں پریوں کے قصے بڑی بوڑھیوں سے سنے تھے اور قصے کہانیوں کی کتابوں میں پڑھے بھی تھے مجھے اُن کے وجود کا اقرار نہ تھا بلکہ میں منکر مطلق تھا مگر اس وقت اپنی آنکھوں کی شہادت کو کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ جو آدم زاد پریوں کو دیکھتا ہے پھر وہ بچتا نہیں یا تو دیوانہ ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے میں کچھ خوف۔ کچھ حیرت۔ کچھ اس منظر کی دلفریب جاذبیت کی وجہ سے برف کی ایک مورت کی طرح منجمد ہو کر رہ گیا۔ دل میں میرے بھاگنے کا خیال آیا۔ میں نے ارادہ بھی کیا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے پیروں میں اور نہ صرف

پیروں میں بلکہ سارے جسم میں کسی نے دفعتاً سیسہ بھر دیا ہو۔ پیر اٹھانے یا ہاتھ ہلانے کی طاقت ہی گویا معطل ہوگئی تھی۔ اس پریوں کے غول میں کوئی نہا رہا تھا، کوئی بال سکھا رہا تھا، کوئی گا رہا تھا۔ کوئی ہنس رہا تھا۔ کوئی کیا کر رہا تھا۔ کوئی کیا۔ دفعتاً ایک نہایت حسین کمسن شوخ چشم پری جو اس غول میں کالبدر فی النجوم تھی مجھے دیکھکر چونکی اور پھر انتہائی تعجب سے انگشت بدنداں میری طرف کچھ دیر تک ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی مجھے دو باتوں پر سخت حیرت ہوئی۔ ایک تو یہ کہ باوجود برہنہ ہونیکے مجھے اپنی طرف دیکھتا ہوا دیکھ کر وہ ذرا بھی نہیں جھجکی اور دوسرے یہ کہ اس کو میری طرف اتنی دیر تک دیکھنے کی بظاہر کوئی ایسی خاص وجہ نہ تھی کیونکہ باوجود اپنی ذاتی خوش اعتقادی کے میں کوئی یوسف کنعاں نہ تھا۔ یک بیک وہ خوف زدہ ہوکر چیخی۔ اس کی چیخ پر دس بارہ پریاں اس کے پاس دوڑتی ہوئی آئیں۔ اُس نے میری طرف اشارہ کیا سب میری طرف دیکھنے لگیں اور کچھ دیر تک نظر استعجاب سے مجھے دیکھا کیں۔

وہی پہلی پری:۔ کیا یہ شخص زندہ ہے یا کسی پُرانے مردے کی روح ہے۔

دوسری پری:۔ زندہ تو نہیں معلوم ہوتا۔ ضرور کسی مردے کی روح ہے۔؟

تیسری پری:۔ نہیں! زندہ ہے! اس کی آنکھیں مُردوں کی سی نہیں ہیں۔ اور مُردوں کی روحیں شروع صدی کے انگریزی کپڑے پہنکر نہیں آتیں مگر پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون شے ہے۔

چوتھی پری:۔ (جو ذرا نڈر تھی) چلو نا۔ قریب چلکر دیکھیں۔ آدمی ہی تو ہے۔ شیر تھوڑی ہے جو کھا جائیگا۔

پانچویں پری:۔ توبہ کرو۔ میں تو ہرگز نہ جاؤنگی۔

پہلی پری:۔ (جس نے مجھے شروع میں دیکھا تھا) ہاں! ہاں! چلو۔ قریب سے چلکر دیکھیں۔ پرانے زمانے کی یادگار ہے ضرور دلچسپ ہوگا۔ یہ کہکر باوجود اوروں کی ممانعت کے وہ پہلی پری اور چوتھی پری جو نسبتاً نڈر تھی آہستہ آہستہ میرے قریب آئیں میں پتھر کی مورت کی طرح ساکت و صامت کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ مجھ سے صرف ڈیڑھ یا دو گز رہ گئیں تو میری آنکھیں اُن کے حسن برہنہ کی تاب نہ لا سکیں کی دیکھ نہ سکیں بشرم سے جھک گئیں اور اور پھر نہ اُٹھیں! اسپر وہی پہلی پری تعجب کے لہجے میں بولی۔ زندہ ہے! زندہ ہے! ضرور زندہ ہے۔ آنکھیں اٹھائے دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں کے قریب آنے پر نظر جھکا لی تم نے دیکھا تھا"

مس مکبل[1] (چوتھی پری) ہاں۔ ہاں۔ بہن میں نے بھی دیکھا تھا۔ تم سچ کہتی ہو یہ زندہ ہے۔ اور یہ کہکر وہ دونوں مجھے ایسی دلچسپی اور حیرت سے دیکھنے لگیں جیسے کوئی سیاح کسی پُرانی یادگار کو دیکھتا ہے پھر...... خاتون (پہلی پری) نے کہا "بس بس میں سمجھ گئی یہ شخص بیسویں صدی کی پہلی ربع کا ہے یعنی اسی قسم کی تصویریں میں نے اپنی ہسٹری کی کتاب میں دیکھی ہیں۔ بالکل یہی وضع قطع! ۔ اس زمانے کے لوگ بھی کیسے احمق اور کندۂ ناتراش ہوتے تھے۔ انہیں جسم کو کپڑوں سے ڈھکنے کا مرض تھا۔ سمجھتے تھے یہی تہذیب کا معیار ہے یہی ترقی کی کسوٹی ہے۔ !!! ہا! ہا! ہا! ان احمقوں کو جرمنی کے سو برس بعد فان ہرٹ زاگ کے قانون فطرت کا فلسفہ تو خواب میں بھی نہ دکھائی دیا ہوگا اُسے سمجھنا تو دوسری بات ہے!

مس مکبل:۔ واہ! تم بھولتی ہو! اٹھارویں صدی میں فرانس کے مشہور فلسفی جین جیکو روسے نے مذہب فطرت کی بانگ دی تھی اور بیسویں صدی کی پہلی ربع میں کہیں کہیں اس مذہب کے معتقد بھی پیدا ہوگئے تھے۔

[1] مکبل لفظ مقبول کی ترقی ہے۔

.... خاتون :- ہاں ہاں ہوگا۔ مگر ذرا پوچھئے تو ان احمقوں سے کہ جس حالت میں تمھیں قدرت نے پیدا کیا اسی حالت میں رہنا اچھا اور فطرت سے قریب تر ہے یا مصنوعی کپڑے پہنکر اپنی قدرتی صحت کو خراب کرنا اور اپنے جسم کی قدرتی خوبیوں کو چھپانا ؟..... اور بتاؤ، جبکہ کپڑوں سے جسم کو ڈھکنا ہی تقاضائے حیا ہوتا تو قدرت نے انسان کو کپڑے پہنا کر کیوں نہیں پیدا کیا۔؟ برہنہ کیوں پیدا کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ ہم فطرت سے دور پڑ گئے تھے اور تصنع کے اندھے معتقد ہو گئے تھے۔ پھر جس قدر تہذیب ترقی کرتی گئی ہم فطرت سے قریب تر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک وہ زمانہ آیا کہ زندگی کے صحیح اصول اور آزادی کا صحیح مفہوم ہم پر مثل اور مادی حقیقتوں کے منکشف ہو گیا۔ اور ہم صحیح اور حقیقی معنوں میں تہذیب اور علم کی گہرائیوں سے آگاہ ہو گئے۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ یہی علم و تہذیب کی معراج اور یہی ترقی اور فلسفہ کا نقطۂ کمال ہے۔

جب میں نے ان پریوں کو اردو میں گفتگو کرتے سنا تو مجھے سخت اچنبھا ہوا۔ پھر جب انکی اور باتیں سنیں تو رفتہ رفتہ میرا یہ وہم کہ یہ پریاں ہیں رفع ہوتا گیا یہاں تک کہ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ پریاں نہیں ہیں انسان ہیں۔ اور جس وقت مجھے اس کا یقین ہو گیا اس وقت گو میری حیرت کم نہ ہوئی مگر میرا ڈر جاتا رہا۔ اور میرے جسم میں وہ جمود اور ناطاقتی جو پیدا ہو گئی تھی تدریج کافور ہو گئی۔

..... خاتون :- (مجھ سے مخاطب ہو کر) تم اتنے کپڑے پہنے ہو تمہیں الجھن نہیں ہوتی ؟ تم کیسے رسم و رواج کے بے بس غلام ہو؟ تمہیں شرم نہیں آتی ؟..... ہم کو دیکھو ! ہم کیسے آزاد اور مہذب ہیں -...... ہم نے زندگی کے وہ سربستہ راز دریافت کر لئے۔ جہاں تک کسی کا اب تک وہم و گمان بھی نہیں پہونچا تھا۔ زندگی کا نام آزادی۔ اور آزادی کا نام زندگی ہے اور جس قسم کی تمھاری زندگی ہے وہ حیات وحوش سے صرف ایک درجہ بالا تر ہے۔ اس سے زیادہ قابل ترجیح تو موت ہے۔ تم سمجھتے بھی ہو کہ آزادی کے معنی کیا ہیں ؟

میں نے بولنے کی کوشش کی۔ ایکبارگی میری زبان کھل گئی اور میں نے جواب دیا: اے حسن سحر کاری کی برہنہ تصویر! آزادی کے معنے میں اب تک صرف اخلاقی برہنگی سمجھتا تھا۔ مگر مجھے آج معلوم ہوا کہ جسمانی برہنگی بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

..... خاتون :- (میرے کاندھے پر اک عجیب شان دلربائی سے ہاتھ رکھکر اور مسکرا کر) تو پھر اے ذہین بیوقوف ! تو کیوں یہ ایک گدھے کا بوجھ جسم پر لادے ہے۔

میں :- اس لئے کہ کسی بات پر اڑے رہنا گدھے کے جملہ اوصاف حمیدہ میں سب سے شاندار وصف ہے !

..... خاتون :- (ہنسکر) اچھا تو اب آؤ۔ یہ کپڑے اتار کر پھینکو ! سچی تہذیب کے آفتاب کی روشنی میں چلکر کھیلو زمانۂ جاہلیت کے بہیمانہ اور وحشیانہ خیالات تہ کر کے طاق پر رکھدو۔ مذہب فطرت اختیار کر لو اور انسان کامل بن جاؤ۔ (میری آستین پکڑ کر) چلو۔ اب پس وپیش نہ کرو۔ یہ لباس وحشیانہ اتارو اور ہمارے حلقہ میں داخل ہو جاؤ۔

میں :- (گھبرا کر) مجھے مہلت دو۔ خدا کے لئے مجھے کچھ دیر کی مہلت دو ! میں تمھاری جدید تہذیب کا فلسفہ ابھی کچھ اور سمجھ لوں پھر تمھارے حلقہ میں داخل ہوں۔

..... خاتون :- کسی فلسفے کے سمجھنے کا بہترین طریقہ اس کی عملی تقلید ہے ..... اے سچ کہنا۔ کیا تمھارے زمانے میں واقعی لڑکیاں کپڑے پہنتی تھیں اور کپڑے پہننا تقاضائے حیا سمجھتی تھیں ؟

میں :- ہاں سمجھتی تو تھیں۔ کیسے کہوں کہ نہیں سمجھتی تھیں۔

..... خاتون :- (ہنسکر) تو پھر اگر ہم تمھارے زمانے میں ہوتے تو ہم بہت ہنسے جاتے۔

کا لباس تھا۔

میں :۔ (مسکراکر) ہاں ہنسی تو جاتیں کیونکہ ہمارے زمانے میں لباس عریانی صرف جانوروں کا لباس تھا۔

....خاتون :۔ (ہنسکر) بڑا جاہل زمانہ تھا۔ مگر کیا اس زمانے میں مغربی فلسفہ اور تہذیب ہندوستان میں رائج نہیں ہوئی تھی۔

میں :۔ نہیں تو! رائج تو ہوگئی تھی مگر اس قدر نہیں جتنی کہ آج کل ہے۔ وہ مغربی تہذیب کی ابتدا تھی۔ یعنی اس وقت عورتیں پردے سے باہر نکلنے کی نہایت سرگرمی سے جدوجہد کررہی تھیں۔ اور یہ اس کی انتہا ہے۔

....خاتون :۔ بیشک ہماری آج کل کی تہذیب اخلاقی و معاشرتی ارتقا کی آخری منزل ہے!

میں :۔ آپ بجا فرماتی ہیں آدمیت سے نکل کر نقطۂ کمال تک پہونچنا اور پھر بہیمیت کی طرف لوٹ جانا تہذیب انسانی کا مشہور ارتقائی چکر ہے۔ مگر یہ تو میں نے آپ سے پوچھا نہیں کہ یہ ہے کون سا سن اور آپ کون ہیں اور یہ ملک کس کا ہے۔

....خاتون :۔ ہم ۱۹۹۵ء کے ہندوستان کی جمہوریت کے شریف گھرانوں کی مستورات ہیں

میں :۔ ۱۹۹۵ء ؟ آپ غلطی کررہی ہونگی۔ اس حساب سے تو میری عمر سو سال کے قریب ہوجاتی ہے۔ حالانکہ میرے بال بھی سفید نہیں۔

....خاتون :۔ ہاں اسمیں تو شک نہیں کہ تمھاری عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی مگر اسمیں بھی شک نہیں کہ یہ ۱۹۹۵ء ہے (میرا ہاتھ پکڑکر) اچھا تو پھر چلو۔ اتار و کپڑے۔ چلکر نہر میں نہائیں۔ اور یہ کہکر اس نے اپنی انگلی سے ایک خوبصورت ہیرے کی انگوٹھی نکال کر میرے ہاتھ میں پہنادی

میں :۔ یہ کیا؟

....خاتون :۔ کچھ نہیں۔ اب تم میرے ساتھ چلو۔

میں :۔ (بہانہ کرکے) مجھے اس وقت بیحد ضروری کام ہے میں اسے کر آؤں پھر آپ سے اگر اطمینان سے باتیں کرونگا۔ بس یہی ڈیرھ دو گھنٹہ میں واپس آجاؤنگا۔

....خاتون :۔ (کھلکھلا کر ہنسی) اب تم کہاں جاسکتے ہو! اب تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔

میں :۔ (کچھ پریشان ہوکر) کیوں؟

....خاتون :۔ اس لئے کہ آج کل قانون یہی ہے میں نے اتنی بہت سی عورتوں کے سامنے انگوٹھی پہنادی ہے حالانکہ قانوناً صرف دو مردوں یا ایک عورت کے سامنے انگوٹھی پہنا دینا کافی ہے۔

میں :۔ یہ کیا؟ انگوٹھی پہنا دینے سے کیا ہوتا ہے؟ ہوش کی باتیں کرو۔

....خاتون :۔ میرے بھولے شوہر! تم زیادہ پریشان نہ ہو۔ میں تمھیں رفتہ رفتہ سب سمجھادونگی۔

میں :۔ (حیرت سے) بھولے شوہر؟ یہ کیا؟ تم غلطی کررہی ہو میں تمھارا شوہر نہیں ہوں۔

....خاتون :۔ (مسکراکر) نہیں! تم ہی غلطی کررہے ہو۔ ؟ اور اگر تمھیں اب بھی یقین نہ ہو تو ان عورتوں سے پوچھکر اپنا شک رفع کرلو۔

مس مکھبل اور بقیہ سب عورتیں :۔ (ایک آواز ہوکر) ہاں ہاں ثریا بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ تم اس کے شوہر ہوا اور ہم سب گواہ ہیں کہ اس نے تم کو ہمارے سامنے انتخاب کیا ہے۔

میں :۔ مگر یہ نکاح ہرگز جائز نہیں۔ میں نے ابتک اپنی رضامندی نہیں دی ہے۔

....خاتون :۔ تم کس قدر بھولے اور ناسمجھ ہو! میرا تم کو انگوٹھی پہنا دینا اور تمھارا خاموشی سے انگوٹھی پہن لینا تمھاری رضامندی کا ثبوت ہے

میں :۔ مگر میں اس قانون سے واقف نہ تھا؟ اور نہ عقلاً کوئی قانون ایسا مہمل ہوسکتا ہے!

.....خاتون :- قانون تو یہی ہے ! اور یہ ایک مشہور قانونی اصول ہے کہ قانون سے ناواقفیت کوئی عذر نہیں " میں لاجواب ہوگیا۔ میرا دماغ چکر کھا رہا تھا میں سوچنے لگا کہ یہ تو بڑا غضب ہوا۔ میرے گھر کے لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے ! اور ایسی آزاد خیال بیوی سے شادی کرکے میں تو کسی کو منہ دکھلانے کے قابل نہ ہونگا۔ سخت بدنامی بڑی جگت ہنسائی ہوگی۔ یا اللہ میں کہاں آکر پھنس گیا " دفعتاً میرے دماغ میں ایک تدبیر بجلی کی طرح چمکی۔

میں :- اچھا تو قانون کا جواب قانون سے دیا جائیگا۔ میں نے مانا کہ قانوناً میں تمھارا شوہر ہوگیا اور تم میری بیوی .... مگر چونکہ مجھے طلاق دینے کا بھی حق ہے لہذا اس حق کا فائدہ اٹھاکر میں تمھیں طلاق دیتا ہوں۔

.....خاتون :- (قہقہہ لگاکر) ذہین بیوقوف ! تم کہاں تک مجھ سے کج بحثی کروگے !! ہا ! ہا ! ہا !

میں :- ذہین بیوقوف ! .... تم خود بیوقوف ذہین ہو !

.....خاتون :- (ہنستے ہوئے) سنو ! تم مجھے چھ مہینہ تک طلاق نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد دے سکتے ہو بشرطیکہ میں بھی اسپر راضی ہوں اور میں جب چاہوں تمھیں طلاق دے سکتی ہوں۔

میں :- (خفا ہوکر) یہ بالکل مہمل قانون ہے اور میں اس کا پابند نہیں۔

.....خاتون :- جب تک تم ہماری جمہوریت میں ہو تمہیں اس قانون کا پابند ہونا پڑے گا۔ اور رہی یہ بات کہ قانون مہمل ہے تو یہ کوئی عذر ہی نہیں کیونکہ جب کوئی بات کسی کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔ تو وہ اُسے مہمل کہکر اپنے دل کو بہلا لیتا ہے۔ میرے شوہر ! اب زیادہ کج بحثی نہ کرو تم مجھ سے پیش نہ پاؤگے چلو دیر ہوتی ہے۔

میں :- (لاجواب اور مجبور ہوکر) اچھا تو اب میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم خود مجھے اس قانونی قید سے رہا کردو۔ تم خود مجھے طلاق دیدو کیونکہ تم کہتی ہو کہ تمھیں یہ حق ہر وقت حاصل ہے۔

.....خاتون :- یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر بہت سے حقوق ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا نفاذ نہیں کیا جا سکتا۔

میں :- میں پُرانے زمانے کے وحشیوں کی ایک یادگار ہوں۔ تمھارے کس کام کا۔ تم کو ۲۴ گھنٹہ میں ۲۴ شوہر مجھ سے بہتر مل سکتے ہیں۔ لہذا مجھے طلاق دینے میں تمھارا کوئی نقصان نہیں۔

.....خاتون :- میرے نقصان یا فائدہ کا تم فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہو۔ یہ صرف میرا حق ہے۔ اور تمھارا پُرانے وحشیوں کی یادگار ہونا ہی تمھاری بہترین سفارش ہے کیونکہ آج کل کے مردوں میں خواہ کوئی بھی صفت ہو مگر یہ صفت نہیں ہو سکتی۔

میں :- (زچ ہوکر) اچھا تو پھر میں اسی وضع میں رہوں گا۔ !! تمھاری تہذیب نہیں اختیار کرونگا۔

.....خاتون :- (مسکراکر) یہ کیوں ؟

میں :- (حاکمانہ لہجہ میں) اس لئے کہ یہ میری مرضی ہے

.....خاتون :- ہا ! ہا ! ہا ! تمھاری کوئی مرضی نہیں .... مرضی صرف میری ہے۔ اور میری ہی مرضی تمھارا قانون ہے

میں :- تو کچھ ہو جائے میں کپڑے نہیں اتارونگا۔

.....خاتون :- (مسکراکر) کیوں ؟

میں :- مجھے شرم آتی ہے !

.....خاتون :- (دوسرا قہقہہ لگاکر) شرم ! ———— شرم ہے کس چڑیا کا نام ؟ تم سمجھتے بھی ہو کہ شرم کیا ہے شرم محض ایک خاص خیال ہے جسمیں انسان نے تربیت پائی ہو۔ اسی لئے ہر قوم۔ ہر طبقہ۔ ہر زمانہ اور ہر ملک کی شرم کا معیار اور مفہوم جُداگانہ ہوتا ہے۔ شکسپیر نے کیا خوب کہا ہے کہ دنیا میں نہ کوئی چیز اچھی ہے نہ بُری یہ ہمارا خیال ہے جو اسے اچھا یا بُرا بنا دیتا ہے۔ کس قدر سچا مقولہ ہے۔ اب یہی دیکھو کہ اگر میں تمھارے زمانے میں یونہی آزادی سے برہنہ تن پھرتی تو شاید وہ وحشی لوگ مجھے بے شرم کہتے۔ حالانکہ

آج کل کی تہذیب میں جس خیالی محبوب کو شاعر شرم و حیا کی دیوی کہہ کہہ کر پکارتے ہیں اس کو بھی اشعار میں میری ہی طرح برہنہ باندھتے ہیں۔..... شرم قسم ہے خدائے نفرت کی۔ ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا۔ شرم اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کوئی شخص کسی قول یا فعل کا عادی نہیں ہوتا۔ مگر عادی ہو جانے کے بعد وہی قول یا فعل جس سے شرم کے پسینے آتے تھے انسان بے تکلف اور بے حجاب کرنے لگتا ہے۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ شرم کی خصوصیت ہی کیا رہی.......... بس آج سے میرے سامنے شرم کا فلسفہ نہ بگھارنا۔ کیونکہ شرم و حیا سب زمانہ جاہلیت کے احمقانہ چوچلے ہیں جو خدا خدا کر کے اب کہیں متروک ہوئے ہیں۔

میں:۔ (عاجز آکر) اچھا تو دو چار دن کے لئے تو مجھے یہ کپڑے پہنے رہنے دو۔ اس کے بعد جو کہو گی وہ کروں گا

.....خاتون:۔ خیر اتنی رعایت ہو سکتی ہے۔

میں:۔ بڑی بات۔ اس مہربانی کا شکریہ۔ میری عقل اسوقت کام نہیں کرتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں تم خدا کے لئے مجھے سمجھا دو یہ کیا ماجرا ہے!۔

.....خاتون:۔ اچھا چلو وہیں نہر کے کنارے چلکر بیٹھیں۔ وہیں۔ اطمینان سے بیٹھکر باتیں کریں گے۔ چنانچہ ہم دونوں سنگ مرمر کے زینوں پر جاکر الگ ایک طرف بیٹھ گئے۔ مس مکبل اور بقیہ عورتیں ہم دونوں کو اکیلا چھوڑ کر دوسری طرف چلی گئیں۔

.....خاتون:۔ ہاں تو تم کیا پوچھتے ہو۔

میں:۔ یہی کہ یہ حیرتناک انقلاب ہندوستان کے اخلاق، معاشرت اور تمدن میں کیونکر پیدا ہو گیا۔

.....خاتون:۔ یہ کون بڑی بات ہے۔ سنو جس طرح مادی دنیا میں قانون ارتقا جاری ہے اسی طرح انسانی خیالات تہذیب۔ فلسفہ، معاشرت تمدن۔ اخلاق کو بھی جادۂ ترقی میں ارتقا کی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں۔ دنیا کی زندگی کے کسی شعبہ پر غور کرو۔ یہی قانون کارفرما نظر آئیگا چنانچہ ایک زمانہ تھا کہ عورتیں محکوم و مظلوم تھیں۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ علم و تہذیب کا آفتاب مغرب سے بلند ہوا اس کی تیز شعاعیں ہندوستان کی سرزمین پر بھی ضیا فگن ہوئیں۔ عورتوں کی مجہول زندگی میں آثار حیات نمودار ہونے لگے۔ وہ اپنی ازلی قید بے زنجیر سے آزاد ہونے کے لئے جد و جہد اور کشمکش کرنے لگیں۔ ایک عرصہ تک مذہب کے مستحکم بند نے انقلاب کے سیلاب کو روکا مگر بالآخر عورتوں کو ہزاروں ٹھوکریں کھا کر سیکڑوں تلخ تجربات کے بعد عقل آئی۔ انکی آنکھیں کھلیں اور ان پر یہ راز منکشف ہو گیا کہ مذہب صرف نیم وحشی قوموں کو ڈرانے یا بہلانے کے لئے ضرورتاً ایجاد کیا گیا تھا۔ جب قومیں ترقی کے اونچے اونچے زینوں پر پہونچ گئیں اور مذہب کی ضرورت مفقود ہو گئی تو روشن خیال اور تعلیم یافتہ قوموں نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اس دقیانوسی آہنی شکنجے کو پرانی چیزوں کے عجائب خانے میں بطور اگلے زمانے کی ایک یادگار کے رکھدینا چاہئے۔ اور قدرت کو اپنا خدا۔ عقل کو اپنا پیغمبر اور آزادی کو اپنا مذہب قرار دیکر علم و ترقی کے بلند زینوں پر چڑھنا چاہئے۔ عورتوں نے بھی یہی مسلک اختیار کر کے پہلے وید اور قرآن کی تاویلیں شروع کیں۔ پھر رفتہ رفتہ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ان پرانی کتابوں کی مناسب ترمیم اور تنسیخ بھی ہو گئی۔ ابلتے ہوئے سیلاب ترقی نے مذہب کے بند کو توڑ ڈالا۔ اور عورتیں مردوں کی حکومت سے آزاد ہو گئیں۔ پردہ (ترقی کی راہ میں پہلا سنگ گراں) بذریعہ قانون ایک مستقل جرم قرار دیدیا گیا۔ عورتوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں وہی حقوق دیدئے گئے جو مردوں کو حاصل تھے۔ نکاح کے احمقانہ قواعد منسوخ کر دئے گئے اور نئے اور نہایت سہل و مختصر قواعد نکاح کے وضع کئے گئے جس کا تمہیں تھوڑا بہت آج ذاتی تجربہ بھی ہو گیا طلاق دینے کا حق مردوں سے چھین لیا گیا اور عورتوں کو دیدیا گیا۔ رفتہ رفتہ مذہب فطرت کی اشاعت بھی شروع ہو گئی۔ وید اور قرآن ناکافی اور مانع ترقی قرار پا کر منسوخ کر دئے گئے۔ اور مذہب فطرت سارے ملک کا مذہب ہو گیا۔ ہر متنفس کا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بچہ ہو یا بوڑھا قانونی فرض ہو گیا کہ وہ برہنہ رہے۔ چنانچہ ابتدا میں اخلاقی جرائم کی ضرور شدت اور کثرت ہو گئی مگر جوں جوں لوگ برہنگی کے عادی ہوتے گئے۔ اخلاقی جرائم بھی کم ہوتے گئے یہاں تک کہ اب قریب قریب معدوم اور مردوں اور عورتوں کے اخلاق بمقابلہ زمانۂ سابق کے قابل تحسین اور لائق صد آفرین ہیں۔ گورنمنٹ کے حکم سے فوج میں عورتوں کی بھی بھرتی ہونے لگی۔ اور انہیں کمیشن بھی ملنے لگا۔ چنانچہ آج کل ہندوستان کی بارہ لاکھ فوج میں

ساڑھے سات لاکھ عورتیں ہیں۔ اور تمہیں سنکر تعجب ہوگا کہ آج کل ہندوستان کی سپہ سالار ایک عورت ہے جس کا نام شکنتلا دیوی ہے ہندوستان کی جمہوریت کی پریسیڈنٹ آج کل ایک عورت ہی ہے جس کا نام زہرہ سلطانہ ہے۔ نکاح کا قاعدہ یہ ہے کہ عورت جس مرد کو پسند کرے اس کو وہ دو مردوں یا ایک عورت کے سامنے اپنی انگوٹھی پہنا دے۔ مرد کی رضامندی اگر ہو تو فبہا ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔ صرف دو صورتوں میں مرد شادی سے انکار کرسکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ عورت کے جسم کا کوئی عضو مقطوع یا مجروح یا مفقود ہو مثلاً عورت اندھی ہو یا لولی ہو یا کانی ہو یا نکٹی ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عورت کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو۔ مثلاً اسے برص ہو یا تپ دق ہو بس یہی دو صورتیں ہیں جن میں مرد انکار کرسکتا ہے ورنہ عورت کے انگوٹھی پہنا دینے سے نکاح قطعی اور مکمل ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چھ ماہ تک مرد کو طلاق دینے کا مطلق کوئی حق نہیں اور بعد چھ ماہ کے وہ طلاق دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ عورت راضی ہو اور عورت ہر وقت طلاق دے سکتی ہے اور عورت ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ نکاح بھی کرسکتی ہے۔

میں:۔ (تعجب سے) ایک سے زیادہ؟ یعنی کتنے؟

......خاتون:۔ کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ مگر عموماً ہمارے زمانے کی عورتیں ایک وقت میں دس بارہ مردوں سے زیادہ نکاح نہیں کرتیں اور یوں اپنی اپنی طبیعت ہے۔ بعض عورتیں اس سے زیادہ بھی نکاح کرلیتی ہیں۔ مثلاً زہرہ سلطانہ کے آج کل اسّی شوہر ہیں۔ اور شکنتلا دیوی کے ۵۵ ہیں یا ۵۷ مجھے ٹھیک یاد نہیں۔

میں:۔ اور مرد؟ مرد کے نکاح کرسکتا ہے؟

......خاتون:۔ مرد نکاح ہی نہیں کرسکتا۔ وہ نکاح نہیں کرتا۔ اس سے نکاح ہوتا ہے۔ میں نے تم سے ابھی کہا نہیں کہ عورتیں مردوں کو پسند کرکے ان سے نکاح کرلیتی ہیں۔ بڑا لطف آتا ہے۔ جیسے پہلے زمانے میں قصائی قربانی کے بکرے ایک کثیر تعداد میں لے آتے تھے اور لوگ اس میں سے قربانی کے لئے پسند کرلیتے تھے اسی طرح آج کل جب کسی لڑکی کو شادی کرنا ہوتی ہے تو وہ کوتوال شہر کو لکھ دیتی ہے کوتوال شہر دو چار سو مرد چنکر لڑکی کے گھر بھیجدیتا ہے۔ لڑکی دیکھ بھال کر ایک دو۔ دس۔ پانچ جتنے شوہروں کی اُس کو ضرورت ہوتی ہے پسند کرلیتی ہے۔

میں:۔ تو ایسی صورت بھی پیدا ہوتی ہوگی کہ ایک ہی مرد کو کئی عورتیں پسند کریں۔

......خاتون:۔ ہاں! ہاں بہت! مگر ایسی صورت میں پولیس میں باضابطہ اطلاع کردینا ہوتی ہے تاکہ فساد یا نقض امن کا اگر کسی حالت احتمال ہو تو عورتوں کے مچلکے لے لئے جاویں۔

میں:۔ اور بچوں کی رضاعت پرورش اور تعلیم و تربیت کا کیا انتظام ہوتا ہے۔

......خاتون:۔ پہلے ماں کا حق ہے پھر اس کے شوہروں کا اور ان میں اگر باہمی تصفیہ نہ ہو تو قرعہ ڈالکر تصفیہ کرلیا جاتا ہے کہ کون شوہر بچے کی پرورش کریگا۔ اور اگر ماں اور اس کے شوہر انکار کردیں تو گورنمنٹ کی طرف سے انتظام ہوتا ہے۔

میں:۔ عجیب قانون ہے!!

......خاتون:۔ اس میں کیا شک ہے؟ یعنی اب یہی سمجھ لو کہ اس کی خوبی کا اس سے بہتر کیا ثبوت ہوگا کہ اخلاقی جرائم کا تو کہیں نام ونشان ہی یہاں نہیں رہا۔ سوسائٹی کے دامن پر جو بہت سے بدنما دھبے تھے مثلاً ناجائز بچے۔ بازاری عورتیں بیویوں پر شوہروں کے مظالم وغیرہ وغیرہ ایسے دھل گئے کہ گویا جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ بیشک تہذیب و ترقی آج کل معراج کمال پر ہے۔

میں:۔ (دفعتاً کچھ یاد کرکے) مگر ثریا میں نے تم سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں تمہارا کون سا شوہر ہوں۔

ثریا کے رخسار آتشین کی سرخی ذرا اور چمک گئی۔ آنکھیں قدرے جھک گئیں۔ اور مجھے شبہ ہوا کہ ثریا شاید شرما گئی۔

میں:۔ ثریا تم نے جواب نہیں دیا۔

......ثریا خاتون:۔ (شرماکر) تم میرے پہلے شوہر ہو

میں:- (ہنسکر) جھوٹ!

.....ثریا خاتون:- نہیں میں سچ کہتی ہوں۔ تمہارے سر کی قسم!

میں:- اس کا ثبوت؟

.....ثریا خاتون:- اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے یہاں قاعدہ ہے کہ ہر شادی شدہ عورت اپنے گلے میں موتیوں کا ایک ہار ہر وقت پہنے رہتی ہے اور جتنے شوہر اس کے ہو چکے ہوتے ہیں اتنے ہی موتی اس کے ہار میں ڈال دئے جاتے ہیں جیسے جیسے شوہروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ موتیوں کی تعداد اور ان کی لڑوں میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اِن سب عورتوں کو دیکھو۔ ہر ایک کے گلے میں موتیوں کے ہار پڑے ہیں۔ اور مجھے دیکھو میرے گلے میں کوئی ہار نہیں۔ مجھے میرا ہار کل صبح پہنایا جائیگا۔ اور اس میں صرف ایک موتی ہوگا یہ کہکر اس کی گردن حیا سے خم ہوگئی اس کی برق سامان نگاہیں خود بخود جھک گئیں اور بالکل ہمارے زمانے کی شریف لڑکیوں کی طرح شرماکر خاموش ہوگئی۔

میں:- ثریا! میں خوش ہوں کہ ابھی تم میں شرم و حیا کی کچھ چنگاریاں باقی ہیں۔ ابھی تمہارے زمانے کی کامل تہذیب سے تمہاری نسائیت کی شفق رنگ نہیں کٹی ہے۔ میری ثریا اب بھی موقع ہے اس تہذیب حیا سوز کی ابھی تمہیں ایسی آنچ نہیں لگی ہے کہ تمہارے زخم مندمل نہ ہو سکیں اب بھی تم بچ سکتی ہو اور ثریا مجھے اجازت دو کہ میں تمہیں بچالوں۔ تم نسائی حسن کی جیتی جاگتی تصویر ہو مگر وہ جوہر جسے نسائیت کہتے ہیں اگر تم کھو بیٹھیں تو تم سے ابھی پتھر کی وہ برہنہ مورتیں ہونگی جو بت تراش تراشتے ہیں۔ اور جنکو شوقین نوجوان اپنے ڈرائنگ روم کو سجانے کے لئے خرید لیتے ہیں۔ تم ایک خوبصورت پھول ہوگی مگر ایسا پھول جسمیں رنگ و بو نہ ہو۔ تم ایک پرسرور نغمہ ہوگی مگر ایسا نغمہ جسمیں الحان و ترنم نہ ہو۔ تم جو کچھ بھی ہوجاؤ مگر عورت نہ ہوگی۔ تم صرف ایک دلچسپ کھلونا ہوجاؤ گی جس سے مرد کچھ دیر تک ہنس ہنس کر کھیلینگے اور پھر اکتاکر دلشکن لاپروائی سے کہیں پھینکدینگے اور پھر دوسرے کھلونے کے خریدار ہوجائیں گے۔ ثریا! ثریا خدا کے لئے مجھکو تمہیں بچالینے دو۔ تم میرے ساتھ چلو۔ اس مکروہ فضا سے نکل آؤ اور اُس فضا میں قدم رکھو جہاں زندگی کی کشمکش اور قسمت کی نیرنگیوں سے دوزخ کی تکالیف بھی ہیں اور سچے دلوں کی سچی پرستش اور محبت کی دلفریب سحر کاریوں سے فردوس بریں کی لذتیں بھی ہیں۔ ایسی لذتیں جو زندگی کو رشک ———

میرا ملازم:- (میرا شانہ ہلاکر) حضور! حضور! اُٹھئے! بہت دن چڑھ گیا۔ رخصتی کے مقدمے والے دیر سے دفتر میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

میں ایک گہری ٹھنڈی سانس لیکر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں تو نہ ثریا ہے۔ نہ وہ خوبصورت نہر نہ وہ سنگ مرمر کے زینے۔ میں ہوں اور میرا ملازم۔ اور میرا سونے کا کمرہ۔ دل میں دیر تک یہ خلش رہی کہ شاید ثریا کو میں اپنی التجا سے راضی کر لیتا۔ کیونکہ بہت دیر تک مجھے یقین نہ ہوا کہ یہ سب ایک خواب تھا۔ اور جب یقین ہوا تو دل میں میں نے کہا۔ .... لاحول ولا قوۃ یہ سب دو بجے رات تک مقدمہ طیار کرنے کا نتیجہ ہے۔ اب اگر میں یہ عجیب و غریب خواب کسی سے بیان کرونگا تو لوگ اور خاصکر حریت پسند خواتین اور ان کے بعض سرگرم معاونین میرے متعلق قسم قسم کی بدگمانیاں کرین گے۔ مگر خیر دیکھا جائیگا۔ خواب ہی تو ہے۔ خواب پر کسی کو اختیار نہیں ہوتا خاصکر اس وقت جب کہ ایک اہم اور پیچیدہ رخصتی کے مقدمے کے واقعات دماغ کا طواف کر رہے ہوں!!!

اور پھر یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ گو "زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں" مگر ارباب حل و عقد کو غور فرمانا چاہئے کہ اتفاق سے اگر یہ خواب کہیں سچا ہی نکل آیا تو مادر ہند کی دختران و فرزندان کا کیا حال ہوگا۔ اور اس آنے والی لذیذ مصیبت سے ملک کو بچانے کی کیا تدبیر کرنا چاہئے

فیاض علی۔ بی اے ال ال بی (علیگ)

فلسفۂ مذہب

مذہب کی ابتدا و ضرورت

اگر انسان اپنے نفس پر غور کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ اس میں بعض ایسے جذبات ہیں جو اس کی فطرت میں داخل ہیں۔ یہ جذبات صرف انسانوں سے مخصوص نہیں بلکہ ان کا عمل تقریباً تمام جاندار پر یکساں ہے مثلاً جذبات شہوانی جن کی وجہ سے ذکور و اناث باہم ایک دوسرے سے رغبت کرتے ہیں یا جذبۂ الفت جو انسان کو اپنے اولاد سے ہوتا ہے موت سے ایک عام نفرت و ہراس اور اس سے بچنے کی خواہش یہ ایسے جذبات ہیں جو ہر انسان میں خدا کی طرف سے ودیعت ہوتے ہیں اور جس کے لئے خود اُس نے کوئی تحصیل نہیں کی۔ صانع فطرت کا ان جذبات کو ودیعت کرنے سے صرف ایک ہی مقصود ہے اور وہ یہ ہے کہ نسل انسان کی دنیا میں بقا رہے۔ ان فطری جذبات کو ایک اعتدال پر قائم رکھنے کے لئے۔ تاکہ دنیا میں امن قائم رہے اور نسل انسانی آپس میں کٹ مر کر تباہ نہ ہو جائے ایک دستور نظام کی ضرورت ہوئی۔ اس دستور نظام کو انسان نے خود تحصیل کیا یا خدا نے اس کو خاص ذرایع سے تعلیم دیا۔ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب فوراً نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ یہ امر یقینی ہے کہ مثل دوسرے جذبات کے یہ اعتدال انسان کا فطری خاصہ نہیں ہے۔ لہذا اگر مذہب اسی دستور و نظام کا نام ہے تو اس کا علم انسان کو یا تو الہامی ذریعے سے ہوا یا خود اس نے اپنے ہزارہا سال کے تجربہ کے بعد سیکھا۔ پس اول سوال یہ ہے کہ آیا مذہب واقعتاً ایک دستور کا نام ہے۔ جو ہمارے جذبات حیوانی کو ایک اعتدال پر قائم کرائے تاکہ دنیا میں امن کی زندگی بسر ہو سکے۔ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہے تو آیا اس کی تعلیم انسان کو خدا نے بذریعۂ الہام کے دی یا خود اس کی عقل نے ہزاروں سال کے تجربہ کے بعد اُسکی رہنمائی کی۔ یعنی مذہب کی یہ صورت الہامی ہے یا ارتقائی۔

اب اگر ہم دنیا کی مختلف قوموں پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ دنیا میں اب بھی ایسی قومیں آباد ہیں جو اپنی طبعی حالت میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ ان فطری جذبات کو عمل میں لانے کے سوا کسی قسم کے اصول و نظام عمل سے واقف نہیں لیکن باوجود اس بات کے وہ ایک قسم کی مذہبی پابندی رکھتے ہیں اور ایک غیر مفہوم و غیر مرئی یا مفہوم و مرئی شے کے آگے سجدہ کرنا اور قربانی چڑھانا ان کا مسلک ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ان کے اس عمل کو نہ ہم اکتسابی کہہ سکتے ہیں اور نہ الہامی اور نہ فطری اس لئے معلوم ہوا کہ مذہب دراصل کوئی نظام و دستور بھی نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی ایک عادت مستمر طبیعت ثانیہ ہے جو انسان اپنی فطری جذبات کے ماتحت خود بخود اختیار کر لیتا ہے۔ اب ہم کو دیکھنا ہے کہ انسان اپنی انتہائی وحشت کے حالت میں بھی کیوں اس خاص عادت کا معمول ہو جاتا ہے۔ غالباً انسان کے فطری جذبۂ خود حفاظت" یا ہراس موت نے" ایسی حالت میں جبکہ انسان نے اپنے ابنائے جنس کو مرتے ہوئے دیکھا، اس کے دماغ میں مختلف افکار پیدا کئے اور از بسکہ وہ طبعاً خود اپنے لئے ایسی حالت دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اُس کو سب سے پہلے خیال خود اپنے کو ایسی حالت سے بچانے کے لئے ہوا ہوگا۔ اُس کو اپنی زندگی ہے

کئی بار اپنے سے طاقتور اور خونخوار انسان یا درندوں سے سابقہ پڑا ہوگا اور حالت اضطرار میں جن طریقوں سے اپنی جان کی حفاظت ان کے مقابلے میں کی ہوگی وہ اس قسم کی ہونگی کہ درندوں کی بھوک کو رفع کرنے کے لئے اس نے ان جانوروں یا انسانوں کو جنپر اُس کا قابو ہوتا تھا ان درندوں کی خوراک میں دیکر ان کے حملوں سے بچا ہوگا اور یا حالت انتشار میں عاجزی وخوشامد کو خوفناک حملہ آوروں کے غضب کا بہترین علاج پایا ہوگا۔ بس جو صورتیں بظاہر اس کو ہالک وقاتل افراد کے دفیعہ کے لئے مناسب نظر آئیں وہی صورتیں اُس نے ان جانستان قوتوں کی بھوک مٹانے یا ان کے غصہ کو دور کرنے کے لئے جن کو اگرچہ وہ دیکھتا نہ تھا مگر اتنی سمجھنے کی قدرت رکھتا تھا کہ وہی موت کا سبب ہیں اختیار کرتا تھا۔ یہی جان لینے والی ظاہری یا پوشیدہ قوتیں انسان کی معبود ہوئیں اور ان کے آگے گڑگڑانا۔ سجدہ کرنا۔ ان کو قربانی دینا بلکہ بعض اوقات حالت مایوسی میں مخالفانہ ومعاندانہ طریقے مثلاً کاہن وجادوگروں کی امداد سے ان جانستاں قوتوں کے پنجے سے اپنے کو بچانا انسان کا مذہب ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے اپنے خود فطری جذبہ پر اس موت سے اپنے لئے معبود پیدا کئے اور اپنی عبدیت کی وہ عام عادت اختیار کی جس کو ہم عرف میں مذہب کہتے ہیں۔

مگر انسان نے کب نیک وبد میں تمیز کی یا وہ کب اس دستور ونظام کا پابند ہوا جو اس کے جذبات شہوانی کو ایک اعتدال پر لایا یہ امر مسلمہ ہے کہ ہے انسان نے کئی دور تک نیک وبد کی تمیز نہیں کی اکثر اس نے خود غرضی سے اور اپنے جذبہ خود حفاظت سے مغلوب ہوکر اپنے سے کمزور انسان بلکہ اپنی اولاد کو قربان کرنے میں دریغ نہ کیا۔ اس کے جذبۂ اشتہا میں - Sexual instinct کے لئے اردو میں کوئی مقابل لفظ نہیں پاتا ہوں۔ جو جذبات کا انگریزی زبان میں بہترین مفہوم ہے کم سے کم میرا ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ میں نے اس کی جگہ جذبہ جود اگرچہ اپنے اصلی عربی مفہوم سے بالکل غیر موزوں اور بے معنی ہے مگر اردو میں یہ لفظ قریب قریب - Sexual instinct کے مفہوم میں سمجھا جاتا ہے۔ اختیار کیا اس سے بہتر لفظ کا علم کسی کو ہو تو وہ اس کی جگہ اس کو سمجھ لیں) نے اُس کو خود اپنے ابنائے جنس کو مارکر کھا جانے پر آمادہ کیا۔ اس کے فطری جذبۂ شہوانیہ نے عورتوں اور مردوں کی مقاربت میں۔ اس میں اور جانوروں میں کوئی تمیز نہ رکھی اور جذبات کی بے اعتدالی سے وہ اصل مقصد یعنی بقائے نسل سے دور جا پڑے اور رفتہ رفتہ مفقود ہوتے گئے۔ اس سوال سے پہلے یا بعد کہ انسان نے کب نیک وبد میں تمیز کی یہ سوال پیدا ہوگا کہ کس نے انسان کو نیک وبد کی تمیز سکھائی۔ قرآن سے تو اس کا جواب بہت جلد دیا جا سکتا ہے "ہدیناہ النجدین۔ لاتقربا ہذالشجرۃ فتکونا من الظالمین"۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس کی جستجو میں ذرا ہم اپنے ہی فلسفہ وتاریخ سے مدد لیں گو کہ آخر میں ہم اسی سرچشمۂ حیات یعنی قرآن عظیم پر اگر ٹھہریں ہی گے تو ہم ان کی تشریح یوں کر سکتے ہیں کہ اگرچہ انسان میں کوئی فطری جذبہ مذہبیت کا نہیں ہے۔ مگر امتداد زمانہ اور ان کے متواتر تجربے نے انسان کو خود بخود مدنی الطبع بنا دیا۔ اور جب ایک زمانے میں وہ اپنے تنہا غاروں اور پتھر کے اوزاروں کو چھوڑ کر ایک جماعت کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوا تو ایسی جماعت یقیناً ضعیف وقوی افراد پر مشتمل رہی ہوگی۔ بہت عرصے تک۔ تو جماعت کا کمزور فرد باقوت فرد سے مغلوب رہکر اس کی غلامی میں رہا ہوگا۔ اور غلامی کی صورت میں

اسوقت اس کے لئے سب سے بہتر حفاظت جان کے لئے نظر آتی ہوگی تو ایک جماعت میں ایک تعداد غالب افراد کی رہی ہوگی اور ایک مغلوب کی اور آخر میں جماعت کی یہ صورت قرار پائی ہوگی کہ صرف ایک شخص غالب ہوگا اور باقی سب مغلوب۔ اور یہی غالب شخص رئیس طائفہ یا قبیلہ سمجھا گیا ہوگا۔ اس قبیلہ نے کم سے کم اپنی جماعت کے مغلوبین کی حفاظت جان و مال کی ذمہ داری دوسری جماعت کے مقابلے میں کی ہوگی۔ اور اس طرح اس کا وجود ایک حدتک اس نظام و دستور کے لئے جو اس کے جذبات حیوانیہ کو ایک اعتدال پر قائم رکھے پہلی کڑی ثابت ہوا ہوگا۔ مگر خود رئیس قبیلہ اگرچہ اپنے کمزور ہم جنسوں کیلئے جو اس کی غلامی میں آچکے تھے ان کے درمیان ایک نظام کو قائم کرنے والا تھا۔ اس کا اپنا فعل اپنے غلاموں کے لئے اور خود اپنی طرح دوسرے رئیس قبیلہ کے لئے کسی دستور کا ماتحت نہ تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اپنے تمام غلاموں کو قتل کر ڈالتا یا اُن کی عورتوں کو اپنی تصرف میں لے آتا اور اپنے ہمسر کے ساتھ ایک ناتمام ہونے والی جنگ قائم رکھتا۔ غرض جو کچھ وہ چاہتا بے روک ٹوک کر سکتا تھا جب تک خود اس کو نیک و بد کی تمیز نہ ہو اس کی ہستی کمزوروں کے لئے یقیناً ایک خوفناک ہستی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی اس حالت میں اور پہلی حالت میں تھوڑا ہی فرق رہ جاتا ہے۔ لیکن یہ حالت غالباً بہت دنوں تک قائم نہ رہی ہوگی۔ رئیس کے استبداد و جبر نے غلاموں کی جماعت کو مقاومت پر متفق کر دیا ہوگا اور ایسی صورت میں رئیس قبیلہ اور جماعت غلامان کے درمیان ایک مفاہمت کی بنیاد پڑی ہوگی اور یہی صورتیں دو مختلف جماعتوں اور ہمسر روساو قبائل میں پیش آئی ہوں گی۔ مفاہمت کی تاسیس اولین ناحق قتل سے احتراز اور حفاظت جان ہوگی اور یہ پہلا امتیاز نیکی و بدی کا تھا اور اس طرح جماعت کے ذریعے سے کم سے کم انسان کا فطری جذبۂ غضب اعتدال پر آگیا ہوگا۔

اسیطرح انسان کے فطری جذبۂ شہوت نے بہت عرصے تک مرد و عورت کے تعلقات میں سخت انتشار و ابتری پیدا کر رکھی ہوگی اور از بسکہ مردوں سے عورتیں کمزور واقع ہوئی ہیں۔ مردوں کے تعلقات عورتوں سے تقریباً اسی خود سرانہ طریقے سے رہے ہونگے جیسا باقوت رئیس قبیلہ کا تعلق کمزور غلاموں سے تھا۔ اب لازمی طور سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے کس دور میں نکاح کا طریقہ ایجاد کیا اور اس میں اور زنا میں تمیز کی اور پہلے کو ایک فعل مستحسن اور دوسرے کو ایک فعل بد تصور کیا۔ فی زمانا بہت سی وحشی قومیں ایسی ہیں جنہیں شادی بیاہ کا دستور ہے اور اس کا پتہ لگانا کہ انھوں نے کیونکر نکاح کا طریقہ اختیار کیا۔ ایک مشکل امر ہے شادی اور زنا میں اس قدر فرق ہے کہ شادی میں مرد اس بات کے لئے مجبور رہتا ہے کہ باہمی مقاربت کا نتیجہ جو اولاد کی صورت میں ظاہر ہو اس کی کفالت کی ذمہ داری میں مرد ہی شریک ہو نہ صرف یہ کہ بلکہ اس حالت میں جبکہ عورت اپنے اس قدرتی بوجھ سے بالکل حالت معذوری میں ہو اور دنیاوی سختیوں کے مقابلے میں بالکل لاچار اور بے بس ہو تو اسی حالت میں بھی وہ اسکی کفالت و حفاظت کرے۔ عدم ذمہ داری کا نام زنا ہے۔ پس کس بات نے انسان کو اس ذمہ داری پر مجبور کیا۔ اور کب اور کس دور میں انسان نے نکاح اور زنا میں فرق سمجھا اور ایک کو اچھا اور دوسرے کو برا جانا۔ اب بھی دنیا میں ایسی قومیں آباد ہیں جن کا نکاح در اصل زنا ہے ملیبار و تبت و چند دیگر کوہستانی

ممالک میں ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کسی ایک مرد پر عورت کے اولاد کی ذمہ داری عائد نہیں ہوسکتی اور یہ صورت قطعی زنا کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ نکاح کو زنا سے بہتر سمجھنا اور نکاح کی طرف مائل ہونا انسان کو اس فطری جذبے نے سکھایا جو اولاد کی محبت کہلاتی ہے۔ اس جذبۂ الفت نے خود اُسکو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ان کے ساتھ اس کی ماں کی کفالت کرے جب اُس نے اپنے لخت جگر کو اس کی ماں کے گود میں پایا اور اس کی طرف فطری طور سے کھنچا۔

پس ابتدائی زمانہ میں انسان نے اپنے تجربہ اور ماحول سے جو کچھ حاصل کیا وہ یہ تھا کہ رفتہ رفتہ اس کی خود غرضی (جو انسان کے عمل کی محرک ہوتی ہے) اس کے جذبات فطری کو ایک نظام کے ماتحت اعتدال پر لے آتی اور اس کی افراط و تفریط کو اس نے بدی و نیکی سے تعبیر کیا۔ پس اگر اس کا نام ہم مذہب رکھیں تو مذہب کی تشریح اس کے سوا کچھ نہ ہوگی کہ وہ ایک نظام و دستور ہے جو انسان کے فطری جذبات کو اعتدال پر لے آیا مگر یہ مطلب دنیاوی قانون و سلطنت رانی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ جو مذہب کی محض ایک شاخ یعنی شریعت ہے اور مذہب جیسا ہم سمجھتے ہیں اس کی اول کڑی ایمان بالغیب ہے جس پر سارے نظام معاشرت کا دار و مدار ہے۔ (ان کی تشریح ہم بعد کو کریں گے کہ ایمان بالغیب کیونکر ہمارے نظام معاشرت کی کلید ہے) اور ہم نے دیکھا ہے اور قرآن بھی اس کا شاہد ہے کہ وحشی قوموں کو ایمان سے کوئی سروکار نہیں (قالت الاعراب انہا الیٰ آخرہ) اور اس کا علم ان کو کبھی خود بخود حاصل نہیں ہوا۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ مذہب کی ابتدا کا سررشتہ ایسی جگہ تلاش کریں جو ہمارے فلسفیانہ اور منطقیانہ حدود سے باہر ہو۔

ایمان بالغیب میں سب سے پہلے انسان نے خدا کو کس طرح پہچانا۔ قرآن نے تو خدا شناسی کو انسانی فطرت بنایا ہے (قرآن سورہ اعراف رکوع ۲۲) اور یہ بالکل صحیح ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ انسان کے فطری جذبہ پر موت نے خود بخود اس کو ایک غیر مفہوم معبود کی طرف مائل کر دیا تھا۔ البتہ انسان کی عقل نے اس معبود کو کیا صورت دی تھی یہیں سے اختلاف مذہب کی صورت پڑتی ہے اور اس حقیقت پر کہ اصل خدا کیا ہے۔ اور اس کی تعداد کیا ہے۔ انسانی عقلوں نے ہر زمانے میں بے شمار اور عجیب و غریب صورتیں پیدا کی ہیں اسلام کے مقابلے میں جس میں توحید کے خیالات سب مذاہب کے مقابلہ میں زیادہ روشن و واضح پائے جاتے ہیں۔ غیر مذہب کے خیالات کا موازنہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

اسلام	غیر مذاہب
(۱) توحید یعنی ایک خدائے برحق پر ایمان لانا جو خالق و معبود کائنات اور ازلی ہے۔ کوئی اسکا شریک نہیں۔	(۱) انسان کی زندگی و موت ہزاروں ارواح کے ہاتھ میں ہے جو دیوتاؤں کے نام سے موسوم ہوتی ہیں
(۲) گو انسانی قوا، خدا کی ماہیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لیکن انسان و کائنات کی خود فطرت اس کے وجود پر گواہی دیتی ہے	(۲) یہ ارواح اکثر انسانوں اور جانوروں میں حلول کرتی ہیں اور انسانوں پر ظاہر ہو کر اُن کو اپنا معبود بناتی ہیں
(۳) خدا کی مخلوق اور خدا کے درمیان ذریعۂ پیام خدا کی ایک	(۳) ستارگاں و سیارگان، آفتاب و ماہتاب کی پرستش

روحانی مخلوق ہیں جو فرشتے کہلاتے ہیں جو خود ہماری طرح خدا کے بندے ہیں اور خدا کی طرف سے جو حکم اُن کو ملتا ہے اس کو بجالاتے ہیں۔

(۴) تثلیث ہنود و کلدانیان و مصریان (یعنی برہما۔ شیو وشنو یا کلدانیوں کے انو۔ بیل وایا یا مصریوں کے یاہاں۔ رع وتاح۔ یعنی آسمان وزمین وماورا کے تین علیحدہ خالق موت و زندگی وشہرت

(۵) تثنیہ مجوس یعنی نیکی وبدی کے دو مقابل خدا

(۶) کوئی خدا نہیں یا غیر معین و نامشخص خدائے فطرت (مذہب بدھ و ویدانت)

(۷) تثلیث نصاریٰ یعنی باپ بیٹا روح القدس۔

(۸) الوہیم عبرانیان یعنی قومی خدا جو مثل ایک عظیم الشان وقوی ہیکل انسان بادشاہ کے غصہ کرتا ہے آسمانی تخت پر متمکن ہے کام سے تھکتا ہے۔ قربانی کی چرائند سے خوش ہوتا ہے اور اپنی قوم کے مقابلے دوسری قوم کا دشمن ہے۔

اب دیکھو انسانی افکار نے خدا کی آٹھ صورتیں پیدا کیں جن کو درجہ بدرجہ ہم نے اوپر دکھلایا ہے۔ اسفلین خیال انکا اول اور اعلیٰ خیال ان کا آخری خیال تھا۔ لیکن ان سب میں انسان کا اپنی عبدیت کا اقرار موجود ہے۔ جو غالباً ایک فطری جذبہ کے لحاظ سے اس قوت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اب ہم قرآن شریف کو کھولیں تو ہم کو حضرت ابراہیم کے قصے میں یہ واقعہ صاف نظر پڑتا ہے کہ حضرت ابراہیم جنکی توحید مسلمانوں کا ارث ہے وہ توحید کے خیال پر اپنی فہم وادراک کی جد وجہد سے پہونچے گویا انسان کے قوائے عقلیہ خود اس کی ایسی رہنمائی کر سکتے ہیں جس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ خیال بھی انسان کا ایک اکتسابی اور ارتقائی فعل ہے بابل چونکہ دور وحشت سے اس زمانے میں بہت دور نکل چکا تھا۔ اور وہاں انسان کا ایسی مدارج ترقی پر پہونچ جانا محال نہ تھا۔ ممکن ہے کہ قوائے عقلیہ نے اس ملک اور اس زمانے میں بہت سے ابراہیم پیدا کرائے ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ این سعادت بزور بازو نیست تا نبخشد خدائے بخشندہ۔ قوائے عقلیہ جو ایسی رہنمائی کر سکیں ہر انسان میں نہیں پائے جاتے اور اس کے ماننے کے لئے کوئی دشواری نہیں کہ دنیا میں بعض نفوس ذکیہ خود خدا سے ایسے خیالات کی ہدایت پاتے ہیں اور ایسے لوگ نبی کہلاتے ہیں۔ اور یہ نبوت دنیا کی ترقی یافتہ انسانوں میں ایک مشترک چیز ہے اور اس نبوت کا وجود مذہب کے لئے لابدی ہے یعنی مذہب کی ابتدا انسانوں میں نبیوں سے ہوئی۔ اُن کے وجود سے پہلے انسان کا کوئی مذہب نہ تھا اور مذہب کی اصل خدا شناسی ہے جو ہر انسان کا اکتسابی فعل نہیں ہے بلکہ وہ جس کو نور خدا ہدایت دے۔ لہذا جب ہم نے دیکھا کہ انسان قوا کے کمالات

ارتقائی طور سے اس کو کامل خدا شناسی کی طرف پورے طور سے نہیں لے گئے تو ہم مجبور رہوں گے کہ ہر زمانے اور ملک میں کچھ ایسے لوگوں کے وجود کو تسلیم کریں جن کو فطرت سے وہ قوتیں عطا کیگئی ہیں جو ہر انسان کو دسترس نہیں یعنی ان میں سے ایک شخص برگزیدہ معلم ہوا اور باقی سب متعلم - ان معلمین نے ہم کو ان باتوں سے آگاہ کیا جن تک ہماری عقل کی رسائی ممکن نہ تھی یعنی عالم ارواح کا وجود کائنات کی ابتدا و انتہا - عالم مابعد الموت - موت کی حقیقت - سزا و جزا نیکی و بدی کی کماحقہ تمیز لیکن اس کا کیا ثبوت تھا کہ جو باتیں ایسے لوگوں نے تعلیم کیں وہ در اصل صحیح بھی تھیں - ممکن ہے کہ خود ان کے عجیب و غریب دماغ نے سب اختراع کیا ہو - یعنی یہ سوال ہوتا ہے کہ ان کے دعوئے نبوت کی کیا اصل ہے -

نبوت کی حقیقت سمجھنے کے لئے ہماری سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ سوائے ایک نبی یعنی ہمارے پیغمبر محمد مصطفےٰ صلعم کے کسی نبی کے مفصل حالات ہمارے پاس موجود نہیں ہیں - ان کے پہلے جتنے نبی جس قوم میں سے گزرے ہیں اُن کو افسانہ پرستوں اور معجز نگاروں نے ایسا قعر تاریکی میں پھینکا ہے کہ سوائے ان مختصر حوالہ جات کے جو قرآن شریف میں ملتے ہیں کسی اور نبی کا وجود دنیا میں خود ایک سوال بنجاتا ہے - لامحالہ ثبوت کی شناخت وصفات پر کلیہ قائم کرنے کے لئے ہمکو وہی نبی منتخب کرنا پڑیگا جس کی مکمل سیرت سے ہم بخوبی واقف ہیں اور وہ صرف پیغمبر آخرالزماں ہیں - لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس نبی کے حالات پر نظر ڈالیں ہم کو ایک اور ضروری بات یہاں طے کرلینی چاہئے - دنیا میں بعض ایسے نبی گزرے ہیں جو اپنی قوم کے معلم ہی نہ تھے بلکہ ان پر حکمران تھے اور ایک ہی وقت میں وہ صاحب مذہب و شریعت بھی تھے کفار کو صرف آخرت سے ڈرانے والے ہی نہ تھے بلکہ اُنھوں نے ان کو دنیاوی سیاحت کا مزہ بھی چکھایا تھا بعض نبی محض معلم تھے بعض محض حاکم اور بعض دونوں کے بین بین اور بعض دونوں میں مشترک پس اگرچہ نبوت کے لئے بعثت اور شرط ہے یہ ضروری نہیں کہ ایک سلطان یا مقنین خدا کی طرف سے مبعوث نہیں ہے - کیونکہ قوانین دنیا یا سلطنت رانی یا سیاست انسان کا ایک ارتقائی اور اکتسابی فعل ہے - جس کے منوانے کے لئے جبر کیا جا سکتا ہے اور اسی واسطے گو کہ انسان کے جذبات کا اعتدال پر قائم رکھنا ایک دنیاوی قانون کے ذریعہ سے ایک حد تک ممکن ہے جیسا کہ ہم پہلے دکھلا چکے ہیں اور اس پر بھی مذہب کا اطلاق ہوسکتا ہے کہ وہ تزکیہ نفس کا ایک جزو ہے مگر وہ اصل مذہب اسی کا نام ہے جو ایک نبی اپنی الہامی قوت سے تعلیم کرے اور اسی قوت سے لوگوں کو انپر یقین دلانے میں ساعی ہو -

دنیا کا کوئی جبر عقائد کے اوپر نہیں چل سکتا - پھر جب ان خیالات پر یقین رکھا جائے تو ہم خود بخود تزکیۂ نفس کی طرف مائل ہوں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں نبوت و سلطنت دونوں شامل ہیں یعنی آپ ایک ہی ساتھ سلطان و نبی تھے - مکہ کے زمانے میں انکی حالت تو بالکل ایک نبی کی سی تھی مگر قیام مدینہ میں وہ صاحب سیاست و جیوش بھی تھے اور ان کے عمل میں اور ایک بادشاہ کے عمل میں کوئی فرق نہ تھا حتیٰ کہ اُنھوں نے اپنے آخری زمانہ میں جبکہ عام طور سے انسان کے قوائے شہویہ کا اضمحلال ہوتا ہے بادشاہوں کی طرح بہ نظر سیاست بعض سربرا وردہ قبائل کی لڑکیوں سے شادی کرنے پر ... ل نہ ہوئے - ہمارا نظریہ نہ انکی جنگوں پر ہے

اور نہ ان کے تعداد ازدواج پر۔ اور نہ ہم اس کو نبوت کے منافی سمجھتے ہیں اور نہ اس کے لئے شرط۔ مگر از بسکہ ظاہر بیں لوگ ان کے دنیاوی اعمال سے ان کی نبوت پر رائے قائم کرنے کے عادی ہو رہے ہیں اور خصوصاً ان کے تعداد ازدواج کو شہوت رانی کا مشغلہ اور نبوت کے منافی سمجھتے ہیں اسلئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ یہاں پر معترض کا مختصر جواب دیکر ان کے زندگی کے اس دنیاوی پہلو سے صرف نظر کر کے ان کی نبوت کے خصائص کی طرف رجوع ہوں۔

ہمارے معترضین غالباً اس بات کو تسلیم کریں گے کہ انسان کے قوائے شہویہ بذات خود کوئی بری شے نہیں بلکہ وہ انسانی جوہر کا ایک ویسا ہی گرانمایہ عطیہ خداوندی ہے جیسا ذکاوت و بصیرت۔ بلکہ اس قوت کی برتری انسان کو اپنے ہم جنسوں میں ویسا ہی قابل رشک و ممتاز کرتی ہے جیسا اس کی دوسری دماغی اور بدنی قوت۔ جو بات بُری ہے وہ اس کا غلط اور بیجا استعمال ہے۔ پس اگر ہم اس کو فرض بھی کر لیں اور ان لغو حدیثوں[1] کو مان بھی لیں جو شہوت پرست خلفائے عباسیہ کے خاطر وضاعین نے اخذ کی ہیں اور اس طرح ان کے بد اعمالیوں کی تاویل کی ہے تو اس سے زیادہ ہم آپ کو مطعون نہیں کر سکتے کہ آپ پچاس سال کے بعد بھی اپنے زمانے کے عام جوانوں سے بڑھکر با قوت تھے اور جو دلیل اس بات کی ہے کہ آپ نے اس قوت کو بھی بیجا صرف نہ کیا تھا۔ پھر ایسا شخص جس میں ابنائے جنس سے ہر چیز میں افضلیت ہو حتیٰ کہ قوت شہوانیہ وہ بجائے مطعون کے بہترین سردار قوم بننے کا حق رکھتا ہے

اب صرف سوال یہ باقی رہتا ہے کہ تعداد ازدواج بذات خود معیوب شے ہے یا نہیں۔ ہم اُس کو معیوب اس لئے کہتے ہیں کہ ایک شخص کی پہلی منکوحہ بیوی کے لئے یہ صورت نہایت دلشکن و باعث تکلیف ہوتی ہے اور ایک غریب بیوی جو اپنے خاندان پر جان و دل قربان ہو (جیسا ہمارے ہندوستان کی اوسط طبقہ کی عورتیں عموماً ہوتی ہیں) اس کے صلہ میں مرد نفسانیت سے اپنی بیوی کی اس طرح دلشکنی کرے تو واقعی وہ مرد سوسائٹی کے لئے قابل نفریں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی فلسفیانہ منطقیانہ۔ حکیمانہ مورخانہ دلیل تعداد ازدواج کے خلاف نہیں۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی صورت میں جس کو ہم بیان کر گئے ہیں تعداد ازدواج معیوب ہی نہیں بلکہ حماقت ہے اور ان کے کرنے والے جانوروں کی طرح زندگی کے لطف سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ مگر اس مخصوص صورت کے علاوہ اکثر ایسی صورتیں ہیں جہاں تعداد ازدواج کے بغیر اگر کوئی چارہ ہے تو زناکاری۔ دنیا میں ایک تعداد ایسی نامراد عورتوں کی ہمیشہ رہیگی جن کو کوئی بر نہیں ملسکتا۔ وجہ یہ ہے کہ اول حالت جنگ میں مردوں کی تعداد کم رہا کرتی ہے۔ دوسری حالت میں مردوں کی ایک بڑی تعدا د جسمانی و مالی حالت کی وجہ سے شادی سے ہمیشہ معذور رہتی ہے۔ مگر عورتوں کا یہ حال نہیں۔ ایسی صورتوں میں ان عورتوں کی کھپت اگر کسی طرح ہو سکتی ہے تو قجگی کے رواج سے۔ پس وہ عورتیں جن سے مردوں کی بڑی تعداد مالی و جسمانی معذوریوں کی وجہ سے نکاح نہیں کر سکتی وہ کیوں نہ ایسے مردوں کی باعزت بیویاں بن جائیں جو ان کو نکاح

[1] قال انس کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدور علی کل ازواجہ فی اللیل الواحدۃ (رواہ المسلم والبخاری)
واقول رحم اللہ علی انس کیف ہو شاہد او من اخبرہ ما وقع بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ازواجہ فی اللیل

میں لانے کی مقدرت رکھتے ہیں جبکہ نکاح کا مقصد افزایش و بقاء نسل انسانی پر مبنی ہو ـــ اور وہ اس صورت میں بالکل حاصل ہے - امراء جو عیش پرستی کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں اور اس واسطے انکی بیویوں میں وہ جان نثاری نہیں پائی جاتی جو طبقہ متوسطین کے ازدواج میں ہوتی ہے - ایسے لوگ بجائے ایک برے فعل کے جو بعض ان کو مہلک بیماریوں میں پھنسا کر اُن کو معدوم کر دیتی ہے - اگر تعداد ازدواج کو اپنا طریقہ بنالیں تو وہ غالباً سوسائٹی پر ایک احسان کریں گے - پس جس مذہب نے تعداد ازدواج کو یکقلم ناجائز قرار دیا ہے خواہ سوسائٹی کی کیسی حالت کیوں نہ ہو وہ حقیقت میں نہایت تنگ خیال اور کم بین مذہب ہے اور کبھی عالمگیر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا - تعدد ازدواج نہ تو عرب کی سوسائٹی میں قبل اسلام کوئی قبیح امر تھا نہ بیرون عرب بلکہ سوائے رومیوں کے دنیا کی کسی قوم میں معیوب امر نہ تھا - اسلام نے بھی تعداد ازدواج کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے ایسی شرائط کی پابندی کے ساتھ اجازت دی ہے کہ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو یہی ایک مسئلہ اُن کے احکام کو الہامی ثابت کرنے کے لئے کافی ہے - مثلاً جمع بین الاختین کے حرام ہونے کی مصلحت سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ شائقین تعداد ازدواج کے راہ میں کوئی آسانی نہ پیدا کیجائے - ورنہ ہر شخص ایسی صورت میں تعداد ازدواج کا خوگر ہو جاتا اور فریقین کو اس مصیبت میں مشکلات تلاش سے نجات مل جاتی -

تو اب آنحضرت پر صرف یہ اعتراض باقی رہ جاتا ہے کہ آپ نے قرآنی حدود ازدواج سے کیوں تجاوز کیا - قرآن کو الہامی ماننے والوں کے لئے تو اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں - کیونکہ ازدواج کا محدود کرنا آنحضرت کا فعل نہ تھا بلکہ خدا کا فعل تھا اور خدا نے اس کو اسوقت محدود کیا تھا جب آپ لاعلمی میں عرب کے پرانے رسم کے مطابق آخری نکاح کر چکے تھے - جب سورہ نساء میں ازدواج کی تحدید کا حکم نازل ہوا (واضح ہو کہ سورۂ آل عمران وسورۂ بقر کی طرح سورۂ نساء وسورہ مائدہ کی آیتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں اس میں ۳ھ سے لیکر ۹ھ تک کے زمانے کی آیتیں ہیں - جن کو جامعین قرآن نے ایک جگہ جمع کر دیا ہے - تحدید ازدواج کا حکم غالباً فتح مکہ یا اس کے بعد کا حکم ہے) ـــــــــــ تو آپ کو ان ازدواج کے متعلق جو چار سے زائد تھیں سخت تشویش پیدا ہوئی حتیٰ کہ سورۂ احزاب میں دوسرا حکم نازل ہوا جس میں آپ کی تمام ازدواج آپ پر حلال کی گئیں - لیکن آئندہ نہ کسی دوسرے نکاح کی اجازت دی گئی نہ موجودہ ازدواج کے تبدیل کرنے کی - مگر جو لوگ قرآن کو الہامی نہیں مانتے ان کے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر بالفرض آنحضرت خود اپنے دل سے قرآن بناتے تھے (نعوذ باللہ) تو کم سے کم ایک احمق شخص نہ تھے کہ ایسا چالاک جس نے نعوذ باللہ اس چالاکی سے عرب کو مذہب کا فریب دیکر اپنی سرداری و بادشاہت کا مقصد حاصل کیا) کبھی بھی اپنے پیروں کے لئے تعداد ازدواج کو محدود کرنے کا خیال ہی دل میں نہ لاتا جو خود اس کے اپنی تعداد سے کم تھی کہ ایسا کرنا سے اس کا کوئی مقصد و فائدہ نہ ہوتا بلکہ الٹا لوگ اس سے بدظن ہو جاتے - ایسا شخص تو اپنے پیرودں کو اپنے سے زیادہ تعداد میں نکاح کرنے کی اجازت دیتا بلکہ وہ ازدواج کا بہانہ ہی کیوں رکھتا وہ آزادی دیتا کہ ساری دل کی حسرتیں نکل جاتیں علاوہ اس کے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ـــــــــ خدا جانے معترض کیا سمجھ کر تعداد ازدواج کو نفس پرستی کا ذریعہ جانتے ہیں - اس سے تو بڑھکر کوئی نفس کشی اور ریاضت نہیں - اپنے گھر کو جہنم بنانا ہو تو دوسری عورت کرے - دیکھو اگر آنحضرت

زلزلہ

(فسانہ)

مجھے خالدہ سے محبت نہ تھی، عشق نہ تھا لیکن اسی کے ساتھ نفرت بھی نہ تھی، وہ اور میں ساتھ کھیلتے ساتھ رہے سہے تھے، اس کے بغیر میرا دل نہ لگتا تھا۔ اور میرے بغیر وہ بے چین رہتی تھی، لیکن خالدہ کے ساتھ شادی کا خیال مجھے کبھی نہ آیا تھا، شاید یہی وجہ تھی کہ جب میری والدہ نے اس کے ساتھ میری شادی کا پیام بھیجا تو مجھے بہت عجیب معلوم ہوا اور کئی روز تک سخت بے چین اور پریشان مارا ہا، سچ یہ ہے کہ میں نے اس وقت تک کبھی اپنی شادی کے متعلق غور ہی نہیں کیا تھا، ایک خالدہ ہی نہیں چاہے کسی کے ساتھ میری شادی کا پیام جاتا شاید میری یہی کیفیت ہوتی، اس مسئلہ کے متعلق جب کبھی میں نے اپنے اردگرد نظر ڈالی تو عجیب حال پایا جن کی شادیاں ہو گئی تھیں انھیں ناکتخدا رہنے کی حسرت تھی، اور جو ناکتخدا تھے انھیں شادی کرنے کی تمنا،

خالدہ میرے چچا کی اکلوتی لڑکی تھی، چچا کا نام شیخ کلیم نوری تھا، وہ ایک پرانے خیال کے بزرگ تھے پڑھے لکھے تو معمولی ہی تھے لیکن تیر اندازی اور نیزہ بازی میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا، اب بھی صبح کو روز دو گھنٹے کسرت کرتے اور روز شکار کھیلنے جاتے وہ پستول یا بندوق سے شکار نہ کھیلتے بلکہ تیر اور تلوار سے اپنے شکار کو ہدف بناتے، گھوڑے پر کبھی زین کس کر سوار نہ ہوتے روز صبح کو سرد پانی سے نہاتے، یہ تھے ان کے اشغال، میرے چچا مغربی تعلیم اور تہذیب کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے وہ کہتے تھے مغربی تعلیم جسمانی اور روحانی دونوں حیثیتوں سے ہمارے جوانوں کو ناکارہ بنا رہی ہے۔

میں انٹرنس پاس کر چکا تھا، ایف، اے میں تعلیم پا رہا تھا، میرے اطوار و خصائل کے سب مداح تھے، میں بھی اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، جائداد دونوں بھائیوں کے پاس برابر تھی، میں شکل و صورت کا بھی بُرا نہ تھا، لیکن بے حد نحیف و کمزور تھا، آئے دن علیل رہتا کبھی کھانسی اور زکام میں مبتلا کبھی پیٹ کے درد سے بے چین، چچا میرے ساتھ محبت سے پیش آتے مجھے کسرت کرنے اور صحت و تندرستی کی ہدایتیں کرتے۔ مجھ سے عدالت کے فیصلوں کا ترجمہ کراتے اور پھر اس ترجمہ کی معرفت میری قابلیت کی سارے محلہ میں تعریفیں کرتے۔

جب میری والدہ نے خالدہ کے لئے پیام بھیجا تو باوجود تمام بے چینی اور گھبراہٹ کے یہ خیال کبھی بھولے سے بھی میرے دل میں نہ آیا تھا کہ چچا مجھے اپنی دامادی میں قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔ اور جب مجھے اس واقعہ کا علم ہوا تو میری حیرت اور پریشانی کی انتہا نہ رہی، میں فطرتاً خوددار واقع ہوا تھا لیکن یہ اس جذبہ پر ایک ایسی کاری ضرب تھی جس سے اثر پذیر نہ ہونا میرے حیطۂ اختیار سے باہر تھا، میں کبھی سوچتا تھا کہ چچا میاں کے برتاؤ کے متعلق مجھے سخت غلط فہمی ہوئی۔ میں اُن کی سیرت کا صحیح اندازہ نہ کر سکا،

کبھی کہتا تھا کہ والدہ نے آخر پیام ہی کیوں بھیجا وہ یقیناً مجھ سے کہیں زیادہ تجربہ کار اور معاملہ فہم ہیں۔ انہیں سمجھ لینا چاہئے تھا کہ اس کا نتیجہ حسب دلخواہ نہ ہوگا۔

میں نے یہ بھی سنا کہ پیام کا جواب دیتے ہوئے چچا میاں کے الفاظ سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ وہ میرے ماموں زاد بھی نعیم ظہری کی طرف مائل ہیں اور شاید خالدہ کی شادی ان کے ساتھ قرار پا چکی ہے۔ نعیم کا مکان بھی چچا کے مکان سے ملا ہوا تھا، انھوں نے کبھی پڑھنے کی طرف توجہ نہ کیا ہمیشہ اُن کا وقت ادنیٰ طبقہ کے لڑکوں کے ساتھ کشتیاں لڑنے، کبڈی کھیلنے اور مچھلی کا شکار کرنے میں صرف ہوتا تھا جس قدر آبائی جائداد تھی اس کا بڑا حصہ نعیم میاں کے والد اپنی حیات ہی میں برباد کر گئے تھے، جو باقی تھی وہ انھوں نے اور ان کے چھوٹے بھائی نے برباد کر دی۔

ان سب باتوں کا ایک دلچسپ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے خود کو خالدہ کی محبت کے شدید ترین جذبہ میں ڈوبا ہوا پایا میں اب سے پہلے محبت کو بھی کرکٹ اور ٹینس کی طرح ایک کھیل سمجھتا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ جب دل پر اس کا اثر ہوتا ہے تو پھر اور کسی چیز کے لئے گنجائش باقی نہیں رہتی۔ میرا خیال تھا کہ محبت کا جذبہ ایک قسم کی کمزوری ہے لیکن اب اس تجربہ نے بتایا کہ اس خیال میں کم سے کم اتنی ترمیم اور کر دینے کی ضرورت ہے کہ اس جذبہ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش اس سے کہیں زیادہ بڑی کمزوری ہے۔ میں جس قدر کوشش کرتا تھا کہ خالدہ کے خیال کو دل سے نکال دوں وہ اور زیادہ شدت کے ساتھ میرے دل پر غلبہ پاتا جاتا تھا۔

خالدہ کی محبت کے جذبہ کا اس طرح یکایک میرے دل میں پیدا ہونا شاید رقابت پر مبنی ہو لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اگر محبت پہلے سے موجود نہ ہو تو رقابت کا وجود بھی نہ ہوگا۔ محبت سے رقابت کا پیدا ہونا ممکن ہے رقابت سے محبت کا پیدا ہونا ممکن نہیں اگر یہ خیال صحیح ہے تو مجھے خالدہ سے بھی محبت تھی گو خاموش اور بیگانہ وار سہی،

یا شاید یہ ہو کہ چچا میاں کے انکار نے میری خودداری کے جذبہ کو ٹھیس لگا کر خالدہ کو ایک ممنوع شے قرار دیدیا اور اس کی طرف میری توجہ میں ایک قسم کا استقلال پیدا کر دیا، اگر اس خیال کو صحیح مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مجھے خالدہ سے زیادہ خودداری کے ساتھ محبت تھی۔

غرض سبب کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ ظاہر ہے کہ مجھ پر رقابت کا بھی اثر تھا میرا خودداری کا جذبہ بھی مجروح ہوا تھا اور میری رگ رگ میں خالدہ کی محبت نے اپنا گھر کر لیا تھا،

(۲)

اب مجھے اپنی زندگی قطعاً بے کیف معلوم ہونے لگی، ہر وقت متفکر اور افسردہ خاطر رہتا، یوں تو میں پہلے ہی سے خاموش اور تنہائی پسند تھا، اب یہ کیفیت ہو گئی کہ ہفتوں گھر سے نہ نکلتا، سب سے ملنا جلنا ترک کر دیا، رنج و غم جس طرح بے چین طبیعتوں کو اور زیادہ

بے چین کر دیتا ہے اسی طرح خاموش اور سکون پسند لوگوں کو اور زیادہ خاموش اور سکون پسند بنا دیتا ہے! اسی دوران میں معلوم ہوا کہ خالدہ کی شادی میاں نعیم کے ساتھ عنقریب ہونے والی ہے، اب سے پہلے جو کچھ سنا تھا وہ کوئی فیصلہ کن بات نہ تھی اور اُمید کے ہوائی محل تعمیر کرنے کے لئے کافی سامان موجود تھا، غمگین اور مصیبت زدہ لوگوں کی جان امید ہی ہوتی ہے، حالانکہ اس سے زیادہ بااثر طریقہ پر فریب دنیوالی دنیا میں اور کوئی چیز موجود نہیں ہے لیکن اس کے فریب بھی دلربا ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ ساتھ دے تو خواہ کسی رنگ میں سہی زندگی دلچسپی کے ساتھ گزر جاتی ہے، اگر امید باقی نہ رہے تو انسان بہائم سے بدتر ہو جائے۔

میرے لئے اب کوئی اُمید باقی نہ تھی، ہزار طرح کوشش کی مگر دل سے افسردگی کا اثر زائل نہ ہوا، جب اور کسی طرح بس نہ چلا تو بیرونی امداد کی طرف نظر گئی، صبح شام پارک میں ٹہلنے کے لئے گیا، دوست احباب کی طرف رجوع کیا، مختلف کھیلوں کے ذریعہ دل بہلانا چاہا سینما میں آنکھیں پھوڑیں مگر سب بے سود،

اکثر سننے میں آیا تھا کہ شراب رنج و غم کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے لیکن اس ذریعہ سے فائدہ اُٹھانا مشکل تھا، کئی مرتبہ خیال گیا لیکن معاملہ خیال کی حدود سے آگے نہ بڑھا۔ مجھے یوں تو مذہب سے کوئی خاص مناسبت نہ تھی لیکن ماحول اور تربیت کا اثر مجھ پر اس قدر غالب تھا اور سماجی بندشیں کچھ ایسی سخت تھیں کہ اُن کے خلاف ایک قدم بھی چلنا مشکل تھا، لیکن یہاں موت اور حیات کا سوال تھا۔ میرے دل و دماغ کی جو کیفیت تھی اس کیفیت کے برقرار رہتے ہوئے اب میرا کچھ مدت بھی زندہ رہنا ممکن نہ تھا، اگر مذہب کے باقی رہتے ہوئے انسان پر رنج و ملال کی ظلمتیں طاری رہیں تو میرے نزدیک اس کا وہ مذہب مذہب ہی نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں آج کل مذہب کے لئے مرجانے کی وبا پھیلی ہوئی ہے! میرے نزدیک مذہب کے لئے زندہ رہنا بہ نسبت مذہب کے لئے مرجانے کے زیادہ ضروری ہے، کم سے کم میں زندہ رہنا چاہتا تھا، مذہب کے لئے نہ سہی اپنے لئے سہی اپنے لئے نہ سہی خالدہ کے لئے سہی،

آخر میں نے فیصلہ کر لیا ـــ کہ مجھے شراب پینی چاہئے، شاید اسی سے غم غلط ہو جائے، شاید میں خالدہ کو بھول جاؤں۔ مگر یہ بھی میں نہ چاہتا تھا، میں تو اس تاریکی کو دور کرنا چاہتا تھا جو میرے حواس پر مسلط ہو گئی تھی، خالدہ سے اگر مجھے محبت تھی تو اس محبت کو میرے دل کے لئے ذریعہ مسرت و شادمانی بن جانا چاہئے تھا، پس میرے موجودہ رنج و ملال کا سبب خالدہ کی محبت نہ تھی بلکہ نعیم کی رقابت اور چچا میاں کے انکار سے اپنی تذلیل کا احساس تھا، ان دونوں چیزوں کا اثر زائل کرنا ضروری تھا اور مجھے پختہ یقین تھا کہ شراب مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دیگی اور اگر اپنے مقصد میں مجھے کامیابی نہ بھی ہوئی تو کامیابی کا پریشان کن احساس بھی باقی نہ رہیگا!

(۳)

اب میں سیدھا ہوٹل سسیل پہونچا اور کئی قسم کی عمدہ شراب کے ادھے منگوا کر اپنے سامنے رکھ لئے، اس وقت صرف ایک خیال اپنی پوری قوت اور اثر کے ساتھ میرے دماغ پر مستولی تھا، میری ساری اُمیدیں ان خوش وضع بوتلوں کے طلسم رنگ و بو سے وابستہ

تھیں، ایک نظر فریب خواب میری آنکھوں کے سامنے مجسم موجود تھا اور اس کی صحیح تعبیر مجھے معلوم تھی، اس وقت کوئی چیز مانع نہ تھی، مذہب یا سوسائٹی کسی چیز کا بعید ترین اثر بھی میرے دل پر نہ تھا، یہاں تک کہ اس وقت مجھے یہ احساس بھی نہ تھا کہ میں نے اپنے مصائب و آلام کے انسداد کا ایک ذریعہ معلوم کر لیا ہے، میں ایک گلاس بھر کر بلا توقف اور بغیر دم توڑے چڑھا گیا، میں نے سوائے ذائقہ خراب ہو جانے اور کوئی خاص اثر محسوس نہ کیا، مجھے توقع تھی کہ حلق سے اترنے کے بعد پہلا ہی سیکنڈ کسی دوسرے عالم میں گزرے گا؛ خلاف امید ایسا ہوا۔ دوسرا گلاس پیا اب اثر ہوا اور تشفی بخش ہوا ایسا معلوم ہونے لگا کہ گلے کے راستہ سے روشن شعلوں کا ایک جلوس آہستہ آہستہ گزر رہا ہے۔ تیسرا گلاس گو سیال آتشین مادہ کے مانند سہی مگر تھا پر کیف اُس نے مشعلوں کے جلوس کو اور زیادہ تیز کر دیا اور اس کی رفتار بہت خوشگوار معلوم ہونے لگی، چوتھا گلاس .... اب کسی نے سر کے اندر آتش بازی چھوڑنی شروع کر دی اب میری حالت پہلے سے بہتر تھی، نہ صرف روحانی حیثیت سے بلکہ جسمانی حیثیت سے بھی میں اپنی نظر میں خود کو قوی تر محسوس کرنے لگا اور گویا خالدہ کی جدائی کی ساری اہمیت زائل ہونے لگی، مجھے خیال ہے کہ چوتھے گلاس کے بعد میں نے ہوٹل کے پیش خدمت سے کہا تھا کہ "دنیا میں خالدہ ہی سب کچھ نہیں ہے"

میں نے دیکھا کہ اس دوران میں ہوٹل کے اندر اور بھی چند آدمی آ گئے تھے، ان پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے سب سے محبت ہو گئی میں نے خدمتگار کو "پیارے ساقی" کہکر مخاطب کیا اور اُسے حکم دیا کہ ان سب کو جس قسم کی شراب یہ چاہیں اور جس قدر چاہیں پلانی شروع کر دو، اور پھر ایک میز پر کھڑے ہو کر میں نے سب کو مخاطب کیا، مجھے یاد ہے کہ میز پر میں اس لئے کھڑا ہوا تھا کہ میری آواز سب اچھی طرح سن لیں، میں نے کہا "میرے دوستو! میں جانتا ہوں کہ تمھیں خالدہ سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور نہ تم میرے جاہل چچا سے ہمدردی رکھتے ہو، تم بھی میری طرح یہاں غم غلط کرنے آئے ہو، پس تم سب میرے مہمان ہو، تم میرے ہمراہ چلو ابھی اسی وقت چلو اور جب تک تم چاہو میرے مہمان رہو، تم سب میرے بھائی ہو اور خاص طور پر تم، یہ آخری فقرہ میں نے ان میں سے اس شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا جو ان سب میں زیادہ کمسن اور خوشرو تھا،

میں اس وقت بھی جب ذرا سکون کے ساتھ حافظہ پر زور ڈال کر یاد کرتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ اس خوشرو جوان نے میرا شکریہ ادا کیا تھا لیکن خدا جانے اس وقت میں نے کیا سمجھا، جب وہ میری گفتگو کے بعد اپنا جواب پورا کر چکا تو میں نے اس سے پوچھا کہ "تو نے کیا کہا؟" مجھے خیال ہے کہ اس نے پھر شکریہ ادا کیا لیکن میری سمجھ میں پھر خدا جانے کیا آیا کہ میں نے سب کو گواہ بنا کر کہا کہ "حضرات آپ نے دیکھا کہ میری اس شخص کے ہاتوں بہت تذلیل ہوئی ہے جس نے ابھی میری تذلیل کی ہے، میں جھگڑے فساد سے ہمیشہ الگ رہتا ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص خواہ مخواہ اس کا طالب ہو تو پھر میں چوکتا بھی نہیں، وہ میرا جاہل چچا سمجھتا ہے کہ مجھ میں زور اور قوت نہیں ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کمسن جوان کو اسی نے بہکا کر بھیجا ہے، میری قوت کا اندازہ ابھی ہوا جاتا ہے، دیکھئے ابھی ہوا جاتا ہے، جس کا جی چاہے دیکھ لے۔

یہ کہکر میں نے میز پر کھڑے ہی کھڑے کوٹ اتارا اور قمیص کی آستینیں چڑھائیں اور جیسے شہباز اپنے شکار پر حملہ آور ہوتا ہے ایک جست میں اس خوشرو جوان کی گردن پر آ پڑا۔ کسی نے سچ کہا ہے نفرت محبت کی ہمسایہ ہے اصل میں اسی جوان کی طرف میں سب سے زیادہ مائل ہوا تھا اور اسی سے سب سے پہلے متنفر ہوا۔ شراب نے میرے حواس میں بجلی کا اثر پیدا کر دیا تھا، معمولی حالت میں یہی کیفیت شاید چند روزہ کے اختلاط کے بعد رونما ہوتی اب ساری منزلیں چند منٹ ہی میں طے ہو گئیں۔ مجھے ایک ہل چل اور ہنگامے کا خیال تو ہے لیکن اسکے علاوہ اور کچھ یاد نہیں، اس کے بعد جو بات مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ میں نے خود کو رات کے وقت بڑے بازار کی ایک بند دوکان کے تھڑے پر بیٹھا ہوا پایا۔ اس ہئیت میں کہ نہ سر پر ٹوپی تھی اور نہ پاؤں میں جوتا، ظاہر ہے کہ میں ہوش میں نہ تھا لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس امر کا بھی اچھی طرح احساس تھا کہ میں ہوش میں ہوں، مجھے معلوم تھا کہ میں بھرے بازار میں ننگے سر اور ننگے پاؤں ایک مکان کے تھڑے پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوں اور یہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر میرے حواس بجا ہوتے تو یہ حرکت مجھ سے کبھی سرزد نہ ہوتی لیکن اس وقت مجھے اس کی قطعاً پروا نہ تھی بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ یہ رنگ بھی مجھے مرغوب تھا۔

سڑک کے دوسرے کنارے ایک نان بائی کی دکان تھی جس نے زمانہ کا ساتھ دینے کی کوشش میں اپنی دکان کے اندر جو وہ تین معمولی دکانوں کو ملا کر بڑھائی گئی تھی ایک بڑی سی میز بچھا رکھی تھی اور اس میز کے ارد گرد بہت سی کرسیاں ڈال دی تھیں میں نے دیکھا کہ اس دکان میں پانچ چھ آدمیوں کی ایک قطار داخل ہوئی مگر یہ سب عجیب و غریب قطع کے انسان تھے، پہلا شخص کسی طرح ڈھائی فٹ سے زیادہ نہ تھا دوسرا اس سے بھی کم قد تھا، تیسرا اور چوتھا بھی اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے لیکن پانچواں قد کے لحاظ سے ان سب سے بازی لے گیا وہ کسی طرح ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ ذرا غور کرنے سے مجھ پر واضح ہو گیا کہ یہ سب بادۂ ناب کی بوالعجبیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اس علم کے باوجود بھی ان لوگوں کے قدوں میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔

اب مجھے اس امر کا نہایت بے چینی کے ساتھ احساس شروع ہو گیا کہ میرا دماغ قطعاً بیکار ہو گیا تھا، میری ٹانگوں کا آزادانہ اور میری مرضی کے خلاف عمل کرنا اب میرے لئے زیادہ اہم نہ تھا، میرے سر میں یہ کیفیت پیدا ہو جانا کہ گویا اس کے اندر شہد کی مکھیوں نے اپنا چھتہ بنا لینے کا فیصلہ کر لیا ہے، تکلیف دہ سہی لیکن قابل برداشت ضرور تھا لیکن اس امر کا احساس کہ میرا دماغ اپنے فرائض انجام دینے سے قاصر ہے میرے لئے قیامت تھا، مجھے اگر کبھی کسی چیز پر فخر ہوا ہے تو وہ میرے دماغ کی غیر معمولی خوبی تھی۔ لیکن میری حرکتوں نے آج اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔

(۴)

خدا جانے میں کس طرح گھر پہنچ گیا، میرے نزدیک اب میرا نشہ کم ہو گیا تھا، اس لفظ کا خیال آتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے ایک میل کے فاصلہ سے نہایت آہستہ آہستہ دس منٹ میں اس لفظ کو ادا کیا ہے، میں کوٹ اتار کر سیدھا اپنے بستر میں جا لیٹا۔ لیکن نیند کا

پتہ نہ تھا دل تو نیندیوں بھی اپنے طلب گاروں سے گھبراتی ہے لیکن میری تو حالت ہی غیر تھی، چھت کی طرف نظر گئی تو عجیب کیفیت پیش نظر تھی ایسا معلوم ہوا کہ چھت کا ایک حصہ مع کمرے کی جنوبی دیوار کے بڑے دھماکے ساتھ زمین پر آ رہا ہے، میں دیر تک آنکھیں پھاڑے ہوئے تکتا رہا، میں جانتا تھا کہ اصل میں کچھ نہیں ہے، یہ سب محض میری نظر اور میرے دماغ کا فتور ہے معلوم ہوتا تھا کہ میری ساری قوتیں زائل ہو چکی ہیں، مگر تعجب یہ ہے کہ اس قدر کمال کے ساتھ میری نظر مجھے دھوکا دیتی تھی کہ اگر میں اپنی اصلی حالت سے آگاہ نہ ہوتا تو میں بلا خوف تردید کہہ سکتا تھا کہ کم و بیش پانچ فٹ چھت یکایک غائب ہو گئی، صاف آسمان نظر آنے لگا، یہاں تک زمین پر تختوں کڑیوں اور مٹی کا ڈھیر بھی موجود تھا اور صرف یہی نہیں کہ میری آنکھوں ہی نے مجھے دھوکا دیا ہو بلکہ میرے کانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا، میرے کانوں میں کتنی ہی دیر تک برابر شور و غل کی صدائیں آتی رہیں اور برآمدہ میں مشرق کی طرف والی سڑک پر لوگوں کے بھاگنے اور تیز تیز چلنے کی آوازیں میں متواتر سن رہا تھا؛

میں بستر سے اٹھا، اینٹ اور مٹی کے ڈھیر کے پاس گیا، اسے ہاتھ سے چھو کر دیکھا، اب میں نے اندازہ کیا کہ میری قوت لامسہ بھی جواب دے چکی ہے، وہ اینٹ اور مٹی کا ڈھیر گو محض میرے دماغی توازن قائم نہ رہنے کا ایک نتیجہ تھا لیکن اسے مس کر کے دیکھا تو مجھے اسی طرح ٹھوس معلوم ہوا جیسے واقعی مٹی کا ڈھیر ہونے کی صورت میں معلوم ہوتا۔

میں پھر بستر پر جا لیٹا، سخت فکر اور پریشانی میں مبتلا تھا، ایک ہی لغزش نے پانسہ پلٹ دیا، کیا سوچا تھا کیا ہو گیا، دماغ بیکار ہو گیا، نظر میں فرق آ گیا، سماعت اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہی، قوت لامسہ پر اطمینان نہ رہا، اسی ہجوم افکار و آلام میں مجھ پر غفلت طاری ہو گئی اور پھر نیند آ گئی!

میں صبح کو پہر دن چڑھے بیدار ہوا، میرے سر میں سخت درد تھا، سارا بدن چور چور تھا، رگ رگ میں درد معلوم ہوتا تھا لیکن بفضل خدا میری نظر اور سماعت اپنی اصلی حالت پر برقرار تھیں،

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ رات جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ محض میرے دماغ اور نظر کا فتور نہ تھا، اب سے آٹھ دس گھنٹے پہلے جہاں جہاں ایک بلند دیوار موجود تھی وہاں اب کھلا ہوا میدان تھا اور دھوپ کی تیزی بلا روک ٹوک مجھ تک پہنچ رہی تھی، آدھی سے زیادہ چھت بھی زمین پر تھی، مجھے رہ رہ کر تعجب ہوتا تھا کہ معاملہ کیا ہے، اسی دوران میں چچا میاں تشریف لے آئے، وہ کچھ گھبرائے ہوئے تھے آتے ہی بولے "ہائیں طلعت! کیا رات تم کمرے سے نکلے بھی نہیں؟"

میں:- "جی نہیں، کیوں کیا کوئی خاص بات تھی؟"

چچا:- "زلزلہ سے زیادہ اور کیا خاص بات ہوتی؟"

میں:- "کیا زلزلہ؟"

چچا: "اُسے رات والا قیامت خیز زلزلہ"

میں: "اچھا وہ رات والا زلزلہ جی ہاں میں تو ہیں تھا، دیوار اور چھت گرنے کے بعد تو سوچا تھا کہ مکان سے باہر چلا جاؤں مگر پھر میں نے کہا ایسا بھی زلزلے سے کیا گھبراتا ہے، انسان میں کچھ تو ہمت چاہئے، پھر وہ سامنے والی دیوار گر گئی، میں نے کہا چلو خیر اسے بھی گر جانے دو۔ زلزلہ بیشک زور دار معلوم ہوتا تھا اور بس پھر اس کے بعد میں سو گیا۔"

چچا میاں کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں بولے "طلعت! میں تمہیں اس قدر نڈر باہمت اور شجاع نہیں سمجھتا تھا، بیٹا تم تو فخر خاندان ہو، دلیر اور بہادر لوگوں کی خدا بھی مدد کرتا ہے، میاں نعیم کو دیکھو، پہلے ہی جھٹکے میں چیخ مار کر بھاگے میں نے بہیترا بیا ذرا بچوں کو باہر لیجانے میں مدد ملجاتی مگر اس بندۂ خدا نے منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا، آؤ ذرا تم اپنی چچی کے پاس تو آؤ۔"

میری ہمت اور شجاعت کے اس زبردست ثبوت کے بعد شاید یہ امر کچھ تعجب انگیز تھا کہ اُسی ہفتہ کے اندر خالدہ سے میری شادی ہوگئی۔

حامد اللہ افسر

میری ڈائری کا ایک ورق

(بہ سلسلۂ ماسبق)

"رخ بتماشہ گہ ناز آورم" ———

میں پھر اسی بلدۂ شعر و موسیقی کی طرف جا رہا ہوں، جہاں اب سے پانچ سال قبل، صحیح معنی میں اس ایک نگاہ کو دیکھا تھا، "جو بظاہر نگاہ سے کم تھی" ——— طبیعیات میں نگاہ، ایتھر کا اہتزاز و تموج ہو یا اس کا انعکاس، لیکن مجھ سے پوچھئے تو میں کہونگا کہ وہ صرف کیفیت ہے روح کی، پیام ہے قلب کا، کبھی فرمان کی صورت میں اور کبھی التجا کے رنگ میں ——— غالب نے انتہائی نزاکت خیال سے کام کیا کہ ریاضی کے ماتحت اس کو "نیم" یا "ربع" میں تقسیم نہیں کیا، بلکہ "بظاہر" کہکر گویا یہ بھی جتا دیا کہ ممکن ہے وہ بہ لحاظ ادائے حسن و لطف کیف پوری "نگاہ" ہو اور ہم "باندازۂ شوق" اسے "کم" سمجھتے ہوں ——— بہرحال سواد بمبئی شروع ہوتے ہی ایک ایک کرکے تمام اُن کیفیات کی یاد ستانے لگی، جن کو ہر چند میں بھلا تو چکا ہوں، لیکن اس بھلانے کی ایذا کبھی نہیں بھول سکتی:-

جاتی ہے کشمکش کوئی اندوہِ عشق کی　　　　گر دل نہیں رہا تو وہی دل کا درد تھا

ایک شام کا واقعہ ہے:-

ساحل آب پر خاموش تنہا بیٹھا ہوا قدرت کی اُس عظمت و جبروت کا مطالعہ کر رہا ہوں جس کا نام سمندر ہے ——— حد نظر تک سوائے اس ایک ہیجان سیّال کے اور کچھ نہ دکھائی دیتا، شب و روز لاکھوں کروڑوں سال سے اسی طرح اس کا تلاطم رہتا ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت اپنے آپ کو زمان و مکان سے آزاد کرنے کے لئے سخت عریاں طور پر بیتاب ہے ——— میں دیر تک اس متشکل "لانہایت" اس مرئی "ابدیت" پر غور کرتا رہا اور پھر کائنات کی اس بسیط فضا کا خیال کرکے جس میں ہمارا سارا نظام شمسی ایک جگنو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، حقیر ترین کرۂ زمین کی طرف ذہن منتقل ہوا اور پھر اس کی ارب در ارب آبادی میں اپنی ہستی پر غور کیا تو بے اختیار ہنسی آگئی جس طرح خوردبینی جراثیم ہمارے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے، اس سے زیادہ بے حقیقت ہستی نوع انسان کی فطرت کی نگاہ میں ہے، پھر اس کے لئے حشر و نشر کا اہتمام، عذاب ثواب کا طومار، بہشت و دوزخ کا قصہ، آخر کیوں؟ - یہ سب مفروضات ہیں جن کے ذریعہ سے انسان اپنی ہستی کو متعین کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ عمان بسیط کو یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس کی رو میں کتنے خس و خاشاک بہکر کہاں چلے جاتے ہیں ——— بیدل اپنے مخصوص انداز بیان میں اسی خیال کو اس طرح ظاہر کرتا ہے:-

چو حباب غیر لباس تو پہ توقع و چہ ہراس تو ۔ نہ تو مانی و نہ قیاس تو چو گسستہ جامہ پیکرت

حباب جو اپنی ہستی کے لحاظ سے صرف ایک لباس ہے، اس کو توقع یا ہراس سے کیا واسطہ جس وقت لباس اتر گیا قصہ ختم ہو گیا نہ جامہ رہا نہ کوئی پیکر ـــــ

چاند افق سے بلند ہو چکا تھا اور اس کی زرد شعاعوں کا حزن و ملال فضا میں ایک سوگوارانہ کیفیت پیدا کرتا جا رہا تھا ـــــ آج اُس کا چہرہ مجھے بہت غمناک نظر آتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سامنے رو رہا ہو لیکن سر نہ اٹھائے ـــــ سمندر میں اُس کا انعکاس ڈبڈبائی ہوئی آنکھ کی کیفیت پیدا کر رہا تھا ـــــ رات بھیگی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا نم ایسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی نہا کر بال خشک کرنے کے بعد بازو پر سر رکھ کر لیٹ جائے دور چوپاٹی کے ساحل پر برقی فانوسوں کی پُرخم قطار ایسی نظر آ رہی تھی جیسے کسی گلے کا ہار اور چونکہ وہاں کا ہنگامہ میری نگاہ و سماعت سے بہت دور تھا اس لئے یہ سارا منظر ایک ایتھری (Ethereal) کیفیت رکھتا تھا ـــــ میں ساحل پر لیٹ گیا اور دیر تک غور کرتا رہا کہ اس وسیع کائنات میں میرا وجود بھی وہی حکم رکھتا ہے جیسے ریگستان میں کسی کا نقش قدم کہ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اس کے لئے پیام فنا ہے۔

ستارے جھلملا رہے تھے اور ان کی روشنی کا قبض و بسط حالی کے بیان کردہ مفہوم کے مطابق گویا غالب کے اس مصرع کی تکرار کر رہا تھا۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

میں بھی سمجھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ "ہاں، کون ہوتا ہے؟" ـــــ "کس میں اتنی تاب ہے" ـــــ کہ دفعتہً قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی اور اسی کے ساتھ ایک ایسی کراہ کے ساتھ جس میں روح کا انتہائی حزن و ملال پنہاں تھا گویا کسی نے یہ کہا:۔

"کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد"

میں اُٹھ کر اس طرف متوجہ ہونا ہی چاہتا تھا کہ کوئی ساحل سے پانی میں تھا اور تھوڑی دیر کے بعد موج کی اس آغوش میں جس کا ہلکا سا فشار بھی ہمیشہ کے لئے بےخبری کی نیند سلا دیتا ہے۔ صبح کو سمندر کی دیوی نے اس نازنین کی روح کی قربانی قبول کر کے اس کے جسم کو پھر ساحل پر لا کر ڈال دیا جس سے سوائے اُس ایک کاغذ کے بنڈل کے جس میں ایک بار، ایک رومال اور ایک خط تھا۔ اور جس کو وہ ساحل ہی پر چھوڑ گئی تھی نہ کوئی اور چیز ملی نہ یہ پتہ چلا کہ وہ کون تھی اور کس کی داغدار ـــــ خط کا مضمون یہ تھا:۔

"اب تو خوش ہو بیوفا تیرا ہی لے کہنا کیا"

"تمہاری محبت طوفان کی طرح آئی اور میرا سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی، ہائے وہ بھی کیا عالم نامرادی تھا۔ کہ تمہاری محبت کی تمام لذتیں میرے لئے مخصوص تھیں اور میں ان کے اعتراف سے بھی عاجز تھی۔ ایک زمانہ گزر گیا ۔ یہ میری زندگی کا وہ عہد تھا جسے میں نے ہمیشہ دور خسراب سمجھا، ہاتھ کہ ہر شے کی طرح اس پر بھی زوال آیا، اس لئے نہیں کہ میں نے اُسے رد کیا بلکہ اس وجہ سے

کہ تمہارے جرعہ ہائے الفت اب میرے لئے مخصوص نہ تھے۔ پھر جس طرح وہ شراب آہستہ آہستہ "زہرا" ہوئی تھی، اسی طرح رفتہ رفتہ وہ ایک "آبِ ناصاف" کی صورت اختیار کرنے لگی، یہاں تک کہ یہ "چشمۂ حیات" میرے لئے بالکل خشک ہوگیا اور تم باوجود میری انتہائی التجاؤں کے میری روح کی اس تشنگی کو بجھانے کے لئے آمادہ نہ ہوئے اور آخرکار نوبت یہاں تک پہونچی کہ تمہارے بت کے سامنے میری آنکھوں نے دل کا آخری قطرہ تک پیش کر دیا، لیکن تمہارا وہ قاتل و خونین تبسم، جس کو میں نے پہلے صرف تبسم بہار سمجھا تھا، اب بھی بدستور قائم تھا — آخر آخر میری صرف یہی ایک التجا تم سے رہ گئی تھی کہ خدا کے لئے تم مسکرانا چھوڑ دو — میں درد و غم سے بیتاب اور تم متبسم! ، میں تمہاری بیوفائیوں اور بیدردیوں کی داستان سے لبریز اور تم متبسم! میں تڑپ رہی ہوں تم مسکرا رہے ہو، میں رو رہی ہوں تم مُسکرا رہے ہو یا اللہ، یہ کیا قیامت ہے! — میں نے بارہا کہا کہ تم کو پاس وفا نہیں نہ ہو، تم مجھ سے بیزار ہوگئے ہو، مجھے گوارا، تم میری محبت کو ٹھکرانا چاہتے ہو، مجھے منظور، لیکن میں یہ کیونکر برداشت کر سکتی تھی کہ تم اپنے تبسم سے مجھے جھٹلاؤ، اپنی بے پروائی سے مجھے جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرو ——

گذشتہ چھ ماہ کی زندگی میں تمہاری محبت کے عروج و انحطاط کے جو منازل مجھ پر گزر چکے ہیں وہ ایسے معمولی نہیں کہ مجھے زندگی و موت میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے پر مجبور نہ کرتے — پھر جب میں نے دیکھا کہ ایک وقت انسان پر ایسا بھی آسکتا ہے جو زندگی کو موت سے بدتر سمجھنے لگے تو چارۂ کار سوائے اس کے نہ تھا کہ میں موت کو ترجیح دیتی کیونکہ کم از کم جہاں پہونچکر مجھے تمہاری مُسکراہٹ کے دیکھنے کا اندیشہ نہ تھا جس کی بوئے خون مجھے ہمیشہ لرزہ براندام کر دیتی تھی۔

تمہاری محبت کے اولین ہدایا جنہیں عزیز رکھنے کی کوشش میں آخرکار مجھے جان دینا بھی گوارا کرنا پڑا اسی دنیا میں چھوڑے جاتی ہوں جہاں ایک زمانہ تک انھوں نے مجھے تڑپائے رکھا —— یہ ہار جسے میرے دل کی دھڑکن نے خدا معلوم کس کس طرح بیقرار رکھا اور یہ رومال جس میں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کہ میرے کتنے آنسو جذب ہو چکے ہیں، چھوڑے جاتی ہوں اس لئے نہیں کہ آپ انہیں میری یادگار سمجھکر محفوظ رکھ لیں، بلکہ صرف اس غرض سے کہ جب آپ انھیں دیکھیں تو ایک مرتبہ پھر مسکرا دیں —

خدا کرے میری موت کی پہلی رات آپ کی حیاتِ نشاط کا اولین نوروز ہو۔

بدنصیب

ز۔ خ

* واقعہ بمبئی منجملہ اور بہت سے واقعات کے ہے جو میری سابق سیاحت بمبئی کو ہمیشہ تازہ رکھیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

گاڑی جس وقت اسٹیشن پر پہونچی تو افضال پلیٹ فارم پر موجود تھا، میں اترا اور دیر تک اسے حیرت سے دیکھتا رہا ـــــ میرے تصور نے جو خیالی تصویر اس کی قائم کی تھی وہ یقیناً بہت مختلف تھی، میں سمجھتا تھا کہ وہ بھی میری ہی طرح ایک افسردہ چہرہ، ایک مضمحل صورت رکھتا ہوگا اور زمانہ کے تلخ تجربات نے اس کے خدوخال پر بھی کافی نقوش چھوڑے ہوں گے لیکن وہ ہنوز دنیائے شباب کی تصویر تھا، جوانی کی شگفتگی اس کے خدوخال سے ظاہر ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ میری ناکام زندگی کا انتقام دنیا کے ذرہ ذرہ سے لے رہا ہے

میں اس وقت سراپا استفہام تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اپنی گزشتہ دس سال کی زندگی کا افسانہ یک وقت مجھے سنا دے، لیکن میں حیران تھا کہ کہاں سے سوال کی ابتدا کروں، وہ یہ سب کچھ سمجھ رہا تھا اور صرف مسکرا رہا تھا ـــ آخرکار میں نے گھبرا کر ایک مرتبہ یہ سوال کر ہی دیا کہ :-

"افضال خدا کے لئے بتاؤ تم کیا ہو، کون ہو، کہاں ہو" وہ یہ سنکر ایک ایسے قہقہہ کے ساتھ جس میں شراب کا نشہ ملا ہوتا ہے ہنسا اور بولا "آزاد ہوں، انسان ہوں، اور وہاں ہوں جہاں ہر شخص کی رسائی ناممکن ہے"

ـــــ "خدا کے لئے عملی دنیا اور مادی عالم کی باتیں کرو۔ تمہارے معمے کسی وقت فرصت سے بیٹھکر حل کرونگا، اس وقت میری جیتابیاں اس کی متحمل نہیں ہو سکتیں"۔

ـــــ "آپ کو معلوم ہے کہ میں دنیا کو ہمیشہ قمارخانہ کہا کرتا تھا! لیکن یہ نہ سمجھ میں آتا تھا کہ اس میں بازی کس طرح لگانا چاہئے کہ جیت اپنی رہے، میں اس دس سال کے عرصہ میں کامل ۶ سال تک یوروپ میں رہا اور وہاں جاکر معلوم ہوا کہ یہ کھیل کس طرح کھیلا جاتا ہے، میں نے اس فن کو وہاں سیکھا، اور پھر اس کا علم صرف مجھی کو ہے کہ کس بیدردی کے ساتھ اپنے دین و ایمان، اپنے اخلاق و انسانیت یہاں تک کہ اپنی روح کی قربانی اس پر چڑھانیکے بعد میں نے اس فن کو حاصل کیا اور پھر چونکہ میں نے اس کو نہایت گراں قیمت دیکر حاصل کیا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کو عزیز نہ سمجھوں اور اب اس کے نتائج سے متمتع نہ ہوں ـ یاد رکھئے کہ اگر ضرورت ہوئی تو میں آپ کو بھی اپنے اس کھیل سے دھوکا دینے میں دریغ نہ کروں گا اور میں ایک لمحہ کے لئے بھی تاسف نہ کروں گا اگر اپنے ذرا سے نفع کے لئے آپ کو بڑے سے بڑا نقصان کسی وقت پہونچا دوں"

میں نہایت حیرت سے اُس کی گفتگو سن رہا تھا اور اس کا ہر فقرہ میری نگاہ سے ایک حجاب اٹھاتا جاتا تھا۔ موٹر آہستہ ہوکر ساحل تالاب کی ایک شاندار کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہوا اور رواق (Portico) میں پہونچکر ٹھہر گیا۔ تمام احاطہ، کوٹھی کے در و دیوار، رواق کی محراب، زینہ، چھت، ستون، غرض اس عمارت کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں پھول ہی پھول نظر آتے ہوں سامنے نہایت ہی شگفتہ اور پاکیزہ خانہ باغ محرابوں اور دیواروں پر خوشنما بیلیں، چھت میں معلق گملے، اور جا بجا خوبصورت چڑیوں کے پنجرے، یہ تھا وہ سب سے پہلا منظر جو میرے سامنے آیا ـــ خادم نے دروازہ کھولا اور افضال ایک ایسی شان کے ساتھ جس میں سرمایہ دارانہ تمکنت سے

زیادہ ایک شاہانہ تسلط کا غرور پایا جاتا تھا۔ نیچے اترا اور نرم ایرانی قالینوں کے فرش سے گزرتا ہوا مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا جس کی پر تکلف آرائش یقیناً جنت قلب و روح تھی۔ میں اپنے معمولی ملبوس اور دہقانی وضع میں یہاں بیٹھا ہوا خود اپنے کو برا معلوم ہو رہا تھا، اور بعض مرتبہ یہ بھی خیال پیدا ہوتا تھا کہ کہیں افضال کو بھی میرا آنا ناگوار نہ ہوا ہو ——— افضال بھی اسی کوچ پر بیٹھ گیا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا اور بولا کہ "فرمائیے آپ داستان سننے نہیں بلکہ دیکھنے کے لئے کب تک طیار ہو سکیں گے"۔ اس کے چہرہ کے نشاط، اور بلا اختیارانہ تبسم کو دیکھ کر اس کی وہ تحریر میری نگاہوں کے سامنے آگئی جس کو پڑھ کر میں یہاں آیا تھا، اور ان سب باتوں کو مربوط کرنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ اس کا مقصود کیا تھا۔ میں نے نہایت ہی غیر محسوس طور پر اپنی حالت کا مطالعہ کیا اور بولا "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہاری داستان صرف سن لی جائے" وہ شروع ہی سے بے انتہا حساس تھا اور معمولی سی بات میں اس کی باریک جلد کے نیچے خون دوڑ جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر رنگین ہو گیا اور نہایت ہی ہلکی سی خشونت کے ساتھ بولا: "ممکن ہے لیکن آپ کو یقین نہ آئے گا"۔ میں نے پھر اسے مستفسرانہ انداز سے دیکھا — اب اس پر ایک خاص کیفیت طاری تھی، نہایت بیخودانہ انداز سے بولا، "اگر میں آپ سے کہوں کہ میں نے چاند کو طلوع ہوتے دیکھا تو آپ یقین کریں گے لیکن اگر میں یہ کہوں کہ چاند میری آغوش میں آگیا تو آپ کبھی باور نہ کریں گے، اسی طرح اگر میں یہ بیان کروں کہ شفق کی رنگینیاں، بہار کی عطر بیزیاں مجسم ہو کر میرے پہلو سے ملتی ہیں تو بھی آپ کو یقین نہ آئے گا ——— یونان کی دیوی زہرہ کا مجسمہ ایک مادی حقیقت ہے جس کا مشاہدہ ہر وقت ہو سکتا ہے، لیکن اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اس پیکر سنگین میں کسی کے لئے کبھی جان بھی آجاتی ہے تو آپ کا کیا کوئی بھی اس کی تصدیق نہ کرے گا — پھر آپ ہی بتائیے کہ میرا افسانہ سننے کی چیز ہے یا دیکھنے کی؟" افضال یوں تو ہمیشہ سے جسناً و فکراً شاعر تھا، لیکن اب میں اسے مقال کے لحاظ سے بھی شاعر دیکھ رہا تھا۔ وہ گفتگو کر رہا تھا اور اس کا تنفس تیز ہوتا جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جذبات کے لحاظ سے وہ اپنے سینہ کو بہت تنگ پاتا ہے ——— اس نے قریب کی میز سے شیشہ اٹھا کر گلاس میں شراب انڈیلی اور میرے سامنے بڑھایا۔ میرے ہلکے تبسم سے دھیرے انکار کو سمجھ کر بغیر کسی مزید اصرار کے خود پی گیا اور میز پر گلاس کو رکھتے ہوئے یہ شعر نرم سروں میں گنگنانے لگا۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
ز چشم مست ساقی وام کردند

نیاز

نوٹ: — بعد کے واقعات ماہ آئندہ کی اشاعت میں درج ہوں گے

چنگاری

(فسانہ)

(بہ سلسلہ ماسبق)

(۴)

مس ہلن کو خلد آباد میں قیام کئے ہوئے ایک ہفتہ اور گزر گیا اور اس دوران میں یوسف کو خدا جانے کتنی بار مایوسیوں سے دوچار ہونا پڑا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک وہ اسی سے نا آشنا تھا کہ مس ہلن کی یہ تمام جسارتیں کس مقصود کے لئے تھیں اور وہ کیسی مخفی لیکن تیز اس کی فطرت سے کر رہی تھی۔

یوسف بڑا ذی فہم تھا، ذہین تھا، اخذ نتائج میں اس کا دماغ بہت جلد سبقت کرتا تھا، لیکن صرف ان باتوں میں جن کا تعلق محض دل سے ہو یا دماغ سے ــــ اس زمانہ میں بارہا ایسے موقع پیش آئے کہ اس کی نگاہوں نے اپنا پیام اس کے قلب و روح تک پہونچانا چاہا لیکن وہ اس سے زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں کہ یوسف کے قلب نے اُن کی آزادی کو سلب نہیں کیا۔ اس نے مس ہلن کو بعض مرتبہ ایسے عالم میں حال میں دیکھا کہ کوئی دوسرا اس کی جگہ ہوتا تو شاید پھر سانس نہ لیتا، لیکن اُس نے زیادہ سے زیادہ جو کیفیت محسوس کی وہ اس قدر تھی کہ وہ اپنی نگاہوں کو نسبتاً کچھ زیادہ آسودہ پاتا تھا لیکن قلب ہنوز بے خبر تھا۔

اُس کی زندگی یکسر بے احتیاج تھی، وہ اپنی امیدوں کے لحاظ سے اس قدر مستغنی واقع ہوا تھا کہ کم از کم یہ بات اُس کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ نظام تمدن میں عورت کونسی چیز مرد کو سونپ سکتی ہے جو اس کے پاس نہیں ہے اور مرد کے پاس کیا نہیں جس کی خواہش عورت سے کرے۔

اس دوران میں مس ہلن نے خود چھیڑ چھیڑ کر، شعر و شاعری، موسیقی، و نقاشی، عشق و حسن، مرد و عورت، اور اسی طرح کے بہت سے مسائل پر یوسف سے گفتگو کی، جن کا تعلق انسان کی صرف شباب سے ہے اور ان کے علاوہ نظام تمدن، ہئیت اجتماعی، اصول ارتقاء وغیرہ پر بھی بحث کی جو ایک زیادہ سنجیدہ اور متفکر دماغ کے لئے باعث دلچسپی ہو سکتے ہیں، لیکن یوسف کے چہرہ پر ان مباحث سے کوئی رنگ نہ آیا اور نہ ان مباحث کے دوران میں اس نے مسکرانا ترک کیا ــــ لیکن ایک نہایت ہی ہلکا سا تغیر یہ محسوس کیا گیا کہ جو وحشت اس کو پہلے ہوتی تھی اب اس قدر نہیں تھی بلکہ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ اگر مس ہلن خاموش رہتی تو وہ خود کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے وہ چونک پڑتی اور وہ اس چونک پڑنے سے تقریباً وہی لطف لیتا جو کسی کے چھیڑنے سے حاصل کیا جاتا ہے۔

ساتھ ایک تغیر اور بھی اس میں پیدا ہوا اور وہ یہ کہ جب مس ہلن اپنے اہتمام سے کھانا طیار کرا کے اس کو کھلاتی تو وہ نسبتاً زیادہ لذیذ معلوم ہوتا اور جس دن اُس کو باہر جنگل میں تنہا کھانا پڑتا تو مس ہلن اُسے ضرور یاد آجاتی اور جلد ہاتھ کھینچ لیتا ——

بہر حال یوسف خود محسوس کرتا یا نہ کرتا لیکن اس میں یہ تغیرات ضرور پیدا ہو چلے تھے جن کو مس ہلن بھی سمجھ رہی تھی۔ مگر اس تغیر کی رفتار اس قدر سست تھی کہ بعض اوقات وہ گھبرا جاتی ——

دو دن اور گزر گئے تیسرے دن یوسف حسب معمول صبح کی چاء پیکر کھیتوں کی طرف نکل گیا اور چونکہ چلتے وقت مس ہلن کے اصرار پر وعدہ کر گیا تھا کہ دوپہر کا کھانا وہ انھیں کے ساتھ کھائے گا اس لئے اُس نے چاہا کہ جلد کاموں سے فارغ ہو جائے اور مس ہلن کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے، لیکن اتفاق سے اسی دن تقاوی کے کچھ قصے پیش آگئے اور اُمید سے زیادہ اس کا وقت صرف ہو گیا۔ وہ ہمیشہ پیدل جانے اور آنے کا عادی تھا لیکن آج دیر ہو جانے کے سبب سے اس نے گھوڑا طیار کرایا اور اس پر سوار ہو کر بھگاتا ہوا چلا —— مس ہلن نہایت بیتابی سے یوسف کا انتظار کر رہی تھی اور دیر ہو جانے سے کچھ متفکر بھی تھی کیونکہ یوسف کی پابندی اوقات کا حال اسے معلوم تھا اور وہ جانتی تھی کہ بغیر کسی خاص سبب کے ممکن نہیں کہ یوسف اتنی دیر لگا دے۔

بارہ بجے کھانے کا وقت مقرر تھا، لیکن یوسف تین بجے تک بھی وہاں نہ پہونچ سکا، مس ہلن کی تشویش اب ضبط سے باہر ہو گئی اور اس نے آدمی کو حکم دیا کہ جا کر مکان پر دریافت کرے، لیکن اتنے ہی میں یوسف آگیا، اس حال میں کہ چارپائی پر بیہوش و مجروح پڑا ہوا تھا اور کچھ دہقانی اس کی چارپائی کو اٹھائے لا رہے تھے۔ قصہ بہت مختصر تھا اور وہ یہ کہ گھوڑا بھڑک کر بھاگ نکلا اور یوسف جب گرنے لگے تو پاؤں رکاب میں اُلجھ گیا جس سے سر، چہرہ، اور گردن کو زیادہ صدمہ پہونچا۔

مس ہلن نے فوراً اندر مسہری پر لٹا کر وہ تمام تدابیر شروع کر دیں جو ایسی حالت میں ایک مغربی خاتون کر سکتی ہے اور اسی کے ساتھ اس نے قصبہ کے ڈاکٹر کو بلایا اور فوراً ایک خط مفصل دیکر آدمی کو علی گڑھ کے سول سرجن کے پاس روانہ کیا ——

(۵)

اس کے بعد یوسف پر تقریباً ایک ہفتہ ایسا گزرا کہ اس کے انجام کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں ہو سکتی تھی، تپ کی شدت اور دماغی خرابی نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ بعض مرتبہ ڈاکٹر بھی مایوس ہو گئے، لیکن مس ہلن کی محنت و تیمارداری کا یونہی ضائع جانا مقدر نہ تھا اس لئے آہستہ آہستہ تمام شدید علامتیں کم ہونے لگیں اور جب دسویں دن یوسف نے اول مرتبہ ہوش میں آکر آنکھ کھولی تو اپنے ماحول کو دیکھکر وہ تھوڑا سا متعجب ہوا، لیکن پھر خود ہی آنکھ بند کر کے اُس نے غور کر کے سمجھ لیا کہ اُس دن گھوڑے سے گرنے کے یہ نتائج ہوں گے۔ اُس نے پھر آنکھ کھولی اور مس ہلن کو اپنے سرہانے دیکھ کر اپنی آنکھوں سے انتہائی جذبۂ منت پذیری ظاہر کرتے ہوئے، زبان سے بھی شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ "میں کتنے دنوں سے آپ کا مہمان ہوں ؟" —مس ہلن

پہلی مرتبہ اس کے اسلوب بیان کو اس قدر ادبی پہلو لئے ہوئے دیکھکر مسکرائی اور بولی کہ "بارہ دن سے یہ شرف مجھے حاصل ہے"۔

یوسف نے سخت حیرت کے ساتھ بارہ دن کے لفظ کو دہرایا اور جیسا کہ تعجب کی حالت میں اس کی عادت تھی اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرنا چاہا، لیکن جب ٹھوڑی سے آگے اُسے بالکل خلا نظر آیا تو اُسنے مزید تحقیق کے لئے اپنے سامنے چہرہ کا جائزہ لیا اور اسی کے ساتھ مسہری کے سامنے ہی ایک بڑا آئینہ دیوار میں لگا ہوا تھا اُس پر نگاہ گئی تو معلوم ہوا کہ نہ صرف مونچھ داڑھی بلکہ سر بھی بالکل صاف تھا۔ سر میں، گالوں، ٹھوڑی کے نیچے جا بجا پھاہے لگے ہوئے تھے اور چونکہ اس وقت تک اُس نے اپنے آپ کو بے ریش و بروت کبھی نہ دیکھا تھا، اس لئے اُسے اپنی صورت دیکھکر ہنسی آگئی اور مس ہلن سے مخاطب ہو کر کہا کہ "میں بھی اس وقت کس قدر بھیانک نظر آتا ہوں"۔

مس ہلن ——— "پہلے سے کم، لیکن میں خوش ہوئی یہ معلوم کرکے کہ کم از کم آپ کے اندر احساس حسن و قبح تو کچھ پیدا ہوا، ورنہ وہ شخص جو بلا کسی سبب کے داڑھی چھوڑ سکتا ہے، اُس کو اس کے ندارد ہو جانے کی بھی کوئی فکر نہ ہونی چاہیے۔ جب تک کسی چیز کا تعلق جذبات سے نہ ہو اس پر غور کرنا لایعنی سی بات ہے ——— کہئے اب آپ کا مزاج کیسا ہے؟ داڑھی کا افسوس نہ کیجئے، خس و خاشاک کی دنیا میں کیا کمی"۔

یوسف ——— "کیا مجھے اُٹھنے کی اجازت ہے؟"

مس ہلن ——— "اُٹھنے کی حاجت ہی کیا ہے۔ میری رائے میں ابھی آپ کو پورے سکون کی ضرورت ہے۔ آپ کو خبر نہیں کہ یہ ہفتہ آپ پر اور ہم سب پر کس قدر سخت گذرا ہے۔ آپ کا دماغ اس قدر متاثر تھا کہ ایک ایک ہفتہ تک تو ہوش آیا ہی نہیں اور اس کے بعد جو تپ کے ساتھ ہذیان شروع ہوا تو کل شب کو مشکل سے خدا جانے کن کن تدبیروں کے بعد اس کا دورہ ختم ہوا"۔

یہ کہکر مس ہلن نے گھڑی دیکھی اور فوراً اٹھکر میز سے دوا کی شیشی لائی، گلاس میں ایک نشان اس کا خالی کرکے، یوسف کو سہارا دیکر اٹھایا اور دوا دیکر، ایک جرعہ افشردۂ نارنج کا، اور کچھ دانے انگور کے کھلائے اور پھر نرمی سے تکیہ کے اوپر اُس کا سر رکھ کر سامنے کرسی پر بیٹھکر کتاب اُٹھائی اور یوسف سے مخاطب ہو کر بولی "کیا آپ سنیں گے"۔ یوسف جو اسوقت مس ہلن کی ان تمام عنایتوں، اور قربانیوں پر غور کرکے اس خیال سے پریشان ہو رہا تھا کہ وہ کیونکر ان کا عوض دے سکتا ہے، آنکھ بند کرکے خاموش ہو گیا اور مس ہلن کا فقرہ اس انہماک میں اس کے کانوں تک نہ پہونچ سکا۔ مس ہلن، یہ دیکھکر کہ یوسف نے آنکھیں بند کر لی ہیں اور شاید وہ اب آرام کریگا، آہستہ آہستہ کرسی سے اُٹھی اور دروازوں کے پردے کھینچکر دبے پاؤں وہاں سے جانے لگی تاکہ وہ اطمینان سے سو جائے، لیکن یوسف جو ان تمام باتوں کو دیکھ رہا تھا، گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور بولا کہ "نہیں آپ یوں نہیں جا سکتی ہیں، ادھر تشریف لائیے"۔ نہ صرف اس کی آواز میں اس وقت ایک آمرانہ لہجہ تھا، بلکہ اُس کے چہرہ کے خط و خال سے بھی عجیب طرح کی خشونت پیدا تھی اور اس کے تیوروں سے انتقام ٹپک رہا تھا۔

مس ہلن نے پلٹ کر دیکھا تو اس خیال سے نہیں کہ یوسف نے اسے روکا تھا بلکہ محض اس بنا پر کہ کہیں اس طرح دفعتہً اپنے آپ بیٹھنا

یوسف کے لئے مضرت رساں نہ ہو، تیزی کے ساتھ واپس گئی اور یوسف کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر چاہا کہ اُسے پھر لٹا دے، لیکن اُسنے نہایت غور سے۔ ہلن کا چہرہ دیکھکر اس کے دونوں ہات اپنی پیٹھ سے ہٹا دئے اور کہا کہ "معاف فرمائیے میں لیٹونگا نہیں، آپ بیٹھ جائیے اور میری ایک بات کا جواب دیجئے"

مس ہلن بیٹھ گئی تو یوسف نے پھر اس کی صورت کو نہایت غور سے دیکھا اور دریافت کیا کہ "آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ میرے لئے اس قدر تکلیف برداشت کریں؟"

مس ہلن کو اس فقرہ پر ہنس پڑنا چاہئے تھا، لیکن اُس نے ضبط سے کام کیا کیونکہ وہ سمجھتی تھی جس مقصد کے حصول کے لئے اُس نے اپنا اس قدر وقت ضائع کیا تھا اس کا اب وقت آگیا ہے یا آنے والا ہے اور اس سے اُس نے صد درجہ سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا کہ "آپ کو کیا حق حاصل تھا کہ میرے سامنے یوں گھوڑے سے گر کر بیہوش و مجروح حالت میں آتے"

یوسف:- "اسپر تو مجھے کوئی اختیار نہ تھا"

ہلن:- "اور اسپر مجھے نہ تھا"

یوسف:- "آپ غالباً بہت خوش ہونگی کہ آپ نے اپنی الفت و عنایت و ایثار و ربانی سے کام لیکر میری بیماری کی یہاں تک کہ میں اچھا ہو گیا لیکن شاید کہ یہ علم ہوگا کہ آپ نے مجھے ایک مرض سے اچھا کر کے دوسرے مرض میں مبتلا کر دیا جو اس سے بہت زیادہ سخت ہے۔ میرا جسم تو شاید یوں بھی صحیح ہو جاتا آپ ہوتیں یا نہ ہوتیں لیکن یہ جو آپ نے میری روح کو علیل بنا دیا ہے اس کا علاج تو شاید آپ کے پاس بھی نہ ہوگا مصلحت کے لئے بتائیے میں کیونکر آپ کی عنایتوں کا اعتراف کر سکتا ہوں، مجھے سخت وحشت ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح اس بار کو برداشت کر سکونگا میرے جسم پر تو آپ کے ہات کی ہر جنبش اب گرم لوہے کی سلاخ کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ پھر اگر آپ اس مسئلہ میں خاموش رہیں گی تو میری تمنا اس سے زیادہ اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ خدا کرے آپ اس سے زیادہ شدید بیمار پڑیں اور میں آپ سے زیادہ انہماک کے ساتھ آپ کی تیمار داری میں مصروف ہوں"

مس ہلن یہ سنکر بے اختیار ہنس پڑی اور بولی کہ "اگر آپ کی تیمار داری مجھے اچھا نہ کر سکی تو پھر کیا ہوگا"

——— "کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ میں اپنی زندگی کو بھی آپ کے لئے تباہ کر دوں"

——— "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ کسی کے لئے زندگی کیونکر تباہ کی جاتی ہے"

یوسف پر اس سوال کا اس قدر سخت اثر پڑا کہ وہ گھبرا کر مسہری سے اُٹھ کھڑا ہوا لیکن چونکہ ابھی کمزوری بہت زیادہ تھی اس لئے اُسے چکر آیا اور زمین پر گر پڑا جس کی وجہ سے اس کے سر کا زخم پھر پھٹ گیا اور تھوڑی دیر کے لئے مس ہلن کے سامنے پھر وہی منظر آگیا جو حادثہ کے اول دن پیش آیا تھا۔ (باقی)

نیاز فتحپوری

باب الاستفسار

وہی یوسف، وہی افسانۂ حسن

(جناب سید فخر عالم فاضل فرنگی محلی - بھاگلپور)

نگار ماہ فروری سنہ ۲۸ء کے باب الاستفسار کی تحت میں جناب نے حسن یوسف کا غیر مصدق عن القرآن ہونا ثابت کیا ہے اور اپنے خیال کو تقویت پہونچانے کی غرض سے بہت کچھ جد و جہد کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ نے زیادہ غور و فکر سے کام نہیں لیا، اگر آپ سورۂ یوسف پر غائر نظر ڈالتے تو آپکو یوسف علیہ السلام کا غیر معمولی حسین ہونا معلوم ہو جاتا۔ بہر کیف میں آپ ہی کی تحریر سے بتا دونگا کہ حسن یوسف کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے اور کہیں کہیں آپ کی تحریر کے علاوہ مفسرین کے اقوال اور احادیث سے بھی مدد لونگا۔

سب سے پہلے آپنے اخوان یوسف کے مکالمہ سے فائدہ اُٹھانا چاہا ہے اور یہ تحریر فرمایا ہے کہ اُن کے بھائیوں نے اپنے باپ کی محبت یوسف کی طرف زیادہ دیکھی تو بولے کہ ہمارا باپ، یوسف اور اس کے بھائی کو زیادہ چاہتا ہے اگر حسن باعث محبت ہوتا تو ویسا تذکرہ کرتے لیکن اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا جس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں اذ قالوا لیوسف واخوہ احب الی ابینا منا ونحن عصبۃ ان ابانا لفی ضلال مبین ۔ جبکہ کہا ان سبھوں (اخوان یوسف) نے کہ ہمارا باپ، یوسف اور اس کے بھائی کو زیادہ چاہتا ہے حالانکہ ہم لوگ عصبۃ ہیں درحقیقت ہمارا باپ کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ اس آیت میں وجہ زیادتی محبت تو کچھ بھی مذکور نہیں ہے تو کیا اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام میں کوئی خصوصیت و خوبی تھی ہی نہیں؟ پھر بغیر کسی خصوصیت و خوبی کے باپ کی غایت نظر شفقت اُن دونوں بھائیوں پر کیوں تھی اور وہ کون سی شے ان دو ہستیوں میں پنہاں تھی جو ان سبھوں میں نہ تھی یقیناً آئندہ ملنے والے مدارج تھے جو یعقوب علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہو چکے تھے۔ لیکن صرف یہی ایک باعث نہ تھا بلکہ جمال یوسفی بھی تھا جس کا ثبوت واقعہ چاہ سے ملتا ہے یعنی اگر وجہ محبت صرف نبوت ہوتی تو اخوان یوسف کو دونوں بھائیوں کے قتل کی سازش کرنی چاہئے تھی کیونکہ حضرت یوسف اور بنیامین دونوں نبوت کے لئے منتخب ہو چکے تھے لیکن قرآن سے صرف یوسف علیہ السلام کے قتل کی سازش کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ اُن کے بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا تھا کہ۔ اقتلو یوسف او اطرحوہ ارضاً یخل لکم وجہ ابیکم وتکونو من بعدہ قوماً صلحین۔ یوسف کو مار ڈالو یا پھینکدو کسی زمین پر تاکہ تمھارے باپ کی خاص توجہ تم لوگوں کی طرف ہو جائے اس کے بعد قوم صالح ہو جانا۔ کیا اس آیت سے بھی حضرت یوسف کا حسین تر ہونا ثابت نہیں ہوتا؟ حالانکہ بنیامین اور یوسف ایک ہی ماں کے پیٹ کے اور ایک ہی درجہ رکھنے والے تھے۔ لیکن پھر بھی ان دونوں

بھائیوں کے درمیان تقابل کرنے کے بعد جو چیز بنیامین سے یوسف کو بڑھا دیتی ہے وہ حسن ہی نظر آتا ہے اور آپ کا یہ کہنا کہ ان کے بھائیوں نے یوسف کے جمال کا ذکر نہیں کیا قابل افسوس ہے۔ سب سے پہلے آپ کو ان کے طرز تکلم کو ملاحظہ فرمانا چاہئے تھا بھلا جو شخص اپنے باپ کو گمراہ یا خطاوار سمجھے اور اُس شخص کے نقایص کو دکھانے بیٹھے جس کی گود میں پل کر جوان ہوا ہے۔ کیا آپ اُس کی زبانی سوتیلے بھائی کے محاسن سننے کے منتظر ہیں؟ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ؎

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیب ست

مکالمہ یا مشورت اخوان یوسف کے بعد آپ نے کاروان کی آمد کے قصہ کو پیش کرتے ہوئے یا بشریٰ ہذا غلام سے اپنے قول پر استدلال قائم کرنا چاہا ہو لیکن آپ کو خبر نہیں کہ لفظ بشریٰ کے بعد یہ کہنے کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کہ یہ کیسا حسین و خوبصورت لڑکا ہے' حیرت و استعجاب کا اظہار اسوقت کیا جاتا ہے جبکہ انسان کوئی نئی چیز دیکھتا ہے۔ اگر اچھی اور خوبصورت شے نظر آگئی تو بیساختہ انسان کہہ اُٹھتا ہے "اہا ہا" یہی حال وہاں بھی ہے کہ ان لوگوں نے ایک غیر معمولی حسین لڑکے کو دیکھا تو خوشی سے اچھل پڑے اور بولے "یا بشریٰ ہذا غلام" اماں واہ کیا لڑکا ہے"! اور بشریٰ سے آدمی کا نام مراد لینا بر بنائے روایت صحیح غلط ہے۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ عزیز مصر جب حضرت یوسف علیہ السلام کو گھر لیکر آیا تو اسوقت بھی حسن کا ذکر نہیں کیا سوال یہ ہے کہ جب تک یوسف علیہ السلام میں کوئی خاص بات نہ تھی تو پھر عزیز نے خرید کر متبنیٰ کیوں بنایا؟ اسوقت موجودہ اور فوری کشش جو یوسف علیہ السلام میں پائی جاتی تھی اور جسے دیکھکر عزیز مصر متبنیٰ بنانے کے لئے تیار ہو گیا اور جس کو دیکھکر عزیز کے دل کا کنول کھل گیا وہ آپ کا حسن ہی تھا۔ اس لئے کوئی ضرورت نہ تھی کہ عزیز آپ کے حسن کا بھی تذکرہ کرتا۔ کیونکہ حسن تو زلیخا کے سامنے موجود ہی تھا۔ پھر آپ آگے چلکر۔ ولما بلغ اشدہ آتینہ حکما وعلما میں جمال یوسفی کی جستجو کرتے ہیں۔ حالانکہ یہاں تو خدا یہ کہہ رہا ہے کہ جب یوسف پر مصائب و آلام کی انتہا نہ رہی اور اس نے ایسی تکلیفوں میں بھی صبر کیا یہانتک کہ دور فتن کی جوانی پوری ہو چکی یعنی ساری مصیبتیں ختم ہو گئیں اور آخر تک یوسف علیہ السلام نے خدا کو نہ بھلایا تو اب خدا صبر کے بدلہ میں علم و حکمت عطا کرتا ہے چنانچہ آگے خود ہی فرماتا ہے کذالک نجزی المحسنین۔ اسیطرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اور یہ علم و حکمت کا عطیہ مصائب کے بعد ملتا ہے اور حسن تو خدا پہلے ہی دے چکا تھا اُسوقت تو جدید عطیات عنایت ہو رہے ہیں۔ قدیم عطیات کی یاد دہانی یا ذکر کی کیا ضرورت تھی۔

اگر میں آپ ہی کے قول کو صحیح مان لوں تو بھی مقصد حاصل ہے کیونکہ آپ نے ولما بلغ سے یوسف علیہ السلام کی جوانی مراد لی ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ جب یوسف جوان ہوا تو ہمنے علم و حکمت سکھائی تو بندہ پرور ذرا غور فرمائیے کہ یہاں تو ان نعمتوں کا ذکر ہے جو عالم شباب میں خدا نے یوسف کو دی ہیں اور نعمت حسن تو قبل ہی اُن کو مل چکی تھی پھر جدید

نعتوں کے ساتھ قدیم علماء کی جستجو کیا معنی رکھتی ہے اگر حسن بھی جوانی کے بعد ملتا ہے تو یوسف علیہ السلام کو بھی ملتا لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے یعنی انسان حسین یا بدصورت ماں کے پیٹ ہی سے پیدا ہوتا ہے تو پھر یوسف علیہ السلام کیونکر جوانی کے بعد نعمت حسن سے معمور ہوتے اور جب یہ بات تصدیق شدہ ہے تو خدا کی خاموشی بھی اس موقع پر ذکر حسن سے میں دانائی پر مبنی ہے۔

ملا بلغ کی تشریح کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ قرآن نے زلیخا کے تعشق یا لگاوٹ کا ذکر کرتے وقت بھی حسن یوسفی کی طرف ارشاد نہیں کیا میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ جیسا ادیب و افسانہ نگار یہاں بھی سپر ڈالدیتا ہے حالانکہ عورتوں کے عشق و تعشق کا دارومدار ہی حسن ظاہری پر ہے جس کی مزید توضیح کی یہاں گنجایش نہیں۔

مجھے پھر اظہار حیرت کی ضرورت پیش آگئی کیونکہ آپ عاشقوں کی جبر سٹ میں ہو کر اور حقیقت کا اقرار کرنے کے بعد پھر حق انکار کرتے ہیں اور جناب نے غضب تو یہ کیا کہ پہلے قرآن سے استدلال کرنے کا دعویٰ کیا اور پھر مفسرین کے اس قول کو بھی آڑ بکڑی کہ چرچا کرنے والی عورتیں عزیز مصر کے ہاں کام کرنے والی یا آنے جانے والی تھیں۔ حالانکہ یہ آپ کے اصول کے خلاف ہے۔ اگر آپ مفسرین کے اقوال سے بھی مسئلہ میں سند لینا چاہتے ہیں تو کوئی جھگڑا ہی باقی نہیں رہتا، اس لئے کہ سب سے زیادہ قرآن کو اگر کسی نے سمجھا ہے تو حضور اکرم صلعم ہیں اور آپ کا ارشاد حسن یوسفی کی تعریف میں موجود ہے۔ یعنی جب حضرت عائشہ صدیقہ نے حسن یوسفی اور حسن نبوی کا موازنہ حضور سے چاہا تو آپ نے فرمایا ہم میں اور یوسف میں ملاحت وصباحت کا فرق ہے۔ پھر حدیث کے ہوتے ہوئے حسن یوسفی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ مزید تشریح کے لئے آنحضرت کی معراج والی حدیث ملاحظہ فرمائیے۔ قال مررت بیوسف علیہ السلام لیلۃ عرج بی الی السماء فقلت بجبریل علیہ السلام من ھذا فقال ھذا یوسف فقیل یا رسول اللہ کیف رایتہ قال کالقمر لیلۃ البدر نقلہ الرازی۔ جب حضور صلعم نے یوسف علیہ السلام کے حسن کے متعلق ہلال بدر فرمایا تو پھر حسن یوسفی میں ہماشما کو شک کی کب گنجائش ہے۔ خیر یہ تو الفاظ معترضہ تھے۔ اب آپ مکر کو ملاحظہ فرمائیے۔

آپ مکر سے دو مطلب مراد لیتے ہیں، اول شہری عورتوں نے زلیخا کی محبت کا چرچا کیا تو زلیخا نے ان کے مکر کو سمجھکر دعوت دی۔ دوئم شہری عورتوں میں اور زلیخا میں یوسف کو رام کرنے کے لئے کوئی حیلہ طے ہو گیا تو عرض یہ ہے کہ ان عورتوں کا محبت کرنا یا زلیخا سے مشورت کے بعد یوسف کو قابو میں لانے کے لئے ہاتھ کاٹ لینا قابل غور ہے۔ گرچہ میں اس کو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ زلیخا اور دوسری محبت کرنے والی عورتوں نے مکر یوسف کو رام کرنے کی ترکیب کی ہو اس لئے کہ رقابت ہرگز اس کی مقتضی نہیں ہے اور خاص کر عورتوں کی رقابت کہ اپنے معشوق کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے مجموعی قوت صرف کریں کیونکہ یہ بالکل خلاف

خلاف فطرت ہے۔

اب رہی پہلی بات یعنی زلیخا کے ماسوا دوسری عورتوں نے جذبۂ محبت سے مجبور ہو کر دیدار یوسفی کے لئے طعنہ زنی کا بہانہ نکالا۔ تو دیکھنا یہ ہے کہ کیا مصر میں کوئی مرد ایسا نہ تھا جس پر یہ عورتیں اپنا دام فریب بچھاتیں۔ صرف یوسف علیہ السلام میں وہ کون سی ایسی خصوصیت تھی کہ وہ عورتیں سارے مصر کے مردوں کو چھوڑ کر یوسف علیہ السلام پر جان دینے لگیں۔ یقیناً آپ کا غیر معمولی حسن تھا جو اور مردوں میں نہ تھا پس کیا پھر آپ یہ کہنے کو تیار نہیں کہ قرآن سے اشارتاً و کنایتہً بھی حسن یوسفی کا پتہ نہیں چلتا۔ دوسرے فلما راینہ سے کافی ثبوت یوسف علیہ السلام کے غیر معمولی حسین ہونے کا ملتا ہے اس لئے کہ حرف فا کا استعمال کلام عرب میں تعقیب کے لئے آتا ہے یعنی تراخی بلا مہلت جس سے ثابت ہو گیا کہ ان کی عورتوں نے دیکھتے ہی فوراً عالم بیخودی میں اپنے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور بول اٹھیں۔ ان ہذا الا ملک کریم۔ یہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔ اور حسن حور و پری و فرشتہ عوام میں مشہور ہے۔ اور فلما راینہ یعنی جوں ہی ان پر نظر پڑی قطعن ایدیہن۔ ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اب آپکا یہ کہنا کہ یوسف علیہ السلام کو ڈرانے دھمکانے اور فریب میں لانے کے لئے اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا ہرگز صحیح نہیں۔ جیسا میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ حرف فا اپنی حقیقت موضوع لہ کی بنا پر بغیر بات کئے ہوئے اور ٹھہرے ہوئے ان عورتوں نے پہلی ملاقات میں اپنا اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا تو پھر باعث قطع ید معصومیت و تقدس قرار دینا سخت غلطی ہے اور تقدس ہی مراد لیتے ہیں تو مجھے بتا دیں کہ آج تک کسی نے کسی کے تقدس پر جان دی ہو یا کم از کم ہاتھ ہی کاٹ ڈالا ہو۔ یقیناً ادب و تاریخ کے اوراق آپ کے اقوال کی تغلیط کرنے کو کافی ہیں۔ ہاں اس واقعہ کے بعد وہ عورتیں آپ کے تقدس کی قائل ہو گئیں۔ جس کا ثبوت آگے کے واقعہ سے بھی ملتا ہے۔

اور یہ تو عقل سے لگتی بات ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ان عورتوں کے عشق و فریفتگی کو بھی ملاحظہ کیا لیکن ان کا دل نہ پسیجا۔ تو زلیخا نے مجبور ہو کر اپنی ذاتی رائے سے یا اُن عورتوں کے مشورہ سے یوسف کو قید کر دیا کہ شاید قید کی پابندیوں سے عاجز آ کر میری طرف راغب ہو جائیں، لیکن آپ نے ایسا نہ کیا۔ یہانتک کہ عزیز مصر نے ان کے علم تعبیر رویا کا حال معلوم کر کے ان کو قید خانہ سے بلا بھیجا تو انھوں نے اپنے تقدس و حیا و صداقت کی شہادت انہیں عورتوں سے چاہی جو ان پر فریب کا جال بچھانے کو تیار تھیں۔ اور جب ان عورتوں سے عزیز مصر نے پوچھا تو انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ ہم نے یوسف میں کوئی لغزش نہیں پائی وہ نہایت صالح و نیک مرد ہیں۔ عزیز کو اسیقدر تحقیق کی ضرورت تھی اور اسیقدر عزیز نے سوال بھی کیا تھا اور اسی کی شہادت یوسف نے بھی دینی چاہی تھی نہ کہ اپنے حسن کی شہادت۔

جب مسلم امر ہے کہ نہ تو یوسف علیہ السلام نے حسن جتانا چاہا اور نہ عزیز نے ان کے حسن کو پوچھا تو پھر وہ عورتیں سوال سے غیر متعلق جواب کیوں دیتیں۔ اور یہاں پر حسن کے اظہار کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں کیونکہ جب آفتاب ہماری آنکھوں

کے سامنے چمک رہا ہے تو پھر کسی سے یہ سوال کرنا کہ آفتاب میں چمک ہے یا نہیں، کس قدر حماقت و بیوقوفی کا سوال ہوگا۔ لہٰذا آپ کا بیان بر جمال یوسفی کی تلاش کرنا مہمل سا معلوم ہوتا ہے

اس مختصر تشریح کے بعد غالباً آپ مان گئے ہوں گے کہ قرآن میں کنایۃً اور استعارتاً حسن یوسفی کا تذکرہ موجود ہے اور یہی وہ معجزہ طرز ادا قرآن کا ہے جس نے دنیا عرب کی زبانیں بند کر دی تھی اگر استعارہ وکنایہ سے اس کا مقصد محض فصاحت ہوتا تو سرکار کے حسن ظاہری کو بھی خدا صاف لفظوں میں قرآن میں ذکر کرتا لیکن بخلاف اس کے ہر جگہ اپنے حسن وجمال کو استعارہ وکنایہ میں ذکر کیا ہے۔

(جناب مولوی غلام ربانی صاحب عزیزؔ۔ کیمبل پور)

میں اس مضمون پر قلم اٹھاتا تو ہوں لیکن آپ کا یہ فقرہ کہ "حسن یوسف کا بے نقاب کرنے والا دنیائے شعر و ادب کی بڑی خدمت انجام دیگا" دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ اور گو اس وقت میں اتنا عدیم الفرصت ہوں، کہ بعض اوقات بڑے بڑے ضروری خطوط کے جواب میں ہفتوں گزر جاتے ہیں۔ اور وقت نہیں ملتا۔ لیکن یہ بحث ہی کچھ ایسی چھڑ گئی ہے کہ سمند قلم بے لگام ہوا جاتا ہے اور پھر یہ بھی کچھ کم قابل فخر امر نہیں اگر میں اس طرح "دنیا شعر و ادب کی کوئی خدمت سرانجام دے سکوں"

میرا خیال ہے۔ کہ آپ کو اس میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔ اگر مکر کے معنے سازش کے لئے جائیں بمعلا سمعت بمکرہن کے معنے یہ ہوں گے، کہ جب زلیخا کو ان کی سازش کا جس کا آیت ماقبل الذکر میں ذکر ہو چکا ہے۔ علم ہوا تو وہ بہت تہ و بالا ہوئی، اور اس نے انھیں انکی غلطی کے احساس اور اپنی مجبوری کے اظہار کے لئے دعوت کا انتظام کیا۔ جب اُنھوں نے یوسف کو دیکھا تو اس کو بڑا جانا۔ اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے مجھے یہاں آپ سے چند باتوں سے اختلاف ہے۔

(۱) کسی شخص کے عشق و محبت کا افسانہ بیان کرتے ہوئے اپنی رائے کا ان الفاظ میں اظہار کرنا کہ ہمارے ہاں اپنے غلام سے عشق کرنا سراپا گمراہی ہے۔ اور زلیخا شدید ترین غلطی کا ارتکاب کر رہی ہے۔ عزیز مصر کی بیوی کے برخلاف خطرناک سازش ہے جس سے اس کے اخلاق اور چال چلن نہ قابل معافی الزام اور دھبہ لگتا ہے۔

(۲) اور پھر فلما رأینہ میں لفظ رویت سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ان عورتوں نے یوسف کو پہلی بار دیکھا تھا۔ ورنہ لفظ رویت کی تقدیم بیکار ہے۔ بلکہ کوئی ایسا لفظ لگایا جاتا۔ جو موقع کے مطابق ہوتا۔

(۳) مزید براں اکبر کا لفظ نہایت بلند آہنگی سے ان جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ جو یوسف کے دیکھنے سے ان عورتوں کے دل و دماغ پر طاری ہوئے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا لفظ تعجب اور حیرت کے موقع پر ہی بولا جاتا ہے۔ اب صرف قابل

دریافت یہ امر ہے کہ وہ کونسی چیز تھی کہ جس سے وہ محو حیرت ہو گئیں

غالباً آپ اس امر میں مجھ سے متفق ہوں گے۔ کہ ہم فقط دیکھنے سے کسی شخص کے اخلاق اور چال چلن کے متعلق صحیح کیا غلط اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ اخلاق کو جانچنے کے لئے کوئی اور معیار درکار ہے۔ اور پھر نہ کسی شخص کے حسن اخلاق سے ہم ایسے متاثر پذیر ہو سکتے ہیں کہ ہماری زبان سے اللہ اکبر کا جملہ تڑپ کر نکل جائے۔ پس ظاہر ہے کہ اس قدر مبہوت کن حیران ساز اور آئینہ بنانے والا صرف حسن کا جادو ہی ہو سکتا ہے۔ ورنہ اخلاق میں یہ کہربائی کشش کہاں ہے۔ آپ نے یہ جملے اپنی طرف سے زاید کر لئے ہیں۔ کہ یوسف ڈرانے دھمکانے پر بھی قابو میں نہ آئے اور انھوں نے ہاتھ بھی کاٹ لئے تب بھی وہ نہ لچے اور انھیں ان کے تقدس پر تعجب ہوا،

قرآن حکیم کے الفاظ کی بندش صاف ظاہر کر رہی ہے۔ کہ وہ اس قدر وقفے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ کہ انھوں نے لگاوٹ کی اور جب قابو نہ چلا، تو ہاتھ کاٹ ڈالے۔

ہاں آپ کا یہ اعتراض بجا ہے کہ یوسف کے حسن کے لئے "ملک کریم" کا لفظ غیر موزوں ہے، لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ اگر مرحوم آزاد کا یہ خیال درست ہے کہ نیچرل خیالات تمام دنیا کے تقریباً ایک جیسے ہیں تو پھر یہ مشکل بھی رفع ہو جاتی ہے۔ ہمارے یہاں اگر عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف کی جائے تو انھیں پریوں سے اور بچوں یا نوجوانوں کے جمال کی تعریف کی جائے تو فرشتوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور پھر اگر یہ تاویل آپ کو نہ بھاوے تو اس کی ایک اور توجیہ بھی نہایت موزوں اور مناسب خیال کی جا سکتی ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ عشق میں ترازو کے ہر دو پلڑوں کا توازن رسوائی اور بدنامی میں قائم رکھا جاتا ہے۔ میری رسوائی پر اُن کو خوش نہ ہونا چاہئے قیس رسوا تھا تو کیا لیلیٰ کی رسوائی نہ تھی

زلیخا کی رسوائی کے ضمن میں یوسف کی جو رسوائی ہوئی تھی وہ بھی عورتوں کی اسی جماعت کی شرمندۂ احسان تھی جب وہ یوسف کے جمال سے اس قدر حیرت زدہ ہوئیں۔ کہ اللہ اکبر! انکی زبان سے نکل گیا۔ تو انھوں نے جھٹ اس الزام کی تردید بھی کر دی۔ جو بالواسطہ یوسف پر لگایا گیا تھا۔ یہاں بیشک آپ سوال کر سکتے ہیں کہ وہ اس قدر جلدی کیوں کر یوسف کی خوبی اخلاق سے متاثر ہو گئیں حالانکہ یوسف کو وہاں آئے ہوئے ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا، میرے اس جواب کا تعلق نفسیات سے ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب ہم کسی شخص کے حسن و جمال یا رعب و جلال سے یوں فوری طور پر متاثر ہو جائیں تو ہمارے دل میں فوراً ان کی خیرخواہی اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور ہم بالکل گوارا نہیں کر سکتے کہ اس شخص کے متعلق کسی قسم کے مضر خیال کی اشاعت ہو۔ زنانِ مصر کے دل میں بھی یوسف کے متعلق اس وقت یہی جذبہ کارفرما تھا جب انھوں نے اس غیرتِ ناہید کو دیکھا۔ ان کے دلوں نے انھیں ملامت کی اور بے اختیار اُن کی زبان سے نکل گیا۔ حاشا للہ ما ہذا بشرا۔ مجھے اس پر بھی حیرت ہے کہ آپ زنانِ مصر کو زلیخا کے ساتھ شریک جرم قرار دے کر بھی یوسف کے جمال کی

تاثیر سے منکر ہیں۔ ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ عورتیں خواہ یہ کوئی ہوں۔ اور کتنی ہوں ساری کی ساری زلیخا کے ساتھ شریک عشق ہیں۔ اگر وہ معمولی حسن و جمال کا مالک تھا۔ تو آخر ان واقعات کو عامۃ الوقوع ہونا چاہئے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ ہماری زندگیاں ان رنگینیوں سے خالی نظر آتی ہیں اور حسرت جلوہ کلب بام سے مرے جا رہے ہیں۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ میرا خیال ہے کہ یہ عورتیں میں جمع کی ضمیر نے بھی آپ کی کافی امداد کی ہے۔

یہ قدرتی امر ہے کہ جب یوسف کو زلیخا نے اس مجمع میں بلایا۔ تو یہ تو نہیں ہوسکتا۔ کہ وہ زنان مصر بہار خزاں دیدہ ہونگی۔ بلکہ عام سمجھ کی بات ہے۔ کہ ایسی محفلوں میں وہی نظارہ سوز ہوتی ہیں۔ جو دولت حسن کی مالک ہوں۔ یوسف کا ایسے مجمع میں بلانے سے زلیخا کا مطلب خواہ کچھ کیوں نہ ہو لیکن یوسف نے یہی سمجھا ہوگا کہ اس کم بخت نے پھانسنے کیلئے یہ گلدستہ ہائے رنگا رنگ جمع کئے ہیں۔ اور گو زنان مصر، اس وقت یہ جذبہ لیکر نہیں گئی تھیں لیکن یوسف کے آنے نے سارا نقشہ بدل دیا۔ اور نگاہوں نے غمازیاں کیں،

چنانچہ یہی خیال اس کے دل میں رہا۔ اور آخر اس نے بادشاہ مصر سے کہدیا۔ کہ ما بال النسوة التی قطعن ایدیھن علاوہ ازیں زنان مصر کا یہ جلسہ کیا رسوائے عالم نہ ہوا ہوگا۔ اور کیا عوام اس سلسلہ میں یوسف سے بھی بدظن نہ ہوئے ہونگے اور پھر اس کی قید نے اس کی تائید نہ کردی ہوگی۔ یہ وہ جوابات تھے جن کے ماتحت یوسف کو اپنی برائت کے لئے ان عورتوں کا ذکر کرنا پڑا۔

(**نگار**) گزشتہ ماہ کے رسالہ میں "حسن یوسف" کے متعلق میرے اظہار خیال پر آخرکار بعض "حسن پرست" طبیعتیں بے چین ہو ہی گئیں اور اُن کو گوارا نہ ہوا کہ "مذہبی جمالیات" پر کسی قسم کی تنقید کیجائے میرے مضمون کے رد میں متعدد تحریریں وصول ہوئیں، جن میں صرف دو درج کی جاتی ہیں۔ باقی تحریریں چونکہ ان سے بھی زیادہ "حسن استدلال" رکھتی تھیں اور جن میں "نسائیت" کے صرف اس حربہ سے کام لیا گیا تھا جسے گالی۔ کوسنا کہتے ہیں، اور جس کے سامنے ایک مرد کو سپر ڈالدینا ہی پڑتی ہے اس لئے اُن کو درج کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ مجھے افسوس ہے اور تھوڑی سی حیرت بھی کہ نہ فاضل فرنگی محلی نے میرے مقالہ کو غور سے پڑھا اور نہ مولوی غلام ربانی صاحب نے ——— میں نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ حضرت یوسف حسین نہیں ہوسکتے تھے یا یہ کہ اُن کے جمیل ہونے میں کوئی استحالۂ عقلی ہے بلکہ مدعا صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ کلام مجید سے ان کا جمیل ہونا اور ایسا جمیل ہونا کہ اُسے "عطایائے نبوت" یا "معجزات خداوندی" میں شمار کیا جائے کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ پھر جس رسوخ کے ساتھ اس سے قبل میں اس خیال پر قائم تھا، اسی طرح اب بھی ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں حضرات کی تاویلیں کیونکر اُس صداقت کو محو کرسکتی ہیں جو یقیناً "حسن یوسف" کے افسانہ

سے زیادہ حقیقت رکھتی ہے۔

میں جواب کے دو پہلو اپنے پاس رکھتا ہوں ایک تو یہ کہ ان حضرات نے جو تاویلیں کلام مجید سے حسن یوسف کے ثابت کرنے کے لئے ایداع کی ہیں اُن کی حقیقت کو واضح کردوں اور دوسرے یہ کہ اِن سب کو نظر انداز کرکے ایک اصولی بحث کے ذریعہ سے یہ بتادوں کہ حضرت یوسف کے جمال کو معجزہ قرار دینا عقلاً محال ہے اور عملاً عبث و بیکار۔ میں اس بحث پر زیادہ صفحات لینا مناسب نہیں سمجھتا لیکن چونکہ اس کے بعد مجھے اس موضوع پر کچھ لکھنا بھی نہیں ہے اس لئے میں کوشش کرونگا کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے مختصراً اسی اشاعت میں عرض کردوں اور بحث کے دونوں پہلوؤں کو پیش کرکے ہمیشہ کے لئے خاموش ہوجاؤں۔ پہلے میں اپنے حریفوں کے جواب پر تنقید کرتا ہوں

فاضل فرنگی محلی فرماتے ہیں کہ برادران یوسف جانتے تھے کہ یعقوب علیہ السلام یوسف اور بنیامن سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور یعقوب کی محبت اس بنا پر تھی کہ وہ ذریعہ وحی معلوم کرچکے تھے کہ یہ دونوں بھائی نبوت کے لئے منتخب ہوچکے تھے پھر چونکہ برادران یوسف اس محبت کی بنا پر دونوں بھائیوں سے جلتے تھے اس لئے چاہئے تھا کہ وہ دونوں کو ہلاک کرتے، لیکن انھوں نے صرف یوسف کو کنویں میں ڈالا کیونکہ وہ بہت جمیل تھے۔

اس کا جواب بہت مختصر ہے اور وہ یہ کہ جب یعقوب کی محبت یوسف اور بنیامن سے اس بنا پر تھی کہ وہ ان کے آئندہ مدارج سے ذریعۂ وحی آگاہ ہوگئے تھے، جیسا کہ خود فاضل فرنگی محلی نے ارشاد فرمایا ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یعقوب کو یوسف ہی سے زیادہ محبت رہی ہوگی کیونکہ نبوت تو یوسف ہی کی قسمت میں لکھی تھی نہ کہ بنیامن کے لئے (فاضل فرنگی محلی نے بنیامن کو بھی پیغمبر بتایا ہے مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس قوم کے لئے نبی مبعوث ہوئے تھے) اور اگر بنیامن کو بھی تھوڑی دیر کے لئے نبی مان لیا جائے تو اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ یوسف کے مرتبہ کے نبی نہ تھے اور اس لئے یقیناً یعقوب، یوسف ہی سے زیادہ محبت کرتے ہوں گے اور اسی بنا پر برادران یوسف نے یوسف ہی کو ہلاک کرنا چاہا۔ حسن و جمال کو وجہ قرار دینا ایک ایسی تاویل ہے جس کی تردید خود فاضل فرنگی محلی کے قول سے ہوتی ہے

دوسرا استدلال یہ پیش کیا گیا ہے قافلہ والوں کا یوسف کو کنویں میں دیکھ کر "یا بشریٰ" کہنا ہی ثابت کرتا ہے کہ آپ بہت خوبصورت تھے۔ "یا بشریٰ" کے بعد بیان حسن و جمال کی ضرورت نہیں رہتی۔

میں یہ کسی طرح ماننے کے لئے تیار نہیں کہ "یا بشریٰ" کا لفظ اس قدر حاوی و جامع ہے کہ اس کے ساتھ بیان حسن و جمال کی ضرورت نہیں رہتی۔ لفظ بشریٰ کے معنے صرف بشارت اور خوشخبری کے ہیں، اور کلام مجید میں جہاں کہیں یہ لفظ مستعمل ہوا ہے اسی معنی میں ہوا ہے انہیں بھی حسن و جمال کا مفہوم شامل نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ خاص اس موقع پر یہ معنی متبادر ہیں تو اس کے لئے پہلے حسن و جمال کو ثابت کرنا چاہئے تھا نہ کہ اسی کے ذریعہ سے اس کو ثابت کرنا۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس زمانہ میں چونکہ لونڈی غلام کے خرید و فروخت کا رواج کثرت سے تھا اور یہ قافلہ بھی یہی کاروبار کرتا تھا اس لئے جب ایک آدمی نے کنویں کے اندر ڈول ڈالا تو دیکھا

کہ اندر ایک لڑکا پڑا ہوا ہے اور اس نے اسی وقت اہل قافلہ کو پکار کر کہا کہ "مبارک ہو، کنویں کے اندر ایک لڑکا بھی مل گیا"۔ یعنی ایک مال اور ہات آیا۔ جیسا کہ آگے کی آیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ "واسروہ بضاعۃ" (یعنی اس کو بھی مال تجارت سمجھکر چھپا لیا) ڈول ڈالنے کے ساتھ ہی اس کا یہ کہنا صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اس کا مبارکباد دینا صرف اسی بنا پر تھا ورنہ کنویں کے اندر پہلی نگاہ میں وہ حسن کی حقیقت کیا معلوم کر سکتا تھا۔ اگر یوسف واقعی غیر معمولی جمیل ہوتے تو صرف "اسروہ بضاعۃ" نہ کہا جاتا بلکہ اسی کے ساتھ ایسے الفا بھی ضرور ہوتے جن سے یہ خصوصیت ظاہر ہوتی۔ اس امر کا ثبوت کہ حضرت یوسف غیر معمولی جمیل نہ تھے بعد کی اس آیت سے بھی ملتا ہے۔ "وشروہ بثمن بخس دراہم معدودۃ" یعنی اہل قافلہ نے یوسف کو نہایت کم قیمت پر چند درہموں کے عوض فروخت کر دیا۔ اگر یوسف غیر جمیل ہوتے تو ظاہر ہے کہ اہل قافلہ جو یہی کاروبار کرتے تھے کبھی ایسے "بدیعۂ حسن وجمال" کو اس قدر ارزاں نہ دیدیتے

فاضل فرنگی محلی نے "لما بلغ اشدہ آتیناہ حکما وعلما" کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اشد کے معنے انتہائی مصائب کے لئے ہیں۔ مو نہیں مجھے اس اختراع پر فرنگی محل کے نصاب تعلیم کو مبارکباد دینا چاہئے یا جناب فخر عالم صاحب کی قوت فکر کو سراہنا چاہئے۔ اگر وہ آ کی ضمیر پر غور کرکے اس کا مرجع تلاش کرنے کی زحمت گوارا کرتے تو انہیں خود معلوم ہو جاتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ خیر اسی سلسلہ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں خدا نے علم و حکمت کے ساتھ ساتھ، عطائے جمال کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ وہ تو خدا اُن کو پہ ہی دے چکا تھا" حالانکہ اگر میں اُن سے پوچھ بیٹھوں کہ کلام مجید کی کس آیت سے وہ اس کو ثابت کر سکتے ہیں۔ تو ان کے پاس سکا کے سوا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کی صراحت کسی جگہ ہوتی پھر نزاع ہی کیا تھا۔ ایک ایسی شے کو دلیل میں پیش کرنا جو خود معر بحث میں ہے طرفہ طرز استدلال ہے۔

اس کے بعد وہ اصل گفتگو آتی ہے جس پر جمال یوسفی کے تصدیق کا انحصار ہے۔ یعنی زلیخا کا فریفتہ ہو جانا اور عورتوں کا آپ کو دیکھ بجائے پھلوں کے ہاتھ کاٹ لینا۔ چونکہ اس باب میں اپنے خیالات فردی کے رسالہ میں ظاہر کر چکا ہوں اس لئے ان کی تکرار مناسب نہ معلوم ہوتی آج میں بحث کا دوسرا پہلو اختیار کرونگا۔

اس سلسلہ میں جو باتیں جمال یوسفی کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں ان میں سے اہم ترین یہ ہیں:-

(۱) زلیخا حضرت یوسف پر عاشق ہوئی اور بقول فاضل فرنگی محلی "عورتوں کے عشق کا مدار ہی حسن ظاہری پر ہے"

(۲) بعض زنان مصر کا یوسف کو دیکھ کر بجائے پھلوں کے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ ان کے حسن وجمال سے مسحور ہو گئیں

امر اول کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ محبت کا سبب صرف حسن ظاہری کو قرار دینا اس لحاظ سے تو درست ہے کہ چاہنے والے کی نگاہ میں محبوب خواہ وہ کیسا ہی ہو جمیل معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ کلیہ کہ الفت کا سبب ہمیشہ حسن محض ہوا کرتا ہے، بالکل غلط ہے دنیا میں ہزار واقعات ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نہایت جمیل عورتوں نے ایسے مردوں سے محبت کی جو نہ صرف یہ کہ جمیل

نہ تھے بلکہ واقعی بدشکل تھے۔

امر دوم کے متعلق یہ دیکھنا ہے کہ زنانِ مصر نے یوسف کو دعوت سے قبل دیکھا تھا یا نہیں، اگر دیکھا تھا تو اسوقت بھی کیوں ان سے ایسی ہی کوئی حرکت مسحوری کی سرزد نہیں ہوئی۔ اور اگر انھوں نے دعوت ہی کے موقعہ پر اول اول دیکھا تھا تو کیا سبب ہے کہ ان پر تو یہ اثر ہوا اور زلیخا پر جو حقیقتاً نہایت شغف رکھتی تھی نہ دعوت کے وقت نہ اس سے قبل کوئی اثر اس قسم کا ہوا۔ کم از کم ایک بار اگر زلیخا بیہوش ہی ہوجاتی تو بھی کہا جاتا کہ وہ تو یوسف کا حسن ہی ایسا تھا۔

اگر یوسف کا حسن اعجاز کی حد تک پہونچا ہوا تھا اور موسیٰ کے ید بیضا کی طرح وہ بھی ایک معجزہ تھا تو، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ معجزہ آپ کو اُس وقت کے تمام اہل عالم کے مقابلہ میں دیا گیا تھا یا صرف مصر والوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ تمام اہل عالم کے لئے نہ تھا کیونکہ حسن وجمال کا معیار بالکل مختلف ہے اور ہر قوم و ملک کا معیار جدا ہوتا ہے، اس لئے لامحالہ یہی ماننا پڑے گا کہ مصر والوں کے لئے معجزہ تھا۔ لیکن اس کی ضرورت اُس وقت ہوتی جب اہل مصر کو اپنے حسن پر ناز ہوتا، حالانکہ یہ نہ تاریخ سے ثابت ہے نہ قرآن سے اسی کے ساتھ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ حسن یوسفی کے معجزہ سے کیا نتیجہ برآمد ہوا اور اس نے اصلاح قوم کی کیا خدمت انجام دی اور اگر اس معجزہ سے مقصود اصلاح اخلاق نہ تھا بلکہ صرف ایک کامل مسحور کن نمونۂ جمال پیش کرنا تھا، تو چاہئے تھا کہ جو شخص آپ کو دیکھتا فریفتہ ہو جاتا، حالانکہ یہ بالکل خلاف واقعہ ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ کا حُسن کوئی معجزہ نہ تھا تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے غیر معجز حسن کے ہوتے ہوئے، تمام اسوۂ یوسفی کو چھوڑ کر صرف اسی کا افسانہ کیوں بار بار دہرایا جاتا ہے اور کیوں ایسی غیر اہم بات کا ذکر قرآن پاک میں پایا جائے۔

فاضل فرنگی محلی نے سلسلۂ گفتگو میں دو حدیثوں کا بھی ذکر کیا ہے، میرا موضوع چونکہ احادیث سے بحث کرنا نہیں تھا اس لئے میں اس وقت بھی احتراز کرتا ہوں۔ تاہم یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس وقت ان احادیث کی حقیقت پر بحث کی جائے گی تو ان سے وہی نتیجہ نکلے گا جو کلام مجید کے آیات پر غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

میرے نزدیک وہ حدیث جس میں رسول اللہ نے اپنی اور یوسف کے حسن کا فرق بتایا ہے۔ ساقط الاعتبار ہے اسی طرح وہ حدیث جس میں بتایا گیا ہے کہ شب معراج میں آپ نے یوسف کو "کالقمر لیلۃ البدر" دیکھا، بہت کچھ محل نظر ہے۔

مولوی غلام ربانی صاحب عزیز نے چونکہ اپنے مضمون میں زیادہ تر شاعری سے کام لیا ہے، اور شاعری بھی وہ جس کو میں پورے طور پر نہیں سمجھ سکا اس لئے جواب دینے سے معذور ہوں تاہم مجھے یقین ہے کہ انکی ایرادات کا بھی جواب اس میں آگیا ہوگا۔

فاضل فرنگی محلی نے ایک غلطی اور کی ہے، اس کو بھی دور کردینا مناسب سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ انھوں نے عزیز مصر کو جس نے یوسف کو متبنیٰ کیا تھا اور شاہ مصر کو جس نے یوسف کو قید خانہ سے طلب کیا تھا، ایک ہی ہستی قرار دیا ہے۔ حالانکہ عزیز مصر اور تھا

اور شاہ مصر اور ۔ مصر کے بادشاہ کا لقب عزیز تھا ، ملکہ فرعون ، چنانچہ اس وقت مصر کا فرعون یا بادشاہ ریان بن ولید بن دومع تھا ۔ اور جس شخص نے یوسف کو خرید کرکے متبنیٰ کیا تھا اس کا نام اطفیر یا قوطفیر تھا جسے انگریزی میں (Potiphar) کہتے ہیں اور عزیز مصر کے لقب سے مشہور تھا ۔ (ملاحظہ ہو ابن خلدون ، تاریخ کامل وغیرہ)

نیاز

ہمالیہ سے دو دو باتیں

بھلا مجال کہاں مجھ سے بے زبانوں کی   کہ منہ سے بات کہوں کچھ فلک نشانوں کی
ترے وجود سے عالم پہ ہو گیا روشن   کہ خاکِ ہند میں رفعت ہے آسمانوں کی
نہ بھولے ہیں ترے دامن میں سالہا جن کے   بہار گرد ہے دنیا کے گلستانوں کی
گپھاؤں سے تری نکلیں تو سارے عالم میں   صدائیں گونج اٹھیں توحید کے ترانوں کی
بلندیوں سے تری وہ ندیاں ہوئے چشمے   حیات جن سے ہے دنیا کے باغبانوں کی
ئے مجاز میں جو نشۂ حقیقت ہے   وہ یادگار ہے تو عشق کے فسانوں کی
تری بلندیٔ عز و وقار کے آگے   چلی نہ ایک ہوائی جہاز رانوں کی
یہ خامشی یہ بلندی یہ عز و شان ثبات   تو ہی قدیم نشانی ہے بے نشانوں کی
وہ صوفی جھونک دو اپنے لب مبارک سے   کہ یاد تازہ ہو بھولے ہوئے فسانوں کی

اٹل ہوں جیسے ارادے خیال جیسے بلند
اٹھیں اب ایسے زمینِ وطن سے حوصلہ مند

زمانہ میں کوئی اک حال پر رہا ہی نہیں
ہماری ذلت و پستی کی انتہا ہی نہیں

نہ ہوتا آج حمایت پہ تو اگر اپنی   نہ بھول بیٹھتے راحت میں ہم خبر اپنی
جہاں پہاڑ ہیں لاشیں وہاں نظر آتیں   جلاتے شوق سے سینوں کو ہم سپر اپنی
خیالِ زیست رہ اتحاد بن جاتا   نفاقِ قوم سے بنتی نہ جان پر اپنی
رگوں میں خون ان سردوں میں جنون بڑھ جاتا   پناہ دیتی ہمیں قوتِ جگر اپنی
بلندیاں تری ہوتیں نہ سدِ راہ اگر   تو گھوم پھر کے نہ رہتی نہیں نظر اپنی
مثالِ موجِ ہوا ہم رواں دواں پھرتے   بساط پھیلتی سارے جہان پر اپنی
جہان بھر کی حمایت پہ ہم تلے ہوتے   جو ہوتی ہات میں تلوار اور سپر اپنی
نکل کے گھر سے جنھوں نے کیا جہاں بیدار   نہ دے سکے وہ سلف ہم کو کچھ خبر اپنی
تو ہی تو مانعِ الطافِ آسمانی ہے   ترے سبب سے ہے فریاد بے اثر اپنی

ازل کے روز ستم کا یہ بندوبست ہوا   کوئی بلند ہوا اور کوئی پست ہوا
اگر فقیر کی قسمت میں بوریا آیا   تو شاہ کے لئے مسند کا بندوبست ہوا
کسی کا دل نہ بھر آتا ہے گنج لیکر بھی   کسی کے ہات جو کلی لگی تو مست ہوا
کسی کی نکہتِ ہمت سے تو بھی نیچا ہے   کوئی وہ ہے کہ خود اپنی نظر میں پست ہوا
خودی پہ غالب و زر دار و بامراد مٹے   ضعیف و بیکس و مسکیں خدا پرست ہوا
امیدِ خلد پہ سنیاس کوئی لے بیٹھا   شرابِ ناب لنڈھائی کسی نے مست ہوا
وفورِ غم سے کوئی زندگی سے عاجز ہے   کسی کا عیش بڑھا یہ کہ خود پرست ہوا
وہ نیاز میں کوئی ہے پائمالِ جہاں   تفنگ و توپ کوئی لیکے چیرہ دست ہوا
غلام ساقیٔ باطن کوئی پہ شیدا ہے   خرابِ بادۂ ظاہر کوئی پرست ہوا

اگر بڑا ہے تو چھوٹوں کی بات بھی سن لے
کسی کا قصۂ دردِ حیات بھی سن لے

ہوا ہے تجھ کو اگر قربِ آسماں حاصل   تو بیکسوں کی نہ فریادِ غم میں ہو حائل
کسی کے رنج سے پانی نہ ہو تو کیا ہے جگر   کسی کے غم پہ نہ روئے لہو تو کیا ہے دل
نباہنا حقِ ہمسائگی اگر ہے تجھے   ہمارے ساتھ تڑپ تو بھی صورتِ بسمل
رگوں سے خون کے دریا بہا کے دکھلا دے   ہٹا کے سنگ جگر ناخنوں سے کر گھائل
یہی ہے فرض یہی اقتضا مروت کا   دکھا دے عرش پہ تو چیر کر ہمارا دل
رگوں کو کاٹ کے ایک ایک نشان دکھلا دے   جہاں جہاں ہے وہ زخمی جہاں جہاں گھائل
بیان قصۂ غم ہو رقیبِ صبر و قرار   فغان درد سے ہل جائیں قدسیوں کے دل

تڑپ تڑپ کے نہ آنسو کہیں بہیں لیکے ‌ کرم یہ اپنے نہ جب تک کہ عرش ہو پامال

جو یہ نہیں تو سرک جا نظر کے آگے سے

دعا کا وقت ہے ہٹ جا جگر کے آگے سے

جواب ہمالیہ

ہمالیہ نے سنا جب یہ دلخراش کلام ‌ بھر آئے دیدۂ پرنم میں اشک لالہ فام

اک آہ سرد بھری اور یوں ہوا گویا ‌ عبث کیا ہے مجھے تو نے مورد الزام

محب و محسن و ہمدرد و دستگیر و شفیق ‌ زیادہ مجھ سے کوئی ہند کا ہے تو دے نام

ازل کے دن سے جو انجام ہند دیکھے ہیں ‌ نہ پوچھ مجھ سے کہ واقف ہیں سب خواص و عوام

عذاب ہند سے آنکھوں میں پھر تڑپتا ہوں ‌ تب درد دل سے یہ سینہ ہے محشر آلام

وہ غم ہے اُف کہ کلیجے میں پڑ گئے ناسور ‌ رواں ہے دیدۂ پرنم سے سیل اشک مدام

فلک کی سمت ہے رخ ایک پاؤں پر ہوں کھڑا ‌ یہی دعا ہے شب و روز اور صبح و شام

رحیم رحم کہ ہندی بھی تیرے بندے ہیں ‌ زمانہ ہو گیا سہتے ہوئے انھیں آلام

بڑھے ہوئے ہیں غریبوں کی جان کے لالے ‌ مٹائے دیتی ہے اب انکو گردش ایام

دکھا دے شان کرم جلد اے غفور رحیم ‌ مٹا دے ان کے ستارے سے کلفت ایام

وہاں سے آتی ہے رہ رہ کے آہ کی آواز ‌ بھلا دیا ہے ترے ہند نے ہمارا پیام

اٹھا کے رکھا ہے دیدہ و دل کو طاق نسیاں پر ‌ فسانہ کر دئے گیتا و پاک کے احکام

تمام قوم وفا داب بھول بیٹھی ہے ‌ کبھی تھا جن سے یہ خطہ بھی قدسیوں کا مقام

ستم ہے کہیں اخلاق کا نہ ایماں کا ‌ نہ حوصلے نہ کہیں ولولوں میں ہیں کام

نہ دل میں بوے وفا ہے نہ پاس غیرت ہے ‌ نہ رنگ چہرے پہ اچھا ہے اور نہ اپنا نام

قدیم رنگ محبت سے شرم آتی ہے ‌ نئے تبرک سے ہیں جو نئی اور نئے کلام

جگر میں صدق نہ سینوں میں جوش ہے باقی ‌ پیا ہے بادۂ تہذیب نو کا جب سے جام

کچھ اس طرح ہوئے بیدار کہ ہیں متوالے ‌ کہ ایک بھائی کا جھوٹا ہے دوسرے کو حرام

بٹے ہیں ایک سے یہ صد ہزار قوموں میں ‌ تو ہی بتا دے کہ کیا ہے نفاق کا انجام

کہیں بھی ان میں رہی بوئے قومیت باقی ‌ غلط ہے دے جو انھیں کوئی ہندیوں کا نام

مگر وہ غیرت و عصمت کی دیویاں جن سے ‌ وفائے ہند کو حاصل ہوئی حیات دوام

انھیں کی فرض شناسی نے ہی بچایا ہے ‌ وگرنہ مٹ گیا ہوتا جہاں سے انکا نام

اگر ہے پاس تجھے انکی زندگانی کا ‌ تو جا کے دے مری جانب سے تو یہی پیغام

جہاں ہے دین وہیں عیش کامرانی ہے

وہیں بقا ہے وہیں فیض آسمانی ہے

جگر بریلوی

ترانہ!

(ضحاک کے قتل اور فریدوں کی تخت نشینی پر!)

ڈراما ضحاک کا آخری ورق

ساقیا!

بادۂ گلگوں بیار ——! ساقیا!

ظلم کی تاریکیاں مرجھا گئیں! عدل کی رنگینیاں پھر چھا گئیں!

عیش و راحت کی ہوائیں آ گئیں!

آ گئیں! —— چھا گیا ابر بہار! —— ساقیا!

ساقیا! —— بادۂ گلگوں بیار! —— ساقیا!

ساقیا! ——!

جنکے ہنگاموں سے کانپ اُٹھتے تھے ہفت افلاک بھی! کچھ نشاں ملتا نہیں آج انکا زیر خاک بھی

ظلم و ظالم کا نتیجہ کتنا عبرت خیز ہے!!!! ظلم بھی خاموش ہے! اور ظالم ناپاک بھی

—— ظلم کی تاریکیاں مرجھا گئیں! عدل کی رنگینیاں پھر چھا گئیں! ——

عیش و راحت کی ہوائیں آ گئیں!

آ گئیں! —— آ گئی فصل بہار! —— ساقیا!

ساقیا! —— بادۂ گلگوں بیار! —— ساقیا!

ساقیا! ——!

صبر کر! مظلوم! جور بیکراں پر صبر کر! آفت و رنج و بلائے ناگہاں پر صبر کر!

گردش ایام و دور آسماں پر صبر کر! صبر کو محبوب رکھتا ہے خدائے پاک بھی!!

—— ظلم کی تاریکیاں مرجھا گئیں! عدل کی رنگینیاں پھر چھا گئیں ——

عیش و راحت کی ہوائیں آگئیں !

آگئیں ! —— باغ ہیں گل در کنار ! —— ساقیا !

ساقیا ! —— بادۂ گلگوں بیار ! —— ساقیا !

ساقیا —— !

عدل سے آباد ہے یہ کارگہ غافل نہ ہو ! — عقل ہے سر میں، تو ظلم و جور پر مائل نہ ہو !

عدل سے لے کام ! محوِ فکرِ بے حاصل نہ ہو ! — عدل کے قدموں پہ ہیں محوِ سجود افلاک بھی !

—— ظلم کی تاریکیاں مرجھا گئیں ! — عدل کی رنگینیاں پھر چھا گئیں ——

عیش و راحت کی ہوائیں آگئیں !

آگئیں ! —— ہیں فضائیں مشکبار ! —— ساقیا !

ساقیا ! —— بادۂ گلگوں بیار ! —— ساقیا !

ساقیا —— !

جشنِ نوروزی ہے برپا گل فضائیں شاد ہیں ! — باغ ہیں سرمست ! باغوں کی ہوائیں شاد ہیں !

ساری دنیا خوش ہے ! دنیا کی ادائیں شاد ہیں ! — شاد ہے بندوں سے آج اپنے خدائے پاک بھی !

—— ظلم کی تاریکیاں مرجھا گئیں ! — عدل کی رنگینیاں پھر چھا گئیں ! ——

عیش و عشرت کی ہوائیں آگئیں !

آگئیں ! —— مہرباں ہے کردگار ! —— ساقیا !

ساقیا ! —— بادۂ گلگوں بیار ! —— ساقیا !

ساقیا —— !

ساقیا —— !

اختر شیرانی

مصطلحات امیں

دل کے پیمانے کو خمخانہ کہا کرتا ہوں　　میں شجر کو عمل دانہ کہا کرتا ہوں
ذرہ ذرہ ہے نگاہوں میں مری حسن کی شمع　　دل بیتاب کو پروانہ کہا کرتا ہوں
میرے نزدیک تصور ہے حریم کعبہ　　میں تخیل کو صنمخانہ کہا کرتا ہوں
الجھنیں میری طبیعت کی نکالیں اس نے　　زلف پر پیچ کو میں شانہ کہا کرتا ہوں
بیخودی میں جو کبھی یاد خودی آتی ہے　　اس کو میں نعرۂ مستانہ کہا کرتا ہوں
سیر چشمی ہے نگاہوں میں مری عقل سلیم　　بندۂ زر کو میں دیوانہ کہا کرتا ہوں

ہے مواخات امیں جن کی غرض پر مبنی
ان یگانوں کو میں بیگانہ کہا کرتا ہوں

امین حزیں

دور جدید کا آغاز

وطن کی خاک سے ہونے کو ہے اک آسماں پیدا　　چمک اے ذرۂ دل، کر شعاع ضوفشاں پیدا
نظام دہر کی گردش میں فرق آیا ہے مدت میں　　نئے سیارے ہونگے اب شکل کارواں پیدا
شہیدان وطن کے دل شگوفے بنکے پھوٹینگے　　لہو سے قومیت کے ہوگا حسن گلستاں پیدا
یہ رنگ و نسل کی تفریق مٹجائیگی دنیا سے　　کریگی دیر کی مٹی حرم کے پاسباں پیدا
فضائے خلد کا پرتو پڑیگا دشت عالم پر　　کرینگے خار صحرا نکہت باغ جناں پیدا
عداوت کے شرر کو موج حریت دبادیگی　　شعاع برق سے ہونگی چمن کی پتیاں پیدا
جہاں میں انقلاب آئیگا قسمت کھائیگی پلٹا　　اب اس خاک غلامی ہی سے ہونگے حکمراں پیدا

مری چشم تجسس میں وہ عالم آشکارا ہے
کہ جس کے ذرہ ذرہ سے ہے حسن جاوداں پیدا

محمود اسرائیلی

چاند اور ہم

چاندنی افسردہ بھی ہے زرد بھی چبھن رہا ہے ہلکا ہلکا درد بھی

....

کچھ پریشانی ہے ایسی ماہ میں جیسے کھو جائے مسافر راہ میں
چاندنی میں کوئی شے بیتاب ہے حسن کا شاید پریشاں خواب ہے
چاند ہے اشکوں سے منہ دھوئے ہوئے نغمے غم انگیز ہیں سوئے ہوئے
یہ سکوں ہے آج کچھ آشفتہ حال یا تڑپ کے بعد ہے کوئی نڈھال
خامشی جو چہرہ مہتاب ہے بولنے کے واسطے بیتاب ہے

چاندنی کا حسن اس کے دم سے ہے
اور محبت اسکو افسر ہم سے ہے

حامد اللہ افسر

لحد کی پہلی شب

اور

سروشِ عبرت کی آواز

ہوش کب آیا تجھے اے مستِ کیفِ جامِ عیش آگیا جب آفتابِ زیست زیرِ بامِ عیش
تجھکو جو کنجِ لحد میں کچھ نظر آتا نہیں چھپ گیا ہے عیش کا دن ہو چکی ہے شامِ عیش
ہر اب کب تک رکھے گا دیدۂ عبرت نگاہ کھول دے اس کو کہ آخر ہے یہی انجامِ عیش
مار و کژدم بن گئے ہیں قعرِ مرقد میں تجھے ذکرِ عیش و یادِ عیش و فکرِ عیش و نامِ عیش
تو ہے جب تک تیرے پیکر کو ہے چھٹکارا محال اب قفس میں آگیا، ٹوٹا جو تارِ دامِ عیش
زیست کی دولت تھی جب تک، تھی مسرت کی پکار بھول کر بھی اب ادھر آتا نہیں پیغامِ عیش
زندگانی نشہ تھی جب رات دن تیرے لئے تجھکو کیوں معلوم ہوتا کب گئے ایامِ عیش

وقت جب ہے جاگنے کا سو کے کٹتا ہے کہیں
وقت جب سونے کا آیا تجھ کو نیند آتی نہیں

ہاں سن اے مفلس فراوانیٔ دولت کیا ہوئی — وہ تکبر کی چڑھی ندی، وہ نخوت کیا ہوئی
کیا ہوا وہ ظاہر و باطن میں خودداری کا شوق — رنگ صورت کیا ہوا، نازک طبیعت کیا ہوئی
کس مپرسی میں ہے کیسے مبتلائے بیکسی — اب بھرے مجمع پہ وہ تیری حکومت کیا ہوئی

تیری جو کشتی رواں تھی سیم و زر کے آب میں
آج وہ ڈوبی ہے آکر خاک کے گرداب میں

یہ جو تیرا جسم ہے خاکی لحد میں زیر بار — بوجھ پھولوں کا کبھی اس کیلئے تھا ناگوار
تجھ کو جز عشرت کدہ راتوں کو نیند آتی نہ تھی — ایک لمحہ بھی تجھے کرتا تھا تنہا بیقرار
خاک کے تودے میں ناداں وقف تنہائی ہے کیوں — اب نہ وہ عشرت کدہ ہے اور نہ یاروں کی قطار
دن میں دس دس بار تھا رنگت بدلنے کا خیال — یعنی ہر جامہ تھا تیرا گلشن زر کی بہار
ایک ہی کپڑے پہ کیوں تجھ کو قناعت ہو گئی — کیا ہوا اب شوق بیجا پی کا رہ رہ کے ابھار
تجھ کو سو گز بھی بلندی قبر کی کافی نہ تھی — ایک ہی گز پر ہوا اب تیرا کیوں دار و مدار
خود بخود کیونکر فنا کا جام تو نے پی لیا — موت کا جب نام سنتا تھا تو آتا تھا بخار

تجھ جو بن آتی نہیں تو آج شرمایا ہے کیوں؟
اپنی ہیئت کو بدل کر گور میں آیا ہے کیوں؟

پھول تھا بستر ترا اب خاک کا انبار ہے — اور بجائے خواب راحت حسرتوں کا خار ہے
تا قیامت زیست کے انجام کا قیدی ہے تو — اب نہ کوئی آشنا تیرا، نہ کوئی یار ہے
تجھ کو بیخود کر چلے جب بالش راحت کی یاد — سر پٹک دینے کو حاضر گور کی دیوار ہے

ہمچو از خود رفتگاں از خود روی بیہوش باش
راز را بے پردہ خواہی کیفیا خاموش باش

کیفی چریاکوٹی

حیات نظیر اکبرآبادی

حسن کا دعویٰ ہے تخت و تاج کے قابل ہوں میں
عشق کہتا ہے کہ ہفت اقلیم کا حاصل ہوں میں

عقل کہتی ہے کہ میرا علم ہے لا انتہا
دل سمجھتا ہے کسی محبوب کا محمل ہوں میں

جاں نکلتی ہے کہ وہ تسکین جاں ہے سامنے
آنکھ روتی ہے کہ یارب کس قدر غافل ہوں میں

ہاتھ اٹھتے ہیں کہ ہے باب اجابت آشکار
ہوش اڑتے ہیں کہ کس تقریب میں شامل ہوں میں

میرے دعوے پر قیامت میں خدا کے سامنے
تیغ کہتی ہے کہ قاتل یہ نہیں قاتل ہوں میں

اصل میں میری فنا میری بقا کا باب ہے
درحقیقت آپ ہی سنگ رہ منزل ہوں میں

تیرے ہونٹوں پر تبسم اشک میری آنکھ میں
حسن کی تصویر ہے تو عشق کی محفل ہوں میں

تیرے سنگ در سے پایا میری قسمت نے فروغ
داغ ماتھے پہ نمایاں ہیں مہ کامل ہوں میں

ڈھونڈتا ہے تو مرے پہلو میں کیا دل کا نشاں
سر سے پا تک اے ستمگر یادگار دل ہوں میں

خار غم سے لالہ گوں ہے میرا ہر ذرہ نظیر
سیکڑوں دل گلشن ہیں جسکی گود میں وہ گل ہوں میں

غزل تبسم صہبائی

دوست آئے کہ کوئی دوست کا پیغام آئے
آئے جس طرح سے بیمار کو آرام آئے

ابر چھایا ہے ہوا مست ہے گلشن خاموش
کاش اس وقت وہ ہاتھوں میں لئے جام آئے

چھوڑ دو تاکہ میں اٹھ جاؤں بھری محفل سے
ہمنشیں یاد مجھے وصل کے ایام آئے

شان ہے یہ بھی تری بزم طرب کی ساقی
کوئی بدمست ہو پی کر کوئی ناکام آئے

اس کے کوچے سے مری نعش لئے جاتے ہیں
کوئی قاتل سے یہ کہہ دو کہ سر بام آئے

وہ بھی دن تھے کہ مری شام تھی صبح امید
اب تو یہ حال ہے رو دیتا ہوں جب شام آئے

جلد ۱۳ - شمارہ ۴   رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ کو شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول عہ

فہرست مضامین اپریل سنہ ۱۹۲۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۲   اپریل سنہ ۱۹۲۸ء   شمار ۴

ملاحظات

ترقیاں دو قسم کی ہیں، ظاہری و معنوی جنھیں زیادہ اصطلاحی صورت میں مادی و روحانی کہہ سکتے ہیں۔ ظاہری ترقی کا معیار یہ ہے کہ دولت وافر ہو، اسباب راحت فراواں ہوں، اور سامان عیش و تنعم کثیر۔ معنوی ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ قلب پُرسکون ہو، دماغ مطمئن ہو اور روح بے نیاز و مستغنی۔ ہرچند دونوں کا اجتماع محال نہیں، لیکن کمیاب ضرور ہے، اس لئے جو لوگ زیادہ سنجیدہ اور متین ہیں، وہ ہمیشہ روح کو جسم پر ترجیح دیتے ہیں اور دیبا و حریر کی نرمی سے زیادہ خشونت گلیم کو پسند کرتے ہیں یہ ہے فلسفۂ اخلاقیین کا اور غالباً بڑی حد تک درست ہے۔ اڈیسن اور فورڈ کا مسلک اس سے بالکل جُدا ہے، ان کے ہاں مادی ترقی بھی روحانی ترقی کی طرح لامحدود شے ہے اور ان کا قول ہے کہ دولت کی فراوانی، ہئیت اجتماعی کا استحکام ہے اور یہی وہ مقصد اصلی فطرت کا ہے جسے نہ مسیح کا درس رہبانیت پورا کر سکا، نہ چنگیز و سکندر کی خون آشام تلوار ——— یہ نظریہ بھی بہت خوشنما اور قرین عقل معلوم ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں ایک جماعت اور بھی ہے جو نہ اُس فلسفہ کی لذت آشنا ہے، نہ اِس نظریہ کی یعنی نہ اس گروہ کے پاس دولت ہے نہ روحانیت، نہ اسباب راحت روح ہیں نہ سامان عشرت جسم پھر لطف یہ ہے کہ وہ زندہ بھی رہنا چاہتی ہے اور لطف و آسائش کے ساتھ!!

ما را ہنوز عربدہ با خویشتن بہ است

میں نے اس وقت یہ ذکر کیوں چھیڑا؟

نگار تجارتی اصول کو پیش نظر رکھ کر جاری کیا گیا اور اس وقت تک اسی اصول پر چلایا جا رہا ہے ظاہری ترقی کی لحاظ سے غالباً یہ امر کم امید افزا نہیں کہ اب وہ ایک بجلی سے چل سکنے والی پرس مشین کا بلا شرکت غیرے مالک ہے، اسی طرح معنوی ترقی کے لحاظ سے دیکھئے تو یہ حقیقت کم دلچسپ نہیں کہ شاید ہی ہندوستان کا کوئی رسالہ ایسا ہو جو اس کی اداسے سربلندی سے نہ جلتا ہو۔ لیکن باایں ہمہ حقیقی معنے میں مجھے نہ اُس پر اطمینان ہے نہ اس پر افتخار، کیونکہ مادی ترقی کے لحاظ سے اگر ایک طرف دولت قاروں میرا نصب العین ہے تو معنوی ارتقاء کی حیثیت سے دوسری طرف میرا ارادہ "الہامات" پر چشمک زن نظر آتا ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ ممکن ہے لیکن محال، یہ محال ہے، مگر ممکن۔ یعنی آج قاروں کی طرح بہت سے دولتمند موجود ہیں لیکن میں نہیں ہو سکتا اور آیات وجدانی کی صورت سے میں بھی اکثر چیزیں پیش کر سکتا ہوں مگر خود مجھی کو ان پر ایمان لانے میں تامل ہوگا، چہ جائیکہ ساری دنیا۔

الغرض یہ ہے میری کشمکش کا عالم جب سے لکھنؤ میں آنے کے بعد نگار اور نگار پرس دونوں کو سنبھالنے کی خدمت میرے سپرد ہوئی ہے اور کس قدر شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ متوسط جماعت کی بے بال و پری بھی کتنا بڑا قہر ہے۔ علی الخصوص اس وقت جبکہ اس کے کسی فرد میں ولولۂ پرواز ضرورت سے زیادہ ودیعت کیا گیا ہو۔

ناظرین نگار کے سامنے یہ افسانہ صرف اس لئے چھیڑا جاتا ہے کہ اگر وہ توسیع اشاعت کو اپنا فرض نہیں سمجھتے تو کم از کم وہ یہ تو آسانی سے کر سکتے ہیں کہ اگر انھیں کبھی پرس سے کام لینے کی ضرورت پڑے تو سب سے پہلے نگار پرس کو یاد کریں، جو بہ نسبت دیگر مطابع کے یقیناً زیادہ مستحق اعانت ہے۔

نگار اور اڈیٹر نگار کے خلاف پروپگنڈا ہمیشہ ہوا ہے اور ہوتا رہیگا۔ اس لئے جائے حیرت نہیں اگر مقامی فضا سے بھی کبھی کبھی اس نوع کی آوازیں سننے میں آئیں۔ میرے بعض احباب نے خصوصیت کے ساتھ مجھے متوجہ کرنا چاہا تا کہ میں کوئی جواب دوں، لیکن انھیں شاید اس کا علم نہیں کہ اس باب میں میرا مسلک ہمیشہ "بگزار تا بمیرد در رنج خود پرستی" رہا ہے۔ اور میں ایسی آوازوں کو صرف صیحۂ موت کا سمجھتا ہوں۔

اس ماہ کے مضامین میں فلسفۂ مذہب، لارڈ ریپن، اور نقد الشعر، مسلسل چلے آرہے ہیں اس لئے مزید تقریب و تعارف کی ضرورت نہیں۔ یہی حال چنگاری اور ڈائری کا بھی ہے۔ فسانۂ "قطرۂ آتشیں" کی خصوصیات کو اسی جگہ نوٹ کے ذریعہ سے ظاہر

کر دیا گیا ہے۔ لکھنؤ کا ایک غیر لکھنوی شاعر خالص تنقیدی مضمون ہے جسمیں بلا رو رعایت جناب آسی کی شاعری کے متعلق ما میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ممکن ہے لکھنؤ کے بعض حضرات اس کو معاندانہ نگاہ سے دیکھیں، لیکن ان کی کج بینی کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ چہ می گوئیاں صرف فکاہی رنگ کا مضمون سمجھکر مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ملکۂ نرگس بیگم "تاریخی مضمون ہے گو چنداں اہم نہیں۔ جناب آرگس کا مضمون کلام درد کے متعلق خاص چیز ہے اور ایک ایسے "فتنۂ لغویہ" کا سد باب ہے جس کو اگر اسی کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو کچھ زمانہ کے بعد اس کے اثرات کو مٹانا دشوار ہوجاتا۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا حبیب الرحمان شروانی جو اپنی سنجیدگی ذوق اور انصاف پسندی کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتے ہیں عملاً ان اغلاط کے محو کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔ جو نظامی پریس بدایوں کے نسخہ میں پائی جاتی ہیں اور جن کی سب سے بڑی ذمہ داری مولانا موصوف پر اس لئے عاید ہوتی ہے کہ اُنھوں نے اس نسخہ کے صحت کی توثیق فرمائی ہے۔

آئندہ ماہ کی اشاعت میں جناب آرگس کا ایک معرکۃ الآرا مضمون تذکرۂ آبحیات پر درج کیا جائے گا جس میں ناقابل تردید دلایل سے کام لیکر مولف آبحیات (مولوی محمد حسین آزاد) کی غلط بیانیوں، دسیسہ کاریوں اور تحریف نگاریوں کو پیش کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ اردو کا یہ سب سے زیادہ مشہور تذکرہ، کس قدر لغو، غلط اور گمراہ کن ہے۔ اسی موضوع پر ایک مضمون جناب امتیاز احمد صاحب بی اے (علیگ) کا بھی ہوگا جس میں موصوف نے مولف آبحیات کی صرف ان دراز دستیوں کو دکھایا ہے جو درد کے ساتھ روا رکھی گئی ہیں۔

حصۂ نظم میں شاعر کا ترانہ۔ خواجہ مسعود علی ذوقی بی اے (علیگ) کا ہے جسمیں انھوں نے ایک طرف اپنے فطرت پرست ذوق کو کامیابی کے ساتھ نمایاں کیا ہے، اور دوسری طرف ایک شاعر کے لا یعنی مشاغل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نظم ہونے کے لحاظ سے یہ ترانہ خوب ہے۔ جناب قیسر کا قطعہ خوشی اور غم ان کے مصلحانہ رنگ میں ہے اور دلچسپ ہے۔ جناب عزیز کی نظم۔ دامن کوہ ایک طویل نظم کا ٹکڑا ہے جس سے ان کا ابداعی رنگ ظاہر ہے۔ واردات میں امین حزیں کا وہی پیام مستور ہے جس کے وہ قدیم علمبردار ہیں۔ تسکین جاوید۔ روش صدیقی کی نظم ہے اور اچھی ہے۔ غزلوں میں جناب اثر لکھنوی کی غزل خاص مرتبہ کی ہے۔ جگر بریلوی کی غزل بھی قابل داد ہے اور دیگر شعرا کی غزلوں میں بھی بعض بعض شعر بہت اچھے ہیں

امین سلونوی جن کے متعلق نگار کی کسی گزشتہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا کہ نگار کے شعبۂ نظم سے وابستہ ہوگئے ہیں۔ اب علحدہ ہوگئے ہیں اور ان کو ادارۂ نگار سے کسی قسم کا تعلق باقی نہیں رہا ہے

نیاز فتحپوری

کلام درد کے ساتھ

نظامی پریس کی بیدردیاں

اور

مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کی غیر ذمہ دارانہ مقدمہ نگاری

حال میں مجھے ضرورت ہوئی کہ خواجہ میر درد کے دیوان پر ایک نظر ڈالکر ان اغلاط کو جو کاتبوں اور مصححوں کے تصرفات سے پیدا ہو گئے ہیں دور کروں اسی لئے سب سے اول جستجو یہ ہوئی کہ کوئی صحیح نسخہ ملجائے چنانچہ نہایت کاوش اور محنت کے بعد ایک نسخہ بہم پہونچا جو مصنف کے انتقال کے بہتر برس کے بعد کلاں کوٹھی مطبع محمدی لکھنؤ میں علم دوست ہنر پرور مقبول الدولہ احسان الملک کپتان مرزا مہدی علی خاں بہادر قبول ثابت جنگ کے اہتمام۔ منشی الطاف حسین کی تحریک اور سعی، اور محمد یعقوب صاحب کی "تصحیح" سے شائع ہوا ہے دستیاب ہوا۔ یہ نسخہ سنہ ۱۲۷۱ھ ماہ شوال میں طبع ہوا ہے جس کو اب چھپتر برس ہو گئے۔ مصحح مرحوم نے آخر دیوان میں لکھا ہے "کہ اکثر نسخے قلمی خدا جانے کہاں کہاں سے بہم پہونچا کر ہزار جانفشانی سے ایک دیوان ترتیب دے کے ابتدا ماہ شوال سنہ ۱۲۷۱ھ میں چھپ کے باعث روشنی چشم نظارگیان و سبب مسرت دل مشتاقاں ہوا۔"

مگر میں نے محض اس نسخہ پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ جستجو جاری رکھی اور آخر کار ایک ناتمام قلمی نسخہ جس کی کتابت اور کاغذ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی طرح سو سوا سو برس سے بعد کا لکھا ہوا نہیں ہے دستیاب ہوا۔ یہ نسخہ ناتمام ضرور ہے مگر جس قدر ہے نہایت صحیح معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا نسخہ مطبوعہ نولکشور بھی تھا اس میں اُن دونوں نسخوں سے بہت زیادہ اختلاف تھا اور اکثر جگہ یہ اختلاف غلط تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ تصحیح شروع کر دوں، مگر اسی وقت مجھے میرے ایک قابل دوست نے بتایا کہ اس وقت ہندوستان میں خواجہ میر درد کا دیوان نظامی پریس بدایوں میں اس خوبی اور اہتمام سے طبع ہو چکا ہے کہ اس سے بہتر کوئی صحیح نسخہ دستیاب ہونا صرف مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن ہے۔ چنانچہ نسخہ مطبوعہ نظامی منگا لیا گیا۔ حقیقتاً اس کی طباعت کتابت کاغذ وغیرہ اس قدر دلکش ہیں کہ ایک دیکھنے والا کتاب کے حسن و قبح کو دیکھے بغیر اس کی خوبی کا قایل ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر کا ایک محققانہ اور فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہو۔ نواب صدر یار جنگ لکھتے ہیں:۔

> حیدرآباد میں ایک سے زائد قلمی دیوان درد کے نسخے میرے ہاتھ آئے سید صاحب کی فرمایش سے میں نے سید معین الدین صاحب صاحب شاہجہاں پوری مترجم نیولین اعظم وغیرہ کو تصحیح و مقابلہ کی تکلیف دی اہل ادب کو ممنون ہونا چاہئے کہ نہایت محنت و کاوش

کلام درد کے ساتھ نظامی پریس بدایوں کی بیدردیاں

دیدہ ریزی سے انھوں نے ایک صحیح نسخہ مرتب فرمایا ..... اسی نسخہ سے یہ دیوان طبع ہوا ہے۔ طبع ہونے کے بعد جب میں حیدرآباد سے حبیب گنج آیا تو کتب خانہ میں ایک قدیم مطبوعہ نسخہ موجود ملا۔ جو دہلی کے مطبع مصطفائی میں ۱۲۵۵ھ میں اہتمام سے طبع ہوا تھا۔ یہ نسخہ بہت صحیح ہے اور متعدد نسخوں کے مقابلہ سے چھاپا گیا ہے۔ میں نے اس نسخہ سے بھی مقابلہ کی خواہش سید معین الدین صاحب کی اور انھوں نے مہربانی سے محنت کرکے مقابلہ کیا۔ یہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ حالیہ مطبوعہ نسخہ، مطبوعہ نسخہ قدیم سے بالکل مطابق نکلا صحت میں بھی اور مقدار کلام میں بھی۔"

یہ ہے وہ عبارت جسے دیکھکر ہر شخص کو اس نسخہ کی صحت پر یقین آ جانا چاہیے۔ میں جناب معین الدین سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن پھر بھی ان دعاوی نے مجھکو اس بات کی اجازت دی کہ میں اپنے نسخہ کو مطبوعہ نظامی سے مقابلہ کروں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ خیال پیدا ہوا کہ کم سے کم ایک قدیم نسخے اور قلمی نسخے، اور نظامی نسخہ کو مطابق کرکے دیکھوں۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے نظامی پریس کے نسخہ کو بدترین نسخوں میں بھی سب سے زیادہ بدتر پایا۔ اس میں تو کلام نہیں کہ اس نسخہ کو صحیح کیا گیا ہے۔ مگر اس طرح کہ جابجا کلام پر اصلاحیں دیدی گئی ہیں اور ایسی بری کہ اگر اسی دیوان کا رواج ہو گیا تو چند روز کے بعد خواجہ میر درد کے کلام کا اردو دنیا میں دستیاب ہونا ممکن نہ ہوگا۔

اختلافات اور اغلاط ایک ہی طرح کے نہیں ہیں بلکہ مختلف قسم کے ہیں۔

(۱) وہ اغلاط جو شعر کو غلط نہیں کرتے۔

(۲) وہ اغلاط جو شعر کا مفہوم بدل دیتے ہیں۔

(۳) وہ اغلاط جو شعر کو بے معنی اور مہمل بنا دیتے ہیں

(۴) اغلاط زبان

(۵) اغلاط کتابت

(۶) بعض اغلاط عروض۔ کہیں یہ معمولی ہیں اور کہیں نہایت خطرناک۔

یہ کہدینا ضروری ہے کہ کسی کتاب کی تصحیح محض قلمی نسخے ہی پر منحصر نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے لئے درایت۔ نظر۔ رسائی ذہن وغیرہ کی بھی ضرورت پڑتی ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ تمام قلمی اور قدیم نسخے بھی صحیح نہیں ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ بعض نسخوں کو دیکھکر خود بخود یقین ہو جاتا ہے کہ غلط ہیں؛ باوجود اس قدر بری طباعت کاغذ و کتابت وغیرہ کے اس نسخہ سے زیادہ صحیح ہیں۔ بہرحال سب کے سب اختلافات مسلسل لکھے گئے ہیں علحدہ علحدہ لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔ بہت سے ایسے اغلاط جو یقینی سہو کاتب سمجھے گئے ہیں نظر انداز کر دیے ہیں اختلافات اور اغلاط کا سلسلہ یہ ہے کہ جو اشعار درج کئے گئے ہیں وہ نظامی نسخہ کے مطابق ہیں:-

جس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہو — کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا

جس کی بجائے دوسرے نسخوں میں اُس ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ یہ ترجمہ ہے براں مسند عزت کا اور یہی شان لفظی ترجمہ کی پہلے رائج تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو خلاف فصاحت سمجھکر جس کر دیا گیا اور اسپر غور نہ کیا گیا کہ درد کے زمانہ میں جو اسلوب بیان

رائج تھا اس کا کیا انتقا ہے۔

ہے خوف اگر جی میں تو تیرے ہی غضب کا　　اور دل میں بھروسا ہے تو تیرے ہی کرم کا

غضب کا کے بجائے دوسرے نسخے میں ستے ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ اس صورت میں توافق ردیف سے مطلع کی صورت پیدا ہو جاتی ہے جو فصحا کے نزدیک عیب ہے۔ بجائے اور دل کے صرف ور دل ہے۔ الف نہیں ہے۔ اور یہی صحیح ہے میر درد اور ان کے معاصرین کی یہی زبان تھی:۔

دونوں جہاں کو روشن کرتا ہے نور تیرا　　اعیان میں مظاہر ظاہر ظہور تیرا

بجائے دونوں جہاں کے نسخۂ قدیم اور کشوری میں۔ ماہیتوں ہے۔ شعر کی شرح کرنے پر خود معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں جہاں ایک فضول ٹکڑا ہے اور ماہیتوں میں کس قدر بلاغت ہے۔

باہر نہ ہو سکی تو قید خرد سے اپنے　　اے عقل بے حمیت یہ ہے قصور تیرا

باہر نہ ہو سکی کے بجائے باہر نہ آسکی ہے۔ اور میر درد کی یہی زبان معلوم ہوتی ہے۔ یہ صاف صاف بیروں نیامدی کا ترجمہ ہے

جھکتا نہیں ہمارا دل تو کسی طرف یاں　　جی میں بھرا ہوا ہے از بس غرور تیرا

مصرع ثانی میں جی میں بھرا ہوا کی بجائے جی میں سما رہا ہے - ہے۔ بہ لحاظ معنی یہی زیادہ فصیح اور صحیح ہے اور قلمی۔ و مطبوعہ قدیم۔ اور نسخہ کشوری میں یہی ہے۔ کوئی سبب نہیں کہ سب کے خلاف نظامی پریس کے نسخہ کو صحیح مانا جائے

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا　　ہم سبھی مہماں تھے یاں اک تو ہی صاحبخانہ تھا

دوسرے مصرع میں بجائے یاں کے واں ہونا چاہیے۔ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ ہم کہیں رہے مگر جہاں بھی رہے ہم وہاں مہمان ہی کی حیثیت سے رہے وہاں میزبان تو ہی تھا۔ بجائے اس کے یاں اک کا بے معنی ٹکڑا لگا دیا گیا ہے۔ کشوری۔ قلمی۔ اور مطبوعہ قدیم تینوں نسخے ہمارے موافق ہیں۔

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا　　بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

مصرع اولیٰ میں بجائے دل۔ نسخۂ قدیم میں۔ جی ہے۔ اور سب نسخوں میں دل ہے۔ گو بجائے دل کے جی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اور قدامت لفظ اسی لفظ کی صحت کی موید ہے۔ درد کے معاصرین نے بھی اکثر بجائے دل کے جی ہی استعمال کیا ہے۔

ہم جانتے نہیں ہیں اے درد کیا ہے کعبہ　　جیدھر پھرے وہ ابرو اودھر نماز کرنا

مصرع ثانی میں جیدھر پھرے کی بجائے جیدھر ہلے ہے۔ سب نسخوں میں یہی ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ ابرو پھرنا کوئی معنی نہیں رکھتا ابرو ہلنا بہ معنی اشارہ کرنے کے ہے ...... غالباً ہلے۔ صاف نہیں پڑھا گیا۔ اس کی بجائے پھرے بنا دیا گیا

سو بار سوز عشق نے دی آگ پر ہنوز　　دل وہ کباب تھا کہ جگر خام رہ گیا

مصرع ثانی میں تھا کی بجائے۔ ہے۔ ہے اور بہ نسبت تھا کے یہ زیادہ بامعنی اور صحیح ہے۔ تھا کہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب

شاید اس کی وہ حالت نہیں رہی۔

مدت سے وہ تپاک تو موقوف ہو گئے　　اب گاہ گاہ بوسہ یہ پیغام رہ گیا

وہ کی بجائے مصرع اولیٰ میں وے ہے۔ یہی صحیح ہے۔ میر درد کی زبان کا اقتضاء یہی ہے۔ اور تپاک کی جمع کے لحاظ سے بھی یہی چاہئے۔ نسخہ قلمی قدیم میں یہی ہے۔

از بسکہ ہم نے حرف دوئی کا اٹھا دیا　　اے درد اپنے وقت میں ابہام رہ گیا

دوسرے مصرع میں۔ ابہام کی بجائے ایہام ہونا چاہئے۔ کیونکہ میر درد کا زمانہ وہ تھا کہ متقدمین کے طریقہ ایہام گوئی کے دور کرنے کی کوشش کیجا رہی تھی۔ ابہام کے کوئی معنی اس جگہ نہیں ہیں اور اس لفظ سے شعر غلط اور مہمل ہو گیا۔

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی　　ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

مصرع اولیٰ میں اِن کی بجائے اون ہے۔ مصحح صاحب نے یہ ستم ظریفی کی ہے کہ اِن کے الف کے نیچے زیر بھی دیدیا ہے۔

اور عاشق مزاج ہے کوئی　　درد کو قصہ مختصر دیکھا

مصرع اولیٰ میں۔ اور بالکل غلط ہے۔ اس کی بجائے زور ہے۔ یہی میر درد کے زمانہ کا محاورہ ہے اور یہاں بھی بامعنی ہے ورنہ شعر مہمل اور غلط ہو جائے گا سب نسخوں میں یہی ہے۔

دشمنی میں سُنا نہ ہووے گا　　جو ہمیں دوستی نے دکھلایا

مصرع اولیٰ میں۔ میں غلط ہے۔ اس اصلاح نے شعر کو بے معنی کر دیا۔ میں کی بجائے نے ہے۔ مصحح صاحب کو یہ لفظ بے جوڑ سا معلوم ہوا۔ اور انھوں نے اُسے بدلدیا۔ مگر افسوس ہے کہ انھوں نے دوسرے مصرع کی طرف توجہ نہ فرمائی کہ وہ بے معنی اور مہمل ہوا جاتا ہے۔ مصنف کی غرض اصلی یہ ہے کہ دشمنی اور دوستی۔ دو چیزیں ہیں۔ دشمنی کا کام خرابیاں پیدا کرنا اور دوستی کا کام نشاط و خوشی پیدا کرنا ہے۔ مگر واضح رہے کہ ہمارے ساتھ دوستی نے وہ خرابیاں کی ہیں کہ جو دشمنی نے سنی بھی نہ ہونگی۔ یہی معتبر نسخوں میں ہے۔

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا　　پر اُسے آہ نے اثر نہ کیا

مصرع ثانی میں آہ نے۔ بالکل۔ بے معنی ہے۔ شعر کے مہمل ہونے میں کوئی کسر نہیں رہی۔ اگر اس کو صحیح مانا جائے تو مصرع اولیٰ بے معنی ہوتا ہے اور کسی طرح چول نہیں بیٹھتی۔ یعنی مصنف کہتا ہے کہ وہ کونسی رات تھی کہ ہم نے نالہ نہ کیا ہو۔ دوسرے میں نالہ کو بھول کر آہ کہتا ہے کہ اس نے اثر نہ کیا حالانکہ نتیجہ کے طور پر کہنا چاہئے تھا کہ نالہ نے اس کو اثر نہ کیا۔ آہ کا یہاں ذکر بیکار تھا۔ نے کے بجائے کچھ ہے سب نسخوں میں یہی ہے اور اسی صورت سے شعر بامعنی ہو سکتا ہے ورنہ دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں رہتا۔

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا　　پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

عہد کے آگے، مصرع ثانی میں اگرچہ صحیح ہے۔ مگر دوسرے نسخوں میں عہد سے آگے ہے۔ اور دلی کی زبان کے بموجب یہی صحیح ہے .... جیسے مرزا غالب کا یہ شعر ہے:—

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب   لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

حالانکہ عرش کے پرے ہی اس جگہ کہا جا سکتا تھا۔ مگر پرے کہا گیا۔

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن   میں جو پہونچا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

مصرع ثانی میں پہونچا۔ سراسر ایجاد بندہ ہے جو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ غالباً کتابت نے دھوکا دیا ہے اس کی بجائے پوچھا ہے سب نسخوں میں یہی ہے اور یہی صحیح ہے۔ ورنہ مصرع بے معنی ہے اور بامعنی کہنے کے لئے بہت سی تاویلوں کی ضرورت ہے

جوں شمع روتے روتے ہی گزری تمام عمر   تو بھی تو درد داغ جگر کو نہ دھو سکا

دوسرے مصرع میں جگر کو کی بجائے دوسرے نسخوں میں داغ جگر میں ہے۔ اگرچہ کو بھی غلط نہیں مگر انسب یہی ہے۔

اندازہ ہی مجھے مرے دل کی آہ کا   زخمی جو ہو چکا ہو کسی کی نگاہ کا

دوسرے مصرع میں بجائے۔ زخمی جو ہو چکا ہو۔ کے زخمی جو کوئی ہوا ہو۔ تھا۔ جو غالباً ناموزوں سا معلوم ہوا ہوگا۔ اس کی بجائے آج کے مروجہ الفاظ میں زخمی جو ہو چکا ہو بنا دیا گیا۔ حالانکہ میر درد کے زمانہ میں کوئی بروزن فع بھی برابر بے تکلف لکھا جاتا تھا۔

روتا ہے گرم جوشی سے یاد کرکے درد   آتش نے مجھکو شمع کے مانند تر کیا

مصرع اولیٰ میں روتا ہے کے بجائے روتا ہوں ہے ورنہ غایب اور متکلم کا ناگوار قضیہ پیش آجاتا۔

ٹھہر جا ٹک بات کی بات اے صبا   کوئی دم کو۔ ہم بھی ہوتے ہیں ہوا

دوسرے مصرع میں اگرچہ سب نسخوں میں کو ہے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کی بجائے۔ میں اچھا تھا۔ مطبع نظامی کے نسخہ میں ستم یہ ہے کہ دوسرے مصرع میں ڈیش دیدیا گیا ہے خدا جانے کیا سمجھ کر اچھے خاصے مصرع کو مہمل بنا یا گیا ہے۔

بلند و پست سب ہموار ہیں اپنی نگاہوں میں   برابر ساز میں ہوتا ہے جوں سُر زیر اور بم کا

مصرع اولیٰ یوں تھا۔ بلند و پست سب ہموار ہیں یاں اپنی نظروں میں۔ مگر زبان کے تدریجی فرق کو مٹا کر اس کو زمانۂ حال کی زبان بنا دیا گیا۔

گلستان جہان کی دید کیجیو چشم عبرت سے   کہ ہر اک سرو قد ہے اس چمن میں نخل ماتم کا

مصرع اولیٰ میں دید مذکر تھا۔ مگر اس کو زمانۂ حال کے موافق مذکر لکھکر زبان پر احسان فرمایا گیا ہے اگرچہ غریب درد کی زبان کا نشان مٹ گیا۔

میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات   پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

اصل میں مصرع اولیٰ یوں تھا۔ میں تو کچھ ظاہر نہ کی تھی دل کی بات۔ میر درد کی زبان یہی ہے۔ مگر اس کو مٹا کر زمانۂ حال کی علامت فاعلیت اس میں رکھدی گئی۔

نگاہ مست ان آنکھوں کی ٹک اید ہر بھی ساقی   کہ ہم کم حوصلہ کے حق میں ہر اک جام ہو شیشا

مصرع ثانی میں بجائے کم حوصلہ کے کم حوصلوں ہے اور بہ لحاظ ہم - وہی صحیح ہے

کہیں لوگوں میں بھلا ہمکو بھی پھرتے چلتے نظر آ جائے گا

مصرع اولی اصل میں یوں تھا - کبھو ہم کو بھی بھلا کو چوں میں اُس کو بدل کر مفہوم شعر کو کچھ سے کچھ بلکہ قریب مہمل کے بنا دیا -

نزدیک ہے پر اپنے بلانے سے کب آوے مل جائیگا تو دور سے پہچان ملیگا

چونکہ بلا بھیجے ایک قدیم اور میر درد کی زبان کا لفظ تھا جواب قریب قریب نہیں بولا جاتا اس کی بجائے بلانے سے بنا دیا گیا -

ملے ہے درد اس کے ساتھ تو دیکھا غریبی سے گھمنڈ اس کے جو تھا جی میں سو اب یکسر گیا نکلا

اصل میں پہلا مصرع یوں تھا - ملے ہے درد اس کے ساتھ - دیکھا تو غریبی سے - یعنی ہم نے دیکھا تو درد اس کے ساتھ نہایت مسکینت اور غریبی سے ملتا ہے - مگر میں نہیں سمجھتا کہ تو کو دیکھا کیوں پر مقدم کیا گیا -

گزرا تھا بعد مدت وہ سامنے سے ہو کر اسے کوتہی نالہ یہ وقت تھا گئی کا

مصرع ثانی میں قافیہ - گئی - اگرچہ صحیح ہے - قدیم نسخے میں بھی گئی ہے - مگر مطبوعہ کشوری میں گی ہے - دو وجہوں سے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے ایک یہ کہ - گئی - بغیر مصدر کرنے کے مستعمل نہیں - گئی کرنا بمعنی درگزر کرنا - یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ کوئی شخص انتقام پر قادر ہو اور رحم کرکے خود درگزر کرے - یہاں بغیر کرنے کے مستعمل ہے - دوسرے حسب تشریح بالا خود درگزر نہیں کی بلکہ کوتہی نے درگزر کی ہے - اس لئے یہ اس کا محل استعمال نہیں ہے - دوسری وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ لفظ دہلی کی زبان کا ہے مگر خیال یہ ہے کہ ذوق کے وقت سے پہلے کا نہیں ہے - میر درد کی زبان نہیں ہو سکتی پھر بھی مجھکو اپنے اس خیال پر وثوق نہیں ہے - اگر گئی کہا جائے تو یہ استکراہ مانا جا سکتا ہے

وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا یعنی کبھو تو اپنے بھی دل کا دماغ تھا

دوسرے مصرع میں دل کا دماغ ایک عجیب چیز ہے - اصل میں دل تھا، تھا جس کو یوں بنا دیا گیا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ان سب نسخوں میں جو مصحح کے پاس تھے، یونہی تھا جیسے کہ چھاپا گیا تو وہ سب غلط تھے -

اس غزل کے بعد رباعیات شروع کر دی ہیں - حالانکہ اُن میں ایک بھی رباعی نہیں ہے - دیکھنے والا جلی قلم سے لکھی ہوئی رباعیات کی سرخی دیکھتا ہے اور اُس کو ایک رباعی بھی نظر نہیں آتی - معلوم ہوتا ہے کہ ناتمام غزلوں کے دو دو شعر دیکھ کر انھیں رباعی سمجھ لیا گیا

تشنگی اور بھی بھڑکتی گئی تو جوں جوں میں اپنے آنسوؤں کو پیا

قدیم نسخے میں یوں ہے - جوں جوں میں آنسوؤں کو اپنے پیا - اسی صورت میں خواجہ صاحب کی زبان سے زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے -

موج نسیم کو ہے زنجیر بوئے گل کی دامن یہ چھو سکے پر از خود رمیدگاں کا

مصرع اول میں کو کی بجائے گو اور مصرع ثانی میں - چھو سکے کی بجائے - چھو سکی صحیح ہے - اس کے بعد افراد ردیف الف کا نمبر آتا ہے جسمیں یہ شعر قابل ملاحظہ ہے -

دیکھ کر حال پریشاں عاشق ناشاد کا یاں کے معشوقوں نے بسم زلف اپنی ہی پڑھا

پہلے مصرع میں زمانۂ حال کی زبان کو ملحوظ رکھتے ہوئے اچھی خاصی اصلاح کر دی گئی ہے ورنہ مصرع اولیٰ در اصل یوں تھا - دیکھکر حال پریشاں عاشقانِ زار کا - میں کبھی یقین نہیں کرسکتا کہ عاشق ناشاد درد کی زبان کا نکلا ہوا فقرہ ہے - نہ اس لئے کہ اُس وقت یہ ترکیب رائج نہ تھی بلکہ اس لئے بھی کہ دوسرے مصرع میں معشوقوں جمع کے ساتھ موجود ہے پھر اب لیجئے مصرع ثانی کو جس میں یاں کے - ایک بے معنی بات کہی گئی ہے حالانکہ نسخہ مطبوعہ کشوری میں بانکے موجود ہے - اور یہی صحیح ہے

فلک پر کون کہتا ہے گزر آہِ سحر کرنا — جہاں جی چاہے وا نیر جا کسی دل میں اثر کرنا

دوسرا مصرع اس قدر مبہم ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا - وجہ یہ ہے کہ اچھے خاصے صحیح مصرع کو نہ سمجھنے کی وجہ سے زیر و زبر کر دیا گیا ہے - دراصل یوں تھا - جہاں جی چاہے واں جا - پر کسی دل میں اثر کرنا - یعنی اے آہ تیرے لئے کوئی قید مکانی نہیں لگائی جاتی جہاں تیرا جی چاہے جا مگر جہاں جائے کچھ نہ کچھ کسی دل میں اثر کرنا -

بے بضاعت ہیں سب اہلِ زرق برق — چشمۂ خورشید میں کیدھر ہے آب

زرق - برق کے درمیاں میں واؤ کی ضرورت ہے ورنہ ترکیب غلط ہوگی - نسخۂ قدیم میں بھی یہی ہے -

سوتے ہے آسائش افتادگاں — چشم نقش پا کو مٹ جاتا ہے خواب

مصرع ثانی میں کو بالکل غلط ہے اسی کی بدولت شعر کا شعر مہمل ہو گیا - یہاں کا چاہئے - ایسا ہی قدیم نسخے میں ہے

ہم روسیاہ دن کو تو کیا منہ دکھا سکیں — چوں شمع جاتے ہیں کہ ہو دے شتاب رات

مصرع ثانی میں چوں میں جیم فارسی کی بجائے جیم تازی چاہئے - ورنہ ترکیب غلط ہو جائے گا کیونکہ زبان کے خلاف ہے

زاہد اگر نہیں کی تو نے کسو سے بیعت — پیر مغاں کہاں - کر - دست سبو بیعت

دوسرا مصرع جس صورت سے بنایا گیا ہے آپ نے ملاحظہ فرمایا - اب صحیح مصرع دیکھئے - پیر مغاں کے ہاں کر دست سبوے بیعت یعنی پیر مغاں کے یہاں -

جائے کسو اسطے اے درد میخانے کے بیچ — اور ہی ہستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

نسخہ قدیم میں مصرع اولیٰ میں جائے کی بجائے آئے ہے

سیر باغ بوستاں تو ہے میسر ہر گھڑی — آئے گا ہے فقیروں کے بھی کاشانے کے بیچ

مصرع اولیٰ میں باغ اور بوستاں کے درمیان سے واؤ غائب کر دیا گیا - اور مصرع ثانی میں وہ اصلاح ہے کہ سبحان اللہ - یعنی فقیروں کے بھی ویرانے کے بیچ کی بجائے کاشانے کے بیچ بنا دیا ہے

چاہے کہ بات جی کی منہ پر نہ میرے آئے — اپنے دہن کو لا کر رکھدے مرے دہاں پر

قدیم نسخہ میں مصرع اولیٰ میں منہ پر نہ آئے میرے - اور مصرع ثانی میں دہن کی بجائے دہاں ہے

ساقی ہو چڑھا آج تو یہ رنگ گھٹا پر — شیشہ ہو گرے پھینکئے گر سنگ ہوا پر

اس غزل میں ہوا پر ردیف ہے اور سنگ رنگ وغیرہ قافیہ۔ مگر مصحح اور کارکنان کی جدت طبع نے مصرع اولیٰ کی ردیف کو بدلکر گھٹا بنا دیا۔

ماتند جہاں آہ تنک ظرف جہاں کے　　یاں کرتے ہیں سر کھینچنے کے ڈھنگ ہوا پر

خواجہ میر درد نے پہلے مصرع میں بجائے جہاں کے حباب لکھا تھا۔ سب سے بڑی ستم ظریفی کارکنان و مصحح صاحب نے یہ کی ہے کہ ایک شعر کو نظر انداز کر دیا ہے اور کہیں اس کا ذکر نہیں کیا وہ شعر یہ ہے:۔

تو ہی نہیں ساقی تو جسے ابر میں کہئے　　اپنی ہی نظر میں یہ بندھا رنگ ہوا پر

اس قدر تھا یا کرم یا ظلم رانی اس قدر　　مہربانی اس قدر نا مہربانی اس قدر

پہلے مصرع میں اشارۂ بعید اُس قدر۔ دوسرے مصرع میں بھی اس کے جواب میں بھی اُس قدر تھا۔ مگر جدت طبع نے قریب و بعید سب کو ایک کر دیا۔

درد تو کرتا ہے معنی کے تئیں صورت پذیر　　دسترس رکھتے تھے کب بہزاد مانی اس قدر

اس میں بھی بہزاد۔ مانی کے درمیاں سے واؤ عاطفہ اڑا دیا گیا ہے۔ جو دوسرے نسخوں میں موجود ہے۔

مشہور خلق میں نہیں اپنے کمال کر　　بکتا ہوں مثل آئینہ اور ہی جمال کر

دوسرے مصرع میں ایک نقطہ اڑا کر شعر کو مہمل بنا دیا۔ بجائے بکتا کے یکتا ہونا چاہیے

اس کے بعد ردیف۔ زا ہے اس میں بھی مثل سابق رباعیات والی ستم ظریفی کی گئی ہے یعنی جہاں کہیں ناتمام غزل کے دو شعر دیکھے ہیں وہیں رُباعیات لکھ دیا یہی رنگ آخر دیوان تک قائم رہا ہے نا واقفان عروض کے لئے سخت گمراہی کا سامان ہے

لایا تھا جو آج تئیں ہاتھ سوئے تیغ　　وابستہ میرے قتل سے تھی آبروئے تیغ

قدیم نسخے میں مصرع اولیٰ یوں ہے۔ لایا نہ تھا تو آج تلک الخ "

راہ عدم میں درد میں اتنا ہوں جلد رو　　پہونچا صبا کا ہاتھ نہ میری غبار تک

نسخہ قدیم میں بجائے جلد رو کے تیز رو ہے اور یہی محاورہ ہے

پانی پر نقش کب ہے ایسا　　جیسے ناپائدار ہیں ہم

قدیم نسخہ میں یوں ہے۔ پانی پر نقش کیا ہے ایسا

از بسکہ ہیں محو لا تعین ؏　　ہر جا بے اعتبار ہیں ہم

دوسرے نسخوں میں بجائے بے اعتبار کے بے اختیار ہے جو یقینی معنی کے لحاظ سے زیادہ بلند ہے

اب کی ترے در سے گر گئے ہم   پھر یہ بھی سمجھ کہ مر گئے ہم

مصرع ثانی میں یہ بھی کی بجائے - یہ ہی ہے - اور پھر کے بجائے بس -

چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم   بہار باغ تو یونہی رہی لیکن کدھر شبنم

دوسرے مصرع میں تو کے بجائے - گو - ہونا چاہئے ورنہ شعر بے معنی ہے - رہی کے بجائے رہتے ہونا چاہئے -

کیا کہیں سوئے فنا کس طور کر جاتے ہیں ہم   شمع کے مانند سر کے بھل ادھر جاتے ہیں ہم

مصرع ثانی میں بھل لایا گیا ہے - یہ دہلی کی زبان نہیں اس کی بجائے بل ہونا چاہئے

ہمیشہ فتح نصیبی ہمیں نصیب رہی   جو کچھ کہ اپچی ہے جی میں سو مار رکھتے ہیں

مصرع ثانی میں اپچنا بہ جیم فارسی لکھا گیا ہے لیکن یہ غلط ہے زبان دہلی کے موافق ابجنا چاہئے

جہاں کے بلغ سوں ہم دل سوا نہیں پایا   فقط یہی ثمر دا غدا ور رکھتے ہیں

مصرع اولیٰ میں سوں لایا گیا ہے - میر درد کے وقت میں یہ متروک ہو گیا تھا - ان کے یہاں جا بجا سے - موجود ہے پھر اس محل پر بلا وجہ سوں کا استعمال کیا اور نسخوں میں سے پایا جاتا ہے

چاہے ہے یہ مری تپش دل کہ بعد مرگ   کنج مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں

نسخۂ قدیم میں مصرع اولیٰ اس طرح ہے - یہ چاہتی ہے تو تپش دل کہ بعد مرگ

کچھ مرتبہ ہے اور وہ فہمید سے پرے   سمجھے ہیں جس کو یار وہ اللہ ہی نہیں

اصل نسخہ میں یوں ہے - کچھ مرتبہ ہے اور ہی - الخ - مصرع ثانی یوں ہے - ہم جس کو بوجھتے ہیں وہ اللہ ہی نہیں - اگر غور کیا جائے تو خواجہ صاحب کی زبان یہی معلوم ہوتی ہے -

انسان کی ذات سے ہی خدائی کے کھیل ہیں   بازی کہاں بساط پہ گر شاہ ہی نہیں

مصرع اولیٰ نسخۂ صحیح میں یوں ہے - انسان کی ذات سے ہیں خدائی کے کھیل یاں یہی مصرع درد کی زبان سے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے زبان کی تدریجی ترقی پر نگاہ رکھنے والے حضرات خود سمجھ سکتے ہیں

گر کہتے ہو کہ ہے وہی ہادی وہی مضل   تو راہ پر ہیں سب کوئی بیراہ ہی نہیں

میرے نسخہ میں مصرع ثانی میں بجائے بیراہ کے گمراہ ملتا ہے

سبھی اپنے جینے سے اے درد خوش ہیں   اگر ہوں تو یہ ایک بیزار میں ہوں

ہمارے نسخہ میں مصرع ثانی میں اگر کے بجائے مگر ہے اور غالباً صحیح یہی ہے -

یوں تو نظر پڑے ہیں تن افگار سیکڑوں   دل ریش کوئی آپ سا دیکھا نہ پر کہیں

مصرع اولیٰ میں بجائے سیکڑوں کے - اور بھی ہے اور یہی زبان کی تدریجی رفتار کے لحاظ سے صحیح ہے

بے زباں ہے یہ وہ زباں سوسن — اس چمن میں کسے مجال سخن

اصل میں "بے وہ زباں" تھا۔ بے کو یہ بنا دیا گیا اور شعر کو مہمل کر دیا۔

ہوئے کب وحدت میں کثرت سے خلل — جسم و جاں گو دو ہیں باہم ایک ہیں

مصرع ثانی میں بجائے "باہم" - "پر ہم" تھا۔ اس ردوبدل نے شعر کو بے معنی کر دیا۔ معنی یہ ہیں کہ وحدت میں کثرت سے خلل نہیں آتا ہم میں جسم ہے۔ جان ہے۔ مگر ہم وہی ایک ہیں

دال ہے اس پہ ہی قرآں کا نزول — بات کی تفہیم میں ہم ایک ہیں

دوسرے مصرع میں بجائے "نزول" کے نسخہ صحیح میں لفظ "وجود" ہے

مزاج نازک اگر دل سے کچھ مکدر ہو — یہ آئینہ ہم ابھی پاش پاش کرتے ہیں

ہمارے نسخہ میں مصرع اولیٰ یوں ہے۔ مزاج نازک دل سے اگر مکدر ہو

تاقیامت نہیں ٹلنے کا دل عالم سے — درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں

مصرع اولیٰ میں بجائے "ٹلنے" کے "مٹنا" ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے۔ کہ درد ہم جاتے ہیں اور اثر چھوڑے جاتے ہیں۔ اب یہ اثر قیامت تک دنیا کے دل سے نہ مٹے گا۔ اس لئے ٹلنا غلط ہے

جس طرف چاہوں چلوں یہ وہ سفر ہستی ہے — وہم کہتا ہے کہ اب پاؤں نہ دھر پانی میں

ہمارے نسخہ میں بجائے "یہ" کے "یاں" ہے

میں مثل حباب آنکھیں تو رو کے بھاؤں — پردہ بھی کہتا ہے سدا جھوٹ ہی ہیں

ہمارے نسخہ میں "بھاؤں" کی بجائے "بھاویں" ہے۔ جو صیغہ ماضی ہے اگر یہ نہ ہو تو شعر کا مفہوم صحیح نہیں اور ردیف سے توافق نہیں رہتا

اے درد سمجھ سہج نہ ان آنکھوں کا بہنا — چھاتی کی طرح دل کو مرے کوٹ ہی ہیں

ہمارے نسخہ میں بجائے "چھاتی کی طرح" کے "چھاتی کے تئیں" ہے یہاں تئیں بمعنی تک استعمال کیا ہے۔

مجھے درسے اپنے تو ٹالے ہے یہ بتا مجھے تو کہاں نہیں — کوئی اور بھی ہیگا ترے سوا تو اگر رہے ہو یہاں نہیں

ہمارے نسخہ میں مصرع ثانی ...... اس طرح ہے۔ کوئی اور بھی ہے ترے سوا تو اگر نہیں تو جہاں نہیں۔ بہ لحاظ معنویت بندش اور صحت یہی زیادہ قرین قیاس اور صحیح ہے۔

پرے جوں سایہ ہم تجھ بن ادہر اُدہر بھٹکتے ہیں — جہاں جائیں قدم رکھیں تو پہلے سر پٹکتے ہیں

ہمارے نسخہ میں اور نیز کشوری میں مصرع ثانی میں بجائے "جائیں" "چاہیں" ہے اور یقینی یہی صحیح ہے۔

کی جس سے عبادت یہ سو وہ زیست کہاں — یوں تو کہنے کے لئے کہئے کہ ہاں جیتے ہیں

مصرع ثانی میں ہمارے نسخہ و نیز کشوری میں بجائے "کہنے کے لئے" کے "کہنے کے تئیں" ہے۔

دل تو سمجھائے سمجھتا بھی نہیں　　کہئے سودائی تو سودا بھی نہیں

ہمارے یہاں و نیز کشوری میں بجائے سودائی کے مصرع ثانی میں سودا ہے جو سیاق کلام کے زیادہ مناسب ہے

یوں تو سب باتیں نصیحت کی کہیں　　پر اثر ہوتا ہے دل کے تئیں کہیں

ہمارے و نیز کشوری نسخہ میں بجائے یوں کے مصرع اولیٰ میں یں ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس سے آگے پھر وہی رباعیات کی غلط سرخی دیدی گئی ہے۔ بعد ازاں

دو نگاہیں جو پار ہوتی ہیں　　برچھیاں دل کے پار ہوتی ہیں

مصرع اولیٰ میں دو لکھا گیا ہے اور ستم ظریفی یہ کی ہے کہ دو کا ہندسہ بھی اوپر بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ معلوم ہے کہ ہر جگہ دو نگاہوں کے چار ہونے کا یہ اثر نہیں ہوتا اُس کے بجائے ۔۔۔ وہ ہونا چاہئے ہمارے یہاں یہی ہے مصرع ثانی میں بجائے برچھیاں دل کے برچھیاں ہیں صحیح ہے۔

زلفوں میں تو سدا سے یہ کج ادائیاں ہیں　　آنکھوں نے پر اب وہی آنکھیں دکھائیاں ہیں

مصرع ثانی میں بجائے اب کر یہ ہے

ہر دم بتوں کی صورت رکھتا ہے دل نظر میں　　ہوتی ہے بت پرستی اب تو خدا کے گھر میں

مصرع ثانی میں بجائے خدا نے۔ خدا کے ہونا چاہئے۔ یہ ایک پیش پا افتادہ غلطی ہے

ایسا ہی غم نے تیرے پامال کر دیا ہے　　کچھ دل رہا نہ دل میں نہ کچھ جگر جگر میں

مصرع ثانی میں نہ کی کتابت سنے کی صورت میں ہونا چاہئے۔

کیا فرق داغ و گل میں اگر گل میں بو نہ ہو　　کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

مصرع اولیٰ میں اگر کی بجائے ہمارے نسخے و نیز کشوری میں کہ جس ہے

ہووے نہ حول و قوت اگر تیرے درمیاں　　جو ہم سے ہو سکے ہے سو ہم سے کبھو نہ ہو

مصرع اولیٰ میں تیرے کی بجائے تیری ہونا چاہئے

جوں صبح چاک سینہ مرا اے رفوگراں　　یاں تو کسی کے ہاتھ سے ہرگز رفو نہ ہو

مصرع ثانی میں بجائے سے کے دوسرے نسخے میں بھی ہے

سمجھا فہم گر کچھ ہے طبیعی سے الٰہی کو　　شہادت غیب کی جا ہو تو حاضر ہے گواہی کو

دوسرا مصرع ہمارے نسخے میں یوں ہے۔ شہادت غیب کی خاطر تو حاضر ہے گواہی کو

نہ بچائے کہیں تو زاہدا محروم جنت سے　　گنہگاروں میں سمجھا کر تو اپنی بے گناہی کو

دوسرے مصرع میں کر تو کی بجائے کر تو ہمارے نسخہ میں ہے۔ اس سے مفہوم شعر صاف اور روشن ہو جاتا ہے۔

اے درد رفتہ کیا آپ کو ہی گم — اس راہ میں چلا تھا میں کس کے سراغ کو

دوسرے مصرع میں بجائے ہی کے بھی اچھا ہے۔ یہی ہمارے نسخہ میں ہے

اور ہوں آمادۂ میخوارگی یہ مو پرست — سر اگر کاٹے انھوں کے محتسب مثل کدو

دوسرے مصرع میں بجائے انھوں کے انھوں کا ہے۔ مگر یہ اختلاف کچھ زیادہ مضر نہیں

بات اہل دید سے کہتے ہیں یاں روشن ضمیر — نت زبان شمع کو ہے چشم ہی سے گفتگو

مصرع ثانی میں ہی سے کی بجائے سے ہی ہے۔ یہی اہل دہلی کا طرز گفتگو ہے

طاؤس کی سی آنکھوں سے کہو اس چشم حیراں کو — عیاں جب ہر جگہ دیکھوں کسی کے راز پنہاں کو

مصرع ثانی میں بجائے کسی کے کہتی ہے۔ اُس میں زبان کی رفتار تدریجی کا ایک خاص فرق ہے جو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

لے شور قیامت رہ اُدھر ہی میں کہتا ہوں — چونکے ہے ابھی یاں سے کوئی دل شوریدہ

مصرع ثانی ہمارے نسخہ میں یوں ہے۔ چونکے نہ ابھی یاں سے کوئی دل شوریدہ۔ یہی مصرع بامعنی ہے ورنہ اہمال پیدا ہوجاتا ہے

ہر چند سعی میں ہی رہا ناخن ہلال — کھلتی ہے پر سپہر کی کوئی کہن گرہ

مصرع اولیٰ میں ہی رہا کی بجائے ہے سدا ہمارے نسخہ میں ہے۔ اور اس سے استمراری صورت پیدا ہوگئی جو زیادہ صحیح ہے

ایک ہی جست میں لی منزل مقصود اُسکو — راہرو رشک کی جا ہے سفر پروانہ

مصرع ثانی میں بجائے راہرو واحد کے راہروو جمع ہونا چاہئے۔ ہمارے اور دوسرے نسخوں میں بھی یہی ہے۔

جسپہ تقصیر دار تم سمجھو — ابھی ایسا تو کچھ نہیں ہے گناہ

مصرع اولیٰ میں تم کی بجائے تو ہے

شوخ تو اور بھی ہیں دنیا میں — یہ تیری شوخی کچھ عجب ہے واہ

مصرع ثانی میں بجائے یہ کے پر ہونا چاہئے۔ اور تیری میں ے کو شامل نہ کرنا چاہئے ورنہ شعر ناموزوں ہو جائیگا

خلوت دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل — حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبال دوش ہے

ہمارے و نیز کلغوری نسخے میں بجائے نے مصرع اولیٰ میں میں ہے

ہووے تو درمیاں سے اپنے تئیں اٹھائے — باہر نہیں ہے اور کچھ سر ہی وبال دوش ہے

مصرع اولیٰ صحیح یوں ہے۔ ہووے تو درمیاں سے آپ اپنے تئیں اٹھائیے

ہم نے تو ایک معصیت چاہی چھپیو نہ چھپ سکی — اپنے گناہ کو ترا عفو ہی پردہ پوش ہے

ہمارے نسخہ میں تو یوں ہے۔ ہمنے تو ایک معصیت چاہیں چھپے نہ چھپ سکے۔

حیرت زدہ نہیں ہے فقط تو ہی آئینہ — یاں تک بھی جس کی آنکھ کھلی ہے سو دنگ ہے

دوسرے مصرع میں تک غلط ہے۔ تک ہونا چاہئے

غنچہ شگفتہ ہووے ہی ہووے کہیں درد دیکھا چمن میں جاکے تو کچھ اور رنگ ہے

دوسرے مصرع میں اور رنگ کی بجائے اور ہی رنگ ہے درد کی زبان بھی یہی ہے اور اسی سے یہاں کلام میں زور پیدا ہوتا ہے۔

ابر مژہ چشم تو کیا ہیں کہ گھر کے گھر تونے برس برس کے ہزاروں بہادئے

ہمارے نسخہ میں بہا دئے کی بجائے بٹھا دئے ہے۔ بہادئے خلاف محاورہ ہے۔ گھر بہنا نہیں بولتے گھر بیٹھنا بولتے ہیں

ادھر کو جیتا دیکھیو بچو رہیں یہ رنداں آنا ہے تو خود داری کو گھر میں ہی دھر آؤ

ہمارے نسخہ میں بجائے آنا - آتا ہے

کہتے ہیں کہ یکدست تری تیغ چلی ہے تب جانئے جب اکدو قدم چل ادھر آئے

مصرع ثانی یوں ہے۔ تب جانیں کہ جب اکدو قدم چل ادھر آوے

اے صبح رواں تیری مدد ہووے تو شاید اس بحر میں ہمسے بھی کوئی شعر تر آئے

مصرع اولیٰ میں صبح رواں بالکل غلط ہے اس کی بجائے طبع رواں ہونا چاہئے

نہیں مشتاق آئینہ کے جو وہ صاف طینت ہیں صفا تو عارضی ہے اور کدورت ہمیں آتی ہے

مصرع اولیٰ میں بجائے جو وہ۔ وہ جو ہونا چاہیئے۔ ورنہ شعر میں اہمال کا اندیشہ ہے

اگر آئینہ چار آئینہ پھرے تو نہیں سنکھ سپر ہوں تیر مژگاں کا یہ سومیری ہی چھاتی ہے

مصرع اولیٰ یوں ہے۔ اگر آئینہ چار آئینہ ٹھہرے تو نہو سنکھ۔ پہرنا۔ بمعنی پہننا۔ ہندی میں صحیح سہی مگر درد کی زبان نہیں ہے۔ وہ پہننا لکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آئینہ چار آئینہ ہی بنجائے تو بھی اس تیر مژگاں کا مقابل نہیں ہوسکتا۔

کہہ اور بھی غزل کوئی اب اس ردیف میں اے درد قافیہ کو اگر تو بدل سکے

ہمارے نسخہ میں اب کی بجائے پر ہے

اخفائے راز عشق نہو آب اشک سے یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

اخفائے راز عشق مصرع اولیٰ میں بالکل غلط ہے۔ اس کی بجائے اطفائے نار عشق ہونا چاہئے یہی ہمارے نسخہ اور دیگر نسخہ میں ہے۔

دل ٹکڑے کیا ہے یہ تر اکس کے بول نے جو لخت ہو سو اشک عقیق یمنی ہے

اگرچہ سب نسخوں میں ترا مصرع اولیٰ میں ہے۔ مگر کوئی معنی نہیں دیتا۔ اغلب ہے کہ مرا ہو۔

آرام سے کبھو بھی نہ یکبار سو گئے ایسے ہمارے طالع بیدار سو گئے

مصرع اولیٰ میں ہی کی بجائے بھی ہونا چاہئے۔

آج نالوں نے مرے اور ہی دلسوزی کی زخم دل جتنے تھے یاں سب کی جگر دوزی کی

مصرع اولی میں آور ہی کی بجائے "اور ہی" چاہئے۔ جیسا کہ ہمارے و نیز دوسرے نسخوں میں ہے ورنہ شعر بے معنی سا ہو جائیگا

نیر دشتر کو سمجھ کہ وہ ہے زہر سانپ کی زیست ہے تجھے سم ہے

مصرع اولی صحیح نہیں ہے اسکی بجائے ہمارے نسخہ میں یہ ہے۔ خیر و شر کو سمجھ کہ ہیں دو زہر۔ یعنی خیر بھی ایک زہر ہے اور شر بھی۔ سانپ کا مارنا تیرے نزدیک خیر ہے مگر اسکے لئے زہر ہے۔ سانپ کی زندگی اس کے لئے خیر ہی تیرے لئے شر ہے۔ لہذا دونوں چیزیں اپنے اپنے موقع پر زہر ہیں۔

پاؤں لرزے ہے مست کی مانند شیشہ مے ہر آبلا ہے مجھے

مصرع ثانی ہمارے نسخہ میں یوں ہے۔ شیشہ مے بھرا ملا ہے مجھے۔ دیکھئے معانی میں کس قدر بلندی پیدا ہوگئی۔ مصرع مطبوعہ نظامی میں۔ بحر تا دو ملل کے معنی صحیح نہیں ٹھہرتے۔

جوں جوں وہ کٹے ہے تو یہی آتی ہے جی میں پھر چھیڑئے اور باتیں سنا کیجئے اس سے

ہمارے نسخہ میں کھچے۔ بجائے کٹے۔ پایا جاتا ہے۔ مطبوعہ نظامی میں کٹے بمعنی شرمندگی لایا گیا ہے حالانکہ یہ لفظ درد کے وقت میں نہیں تھا جدید ہے۔

یہ مرتبہ یوں ہو چکی آپ سے نہ ملئے وہ بھی تو نہیں بنتی ہے کیا کیجئے اس سے

مصرع ثانی میں وہ بھی کی بجائے "وال بھی" صحیح ہے

گر چاہے تو ملئے اور چاہئے نہ ملئے سب تم سے ہو سکے ہے ممکن نہیں تو ہم سے

مصرع اولی میں اور کی بجائے۔ ور ہے جو (ہور) کا بگڑا ہوا تھا۔

اب ہیں کہاں وہ نالے سر گشتگی کدھر ہے تھیں سب یہ باتیں ثابت میری ہی دم قدم سے

مصرع ثانی میں بجائے یہ اشارہ قریب "وہ" اشارہ بعید ہے اور یہی ہونا چاہئے

کاہیکو ہوتی تم کو گردش نصیب طالع گر پاؤں اپنا باہر رکھتے نہ ہم عدم سے

مصرع اولی میں بجائے تم نے ہم ہونا چاہیے۔

پتھر تلے کا ہاتھ ہے غفلت کے ہاتھ دل سنگ گراں ہوا ہے یہ خواب گراں مجھے

ہمارے نسخہ میں خواب کو مونث لکھا ہے۔ اگرچہ آج کل مذکر مستعمل ہے مگر بہت ممکن ہے کہ درد کے زمانہ میں مونث رہا ہو۔ کیونکہ اس وقت تذکیر و تانیث کی زیادہ پرواہ نہ تھی۔ سیکڑوں الفاظ جو اب مذکر مستعمل ہیں اوس وقت بہ تانیث ملتے ہیں اور مجھے یاد ہے کہ میر درد کے معاصرین کے یہاں بھی میں نے بعض جگہ خواب بہ تانیث دیکھا ہے۔ نیز خیال ہے کہ خود درد کے یہاں بھی دوسری جگہ بہ تانیث ہے

کب ترا دیوانہ آوے قید میں تدبیر سے جوں صدا نکلا ہی چاہے خانۂ زنجیر سے

دوسرے مصرع میں چاہے کی بجائے چاہئے۔ صحیح ہے بمعنی جاتا ہے۔ یہ لفظ سب نسخوں میں یونہی پایا جاتا ہے۔ نیز لغات اور

مضافات دہلی میں زبان عوام پر اب تک یونہی مستعمل ہے۔

اے ہم وطناں اب کے یہ غیرت زدہ ہرگز　　پھرنے کا نہیں عمر کے مانند سفر سے

مصرع اولیٰ میں غیرت زدہ کے بجائے ہمارے نسخہ مطبوعہ قدیم و قلمی میں غربت زدہ ہے۔

کھلتی ہے مری آنکھ جو احوال پر اپنے　　جوں شمع گھٹا جاتا ہوں میں اپنی نظر سے

نسخہ قدیم قلمی میں علی الرغم سب نسخوں کے مصرع اولیٰ یوں ہے۔ کھلتی ہے مرے آنکھ جب احوال پر اپنے

گر خاک مری سرمہ اصفہان نہ ہووے　　تو کوئی نظر قابل دیدار نہ ہووے

مصرع ثانی میں نسخہ قلمی میں بجائے قابل - مایل ہے - جو قابل اعتنا نہیں

سررشتہ الفت ہو یہ تا شیخ و برہمن　　یہ بستہ بجز سبحہ و زنار نہ ہووے

قدیم نسخہ مطبوعہ میں مصرع ثانی میں بجائے بجز کے ہر ہے - اور قلمی قدیم نسخہ میں یہ رشتہ ہر ہے گو مفہوم ان دونوں کا ایک ہی ہے مگر مطبوعہ زیادہ صحیح سمجھا جا سکتا ہے بہر حال بجز ضرور غلط ہے۔

دل ایسے ستمگار سے اظہار محبت　　ایسا کہیں پھر دیکھیو زنہار نہ ہووے

مطبوعہ - اور قلمی میں مصرع اولیٰ میں بجائے ایسے کے ویسے ہے۔ یہاں اسم اشارہ غایب صحیح ہے۔ کیونکہ جو کچھ دل کو سمجھایا جا رہا ہے اس ستمگار کی غیبت میں سمجھایا جا رہا ہے نہ کہ مواجہہ میں

گر زندگی اس طور سے اے درد جہاں میں　　خاطر پہ کسو شخص کے تو بار نہ ہووے

مصرع اولیٰ میں بجائے گر کے گو صحیح ہے۔

حال کچھ تو پوچھئے میں جو کہوں سو کیا کہوں　　دل ہی سو ریش ریش ہے دل ہی سو داغ داغ ہے

مصرع اولیٰ قلمی و مطبوعہ قدیم نسخوں میں یوں ہے حال مرا نہ پوچھئے الخ یہی صحیح ہے اس حالت میں مہمل ہے

پائے کس روش بتا اے بت بیوفا تجھے　　عمر گزشتہ کی طرح گم ہی سدا سراغ ہے

نسخہ مطبوعہ قدیم میں مصرع اولیٰ میں پائے کس روش کی جگہ - پائے کس جگہ ہے۔ مگر قلمی قدیم میں پائے کس روش ہی ہے

تیری نگاہ مست نے جب سے نہ کی ہے میکشی　　خون سے اپنے مثل گل ہمتی بھرا ایاغ ہے

مصرع اولیٰ میں بجائے نہ کی کے یہ کی ہونا چاہئے - یہی دوسرے نسخوں میں ہے۔

چلئے کسی کی زلف میں کب یہیں فراغ ہے　　لیجئے بو شمیم سے سو بھی کہاں دماغ ہے

مصرع ثانی میں لیجئے بو شمیم سے بے معنی ہے اس کی بجائے - کیجئے بو شمیم ہی - چاہئے یہی ہمارے قدیم مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں ہے

بات کچھ دل کی ہمارے تو نہ سلجھی ہے　　آپ ہی خوش ہوا پھر آپ ہی گھبراتا ہے

ہمارے نسخوں میں مصرع ثانی اس طرح ہے اور یونہی صحیح ہے - آپ ہی خوش ہوتے ہے پھر آپ ہی گھبراتا ہے

راہ پینڈے کبھو اس شوخ کے تئیں ہے بھی دید وا دید تو ہوتی ہے جو مل جاتا ہے

راہ پینڈے سب نسخوں میں ہے۔ مگر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ غالباً راہ مینڈے صحیح ہے۔

میں شعر فہم جتنے زمانہ میں لاکلام اے درد مانتے ہیں یہ سب آن کر مجھے

پہلے مصرع میں بجائے لاکلام کے لاعلاج اور دوسرے میں بجائے آن کر کے مانکر صحیح ہے نسخہ جات قدیم میں یہی ہے

لوگ کہتے ہیں عاشقی جس کو میں جو دیکھا بڑی مصیبت ہے

مصرع ثانی میں بجائے میں کے ہم ہے

آنسو تمیں کچھ جگر کے ٹکڑے بھی ہیں بعض بعض یہ نہیں معلوم لخت دل کدھر بہکر گئے

نسخہ مطبوعہ قلمی قدیم میں پہلا مصرع اس طرح ہے۔ آنسو نہیں کچھ جگر کے ٹکڑے ہیں بھی بعض بعض۔ دوسرے مصرع میں یہ کی بجائے کچھ ہے۔

دل ہی کچھ تنہا خفا ہو کے نہ یاں سے پھر گیا ہم بھی تو اے درد چلنے کو مہیا ہو گئے

نسخہ قلمی قدیم ومطبوعہ میں مصرع اولیٰ میں، پھر گیا کی بجائے اُٹھ گیا ہے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

نسخہ قدیم قلمی ومطبوعہ میں مصرع ثانی میں چشم نم کی جگہ چشم تر پایا جاتا ہے۔ اور بہ لحاظ دامن تر کے وہ زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور صحیح بھی ہے۔

آتش عشق قہر آفت ہے ایک بجلی سی آن پڑتی ہے

مصرع ثانی میں بجائے ایک بجلی کے ایک تجلی سی ہے۔ یہ اس لئے صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بجلی کے ساتھ آن پڑنا نہیں بولتے ہیں بلکہ تجلی کے ساتھ بول سکتے ہیں۔

ایسے سے کوئی اپنے تئیں کیونکہ بچاوے دل زلفوں سے بچ جائے تو آنکھوں سے چرا لے

مصرع ثانی میں بجائے چرالے کے چھنا لے ہے۔ جو چھیننا کا متعدی ہے۔ ہمارے نسخہ میں ہے

یا تو وہ راتیں تھیں یا یہ کچھ دنوں کا پھیر ہے ہاتھ اب لگتے نہیں تب پاؤں بوسا کئے

مصرع اولیٰ میں یا یہ کچھ کی بجائے تو یہ ہے۔

جو یاں کچھ چاہنے والے قریب یکدگر بیٹھے ہم اپنا دل بغل میں اب لیکر آہ کر بیٹھے

مصرع اولیٰ میں بجائے کچھ کے دو۔ نسخہ مطبوعہ قدیم میں ہے۔

نہ پوچھ عشق کی سوزش نے عالم میں کیا کیا عجب طوفان اٹھائے یہ کہ جس گھر کے گھر بیٹھے

مصرعۂ اولیٰ میں بجائے سوزش کے شورش، اور مصرع ثانی میں۔ عجب طوفاں اٹھائے یہ۔ کی بجائے۔ عجب طوفاں اٹھا ہے یہ

صحیح ہے۔ جو نسخہ مطبوعہ قدیم میں ہے۔

دشوار ہوئی ظالم تجھ کو بھی نیند آنی لیکن سنی نہ تو نے ٹک بھی مری کہانی

مصرع اولیٰ میں ہوئی کی بجائے ہوتی چاہیئے۔ ورنہ شعر ناموزوں ہوگا۔

گر نام عاشقی ترے نزدیک ننگ ہے کرنے نہ مجھکو قتل تو پھر کیا درنگ ہے

مصرع ثانی میں کرنے کی بجائے کرنے صحیح ہے۔

آیا ہے ابر اور چمن میں بہار ہے ساقی شتاب آکہ ترا انتظار ہے

مصرع اول میں اور چمن میں کی بجائے زور چمن میں صحیح ہے۔

بازی بدی تھی اُس نے مری چشم تر کیساتھ آخر کو ہار ہار کے برسات رہ گئی

مصرع اولے میں قلمی نسخے میں اُس نے کے بجائے اون نے ہے یہی میر درد کی زبان ہے۔

گرچہ بیزار تو ہے پر اُسے کچھ پیار بھی ہے ساتھ انکار کے پردے میں کچھ اقرار بھی ہے

مصرع ثانی میں کچھ اقرار بھی ہے کی بجائے ۔ پھر اقرار بھی ہے ۔ قلمی نسخہ میں ہے ۔ مگر دونوں مطبوعہ نسخوں میں کچھ ہی ہے

آہوں کی کشمکش میں دیکھو کہیں نہ ٹوٹے تار نفس سے اے دل وابستہ میری جاں ہے

مصرع اولے میں یہ اختلاف ہے ۔ آہوں کی کشمکش میں کہیں دیکھیو نہ ٹوٹے

دل تڑپتا ہے درد پہلو ہے جی نکل جائیو کہ قابو ہے

مصرع ثانی نسخہ مطبوعہ قدیم و قلمی میں اس طرح ہے مرگ آ پہونچیو کہ قابو ہے

نہیں چھوڑتی قید ہستی مجھے اگر کھینچ لیجا سکی مجھے

مصرع ثانی میں اگر کی بجائے مگر چاہیئے

گلرخاں کا بحر دبر میں جو کہ ہے مدہوش ہے ہمنے دریا میں بھی دیکھا بلبلوں کا جوش ہے

گلرخاں کی بجائے قدیم قلمی اور مطبوعہ نسخے میں ۔ گلرخوں ہے

یارب سپہر اتنی تو اب درگزر کرے یہ خانماں خراب کسی دل میں گھر کرے

مصرع ثانی مطبوعہ قدیم و قلمی میں اس طرح ہے کوئی خانماں خراب کسی دل میں گھر کرے چونکہ کوئی ناموزوں سا معلوم ہوا
اس کی بجائے یہ بنایا گیا حالانکہ کوئی بروزن فع قدما میں مستعمل تھا۔

نہ مرتے ہیں نہ نیند آتی نہ وہ صورت بسرتی ہے یہ جیتے جاگتے ہم پر قیامت سب گزرتی ہے

مصرع ثانی میں سب کی بجائے شب صحیح ہے

نالہ ہی سو بے اثر اور آہ بے تاثیر ہے سنگدل کیا تجھکو کہئے اپنی ہی تقصیر ہے

مصرع ثانی میں تقدیر کی بجائے تقصیر صحیح ہے یہی قدیمی مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں ہے

اُس کے بعد رباعیات شروع ہوتی ہیں۔ جو واقعی رباعیاں ہیں۔ اُن پر یہ سرخیاں دی گئی ہے۔ رباعیات متفرق۔ حالانکہ دیوان درد میں رباعیاں صرف یہی ہیں۔ پہلی رباعی کا دوسرا شعر یہ ہے۔

جوں آئینہ کب تلک پریشاں نظری کو
اب موندلے آنکھ بس جہاں کو دیکھا

موندلے کی بجائے موندئے صحیح ہے۔ ایک رباعی کا شعر آخر یہ ہے

بینائی نہ تھی تو دیکھتے تھے سب کو
جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا ہم نے

مصرع اولیٰ میں سب کو غلط ہے اس کی بجائے قلمی۔ و مطبوعہ قدیم میں، سب کچھ ہے۔

ملا کو بھی کچھ اس میں نہیں ہے انکار
بندہ بندہ خدا خدا کہتا ہوں تو

پہلا مصرع قدیم قلمی۔ و مطبوعہ قدیم میں یوں ہے۔ ملا کو بھی اس میں نہیں جائے انکار۔ ترکیب بند کا ایک یہ شعر ہے۔

تو ہی تو ہے دل کی بے حجابی
ہے پردہ چشم سرگیں تو

سرگیں غلط ہے اس کی بجائے شرمگیں صحیح ہے قدیم نسخوں میں یہی ہے ورنہ شعر مہمل ہو جائے گا۔

ظاہر ہے تجھی سے تو یہ عالم
تجھکو بتا کہیں چھپا ہے

مصرع ثانی میں کہیں کے بجائے کہاں ہے

کرتا ہے تو صلح غیر سے تو
ہمسے ہے مگر ارادۂ جنگ

مصرع اولیٰ میں تو اول کی بجائے جو صحیح ہے۔ قلمی نسخے میں بھی یہی ہے

کرتا ہے یہ دل تو روز نالے
ہے نے سے زیادہ تر خوش آہنگ

مصرع اولےٰ میں روز نالے غلط ہے۔ زور نالے ہونا چاہئے۔

اس قدر مطالعہ کے بعد ہر شخص یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ نظامی پریس نے دیوان درد کی طباعت میں جسقدر ظاہری زینت سے کام لیا ہے اسیقدر اسکی صحت کیطرف سے بے اعتنائی اختیار کی گئی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کہیں کہیں اصلاح مناسب ہے، تو بھی اس کا کیا جواب ہے کہ نظامی پریس یا معین الدین صاحب یا اور کسی کو کیا حق حاصل تھا کہ وہ درد کے اسلوب بیان اور اُس کے زبان کو بدل کر اپنے زمانہ کی پیداوار بنا دیں۔ جہاں تک ہم نے غور کیا حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ نواب صدر یار جنگ نے معین الدین صاحب پر اعتماد کر لیا اور خود ایک لمحہ کے لئے بھی یہ تکلیف گوارا نہیں کی کہ وہ دیوان کو ملاحظہ فرماتے نواب صدر یار جنگ نے مقدمہ نہایت پاکیزہ لکھا ہے لیکن ایسے دیوان پر جو درد کا کم اور معین الدین صاحب کا زیادہ ہے، اسی طرح نظامی پریس سے یہ الزام دور نہیں ہو سکتا کہ اُس نے صرف طباعت ہی کو اپنا فرض سمجھا اور بہ حیثیت ایک ذی ہوش ناشر کے کوئی جستجو اس امر کی نہیں کی کہ جس چیز کو وہ اس قدر اہتمام و طنطنہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، وہ حقیقتاً اس قابل ہے بھی یا نہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ حقیقت کے لحاظ سے ساری ذمہ داری معین الدین صاحب پر عاید ہوتی ہے جنھوں نے اپنے فرائض کا صحیح احساس نہ کر کے اس اعتماد کو مجروح کیا جو ان پر قائم کیا گیا تھا لیکن مولوی حبیب الرحمان خان شروانی مشکل سے اس الزام سے بری ہو سکتے ہیں کہ کیوں انھوں نے بغیر خود دیکھے ہوئے محض اعتماد پر توثیق صحت فرما دی اور نظامی پریس کے مالک کسی طرح اس اعتراض کو رفع نہیں کر سکتے کہ انھوں نے کیوں نہ قبل اشاعت خود صحت کی تحقیق کی۔ اس لئے اب اس کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ صدر یار جنگ بہادر خود دیکھ کر معین الدین صاحب کی غلطیوں کا اعتراف فرمائیں اور نظامی پریس اس اشاعت کی تمام کاپیوں کو تلف کر کے دوسرا اڈیشن شائع کرے۔ لیکن اگر بدقسمتی سے نواب صدر یار جنگ یا نظامی پریس اب بھی، بہ اصرار کریں کہ نہیں وہی نسخہ صحیح ہے جو شائع کیا گیا ہے تو پھر میں سوائے اسکے کیا کہہ سکتا ہوں کہ خدا درد کی روح کو صبر عطا کرے

"آرگس"

"قطرۂ آتشیں"

(فسانہ)

گزشتہ قرن کے اخیر میں سرزمین ہنگری نے دو بھائی کارولی کسوالاڈی اور الگزنڈر ایسے پیدا کئے جن پر وہاں کے ادبیات کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ کارولی ہر چند خصوصیت کے ساتھ اپنی روایات تمثیلی کی وجہ سے بہت مشہور ہوا، لیکن اس نے اپنی مختصر زندگی میں جو ہمیشہ خطرات سے گھری رہی — بعض ایسے عجیب و غریب فسانے بھی لکھے جن پر ہنگاری ادب جس قدر فخر کرے کم ہے۔

آج کی صحبت میں اسی کے ایک افسانہ کا ترجمہ (جسے میں نے عربی سے لیا ہے) درج کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ جب ایک ماہر افسانہ نویس کسی ایک واقعہ میں مرکزیت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے وہ کس قدر اہتمام کرتا ہے اور کس طرح ماحول کو آہستہ آہستہ سمیٹ کر اس مرکز میں جذب کر دیتا ہے جسے اس نے ہدف خیال بنایا تھا۔ مصنف نے اس قصہ کا عنوان پوشیدہ زخم رکھا تھا میں نے اُسے "قطرۂ آتشیں" سے بدل دیا ہے

نیاز فتحپوری

ایک دن طلوع آفتاب سے قبل، بہت سویرے ایک شخص ایک مشہور ڈاکٹر کے پاس آیا اس حال میں کہ وہ ابھی تک بیدار نہ ہوا تھا دروازہ پر پہونچکر اُس نے ڈاکٹر صاحب کے خادم سے التجا کی کہ "اپنے آقا کو جگا دو کیونکہ میں نہایت ہی سخت مرض لیکر آیا ہوں اور اسپر اسی وقت عمل جراحی ہونا چاہیئے"۔

جب ڈاکٹر جاگا اور اس کو ایسی شدید ضرورت کا علم ہوا تو اس نے فوراً کپڑے پہنے اور خادم کو حکم دیا کہ آنے والے کو اندر بھیجدے نووارد کے خد و خال وضع و لباس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت بلند طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس کے چہرہ کی زردی اعصاب کے ہیجان سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کو کوئی شدید تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ اس کا داہنا ہات بندھا ہوا تھا اور گلے میں ایک رومال ڈالکر اسپر اُسے سہارا دیکر لٹکا لیا تھا۔ اور باوجودیکہ وہ حد درجہ صبر و ضبط سے کام لے رہا تھا لیکن پھر بھی اس کی بے چینی کراہ کبھی کبھی نکل ہی جاتی تھی۔

ڈاکٹر نے نہایت عزت و احترام سے اس کا استقبال کیا اور بولا کہ "تشریف رکھئے اور فرمائے میں آپکی کیا خدمت انجام دے سکتا ہوں"

"ایک ہفتہ سے میرے ہاتھ میں اس قدر شدید درد ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی پلک نہیں جھپکا سکا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ درد سرطان

کی وجہ سے ہے یا کسی اور بیماری کی وجہ سے پہلے ہلکا ہلکا قابل برداشت تھا۔ لیکن اب یہ عالم ہو کہ اُسکی برداشت ممکن ہی نہیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ وہ ہر ساعت بڑھتا جاتا ہے اور اُسی کے ساتھ کرب و ایذا کا عذاب بھی مجھے ہلاک کئے ڈالتا ہے۔ اس لئے خدا کے لئے کوئی تدبیر کیجئے۔ میرا ہاتھ کاٹ ڈالئے آگ سے داغ دیجئے، بہر حال جو کچھ کرنا ہو جلد کیجئے۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اگر جان نکلی"

ڈاکٹر نے اُسے تسکین دی اور کہا کہ "یہ مرض ایسا سخت نہیں ہے اور جراحی کی ضرورت نہ ہوگی، آپ مطمئن رہیں"

—— نہیں نہیں، جراحی کی ضرورت یقیناً ہوگی اور میں آپ کے پاس اسی لئے آیا ہوں کہ آپ میرا ہاتھ کاٹ ڈالئے تاکہ اس عذاب نجات مل جائے" یہ کہتے ہوئے اُس نے رومال سے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور اُس کو اٹھا کر بولا۔ آپ کو غالباً یہ دیکھکر تعجب ہوگا کہ ہاتھ میں بظاہر کوئی زخم یا درد کا سبب موجود نہیں ہے۔ مگر میرا مرض ہی قیاس سے باہر ہے مگر اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل عجیب و غریب"

ڈاکٹر نے نہایت غور سے اس کے ہاتھ کو دیکھا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس میں کوئی علامت کسی مرض کی نہ تھی اور بائیں ہاتھ کی طرح وہ بھی بالکل صحیح تھا اس نے دریافت کیا کہ "درد کس جگہ محسوس ہوتا ہے؟"۔ اس نے اپنا ہاتھ ڈاکٹر کی طرف بڑھایا اور دونوں وریدوں کے درمیان انگلی کے اشارہ سے ایک جگہ کو متعین کیا۔ ڈاکٹر نے حد درجہ نرمی سے اس جگہ کو چھوا لیکن وہ اس کی بھی تاب نہ لا سکا اور درد کی شدت سے چیخ اُٹھا

ڈاکٹر نے کہا "سخت حیرت ہے کہ مجھے آپ کے ہاتھ میں کسی مرض کا ہونا معلوم نہیں ہوتا"

—— "لیکن میں درد سے تڑپ رہا ہوں"

ڈاکٹر نے خوردبین اُٹھا کر اس سے اس کے ہاتھ کا نہایت غور سے معائنہ کیا، تھرمامیٹر سے اُس کا درجۂ حرارت دیکھا اور پھر سر اٹھا کر بولا کہ جلد اور شرایین بہترین حالت میں ہیں۔ ورم والتہاب کا کوئی نشان نہیں ہے اور ہاتھ ہر مرض سے پاک ہے"

—— "لیکن اس حصۂ جسم میں جہاں درد ہے سرخی تو معلوم ہوتی ہے"

—— "کہاں ہے"

اس نے ایک گول چھوٹا سا دائرہ انگلی سے بتلاتے ہوئے کہا کہ "اس جگہ"

ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور سمجھ گیا کہ اس شخص کو اگر کوئی بیماری ہے تو عقل کی خرابی کی ہے اس لئے اس نے کچھ تامل کرکے جواب دیا کہ آپ کچھ دن شہر میں قیام کریں میں علاج میں اپنی پوری کوشش صرف کروںگا"

—— "میں تو ایک لمحہ کا انتظار نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے دیوانہ سمجھئے اور نشتر نکال کر اتنا حصہ گوشت کا اور جی چاہے تو ہڈی بھی نکال کر پھینک دیجئے"

—— "میں تو یہ نہیں کر سکتا"

—— "کیوں؟"

—— "اس لئے کہ آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح صحیح و سالم ہے اور اس میں جراحی کی ضرورت نہیں"

یہ سنکر اس آدمی نے اپنی جیب سے ہزار روپیہ کا نوٹ نکالا اور سامنے میز پر رکھ کر بولا کہ "آپ مجھے شاید دیوانہ سمجھتے ہیں لیکن میں کامل صحت عقل کی حالت میں ہوں آپ عمل جراحی کے لئے آمادہ ہوں تو یہ حقیر ہدیہ پیش کرنے کے لئے طیار ہوں"۔

"میں عضو صحیح میں نشتر کا استعمال نہیں کر سکتا خواہ دولت قارون ہی کیوں نہ ملے"۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ یہ میرے ضمیر اور میرے پیشہ کے آداب کے خلاف ہے"۔

"اچھا تو پھر میں ہی خود عمل جراحی کرونگا، ہرچند میرا بایاں ہاتھ اچھی طرح کام نہ دیگا۔ لیکن آپ یہ تو کرینگے کہ جب میں گوشت کا دردمند حصہ کاٹ ڈالوں تو زخم کا علاج آپ کریں"۔ یہ کہکر اُس نے فوراً اپنی آستین چڑھائی اور قبل اس کے ڈاکٹر روکے جیب سے چاقو نکال کر ہاتھ میں تیر دیا۔ ڈاکٹر نے یہ دیکھ کر کہ کہیں کوئی ورید یا شریان نہ کٹ جائے، فوراً چیخ کر کہا کہ "ٹھہر جائیے اگر آپ کو ایسا ہی اصرار ہے تو میں اس عمل کو پورا کئے دیتا ہوں"۔ یہ کہکر اس نے اپنی آستین چڑھائی اور کہا کہ اپنا منہ پھیر لیجئے اس خیال سے کہ خون بہتا ہوا دیکھ کر متاثر نہ ہو، لیکن اُس نے کہا کہ "اس کی ضرورت نہیں۔ بلکہ مجھے دیکھتے رہنا چاہئے۔ تاکہ میں صحیح جگہ آپ کو بتا سکوں"۔

ڈاکٹر نے اپنا عمل شروع کیا۔ اور وہ نہایت اطمینان سے بغیر کسی خوف و ہراس، یا لرزہ و ارتعاش کے اُس کو برداشت کرتا رہا جب ڈاکٹر گوشت کا اچھا حصہ کاٹ چکا تو مریض نے نہایت اطمینان کی سانس لی۔ ڈاکٹر نے دریافت کیا "اب تو کوئی درد محسوس نہیں ہوتا؟"

اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ "نہیں" لیکن ذرا سی ٹیس زخم کی ہے، اب تو خون کو آزادی کے ساتھ بہہ جانے دیجئے تاکہ پھر کوئی خلش باقی نہ رہے۔

ڈاکٹر نے زخم پر پٹی باندھی اور مریض نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے ہوٹل کا پتہ بتا کر واپس گیا۔ ڈاکٹر روز وہاں جاتا اور پٹی بدل کر چلا آتا۔ چند دن میں زخم بالکل اچھا ہو گیا اور وہ اپنے وطن چلا گیا۔

(۲)

گزشتہ واقعہ کو تین ہفتہ کا زمانہ گزرا ہوگا کہ وہی شخص پھر واپس آیا اس حال میں کہ اس کا ہاتھ پھر رومال میں لٹکا ہوا تھا اور اسی مقام پر کرب و الم کی وہی شکایت اس کی زبان پر تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور سر دلپسینہ اس کی پیشانی پر ٹپک رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھکر اُسنے اپنا ہاتھ ڈاکٹر کے سامنے بڑھایا اور بولا کہ معلوم ہوتا ہے آپ نے کافی گہرائی تک جا تو پہونچا کر جراحی نہیں کی اور اسی لئے درد پھر عود کر آیا اور اسی شدت کے ساتھ۔ مہربانی کر کے پھر عمل جراحی کیجئے۔ لیکن مکمل طور پر"۔

ڈاکٹر نے اس جگہ کو دیکھا جہاں اس کے پہلے عمل جراحی کیا تھا۔۔۔۔۔ پھر کوئی علامت موجود نہ تھی، نئی جلد پیدا ہو کر تمام وریدیں اپنا اپنا کام کر رہی تھیں نبض بھی اعتدال کے ساتھ چل رہی تھی۔ تپ کی بھی کوئی علامت نہ تھی، لیکن وہ شخص درد کی وجہ سے کانپا جا رہا تھا

ڈاکٹر نے مجبوراً پھر شگاف دیا اور پھر اس کا درد دور ہوگیا۔ لیکن جب وہ جانے لگا تو ایک حزن وملال کے ساتھ بولا کہ تعجب نہ کرنا اگر میں پھر ایک مہینے کے بعد واپس آؤں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ "آپ یہ خیال دل سے نکال ڈالئے، اللہ نے چاہا تو اب مرض کا اعادہ نہ ہوگا" اُس نے کہا کہ مجھے تو اس کا ایسا ہی یقین ہے جیسے خدا کے وجود کا، لیکن خیر دیکھا جائیگا"

جب وہ ... چلا گیا تو ڈاکٹر نے اس واقعہ کا ذکر اپنے اور ہم پیشہ احباب سے بھی کیا، لیکن کوئی تشخیص نہ کرسکا۔

(۳)

ایک مہینہ گزر گیا اور وہ شخص واپس نہ آیا۔ اس کے بعد بھی کئی ہفتے گزر گئے یہاں تک کہ ڈاکٹر اس واقعہ کو بھول گیا ایک دن اتفاق سے اُسکا ایک خط ملا جس کا مضمون یہ تھا:-

میرے عزیز دوست۔

میں آپ کو زیادہ عرصہ تک حیرت میں مبتلا رکھنا مناسب نہیں سمجھتا؛ نہ اس راز کو اپنے ساتھ قبر میں لیجانا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ درد نے پھر تیسری مرتبہ عود کیا اور میں نے نہایت تیز دہکتا ہوا انگارہ رکھدیا۔ اب میں اس قابل ہوا ہوں کہ ہاتھ کو حرکت دے سکوں اور یہ خط آپ کو لکھتا ہوں

کچھ زمانہ ہوا کہ میں اپنے کو بڑا خوش نصیب سمجھتا تھا اور تھا بھی ایسا ہی کیونکہ نشاط زندگی کے لئے جتنے اسباب کی ضرورت ہے وہ سب مہیا تھے۔ میں نے ایک ایسی خاتون سے شادی کی جو حسن وجمال اور سلیقہ وتہذیب کے لحاظ سے عدیم المثال تھی۔ یہاں مجھے بتا دینا چاہئے کہ شادی سے قبل میری بیوی کی دوست ایک اور خاتون بھی تھی جو نہایت ذی عزت اور دولتمند تھی۔

شادی کے بعد چھ مہینے جس لطف ومسرت سے بسر ہوئے اس کا بیان محال ہے، ہر نیا دن گویا محبت وخلوص کا ایک نیا دروازہ تھا اور زندگی کا ہر لمحہ ولولہ وشوق کی پر لطف داستاں۔ جب میں کسی ضرورت سے شہر جاتا تو واپسی کے وقت وہ دور تک پیدل چلکر میرا خیر مقدم کرتی اور یہ معلوم ہوتا کہ وہ میری روح کے ساتھ جی رہی ہے۔

اسی لطف ومسرت کی زندگی میں دفعتہً یہ خطرہ میرے دل میں پیدا ہوا اور خدا جانے کیوں، کہ اس کی تمام باتیں تکلف وتصنع ہیں۔ میری بیوی کے پاس ایک سینے پرونے کی میز تھی اور اس میز میں ایک خانہ تھا جس کو وہ ہمیشہ مقفل رکھتی۔ نہایت احتیاط سے اس کو بند کرتی اور کنجی اپنے پاس رکھ لیتی۔ اس بات سے میرے دل میں شکوک پیدا ہوئے اور رفتہ رفتہ ان میں اس قدر استحکام پیدا ہوگیا کہ مجھے اس کی تمام محبت جھوٹی اور جملہ عنایتیں مکر وفریب نظر آنے لگیں، میں بیتاب تھا کہ کسی طرح اس خانہ کو کھول کر دیکھوں کہ اس کے اندر کیا ہے جس کی وہ اس قدر اہتمام کے ساتھ حفاظت کرتی ہے۔

ایک دن وہی خاتون جو میری بیوی کی دوست تھی آئی اور میری بیوی کو اپنے ساتھ لے گئی، مجھ سے بھی اصرار کیا لیکن میں نے کہا کہ بعد کو پھر آ ونگا اُن کے جانے کے بعد میں فوراً میز کے قریب گیا اور کسی نہ کسی طرح اس خانہ کو کھولا جو مقفل رہتا تھا۔ اس کے اندر منجملہ اور اشیاء کے ایک بنڈل نقشئی رنگ کے ڈورے سے بندھا ہوا ملا۔ میرا دل دیکھتے ہی دھڑکا تھا، لیکن جب میں نے اُسے کھولا تو میرا شک یقین

سے بدل گیا کیونکہ عشقیہ خطوط کا بنڈل تھا۔ میں نے ایک ایک کر کے انھیں پڑھا اور اب میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کیا لکھا تھا اور کس طرح انھیں پڑھ رہا تھا، یہ میرے ایک دوست کے خطوط تھے اور اس زمانہ کے تھے جب میری شادی ہو چکی تھی۔ میں نے پھر خانہ کے اندر ان کو رکھا اور قفل لگا دیا۔

جب شام کو میری بیوی واپس آئی تو حسب عادت اسی شوق و ولولہ کے ساتھ ملی جو روز اس سے ظاہر ہوتے تھے میں نے ضبط سے کام لیا اور اسپر اپنے تاثر کو بالکل ظاہر نہ ہونے دیا۔ ہم دونوں نے ساتھ کھانا کھایا، کھانے کے بعد کچھ وقت حسب معمول باتوں میں صرف کیا اور پھر اپنے اپنے کمرہ میں آرام کی غرض سے چلے گئے میں اس وقت بالکل دیوانہ تھا، دماغ کی یہ حالت تھی جیسے کوئی سیسہ پگھلا کر اندر ڈال رہا ہے۔ جب آدھی رات ہوئی تو میں اُٹھا اور دبے قدموں اس کی مسہری تک پہونچا۔ وہ غافل سو رہی تھی اور اس کے چہرہ سے پورا اطمینان و سکون ظاہر تھا۔ اُس کے چہرہ کے اس سکون کو دیکھ کر میری دیوانگی میں اور اضافہ ہوا اور میں نے اپنا داہنا ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑ لی۔ یہ میری گرفت ایسی آہنی گرفت تھی کہ ایک مرتبہ آنکھ کھول کر مجھے دیکھ تو لیا لیکن اُسنے نہ کوئی آواز نکالی نہ ہاتھ پاؤں مارے، معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت سکون کے ساتھ اس موت کو برداشت کر رہی ہے، تھوڑی دیر میں اُس کا دم نکل گیا۔ اور کوئی علامت ایسی ظاہر نہ ہو سکی جس سے کسی کو قتل کا شبہہ ہو سکتا، البتہ جب گلا دبانے سے اس کا منہ زیادہ کھلا تو اس سے خون کا ایک قطرہ نکل کر میرے داہنے ہاتھ کے اُس حصہ پر پڑ گیا جس سے آپ خوب واقف ہیں۔ لیکن اس کا علم بھی مجھے صبح کو ہوا۔

دوسرے دن جب اسے دفن کر کے میں گھر واپس آیا تو وہی خاتون (جو میری بیوی کی دوست تھی) گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی اور کلمات تعزیت استعمال کرنے کے بعد بولی کہ "میں اس وقت ایک خاص غرض سے آئی ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ میری مدد کریں گے"۔ میں نے کہا کہ فرمائیے اُس نے جواب دیا کہ "آپ کی بیوی کے پاس میرے کچھ خطوط امانتاً جمع تھے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کیا آپ مجھے واپس دیں گے"۔ میں نہیں بیان کر سکتا کہ یہ سنکر میرا کیا حال ہوا، اگر وہ خاتون سامنے نہ ہوتی تو شاید میں چاقو سے اپنے دل کو نکال کر پھینک دیتا، دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان دیدیتا۔ بہر حال میں نے صد درجہ صبر و ضبط سے کام لیا اور خطوط کا وہ بنڈل نکال کر میں نے خاتون کے حوالہ کیا۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد ٹھیک اُسی جگہ جہاں قطرۂ خون گرا تھا جلن محسوس ہوئی اور اس میں رفتہ رفتہ وہ شدت پیدا ہوئی جس کا علم آپ کو بھی ہے۔ بہر حال چونکہ وہ میرے جرم کی سزا ہے اس لئے میں اُسے برداشت کرونگا اور اس کا مداوا نہ چاہوں گا۔ علاوہ اس کے اب یوں بھی کوئی ضرورت اس کے دفع کرنے کی نہ ہوگی۔ کیونکہ میں بہت جلد اس کے پاس پہونچنے والا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ میرے اس قصور کو معاف کر دے اور ہم دونوں پھر اسی کھوئی ہوئی محبت کی فضا میں روحانی زندگی بسر کر سکیں"۔

نیاز فتحپوری

ملکۂ نرگس بیگم

نظر غور سے اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بہت کچھ فایدہ بخش نتایج نکل سکتے ہیں، فی الحقیقت تذکرۂ رفتگاں ہمارے لئے مرقع عبرت ہے نہ صرف بعض اوقات حیرت و خوشی، اور درد و بیتابی کی ایک مجموعی کیفیت دل پر طاری ہوتی ہے۔ بلکہ یہی اوراق تاریخ نوع انسانی کی بداقبالیوں اور خوش حالیوں، اور امم ماضیہ کے انقلاب آمیز واقعات ہمارے پیش نظر کر دیتے ہیں، اور ہم درس عبرت کا مطالعہ کرتے ہوئے اصول "خذ ما صفا و دع ما کدر" کو پیش نظر رکھکر تجربے حاصل کر سکتے ہیں ؎

ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے
دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے

موسیو گستاؤلیبان مصنف تمدن ہند لکھتا ہے "مصنفین اسلام کا ہمیں بہت مشکور ہونا چاہیے کہ اس زمانہ کی تاریخ اسقدر صاف اور واضح ہے جسقدر اس کے ماقبل ازمنہ کی تاریخ تیرہ و تاریک ہے"

یہ ہمارے لئے باعث افتخار ہے کہ ہمارے اسلاف نے واقعات کو کتب تواریخ میں مدون کرکے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا تاکہ آیندہ نسلیں بہ غور مطالعہ کریں اور اصلاح عمل کے ساتھ آفتاب تاریخ کی ہدایت کرنے والی نورانی شعاعوں سے استفادہ...... کریں نہ صرف ہم کو اس سے کاروبار، معاشرت، اور دنیوی معاملات میں مدد ملتی ہے بلکہ دیانت و صداقت، نیک کرداری و حسن تدبیر، شجاعت و دلیری، خلوص و راست بازی کے متحیر کرنے والے واقعات ہماری قوت تخیل میں تحریک پیدا کرکے ہمکو عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں؛

فن تاریخ بصیرت انسانی کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور اسکا مطالعہ خیالات میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور جذبات میں تلاطم، انسان کی تخلیق کی غایت یہ ہے کہ وہ دنیا میں پیدا ہو تو ایسے کام کرے جن کی وجہ سے اس کا نام اس کے بعد بھی زندہ رہے اور مشیت ایزدی کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ انسان اس جوہر سے جو خدائے پاک نے اس کی ہستی میں ودیعت کیا ہے کام لے اور نشو و نما کے ساتھ ساتھ محیر العقول کارنامے چھوڑ جائے۔ جب ہم اپنے اسلاف کی زندگی کے حالات پر بالاستیعاب نگاہ تنقید ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں سے بعض ایسے گزر چکے ہیں جن کو لوگ قیامت تک یاد کریں گے، اور جن کی برکات یادگاری سوانح ہزاروں برس تک دلوں میں احساس پیدا کرتی رہینگی۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں میں تعلیم اس درجہ عام تھی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ پیشے والے بھی اس سے محروم نہ رہتے تھے، لیکن تغیر زمانہ کے ساتھ اب مسلمان علم سے اس قدر ناآشنا ہیں، گو آج کل تعلیم یافتہ خواتین بہت کم نظر آتی ہیں اور تعلیم نسواں کا خیال ایک خواب سا ہے تاہم ازمنہ گزشتہ کی تاریخ اور اس زمانہ کی تصنیفات ہم کو یہ بات بتلاتی ہیں کہ اس زمانہ میں مسلمان عورتوں کی تعلیم ضروری خیال کی جاتی تھی۔ اور تمام بڑے بڑے گھرانوں میں اُسکا بخوبی چرچا تھا، خاندانی شرافت کیساتھ یہ جوہر لازمی ہوگیا تھا اور انہیں خواتین نے

ایسے محیر العقول کارنامے چھوڑے ہیں جو ہمارے لئے مواعظ و عبرت کے زریں درس ہیں، شہنشاہ بابر کی بیٹی "شہزادی گلبدن بیگم" نہ صرف تعلیم یافتہ تھی بلکہ اس نے ایک ایسی کارآمد کتاب "ہمایوں نامہ" تصنیف کی جو تاریخی حیثیت سے آج بھی مستند سمجھی جاتی ہے جہانگیر کی رحلت کے وقت اس کی عزیز بیوی ملکہ نورجہاں بیگم نے جو نظم کی سچ تو یہ ہے کہ قابل عورتوں کی لیاقت کا بہترین نمونہ ہے۔ شہزادی زیب النساء کی نکتہ سنجی اور شاعرانہ طبیعت ضرب المثل ہے جو محتاج بیان نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں دیکھتے ہیں جو اس امر کی بخوبی وضاحت کرتی ہیں کہ عورتوں نے انتظام امور مملکت میں بہت حصہ لیا اور اپنے عزیز شوہر کے دوش بدوش امور سلطنت کی انجام دہی میں منہمک رہیں،

آج ہم سرزمین دکن کی عفت مآب، مدبر اور دور اندیش شہزادی نرگس بیگم کے حالات زندگی کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر پبلک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، یہ وہ ملکہ ہے جس کی سوانح دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبقہ اناث میں بھی بعض بعض بیگمات دلیری، عزم ثبات، جہانبانی، اصابت رائے، اور تدبر میں مردوں سے کم نہیں رہی ہیں؛

ہمایوں شاہ بہمنی سلاطین بہمنیہ میں نہایت ہی تند مزاج، سفاک اور ظالم و جابر بادشاہ گزرا ہے تخت نشینی سے وفات تک یہ بادشاہ قتل و خونریزی میں مصروف رہا، جس کی وجہ سے تواریخ میں اس کے نام کے ساتھ ظالم کا لفظ لکھا جاتا ہے، رعایائے مملکت اور ارکین دولت اس کی حکومت سے بیزار تھے۔ جا بجا فتنہ و فساد کی آگ مشتعل تھی، امرا سرکشی پر آمادہ تھے رعایا اس کے ظلم و ستم سے تنگ آکر درگاہ رب العزت میں دست بدعا تھی کہ جلد اس ظالم و جابر کا خاتمہ ہو جائے اور اس کے پنجۂ ظلم سے نجات ملے،

ملکہ مخدومہ جہاں نرگس بیگم اسی بادشاہ کی بیوی تھی جو آج تک ظالم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے لیکن ایسے نانا کی نواسی تھی جس کا ثانی خاندان بہمنیہ میں نہیں گزرا یعنی فیروز شاہ بہمنی جو شوکت و عظمت میں اور شاہان بہمنیہ پر امتیاز تمام رکھتا ہے، ایسے پرآشوب زمانہ میں جب کہ تمام سلطنت میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ارکان سلطنت خود سر تھے، اور رعایا بد دل تھی، ہمایوں شاہ نے ۸۶۵ھ میں انتقال کیا، اور عنان حکومت نرگس بیگم کے ہاتھ میں آئی گو ایسے پرخطر زمانہ میں جب کہ قواعد و ضوابط شمسی کا دیباچہ الٹ چکا تھا صنف لطیف کی ایک نازک ہستی کا ایک کمسن بچہ کے لئے انتظام مملکت کو اپنے ہاتھ میں لینا یقینی بادی النظر میں حیرت ناک اور تعجب خیز نظر آئے گا، لیکن ملکہ نے جو علاوہ عظمت خاندانی اور لیاقت ذاتی کے عقل و تدبر، شجاعت و ہمت، سخاوت و فیاضی، قدردانی اور کمال پروری کے جواہرات سے مزین تھی تمام ملکی معاملات میں حصہ لیا اور اپنی دور اندیشی و حسن تدبر سے بتدریج تمام بغاوتوں کا خاتمہ، بدعنوانیوں کا انسداد اور فتنہ و فساد کی آگ کو فرو کر دیا۔ ملک میں امن و عافیت قائم ہوئی اور رعایا خوشحال ہو گئی،

جب ہمایوں شاہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے شہزادہ نظام شاہ ہشت سالہ کو ولیعہد مقرر کیا اور خواجہ جہاں ترک کو وکیل السلطنت اور خواجہ محمود گاواں ملک التجار کو وزیر قرار دیکر وصیت کی کہ ملکہ مخدومہ جہاں مع اتفاق وزرا۔ ریاست کا انتظام کرے، چند ہی دن کے بعد ہمایوں شاہ کا انتقال ہو گیا اور حسب دستور سلاطین بہمنیہ فاتحہ سوم کے بعد دربار عام منعقد ہوا اور قاعدہ کے سادات عظام سے دو شخص میر محب اللہ اور سید شریف نے تیمناً و تبرکاً دائیں و بائیں جانب سے نظام شاہ کو سہارا دیکر تخت فیروزہ پر بٹھایا

نرگس بیگم نہایت عاقل و زیرک تھی، علم و فضل کے زیور سے بھی آراستہ تھی، ملک کے انتظام و اہتمام کا ملکہ بھی رکھتی تھی، حسب وصیت معاملات ملکی و مالی سے مزید واقفیت حاصل کرکے خواجہ جہاں ترک اور خواجہ محمود گاواں جیسے تجربہ کار و کار آزمودہ مشیروں کو وزارت اور وکالت کے عہدوں پر مامور کیا۔ حسن اتفاق سے یہ دو ایسے عدیم النظیر کارپرداز مل گئے جو بہی خواہ سلطنت تھے اور جنھوں نے اپنی شجاعت و ہمت تدبر و پختہ کاری سے سلطنت کی بقا میں بہت سعی و کوشش کی ملکہ کو ان پر بیحد اعتماد تھا تمام امور و مہمات شاہی ان دونوں کی صلاح و مشورہ سے انجام پاتے تھے، ہر روز علی الصباح یہ دونوں باتفاق دربار میں آتے تھے اور عرض اخلاص بجا لاکر ایک عورت ماہ بانو کے ذریعہ تمام امور کے متعلق احکام حاصل کرتے تھے، جو کچھ ملکہ کے احکام صادر ہوتے تھے بلکم و بیش ان کی تعمیل کرتے تھے، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تینوں کے حسن اہتمام سے کاروبار سلطنت بوجہ احسن انجام پائے اور سلطنت کو استقلال حاصل ہوا

جب گرد و نواح کے سلاطین نے سنا کہ تخت بہمنیہ پر ایک خورد سال بچہ بیٹھا ہے، اور عنان حکومت ایک عورت کے ہاتھ میں ہے تو انھوں نے اپنی دیرینہ خواہش کو پورا کرنے اور سلطنت بہمنیہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے اس کو زرین موقعہ خیال کیا، اور ایک دم ہر طرف سے اسپر حریص جانور کی طرح ٹوٹ پڑے، اس کی تباہی کے لئے شاطرانہ چالوں اور سیاسی حربوں سے کام لیا، تاریخ شاہد ہے کہ سلطنت بہمنیہ کے لئے یہ نہایت نازک وقت تھا، فی الواقعی اگر مخدومہ جہاں کا تدبر اور خواجہ جہاں و خواجہ محمود گاواں کی بہادرانہ و سرفروشانہ کارگذاریاں نظام شاہ کے شامل حال نہ ہوتیں تو دکن کی یہ عظیم الشان سلطنت ہمسایہ طاقتور حکومتوں کا شکار ہوگئی ہوتی،

ایک کمسن بچہ کے تخت نشین ہونے سے سب سے پہلے تحریص و ترغیب اڑلیسہ اور اودیسہ کے راجاؤں کو ہوئی اور اس موقعہ کو غنیمت جانکر متفقہ طور پر حملہ آور ہوئے، لیکن مخدومہ جہاں پریشان ہونے والی یا ہمت ہارنے والی عورت نہ تھی۔ اس نے نہایت استقلال کیساتھ انکی مدافعت کے لئے تیاری کی، اور چالیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ ان کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئی اور اس عمدگی کیساتھ فوج کی سپہ سالاری کی کہ دشمن کو شکست فاش دیکر مظفر و منصور واپس آئی،

ابھی اس مصیبت سے نجات حاصل نہ ہوئی تھی کہ سلطان محمود خلجی والی مالوہ بھی ایک جرار فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا، ادھر سے بھی مقابلہ کے لئے فوج روانہ کی گئی، قندھار کے پاس معرکہ کارزار پڑا، اس زور و شور کے ساتھ لڑائی ہوئی کہ نعروں کے گونج سے زمین دہل پڑ گئی، دوست اور دشمن میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا، مگر کسی نے بھی قدم پیچھے ہٹانے کا نام نہ لیا، دونوں طرف کے نبرد آزماؤں نے اپنی بہادری کے خوب خوب جوہر دکھائے، ایک وقت تو ایسا آیا کہ بہمنیہ فوج کامیاب نظر آنے لگی، خلجیوں کی فوج میں ہراسانی و پریشانی نے اپنا تسلط جما لیا تھا، محمود خود میدان جنگ سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ لیکن مصاحبین نے اس کو اس حرکت سے روکا، اور استقلال و ہمت سے کام لینے کا مشورہ دیا پھر کیا تھا آن کی آن میں قسمت کا پانسہ پلٹا، یا تو فتح ہو رہی تھی، یا اب جان کے لالے پڑ گئے، خود نظام شاہ بھی دشمنوں کی زد پر تھا سکندر خاں نے حق نمک ادا کیا۔ نہایت دلیری کے ساتھ میدان جنگ سے اپنے آقا کو بچا لایا، آخرکار اس لڑائی میں محمود خلجی کو فتح حاصل ہوئی، اس کامیابی نے حرص و آز میں اور اضافہ کردیا، برار اور بیڑ پر قابض ہوکر اپنے پاؤں پھیلائے، بیدر کی طرف رخ کیا سلطنت کو بالکل تباہ کرنے کی دل میں ٹھان لی، لیکن ملکہ مخدومہ جہاں اس کی ان جارحانہ کارروائیوں سے غافل نہ تھی وہ اندر ہی اندر

اس کے مقابلہ کی تدبیریں سوچ رہی تھی، آخرکار اس نے طے کیا کہ باہر سے امداد حاصل کیجائے چنانچہ اُس نے فوجی امداد کے لئے محمود شاہ گجراتی کو خط لکھنے کے لئے محمود گاواں کو ہدایت کی، محمود شاہ اسی ہزار سوار لیکر مدد کے لئے روانہ ہوا، گجراتی اور دکھنی فوج نے بالآخر محمود خلجی کو کامل شکست دی وہ بحالت تباہ، تمام ساز و سامان اور اسباب شاہی چھوڑ جان بچاکر بھاگ گیا،

شاہان بہمنیہ کا یہ دستور تھا کہ پہلی بیوی کو ملکہ مخدومہ جہاں کا خطاب دیا کرتے تھے اور یہی ملکہ سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے عموماً اس بات کی پابندی کی جاتی تھی کہ پہلی بیوی خاندان شاہی سے ہو، رواج کے مطابق ملکہ نرگس بیگم نے بھی نظام شاہ کی شادی اپنے ہی خاندان کی ایک شہزادی سے کی اور جشن شاہانہ ترتیب دیا اسی شب کو جب کہ مجلس زفاف آراستہ ہوئی، بزم عیش و عشرت کی ترتیب پانے سے ایک دنیا شادی و خرمی میں مشغول ہوئی۔ خدا جانے کیا بلائے ناگہانی نازل ہوئی کہ آدھی رات کے بعد محل شاہی میں نالہ و زاری سے شور بپا ہوا اور یہ خبر وحشت ناک سننے میں آئی کہ نظام شاہ نے اس جہاں سے رحلت کی "۸۶۷ھ" نوحہ و ماتم سے قیامت کا نقشہ کھینچ گیا عشرتکدہ ماتم کدہ بنگیا، اگرچہ مخدومہ جہاں کا دل کثرت رنج و غم سے پارہ پارہ ہو رہا تھا لیکن اس نے نہایت استقلال سے کام لیا۔ آہ ایسی شفیق ماں کو کس قدر رنج ہوا ہوگا، جس نے اس کمسن بچہ کو اپنی آغوش محبت میں چھپائے، صبر و استقلال سے اس کی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے سلطنت کے امور نہایت عمدگی سے انجام دے جبکہ افق سلطنت بہمنیہ پر مخالفت و دشمنی کے بادل چھائے ہوئے تھے اور شوہر کے ظالمانہ طرز عمل سے رعایا نالاں اور امرا بددل تھے ملکہ نے جس جگر گوشہ کے لئے ان تمام کانٹوں کو دور کیا، اور راہ کو ہموار کیا، فتنہ و فساد کی وجہ سے جو خرابیاں پڑ گئیں تھیں ان کو رفع کیا، وہی نور نظر عالم جوانی میں اور عین شب عروسی میں داغ مفارقت دے گیا! یہ سب کچھ تھا مگر اس دلیر اور باہمت خاتون نے مستقل مزاجی سے کام لیا، اور دامن صبر و شکیب کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ بلکہ سب سے پہلے اسکی تجہیز و تکفین کی فکر کی۔ پھر جب دستور فاتحہ سیوم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دوسرے کمسن فرزند محمد شاہ کو تخت نشین کیا،

ملکہ نے محمد شاہ کی تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ کی، وہ خود تعلیم یافتہ تھی پھر کیسے ممکن تھا کہ تاج و تخت کے مالک کی تعلیم و تربیت میں غفلت و لاپروائی کرتی ۔ اس نے ایک فاضل ہستی کو اس عہدہ کے لئے منتخب کیا یعنی شوستری جیسے عالم کو اس کا اتالیق مقرر کیا شوستری نے بادشاہ کو بہترین طریقہ پر تعلیم دی۔ خود شاہزادہ نہایت ذکی و ذہین تھا پھر مخدومہ جہاں کی نگرانی اور شوستری کی تربیت نے سونے میں سہاگے کا کام کیا، یہ بادشاہ ایسا لائق و عالم نکلا کہ خاندان بہمنیہ میں فیروز شاہ کے بعد اس سے بہتر اور کوئی نہیں گزرا۔

ملکہ مخدومہ جہاں کے زمانہ میں ایک ایسا اہم واقعہ گزرا ہے جس کا یہاں تذکرہ نہ کرنا اظہار حق سے گریز کرنا ہے، اسی واقعہ کو بعض تاریخ نویسوں نے نہایت آب و تاب کے ساتھ ظاہر کرکے سختی کے ساتھ ملکہ کی طرز عمل پر نکتہ چینی کی ہے۔ اور اس کو محسن کش و احسان فراموش قرار دیا ہے لیکن اگر اطمینان کے ساتھ سیاسی پہلو پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ واقعات و حالات کا لحاظ کرتے ہوئے مجبوراً ملکہ کو اس طرح کرنا پڑا، وہ الزام جو ملکہ پر عاید کیا جاتا ہے یہ کہ وہ خواجہ جہاں ترک کے قتل کا باعث ہوئی، اور ایک وفادار اور جانثار سلطنت کی خدمت کا عوض اس طرح دیا۔ اب ہم اس بات کی کوشش کریں گے کہ واقعات کا اظہار کرتے ہوئے یہ بات ثابت ہو جائے

کہ اس طرح کا سلوک کرنے میں ملکہ حق بجانب تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ جہاں نے گرتی ہوئی عمارت کو تھام لیا، سلطنت کے استحکام میں کوشش کی اور ابتدا میں اچھا بندوبست کیا مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد اس سے بے اعتدالیاں اور حماقتیں سرزد ہونے لگیں، خود کو سلطنت کا مختار کل سمجھکر حکومت جتانے لگا یہانتک کہ کسی کو خیال میں نہ لاتا تھا نہ عاقبت اندیشی سے محل والوں کی تنخواہیں روکدیں، اور امرا قدیم کی جاگیریں چھین کر اپنے آوردوں کو دینا شروع کیا اور بعض اپنے طرفداروں کو بڑے بڑے عہدے بھی دئے چونکہ بہت سی مہمات میں شریک ہوکر، دلیری اور بہادری دکھاکر خاص افتخار حاصل کرچکا تھا اس واسطے اپنی قوت واقتدار پر بہت زیادہ گھمنڈ ہوگیا، نشۂ غرور سے سرشار ہوکر دست تغلب وتصرف شاہی خزانوں پر دراز کیا، ملک التجار محمود گاواں کو مد مقابل سمجھکر ہمیشہ اس کو سرحدی خدمتوں پر بھیجا کرتا تھا تاکہ وہ مرکز حکومت سے دور رہے اور اس کو اپنی خواہشات کے پورا کرنے کا موقعہ ملے۔

ملکہ مخدومہ جہاں، محمود خلجی کے واقعہ کے زمانہ ہی سے بدظن ہوگئی تھی۔ اس واسطے کہ اس نے سکندر خاں کو اس جرم میں کہ وہ نظام شاہ کو معرکہ کارزار سے نکال لایا تھا۔ قید کردیا۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ خواجہ جہاں کا یہ خیال تھا کہ بادشاہ کے میدان جنگ سے ہٹتے ہی سپاہیوں میں بددلی پھیل گئی جس کی وجہ سے شکست ہوئی، ایک لحاظ سے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے اس واسطے کہ مشرق میں بادشاہ ظل اللہ سمجھا جاتا ہے اور مشرق بادشاہ پرستی کے لئے مشہور ہے، جب تک وہ نظروں کے سامنے ہے اہل مشرق کو بیحد تقویت حاصل ہوتی ہے بہرحال خواجہ جہاں کی نیت کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کی طرز عمل سے ملکہ مشکوک ہوچکی تھی۔

ایشیائی درباروں میں یہ بات اکثر مشاہدہ میں آتی ہے کہ جو امیر بادشاہ کے جلوس سلطنت میں سعی بلیغ کرکے فروغ پاتا ہے اسکی خواہش طبعی یہ ہوتی ہے کہ جملہ مقدمات جزئی وکلی میں بادشاہ پر تسلط واقتدار حاصل ہو لیکن فطرت انسانی سے مجبور سلاطین بھی ایسے امیر کی خواہش بیجا کو ناپسند اور تسلط کو گوارہ نہیں کرتے، جسکا نتیجہ خانہ جنگی اور ان میں سے کسی ایک کا استیصال ہوتا ہے۔

دور اندیش وذی عقل ملکہ نے جب یہ دیکھا کہ خواجہ جہاں روز بروز اپنی قوت بڑھا رہا ہے تو وہ اس کے اوضاع واطوار سے بیحد فکرمند ہوئی اور اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں موقعہ پاکر نمک حرامی نہ کرے، اس لئے اس اولوالعزم ملکہ نے سمجھ لیا کہ خواجہ کا وجود سلطنت بہمنیہ کے حق میں مضر ہے اور جلد اس کا انسداد ہونا چاہئے اس کی مفسدی وکورنگی کو محمد شاہ کے ذہن نشین کراکے اس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ جلد خواجہ کو تیغ بیدریغ کرکے سلطنت کو اس کے شر سے محفوظ رکھے ۸۶۶ھ کا واقعہ ہے کہ ایک دن حسب معمول خواجہ دربار میں آیا مگر خلاف عادت نظام الملک کو سپاہیوں کی ایک جماعت کے ساتھ دیکھکر متعجب ومتفکر ہوا لیکن دربار سے بغیر کورنش کئے نکلنا مشکل تھا۔ بہ امر مجبوری ولاچاری معمولی امور میں مشغول ہوا، اسی اثنا میں دو ضعیف عورتیں محلسرا سے برآمد ہوئیں اور سلطان سے عرض پرداز ہوئیں کہ جو کام قرار دیا گیا ہے وہ جلد طے پائے، یہ سنتے ہی سلطان نے نظام الملک کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ فوراً قتل کردو۔ نظام الملک جو اس کا دشمن تھا بادشاہ کے حکم ہی کا منتظر تھا بے تامل اس کا ہاتھ پکڑکر دربار سے باہر لے گیا اور تلوار کو میان سے نکال کر اپنے ہی ہاتھ سے کام تمام کردیا، ایک ایسے شخص کا قتل کرنا جس نے سلطنت میں اپنا رعب اور خاص اقتدار قائم کرلیا ہو

کوئی آسان کام نہ تھا مگر ملکہ نے حسن تدبیر اور دانائی سے اس معاملہ کو اس عمدگی سے انجام دیا کہ کوئی فتنہ و فساد برپا نہ ہوا۔

چو تدبیر زاں پس خردمند زن　　بہ فرمان خود ساخت ملک دکن

جہانے ز عدلش بہ آسودگی　　..................

شخصی حکومتوں میں یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس طرح بعض امراجب زیادہ مقتدر ہو جاتے تھے تو ان کا وجود سلطنت کی بقا اور بادشاہ کی سلامتی کے لئے مضر ہو جاتا تھا، عام طور پر شخصی سلطنتوں کے اختیارات اور ان کی مجبوریوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ سیاست ملکی اس قسم کے سلوک کی متقاضی ہوتی ہے اسواسطے کہ ہر ایک سلطنت میں شخصی ہو یا جمہوری یہ نہایت مشکل ہے کہ ایک شخص نیک نام ہو کر زندگی بسر کرے، کچھ لوگ اس کے زیادہ بارسوخ ہونیکی وجہ سے اس کے مخالف اور دشمن ہو جاتے ہیں اور پھر بادشاہ کا غیظ و غضب اس کے روز افزوں اقتدار کو دیکھکر ترقی کر جاتا ہے، اسیطرح کی ایک مثال جعفر برمکی کی ہے۔ خاندان برمکی سے جو فائدہ خاندان بنو عباس کو ہوا وہ محتاج بیان نہیں، تاہم انتظام مملکت اور سیاست ملکی کی خاطر ہارون رشید نے وہ کام کیا جو اس کے شایان شان نہ تھا اور جو مستحق نہیں سمجھا جا سکتا یعنی قتل برمکی جس کی وجہ سے وہ محسن کش اور احسان فراموش مشہور ہوا۔ یہاں امام المورخین علامہ ابن خلدون کی رائے کا درج کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔

"برامکہ پورے طور پر دولت عباسیہ پر قابض ہو گئے تھے، یہاں تک کہ وقت ضرورت ہارون الرشید کو تھوڑا سا روپیہ بھی خزانہ سے نہیں مل سکتا تھا۔ برامکہ کا قدم، استقلال و استحکام کیساتھ سلطنت میں جم گیا تھا۔ اور وہ حکومت پر غالب تھے رشید کو سلطنت میں دخل تصرف کا کچھ بھی اختیار باقی نہ تھا اور تمام دنیا میں آہستہ آہستہ ان کی شہرت پھیل گئی تھی اور سلطنت کے تمام اعلیٰ درجہ کے منصب انھوں نے حاصل کر لئے تھے۔"

ان مذکورۂ بالا واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ہم خواجہ جہاں کے طرز عمل پر نظر ڈالیں تو ہمکو ان دونوں میں تطابق عظیم نظر آتا ہے۔ لہذا ان پر غور کرتے ہوئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی طرح بھی ملکہ نرگس بیگم کا طرز عمل قابل اعتراض نہیں، ورنہ اس کی وجہ سے اس کے حالات زندگی میں کوئی تاریک پہلو پایا جاتا ہے،

ملکۂ مخدومہ جہاں، محمد شاہ کے ایام بلوغ تک نیابتاً انتظام کرتی رہی، جب اُس نے عالم شباب میں قدم رکھا تو ملکہ کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہوئی بہت جلد ملکہ اس فرض سے سبکدوش ہو گئی، خاندان شاہی کی ایک حسین، زہرہ جبین شہزادی کیساتھ نہایت تزک و احتشام سے شادی کا اہتمام کیا، اور تمام مہمات سلطنت کا انتظام فرزند دلبند کے سپرد کر کے گوشہ نشینی اختیار کی اور بقیہ عمر صوم و صلوٰۃ اور تلاوت قرآن مجید فرقان حمید میں صرف کی،

گو محمد شاہ کلیتہً بادشاہ تسلیم کر لیا گیا تاہم وہ ہمیشہ اہم امور میں ملکہ سے مشورہ لیا کرتا تھا، اور اس قسم کے معاملات ملکہ کی دانائی و عقل کی رسائی اور حسن تقریر کی وکالت سے سلجھتے تھے چونکہ سعادت مند فرزند اپنی والدہ کی حقیقی خوبیوں سے واقف تھا، وہ ملکہ کی بیحد تعظیم و تکریم کرتا تھا، بلا ناغہ روزانہ سلام کے لئے حاضر خدمت ہوا کرتا تھا۔

حسن و جمال میں بھی ملکہ کا کوئی ثانی نہ تھا، حسن صورت کی طرح حسن سیرت میں بھی وہ اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی، وہ ایک بے نظیر و بے عدیل حسین و جمیل خاتون تھی جو کمالات علمی و انتظامات ملکی میں بیحد دخل رکھتی تھی، اس کے علمی ذوق کا یہ نتیجہ تھا کہ اس کی ڈیوڑھی پر بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں، فلسفیوں اور شاعروں، ریاضی دانوں اور مہندسوں، فصیحوں اور ادیبوں کا مجمع رہا کرتا تھا، ملک دکن میں اہل علم و صاحبان کمال کا مرجع و ماویٰ اسی کا گھر تھا، اس کے مردانے مکان سے بڑی علمی صحبت ملک بھر میں کہیں نہ تھی اہل کمال کی جیسی وہ قدر کرتی تھی اس کا اور اس کے علمی شوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے دربار میں ہمیشہ منتخب روزگار کا مجمع رہا کرتا تھا، اور اس کے سلوک کی وجہ سے بڑے بڑے امراجان نثاران سلطنت بن گئے اور خیر خواہی میں جان دینا معمولی بات سمجھتے تھے۔

مہمات سلطنت کو انجام دینے کے علاوہ ملک میں ضبط و انتظام رکھنے اور انصاف و عدل کیساتھ معاملات طے کرنے میں بھی وہ شہرت حاصل کی کہ لوگوں نے نوشیرواں کے عدل و انصاف کو بھلا دیا اور وہ قصے داستان پارینہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے، گو کہنے کو تو وہ صنف لطیف کی ایک نازک ہستی تھی لیکن اس میں ملک گیری و کشور ستانی کا جذبہ موجود تھا، نیز اس نے کفر کے رفع کرنے میں بہت سعی و کوشش کی، کنجی و کالستری جیسے مقامات اس کے قبضہ تصرف میں آگئے، ہر روز فتح و کامیابی اسے حاصل ہوتی گئی، اور اقبال و طالعمندی نے کامرانی کے پھول اس کے قدموں پر نچھاور کئے،

اس کا فیض عام، امیر و غریب برنا و پیر کافر و مسلمان خورد و بزرگ سب کو یکساں مستفید کرتا تھا، اس کی سخاوت نے لوگوں کے دلوں سے حاتم کی سخاوت کی داستان کو فراموش کرا دیا، نیک کاموں میں سب سے پیش پیش رہتی تھی کوئی شخص اس کے در سے بے نیل مرام واپس نہ ہوتا تھا اس نے سرائے اور مسجدیں تیار کرائیں، جا بجا سڑکوں پر باؤلیاں بنوائیں تاکہ مسافر سفر کرنے میں تشنگی آب سے جاں بلب نہ ہو جائیں، ملکہ بیحد رحمدل تھی، مظلوم و ستم رسیدہ کی دستگیری و اعانت کرتی تھی بڑی عالی دماغ و لائق تھی۔ امور مملکت کی واقفیت اور سیاست دانی کے لحاظ سے اس کا مرتبہ ہند کی مستورات میں بہت بلند ہے، بہادری و دلیری میں ایسی ہی مشہور تھی جیسا کہ چاند بی بی احمد نگری ہمت و جرات میں، جب تک زندہ رہی مہمات سلطنت کو بحسن و خوبی اپنے دونوں معتمدین کی مدد سے انجام دیتی رہی ملکہ کے عہد میں تمام رعایا خوشحال اور فارغ البال تھی، ظلم و ستم، جبر و تشدد کا نام و نشان نہ تھا، ہمایوں شاہ کے وقت میں جتنی سختیاں کیگئی تھیں، اسی قدر ملکہ نے عمدہ سلوک کیا، اور رعایا کی فلاح و بہبود میں ہمہ تن منہمک رہی، سچ تو یہ ہے کہ ملکہ نے اپنے شوہر کی بدنامی کو نیک نامی سے تبدیل کر کے اس کی بہت کچھ تلافی کر دی، اور فی الحقیقت ہمایوں شاہ کے ظلم و ستم کو لوگ بھول گئے۔

جب بلگواں کے راجہ کی سرکشی کی خبر سنکر اس کی تادیب کے لئے محمد شاہ روانہ ہوا تو ملکہ مخدومہ جہاں بھی اس کے ہمراہ گئی اور اپنے زریں مشوروں سے اس کو ہدایت کرتی رہی، آخر کار ملکہ کی نیک صلاح پر عمل کرنے سے فتح حاصل ہوئی اور راجہ پابزنجیر دربار شاہی میں حاضر ہو کر عفو تقصیر کا خواستگار ہوا، کامیابی کے ساتھ اس مہم کو سر کر کے جب محمد شاہ واپس ہو رہا تھا اور ابھی دارالسلطنت تک پہونچا بھی نہ تھا کہ راستہ میں ملکہ سخت بیمار ہو گئی، اطبا و حکما نے معالجہ میں بیحد کوشش کی لیکن چونکہ پیمانہ عمر لبریز ہو چکا تھا، سعی و کوشش مفید ثابت نہ ہوئی، راستہ ہی میں ملکہ نے عالم فانی سے عالم بقا کی طرف کوچ کیا، محمد شاہ کو ایسی شفیق و مہربان والدہ کے انتقال کا بیحد

رنج ہوا، لاش کو دفن کرنے کے لئے شاہانہ تزک و احتشام سے دارالسلطنت بیدر کی طرف روانہ کیا، اور بادشاہ کے حسب الحکم سلاطین بہمنیہ کے مقبرہ میں سپرد گور کر دی گئی،

حقیقت میں ملکہ بڑی عالی ہمت تھی، اس ملکہ کی حسن تدبیر سے سلطنت بہمنیہ کو محمد شاہ کے زمانہ میں عروج حاصل ہوا، اور وسعت ملک میں بےحد اضافہ ہوا، رعایا خوشحال تھی، شاہی خزانہ زر و جواہر سے معمور تھا، اس ملکہ کی دور اندیشی اور عنایات شاہانہ نے خواجہ محمود گاواں کو ملک کا خیر خواہ بنایا۔

محمد شاہ نے حکم دیا کہ ایسی عالی ہمت اور منصف مزاج اور لائق روزگار ملکہ کا گنبد مزار بھی مستحکم سنگین اور عالیشان بنایا جائے چنانچہ اسیطرح حکم کی تعمیل کی گئی اور ملکہ کا مزار باوجود حوادث روزگار اور انقلاب زمانہ کے اب تک باقی ہے، اور یہ آثار صنادید عہد ماضی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

کسی شاعر نے ہر دل عزیز ملکہ کی تاریخ وفات عربی میں کہی تھی جسے ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

درۃ التاج مریم الاثار	اذ جارت ندا ربا عنہا
ملہم الغیب قال فی التاریخ	ابد الله ملک وارثہا

ماخذ:- (۱) تاریخ فرشتہ (۲) تحفۃ الملوک (۳) چمن گلشن (۴) تاریخ سلاطین دکن (۵) محبوب الوطن تذکرۂ سلاطین دکن (۶) تاریخ قادری (۷) تاریخ دکن سلسلہ آصفیہ (۸) تاریخ رشید خانی (۹) (۱۰) باغ آصف حصہ دوم :- (سعیدی بی اے علیگ)

فلسفۂ مذہب

(بسلسلۂ ماسبق)

اب ہم آنحضرت کی اس خالص نبوت کی زندگی پر جو آپ نے مکہ میں گزاری ہے نظر ڈالتے ہوئے نبوت کے اوصاف کا ایک معیار قائم کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے۔

اول اس شخص کا اخلاق اس قدر بلند ہو کہ دوست و دشمن سب اسپر اعتبار کریں وہ شخص کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو نہ اس نے کسی امانت میں خیانت کی ہو۔

دوم۔ وہ ایسا موثر کلام کرے جسکے مثل لوگ نہ کر سکتے ہوں اگرچہ وہ کوشش بھی کریں۔

سوم۔ وہ باوجود امی ہونے کے ایسی باتوں کی خبر دے جس کی تصدیق دوسرے ذرائع سے ہو سکے۔

چہارم۔ اس کے کلام میں فحش و لاطایل باتیں نہ ہوں۔

پنجم۔ اس کا مقصد اپنی بڑائی اور عظمت کے بجائے دوسروں کی بھلائی ہو۔

ششم۔ وہ لوگوں کو ایسے کاموں کی طرف بلائے جن کو عقل سلیم خود بخود مان لے۔

پس یہ شرائط اگر ایک نبی میں پائے جاتے ہیں تو عام اس سے کہ اس نے متعدد شادیاں کی ہوں۔ جہاد کیا ہو۔ کھاتا پیتا ہو یا بازاروں میں چلتا پھرتا ہو، ہم اسکو نبی ماننے کے لئے تیار ہیں اور اس کا کلام یقیناً الہامی ہوگا کیونکہ بغیر اس کے کلام کو الہامی مانے ہوئے نہ ہم اسکے قول پر اعتبار کر سکتے ہیں اور نہ اس کے احکام کی تعمیل پر دل سے مجبور ہو سکتے ہیں۔ لہذا مذہب کے لئے نبوت و کلام الہامی لازم و ملزوم ہے۔ اور یہ صورت تقریباً ہر ملک و قوم میں پیش آئی ہے اور دنیا کے تمام مذاہب میں جو اختلاف رونما ہے وہ یا تو نبوت کی باتوں پر متوجہ نہ ہونے یا نہ سمجھنے یا ان کو فراموش کر دینے کی وجہ سے ہے۔

مذہب کے اصول یعنی خداشناسی۔ تکوین و حشر۔ سزا و جزا۔ ایسی باتیں ہیں جن میں انسانی عقل بہت کم رہبری کر سکتی ہے۔ اور جب کبھی انسانی عقل نے مذہب بنایا ہے وہ وحشیوں کے خودرو مذہب سے بہت کم فرق رکھتا ہے۔ لیکن سب سے بڑا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ اگر مذہب فطری چیز نہیں ہے بلکہ اکتسابی ہے تو کیا انسان بلا مذہب کے بھی دنیا میں رہ سکتا ہے۔ یہ سوال معمولی نہیں ہے جبکہ مہذب دنیا کے لوگ بہ بانگ دہل اس کا اعلان کر رہے ہیں کہ وہ مہذب ترین قوم کے افراد ہیں اور کسی مذہب سے سروکار نہیں رکھتے پھر اگر ایک طرف یہ صداے بے ہنگام ہے تو دوسری طرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فلسفی و نکتہ داں اپنے قومی مذاہب میں سخت انہماک رکھتے ہوئے پائے گئے۔ اور ایسی باتیں انھوں نے کیں اور کہیں کہ مشکل سے عقل سلیم ان پر یقین کر سکتی ہے۔ سقراط کی فراست میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ لیکن سقراط مرتے وقت اپنے شاگردوں کو وصیت کر جاتا ہے کہ اس کے ذمہ فلاں دیوتا کی مرغے کی قربانی

باقی رہ گئی ہے وہ پوری کیجائے۔ مذہب کا یہ کرشمہ درحقیقت نہایت تعجب انگیز ہے خود ہمارے ہم وطن ہی کیسے کیسے عالم و فلسفی ہیں مگر مذہب کے اعتقاد میں وہ اور ایک دہقانی جو ایک گول پتھر پر صبح جل چڑھاتا ہے برابر ہیں۔ یہ عقدہ غالباً کبھی حل نہ ہوگا کہ وہ سارے خرافات جو توحید کے خلاف دنیا کی متعدد قوموں میں کثرت سے معمول بہ ہیں ان کو ان کے ماننے والے خود ہی لغو سمجھتے ہیں۔ لیکن سوسائٹی کے ڈر سے زبان نہیں کھول سکتے یا درحقیقت وہ اس کو ویسا ہی سنجیدگی سے باور کرتے ہیں جیسا کہ ایک نادان شخص باور کرتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مذہب کی تاریخ میں اسلام سے قبل صرف یہود بنی اسرائیل میں دیوتاؤں کے خلاف ایک خدائے واحد کے وجود کا خیال پایا جاتا ہے۔ ورنہ کیا کلدانی کیا مصری۔ کیا رومی۔ کیا یونانی سب مذاہب میں وہی باتیں ہیں جو انسان نے خود اپنے دل سے پیدا کریں اور جو بیشمار دیوتاؤں کی پرستش پر مبنی ہیں۔ کم سے کم یہ یورپ کی تحقیق ہے۔ ممکن ہے کہ ان کو دنیا کے کسی مذہب میں خدا کا وجود نہ ملے کیونکہ انھوں نے یہ کلیہ پہلے سے بنا لیا ہے کہ صرف بنی اسرائیل ہی کو خدا شناسی کا پتہ حاصل تھا۔ مگر قرآن ہر قوم میں نبوت کو تسلیم کرتا ہے۔ پس ان نبیوں کی تعلیم کہاں گم ہوگئی۔ ضرور ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم کریں کہ اوہام انسانی میں نبوت کی باتیں گم ہیں اور انکی تلاش سے ہم کو بہت کچھ سراغ مل سکتا ہے۔ رومیوں اور یونانیوں کے بارے میں تو پتہ نہیں چلسکتا کیونکہ مسیحیت نے خود عمدی سے انکی اصل کو دنیا سے مفقود کر دیا تاکہ مسیحیت کا ستارہ تاریکی میں زیادہ روشن نظر آئے۔ مگر مشرق کے مذاہب میں نبوت کے خیالات ضرور ملتے ہیں۔ چنانچہ قدیم مصریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فرعون (اسوقیس چہارم) نے یہاں تک کوشش کی کہ اپنے پرانے معبودوں اور اس پائے تخت کو چھوڑ کر جو معبد دوال یا مال۔ تامے اور ری کی سرپرستی میں بنایا گیا تھا، تل العمرانہ کے قریب ایک نیا پایۂ تخت اپنے نئے اور تنہا خدا آتون کے نام سے بنوایا اور خود اپنا لقب انی ناتون (یعنی آتون کا پرتو نور) رکھا۔ اس نئے معبود کے متعلق کتاب تعلیمات میں جو مناجات کی صورت میں قدیم مصریوں کے قول کے مطابق الہامی بتائی جاتی ہے۔ توحید الہیات کے وہ خیال پائے جاتے ہیں جنکو ہم واقعی الہامی کہسکتے ہیں۔ لیکن اخناتون کے مرنے کے ساٹھ سال کے اندر قدیم بت پرستی کے خیالات نے پھر پلٹا کھایا اور نئے خیالات جو ایک خدا کی پرستش پر مبنی تھے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اٹھارہویں خاندان کے سلاطین جن کے زمانے میں مصریوں میں توحید کا رواج تھا ٹھیک وہی زمانہ تھا جب حضرت یوسف مصر میں تھے تو گویا تاریخی کتبے اور قرآن مجید دونوں اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ درحقیقت مصر کے مسلم مبعوث پیغمبر تھے۔ اور ان کی تعلیم سے مصریوں کے خیالات بدل گئے۔ اسیطرح قدیم کلدانیوں میں حمورابی کے زمانے کے بعد سے جبکہ بابل کی سلطنت و مذہب کی تشکیل ہوئی۔ بعل کے لئے وہی صفات مانے جاتے تھے جو ایک خدا میں سمجھے جا سکتے ہیں، اور وہاں بھی کتبات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت نوح کی تعلیم ایک عرصہ تک ان میں قائم رہی تا آنکہ انھوں نے بودھ مذہب و عیسائی مذہب کی طرح خود حضرت نوح کو (تو تام) کا ایک دیوتا بنا لیا۔ ہندوؤں کے مذہب میں بھی بقول البیرونی عوام سے بالاتر ایک طبقہ تھا جنکا خیال خدا کی نسبت بالکل الہامی کہا جا سکتا ہے۔ وہ خدا کو واحد ازلی۔ قادر مطلق خالق کائنات وغیرہ وغیرہ صفات کے ساتھ ویسا ہی مانتے تھے جیسا ہم مسلمان۔ چنانچہ کتاب پاتنجلی میں جسکا حوالہ البیرونی نے دیا ہے شاگرد اپنے استاد سے سوال کرتا ہے "وہ کونسا معبود ہے جس کی عبادت انسان کو سعید بناتی ہے" استاد جواب دیتا ہے۔ وہ وہی ہے

جو ازلی و بے ہمتا ہے۔ وہ عذاب و رحمت کے لئے کسی کا محتاج نہیں وہ انسان کے خیال میں نہیں آ سکتا۔ وہ استاد بے مثل ہے اور کسی قسم کی تشبیہ اس کے لئے لغو ہے۔ وہ خود اپنے وجود سے موجود ازلی ہے وہ عالم (؟) نہیں ہے بلکہ وہ خود علم ہے اور لاعلمی کی صفت خدا میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ شاگرد پھر سوال کرتا ہے "کیا اس کے علاوہ بھی اس میں کچھ اور صفات ہیں" استاد جواب دیتا ہے۔ وہ بلند ہے اس کی برتر ذات مکان کی ضرورت سے مستغنی ہے۔ وہ خالص نیکی ہے وہ علیم و خبیر ہے" شاگرد پھر سوال کرتا ہے "کیا وہ کلام کر سکتا ہے" استاد جواب دیتا ہے "چونکہ وہ عالم ہے اس لئے وہ کلام کر سکتا ہے" وغیرہ۔ اسی طرح بھاگوت گیتا میں باسدیو ارجن کے مکالمہ میں باسدیو فرماتے ہیں "میں کائنات ہوں بلا ابتداء آخر ہستی لاموت ہوں میں اپنی رحمت سے بے نیاز ہوں۔ مجھ سے کسی ہستی کی تشبیہ نہیں ہو سکتی میں کسی خاص فریق کا طرفدار نہیں۔ میں نے ہر ہستی کو اسکی ضرورت کا تمام سامان دیدیا ہے۔ اس لئے جو میری ہستی کو پہچانتا ہے اور میرے مانند ہونے کے لئے مجاہدۂ نفسی کرتا ہے۔ اس کے علائق کی بیڑیاں کٹ کر اس کو آزادی و نجات ابدی حاصل ہوتی ہے"

ایک دوسری جگہ باسدیو نے فرمایا ہے "انسان کا فطری تقاضا ہے کہ وہ اپنی ضرورت میں خدا کو یاد کرے۔ جو مجھے ازلی و لم یلد و لم یولد مانتا ہے۔ خالق اکبر جانتا ہے۔ وہی تمام انسانوں میں گناہوں اور خطاؤں سے مبرا ہے" فلاسفہ یونان و روما کے خیالات میں بھی ہمکو بہت کچھ اس کے پرتو نظر آتے ہیں۔ سات حکمائے یونان جو ارکان عقل کے نام سے مشہور ہیں انکا خیال تھا کہ تمام چیزیں ذات واحد سے نکلی ہیں۔ اور انسان دوسرے غیر ذوی الارواح مخلوق سے یہ فرق رکھتا ہے کہ وہ ان سے ایک درجہ اس ذات واحد یا سبب اول سے قریب تر ہیں۔ ان حکماء کا خیال تھا کہ عالم ایک ہی شے ہے اور سبب اول ان میں مختلف جلووں سے ظہور کرتا ہے اور انسان جو سبب اول سے لو لگاتا ہے وہ آخر کار اس میں جذب ہو کر اپنی ساری ہستی فنا کر دیتا ہے۔ افلاطون کے اس قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ "دیوباس (خدائے واحد) جنکو غیر اقوام منجملہ اور دیوتاؤں کے ایک دیوتا جانتے ہیں بوجہ اس کے کہ اس کو بقا حاصل ہے۔ اور "دیوتاؤں سے جدا ہے" پھر ایک جگہ افلاطون نے کہا ہے "یہ خدا ایک ہی ہے۔ خدا متعدد تعدادوں میں نہیں ہے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں کے بیشمار دیوتا درحقیقت فلاسفہ کے نزدیک وہی صورت رکھتے تھے جو ہمارے یہاں فرشتوں کی ہے۔ عوام نے فرشتوں کو خدا کے درجہ تک بڑھا دیا جیسا کہ عرب کے عوام نے ان کو خدا کی بیٹیاں کہنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جالینوس کا قول ہے کہ "یہ صحیح ہے کہ اسقلابوس دیوتا کسی زمانے میں انسانیت کے جامے میں تھا۔ اس کے بعد خدا نے اس کو ملائکہ کا درجہ دیدیا"

پس قرآن کا یہ اصول کہ "ولکل اُمۃٍ رسولٌ فاذا جاء رسولھم قضی بینھم بالقسط وھم لا یظلمون۔" ایک حقیقت ہے جس کی بے نقابی کا دنیا کو ابھی انتظار ہے۔ عرب کی قوم جو بت پرستی میں دنیا کی کسی دوسری قوم سے کم نہ تھی۔ اس میں بھی نبوت کی آواز ایک زمانے میں گونجا کی۔ چنانچہ ہود پیغمبر کی بعثت کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ اس کی لفظ بلفظ تائید یمن کے اس مشہور کتبۂ حصن غراب سے ہوتی ہے۔ جس نے دنیا میں صرف حضرت ہود کا وجود ہی ثابت نہیں کر دیا بلکہ اکثر قرآنی امور کی بھی تائید کر دی۔ (دیکھو فارسٹر کا قدیم جغرافیہ عرب)

پس انسان مذہب کے اختیار کرنے پر مجبور ہے اگرچہ وہ باوجود اعلیٰ فہم و فراست رکھنے کے مذہب میں نہایت لوچ و لچر باتیں پیدا کرے مگر مذہب سے خالی ہونا انسان کے لئے ممکن نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق انسان کی سائیکالوجی سے ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کو مذہب

کی طرف لانے والا" ملک الموت کا ہاتھ ہے۔ انسان کی خودی اس کو اس بات کے لئے مجبور کرتی ہے کہ وہ غور کرے کہ یا تو اُسے اپنے دوسرے ابنائے جنس کی طرح ایک دن مرنا ہے۔ یا اپنے لئے موت کا یقین رکھکر اس سے بھاگنے اور بچنے کی کوشش کرے اور یہی دو صورتیں ہیں جو آپ کو مذہب کا خیال دلاتی ہیں۔ پھر چونکہ اُسے موت سے بچنے کا یقین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مضطر و پریشان ہو کر مذہب کی جستجو میں مشغول ہو گا۔ اور اب اس کے لئے صرف یہ تلاش باقی رہجائے گی کہ مذہبی عقائد میں سے کون اس کے دل کو مطمئن کر سکتے ہیں۔

باقی ـــــــــــ باقی

سید مقبول احمد بی اے

لغت اسلامی

مرتبۂ سید حامد حسین رضوی - (علیگ)

جلد اول طیار ہو گئی ہے جسمیں صرف ثا تک تمام وہ الفاظ معہ مکمل تشریح و تفسیر کے درج کئے گئے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کے مذہبی، اقتصادی، جغرافی، تاریخی، علمی و معاشری لٹریچر سے ہے۔ نہایت مفید و ضروری کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲؎ ملنے کا پتہ:- منیجر "نگار" لکھنو



چنگاری

(فسانہ)

(بسلسلۂ ماسبق)

—:(۶):—

یوسف کا اعادۂ مرض ہر چند نہ زیادہ شدید تھا نہ زیادہ طویل، لیکن تاثرات و نتائج کے لحاظ سے یوسف کی حیات کے لئے ایک ایسا نقطۂ انحراف (Turning point) اپنے اندر رکھتا تھا کہ اُس کو بھلا دینا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

اس سے قبل مس ہلن نے تیمارداریاں ایسے عالم میں صرف کی تھیں کہ یوسف بالکل بیہوش تھا، لیکن اس مرتبہ یوسف ہوش میں تھا، اسکا دماغ صحیح تھا اور اگر ایک طرف وہ مس ہلن کی جانفشانیوں کو دیکھ کر خاموشی کے ساتھ نہایت گہرا اثر قبول کرتا جاتا تھا، تو دوسری طرف مس ہلن بھی سمجھتی جاتی تھی کہ اس مرتبہ پہلے کی طرح یوسف کی خدمت، کسی بت کی پرستش نہیں ہے بلکہ ایک ایسی اثر پزیر چیز کو ہاتھ میں لینا ہے جو ہر لمس کے نقش کو قبول کر لینے والی ہے۔ اول مرتبہ جو کچھ اس نے کیا محض انسانی فرض شناسی کے احساس پر مبنی تھا۔ لیکن اس مرتبہ جو کچھ وہ کر رہی تھی یکسر نسائی ایثار تھا جس کے لئے دنیا نے ہمیشہ بڑی سی بڑی قربانی گوارا کی ہے۔

عورت کی صحیح فطرت کا اندازہ کرنا ہو تو اُسے اس وقت نہ دیکھو جب وہ عہد تمنا سے گزر رہی ہو، انتظار کرو یہاں تک کہ وہ مقصود کو پالے یا اس سے مایوس ہو جائے پھر اگر اس کا مدعا صرف دوسرے کے اندر جذبۂ پرستش پیدا کرنے کی حد تک ختم ہو جائے تو سمجھ لو کہ اس کے بعد وہ انتقام پر آمادہ ہوگی اور پھر یہ انتقام ایسا ہی شدید ہوگا جیسا وہ جذبہ جو مایوسی کے عالم میں اسے اپنے آپکو ہلاک کر دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔

یوسف جس نے اسوقت تک نسائی فطرت کا بالکل مطالعہ نہ کیا تھا اس دوران میں صرف اس قدر سمجھنے میں کامیاب ہوا۔ کہ عورت بھی قدرت کی غیر ضروری پیداوار نہیں ہے اور مرد کی زندگی کی بعض خستگیاں ایسی ہیں جنھیں عورت ہی کا نرم و نازک لمس دور کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اب بھی اس حقیقت سے آگاہ نہ تھا کہ عورت سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرنے کا عزم ایک شدید ترین جرم ہے اور فطرت کبھی نہ کبھی اس کا انتقام لے ہی لیتی ہے۔ مس ہلن سے اس کی پہلی ملاقات بالکل وہی نوعیت رکھتی تھی جو ایک اجنبی کی ہوا کرتی ہے اور اس کے بعد اس نے ایک دوستی کی سی صورت اس کو دینا چاہی تھی، لیکن مس ہلن جس کے سامنے یوسف کا وجود ایک ایسا معمہ تھا جس کے حل نہ کر سکنے کو وہ اپنی توہین خیال کرتی تھی، کسی اور فکر میں تھی اور آخر کار وہ اپنی فکر فضول میں کامیاب ہو کر رہی یہاں تک کہ جس وقت یوسف بیماری سے اٹھا ہے تو وہ اپنی زندگی کو مس ہلن ہی کا عطیہ سمجھکر اُٹھا اور اس کی غیور طبیعت اس فکر سے بے چین رہنے لگی کہ وہ کیونکر اس احسان کا اعتراف کر سکتا ہے۔

یقیناً اول اول اخلاق ہی کی دنیا میں یوسف کو ہلن سے تعلق پیدا ہوا، لیکن وہ غریب بے خبر تھا کہ عورت سے تعلق ہونے کی کیفیت دنیا میں ایک ہی ہے اور اس کو دائرہ کے جس نقطہ سے بھی شروع کیا جائے اسے پہونچنا اسی مرکز تک ہے جہاں مرد اپنے آپ کو بالکل بیدست وپا محسوس کرنے لگتا ہے۔

یوسف بالکل صحیح وتوانا ہوگیا، وضع ومعاشرت بدل گئی، مشاغل میں بھی شان امارت پیدا ہونے لگی، اور رفتہ رفتہ وہ اسی سطح پر آگیا جہاں مرد ایک عورت کے لئے سراپا نمائش نظر آتا ہے، یہ سب کچھ ہوا، لیکن سب سے زیادہ حیرتناک امر یہ ہے کہ اس نے آخر کار یہ بھی محسوس کرلیا کہ زندگی خواہ کسی چیز کا نام ہو، لیکن زندگی کا لطف عبارت ہے عورت سے اور وہ عورت اس کیلئے سوائے ہلن کے کوئی اور نہ ہوسکتی تھی۔

اصولاً وہ اس سے واقف تھا کہ عورت کے سامنے کیونکر جذبۂ محبت پیش کیا جاتا ہے، اس نے بہت سے فسانے پڑھے تھے اس نے دوران تعلیم میں متعدد ناولوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اور اس لئے جہاں تک 'نظریہ' کا تعلق ہے وہ اس سے خوب آگاہ تھا، لیکن جب اسپر عمل کرنے کا وقت آیا، جب سوال خود اپنے دل کا پیش ہوا، تو اس کی تمام آگاہیاں بیکار ثابت ہوئیں، اور کسی طرح اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ دل کا یہ کانٹا کیونکر زبان سے نکالا جائے۔

باوجودیکہ مس ہلن، یوسف کے لئے سراپا توجہ تھی، یکسر انعطاف والتفات تھی، لیکن یوسف جس وقت اپنے آپ کو دیکھتا تھا، اپنے تمام حالات پر غور کرتا تھا تو اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا، کیونکہ جس زندگی کا عادی اس کو مس ہلن نے بنا دیا تھا اب وہ ایک نشہ کی سی تکلیف رکھتی تھی اور یوسف کی قدرتاً یہی خواہش ہونی چاہئے تھی کہ وہ اس لطف میں دوام پیدا کرے، لیکن جب وہ یہ خیال کرتا تھا کہ مس ہلن کیوں اپنی زندگی اس کے ساتھ وابستہ کرنے لگی، اس میں کیا ہے جس کے لئے وہ اپنی وسیع دنیا کو ترک کرکے مجبور دپابند ہوجائے گی، تو ساری تعمیر خیال خاک میں ملجاتی تھی اور وہ متحیرانہ سر پکڑکر بیٹھ جاتا تھا۔

مس ہلن اس کے تمام جذبات سے آگاہ تھی اور کیوں نہ ہوتی جبکہ وہ خود اس کے پیدا کئے ہوئے تھے، لیکن اب مشکل سے یوسف کو کوئی موقع ایسا دیتی تھی کہ وہ اظہار تمنا کرسکے، اب اس کی تمام باتیں نہایت سخت بے لطف مادیات کے متعلق ہوا کرتیں، یا خشک سیاسیات، اس کا موضوع سخن ہوتا۔ یوسف حیران تھا کہ یہ انقلاب اس میں کیوں ہوگیا۔ ایک وقت تھا کہ وہ سوائے حسن وعشق، نظریۂ شعر وشاعری، اصول فنون لطیفہ تجزیۂ جذبات جنسی کے اور کوئی بات ہی نہ کرتی تھی۔ اس حال میں کہ وہ گھبرا گھبرا کر بھاگ اٹھتا تھا یا اب وہ وقت آیا کہ اسے تمنا رہتی تھی کہ مس ہلن کوئی ایک ہی جملہ زبان سے ایسا ادا کردے کہ اس کو کسی لطیف بحث کے چھیڑنے کا موقعہ ملے لیکن اس میں کامیاب نہ ہوتا۔

یہاں تک کہ معمولاً جب صبح کو وہ گلدستہ سامنے لاکر پیش کرتا تو بجائے اس کے کہ وہ پھولوں کی خوشنمائی کا ذکر کرتی، انباتات کے متعلق مسٹر بوس کے انکشافات سے بحث کرنے لگتی اور ایسا خشک چہرہ بناکر کہ یوسف کو سوائے خاموش سنتے رہنے کے کوئی چارہ نہ ہوتا —— ایک خنک شب ماہ میں ساحل کے قریب قریب یوسف کشتی کھیتا ہوا چلا جارہا تھا، ہارسنگھار اور

کرانڈے کی جھاڑیوں سے خوشبو نکل کر پھیل رہی تھی، ایک عشق انگیز روشن سکوت سطح آب اور تمام فضا پر طاری تھا کہ دور سے بانسری کی آواز آئی، مس ہلن بانسری کی عاشق تھی۔ یوسف نے اس خیال سے کہ اس وقت ان کیفیات کا اجتماع یقیناً ایک کامیاب سفارش ثابت ہوگا۔ اُس نے بہت جرأت کر کے کہا کہ "آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس وقت کیسا سحر ٹپک رہا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذرہ ذرہ عشق.........." وہ یہ فقرہ پورا ابھی نہ کر پایا تھا کہ مس ہلن نے چونک کر کہا "مسٹر یوسف، آج کا اخبار آپ نے دیکھا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتی کہ مصر کیستھ برطانیہ کا موجودہ طرز عمل کیونکر قابل ستائش سمجھا جا سکتا ہے، حیرت ہے کہ وہاں کی وزارت کیوں نہیں بیدار ہوتی۔ اور وہاں کی رعایا کب تک اپنے حقوق کی پامالی کو گوارا کرتی رہیگی"

اس وقت یوسف کی وہی حالت ہوئی جیسے دفعتہً "کسی کا گلا گھونٹ کر خاموشی کے ساتھ تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا جائے" مجبوراً اُسے وہ "ذرہ ذرہ کا عشق" ترک کرنا پڑا، لیکن کچھ سوچکر تھوڑی سی خشونت کیستھ بولا "جی ہاں مصر کی مجبوریوں سے میری مجبوریاں بھی کم نہیں لیکن فرق یہ ہے کہ اُن کا ذکر کیا جاتا ہے اور اِن کو فراموش۔ خدا جانے دنیا کے کتنے دردناک واقعات ایسے ہیں جو فسانہ بننے سے پہلے ہی محو کر دئے جاتے ہیں"۔

بات سے بات پیدا کرنے کی ذہنیت یوسف میں کبھی نہ تھی لیکن جہاں اور بہت سے انقلاب اس کی زندگی میں ہوئے، یہ بھی ایک تغیر رونما ہوا اور چونکہ سلسلۂ گفتگو میں کسی کی طرف سے ایسی ذہنیت کا ظاہر ہونا ہمیشہ مخاطب کو مغلوب کر دیتا ہے، اس لئے مس ہلن نے پھر اس کو ٹالنا چاہا اور زیادہ سنجیدگی کے ساتھ بولی کہ "ذاتی و انفرادی مجبوری کا فسانہ بننا کوئی اچھی بات نہیں ہے اور نہ دنیا کو فرصت و ضرورت کہ اسے سنے، آپ کے ایک ایک کاشتکار کا دل اس لحاظ سے ایک غمکدہ ہوگا اور خدا جانے کتنی نرالہ باریوں کے زخم وہ اپنے سینے میں لئے ہوئے ہوگا، لیکن کیا آپ پر کیا الزام اگر آپ اس سے بے خبر ہیں،...... بہت دیر ہوگئی اب آپ جلد واپس چلئے، مجھے ایک نہایت ضروری خط لکھکر اسی وقت روانہ کرنا ہے"۔

اس وقت یوسف کی مجبوری و بیچارگی اس حد تک پہونچ گئی تھی جس کے بعد ردعمل شروع ہو کر انسان از سر نو اپنے اندر جرأت و جسارت محسوس کرنے لگتا ہے، وہ سمجھتا تھا کہ جو کچھ کہنا ہے، اسی وقت کہدینا چاہئے، ورنہ پھر موقعہ ملنا دشوار ہے۔ لیکن جب مس ہلن کے موجودہ احتراز کو دیکھتا تھا تو پھر اس کا نفس ملامت کرنے لگتا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ کشتی کا رخ پھیر کر واپس جا رہا تھا اور ان تمام حالات پر غور کرتا جاتا تھا کہ گھاٹ آگیا۔ وہ کشتی سے اترا اور مس ہلن کو اُتارنے کے لئے اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ یہاں تک جو کچھ ہوا وہ یوسف کے عالم ہوش کی باتیں ہیں، لیکن جب مس ہلن کا نرم و نازک ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا تو وہ بالکل بے اختیار ہوگیا اور قبل اس کے کہ مس ہلن اپنا ہاتھ علحدہ کرتی، یوسف نے اسی جگہ دو زانو ہو کر پیام دل کہدیا۔

مس ہلن نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بولی "یوسف صاحب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں تو آپ کو ایک غیر معمولی انسان سمجھتی تھی، مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ بھی آخرکار اسی سطح پر آگئے جہاں انسان بجائے روح کے صرف گوشت پوست کی ستائش کرنے لگتا ہے"

یوسف "اگر میں واقعی کسی ایسی سطح پر آگیا ہوں، جو آپ کے نزدیک پست ہے تو اس کا الزام مجھ پر نہیں ہے آپ نے میری ساتھ

وہ احسان نہیں کیا جس کی یاد میرے سے محو ہوسکے' پھر اب میں اس کی عوض میں سوائے اس کے کیا کر سکتا ہوں کہ اپنی زندگی کو جو حقیقتاً آپ ہی کی بخشی ہوئی ہے، آپ کے قدموں پر ڈال دوں"

مس ہلن "میں نے جو کچھ کیا آپ اسے احسان سمجھیں یا کچھ اور لیکن میں تو اُسے ایک فرض انسانی سمجھتی ہوں' اور اس لئے اس کا کوئی عوض قبول کرنے کے لئے طیار نہیں۔ علاوہ اس کے یوں بھی یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ منت پزیری کا ذکر اس طرح کیا جائے گویا آپ نے خود کوئی احسان مجھ پر کیا ہے۔ اگر آپ ہی کے یقین و اعتقاد کے مطابق میں نے کوئی احسان کیا ہے تو اس کا عوض یہ تو نہیں ہوسکتا کہ آپ اس کے عوض میں، مجھی کو مجھ سے چھین لیں۔ جس وقت تک ہیئت اجتماعی کے قانون میں مرد کو کچھ بھی مرجح درجہ حاصل ہے' اس وقت تک میں یا کوئی ذی حس عورت نکاح کی توہین کو گوارا نہیں کرسکتی۔ فطرت نے ہر چیز کو آزاد پیدا کیا ہے اور آزادی کو قایم رکھنا ہر ذی حیات کا فطری حق ہے، دنیا میں پابندی کا خیال صرف ایک فریب ہے' اور کسی ایک حالت پر قائم رہنا ارتقار کا دشمن نسیم آزاد ہے، نکہت آزاد ہے، آبشار آزاد ہے اور ہر وہ چیز آزاد ہے جو لطیف ہے' پہاڑوں کے جمود میں ہیبت ہو تو ہو لیکن لطافت مفقود ہے" وہ یہ باتیں کرتے کرتے مکان تک پہونچ گئی اور جب یوسف رخصت ہونے لگا تو اس نے یہ کہکر "کل صبح کو میں چلی جاؤنگی" دروازہ بند کرلیا اور یوسف کو مبہوت و متحیر چھوڑ گئی۔

(۷)

مس ہلن کو گئے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے اور اس دوران میں یوسف کی زندگی نے جو تغیرات قبول کئے وہ نہایت عجیب و غریب تھے۔ مشاغل کاشتکاری کے ساتھ ظاہری وضع و معاشرت کی سادگی تو اس سے قبل ہی رخصت ہوچکی تھی لیکن مس ہلن کے جانے کے بعد قلب و دماغ کا توازن بھی درہم برہم ہوگیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس میں ایک نہایت خطرناک انتفاعیت (utilitarianism) کا ذوق پیدا ہوچلا ہے۔ مس ہلن کی معیت اور اس کی گفتگو نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک اشتعال پزیر مادہ کیساتھ آگ کی چنگاری کرتی ہے اور اس کے جذبات کی وہ حالت ہوئی جیسے تند شراب سر بند مینا کو توڑ کر باہر اُبل پڑے

گزشتہ صحبت کے ختم ہونے کے بعد کامل پندرہ روز تک اُس نے غور کیا کہ آیا وہ اپنے جذبات کو ضبط کرسکتا ہے یا نہیں اور جس نتیجہ پر پہونچا وہ یہ نہ تھا کہ ضبط ممکن نہیں بلکہ اس کا خطرناک پہلو یہ تھا کہ ضبط کی ضرورت بھی نہیں ہے، اسی کے ساتھ اس نے مسئلہ آفرینش، نظام تمدن، مذہب و اخلاق، رابطۂ نکاح، فلسفۂ حسن و عشق، اور خدا جانے کن کن مسائل پر غور کیا۔ اور آخرکار پورے وثوق کے ساتھ اس کے دماغ نے یہ فیصلہ صادر کردیا کہ:۔

۱ قدرت پیدا کرنے کے بعد نہ مخلوق کے اخلاق کی ذمہ دار ہے اور نہ مخلوق پر قدرت کا کوئی خاص حق ہے۔

۲ تمدن کا قانون نام ہے اس ظلم کا جو وہ افراد پر روا رکھتی ہے۔

۳ مذہب ایک جنون ہے جس سے صرف سلطنتیں قائم کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

۴- نکاح ایک لایعنی پابندی ہے جس کے ذریعہ سے تمایل جنسی کو برباد کیا جاتا ہے۔
۵- حسن و عشق مسمی ہے صرف شباب سے فائدہ اُٹھانے کا۔
۶- غایت حیات سوائے اس کے کچھ نہیں کہ شباب کو اس طرح بسر کر دیا جائے کہ شیب میں اس کے عادہ کی حسرت باقی نہ رہے۔

جب تک اس کا خیال اس حد تک نہ پہونچا تھا، اس کی روح مس ہلن کے لئے حزین و ملول تھی۔ لیکن جب اُس نے اصول زندگی یہ مقرر کر لئے تو اس کی روح اس نشار سے آزاد ہو گئی اور اب اس کا تمام حزن و ملال آگ بنکر اس کے ریشہ ریشہ میں دوڑ گیا۔ اب وہ یکسر ہیجان تھا، اُس کے خون میں ایک ناقابل ضبط شباب دوڑ رہا تھا اور اس کے سر میں ایسا نشہ پایا جاتا تھا جو صرف قوائے بہیمیہ کو اُبھار سکتا ہے۔

اُس نے تمام احباب کو اپنی زندگی کے اس تغیر سے آگاہ کیا اور مس ہلن کو بھی ایک تحریر روانہ کی جو الفاظ کے لحاظ سے بہت مختصر لیکن معنی کے لحاظ سے نہایت بسیط تھی اور غالباً اس کی زندگی کا یہی پہلا ادبی کارنامہ تھا اس نے لکھا ۔

"پہلے اگر مجھے اس کا افسوس تھا کہ نام کے لحاظ سے میری صورت کیوں اچھی نہیں ہے، تو آج میں اس تغیر پر مسرور ہوں کہ اب میری فطرت بھی یوسف کی طرح نہیں رہی۔ کیا یہ فخر کم ہے کہ جو کنعاں کے حسین یوسف سے نہ ہو سکا، آج جلال آباد کا زشت رو یوسف اس کے کرنے پر قدرت رکھتا ہے! آپ نے دیکھا فطرت جب مکمل ہوتی ہے تو کس قدر ادر فیاضی پر آمادہ ہو جاتی ہے تو کتنی۔ کس قدر بے عقل ہیں وہ لوگ جو دنیا کے ہنگامہ میں نظام و اصول کی جستجو کرتے ہیں۔ اخلاق مذہب کا معیار قائم کرتے ہیں، حالانکہ موت ہر وقت اعلان کرتی رہتی ہے کہ جو کچھ کرنا ہو کر لو، زندگی دوبارہ ملجائے تو ملجائے لیکن جوانی پھر نہیں مل سکتی۔ کس قدر خوش نصیب تھے وہ لمحے جب اول اول آپ نے میرے اندر یہ احساس پیدا کیا، میری سوئی ہوئی فطرت کو بیدار کیا۔ میں سمجھتا تھا انسان پیدا ہوا ہے صرف کام کے لئے اور رات دن خستہ رہتا تھا، آپ نے بتایا کہ وہ صرف ہنسنے اور کھیلنے کے لئے بنایا گیا ہے اور اب میں بجائے خستگی کے خاص نشاط اپنے اندر پاتا ہوں۔ اب تو غالباً آپ کو میرے ملنے سے احتراز نہ ہوگا، کیونکہ اگر آپ تیتری کی طرح ہر وقت آزاد رہنا ہی پسند کرتی ہیں تو میں بھی اُسی کو پسند کرتا ہوں کہ اس کا تعاقب کیا جائے لیکن صرف اس لئے کہ جب ہاتھ آجائے تو تھوڑی دیر تک چٹکی میں اس کا تلملانا دیکھ آزاد کر دیجائے میں اس خط کے جواب کا انتظار نہ کرونگا، پرسوں خود یہاں سے روانہ ہو کر آپ کی معیت میں سحر بنگالہ کی قوتوں کا امتحان کرنے کے لئے پہونچتا ہوں۔

یوسف سمجھتا تھا کہ مس ہلن اس کے اس تغیر پر بہت مسرور ہوگی اور اس کی آغوش اُس کے لئے کھلی ہوگی، لیکن اس کے حیرت کی انتہا نہ رہی، جب کلکتہ پہونچنے کے بعد اس کو بجائے مس ہلن کے اس کا ایک خط ملا جس میں اس نے بہت افسوس ظاہر کیا تھا اور ایک نہایت اہم ضرورت سے دارجلنگ چلے آنے کی معذرت کی گئی تھی۔

اس نے فوراً وار جلنگ تار دیا اور اسی وقت وہاں روانہ ہوگیا۔ لیکن جب وہاں پہونچکر ہوٹل کے منیجر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ دو گھنٹہ قبل مس ہلن ہوٹل چھوڑ چکی ہیں لیکن اس کے نام ایک تحریر دے گئی ہیں اس میں لکھا تھا :-

"تیتری کا تعاقب آسان نہیں، جنگل میں اس کو تلملاتے ہوئے دیکھنا یقیناً پر لطف منظر ہے، لیکن آپ کو نہیں معلوم کہ جس تیتری پر آپ قابو حاصل کرنا چاہتے ہیں اس تک دسترس حاصل کرنے کے پہلے سر دینا ضروری ہے"

یہ تحریر پڑھکر جو حالت یوسف کی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہر شخص اپنی جگہ کر سکتا ہے، وہ غالباً اس خط کو دیکھ کر فوراً واپس ...... جاتا اگر وقت ہوتا لیکن، اس نے کچھ تو اس خیال سے کہ انتظار کرنا ضروری ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ ہوٹل کے لوگ اس کو سبک نہ سمجھیں، حکم دیا کہ اسباب کسی کمرہ میں پہونچا دیا جائے اور خود بھی وہاں پہونچکر اس فکر میں مستغرق ہوگیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے

باقی ــــــــــــ باقی

نیاز

سفرنامہ اندلس

مرتبہ عالیجناب قاضی ولی محمد صاحب سکریٹری اسٹیٹ کونسل

جسمیں مکمل دیار و امصار۔ قصبات و حصون۔ میدان جنگ وغیرہ کے چشم دید تاریخی حالات مصنف ممدوح الشان نے ۱۹۲۴ء میں طولانی سیاحت کر کے قلمبند کئے ہیں اور جسمیں قرطبہ۔ غرناطہ۔ اشبیلیہ۔ بطلیوس۔ بلنشیہ۔ مرسیہ۔ برشلونہ۔ طلیطلہ۔ شلب۔ وادی الحجارہ جبل طارق۔ جزیرۃ الخضرا۔ ارجونہ۔ سرقسطہ۔ قلعہ۔ باجہ۔ طنجہ۔ ثغر الصغیر وغیرہ کے مفصل حالات معہ مکمل تصاویر عکسی و نقشہ جات آثار اسلامی مثل مساجد۔ قلعہ جات پل۔ محلات۔ منارہ جات۔ پن چکی۔ زنانہ و مردانہ لباس مسلمانان اندلس۔ زیورات۔ الحمرا۔ القصر الطارق قصر جعفریہ۔ مسجد قرطبہ۔ مدینۃ زہرا قابل دید ہیں۔

کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ضخامت ۵۰۴ صفحات۔ عبارت دلچسپ و دلکش اور حالات تاریخی و جغرافیائی میں نہایت صحت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر ایک روز کے مطالعہ کے بعد ناپسند ہو تو واپس کر دینے پر بعد منہائی محصول ڈاک باقی قیمت واپس کر دیجاتی ہے قیمت آٹھ روپے کلدار محصول ڈاک وغیرہ چودہ آنے۔ اس قدر تصاویر آج تک کسی اردو کتاب میں شائع نہیں ہوئیں۔

مصنف ممدوح الشان سے طلب کیا جا سکتا ہے

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(ملاحظہ ہو نگار ماہ فروری سنہ ۱۹۲۸ء)

اسلامی ہندوستان کی مضبوط ترین جائے پناہ شمال مغربی حصہ ہے اور وہاں اسلام کی حالت مایوس کن نہیں ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تباہی کے قریب آ لگا ہے۔ ذہنی لحاظ سے وہ اپنے ہندو ہمسایوں کے مساوی ہیں۔ مگر اخلاقی لحاظ سے وہ ان سے اعلیٰ ہیں اور وہ ابھی تک یہ بات بھولے نہیں کہ زمانۂ حال تک سلطنتِ ہندوستان کا انتظام ان کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ اپنے زوال کے متعلق یہ رائے نہیں رکھتے کہ وہ اس کے مستحق تھے یا یہ کہ وہ لاعلاج ہے۔ تاریخی حیثیت سے وہ تاتاری، ایرانی اور افغانی فاتحین کی اولاد ہیں جنھوں نے مختلف زمانوں میں شمال مغربی حصہ سے ہندوستان پر حملے کئے یا ان نومسلموں کی اولاد ہیں جو اچھوت سے مسلمان بنائے گئے تھے۔ چند شریف گھرانوں کے سوائے اُن کی نسل خالص نہیں رہ سکی لیکن ان کے مولد کی روایات جوں کی توں قائم ہیں اور یہ ان کی کمزوری اور طاقت دونوں کا باعث بنی ہوئی ہیں، طاقت تو اس لئے کہ ان کے ذریعہ وقار اور عزت کا ایک معیار قائم ہو جاتا ہے جو ہر سوسائٹی کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے اور کمزوری اس لئے کہ ان کی وجہ سے وہ زندگی کے معمولی پیشوں کو حقارت سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

شمالی ایشیا سے جو اسلامی اقوام اٹھی ہیں ان کی عام بڑائی فتح کا غرور ہے اور ہندوستان کے مسلمان اس لحاظ سے مستثنیٰ نہیں کئے جا سکتے۔ مغلوں نے کبھی تجارت کی جانب رغبت نہیں کی بلکہ وہ آباد ہونے کے بعد سرکاری ملازم ہو گئے خواہ وہ ملازمت شہری ہو یا فوجی ان کی نسلوں میں اب تک یہی غرور چلا آ رہا ہے۔ ہندوستان میں ان پر مصائب کے پہاڑ یکے بعد دیگرے ٹوٹے۔ مرہٹوں کی لڑائیوں سے تنگ آ کر انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے اتحاد کر لیا اور اس طریقہ سے سلاطین مغلیہ موخر الذکر کے زیر اقتدار آ گئے اور بالآخر جب دہلی کی شہنشاہیت اس میں جذب ہو گئی تو حکومت کے اختیارات تمام و کمال مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں رہے، یہ تبدیلی یکقلم وجود میں نہیں آئی بلکہ آہستہ آہستہ جیسا کہ جدید نظام کا نفاذ ہوتا رہا ہے۔ جن اشخاص پر سب سے پہلے اس کا اثر پڑا وہ مالکان اراضی تھے۔ ایک خاص قانون اراضی کے ذریعہ تمام اصحاب جائداد سے ان کے قبالے طلب کئے گئے اور مسلمان جن میں اکثروں کے پاس تحریری اجازت نامے نہ تھے، اپنی وسیع جائدادوں سے محروم کر دئے گئے اور اس طرح قلاش رہ گئے۔ فوجی ملازمتوں میں اُن کیلئے میدان موجود نہ تھا اس لئے کہ بہت بڑی حد تک دیسی افواج کو اڑا دیا گیا تھا۔ اور سب سے آخر میں چونکہ اس قانون کے ذریعہ سرکاری زبان فارسی سے انگریزی قرار دیدی گئی تھی اس لئے شہری ملازمتوں میں بھی ان کی نمایاں حیثیت بالکل جاتی رہی مسلمان اب تک ہندوؤں سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ بڑھے ہی ہوئے تھے کیونکہ اردو انکی مادری زبان تھی اور فارسی ان کی کلاسیکل زبان تھی۔ لیکن

انگریزی میں وہ بہت پیچھے تھے۔ جو تجارتی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور اس لحاظ سے تمام تعلیم یافتہ ہندوؤں کی وہ زبان سمجھی جاتی تھی۔ مزید براں انگریزی کی تحصیل اسکولوں کے سوائے اور کہیں ممکن نہ تھی اور مسلمان اپنے بچوں کو وہاں بھیجنے کے یوں مخالف تھے کہ اس سے لامذہبی پھیلتی ہے۔ لہذا ان کی ملازمت کے ذرائع ہر طرف سے محدود ہو گئے اور اس کا قدرتی نتیجہ افلاس کی شکل میں نکل رہا ہے جو روز بروز ترقی پر ہے۔ ۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت نے جس نے اودھ اور دہلی میں خاص اسلامی صورت اختیار کر لی تھی، انگریزی حکومت کو مسلمانوں سے کلیتہً بدظن کر دیا جس کا خمیازہ انہیں بعد میں مادی نقصان میں اٹھانا پڑا +

ساتھ ہی یہ مسلمہ امر ہے (اگرچہ مجھے اس کی پوری پوری تشریح معلوم کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا) کہ شمالی ہندوستان کے مسلمان بلحاظ تعداد بہت سرعت کے ساتھ ترقی کرتے رہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ اسکی وجہ یہ ہو کہ ادنیٰ ذاتوں کے ہندو مسلمان بن جاتے ہیں یا ممکن ہے کہ دوسرے اسباب ہوں، لیکن یہ یقینی امر ہے کہ اگرچہ قدیم شمار کے حساب سے ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد تقریباً تین کروڑ تھی اور حال میں ڈاکٹر ہنٹر نے ان کا اندازہ چار کروڑ کیا ہے لیکن آخری مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد ۵ کروڑ ہے اگرچہ ہندوستان کی عام مردم شماری میں اسی نسبت سے اضافہ نہیں ہوا۔ لہذا اب ہم شمالی ہندوستان میں جس غیر اطمینان بخش صورت حالات سے دوچار ہو رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو مسلمانوں کی آبادی رو بترقی ہے اور دوسری طرف وہ کم خوشحال ہوتے جا رہے ہیں دوسرے یہ کہ یہ قوم اگرچہ فطری طور پر نظم و نسقِ سلطنت کے قابل ہے تاہم اسے انتظام ملک میں شریک نہیں کیا جا سکتا، تیسرے یہ کہ یہ وہ قوم ہے جو اپنے مصائب کو ان غیر موافق حالات کا نتیجہ سمجھنے میں حق بجانب ہے جنھیں امپیریل گورنمنٹ نے ان پر عائد کر دیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ شمالی ہندوستان کے مسلمان غیر مطمئن حالت میں ہیں اور بے چین ہیں اور واحد سوال یہ رہ جاتا ہے کہ انکی طاقت جس میں تباہی کی مایوسی کا احساس بھی شامل ہے کس مصرف میں آئیگی۔ اسکے دو مصرف ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ اس سے اپنی اور عام بھلائی متصور ہو یا وہ جس سے اپنا اور عام نقصان ہوتا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ امر ہندوستان کے موجودہ حکمراں کے حیطۂ اختیار میں ہے کہ وہ مسلمانوں کی طاقت کو اول الذکر مصرف میں خرچ کریں اور موخر الذکر مصرف سے ان کی توجہ کو ہٹا دیں +

جو اصحاب ہندوستان میں امن و امان قائم رکھنے کے ذمہ دار ہیں انہیں معلوم ہوگا کہ خود ملک کے اندر اور اُس کی سرحد پار ایسے افرات کام کر رہے ہیں جو اس امن و اماں کے مخالف ہیں۔ مجھے روسی حملہ کا خطرہ نہ کبھی رہا ہے اور نہ میں اس کا قائل ہوں اگر اس حیثیت سے نگاہ ڈالی جائے کہ روس ہندوستان کا دشمن ہے، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے ضرر دشمن ہے اور رہیگا۔ اور میں ہندوکش یا اصلی سرحد تک اس کی آمد کو اطمینان کیساتھ دیکھتا بشرطیکہ یہ ناممکن ہوتا کہ وہ یہاں دوست کی حیثیت سے کبھی نہیں آ سکتا لیکن دوست کی حیثیت سے میں اس سے خائف ہوں۔ اگر ہماری خود غرضانہ حکومت کے نظام میں (جو ہندوستان کے فائدہ کے بجائے خود ہمارے فائدہ کے لئے قائم ہے) کسی قسم کی تبدیلی نہ کی گئی یا اگر ہم باشندگانِ ہند کو بالآخر سیلف گورنمنٹ (سوراج) کا یقین دلانے سے انکار کرتے رہے جس کے باعث وہ اطمینان کے ساتھ اپنی امیدوں کے پورا ہونے کے موقع کا انتظار کرنے کے قابل ہو جائیں گے

اگر ہم ان کے ساتھ محکوم دشمنوں کا سا سلوک روا رکھیں گے یا انہیں اپنے کام کے لئے غلام بنا رکھیں گے۔ یا ایسے اشخاص کے طور پر جو حقوق سے معرا ہوں، تو یہ یقین کر لینا چاہئے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر تمام بیرونی دنیا ہندوستان کی دوست بن جائیگی اور روس چونکہ سب سے قریب ہے، اس لئے وہ سب سے بڑھکر دوستانہ روش اختیار کرلیگا +

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ حالات میں زار کی حکومت بہت کچھ پیش کر سکتی ہے اور اگر انکار کرنے سے پیشتر باشندگان ہند اسپر اچھی طرح سے غور و خوض کرلیں تو یقیناً وہ معاف کئے جاسکتے ہیں روسی مشرقی ہے اور اغلب گمان یہ ہے کہ غیر ہمدرد سرکاری انگریز کے مقابلہ میں اس کا آقا بن جانا کم نفرت انگیز ہوگا۔ لیکن یہ بھی یقین سے بہت بعید ہے کہ ہندوستانی توقعات کے روبرو وہ اپنے تئیں آقا کے طور پر پیش کریگا۔ ممکن ہے کہ وہ نجات دہندہ کی حیثیت سے جلوہ گر ہو اور یہ کہے کہ میں تم کو انگریزی مالی نظام کے مہلک پنجہ سے رہائی دلانے آیا ہوں اور یہ کہ میں آزادی، کفایت تجارتی اور مالی ترقی کا حامی رہونگا کون کہہ سکتا ہے کہ روس کسی جدید تجارتی معاہدہ کے بدلہ میں ہندوستان کو کامل ہوم رول عطا نہیں کریگا اور اور اس طریقہ سے ہماری محبت کو زائل نہیں کریگا؟ ہندوستان کو اس امر کی ترغیب دینا کہ اسے مجوزہ تبدیلی سے فائدہ پہنچیگا کچھ مشکل نہ ہوگا اور انگریز ہونے کی حیثیت سے مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ ہر امر میں اسے نقصان رہیگا۔ بہر صورت یہ ممکن ہے کہ لوگ یہ سمجھ کر اگر برا سے برا بھی نتیجہ نکلا تو موجودہ بدترین حالت سے تو برا نہ ہوگا۔ تبدیلی کی خواہش کو اچھی نظر سے دیکھنے لگ جائیں +

اسوقت اگر کوئی قوم ایسی ہے جس پر اس قسم کے دلائل کا سب سے زیادہ اثر ہو سکتا ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ موجودہ نظام اُن کیلئے تباہی انگیز ہے حالانکہ سرحد سے تھوڑے ہی فاصلہ پر اُن کے بھائی بند ہیں جو ابھی تک حکومت کر رہے ہیں، اس سے بڑھکر اور زیادہ قدرتی امر کونسا ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے امداد کے متوقع ہوں یا اُن سے بڑی کی زیادہ زبردست قوم سے مدد کے طالب ہوں بشرطیکہ وہ اپنے تئیں اُنکا مذہبی محافظ ظاہر کرے۔ گزشتہ چند سال کی ہماری سیاسی حماقت نے اس بات کو پہلی مرتبہ ممکن کر دکھایا ہے اور جو بات کہ گزشتہ نسل میں موہوم نظر آتی تھی وہ اب عملاً خطرہ ثابت ہو رہی ہے +

قدیم عثمانی اتحاد میں خواہ کچھ ہی خرابی کیوں نہ ہو، اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہندوستانی مسلمان اسے بیحد پسند کرتے تھے۔ اور اُسے دنیائے اسلام اور انگلستان کی دوستی کی علامت تصور کرتے تھے اس کی جو ہمدردی کو اسلام کے سب سے بڑے دشمن کی قابل رشک حیثیت حاصل ہوئی۔ اسی خیال سے جنگِ افغانستان کو کم سے کم ابتدائی منازل میں پسند کیا گیا کیونکہ اس سے شمالی طاقت کی شکست مراد لی گئی تھی۔ اُسے صرف بعد میں بُری نظر سے دیکھا گیا۔ لیکن معاہدۂ برلن کے مشکوک انتظامات، جزیرہ قبرص کا بدنام کرنے والا قبضہ اور ٹیونس کی حوالگی (جب یہ باتیں رفتہ رفتہ معلوم ہوئیں تو انہوں نے) لوگوں کے خیالات میں ہیجان پیدا کر دیا اور انہیں اس سے زیادہ سخت حوادث کے لئے آمادہ و تیار کر دیا بالخصوص جبکہ انگلستان نے مصر میں کھلم کھلا ظالمانہ روش اختیار کی +

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مسلمانان ہند نے عربی سے دوران جنگ میں ہمدردی کا اظہار کیا۔ انہوں نے سلطان کے اعلان جسمیں عربی کی بغاوت کا ذکر تھا، غلط مفہوم پیدا کرنے پر اظہار نفرت کیا اور اب گزشتہ دو سال سے یہ حالت ہے کہ روس اُنکا

ویسا دشمن نہیں رہا جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بے اعتمادی پورے طور سے موجود ہے۔ انگریزی وزارت کی وفاداری
کے مقابلہ میں انگریزی تاج کی وفاداری ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلی تھی لیکن یہ امر بالکل یقینی ہے کہ جنگ کے بعد سے مصر کی تباہی کی تاریخ
اور گورنمنٹ کے بظاہر اس ارادہ نے کہ جو شے اسلام کے لئے مفید طلب ہو اسے تباہ کر دیا جائے، چاروں طرف انقلاب پیدا کر دیا ہے
قسطنطنیہ پر جب سے زوال طاری ہوا ہے دنیائے اسلام ایک حامی کی متجسس رہی ہے اور اگر انگلستان نے اس عہدہ کے قبول
کرنے سے انکار کر دیا تو یہ عہدہ کسی دوسری عیسائی طاقت کو دیدیا جائیگا ◆

میرے خیال میں یہ طریقہ وہ ہے جس کے ذریعہ مسلمانان ہند اپنی بہت سی برائیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں علاوہ ازیں
ایک اور طریقہ بھی ہے جو میرے خیال میں زیادہ امید افزا ہے (اور یہ امر ابھی تک ہماری گورنمنٹ کے اختیار میں ہے کہ وہ مسلمانوں کو
اس کے انتخاب پر مائل کرے) تین سال ہوئے میں نے اپنی کتاب "مستقبل اسلام" میں ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات کی
ترجمانی کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ ہز مجسٹی ملکہ معظمہ سے سلاطین مغلیہ کا شاہی لقب اختیار کر لینے کے بعد سے کیا کیا توقعات رکھتے
ہیں یا بالفاظ دیگر سلطنت مغلیہ کا جانشین ہونے کی حیثیت سے ہز مجسٹی کے فرائض ہندوستانی مسلمانوں سے کیا ہیں۔ اور جب گزشتہ
موسم سرما میں میں ہندوستان میں تھا، تو مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی تھی کہ میرا بیان بالعموم پسند کیا گیا۔ ہندوستانی مولویوں کی
جنہیں شیعہ اور سنی دونوں شامل تھے، یہ رائے تھی کہ ہز مجسٹی نے قیصر ہند کا لقب اختیار کر لینے سے مسلمانوں کی جانب ایک ایسی
قانونی ذمہ داری اختیار کر لی ہے کہ جس کی رو سے وفاداری کے عوض میں خاص حفاظت کے مستحق ہو گئے ہیں بالخصوص ایسے
معاملات میں جنکا تعلق ان کے مذہبی اوقاف، ان کی تعلیمی ترقی اور انتظامات متعلقہ حج سے ہو، اور انہوں نے اردو میں میری کتاب
کا ترجمہ بھی شائع کر دیا تھا ◆

مذہبی اوقاف کے بارے میں میں نے ہر جگہ یہی شکایت سنی کہ ان کا غلط مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جس وقت
اراضی ملکیت کا مسئلہ درپیش تھا تو اسوقت بہت سی زمینیں اس عذر پر ضبط کر لی گئیں کہ قبالوں کے اندراجات درست حالت میں
نہیں تھے۔ بنگال میں محسن ٹرسٹ کے مقدمہ کا اگرچہ کسی حد تک معقول فیصلہ کر دیا گیا ہے تاہم اس کے بیان کرنے کی ضرورت یوں پیش
آئی ہے کہ گورنمنٹ نے اس کی ناانصافی کو اب تسلیم کر لیا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس قسم کے بیشمار مقدمات میں ناانصافی برتی
گئی ہے۔ اس خاص مقدمہ میں ایک مالدار مسلمان نے بہت سی جائداد صاف طور پر وقف کر دی تھی لیکن گورنمنٹ کئی سال سے
اس کی آمدنی کا روپیہ اسلامی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے بجائے ہندوؤں کی تعلیم پر صرف کرتی رہی اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لیا گیا
ہے کہ مجھے بار بار یہ اطلاع دی گئی ہے کہ جائداد کا کافی حصہ ابھی تک گورنمنٹ کے قبضہ میں ہے اور یہ کہ اگر اس کا صحیح استعمال
کیا جائے تو تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کی اہم ضروریات اسی کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر
لیٹنر نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ صرف پنجاب میں لاکھوں روپے کے وقف کا سرکاری طور پر غلط استعمال کیا جاتا ہے ◆

Leitner

حج کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ حاجیوں کو لیجانے کے انتظام کو باقاعدہ بنانے اور دوران سفر میں انکی حفاظت کی سخت ضرورت ہے۔ گزشتہ تین سال میں بہت کچھ اصلاح عمل میں آچکی ہے لیکن وہ بہت کم ہے اور ہندوستانی مسلمان اس قسم کی حفاظت کو امپیریل گورنمنٹ کا فرض منصبی خیال کرتے ہیں، بالخصوص اس وجہ سے کہ قسطنطنیہ اور جدہ کے تکلیف دہ قوانین کے باعث برائیاں روزبروز زیادتی پر ہیں +

تعلیم کے متعلق مسلمانوں کی پوزیشن حسب ذیل ہے :-

انگلستان کے کیتھولک باشندوں کے مانند انہیں اپنے مذہب سے بیحد شغف ہے اور وہ ہمیشہ اس کے لئے متفکر رہتے ہیں کہ جس برکت کے وہ حصہ دار ہیں وہ اپنی پاکیزہ حالت میں ان کے بچوں تک پہنچ جائے اور انکا خیال یہ ہے کہ جو دنیاوی تعلیم حکومت کی جانب سے دی جاتی ہے وہ ان ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے۔ ہندوستان میں ایک استاد کو اپنے شاگرد سے جو گہرا تعلق ہوتا ہے اس کی مثال کسی دوسرے ملک میں نہیں ملیگی اور مسلمان یہ دیکھ رہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں اساتذہ بالعموم یا تو انگریز ہیں یا ہندو کر مسلمان اسی وجہ سے علٰحدہ رہتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تعلیم کے معاملہ میں وہ ہر قسم کی سرکاری امداد سے محروم ہوگئے ہیں اور جو لوگ مذہب کی سختی سے پابندی کرتے ہیں وہ تمام سرکاری تعلیم سے غیر مستفید رہتے ہیں۔ بلاشبہ ان کے مخالف یہ کہتے ہیں کہ یہ محض تعصب اور خواہ مخواہ کی مخالفت ہے۔ وہ غیر وفاداری کے باعث اس سے متمتع نہیں ہوتے اور یہ کہ وہ ترقی کے خواہشمند نہیں ہیں۔ لیکن پہلے زمانہ میں خواہ کچھ ہی حالت کیوں نہ ہو میں وثوق کے ساتھ کہسکتا ہوں کہ اس بیان میں ذرا سی بھی صداقت نہیں ہے۔ ہندی مولویوں نے جو نقطۂ خیال قائم کیا ہے میرے خیال میں از روئے انصاف اس پر نکتہ چینی نہیں کیجا سکتی اور یہ بات دوسری ہے کہ اس نظریہ کو پیش کیا جائے کہ تمام مذاہب خراب ہیں لہذا حکومت کا فرض ہے کہ ان کی تعلیم کو کم کرے میں خیال نہیں کرسکتا کہ حکومت نے اس نظریہ پر اپنے طرز عمل کی بنیاد رکھی ہو گر عملاً مسلمانوں کی تعلیم پر انکی پالیسی کا بیحد اثر پڑرہا ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے کہ اگر امپیریل گورنمنٹ چاہے تو محافظ کی حیثیت سے دخل دے سکتی ہے۔ مسلمان اس کارروائی سے بیحد خوش ہوجائیں گے اور اسے اپنی وفاداری کے لئے باعث عزت قرار دیں گے +

آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امپیریل گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ کو پورے جوش کے ساتھ ہاتھ میں لے اور جہاں کہیں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہو وہاں اس کا خیال رکھے اُن کی تعلیم کی ترقی تجارتی اور صنعتی معاملات میں انکی ہمت ہمت افزائی اور بیرون ہند مقامات میں ان کے مذہبی مفاد کی وفادارانہ حفاظت وہ امور ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے مسلمان رعایا کو انگریزی تاج پر از سر نو اعتماد حاصل ہوجائیگا۔ ان کی جانب سے غفلت برتنا اور اسلام کو نقصان پہنچانے کی موجودہ خراب پالیسی پر عملدرآمد رکھنا انہیں اس حد تک غیر وفادار بنادیگا کہ پھر وہ وفادار نہ بن سکیں گے۔ اصلاح کا وقت ابھی باقی ہے اور اس لئے اسپر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ بہت جلد وہ زمانہ آجائے جبکہ معاملہ بالکل ہاتھ سے نکل جائے اسلئے کہ مسلمان اپنی تاریخ کے نازک ترین زمانہ میں سے گزر رہے ہیں اور انکی جائز شکایات کی طرف سے بے اعتنائی برتنے میں ہم گویا اُن

شکایات کو بڑھنے کی اجازت دے رہے ہیں جو کسی وقت ہمیں سخت پریشانی میں ڈال دیں گی۔ جواب میں نے تین سال پیشتر کہی تھی دہرانے کی اجازت چاہتا ہوں یعنی یہ کہ انگلستان کا فرض ہے کہ جس امانت کو اس نے قبول کیا ہے اسے ایشیا کی انجانیوں کو ترقی دیکر تکمیل تک پہنچائے کہ ان کی تباہی کے درپے ہو جائے وہ اسلام کو تباہ نہیں کرسکتا اور نہ اس سے قطع تعلق کرسکتا ہے لہذا خدا کا نام لیکر اسے اسلام کو ہاتھ سے پکڑ کر نیکی کے راستہ پر ڈالدینا چاہئے"۔ باوجود اس کے کہ مصر میں قوت کو غلبہ حاصل ہو چکا ہے۔ پھر بھی یہی طرز عمل نہایت دانشمندانہ اور قابل تحسین معلوم ہوتا ہے+

بحیثیت مجموعی انگریزوں کے ماتحت ہندوستان کے ذہنی اور مذہبی پہلو (جیسا کہ میں نے انہیں پایا) نہایت امید افزا ہیں اور مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ ہماری حکومت کے سوائے اور کسی حکومت میں انہیں یہ ترقی میسر نہیں آسکتی تھی+

ﻟﮧ خوشی کی بات ہے کہ جن امور کی یہاں پر سفارش کی گئی ہے کہ وہ انگلستان کے فرائض متعلقہ اسلام میں داخل ہوگئے ہیں اور ہمارے حکام نے گزشتہ دو سال سے عملدرآمد شروع کر دیا ہے اور ہم انگریزی پالیسی کا جزو ہوگئے ہیں۔ لیکن یہ امر قابل افسوس ہے کہ ہندستان میں اس کے متعلق جو خیال کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ صرف ہندوؤں کی ۱۹۱۹ء کی تحریک سوراج کو دبانے کی غرض سے مسلمانوں کو وفاداری پر ابھارا جا رہا ہے۔ ض-ا-ب-ی حلے

ڈائری کا ایک ورق

(مسلسل)

اشب آتشیں روے گرم زند خوابہاست
کز بش تو اہر دم ورشرر فشانیہاست

(غالب)

شیریں، اس قسم کی حسین عورتوں میں تھی جن کے چہرہ سے بہ نسبت حسن ظاہر کے حسن فطرت زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور دیکھنے والا بجائے مسحور ہونے کے مرعوب ہو جاتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ایک عمیق چشمۂ سرمدی تھیں جن میں دلربائی سے زیادہ معصومیت اور رعنائیت سے زیادہ روحانیت پائی جاتی تھی، اس کی صورت دیکھنے کے بعد ایک شخص ایسا محسوس کرتا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے جب اس سے گفتگو کی جاتی ہے تو وہ اس طرح جواب دیتی جیسے کسی بعید فاصلہ سے کھینچکر اپنے آپ کو واپس لائی ہے اور جواب دیکر پھر وہیں چلا جانا چاہتی ہے۔ ہر چند جب افضال سامنے ہوتا تو اس کا بہترین مشغلہ سوائے اس کے کچھ نہ ہوتا کہ وہ اس کی صورت کو دیکھا کرے لیکن اس وقت بھی اس کا انداز کچھ کھویا ہوا سا رہتا اور ایک نامعلوم جستجو کس وقت بھی اس کی چتون سے ظاہر ہوتی اس نے جب اپنے ہات کے بنائے ہوے نقوش مجھے دکھائے تو میں نے ان کے اندر بھی یہی رنگ غالب پایا اور کوئی ایک نقش بھی اس کا ایسا نظر نہ آیا جس کو میں "خیال بیدار" کہہ سکتا۔ مناظر سے اُسے خاص دلچسپی تھی لیکن وہ بھی اس قسم کی :- ساکن سطح آب، سنسان صحرا، خاموش شب ماہ، برف پوش چوٹیاں۔ ذی حیات چیزوں کی تصویریں بنانے سے اُسے کم دلچسپی تھی اور کبھی ضرورتاً منظر کے ماحول کے لحاظ سے بناتی بھی تو اس میں ایک حزن کی کیفیت پیدا کر دیتی۔

اس کا ایک نقش جس کو فرانس کی اکاڈیمی نے بہت زیادہ سراہا تھا، وہ تھا جو "داستان خموش" کے عنوان سے پیش کیا گیا تھا :- صبح کا وقت تھا، طلوع آفتاب سے قبل، رنگ کے لحاظ سے صحیح معنے میں طباشیر سحر، جنگل کی ایک گلاب کی جھاڑی میں شاخ سے ٹوٹ کر گلاب کا مرجھایا ہوا پھول زمین پر پڑا ہے اور بلبل اس کے پاس مر کر سرد ہو گئی ہے، منظر کے ماحول میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کر دی گئی ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ساری کائنات اس حادثہ کے دیکھنے کے لئے جھکی پڑتی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا "کہ آپ کا خیال اس نقش کی طرف کیونکر منتقل ہوا؟" افضال بھی موجود تھا، وہ شیریں کو بہت دق کیا کرتا تھا فوراً بول اٹھا "جس طرح اور بہت سی غیر حقیقی باتوں کی نمائش کے لئے مردتاً خیال کو منتقل ہونا پڑتا ہے"۔ شیریں جو اس کی اس قسم کی باتوں کی عادی تھی مسکرائی اور بولی کہ "یہ آپ نے بالکل صحیح فرمایا کیونکہ اس نقش میں اگر کوئی جھوٹ حصہ ہو سکتا ہے تو صرف بلبل کا

جان دے دینا۔ پھول کا مرجھا جانا تو کوئی عجیب بات نہیں ہے، اور اس حصہ کو خلاف واقعہ دکھانے میں میری مصلحت سوائے اس کے اور کیا ہوسکتی تھی کہ مدعیان محبت کے فریب پر پردہ ڈال دوں، ورنہ شاید آپ کو تکلیف ہوتی"

شیریں بہت ذہین تھی اور میرے نزدیک خطرناک حد تک ذہین، لیکن خیریت یہ تھی کہ اس کا اجمال ایک ایسی معصوم حقیقت تھا کہ وہ اس کی ذہنیت سے پیدا ہونے والے خطرات کو فوراً بھلا دیتا تھا اور انسان پھر بدستور خواب عشق میں مبتلا ہوجاتا تھا۔

شیریں اور افضال کی شناسائی سب سے پہلے پیرس میں ہوئی اور وہیں وہ اس درجہ شدید و وسیع ہوگئی کہ وہاں سے واپس آنے کے بعد بھی دونوں جدا نہ ہوسکے۔ شیریں بمبئی میں ایک بڑی جائداد کی تنہا مالک تھی اور سوسائٹی میں نہ صرف اپنی دولت بلکہ اپنی قابلیت و شائستگی کے لحاظ سے بھی خاص عزت رکھتی تھی۔ افضال یوں تو بظاہر صرف سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتا تھا، لیکن حقیقتاً وہ اس پر مالکانہ اقتدار رکھتا تھا اور اس کا علم تقریباً سبھی کو تھا۔

یقیناً افضال ایک خوشرو انسان تھا اور تمام وہ دلربا ادائیں جو ایک حسن مہذب کو مالوف کرنے کے لئے ایک مرد میں ہونی چاہیئے اس میں موجود تھیں، لیکن پھر بھی یہ بات ہر شخص نہیں سمجھ سکتا تھا کہ شیریں نے اسی کا انتخاب کیوں کیا۔ جب کہ اسی طرح کے بلکہ اس سے زیادہ یہ ظاہری خصوصیات رکھنے والے انسان اور بہت سے اس کو مل سکتے تھے ——— میرے ایک ہفتہ کے مطالعہ نے مجھے بتایا کہ شیریں، افضال سے زیادہ اس کی ذہانت کی دلدادہ تھی اس کے تیکھے پن کی فریفتہ تھی، وہ اس کے جلد برہم ہوجانے کی صلاحیت پر مٹی ہوئی تھی، اور چونکہ وہ خود ایک متامل و خوابیدہ فطرت رکھتی تھی اس لئے وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُسے چونکاتا رہے، جگاتا رہے، اور افضال جو غالباً اس راز کو سمجھ گیا تھا پیدا ہی ہوا تھا چھیڑ اور شرارت کے لئے ———

شیریں کا معمول تھا کہ وہ ایک بات کا جواب دیکر کچھ سوچنے سی لگجاتی اور دیر تک اس کی یہی حالت رہتی، لیکن اس وقت افضال کے نہتنفرہ کا جواب دینے کے بعد بھی وہ آمادۂ گفتگو تھی اور اس کے ساتھ وہ صناعانہ جذبات جو زیادہ تر دماغ ہی کی فضا میں بند رہتے ہیں، آنکھوں کی چمک سے، لبوں کی ارتعاش سے، چہرہ کی سرخی سے، جسم کی ہلکی بےچینی سے ٹپکے پڑتے تھے

افضال کو جواب دینے کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئی اور بولی کہ ایک نقش دیکھنے کے بعد سب سے زیادہ دلچسپ سوال ایک نقاش کے لئے یہی ہوسکتا ہے کہ اس سے ماخذ نقش، رفتار خیال، انتقال فکر کا سوال کیا جائے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ایک نقاش کے نقوش، اوراق حیات ہیں، داستان زندگی ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خطوط نقش کے ذریعہ سے وہ دوسروں کا فسانہ بیان کرنا چاہتا ہے اور ایسی صورت میں بعض اوقات دیکھنے والوں کو نقاش کی فطرت کے سمجھنے میں غلطی ہوجاتی ہے۔ آپ نے جس نقش کو پسند کیا ہے وہ مجھے پسند نہیں کیونکہ اس میں بلبل کا وجود میرے ذوق کے منافی ہے، مرجھائے ہوئے پھول کے سامنے اس کا مردہ حالت میں پایا جانا گویا نقاش کے اس خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ نہ عشق حسن کی مواصلت کی تاب لا سکتا ہے اور نہ حسن پایان عشق سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ کائنات کی توجہ گویا اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ ہر چند یہ حادثے نہایت معمولی ہیں لیکن حقیقت کی لحاظ سے کائنات کو ہلا ڈالنے والے ہیں خیال بھی پامال ہے اور تصویر بھی......

اس کا اظہار بھی معمولی بات ہے۔ میں اگر اکاڈیمی کے بعض ممبروں کے خیال سے آگاہ ہو کر یہ منظر نقش میں پیدا کرنے پر مجبور نہ ہوتی بلکہ آزاد ہوتی تو میں وہ نقش پیش کرتی جس کو میں نے "انتظار" کا عنوان دیا ہے یہ کہکر وہ اُٹھی اور الماری سے ایک تصویر نکال لائی جس کا یہ منظر تھا :۔

فضا ابر آلود ہے شام کی تاریکی کافی پھیل چکی ہے اور ایک نوجوان لڑکی اپنے جھونپڑے کے دروازے کھڑی ہوئی ہے ابر کے ٹکڑوں اور بجلی کی چمک کو خوف و دہشت کے ساتھ دیکھ رہی ہے، بجلی کی نورانی لکیروں اور بادلوں کے ٹکڑوں سے ملاکر اس لڑکی کے دھندلے نظر پر ایک نہایت ہی ہلکی سی مٹی ہوئی صورت اس شخص کی پیدا کی گئی ہے جس کے انتظار میں وہ باہر نکل آئی ہے اور اس کے چہرہ سے گویا یہ خیال ٹپک رہا ہے کہ "کیا اب بھی وہ نہ آئیں گے اور نہ آئے تو یہ طوفانی رات کیونکر بسر ہوگی ـــــ

اس تصویر کو دیکھکر میں متحیر رہگیا۔ شیریں نے اس قدر شدید تاثرات ذرا سے صفحۂ کاغذ میں بھر دئے تھے کہ میری آنکھیں نم آلودہ ہوگئیں اور میں اس کی طرف سے نگاہ ہٹاکر بالکل خاموش بیٹھ گیا۔ اس نے میری حالت کو سمجھکر فوراً موضوع گفتگو بدلدیا اور افضال سے مخاطب ہوکر بولی کہ آپ کو یاد نہیں آج شام کو ماتھران چلنا ہے، مہربانی کرکے سر فضل کریم بھائی کو ٹیلیفون کرکے دریافت کر لیجئے کہ جعفر کمپنی کے مسئلہ میں کل میری حاضری کی تو ضرورت نہ ہوگی"۔ افضال جو ایسے اوقات میں نہایت ہی مودب سکریٹری کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا۔ اٹھا اور نہایت ادب سے جھک کر تعمیل حکم کے لئے روانہ ہوگیا۔

افضال کی یہ خصوصیت کہ موقع و محل کے لحاظ سے وہ اپنے اوپر متضاد و متباین کیفیات نہایت کامیابی کے ساتھ طاری کر لیا کرتا تھا اس قدر عجیب و غریب تھی کہ میں اس کے اس شعور پر حیران تھا۔ اول دن جب میں نے تنہائی کی ملاقاتوں میں افضال اور شیریں کی گفتگو کو سنا تو حیران رہگیا کہ شیریں، اس کے لئے کس درجہ سراپا ایثار و سپردگی ہے اور وہ اس کے مقابلہ میں کس قدر شریر و گستاخ، لیکن دوسری صبح جب اُس نے ڈرائنگ روم میں شیریں کی ڈاک اور کچھ اور کاغذات پیش کئے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ملک معظم کے سامنے کوئی مسکا سکریٹری مودب کھڑا ہوا احکام حاصل کر رہا ہے

میں نے ایک دن افضال سے اس کے متعلق گفتگو کی تو اُس نے کہا کہ آپ نہیں جانتے آج کل کی مہذب و تعلیم یافتہ عورت کس قدر پیچیدہ معمہ ہے۔ علی الخصوص اُس وقت جب دل کا معاملہ اس کے سپرد کیا جائے کہ پھر اس صورت میں تو اسکی نگہداشت ایک ناگن سے زیادہ کرنی پڑتی ہے، شیریں پر جو اقتدار مجھے حاصل ہے، نتیجہ ہے میری چار سال کی کوشش کا اور بڑی حد تک مجھے اس پر اعتماد ہونا چاہئے لیکن باوجود اسکے بعض وقت میں، اس عورت کو بات بات کرتے دفعتہً کسی غور و فکر میں مبتلا ہوجاتے دیکھتا ہوں تو میرا دل دھڑکنے لگتا ہے اور ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب جو نگاہ مجھ پر اٹھے وہ شیریں کی افضال پر نہ ہو بلکہ ایک مالکہ کی خادم پر ہو۔ یہی سبب ہے کہ میں اس کے اس جذبۂ تفوق کی جو قدرتاً اس کے دل میں ہونا چاہئے، تسکین کرتا رہتا ہوں اور گویا اس طرح اس کو بتا دیتا ہوں کہ عورت خواہ کتنی

ہی بڑی مدعی ایثار و قربانی کی کیوں نہ ہو، لیکن میں اسپر اعتبار نہیں کر سکتا۔ آپ کو یہ سنکر غالباً حیرت ہوگی کہ اس سلئے اتنے طویل عرصہ میں انتہائی لطف و مسرت کی گھڑیوں میں بھی کبھی میرے اس طرز عمل پر کوئی تنقید نہیں کی اور ایک بار بھی اُس نے یہ نہیں کہا کہ اس رسم کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک عورت ہر وقت عورت ہی نہیں رہتی بلکہ وہ کبھی انسان بھی ہو جاتی ہے۔ اور انسان بھی وہ جو صرف جذبات کے لئے، جذبات ہی کے ذریعہ سے زندہ رہنا چاہتا ہے اور کوئی فلسفۂ حیات اس کے سامنے نہیں ہوتا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ شیریں کے سمجھنے کے لئے میں نے اپنی انفرادیت کو کس قدر ناقابل فہم بنا دیا ہے، اس میں بار بار غور و تامل ہمیشہ میری فطرت کا معمہ سمجھنے کے لئے پیدا ہوتا ہے اور جب اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوتی، تو اس میں ایک مفتوحانہ انفعال پیدا ہوتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب میرے اندر صحیح معنے میں استغنار کامل پیدا ہوتا ہے

آپ باور کیجئے کہ میری نگاہ سے اس قدر ذہین عورت نہیں گزری، خطرات قلب پر آگاہ ہو جانا اس کی ذہانت کا ادنیٰ کرشمہ ہے، لیکن خود ستائی نہ سمجھئے یہ بھی واقعہ ہے کہ مجھ سا انسان بھی اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شیریں کا وہ زمانہ جب یہ پیرس میں تھی اس کی فتوحات کا عجیب و غریب زمانہ تھا، بڑے سے بڑا انسان جو اس کے دائرۂ تعارف میں آجاتا تھا اس طرح بے بس ہو کر رہجاتا تھا جیسے جالے میں تینگا اور پھر اس کی بے اعتنائیوں، بے دردیوں کا وہ عالم ہوتا تھا کہ خدا کی پناہ وہاں کے تمام بلند طبقوں کے لوگ اس کو "قلو بطرۂ ہند" کے لقب سے یاد کرتے تھے، آپ کا وقت تو ضائع ہوگا لیکن میری اس کی اولین ملاقات کی داستان سننے کے قابل ہے وہاں عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ شیریں کو دیکھ لینا محبت کر لینا ہے اور محبت کر لینا تباہ و برباد ہو جانا" یہ تھا اس کے حسن و دلربائی کا عالم اور اسی کے ساتھ اس کی خود داری اور تمکنت کا رکھ رکھاؤ۔

میں موسیو ژوردان کا جو پیرس کا مسلم الثبوت ماہر علم الکیمیا ہے، مہمان تھا، میری اس کی ملاقات کیونکر ہوئی۔ یہ ایک اور داستان ہے، پھر کبھی سناؤنگا، بہر حال میں ژوردان کے ہاں مقیم تھا اور ایک امیر کے ہاں جو ژوردان کا قدیم دوست تھا میں بھی ایک جلسۂ رقص میں مدعو تھا۔ پیرس کی تمام بہترین سوسائٹیوں کا گویا عطر کھنچکر اس جلسہ میں آگیا تھا۔ شیریں بھی وہاں تھی اور اس شان کیساتھ کہ پیرس کی بڑی بڑی خوش وضع اور تیکھی عورتیں اسپر رشک کر رہی تھیں۔ جب اول اول صاحب خانہ نے میرا تعارف اس سے کرایا اور اس نے ہاتھ ملایا تو انگلیوں کے مس ہوتے ہی اس نے اپنا سب سے پہلا مشہور حربہ مجھپر صرف کیا، اس کی نرم و نازک انگلیاں میری ہتیلی سے اس طرح آہستہ آہستہ گزر رہی تھیں گویا وہ کوئی پیام سنا رہی ہیں اور اس کی نگاہیں اس قدر متین، رحم طلب اور روادارانہ انداز سے میری نگاہوں سے مل رہی تھیں جیسے انھوں نے کوئی اپنی دیرینہ آرزو پالی ہے۔ میں نے اس کو محسوس کیا اور تھوڑی دیر تک یہ حالت رہی جیسے سیلاب میں کسی کے قدم اُکھڑ جائیں، لیکن چونکہ میں پہلے ہی اُس کی ان مار رکھنے والی اداؤں کا ذکر سُن چکا تھا اور یوں بھی کافی تجربہ اس طرح کی دلربائیوں کا رکھتا تھا، اس لئے جب تک وہ اس سحر کاری میں مصروف رہی میں اپنی حالت سے اسکو یہی یقین دلاتا رہا کہ اس کا حربہ خالی نہیں گیا، لیکن جب اس یقین کے بعد اُس نے اپنے پندار میں مجھے نیم بسمل کر کے ہاتھ سے ہاتھ اور نگاہ سے نگاہ جدا کر کے منہ موڑا ہی تھا کہ میں ہنس پڑا، یعنی یہ میرا پہلا حربہ تھا جو میں نے اس کے خلاف استعمال کیا۔ یہ اُسکی

زندگی کا پہلا تجربہ تھا اس لئے جب اُس نے منہ پھیر کر میری طرف دیکھا، تو میں نہایت ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا اور بولا کہ معاف فرمائیے کبھی دل کا تاثر بھی ہنسی پر مجبور کر دیتا ہے خاصکر جب بیشتر ملکے قسم کا ہو اس لئے الزام مجھ پر نہیں ہے"۔ وہ کچھ دیر تک دیکھتی رہی گویا اسے اب بھی یقین نہ تھا کہ میں ہنسا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ کیا آپ مجھے اجازت دے سکتی ہیں کہ میں آپ کو رقص گاہ تک پہونچا دوں"۔ اُس نے تھوڑا سا تامل کر کے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور میں اس کو سہارا دیتا ہوا بڑھا۔ وہ خاموش تھی لیکن متفکر صورت سے، میں بھی خاموش تھا۔ لیکن عیارانہ انداز سے۔

رخصت ہوتے وقت اس نے مجھے پھر دیکھا لیکن ان نگاہوں سے جو بیک وقت نشہ بخش بھی تھیں اور جرأت آموز بھی، میں نے اسے دیکھا لیکن ان نگاہوں سے جو یکسر کیفیات سے خالی تھیں ———— اس کے بعد جلسہ کے دوران میں باوجود اس کی جستجو کے بھی میں اس سے نہ ملا اور جب اس کو کسی طرف سے آتے ہوئے دیکھا تو قصداً ہٹ گیا، اور اس انداز سے کہ وہ میرے احتراز کو سمجھ لے۔

دوسرے دن وہ خود موسیو ژدوان کے مکان پر آئی میں اس سے ملا لیکن ایک سرد خودداری کے انداز سے اور پھر ایک خاص ضرورت کا بہانہ کر کے چلا گیا۔ اس نے میری نسبت موسیو ژدوان سے بہت گفتگو کی اور جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ وہ چائے پر بلائی گئی ہے اور دوسرے دن دعوتی رقعہ بھی میرے نام کا آ گیا۔ ژدوان کو چونکہ اُس وقت بہت مصروف تھا اس لئے وہ نہ جا سکا اور تنہا مجھی کو جانا پڑا۔ شیریں کی دولت و امارت کا حال مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا لیکن اس کی جائے قیام پر جا کر مجھے اس کی پاکیزگی ذوق اور وسعت مطالعہ کا حال بھی معلوم ہوا۔ اس صحبت میں جو گفتگو اُس سے ہوئی اس کی تفصیل تو یاد نہیں مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ جب میں اُس سے رخصت ہوا ہوں تو اور زیادہ اس کے لئے معمہ بن گیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ جستجو و خلش تھی۔

اس کے بعد زمانہ گزرتا گیا، مراسم بڑھتے رہے، تکلف دور ہوا، مختلف وقت و محل کی گفتگو نے مجھے اُن کے اور ان کو میرے ذوق کے سمجھنے میں مدد دی لیکن جس حد تک رابطۂ جنسی کا تعلق ہے وہ میرے لئے چیستاں تھیں اور میں انکے لئے عقدۂ مشکل۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں میرے لئے اور مجھ میں ان کے لئے خاص مرکزیت پیدا ہونے لگی اور ان کی دلچسپیاں محدود ہو کر رفتہ رفتہ صرف میری ذات سے متعلق ہو گئیں، لیکن حالت یہ تھی کہ ہم دونوں گویا دو شعلے تھے جو علحدہ علحدہ جل رہے تھے، اور باوجود شدید تمایل کے ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے تھے۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ پہلی ملاقات کے دو ماہ بعد ہی میری خدمات ایک سکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے حاصل کر لی تھیں اور اب میں شب و روز انھیں کے ساتھ رہتا تھا۔

آپ یہ سنکر حیرت کریں گے کہ کامل چار سال اسی عالم میں گزر گئے ہیں اور میں اپنی اس رہبانیت میں خاص قسم کی لذت محسوس کرنے لگا ہوں، ادھر انکا یہ عالم ہوا کہ شوخیاں متانت میں، لہو و لعب سنجیدگی میں اور فرحت کے تمام اوقات نہایت عمیق غور و فکر میں بسر ہونے لگے۔ آپ ان کے اولین نقوش اُٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ بعد کے نقوش سے وہ کس قدر متباین ہیں۔ آپکو جو خط میں نے لکھا تھا ہر چند وہ بالکل حقیقت کے خلاف تھا، لیکن میری تمنا کے بالکل موافق تھا۔ پہلے دن جب آپ آئے

اس وقت بھی میں نے آپ کو دہوکا دینا چاہا، لیکن اب چونکہ آپ سے اس مسئلہ میں صحیح مشورہ کرنا تھا اس لئے ضرورتاً یہ سب بیان کرنا پڑا۔ دنیا جو چاہے سمجھے لیکن اس کو میں ہی جانتا ہوں کہ یہ برسوں کی الفت کس طرح اب تک ناشگفتہ حالت میں پڑی ہے۔ اگر اس وقت تک کی میری ان کی صحبتوں اور خلوتوں کی گفتگو کو تحریر میں لے آیا جائے تو بہترین عاشقانہ لٹریچر فراہم ہو سکتا ہے، لیکن حقیقت و معنی کے لحاظ سے شاید ہی کوئی دفتر اس سے زیادہ مہمل ولایعنی نظر آئے۔

شادی کا سوال براہ راست تو نہیں ضمنی طور پر بارہا پیدا ہوا لیکن آخر کار میں اور وہ دونوں اسی نتیجہ پر پہونچے کہ شادی نام ہے صرف باہمی غلط فہمی اور ایک سخت لذت شکن نتیجہ کا اس لئے اب کوئی صورت سوا اس کے نہیں ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں یا پھر وہ کروں جو شادی سے بہتر لیکن انسانیت سے بہت فروتر ہے ——

نیاز

(باقی)

چہ می گوئیان

(میری تصویر کے متعلق)

کوہاٹ (صوبہ سرحد)
محررہ ۱۸ر مارچ ۱۹۲۸ء

(۱)

نیاز صاحب!

السلام علیکم۔ یقیناً ان چند اصحاب میں سے ایک میں بھی ہوں جنھوں نے آپ کی تصویر کو "اپنی ذہنی تصویر" سے مختلف پایا ہوگا۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ پہلے میں اپنی ذہنی تصویر کے متعلق کچھ لکھکر آپ کے سامنے پیش کردوں۔ اور پھر آپ کی اصلی تصویر کے متعلق چند جملوں میں اظہار خیال کردوں۔

میرا خیال تھا کہ نیاز ایک دبلا۔ پتلا۔ ضعیف الاعضاء۔ نحیف الجثہ۔ چند ہڈیوں اور پوست کا مجموعہ ہوگا (گوشت نہیں) سر کے بال منڈے ہوئے یا لمبی لمبی لٹیں ہونگی اور داڑھی شریف حضرت سر سید علیہ الرحمۃ سے کسی صورت کم نہ ہوگی اور دنیا کے تمام داڑھی منڈوں کا کفارہ ہوگی۔ آنکھوں پر پُرانے زمانے کی عینک ہوگی، سفید فریم کہیں سے خمیدہ کہیں سے شکستہ ہوگا۔ گردن افتادہ اور کمر خمیدہ ہوگی۔ اُٹھتے ہوں گے تو ہاتھ میں چھڑی عصائے موسیٰ کا کام دیتی ہوگی۔ ارد گرد کتابوں کا انبار ہوگا۔ جنھیں مطالعہ کرتے کرتے گردن جھکے رہنے کی عادی ہوگئی ہوگی۔ سرکشی تو کہیں نام کو نہ ہوگی۔ لباس نہایت سادہ پُرانی طرز کا لیکن صاف ستھرا زیب بدن ہوگا اور روزانہ مشغلہ یہ ہوگا۔ کہ ایک حضرت آکر پوچھتے ہوں گے "فراعنۂ مصر کے متعلق آپکا کیا خیال ہے۔ کتنا عرصہ ہوا۔ وہ تہ زمین ہوئے ہیں" دوسرے صاحب کہتے ہوں گے "مرزا غلام احمد قادیانی نے جو نبوت کا دعویٰ کیا ہے وہ سچا ہے یا جھوٹا اگر جھوٹا ہے تو اس کے پیرو کیوں روز بروز بڑھ رہے ہیں" تیسرے صاحب اگر دریافت کرتے ہوں گے "کیوں نیاز صاحب آپ کون سے مذہب کے پیرو ہیں" "باب استفسارات" سے تو نمایاں ہوتا ہے کہ آپ نیچری یا دہری ہیں" غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

مگر فروری کے نگار میں جب پڑھا کہ آئندہ اشاعت میں آپکی تصویر بھی زیب رسالہ ہوگی تو دل کی عجیب حالت تھی خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔ نہیں معلوم ایک دہری۔ ایک نیچری۔ ایک گم کردہ راہ (یہ الفاظ چند کوتاہ اندیش حضرات یا آپ کے خیال کے مطابق اورنگ زیب جیسے مذہبی متعصبین کے الفاظ ہیں) اس ظالم نے سیکڑوں گوشت پوست کے پردوں میں رہکر کیوں اتنی محبت گانٹھ لی۔ خیر انتظار کی گھڑیاں جوں توں کرکے گزریں ۱۳ر ماہ رواں کو آپ کا رسالہ پہونچا۔ بد قسمتی سے میں مکان پر نہ تھا اور میرے ایک فاضل دوست نے رسالہ کھول کر پڑھنا شروع کردیا۔ جوں ہی میں پہونچا "کیا نگار آگیا" یہ وہ جملہ تھا جس نے مجھ سے علیک سلیک سب کچھ چھڑا دیا بولے "ہاں آ تو گیا۔ لیکن

نیاز کی یہ تصویر نہیں - اور اس نے معذرت کی ہے کہ اگلے مہینے تصویر شائع ہوگی" (اس فاضل دوست نے تو بطور تفنن یہ کہا تھا) گر میری زبان نے نہیں بلکہ شوق بے پایاں نے چند بے نقط ایسی سنائیں کہ اگر آپ ہوتے تو نہ معلوم اینجا نب آج کس گوشۂ عافیت میں آرام فرما ہوتے - میں نے کہا کہ یہ (آپ) اسی طرح کرتا ہے - اگر تصویر نہ چھپوانی تھی تو وعدہ کرنے کی کونسی ضرورت تھی - میرے دوست کچھ دیر تک تو میری خرافات نہایت سنجیدگی سے سنتے رہے اور جب میں خاموش ہوگیا تو انھوں نے نہایت متانت سے رسالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "بڑھاؤ نہ آپس میں الفت زیادہ" بھائی جان ایک شریف آدمی کو اس کی غیبت میں اس قدر کوسنا اچھا نہیں یہ تو تصویر ہے اب میں کیا لکھوں - کہ میرے دل کی کیا حالت تھی - فرط محبت سے قریب تھا کہ میں کچھ اور سناجاتا لیکن خیر گزری آپ کو اپنی ذہنی تصویر سے تمام تر مخالف پایا - لیکن شکر للہ حضرت اکبر مرحوم والا معاملہ نہ ہوا - یعنی آپ اس قدر "زشت رو" نہ ہوئے کہ "طبع جمیل دارد" کہنے سے دل گریز کرتا - ماشاء اللہ ہم سے کسی صورت کم نہ نکلے - اچھے خاصے توانا و تندرست - داڑھی کا صفایا - مونچھیں مصطفے کمال سے ٹکر کھاتی ہوئی - آنکھیں کمانیدار عینک کے پردوں میں سے جھانک کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں اور آپ ہیں کہ کرسی پر اس قدر اکڑے بیٹھے ہیں کہ گویا کبھی یہ گردن جھکی ہی نہیں - یہ تو ہے صرف نصف تصویر (Bust) کی حالت اور اگر ساری ہوتی - تو خدا معلوم

خیر نیاز فتحپوری ۱۳/۱ نے ایک خاص شان پیدا کرلی - لیکن افسوس آپ نے جہاں اپنی تصویر سے ملاقات کراتے ہوئے چند جملے تحریر کئے وہاں ایک یہ جملہ بھی اپنی مصروفیت ماضی و حال کے متعلق لکھنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائی (اپنی سوانحعمری) اور یہ حسرت ہمارے دل رہ گئی - خدا کرے کہ آپ یہ تکلیف بھی گوارا فرماکر ہم کو شاد گردانیں - والسلام

مخلص آوارۂ و مجنونے رسوا سربازارے

یعنی خیر محمد از کوہاٹ

(۴)

گورنمنٹ نارمل سکول
کیمبل پور
۲/۳ ۲۰

نیاز و مولانا نیاز

مارچ کا نگار کیا تھا - میرے دیوانۂ دل کے لئے پیغام حشر تھا - میں نے رسالے بھی دیکھے ہیں اور ان کے اڈیٹر بھی لیکن مجھے اتنی حیرت کبھی نہیں ہوئی، جتنی کہ مولانا ابوالکلام کی تصویر اور جناب نیاز کی تصویر کے مطالعہ سے ہوئی - میں نے ابوالکلام کا حشر ریز الہلال دیکھا اور پڑھا میں نے نگارستان کے مضامین بھی پڑھے ہے - اور باب الاستفسار کو ہمیشہ میں نے نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا،

نگارستان پڑھ کر مجھے مصنف کے رندمشرب ہونے کا علم ہوا، اور باب الاستفسار کے مطالعہ سے ان کی فضیلت علمی اور جامعیت کا --- تاہم میرے نہاں خانۂ دماغ میں آپ کی جو شبیہ تھی وہ بالکل اُس سے مختلف تھی جو مارچ کا نگار پیش کرنے والا تھا۔ چنانچہ جب نیاز کی تصویر سے روبرو ہوا تو کوئی ۵ امنٹ تک مجھ پر سکتہ کی سی حالت طاری رہی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تصویر کو دیکھتا رہا اور شوق دید تھا کہ اُمنڈا چلا آتا تھا۔ اور دیکھنے سے طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ اب بھی یہی حالت ہے۔ جب چاہتا ہوں پرچۂ نگار اُٹھا کر جناب نیاز کے فوٹو سے آنکھیں سیراب کرتا ہوں۔

اپنے استعجاب کی وضاحت کے لئے اگر میں اپنی ذہنی شبیہ کا خاکہ اتار دوں، تو شاید زیادہ مناسب ہوگا۔

میرے دماغ میں جناب نیاز کی تصویر یہ تھی کہ وہ ایک سلجھے ہوئے مولانا ہیں۔ پاس وضع کے لئے مختصر سی ریش مبارک بھی ہے۔ رنگ ذرا سیاہی مایل، اور دُبلے پتلے عینک کا شوق کبھی کبھی فرماتے ہیں۔ مگر فیشن کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے کہ آنکھیں دیکھنے سے جواب دے چکی ہیں۔ پُرانی وضع کے آدمی ہیں مگر عام طور پر جدید وضع کے لوگوں سے ملنا پسند کرتے ہیں۔

یہ خدا کس کافر کو گمان ہی تھا۔ کہ اس کافر نیاز کی تصویر اس بلا کی چنچال اور دل فریب ہوگی، تصویر دیکھ کر بے اختیار جی نے چاہا کہ لپٹ جاؤں اور اس روشن پیشانی کے بوسے لوں، اب جب آنکھیں بند کر کے نیاز کی رندمشربی، جامعیت اور فضیلت علمی کا اس تصویر سے سامنا کرتا ہوں، تو دل مانتا ہی نہیں کہ یہ تمام اوصاف اِن نیاز کے ہیں۔ میں تو اَب بھی جب نیاز کے کمال علمی اور تبحر پر غور کرتا ہوں تو یہ کم بخت ضدی دماغ وہی شبیہ پیش کرتا ہے جس کا ذکر کر چکا ہوں اور میں ہر چند اس نیاز کو دماغ میں جگہ دینا چاہتا ہوں۔ لیکن وہاں سے جواب آتا ہے کہ تمہارا نیاز وہی ہے۔ اس نئے نیاز سے بے نیاز ہی رہو۔

یہ تصویر اس نیاز کی نہیں جس نے قدیم طرز تعلیم کے مطابق تعلیم پائی ہے۔ جو رندمشرب ہونے کے باوجود سید کے دل و دماغ اور آزاد و شبلی کے زور قلم کا مالک ہے۔ اور تم یقین کرلو کہ تمہارے مولانا نیاز نے تمہیں حیران کرنے کے لئے کسی جج یا بیرسٹر کی تصویر شائع کردی ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ ایک جنٹلمین کو ایسی صورت عطا نہیں کیجا سکتی نہیں بلکہ ایک ہندوستانی جنٹلمین کو کم از کم اس نعمت سے ضرور محروم رکھا جانا چاہئے۔

میں جب اس نئے نیاز کی اس شبیہ کو دیکھتا ہوں تو اپنی چمکدار آنکھیں میرے دل کے پار ہوئی جاتی ہیں اور میں کانپتا ہوں کہ خدایا، اگر اس شخص سے کہیں میں دوچار ہوگیا۔ تو میں نے بھی جو اپنی ادب دانی اور علمیت کا تھوڑا بہت رعب مولانا نیاز پر بٹھا رکھا ہے وہ اس نیاز کے سامنے تو ہوا ہی ہو جائیگا۔

ایک معمہ اب تک لاینحل ہے۔ کہ مضبوط اور جسیم آدمی عام طور پر بطی الذہن ہوتے ہیں۔ (اور یا یہ "حسن ظن" ہے جو مجھے اس جماعت کے متعلق اس لئے پیدا ہوگیا ہے۔ کہ میں خود جسیم نہیں ہوں) پھر یہ نیاز جس سے اب میرا تعارف ہوا ہے میرے مولانا نیاز کی طرح ذکی الفطرت کیوں ہے؟

اور پھر جس نیاز کی تصویر میرے سامنے ہے وہ نیاز تو قیامت کا بلاتوش معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ میرے مولانا نیاز کی شبیہ

تو متانت اور سنجیدگی کی مجسم تصویر ہے۔ اس لئے نہیں کہ متانت اس زمانے میں کوئی قابل قدر صنعت ہے۔ بلکہ اس لئے کہ فاضل دو عالم مولانا نیاز کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔

آخر میں اپنے دل کو یوں تسلی دیتا ہوں کہ ڈاڑھی، چنگاری، اور نگارستان کا نیاز تو یہی ہے جس کی تصویر نگار میں شائع ہوئی ہے۔ اور باب الاستفسار کا نیاز وہ ہے جس کی تصویر میرے نہاں خانۂ دماغ میں محفوظ ہے

عزیز

(نگار) داغ کا نہایت مشہور اور پر لطف شعر ہے :۔

شریر آنکھ، بیقرار، چستون شوخ
تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لئے

میرے کو ہاٹی اور کمبل پوری عزیزوں نے میرے اور میری تصویر کے متعلق جو کچھ اظہار خیال کیا ہے، اس کو اگر ایجاز کے ساتھ شاعرانہ زبان میں ادا کیا جائے تو داغ کا مذکورۂ بالا شعر پڑھ دینا کافی ہے

نہایت معمولی مسئلہ ہے کہ تجربات انسانی کے بعض نتائج تصویر و قیاس کی رہبری کرنے میں ہمیشہ کامیاب ثابت نہیں ہوتے۔ .... علی الخصوص اسوقت جب ہم اپنی نفسیات دانی پر اعتماد کرکے فراستیات (Physiognomy) کے متعلق کوئی حکم لگانا چاہیں۔ اس لئے میرا معمول ہے کہ جب کسی نادیدہ شخص کی صورت کے متعلق محض اس کے آثار و افکار کو دیکھکر کوئی رائے قائم کرنا چاہتا ہوں تو ہمیشہ عام شاہراہ سے ہٹ کر کیونکہ دنیا میں کم ہیں ایسے نفوس جو جسم و روح کے لحاظ متوازن و متطابق نظر آئیں۔

میں ریاض کا نام عرصے سے سن رہا تھا لیکن دیکھا نہ تھا۔ جب میں نے اول مرتبہ بھوپال میں اُن کو دیکھا تو مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ میرے کیا کسی کے بھی تصور میں یہ بات نہیں آسکتی کہ جو شخص ایسے شعر کہہ سکتا ہے:۔

گلا بیٹھا ہوا خدمت اذاں کی اور کعبہ میں
بھلے سے ہم دبالائے تھے ناقوس برہمن کو

یا۔

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اُٹھالے

وہ صورت کے لحاظ سے اس قدر مقطع ہوگا کہ دیکھکر خواہ مخواہ بیعت کے لئے ہاتھ بڑھ جائے۔ لاکہ شیب و انحطاط سہی، مجبوری و پیری سہی، لیکن ایسی بھی کیا "منافق پیشگی" کہ وہی شخص جو کسی وقت کعبہ میں ناقوس بجنکنے اور کسی کو گود میں چپکے سے اُٹھا کرلے جانے کے لئے طیار رہتا آج ایسا نظر آتا ہے کہ گویا یہ حضرت ہمیشہ سے "تو دۂ تیمم" ہی رہے تھے۔ وہ شخص جو جوانی کی بادہ

یادہ خواری کو پیری تک نباہ دے میرے نزدیک زیادہ قابل قدر ہے اس انسان سے جو کچھ دنوں تک منکر خدا فلسفی رہے اور پھر مذہب کے باب میں اس قدر غلو سے کام لے کہ ہر بے عقلی کو داخل ایمان کرلے۔ سمجھ کر خدا سے انکار کرنا بے سمجھی کے اقرار سے بہتر ہے کیونکہ گر اس نے کبھی خدا کو خدا مان لیا تو اور ہزاروں سے منوا چھوڑے گا، اور اس کا اقرار خود اس کے لئے بھی...... مفید نہیں

خیر، بہرحال مدعا یہ ہے کہ خیال انسانی ایک شخص کی صورت گری میں غلطی کر سکتا ہے، جس طرح خود ایک شخص کی وضع دوسروں کو مبتلائے فریب کر سکتی ہے، لیکن میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آئی کہ آپ کو یا کسی اور کو کب میری اس قدر توہین کرنے کا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے بھی اسی جماعت میں شامل کرے جن کے ہاں صحت اخلاق کی علامت صرف صورت کو بگاڑ لینا ہے اور فضل و کمال کی دلیل اپنے اوپر صرف کہنگی و بوسیدگی طاری کر لینا۔ یہ غریب اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اخلاقیات کس قدر جمالیات کے پابند ہیں اور جب تک یہ ذوق مکمل نہ ہو اس کا دعویٰ یکسر مکر و فریب ہے۔ میرا حال تو ہمیشہ یہی رہا کہ "شگفتہ روئی گلہائے بوستانم سوخت" اور میں نے ہمیشہ رندی کے حسن کو زہد کی زشت روئی پر ترجیح دی ہے اب آپ کو اختیار ہے خواہ بیعت کیلئے اسی دل خانہ خراب کا انتخاب کیجئے جس کے غرور سے بھی صد ہزار سامان نیاز پیدا ہیں یا کسی ایسی جھکنے والی پیشانی کا جس کا ایک ایک سجدہ "پرورش لات و ہبل" ہے۔

میرے کوہاٹی دوست کی یہ خواہش بھی تھی کہ تصویر کے ساتھ میں اپنے حالات زندگی بھی لکھتا، اپنے اکتسابات ذہنی سے بھی آگاہ کرتا اور وہ سب کچھ لکھتا جو آج کل ایک "نشو و نما تجز" کے ساتھ ہر شخص لکھا کرتا ہے، لیکن میں اس سے احتراز کروں گا کیونکہ جھوٹ بولنے کی مجھے عادت نہیں، اور سچ لکھوں تو سب سے پہلے اپنی جہل و بے مائگی کا اعتراف کروں جسے شاید میرا نفس گوارا نہ کرے۔

اپنی فطرت کے متعلق البتہ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ جس در تک پہونچنے کے لئے میں سراپا اضطراب ہوتا ہوں ہاں بھی حتی الامکان اس وضع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا کہ۔

ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا ہو

بھوپال کے دوران قیام میں اپنے بعض احباب کے شدید اصرار پر ایک نظم میں نے موجودہ فرمانروائے بھوپال کے حضور میں پیش کی تاکہ ایک وعدہ کی یاد دہانی کروں، باوجود اس کے کہ غرض میری تھی، اور اعلیٰحضرت کی ذات حقیقتاً یوں بھی ایسی ہے کہ جو مدح و ستائش کیجائے زیبا ہے، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں لکھ چکا تو معلوم ہوا کہ اس میں ممدوح سے زیادہ میں خود اپنی تعریف کر گیا ہوں ملت تو ضائع ہوگا، چند شعر سن لیجئے:—

زمن سپاس تو آید نہیں کہ نالانم — زخندہ ات چہ نوا بردہ ام کہ گریانم
نگاہ مہر کہ بر من فگندہ اینم — سحاب لطف کہ بر من فشردہ دامنم
ولے ز آرزوی خود ہنوز منفعلم — ز اقتضائے کمال خودش پشیمانم

بدست من سرِ دامانِ خود رسیدہ دہ ... دگرنہ چاک شدن خواہدش گریبانم
عجب نباشد اگر می زنی بدستارت ... بجائے طرّہ کہ من گوہرے زعمّانم
بہ بزم مرا بہ مشامت کہ مشکم از تاتار ... بکش مرا بسرت تیغہ از صفاہانم
مرا بہ افسر دیہیم خود بدہ جاے ... کہ من بہ تاب و صفا لعلے از بدخشانم
مرا بپرس ز حسّان و شیخ شیرازی ... کہ نغمۂ عرب و طوطئ نژاد ایرانم
مرا بہ وعدۂ لطفے چہ شاد می نمودی ... نہ زیبدت کہ تماشا کنی پریشانم
چہا کنی کہ تو امروز نیشتر سازی ... ہمان امید کہ دی ساختی رگ جانم
تأملے کن و قدرم شناس و کامم دہ ... کہ باشد از نظرِ عدل و نظم شایانم

وگرنہ دہ خبر از نامرادیم کہ ز تو
بہ سنگِ سختِ فنا قلبِ نالہ سامانم

اور اگر آپ اس سے زیادہ میری حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو پھر عرفی کی زبان میں اُسے بھی سُن لیجئے:-

من کیستم آن سالک کونین مسیرم ... کز بیختۂ جوہر قدس ست خمیرم
در صفحۂ تصویر جلال ست مثالم ... در پردۂ تقدیر جمال ست نظیرم
چون حُسن کشد جام صفا رنگِ شرابم ... چون عشق دہد رنگ جبین آب و زریرم
در قامت عاشق شکن آموز کمانم ... در غمزۂ معشوق کشایش دہ تیرم
بر کتف ریاضت طلبان شال و پلاسم ... بر دوش زلیخا منشان بُرد حریرم
در کوزۂ لذت شکنان چشمۂ زہرم ... در کاسۂ کودک منشان جرعۂ شیرم
آنجا کہ ادب نغمہ طراز است سمیرم ... زانجا کہ ہنر جلوہ فروش ست بصیرم
عشقم کہ بر آسودہ دلان نیست گزارم ... حسنم کہ ز خونین جگران نیست گریزم
در خانۂ مجنون کہ خراب ست غبارم ... در حجلۂ لیلیٰ کہ بہشت ست عبیرم
میگویم و اندیشہ ندارم ز ظریفان ... من زہرہ را مشتگرم و من بدر منیرم
سر بر زدہ ام با مہ کنعان ز یکے جیب ... معشوق تماشا طلب و آئینہ گیرم
آن چشمۂ قربم کہ ز لب تشنگی جم ... جبریل دمآید بجگر مگاد ضمیرم

نیاز

لکھنؤ کا ایک غیر لکھنوی شاعر

(آسی الدنی)

نظمیات میں جس قدر دلچسپی مجھے غزل سے ہے اسی قدر نفرت بزم مشاعرہ سے ہے کیونکہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ غزل کہی نہیں جاتی بلکہ ہوجاتی ہے اور مشاعرہ نام ہے یکسر تکلف و تصنع کا جہاں ہر ممکن آورد کے ساتھ ایک مخصوص زمین میں طبع آزمائی کیجاتی ہے اور یہ "بہ ستم می رسد" کا تغزل کم از کم میرے جذبات کو تو اپیل کرتا نہیں۔ عرب کے قدیم بازار عکاظ کا ذکر نہ کیجیے کہ یہاں وہ فضا پیدا ہوسکتی ہے اور نہ طبائع میں وہ حقیقی جوش، وہاں کا شاعر وہی کہتا تھا جو بے اختیارانہ اس کی زبان سے نکل جاتا تھا اور یہاں کا وہ عالم ہے کہ ریاضؔ نے عمر بھر شراب کا ذکر کیا لیکن غریب کو بقدر لذت کام و دہن بھی چکھنے کی توفیق نہیں ہوئی بلکہ اس سے زیادہ بحفاظ ذوق یہ دیکھئے کہ حافظؔ کو اگر بادہ خوار کہہ دیا جائے جس نے واقعی شراب پینے کے بعد ہی شراب کا ذکر کیا ہے تو ایک بڑی جماعت جنگ کے لئے طیار ہوجاتی ہے اور سمجھتی ہے کہ دنیا کا عظیم ترین کفر اگر کوئی ہوسکتا ہے تو صرف یہی، کیونکہ ان کے نزدیک اسلام نام ہے صرف اس اعتقاد کا کہ "حافظ میگسار نہ تھا"۔

مشاعرہ میں اگر کبھی گیا بھی تو یہ دیکھکر کہ "منافقوں کا اتنا بڑا ہجوم میرے سامنے ہے" گھبرا گیا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہزار میں ایک شاعر بھی ایسا نہیں۔ جو حقیقی معنے میں کیفیات محبت اپنے اوپر طاری کرنیکے بعد کوئی شعر پیدا کرتا ہو۔ اور زبان سے وہ کہتا جو دل میں نہ ہو اپنا وقت ضائع کرنا ہے اور دوسروں کو فریب میں مبتلا کرنا۔

یہ مسئلہ بجائے خود یقیناً تحقیق طلب ہے کہ اس زمانہ کا شاعر، عاشق کیوں نہیں ہوتا۔ آیا حُسن کی پیداوار بند ہوگئی ہے۔ یا دل کی تعمیر کا اسلوب بدل گیا ہے۔ بہرحال جو سبب بھی ہو یہ ایک واقعہ ہے اور اسی چیز کے نقدان نے رفتہ رفتہ رنگ تغزل کو نہ صرف بے نمک اور بے اثر بلکہ اس کے معیار کو اس درجہ پست کر دیا کہ خدا کی شان ہے آج متشاعرین لکھنؤ بھی اپنے آپ کو شاعر سمجھنے لگے جن کی پرواز خیال، کلام کو پر اثر بنانے کے لئے اس سے زیادہ بلند نہیں جاتی کہ کبھی اپنا جنازہ نکالدیا، کبھی نزع میں ہچکیاں لینے لگے، اور بہت ترقی کی تو صیاد و آشیان، بلبل و باغبان کی فرسودہ و پامال داستان ظلم و تظلم کی تکرار کرکے اپنے حال سے اسکو منطبق کرکے دکھا دیا۔ بہرحال یہ ہے ساری کائنات اس دور کے شعراء کی (الا ماشاء اللہ) جنپر بغرض مشاعرہ اور یہ ہنگامہ تغزل و مغازلہ قائم کیا جاتا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ ان انجمنوں کا نام رکھا جاتا ہے ایسا جس سے معلوم ہو کہ "ادب کی اعانت" اور ادب کا عروج، انہیں کی وجود سے قائم ہے۔

ارباب نظر سے یہ امر مخفی نہ ہوگا کہ گزشتہ دس سال کے اندر لکھنؤ سے باہر کی دنیا میں رنگ تغزل نے ایک خاص تبدیلی اختیار کی ہے اور وہ یہ کہ غزل میں زیادہ سنجیدہ، زیادہ وزنی اور زیادہ تخیلی مضامین بیان کئے جاتے ہیں۔ ہر چند میں ایسے

کلام کو صحیح معنی میں غزل کے نام سے تو موسوم نہیں کر سکتا، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ نظم ہونے کے لحاظ سے وہ یقیناً قابل قدر ہے۔ اور زیادہ روشن مستقبل کی خبر دیتا ہے۔ یہ تغیر ذوق عام میں کیوں ہوا؟ اس کے خارجی اور ماحولی اسباب جو کچھ بھی ہوں، لیکن اس کا ایک اندرونی اور ذاتی سبب یہ بھی ہے کہ جب تکثیف محبت ضعیف اور غزل کا صحیح عاشقانہ رنگ مفقود ہونے لگا (اور ہونا چاہئے تھا کیونکہ ہر دور کی عمر اور ہر شاعر کا ایک دور ہوا کرتا ہے) تو لوگوں نے اس کمی کو محسوس کر کے اس کی تلافی کرنی چاہی اور تصوف و فلسفہ کی مدد سے کلام کو پر کیف بنانے کی سعی کی، ہر چند اس ہنگامہ میں یہ بھی ہوا کہ بعض شاعر لغو سے لغو تر ہو گئے لیکن عام اثر یہی ہوا کہ ذوق بلند ہونے لگا اور نگاہ زیادہ دقیق و نکتہ رس۔ مگر غالباً یہ سنکر حیرت ہوگی کہ اہل لکھنؤ نے جن کو زباندانی کے غرور نے کبھی ذوق سلیم کی سطح تک ابھرنے نہ دیا اب بھی بدبختی سے اس تغیر کو قبول نہ کیا جس نتیجہ کا پورا احساس اسی وقت ہو سکتا ہے جب کوئی شخص یہاں کے محافل شعر و ادب میں جا کر شرکت کرے اور دیکھے کہ سب سے زیادہ داد کس شعر کو ملتی ہے۔

عربی زبان میں شاعروں کے کئی درجے مقرر کئے گئے ہیں۔ پہلا وہ شاعر جید ہے جو اپنے اشعار سے لوگوں کے امیال و عواطف میں تبدیلی پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے اس کو وہ خنذیذ کہتے ہیں۔ اس کے بعد مرتبہ شاعر کا ہے جو قدرت کی طرف سے شاعر نہ دماغ لیکر آیا ہے اور کسی نہ کسی وقت اس کا خنذیذ ہو جانا مستبعد نہیں ہے، تیسرا درجہ شویعر کا ہے جو شاعر کی تصغیر ہے یعنی معمولی قسم کا شاعر، چوتھا درجہ شعرور کا ہے جس سے بہت ہی ضعیف قسم کا شاعر مراد ہوتا ہے۔ آخری درجہ کے شاعر کا نام تشاعر ہے، یعنی وہ جو شاعر تو پیدا نہیں ہوا لیکن سعی و تکلف سے وہ اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ پھر اگر آپ کو شعرور، شویعر شاعر و خنذیذ کی تلاش ہو تو جہاں جی میں آئے جا کر جستجو کیجئے خدا کی زمین وسیع ہے، لیکن اگر آپ کو صرف تشاعر درکار ہے تو لکھنؤ سے باہر کہیں جانے کی ضرورت نہیں، بھانت بھانت کا تشاعر آپ کو یہیں ملجائیگا اور اس قدر افراط سے کہ مجھے اپنے دفتری اور چپراسی کی طرف سے بھی یہ شبہ پیدا ہونے لگا ہے کہ کہیں ان میں تو یہ جراثیم موجود نہیں یہ تھی میری رائے لکھنؤ آنے سے قبل بھی یہاں کے شعرا کے متعلق اور مستقل قیام کے بعد تو اس کی تصدیق ایمان کی حد تک ہو گئی ہے۔

میں بہت دیر آشنا اور خلوت پسند انسان ہوں اور اس لئے میرے متعلق ہر شخص اول اول یہی رائے قائم کر لیتا ہے کہ میں بہت مغرور و متکبر ہوں، حالانکہ غرور و تکبر کے لئے میرے اندر اس سے زیادہ اہلیت نہیں ہے، جتنی خدا میں عجز و انکسار کے لئے لیکن چونکہ لوگوں کے اس خیال کو محو کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا اس لئے خاموش رہتا ہوں یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بعض حضرات کو اپنے خیال کی غلطی تسلیم کرنا پڑتی ہے اور بعض اخیر تک اسی کفر میں مبتلا رہتے ہیں خیر، بہرحال جب میں یہاں آیا تو عرصہ تک اس سے بیخبر رہا کہ یہاں کون شاعر کس رنگ کا ہے۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب جناب وصل بلگرامی کا وجود (جو موت کی طرح میری شہرگ سے زیادہ قریب رہتے ہیں) یہاں کی انجمن معین الادب میں آستین خانہ کی حیثیت رکھتا تھا اور انکا مکان شعراء لکھنؤ کی کثرت آمد و رفت سے بالکل تختۂ بازار بنا ہوا تھا۔ پھر ان میں سے بعض کا نغمۂ داؤدی بھی کانوں تک پہونچا جن کو اپنی خوش گلوئی پر ناز رہتا، بعض کا وہ لب و لہجہ بھی سنا جس کے متعلق میں یہی سمجھ سکا کہ شاید یہاں کے بعض فقیر اسی طرح صدا لگاتے

ہوں گے، اسی طرح بعض کا رونا، بعض کا سسکیاں بھرنا بھی میری نیند میں حارج ہوتا رہا لیکن یہ جراءت کبھی نہیں ہوئی کہ اس جماعت میں شریک ہوکر زیادہ قریب سے اپنے سامعہ اور باصرہ کو مجروح ہونے دوں۔

الغرض ایک زمانہ گزر گیا، یہاں تک کہ اس ہجوم کی "غلظت" میں رفتہ رفتہ کمی آئی اور کبھی کبھی مجھے بھی چند منٹ "وصل کدہ" میں صرف کرنے کی ہمت ہوئی۔ کبھی کبھی کی ان مختصر صحبتوں میں شعر خوانیاں بھی ہوئیں اور میں نے ان سے لطف بھی اٹھایا لیکن کسی صاحب سے بے تکلف ہونے کا اقدام میں نے نہیں کیا، یہاں کے آنے جانے والوں میں ایک شاعر جناب آسی بھی تھے جو اب میرے بے تکلف دوست ہیں۔ میں نے انکو بارہا دیکھا اور سوائے اس کے کہ میں نے انہیں ہمیشہ نیک طینت انسان سمجھا اور کوئی خاص دلچسپی ان کی اداؤں سے نہیں لی۔ چونکہ میں شعر سننے کی فرمائش بہت کم کرتا ہوں اس لئے باوجود اس کے کہ وہ میرے پاس تشریف لاکر بیٹھ جاتے تھے میں بہت کم ان کے کلام سے مستفید ہو سکا کیونکہ جہاں تک میرا خیال ہے وہ خود بھی اپنا کلام سنانے کے زیادہ شائق نہیں ہیں۔ چند دن بعد مجھے کوئی رسالہ نظر آیا، جس میں جناب آسی کا یہ شعر درج تھا:-

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے بہت مجبور ہو کر ہم نے آئین وفا بدلا

لکھنؤ آنے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ میرے جمود میں جنبش پیدا ہوئی اور دیر تک میں اس شعر سے لطف اٹھاتا رہا۔ جناب آسی میرے پاس آئے تو میں نے اس شعر کی داد دی اور ان سے فرمائش کی کہ مجھے اپنا کلام مطالعہ کے لئے دیں چنانچہ انھوں نے اپنا مجموعہ جو اب تک غیر مطبوعہ ہے مرحمت فرمایا اور یہ مضمون اسی تحریک کا نتیجہ ہے۔

ہرچند حضرت آسی ضلع میرٹھ کے ایک قصبہ آلدن کے رہنے والے ہیں، لیکن تقریباً گزشتہ ایک قرن سے وہ یہیں زندگی بسر کر رہے ہیں اور لکھنؤ کی فضا سے اس قدر مانوس ہیں کہ اگر میں انہیں لکھنوی کہدوں تو شاید وہ برا نہ مانیں گے، ہرچند شاعری کی حیثیت سے انھیں لکھنؤ سے اتنا ہی بُعد ہے جتنا مجھے تصوف سے ہے۔

جناب آسی بہت کہنہ مشق شاعر ہیں کیونکہ کم و بیش بیس سال سے وہ اس فن کے دلدادہ ہیں اور انکی عمر چونکہ ابھی چالیس تک بھی نہیں پہونچی اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری نے بھی ان کے شباب کے ساتھ ہی ساتھ طلوع کیا لیکن فرق یہ ہے کہ شباب اب رخصت ہو گیا (جسکا غالباً جناب آسی کو اعتراف اعتراف نہ ہوگا) اور شاعری بدستور قائم ہے اور شاید پوری جوانی کے عالم میں یوں تو ہر شخص کے خیالات و جذبات ماحول سے متاثر ہوتے ہیں، لیکن وہ شخص جو فطرت کی طرف سے شاعرانہ دماغ لیکر آیا ہے اور پھر شاعری بھی کرنے لگتا ہے، اس کا مجموعۂ کلام حقیقتاً اس کی زندگی کی تاریخ ہوا کرتا ہے اور اس سے ایک شخص بآسانی سراغ لگا سکتا ہے۔ کہ اس کے جذبات نے زندگی میں کیا کیا راہیں اختیار کیں۔۔ اس نظر سے جب ہم کلام آسی کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعرانہ زندگی کے لحاظ سے اُن پر مختلف دور گزر چکے ہیں اور اب یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ وہ حقیقتاً کیا کہنے کے لئے پیدا ہوئے تھے اور حالات زندگی یا ماحول نے اُن کو کب اور کس قدر اس راہ سے ہٹایا۔ ان کے ہاں قدمائے دہلی کا بھی رنگ پایا جاتا ہے، اور متاخرین کا بھی، اسیطرح لکھنؤ کے قدیم رنگ میں بھی اُنھوں نے لکھا ہے اور جدید رنگ میں بھی۔ پھر چونکہ ان تمام رنگوں کے لئے کسی کا دماغ موزوں

نہیں ہو سکتا اس لئے ظاہر ہے کہ ان میں کوئی ایک رنگ وہبیات کے تحت میں ہوگا اور باقی سب اکتسابات و تکلفات کے سلسلہ میں۔ میں اس وقت جبکہ مجھے کافی موقعہ بالاستیعاب ان کے کلام کے مطالعہ کا نہیں ملا، یقین کے ساتھ ان کے فطری ذوق کو تو متعین نہیں کر سکتا لیکن ان کے موجودہ رنگ کو دیکھ کر بہ گمان غالب یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ نیم عاشقانہ اور نیم فلسفیانہ انداز بیان کے شائق ہیں لیکن بالکل ممکن ہے کہ کسی وقت جب عہد شباب کے افسانے اُن کی یاد سے بالکل محو ہو جائیں یا یوں کہئے کہ وہ اپنی جوانی کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائیں تو وہ نیم عاشقانہ رنگ بھی زائل ہو جائے اور صرف وہی تجربات رہ جائیں جو ایک عاشق دیرینہ سال دل کی ساری آگ بجھ جانے کے بعد بطور نظریوں یا مسلمات کے اپنے چھوٹوں کے سامنے بیان کیا کرتا ہے۔ اس کا اندیشہ مجھے اس لئے ہے کہ وہ اب بھی اپنے آپ کو ایسا ہی جانتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

اَب کون ہے رموز محبت کا راز داں
اک ہم رہے ہیں ہمکو کوئی پوچھتا نہیں

اسی زمین میں، اس سے زیادہ خشک ناصحانہ لب و لہجہ ملاحظہ ہو

یہ سب فریب ہے نظر امتیاز کا
دنیا میں ورنہ کوئی بھی اچھا بُرا نہیں

بہرحال یہ تیور اچھے نہیں ہیں، لیکن اسی کے ساتھ جب ہم اسی زمین میں یہ شعر دیکھتے ہیں

یا سب خموش ہیں مری حالت کو دیکھ کر
یا اب جہاں میں کوئی بھی میرے سوا نہیں

تو پھر اُمید وابستہ ہو جاتی ہے اور خیال پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے طبیعت مستقلاً یہ رنگ اختیار کرے۔ آپ کا بالکل ابتدائی رنگ شاعری کوئی خاص بات ایسی نہیں رکھتا جس سے ان کے مستقبل کی شاعری کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم کی جا سکتی۔ مثلاً:-

دو جہاں سے کھو دیا عشق بت بے پیر نے　　مفت میں کافر نے ناحق کی رسوائی ہوئی

بالکل جُدا نہ ہو جئے کچھ واسطہ سہی　　ہاں ہاں وفا نہیں ہے تو اچھا جفا سہی

زخم کھا کر مجھے اس پر ہے نمک کی خواہش　　بے نمک کھانا کوئی چیز ذرا مشکل ہے

ہائے اب تو خیال گیسو میں لو　　نیند بھی رات بھر نہیں آتی

یہ ابتدائی قسم کے اشعار سنہ ۔۔۔ و سنہ ۔۔۔ کے ہیں۔ اس کے بعد تین چار سال کے اندر ذوق میں اتنی تبدیلی پیدا ہوئی کہ قسم بالا کے اشعار کے ساتھ ساتھ حسب ذیل رنگ بھی کہیں کہیں نظر آنے لگا:۔

شرمندہ ہو رہے ہیں تری بے رخی سے ہم — منہ ہی نہیں جو بات کریں اب کسی سے ہم
اتنا تو مجھے خیر تری دشمنی سے ہم — آئندہ دوستی نہ کرینگے کسی سے ہم

وہ اپنی آنکھ سے بھی دیکھیں جوانی میں — مصیبتیں جو سنی تھی کبھی کہانی میں

آپ نے پوچھ لیا خیر اب اچھا ہوں میں — ورنہ مرجانے کی امید پہ جیتا ہوں میں

سنہ ۱۹۱۰ء تک کوئی خاص تبدیلی آسی کے کلام میں پیدا نہیں ہوئی، اور معلوم ہوتا ہے کہ جس فضا میں انکی غزلگوئی کی ابتدا ہوئی تھی، اس کا اثر بدستور قائم رہا اور کوئی خاص بلند سوسائٹی ذوق شعری کے لحاظ سے ان کو ایسی نصیب نہیں ہوئی جو انکو صحیح راستہ پر لگاتی۔ لیکن غور کرنے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اساتذہ کے کلام کا مطالعہ برابر کرتے رہتے تھے اور غالباً یہی ایک ذریعہ انھوں نے ذوق شعرگوئی کی اصلاح کے لئے تجویز کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نگاہ میں وسعت، خیال میں بسط، اور انداز بیاں میں کچھ حلاوت پیدا ہونے لگی لیکن عدم مشق یا توازن شناسی کے احساس کی کمی پھر بھی باقی رہی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۰ء کے بعد کی غزلیں جو لکھنؤ کے دوران قیام میں کہی گئی ہیں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اسی زمانہ کی ایک غزل کا مطلع ہے:۔

برق جانسوز غم یار کو ارماں نہ رہا — نہ سہی خیر جو اک سوختہ ساماں نہ رہا

دوسرا مصرعہ بہت صاف ہے، لیکن پہلا مصرعہ بالکل آورد ہے اور نامناسب حد تک اسی زمین کا ایک شعر اور ہے:۔

اُس نگاہ غلط انداز کے اللہ ری فریب — میں نے سمجھا کہ مجھے اب کوئی ارماں نہ رہا

شعر بہت اچھا ہے اور صحیح رنگ تغزل رکھتا ہے لیکن اتنی خامی باقی ہے کہ دوسرے مصرعہ میں میں اور مجھے کا اجتماع ہوگیا جو ہر چند ناجائز نہیں لیکن ذوق سلیم کے لئے بار ہے۔ ایک اور غزل کا مطلع ہے:۔

فریاد ہے اے خدائے بالا — درد جگری نے مار ڈالا

اس میں کلام نہیں کہ شعر خاص اثر کے ماتحت کہا گیا ہے لیکن خدائے بالا اور درد جگری کی ترکیب بالکل انشاء ما دہ رام ہے اسی زمین کے دو شعر یہ ہیں:۔

دل کش سہی نالۂ سحر خیز — لیکن نہیں کوئی سننے والا
شب ہے سوتی ہے ساری دنیا — روتا ہے غریب رونے والا

جن میں میر کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک غزل کا مطلع ہے۔

ہائے ساماں کوئی حسبِ مقدر نہ ملا　　دل ملا ہم کو مگر درد کا خوگر نہ ملا

اس کا بھی دوسرا مصرعہ نہایت پاکیزہ ہے لیکن چونکہ مطلع بنانے کی فکر تھی اس لئے حسب مقدر نے شعر کا مطلب غارت کر دیا۔ اسی زمین کا ایک شعر ہے اور خوب ہے :-

مجھ سے امید ہے سب کچھ مگر اے جذبۂ دل　　مر ہی جاؤں گا اگر وہ مجھے در پر نہ ملا

اسی زمین کے اور شعر ہیں :-

آخر آہ ضروری سہی لیکن اے دل　　میں نے ڈھونڈا جسے اکثر وہی اکثر نہ ملا

قصۂ جوشِ جنوں شبِ فرقت کو نہ چھیڑ　　خیریت تھی کہ مجھے رات ترا در نہ ملا

شعروں کے اچھے ہونے میں کلام نہیں، لیکن پہلے میں لفظ ضروری نے نقص پیدا کر دیا اور دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں توالی اضافات بہت ثقیل ہے، اسی طرح دوسرے مصرعہ میں خیریت تھی کا استعمال صحیح نہیں کیا گیا، اس کے بجائے خیر گزری کہنا چاہئے تھا۔ اس گفتگو سے میرا مقصد یہ ہے کہ آسی اس شاعری کے لئے پیدا نہ ہوئے تھے جس کی انھوں نے ابتدا کی تھی اور اسی لئے باوجودیکہ کوئی ایسا موقعہ ان کو ہاتھ نہ آیا تھا کہ ان کے ذوق کو صحیح راستہ پر لگا دیتا انھوں نے محض مطالعہ کی مدد سے اور اپنی فطری رہنمائی کی بنا پر آہستہ آہستہ وہ راہ تلاش کرنی چاہی جس کے لئے ان کے اندر ایک مخفی جستجو پائی جاتی تھی، لیکن چونکہ اس نوع کی رہبری تمام نقائص کو دفعۃً دور نہیں کر سکتی اس لئے باوجود ترقی خیال اور جذبات نگاری کے، اسلوب بیان، تلاش الفاظ اور انتخاب تراکیب میں خامیاں باقی رہیں۔

میں صحت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آسی کا یہ دورِ شاعری کب ختم ہوا، میں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا ہوں کہ آسی کا موجودہ رنگ (جس کو دیکھکر اس لئے بہت زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ وہ لکھنؤ کی فضا میں پیدا ہونے کے باوجود اس قدر غیر لکھنوی ہے) گزشتہ دور سے بہت مختلف ہے اور اب نسبتاً ان کی غزلوں میں زیادہ پرکیف اور عمیق شعر نکلتے ہیں۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان کا موجودہ رنگ شاعری نیم عاشقانہ و نیم فلسفیانہ ہے، لیکن کہیں کہیں وہ صرف عاشقانہ بھی ہو جاتا ہے اور کہیں محض فلسفیانہ، لیکن ان میں سے کوئی تقسیم بھی ایسی نہیں ہے جو دادِ طلب نہ ہو۔ زندگی ایک کارگاہِ تمنا ہے سیلاب آرزو ہے، اور باوجود اس کے کہ اکثر تمنائیں ناکام رہتی ہیں انسان اس کے فریب تکرار سے نہیں گھبراتا، اس فلسفہ کو ہلکے سے عاشقانہ رنگ کے ساتھ آسی نے کس خوبی کے ساتھ ظاہر کیا ہے :-

پھر بڑھ چلا تلاطم طوفانِ آرزو　　حالانکہ ڈوب کر ابھی ابھرے بھی نہیں

تمناؤں کی مسلسل ناکامی آخرکار انسان کو مایوس کر دیتی ہے اور اس مایوسی میں جو تاویلیں کی جاتی ہیں ان میں سے ایک بہترین تاویل کو آسی نے اس طرح ظاہر کیا ہے :-

اے بدگماں شدائد دنیا پہ صبر کر　　فطرت کو تیرے ساتھ کوئی دشمنی نہیں

ایک غزل کے یہ دو شعر تقریباً ایک ہی جذبات کے ماتحت لکھے گئے ہیں :-

شب غم ہوش آتا ہے تو اکثر سوچتا ہوں میں　　کسے آواز دی تھی میں نے سرگرم فغاں ہو کر
مٹا جاتا ہوں تیرے ساتھ اے بانگ جرس میں بھی　　جسے کب تک کوئی محو تلاش کارواں ہو کر

مگر فرق یہ ہے کہ پہلے شعر میں عالم حیرت و جستجو ہے اور دوسرے میں شاعر ایک نتیجہ پر پہونچکر مآل کار کو پیش کرتا ہے۔ آسی کی ابتدائی یا وسطی دور سے ان اشعار کا مقابلہ کیجئے تو یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ دونوں کلام ایک ہی شاعر کے ہیں۔ آسی کا محبوب موضوع گفتگو بے ثباتی عالم اور اس کے متعلقات کا اظہار ہے اس کو وہ مختلف صورتوں سے، متنوع طرز ادا کے ساتھ بیان کرتے ہیں :-

نمائش گاہ عالم فرد نکلی بے ثباتی میں　　کوئی یہ بھی نہیں سمجھا نہاں کیا تھا عیاں کیا تھا
مرا دور گزشتہ بھی یونہی گزرا ہے اے ہمدم　　بنا رکھی تھی اک صورت خوشی کی شادماں کیا تھا

شعرا گلشن کی تباہی کا باعث بلبل کے نشیمن کو قرار دیتے ہیں۔ آسی نے اس پامال خیال کو کس قدر جدت کے ساتھ ظاہر کیا ہے :-

خار و خس جمع کرے نام نشیمن رکھدے　　جس کو منظور ہو گلشن کا بیاباں کرنا

اس میں ایک طرف تعمیر نشیمن کی بے حقیقتی اور دوسری طرف اثر کے لحاظ سے اس کے نتائج کی اہمیت کو جس حسن کیساتھ دکھایا ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔

ذیل میں ان کے مختلف غزلوں کے منتخب شعر جن سے ان کے صحیح رنگ کا علم ہو سکے درج کئے جاتے ہیں :-

خیر آساں ہی صبر مگر اے ناصح　　کبھی دیکھی تھی یہ حالت مری غمخانے کی
اس طرف سے دوڑی جاتی ہے میری زندگی　　اس طرف سے موت خود لینے کو آتی ہے مجھے
بات اصل میں یہ ہے کہ میں کچھ کر نہیں سکتا　　کہنے کے لئے یہ ہے کہ تقدیر بری ہے
بڑھتا رہا ہمیشہ خیال محال عیش　　آخر مرے دماغ کو بیکار کر دیا
اس چشم فسونگر کی اف ری ستم آرائی تو　　ہوتا ہی پڑا دل کو آمادۂ رسوائی
بیکار برا مانا تم نے مرے شکووں سے　　دیوانہ تو دیوانہ سودائی تو سودائی
اپنے نالوں سے تمنائے اثر بھی ہے مجھے　　اور مزا یہ ہے کہ قسمت کی خبر بھی ہے مجھے
صاف کہتے ہوئے ڈرتا ہوں حکایت اپنی　　خوف مایوسئ ارباب نظر بھی ہے مجھے
مجھ کو دنیا کی محبت نہیں چھٹتی آسی　　ورنہ ہونے کو تو اللہ کا ڈر بھی ہے مجھے
بہت کچھ عقل نے پہلو مری تقدیر کا بدلا　　مگر اب تک نہیں بدلا تھا قانون خدا بدلا

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

زمانہ شکوۂ نیرنگ پر مجھ سے یہ کہتا ہے
کہ تو خود ہی بدلتا جا رہا ہے میں نے کیا بدلا

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں دنیا مرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے رنگ ہر اک چیز کا بدلا

تمام احباب عاجز آ گئے تھے مجھ کو سمجھا کر
مگر ناکامیوں نے میری میرا مدعا بدلا

پھول ہنس ہنس کر دکھاتے ہیں چاکِ دل
ہمنوا فریاد کے بھی سیکڑوں انداز ہیں

تفصیلِ معنیِ غمِ الفت طویل ہے
اور دیسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے

اصطلاحاتِ محبت ہیں زمانہ سے جدا
صبر بگڑا ہوا اک نام ہے ناچاری کا

امیدِ عفو خوب ہے لیکن نہ اس قدر
کچھ نیکیوں سے مجھ کو سروکار ہی نہیں

عشق حسرت آفریں ہے کس جرأت سوز ہے
موت سے بھی کچھ زیادہ زندگی دشوار ہے

آلامِ زندگی کی حقیقت نہ پوچھئے
لاکھوں تو ایسے ہیں جو مجھے یاد ہی نہیں

دیکھا ہے ہم نے آسیِ مضطر کو بارہا
ناشاد اگر نہیں ہے تو کچھ شاد بھی نہیں

پیشتر تاکیدِ ضبطِ گریہ تھی میرے لئے
اب مضر بتلائی جاتی ہے ہنسی میرے لئے

رنگِ نشاط دیکھ مگر مطمئن نہ ہو
شاید کہ یہ بھی ہو کوئی صورت ملال کی

موسم بہار کا ہے ہنسو اے گلو ہنسو
جب تک خبر نہ ہو تمہیں اپنے مآل کی

احساس اب نہیں ہے مگر اتنا یاد ہے
شکلیں جدا جدا تھیں عروج و زوال کی

نہ سنئے مری زندگی کی کہانی
بسر کر رہا ہوں بسر ہو رہی ہے

سبب دل تنگیِ غنچہ کا اتنا جانتا ہوں میں
کہ غم دنیا کے بے تعداد ہیں اور زندگی کم ہے

میری سعی اور میری کوشش ہی کیا
بہت کچھ کروں گا تو مر جاؤں گا

شکوۂ جور و دل آزاری کو چھوڑ
یا پھر اس رنگِ وفاداری کو چھوڑ

جی خوشی سے موت کا ارمان کیا
چھوڑ اب اس رسمِ بازاری کو چھوڑ

کھل گیا دنیا پہ ربطِ حسن و عشق
وہ ہنسے مجھ کو پسینا آ گیا

جب سے میں دنیا کی نظروں سے گرا
خود مری نظروں سے دنیا گر گئی

مرے احباب سب تیار ہیں ہمدرد بننے کو
مگر مشکل ہے آسی مجھ سے ترکِ مدعا ہونا

بیٹھا بیٹھا درد دل میں رہ گیا
ہنسنے والے ہنس کے چلتے ہو گئے

صبر پر دل کو تو آمادہ کیا ہے لیکن
ہوش اڑ جاتے ہیں اب بھی تری آواز کے ساتھ

جسے جان تمنا کہہ رہا ہے آج تو اے دل　　اُسے کہنا پڑے گا دشمن جاں تمنا بھی

جنون عشق میں وہ محویت رہی طاری　　کہ خود مجھے بھی اندازۂ وفا نہ ہوا

سمجھتا ہوں کہ دنیا میں ہمیشہ رنج سہنا ہے　　مگر پھر کیا کروں آسی اسی دنیا میں رہنا ہے

اُمید جاں نفزا ہے اگر تو ہوا کرے　　ہم وہ نہیں کہ جسے زمانہ وفا کرے

کروں گا زیست کا ساماں یہی مجبوری　　ابھی تو موت کا اور انتظار کرتا ہوں

یا سب خموش ہیں مری حالت کو دیکھ کر　　یا اب جہاں میں کوئی بھی میرے سوا نہیں

اور آگے بڑھ فدا اے ہمت مردانہ آج　　ہے کوئی پردہ میں یا آواز ہی آواز ہے

سوچ اے غافل کہ تو قابل زمانے کے نہیں　　یا زمانے کی ہوا تیرے لئے ناساز ہے

وہ عشق جو تاثیر سے محروم نہیں ہے　　ہوگا کہیں لیکن مجھے معلوم نہیں ہے

میں چپ بیٹھا ہوا ہوں اور یہ معلوم ہوتا ہے　　کہ جیسے اک زمانہ کہہ رہا ہے داستاں میری

وہ رازِ وسعت آبادئ عالم کو کیا جانیں　　جو بیٹھے ہی نہیں جا کر کسی خاموش منظر میں

تمہیں صد صبر کروں کس امید پر　　تکلیف ایک حالیہ ٹھہری ہوئی نہیں

برسوں حریم ناز نے دھوکے دئے مجھے　　اب دیکھتا جو ہوں تو یہاں کوئی بھی نہیں

خانہ بربادئ بلبل اک مصیبت ہے مگر　　برق کی تکلیف کا بھی کوئی حاصل چاہئے

بدنصیبی میری سعی ناخدا کے ساتھ ہے　　آکے ساحل پر سفینہ ڈوب جانا چاہئے

میں نہیں ہوں حشر کے دن محرم افشائے قتل　　میں تو کہتا تھا تمہیں دامن بچانا چاہئے

مجھے تو یاد نہیں ہے کوئی خوشی ایسی　　شریک جس میں کسی طرح کا ملال نہ تھا

اس سال فصل گل میں اجڑا تھا بنتے بنتے　　رہتا تو آشیاں کو اب ایک سال ہوتا

اُسی محفل سے میں روتا ہوا آیا ہوں آسی　　اشاروں میں جہاں لاکھوں مقدر بنتے جاتے ہیں

سمجھ لینا کہ اے شوق رہائی جان دیدونگا　　جو پھر ملنے دئے مجھکو مری بے دست پائی نے

مصلحت بینی مرے جوش جنوں کی دیکھئے　　میں کھڑا ہوں آپ اپنا راستا روکے ہوئے

آج تکلیف ہوئی درد جگر سے آسی　　اُسنے پوچھا تو کچھ اُسنے مجھے کہنے نہ دیا

اب تو یہ چاہتا ہوں کہ اے تنہائے غم　　آئے کبھی ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

وعدہ حشر میں تھی بھیڑ بہت کچھ لیکن　　مجھکو پہچان کے چھوڑا مری رسوائی نے

کیا ہو گیا ہے ہم کو آسی کہ ہنستے ان سے   جس وقت کچھ کہا ہے آنسو نکل پڑے ہیں
خوش تو ہوں مرنے سے لیکن اے دعائے مستجاب   اک ذرا بے وقت یہ ارمان پورا ہو گیا
مجھے احساس کم تھا ورنہ وہ زندگانی میں   مری ہر سانس کے ہمراہ مجھ میں انقلاب آیا
سمجھ کر ٹال جانا اور شے ہے ورنہ عالم میں   بلا جیسے مرے آیا ہے مجھ پر جو عذاب آیا
ہزاروں نغمۂ دلکش مجھے آتے تھے اے بلبل   مگر دنیا کی حالت دیکھ کر چپ ہو گیا ہوں میں
نیا عالم ہے ابکی بار دل کی نامرادی کا   وگرنہ بارہا دنیا میں رو کر ہنس چکا ہوں میں
اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھکو   میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشان ہوں میں
اے بدگمان شدائد دنیا پہ صبر کر   فطرت کو تیرے ساتھ کوئی دشمنی نہیں
پھر بڑھ چلا تلاطم طوفان آرزو   حالانکہ ڈوب کر ابھی ابھرا نہیں ہوں میں
شب غم ہوش آتا ہے تو اکثر سوچتا ہوں میں   کسے آواز دی تھی میں نے سرگرم فغاں ہو کر
مٹا جاتا ہوں تیرے ساتھ اے بانگ جرس میں بھی   بنے کب تک کوئی محو تلاش کارواں ہو کر
زمانہ دوسری کروٹ بدلنے والا تھا   مریض درد محبت نے جان ہی دیدی
خار و خس جمع کرے نام نشیمن رکھدے   جس کو منظور ہو گلشن کو بیاباں کرنا
اک داغ دل میں اور بڑا داغ کے قریب   یہ تم نے کیوں کہا کہ پریشاں نہ ہوجیئے
تم نہ سمجھے مری باتوں کو تو شکوا کیا ہے   مجھکو خود ہی نہیں معلوم کہ کیا کہتا ہوں
یا سب خموش ہیں مری حالت کو دیکھ کر   یا اب جہاں میں کوئی بھی میرے سوا نہیں
اللہ آگے بڑھ ذرا اے ہمت مردانہ آج   ہے کوئی پردہ میں یا آواز ہی آواز ہے
سوچ اے غافل کہ تو قابل زمانے کے نہیں   یا زمانہ کی ہوا تیرے لئے ناساز ہے

اس انتخاب سے ہر شخص بہ آسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ آسی کی موجودہ شاعری کا رجحان کیا ہے اور اس کا مستقبل کس قدر شاندار نظر آتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ مجھے یہ اندیشہ بھی ہے کہ انحطاط عمر کے ساتھ کہیں یہ واقعات نگاری جوان کی موجودہ غزلگوئی کا عنصر غالب ہے، خشک فلسفی شاعری ہو کر نہ رہجائے۔ اس میں کلام نہیں کہ مشاہدات فطرت و اصول فطرت جن جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں، ان کو نظم میں اس طرح لے آنا کہ سننے والے پر وہی اثر پڑے جو کہنے والے کے دل پر ہوا ہے، آسان امر نہیں، لیکن اگر انکو کیفیات محبت سے جدا کر کے بیان کیا جائے گا تو وہ نظم ہونے کے لحاظ سے خواہ کیسے ہی غیر فانی کیوں نہ ہوں، لیکن حدود تغزل سے یقیناً علحدہ سمجھے جائیں گے۔ مثلاً آسی کا ایک شعر ہے:-

رفتہ رفتہ یہ زمانہ کا ستم ہوتا ہے   ایک دن روز مری عمر کا کم ہوتا ہے

شعر کے اچھے ہونے میں کلام نہیں لیکن غزل سے اُسے کیا واسطہ۔ تدبیر کی اہمیت تقدیر کے مقابلہ میں خاص چیز ہے آسی نے اسے یوں ظاہر کیا ہے۔

جو کچھ ہے وہ سب مرے ارادوں میں ہے مضمر　　تقدیر میں اک حرف بھی مرقوم نہیں ہے

ابھی تک اس قسم کے خشک شعر ان کے ہاں زیادہ نہیں ہیں اور اکثر حصہ اُن کے موجودہ کلام کا ایسا ہے جن میں یا تو خالص جذبات محبت کام کر رہے ہیں۔ مثلاً

آج تکلیف ہوئی درد جگر سے آسی　　اُسنے پوچھا تو کچھ اس نے مجھے کہنے نہ دیا

کیا ہو گیا ہے ہمکو آسی کہ ہمنے اُن سے　　جس وقت کچھ کہا ہے آنسو نکل پڑے ہیں

یا معنی آفرینی اور فطرت نگاری کے ساتھ اس میں عاشقانہ کیف بھی شامل نظر آیا ہے مثلاً :-

میری سعی اور میری کوشش ہی کیا　　بہت کچھ کرونگا تو مرجاؤں گا

میر کا بھی ایک شعر اسی مفہوم کا ہے:-

بہت سعی کیجئے تو مر رہئے میر　　بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

یا ——
نہ سنئے مری زندگانی کی کہانی　　بسر کر رہا ہوں بسر ہو رہی ہے

رنگ نشاط دیکھ کر مطمئن نہ ہو　　شاید کہ یہ بھی ہو کوئی صورت ملال کی

الغرض ان کا موجودہ رنگ بہت پاکیزہ ہے اور صحیح معنے میں کیفیات شعر کا حامل۔ البتہ کہیں کہیں بعض الفاظ کا استعمال بہت تاویل طلب ہو جاتا ہے اور کسی جگہ مفہوم پوری قوت کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتا مثلاً ایک شعر ہے :-

ہمنے سمجھا تھا تمنا کا خزانہ لازوال　　دل کے محسوسات میں آخر کمی ہونے لگی

دوسرے مصرع میں محسوسات بجائے احساسات کے استعمال کیا گیا ہے حالانکہ ثقیل دونوں ہیں۔ یا ایک اور شعر ہے:-

جلوہ بیتاب اشاعت ہے حریم ناز میں　　مرنے والوں کو مقدر آزمانا چاہئے

پہلے مصرع میں لفظ اشاعت ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ یہ مصرع اگر یوں ہوتا:- "حسن بیتاب تجلی ہے حریم ناز میں" تو بہتر ہوتا۔ ان کا ایک شعر ہے :-

کرم اے تمکنت حسن غریبوں پہ کرم　　کیا ملیگا انہیں خودبین و خودآرا کرکے

اس میں معنوی نقص یہ ہے کہ۔ غریبوں یعنی عشاق (یا خود اپنی ذات) میں "خودبینی و خودآرائی" پیدا ہونے کی شکایت کی گئی ہے، جو بالکل نامناسب و بے محل ہے۔

آسی کا ایک اور شعر نہایت پاکیزہ ہے :-

صبر پر دل کو تو آمادہ کیا ہے لیکن
ہوش اڑ جاتے ہیں اب بھی تری آواز کیساتھ

دوسرے مصرع میں "اب بھی" کے الفاظ کا اقتضا رتھا کہ پہلے مصرع میں صبر و ضبط کے اشتداد و امتداد کو ظاہر کیا جاتا ۔ صرف آمادگی صبر ایسی چیز نہیں کہ اس کے لئے "اب بھی" کا اضافہ کیا جائے ۔ یہ شعر اگر یوں ہوتا تو بہت بلند ہوجاتا۔

خوگر صبر ہوئے دل کو زمانہ گزرا
ہوش اڑ جاتے ہیں اب بھی تری آواز کیساتھ

لیکن اس قسم کے نقائص اول تو بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ غالباً صرف اس وجہ سے ہیں کہ آسی نے ابھی اپنے کلام پر نظر ثانی نہیں کی، آسی نے اور اصناف سخن میں بھی کوشش کی ہے لیکن ان کے ذوق کا پورا حال ان کی رباعیات سے ظاہر ہوتا ہے جو یقیناً خاص چیز ہیں اور کسی آئندہ اشاعت میں ہم نمونۃً انھیں درج کریں گے

نیاز

نادرات

عاقل وہ نہیں ہے جو خیر و شر میں تمیز کر سکے بلکہ وہ ہے جو دو شر میں سے بہتر کا انتخاب کر سکے

غلام کے لئے صرف ایک آقا ہوتا ہے، لیکن طماع کے لئے ساری دنیا اس کی آقا ہے -

---

دنیا کو عقل انسانی سے اتنا فائدہ حاصل نہیں ہوا جتنا نقصان پہونچا ہے -

---

عورت کی کمر جتنی موٹی ہوتی جائے گی، اسیقدر اسکا اعتقاد محبت ضعیف ہوتا جائگا

توپ چھپاتا ہے اور کمرہ ظاہر کرتا ہے

جو شخص سب سے محبت کرنے کا مدعی ہے وہ کسی سے محبت نہیں کرتا۔

عورت ایک بت ہے، مرد اسکی پرستش کرتا ہے لیکن پھر اسے توڑ ڈالتا ہے -

---

جو شخص اپنے وطن کی خدمت کرتا ہے وہ سب سے بے نیاز ہو جاتا ہے

جو شخص دوسرے کی خطا معاف نہیں کرتا، اس پل کو منہدم کرتا ہے جس پر سے وہ گزرتا ہے

عورت کا امتحان کرو غصہ کے وقت، خوشی کے وقت نہیں

دولت پیدا ہوتی ہے مرد کے ذریعہ سے لیکن صرف ہوتی ہے عورت پر

انصاف مظلوم کے لئے جنت اور ظالم کے لئے دوزخ ہے

ایک عورت کے خاموش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسکا منہ چوم لیا جائے

عورت اپنے پاس کسی چیز کے کم ہونے کا افسوس نہیں کرتی بلکہ اس کو رنج ہوتا ہے اس بات کا کہ دوسرے کے پاس کیوں زائد ہے

عورت کو کبھی نہ مارو خواہ وہ پھول ہی کیوں نہ ہو۔

جب سودا پسند آجاتا ہے تو خریدار اندھا ہو جاتا ہے۔

جس عورت کے جتنے بڑے بال ہیں اتنی ہی وہ کم عقل ہے

سات سال تک جستجو کرنے کے بعد کسی بات کی تصدیق کرو

نقد الشعر

(۳)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

یہ کہنا بے ادبی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایک کافر کے نسب یا عہد پر فخر کیا ہے شاعر نے اگر اس حدیث کی طرف تلمیح کی ہے ولدت فی زمن ملک عادل تو اس کے دو جواب ہیں :۔

اول۔ محققین کے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں۔

دوم۔ اس سے یہ امر منتج ہوتا ہے کہ آپ نے خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ اس نے آپ کو اس طرح شر سے پاک اور دور رکھا کہ پیدائش بھی ہوئی تو عادل بادشاہ کے عہد میں۔" آپ نے نسب پر فخر کرنے کو مذموم فرمایا ہے اور اس رسم جاہلیت قرار دیا ہے۔

بعض الفاظ میں اضافات اور محذوفات عام طور پر جائز اور جاری ہیں۔ شعرا نے آزادی سے استعمال کیا ہے۔ مثلاً۔ گر اگر۔ مانا۔ ہمانا۔ می ہمی۔ اکنون۔ کنوں۔ دروں۔ اندروں۔ بروں۔ بیروں۔ نغاں۔ افغاں۔ چار۔ چہار۔ دگر۔ دیگر بتر و بدتر۔ جائے و جاگہ و جائگاہ۔ چناں و چوناں۔ خامش و خاموش۔ شاہ و شہ۔ ماہ و مہ۔ راہ و رہ۔ کوتاہ و کوتہ۔ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں کہ ان میں تصرف عیب کی جگہ حسن پیدا کرتا ہے۔ مثلاً دامن داماں سے، پیرہن پیراہن سے ناگاہ ناگہاں سے فصیح تر اور آگہی آگاہی سے بلیغ تر ہے۔

لفظ میر و امیر میں امیر سے الف گرا کر "میر" کر دینے سے کوئی حرج یا سقم نہیں ہوتا، البتہ اس قیاس پر ابوعبداللہ کا "عُبدی" نہیں ہو سکتا۔

الفاظ لاکن۔ لاک۔ و لے میں لاکن لفظ تازی ہے اصل میں اس کا نون مشدد ہے مگر تخفیف بھی درست ہے، کبھی "نون" کو گرا کر "لاک" کہتے ہیں۔ قدیم فارسی میں " ولیکن" کا استعمال درست مانا گیا رفتہ رفتہ "کن" حذف کر کے صرف و لے رہنے دیا۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو سمجھ لینا چاہئے کہ تازی میں " لیکن" استعمال کرنا مقدوح ہے۔ لفظ لیک بغیر "ے" اور "لام الف" کے لکھنا نہ چاہئے۔

لفظ امین و امینی میں اصل "آمن" ہے "آمن" تازی ہے فارسی میں اس کے ہم معنے کوئی لفظ سفرد نہیں ملتا، امینی کا استعمال فارسی میں اس طرح ہو گیا ہے کہ یہ فارسی کا لفظ ہو گیا، اگر امین کو امینی کی شکل میں لکھیں تو غلط نہ ہوگا اسی طرح کثیر التعداد الفاظ ہیں۔

نوع دوم بعض نامناسب اور ناگوار ترکیبوں کا استعمال، استعارات رکیک و مذموم تقدیم و تاخیر، لغو مطالب کا بیان بھی شعر کو گرا دیتا ہے مثلاً ؎

بساز مجلس و پیش من آر جام نبیذ
ہلا کہ دوست بنا گاہیاں فراز رسید

"ہلا" کے بعد کاف صلہ (کہ) کے استعمال نے دوست کو ہلاکی سے قریب کر دیا دوسرا شعر ہے ؎

خرمن زمرغکان گرسنہ خالی کجا بود
ما مرغگان گرسنہ ایم و تو خرمنی

اس شعر کا دوسرا مصرع دیکھئے اس میں "لفظ خرمنی" سے ممدوح "گدھا" ہوگیا، اور مدح کرنے والا دھوبی یا کمہار۔ ایک اور شعر ہے ؎

ہوا چو دریا ماہی چو مرغ کشتی پر
شنا ور انش سیہ زاغکان غرقہ نفوس

اس میں "مرغ چو ماہی" ہونا چاہئے تھا نہ کہ "ماہی چو مرغ" کیونکہ لفظ دریا موجود ہے سیہ زاغکان غرقہ نفوس کے کیا کہنے ہیں۔ اسی رنگ میں ایک صاحب نے ایک شخص کی تعریف کی ہے ؎

قضا دمیکہ ز نور شعاع چشم افتد
نفیر حشر بود چوں صدائے موسیقار

اس سے زیادہ پرلطف اشعار اور نظمیں اردو میں ان جدید النوع شعرا کی ہیں جو اس وقت دعویٰ اجتہاد کے ساتھ ملک سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں، اور تعریف کرنے والے ادا کرتے ہیں۔ اس قسم کے بہت اشعار ہیں جن کا تفصیلی بیان موضوع کو ناگوار بنا دیگا۔

نوع سوم | کسی کی مدح میں اس قدر غلو کیا جائے کہ وہ امر عقلاً محال ہو جائے یا اس سے شریعت اسلام کی توہین ہو۔ انوری کہتا ہے ؎

اگر فنا در ہستی بکل براندازد
ترا چہ باک نہ ذات تو مستعد فناست

وگر بقا نہ بود در جہاں ترا چہ زیاں
بقا بذات تو باقی نہ ذات تو بہ بقاست

علم کلام کا ایک مسئلہ ہے کہ باریتعالےٰ باقی بالذات ہے یا باقی بالبقا ہے۔ دو گروہوں میں اختلاف ہے، انوری کہتا ہے کہ بقا تیری ذات سے باقی ہے۔ غضایری کہتا ہے کہ ؎

صواب کرد کہ پیدا نکرد ہر دو جہاں
یگانہ ریزدِ دادار بے نظیر و ہمال

وگرنہ ہر دو بہ بخشیدے بیگاہ عطا
امید بندہ نماندے بایزد متعال

نوع چہارم | ابتدائے مطلع و قصائد میں ایسا انداز اختیار کرنا جس سے ممدوح کی شان میں بٹا لگ جائے، یا طرز تکلم و خطاب میں بے ادبی و بدتہذیبی ہو اس کی مثالیں بہت ہیں، یہ غلطی از غفلت ابتداء سے ابتک کیجا رہی ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں مشہور استاد نے یہ کہا ہے لہذا درست ہے اس کو عقل قبول نہیں کرتی
عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

اس کے بعد اصناف سخن کے محاسن بیان ہوں گے تاکہ ناظرینِ نگار کے سامنے تصویر کے دونوں رخ ...... آجائیں۔

عیوب شعر و قوافی کے ذکر کے بعد محاسن کا بیان بھی ضروری ہے تاکہ موضوع مضمون تشنہ نہ رہجائے اس امر کا مجھ کو اقرار ہے کہ میرے فاضل اور محترم دوست مولانا نیاز صاحب مدیر نگار نے مجھ کو آمادہ نہ کیا ہوتا تو شاید اس کی تکمیل جلد نہ ہوتی اس لئے اگر یہ مضمون مفید ہو سکے تو قارئین نگار کو مولانا نیاز کا ممنون ہونا چاہئے۔

حسب ذیل محاسن ہیں جو اشعار اور قوافی میں چار چاند لگا دیتے ہیں بلکہ ان کے وجود کے ذمہ دار ہیں۔

تفویف۔ ترصیع۔ تجنیس۔ تکریر۔ مطابقت۔ تشبیہ۔ جمع و تفریق۔ ایہام۔ ایغال۔ تکمیل۔ اغراق۔ استعارہ۔ تمثیل ارورف۔ تبیین۔ تغیر۔ تقسیم۔ توسیم۔ تسہیم۔ تفریع۔ استطراد۔ تلمیح۔ ایجاز۔ مساوات۔ بسط۔ اعتراض التفات۔ تدارک۔ تقابل۔ تاکید المدح بما یشبہ الذم۔ اعنات۔ ذو قافیتین۔ تنسیق صفات۔ سیاقۃ الاعداد۔ توشیح۔ تسمیط۔ ترجیع۔ حسن مطلع و مقطع۔ لطف تخلص۔ ادب طلب۔

ان کی تفصیل اور تشریح بھی سن لیجئے۔

تفویف لغت میں "تفویف" کے معنے کپڑے میں خطوط ڈالنے کے ہیں، ثوب مفوف اس کپڑے کا نام ہوگا جس میں خوشنما خط پڑے ہوں۔ اصطلاح میں تفویف کے معنے یہ ہیں کہ اشعار میں بہتر وزن، شیریں الفاظ، متین الفاظ۔ درست قوافی سہل ترکیب، لطیف معانی کا انتظام اور التزام ہو تاکہ شعر کے سمجھنے میں اور لطف اُٹھانے میں کسی قسم کی دقت اور تعویق نہ ہو ایک طرف تو ان کا وجود ضروری دوسری طرف استعارات بعیدہ، مجازات شاذ، تشبیہات کاذب اور تخلیات متکرر سے احتیاط لازم ہے نظم یا غزل کا ہر شعر بجائے خود مستقل مفہوم رکھتا ہو یہ نہ ہو کہ سمجھنے اور نتیجہ نکالنے کے لئے اور اشعار کی حاجت ہو۔ یہ صورت غزل میں تو بالعموم ہوتی ہے لیکن قصائد میں بھی ہونا ضروری ہے۔ عبارت کہیں پست کہیں بلند نہ ہو، معنوی اعتبار سے بھی اضطراب نہ ہو الفاظ اور قوافی بجائے خود لطف انگیز ہوں یا قصیدہ ہو تو اس میں ایک طرز اور ایک سلسلہ ہو۔ غریب الفاظ سے بچنا اور متروکات سے دور رہنا بھی تفویف میں داخل ہے۔

آج کل فارسی اور اردو کی شاعری بیشتر تفویف سے معمور ہوتی ہے۔ اس کا سبب مذاق اور فن کا فقدان ہے، نظم و ادب جن ہاتھوں میں ہے اُن کو اس کا معمولی سلیقہ بھی نہیں، سمجھنے اور سننے والے تو کیا محسوس کر سکتے ہیں، اس وبا میں اکثریت شامل ہے۔ کلیہ نہیں ہے۔ انوری کے ذیل کے قصیدے میں آخر الذکر ضروریات موجود ہیں۔ عربی کے وہ الفاظ آئے ہیں جو مستعمل ہیں ؎

اے در ضمانِ عدل تو معمور بحر و بر   وے در مسیر کلک تو اسرار نفع و ضر

اے روز گار عدل تو با جبر خاصیت   بیجادہ از تعرض کاہست بر حذر

اے روزگار عادل و ایام فتنہ سوز　　　وے آسمان ثابت و خورشید سایہ در
قدر تو کسوتیست کہ خیاط فطرتش　　　بردوختست زابرۂ افلاک آستر

رشید کہتا ہے :-

اے در کف عزیمت تو خنجر صواب　　　جان عدو سوال، حسام ترا جواب
گنجیست خاطر تو پر از گوہر ہنر　　　چرخیست فکرت تو پر از اختر صواب

ظہیر کہتا ہے :-

گیتی ز فر دولت فرماں دہ جہاں　　　ماند بعرصۂ حرم و روضۂ جناں
بر ہر طرف کہ چشم زنی جلوۂ ظفر　　　وز ہر جہت کہ گوش کنی مژدۂ اماں

یہ تینوں قصیدے طویل ہیں لیکن شروع سے آخر تک ایک رنگ ہے۔

ترصیع لغت میں ترصیع کے معنے نگینہ جڑنے کے ہیں، اصطلاح میں مسجع کرنے اور الفاظ کو وزن اور حروف میں برابر کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ترصیع کی مثال یہ ہے :-

ان الابرار لفی نعیم ان الفجار لفی جحیم

ابرار کے مقابلہ میں فجار اور نعیم کے مقابلہ میں جحیم میں یہی رعایت اور تناسب موجود ہے۔ رشید کے اشعار میں ترصیع کا اہتمام دیکھیے :-

اے منور بتو نجوم جلال　　　وے مقرر بتو رسوم کمال
بوستانیست صدر تو ز نعیم　　　آسمانیست قدر تو ز جلال
خدمت تو مقول دولت　　　حضرت تو مقبل اقبال
در کرامت ترا نبودہ نظیر　　　در شہامت ترا نبودہ ہمال
تیرہ پیش فضائل تو نجوم　　　خیرہ پیش شمائل تو شمال
ہچو اسکندری بہ یمن لقا　　　ہچو پیغمبری بحسن خصال
بزمگاہ تو منبع لذات　　　رزمگاہ تو مجمع اہوال
نہ ملک را از طاعت تو ملام　　　نہ فلک را ز خدمت تو ملال

الفاظ خط کشیدہ سے ترصیع کا اہتمام معلوم ہوتا ہے، یہ پورا قصیدہ مرصع ہے جس سے شاعر کی قدرت اور مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آج کل جو لوگ ترصیع کی حقیقت سے واقف نہیں ہر غزل اور ہر قصیدے کو مرصع کہتے ہیں۔

ترصیع سے ملتا جلتا موازنہ ہے، دونوں میں معمولی فرق ہے، ترصیع کی تعریف ہو چکی،

موازنہ وہ ہے جسمیں حروف خواتیم لفظاً متفق نہ ہوں لیکن سلاست میں ترصیع کا لطف باقی رہے۔ قرآن حکیم میں یہ صنعت بہتر ہے مثلاً

واتینٰہما الکتاب المستبین و ہدینٰہما الصراط المستقیم

مستبین اور مستقیم میں موازنہ ہے۔

مسعود سعد کا ایک قصیدہ اس صنعت میں ہے اس کے دو شعر قابل ذکر ہیں:۔

شاہے کہ زخش اور ادولت بود ذلیل ۔۔۔ شلہے کہ تیغ او را نصرت بود ضماں

اندر بے کمانش زہ بگسلد یقیں ۔۔۔ وندر بے یقینش رہ کم کند گماں

ایک شعر میں موازنہ کا کمال دیکھئے:۔

بہ بزم و رزم تو ماند ہمی خزان و بہار ۔۔۔ بہ تیغ و کلک تو ماند ہمی قضا و قدر

الفاظ بزم و رزم کے ساتھ تیغ و کلک پھر قضا و قدر میں مناسبت کی باریکی اور موزونیت کی لطافت دیکھئے۔ موازنہ اور ترصیع بالعموم آورد کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ کثرتِ مشق "آمد" میں بھی یہ رنگ اس طرح نمایاں کر دیتی ہے کہ آورد کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔

ترصیع قصیدے ہی کے لئے مخصوص نہیں بلکہ غزلوں میں بھی بکثرت موجود ہے۔ (باقی)

کیفی چریا کوٹی

تسکین جاوید

کشمکش ہوں، جفا پرور دہ ہوں، ناکام عشرت ہوں
میں اک بیگانۂ آرام ہوں محروم راحت ہوں
محبت نے مٹا رکھا ہے ——— مجبور محبت ہوں
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

خلش آباد ہے گو میرے محسوسات کی دنیا
ہجوم بیکسی ہے اور مرے جذبات کی دنیا
یہ دنیا ہو گئی میرے لئے آفات کی دنیا
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

برہمن کو مری وحدت پرستی سے شکایت ہے
کلیسا کو مری عصمت پرستی سے شکایت ہے
تو شیخ کعبہ کو فطرت پرستی سے شکایت ہے
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

نہ رفتار زمیں میری نہ دور آسماں میرا
سمجھتا ہوں کہ شاید ہو گیا دشمن جہاں میرا
دل آزاروں کے ہاتھوں لٹ رہا ہے کارواں میرا
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

ہلاک ذوق بھی ہوں نامراد جستجو بھی ہوں
فریب آرزو سے شرمسار آرزو بھی ہوں
چمن میں بھی ہوں اور محروم کیف رنگ و بو بھی ہوں
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

یہاں تک ہوش والوں نے بنایا مجھکو سودائی
کہ تیری بزم تک جانے لگی ہے میری رسوائی
مری فطرت پرستی کو کہا جاتا ہے "ہرجائی"
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

مری بربادیٔ قسمت کا ہر ذرہ ہے فریادی
مری مجبوریوں نے لوٹ لی ہے میری آزادی
ادہر دیکھوں تو بدبختی ادہر دیکھوں تو بربادی
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

میں گم گشتہ ہوں اور ہر رہنما بیزار ہے مجھسے
تلاطم اوج پر ہے ناخدا بیزار ہے مجھسے
زمیں ناراض ہے مجھسے فضا بیزار ہے مجھسے
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

مری تخئیل ہے، بیکار تدبیروں سے وابستہ
مری تدبیر ہے، ناکام تاثیروں سے وابستہ
مری تاثیر ہے، قسمت کی زنجیروں سے وابستہ
مگر تو ہے تو کیا غم ہے

بنایا حسرتوں نے میرے دل کو اپنا گہوارہ
نہ وہ فردوسِ عشرت ہے نہ وہ خُلدِ نشاط آرا
مری آنکھیں ہیں اور ناکامیوں کا تلخ نظارہ
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

عزائم مضمحل ہیں اور منزل دور ہے مجھسے
میں ہوں اک موجۂ آوارہ ساحل دور ہے مجھسے
قدم اُٹھتے نہیں اور تیری محفل دور ہے مجھسے
مگر! تو ہے تو کیا غم ہے

روشن صدیقی

دامنِ کوہ

کوہ کے دامن میں تھا اک روز میں محوِ خرام — کائنات دل ہوائے دہر سے پُر اضطراب
فطرتِ زرکار کی نیرنگیاں تھیں جلوہ زا — تھا چراغ لالہ روشن اور نرگس محوِ خواب
شاخِ گلبن پردہ در دیدہ نگاہ چشمِ گل — ایسی تھی جیسے نکل آئے چمن میں ماہتاب
آبشاریں اس طرح وادی میں تھیں نظارہ سوز — جیسے پانی ہو کے بہ جائے شعاعِ آفتاب
قطرۂ شبنم درخشاں اس طرح تھے پھول پر — جس طرح تاریکیٔ شب میں چمکتا ہے شباب
برف تھی وقفِ روانی موج کے گہوارہ میں — کس قیامت کا سماں تھا یہ طلسمِ سیم و آب
یاسمن، ریحان و سوسن، ارغوان و موتیا — یہ تھے واں دیوانِ فطرت کے نظر افروز باب

دامنِ کہسار کا منظر تھا اتنا دل فریب
در دلِ نظارگی نے صبر ماندہ نے شکیب

غلام ربانی عزیز

واردات

مکاں کماں خدنگِ کماں زمانہ ہوا — فلک کے جور کا دل جب کہیں نشانہ ہوا
عدم سے آنے کو بیتاب میں نہ تھا لیکن — پکڑ کے مجھکو یہی خود تما" روانہ ہوا
الٰہی اس کی ہے بالیدگی قیامت کی! — بلند طوبیٰ و سدرہ سے بھی یہ دانہ ہوا
بلا کو ذوقِ نظر کیا ملا! بقول کسے — سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا
اسی نے چھیڑ دیا حسن و عشق کا قصہ — کہیں تو زلف بنا اور کہیں یہ شانہ ہوا
یہ شمع وہ ہے کہ ہے جسپہ مہر و ماہ کو رشک — کہ ایک اسکو عطا سوز جاودانہ ہوا

یہی وہ قطرۂ شبنم ہے اے امین حزیں
ٹپک سکے جو گلِ ہستی پہ بیکرانہ ہوا

امین حزیں

شاعر کا ترانہ

عجب اک عالم کیف و لطافت ہے مری دنیا
شفق کا رنگ ہے پھولوں کی نکہت ہے مری دنیا

مری اقلیم کی وسعت زمین سے آسماں تک ہے
مرے تخئیل کی رفعت حدود لامکاں تک ہے

جو آنکھیں بند کر کے چشم باطن کھول کر دیکھوں
تو ہر ذرے میں صحرا ہر ستارے میں قمر دیکھوں

اگر چاہوں تو پرواز تخیل کی لطافت سے
نکل کر میں دکھا دوں عالم امکاں کی وسعت سے

کبھی جھیلوں سے دلچسپی کبھی دریا سے دلچسپی
کبھی خلوتکدوں میں ساغر و مینا سے دلچسپی

کبھی بے حاصلی میں روز و شب برباد ہوتا ہوں
کبھی بے کار ہنستا ہوں کبھی بے کار روتا ہوں

رباب دل سناتا ہوں پہاڑی آبشاروں کو
تخیل کے پروں پر اڑ کے چھو آتا ہوں تاروں کو

میں اکثر رات کی تنہائیوں میں اٹھ کے روتا ہوں
نم گریہ کے آب گرم سے دامن بھگوتا ہوں

مرے کانوں میں شب کو وہ ندائے درد آتی ہے
جو ساز دل کے ہر نغمے کو آ کر چھیڑ جاتی ہے

یہ وہ نغمے ہیں جن میں اک قیامت کا ترنم ہے
کہ معنے کچھ نہیں پھر بھی سماعت کیف میں گم ہے

غرض اک راز پنہاں ہے یہ سرشاری یہ سرمستی
کبھی پستی میں رفعت ہے بلندی میں کبھی پستی

مرے مانند دیکھا کر مناظر چشم حیرت سے
فضائے قلب کو لبریز کر وجدان فطرت سے

نوائے شوق سے بھر دے رباب دل کے تاروں کو
نظر میں جذب کر لے ساری دنیا کی بہاروں کو

حقائق سب عیاں ہو جائیں گے رندی و مستی کے
بلندی کی طرف لے جائیں گے جذبات پستی کے

(ذوقی)

خوشی اور غم

چمک اے برق ہاں اک بار پھر تو با دم تازہ
جھپک سے تیری، تاریکی کا ہو جاتا ہے اندازہ

نظر پر ہو گئیں قصر الم کی ظلمتیں روشن
خوشی کی اک جھلک کے واسطے کھلتے ہی دروازہ

حامد اللہ افسر بی اے

غزلیات

آزاد انصاری

لطف کی آنکھوں سے کیا دیکھا کہ دم پر آبنی
ملے جز اک اللہ اچھا لطف کا انداز تھا

ہم کسی سے بات کیا کرتے کہ شرم ضبط تھی
ہم کسی سے درد کیا کہتے کہ دل کا راز تھا

آپ کے الطاف کیا تھے جور کی تمہید تھی
آپ کی امید کیا تھی یاس کا پرواز تھا

تیرے انداز ستم بھی لطف سے خالی نہیں
برہمی کیا تھی کہ خاصا التفات ناز تھا

اکبر حیدری

یہ ستم - اک خواہش موہوم پر ؟
لطف فرما خاطر مغموم پر !

اے مسرت میرے غمخانے سے دور
یہ گرانی اور میرے مقسوم پر ہو

پرسش حالات غم سے درگزر
رحم فرما اب دل مرحوم پر

صبر کرتی ہی رہی بے چارگی
ظلم ہوتا ہی رہا مظلوم پر

اک تبسم تھا جواب آرزو
وسعتیں قرباں ہوئیں مفہوم پر

ابتدائے غم کی دور اندیشیاں
شاد ہوں انجام نامعلوم پر

آج تک اکبر ہوں میں ثابت قدم
جادۂ خودداری موہوم پر

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

یوں ہی نہ بھلا دے کوئی آئین وفا کے
کیا جانے ملا کیا انہیں بیکس کو رلا کے

سب قتل کی حسرت ہی لئے مر گئے آخر
بے درد نے دیکھا بھی نہیں آنکھ اٹھا کے

عبرت ہی کو رہنے دو یہ ٹوٹی ہوئی قبریں
کیوں نقش مٹاتے ہو مزار شہدا کے

سر تھام کے بیٹھے تو جگر تھام کے اٹھے
اس دل نے اٹھایا یونہیں سو بار بٹھا کے

بے سود ہے آہ سحری اے دل صد چاک
پھولوں کو کوئی گوندھتا ہے رات بسا کے

سنتے تھے اثر کو کہ ہیں وہ عقل کے پتلے
لو آج چلے آتے ہیں دل مفت گنوا کے

تبسم نظامی

اس ضد کو کیوں نہ بانئ دل کہا نہ جائے   قاتل اُسے کہوں جسے قاتل کہا نہ جائے
طوفانِ التجا ہو، جو سربپوش تو رہے   اور حالِ زار تیرے مقابل کہا نہ جائے
اس درجہ آشنائے محبت بنا مجھے   نقشِ خیال کو مرے باطل کہا نہ جائے
مرنا بھی اس کے ہجر میں دشوار ہو گیا   اب موت کو بھی عشق کا حاصل کہا نہ جائے
وہ لطف چاہتا ہوں میں اسکی نگاہ سے   جس کی طلب کو درد کا حاصل کہا نہ جائے
کیا کیا کہا نہ جائے اُسے پیش آئینہ   دلکش کہا نہ جائے کہ قاتل کہا نہ جائے

ہو جائے وقفِ گریہ تبسم خدا کرے
دیوانۂ تبسم قاتل کہا نہ جائے

جگر بریلوی

وہ برق جلوہ کہاں اور کہاں یہ خرمنِ ہوش   سمجھ کے حالتِ دل ہو گیا کوئی روپوش
نگاہِ ساقئ مدہوش نے کر دیا بے ہوش   فضائیں گونج رہی ہیں صدائے نوشا نوش
یہی ہے رمزِ محبت یہی ہے رازِ فنا   برنگِ برق طپاں رہ برنگِ باد خموش
ابھی تو شورِ قیامت لگی تھی آنکھ مری   جگا کے چھیڑ دیا پھر وہی فسانۂ دوش
کسی کا ذکر زباں تک ابھی نہ آیا تھا   بھڑک کے شمع صفت ہو گیا کوئی خاموش
وہ آئی نزع کی ہچکی بدل گئی دنیا   مریضِ ہجر کہاں ہے ترا وہ جوش و خروش

جگر کو دیکھ کے اہلِ نظر یہ کہتے ہیں
جہان ساتھ لئے پھر رہا ہے خانہ بدوش

حافظ غازیپوری

صدائے بازگشت آتی نہ ہو نہ آرزو میری   خدا جانے سناتی ہے مجھے کیا گفتگو میری
جہاں سے دیکھتا ہوں میں فروغِ منظرِ فطرت   صلائے ہوش دیتی ہے "تمنائے نمو" میری
عجب پر کیف دورِ نیم شب تھا یادِ جاناں میں   کہ رقصِ حسنِ انجم بن گئی ہر آرزو میری

فضائے گل میں جب بکھرے نظر آئی ترے جلوے فضائے رنگ و بو ہو ہو کے نکلی آرزو میری
گذر جا مست و بیخودی بچاکر اپنے دامن کو بھری ہر ساغرِ دل میں شراب تندخو میری

تلاش حسن میں مجکو ملا غم کا نشاں حافظ
فنائے عشق ہوکر کام آئی جستجو میری

کیف مرادابادی

دل پھر ہے ایک حشر تمنا لئے ہوئے قطرہ ہے پھر کنار میں دریا لئے ہوئے
رسوائی خیال کی اللہ رے احتیاط مدت ہوئی ہے نام تمھارا لئے ہوئے
میں اور تم سے ہر کرم و لطف کی امید تم اور مجھ سے رنجش بیجا لئے ہوئے
اب دیکھتا ہوں کون رہیگا حجاب میں میں جا رہا ہوں ذوق تماشا لئے ہوئے
میری نگاہ شوق کا یہ جوش دیکھنا اٹھے حریم ناز کا پردا اٹھائے ہوئے

پھر چھیڑتا ہے تار رگ جاں کو کوئی کیف
ہاتھوں میں ایک تیز سا دشنہ لئے ہوئے

کیفی چریاکوٹی

بہ محشر آں ستمگر نزد تو یارب چہ جا دارد کہ از خون شہیداں شوخیش رنگیں قبا دارد
ز حسن و عشق چیزے با رقیباں کے تواں گفتن نہ حسنش ابتدا دارد نہ عشقم انتہا دارد
نمی دانم کہ باچارہ گراں از خویش چوں سازم دلم درد تو میدارد، اگر دارد بجا دارد
بگرداب بلا ہر کس بقدر ہمتش کو نشد حریفاں ناخدا دارند و دل یاد خدا دارد
بہ بخت عاشق بیتاب تدبیرے نمی گنجد بنازم ہمت دل راکہ درد لا دوا دارد
ہمیدانم کہ جان ناتوان من بہ تن بالد نمی دانم صبائے کوئے او با خود چہا دارد
نشست و شوئے طوفان سرشکم ہم بجا ماند مگر داغ جبین من عجب رنگ وفا دارد
بہ فکر روزگارے او ست و دل را نیست پروائے ز شاہے، ایں گدائے بینوا شانے جدا دارد
دلم در سینہ و درد فراق تو بدل باشد ببیں جانباز عاشق چوں بلا اندر بلا دارد
بہ سر سودا و در دل شوق و حسنش در نظر زیبد اگر عاشق جز ایں دارد چہا دارد کجا دارد

منم چون شبنم و آں صورت مہر جہانتابے — نگاہِ شوخ باید شکوۂ عاشق چہ دارد
بجانم می خرام و سوئے چشم جلوہ می افگن — کہ ایں شوقِ جدا واں لذت و لطفِ جدا دارد
زکیفی، دین و دل ہر دو فدایت ہیچ می پرسی
دو عالم را نمی خواہد کہ او شوقِ شما دارد

اب بھی وقت ہے

باب الاستفسار

(ز۔خاتون ۔ رائے بریلی)

مجھے نگار کے خریدار ہونے کا فخر تو حاصل نہیں ہے لیکن اتفاق سے کل اپنی ایک عزیز بہن کے پاس آپکے رسالہ کا مکمل فائل دیکھنے کو ملگیا۔ آپ یقین کیجئے کہ مجھے کبھی اس رسالہ سے دلچسپی نہیں ہوتی، جسمیں ہماری جنس کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ اس لئے یہ دیکھکر تو مجھے مسرت ہوئی کہ آپ کبھی کبھی نسائیات پر گفتگو کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ حیرت بھی ہے کہ آپ کے خیالات بعض مسائل میں متضاد نظر آتے ہیں۔

آپ ایک طرف اس کے بھی مخالف ہیں کہ عورتیں انشاء لطیف کی طرف متوجہ ہوں اور دوسری طرف پردہ کے بھی زیادہ حامی نظر نہیں آتے، تعلیم اور بلند تعلیم کے بھی طرفدار ہیں، پھر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ پردہ اُٹھ جانے کے بعد اگر عورتیں آزادی کے ساتھ تعلیم حاصل کرینگی تو ان بعض افراد کے لئے جن کی فطرت انشاء لطیف کی طرف مائل ہے کیونکر افسانہ نگاری یا غزل نگاری سے باز رہ سکتی ہیں اور جب مردوں کے لئے اس میں کوئی قباحت تسلیم نہیں کیجاتی تو عورتیں کیوں باز رکھی جائیں۔ خدا کے لئے یہ معمہ حل کیجئے اور زحمت نہ ہو تو جواب سے ممنون فرمائیے

(نگار) محترمہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے نگار کی جلدوں کا مطالعہ زیادہ سرسری (نسائی) انداز سے کیا ہے ورنہ آپ میرے اقوال میں تضاد محسوس نہ کرتیں۔ میں مروجہ پردہ کو یہی نہیں کہ اچھا نہیں سمجھتا بلکہ اس کو عورت کی توہین سمجھتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک وہ عورتیں جن کو "عفت و حیا" کا درس دینے کے لئے سنگین حصار اور اجباری پردہ کی ضرورت ہے ہرگز اپنی پاکیزگی اور نسائیت پر فخر نہیں کرسکتیں۔ پردہ نام ہے حیا کا اور حیا کی تعریف "غض بصر" کی گئی ہے۔ اگر ایک عورت زنداں کے اندر رہنے کے بعد اس صفت سے خالی ہے تو تمام قید و بند بیکار ہے اور اگر برافگندہ نقاب ہوکر وہ اس خصوصیت کی مالک ہے تو اُس کو "پابزنجیر" کیوں کیا جائے۔ پردہ اُٹھ جانے کے بعد فتنۂ و فساد کا احتمال بہت ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ انسان کا "نفسیاتی" میلان یہی ہے کہ وہ ہر اس چیز کی خواہش کرے جو اُس سے دور ہے، اس کے لئے عسیر الحصول ہے ایک عورت برقعہ کے اندر دیدہ و دل کو جس قدر بیتاب بنا سکتی ہے وہ کشف حجاب کے بعد ممکن نہیں۔ ہندوستان کی پردہ نشین خواتین اگر آج سب کی سب بے نقاب ہوجائیں تو یقیناً ان میں سے ۸۰ فیصدی ایسی ہونگی جو کوئی توجہ حاصل نہ کرسکیں گی۔ (حالانکہ زیر نقاب رہنے کی حالت میں یہ بھی اگر مرکز نگاہ نہ بنتیں تو مرکز خیال

ضرور تھیں) پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ فتنہ و فساد کا احتمال کس حالت میں زیادہ ہے اور اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کا کیا جواب ہے کہ اس اندیشہ سے جو نسل کی نسل تباہ ہوتی جا رہی ہے اس کا ذمہ دار کس کو قرار دیا جائے گا۔

عورتوں کا ضعیف و کمزور رہنا، امراض میں مبتلا پایا جانا، دنیا کی رفتار سے بے خبر رہنا، مطالعۂ فطرت سے محروم رہنا حقائق فطری کا نہ ہونے کی وجہ سے اوہام میں مبتلا رہنا، بے سلیقہ ہونا، غیر نظیف زندگی بسر کرنا، اور ان نقائص کی وجہ سے بچوں کی صحیح تعلیم اور صحیح تربیت نہ کر سکنا، کیا آپ کے نزدیک یہ ایسی معمولی باتیں ہیں جن کے دور کرنے کے لئے پردہ کی قربانی (ایک ایسی رسم کی قربانی جو شرعاً و اخلاقاً کسی طرح ہم پر عائد نہیں ہوتی) کوئی بڑی چیز ہے۔

عورتوں کے بے پردہ ہونے کا سب سے پہلا لازمی اثر یہ ہوگا کہ وہ صاف ستھرا رہنا سیکھیں گی۔ گھر کی چیزوں کو سلیقہ و ترتیب سے رکھیں گی، معاشرت میں صفائی و پاکیزگی پیدا ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سوسائٹی میں انکا مرتبہ بلند ہو جائیگا اور جو بچے اس ماحول میں پرورش پائیں گے وہ بھی پست خیال نہ ہوں گے۔ ایک عورت اپنے گھر کے اندر جہاں اُس کو یقین ہے کہ کوئی غیر شخص آکر تنقیدی نگاہ نہیں ڈال سکتا بدتر سی بدتر حالت میں رہ سکتی اور اُسے میلے کپڑے، کثیف گھر، منتشر و بے ترتیب چیزوں کی طرف بھی توجہ نہیں ہو سکتی، لیکن یہ جاننے کے بعد کہ یہاں کوئی غیر بھی آسکتا ہے وہ کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتی، اور اُس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ خود بھی صاف رہے، بچوں کو بھی صاف رکھے گھر کی چیزوں میں ترتیب و سلیقہ پیدا کرے، انگریزوں کے ہاں جو آپ کو ہر گھر فردوس کا ٹکڑا نظر آتا ہے اس کا یہی سبب ہے۔ میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ چونکہ عیسائیوں کی مالی حالت ہندوستانیوں سے اچھی ہے اس لئے وہ ایسی معاشرت کے پابند ہو سکتے ہیں، کیونکہ آپ غریب عیسائیوں کا مقابلہ اپنے ہاں کے امراء کی معاشرت سے کر کے دیکھیں گے تو بھی یہی فرق نظر آئے گا۔ علاوہ اس کے محض سلیقہ اور صفائی کے لئے روپیہ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمیز اور احساس کی ضرورت ہے، اور اسی کا ہندوستان کی عورت میں فقدان ہے۔

ایک نقص ہمارے ہاں کی عورتوں میں یہ بھی ہے کہ ان کا وقت اکثر بیکاری اور تعطل میں گزرتا ہے جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اُنکے پاس کوئی کام نہیں ہے۔ اگر بچوں کی تعلیم و تربیت کا اُن کو سلیقہ حاصل ہو، امور خانہ داری میں ان کو ترتیب و تہذیب پیدا کرنے کی فکر ہو، گھر کی صفائی ستھرائی کا خیال ہو، زنانہ دستکاری سیکھنے کی طرف ان کو توجہ ہو تو انکا ایک لمحہ بیکار نہیں جا سکتا۔ لیکن ان باتوں کی طرف توجہ ہو ہی نہیں سکتی جب تک الزام یا تنقید کا ڈر نہ ہو اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح تنقید غیر ہی کر سکتا ہے۔

پردہ اٹھا دینے کے یہ بالکل ابتدائی فوائد ہیں جو میں نے بیان کئے، رہا تعلیم کا مسئلہ سو اس کے متعلق میں اپنے خیالات تفصیل کیساتھ نگار میں بیان کر چکا ہوں اُن کو ملاحظہ فرمائیے۔

میں یہ کبھی نہیں چاہتا کہ ہندوستان کی عورتیں اپنے بطون کے لحاظ سے یوروپین ہو جائیں، لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اُنکے عمدہ خصائل اختیار کریں۔ تعلیم کا اثر کبھی کسی پر خراب نہیں ہوتا، خواہ وہ مشن اسکول میں ہو یا کسی اور جگہ۔ اصل چیز جو زندگی کو تباہ کرنے والی ہے وہ تربیت کا نقص ہے جس کی سب سے پہلی ذمہ دار ماں ہے اور ماں اسی وقت اچھی تربیت کرنے والی ثابت

ہوگی جب خود اس کے اخلاق بلند ہوں، معاشرت پاکیزہ ہو، وقت کی قدر شناس ہو، اصول صحت سے واقف ہو، رسم و رواج اور اوہام کی پابند نہ ہو۔ اس لئے اس وقت سوال لڑکیوں کی تعلیم کا نہیں ہے بلکہ ماؤں کی تعلیم و تربیت کا ہے اور اس کا سب سے پختہ عملی نکتہ روشن خیال بنانے کا ذریعہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان کو مکان کی چار دیواری سے باہر نکالا جائے اور مطالعۂ عالم کا موقعہ دیا جائے

میں بیشک اس کے خلاف ہوں کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر عشقیہ فسانہ نگاری اور غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوں، کیونکہ اول تو اُن کی تعلیم اس قدر معمولی ہوتی ہے کہ وہ پوری طرح اچھے بُرے فسانہ یا غزل میں تمیز ہی نہیں کر سکتیں چہ جائیکہ خود لکھنا، دوسرے یہ کہ وہ لڑکی جس کی تعلیم کا نتیجہ اس طرح ظاہر ہوگا۔ اس کے متعلق عملی دنیا میں کوئی اچھی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی مردوں کے لئے اگر اس کو جائز قرار دیا جاتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بہر نوع اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے اور اُن کو پورا کرنے پر مجبور ہے؛ علاوہ بریں اس کی غزل گوئی یوں بھی اس قدر لایعنی و لغو سی بات ہے جس کا کوئی اثر اُس کی زندگی پر نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ اس کے حال سے بالکل علٰحدہ چیز ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے ایک عورت اگر غزل گوئی کی طرف مائل ہوگی تو اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ وہ حقیقتاً ایک کیفیت سے متاثر ہے اور اگر اس تاثر کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو اس کا اثر نہ صرف ازدواجی و مادری زندگی بلکہ سوسائٹی پر بھی پڑے گا البتہ اگر کوئی خاتون اپنی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بلند ہوگئی ہے اور فطرت نے اس کو نابغۂ ادب پیدا کیا ہے تو چنداں حرج نہیں لیکن سوال تو صرف یہ ہے کہ عام طور سے جو یہ ذوق آج کل کی لڑکیوں میں پیدا ہوتا جاتا ہے وہ کس حد تک جائز ہو سکتا ہے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے ان خرابیوں کا بڑا سبب علاوہ نقص تربیت کے نقص تعلیم بھی ہے۔ جہاں کسی لڑکی کو کچھ پڑھنا لکھنا آیا وہ فطرتاً قصہ کہانیوں ہی طرف مائل ہوتی ہے اور اس کے والدین اس خیال سے کہ اچھا ہے اسی طرح کچھ لکھنے پڑھنے کی مشق ہو جائے مزاحمت نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ذوق گندہ لٹریچر کے سامنے رہنے سے آہستہ آہستہ مگر نہایت مہلک طور پر نشو و نما پاتا رہتا ہے اور آخر کار ذوق میں ایسی زہرآلود تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر اس کا علاج دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر شروع ہی سے اسکا انتظام کیا جائے کہ لڑکیوں کے سامنے جو لٹریچر آئے وہ مفیدِ ذہن و دماغ، مصلحِ معیشت و معاشرت ہو تو کبھی کوئی خرابی پیدا نہیں ہو سکتی۔

اس وقت زنانہ نصاب کی بہت سی کتابیں پائی جاتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض نہایت خوب ہیں اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے بنگالی ناگن، طرحدار لونڈی، میٹھی چھری دیکھنے کی اجازت اُن کو دی جائے۔

معلومات

برقپاروں کے عجائب

۱۸ر جون ۱۸۱۵ء کو نپولین اور ولنگٹن، واٹرلو کے میدان میں متصادم ہوتے ہیں اور سارا یورپ نتیجہ کا منتظر ہے اسی دن نو بجے رات کو سارے یورپ کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور نپولین کو شکست ہو جاتی ہے۔ انگلستان جو صرف ۲۰۰ میل کے فاصلہ پر تھا تمام دن اس حقیقت سے بے خبر رہتا ہے کہ اس کی فوج دن بھر کس قدر سخت جنگ میں مبتلا رہی۔ ۱۹ر کو بھی اسے کوئی علم نہیں ہوتا۔ ۲۰ر کی شام کو کچھ حال معلوم ہوتا ہے اور تین دن بعد ۲۱ر کو ولنگٹن کی تحریر سے مفصل کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ امریکہ کو اس کا حال تین ہفتہ کے بعد اور آسٹریلیا و نیوزیلینڈ کو اس سے بھی زیادہ انتظار کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ یہ حال ۱۸۱۵ء کا تھا۔ لیکن اب ۱۹۲۷ء کو ملاحظہ کیجئے ۱۹ر اگست ۱۹۱۲ء کو ساکو اور وانزٹ کا برقی قصاص ہوتا ہے اور ۹۰ سکنڈ میں ساری دنیا اس سے آگاہ ہو جاتی ہے۔ یعنی ۱۸۱۵ء میں جتنی دیر ایک سوار کو اپنے گھوڑے پر سوار ہونے میں لگتی تھی، اتنے عرصہ میں اب بحر و بر کے ہزاروں میل طے ہو جاتے ہیں۔

ایک معصوم صورت انسان بمبئی سے عدن جانے کے لئے جہاز پر سوار ہوتا ہے، وسط بحر میں جہاز جا رہا ہے اور وہ نہایت اطمینان سے بیٹھا ہوا باتوں میں مصروف ہے کہ دفعۃً ایک شخص آ کر اس کے ہاتھ میں ہتکڑی ڈال دیتا ہے کیونکہ وہ بمبئی سے کوئی جرم کر کے بھاگا تھا اور عدن پہونچنے سے قبل ہی لاسلکی کے ذریعہ سے سارا حال جہاز کے کپتان کو معلوم ہو گیا تھا۔

اب سے ایک صدی قبل کسی خوش منظر مقام دیکھنے کے لئے سیکڑوں میل کا سفر کرنا پڑتا تھا لیکن اب وہ گھر کے دروازہ ہی پر عکاسخانہ میں موجود ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ تم ہندوستان میں بیٹھ کر لندن کی آواز سن سکتے ہو اور وہاں کا ڈراما دیکھ سکتے ہو۔ یہ ان ہزاروں مثالوں میں سے چند مثالیں ہیں جو برقپاروں کی بدولت ظہور میں آ رہی ہیں۔ لاسلکی ٹیلیفون، تصاویر متحرکہ برقی روشنی، کہربائی قوت، طیارے، جہاز، اور تمام وہ مقامات جہاں مشین کا چھوٹے سے چھوٹا پہیہ بھی گردش کر رہا ہے، سائنس اور طبیعیات ہی کی ترقی کے ممنون ہیں۔

اس صدی میں طبیعیات اور کیمیا نے جن عجائب و غرائب کو دنیا میں منتشر کر دیا ہے وہ حقیقتاً خیال انسانی سے بھی کچھ بلند نظر آتے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ ابھی تک اس کی انتہا ہمارے سامنے نہیں آئی اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس ترقی کی آخری منزل کیا ہوگی۔

اب زمانہ قدیم و قدامت کا نہیں رہا۔ ہر چیز جدید ہے، اور جدت و ندرت ''ابداع و اختراع ہی کی حکومت دنیا میں قائم ہوگی، فضائے آسمانی کی تحقیق، اثیر کی جستجو، نئی نئی شعاعوں کی تحقیقات، نئی نئی قوتوں کی تلاش ماہیات و حقیقیات کی

تفتیش جاری ہے اور ہر چند ہمیں یہ سنکر حیرت ہوتی ہے کہ کائنات کے ایک ایک ذرہ میں پورا نظام شمسی پایا جاتا ہے۔ لیکن ہم انکار کی کوئی وجہ بھی نہیں پاتے اور اگر کل کو کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ صرف ایک ذرہ کی مدد سے ساری دنیا کو ہلاک کر سکتا ہے تو ہمیں اسپر بھی ایمان لانا پڑے گا کیونکہ ہم لوگ جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ صرف سجود و نیاز کی دنیا ہے اطاعت و فروتنی کی فضا ہے، عجز و درماندگی کی سرزمین ہے اور ہم کو اُن کے مقابلہ میں چون و چرا کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

ہمارے ہاں کے مولوی خواہ کتنے ہی برہم ہوں، لیکن اگر انھیں کبھی انگلستان یا فرانس جانا پڑا تو مسجد کی اذان انہیں مائکروفون اور لاسلکی مکبرۂ صوت ہی سے سننی پڑیگی اور اگر ان کی نسل منقطع نہ ہوگئی، تو حج بھی اسی طرح لاسلکی ہوا کریگا اور گھر بیٹھے عرفات و منیٰ کے میدان سامنے آجایا کریں گے۔

پھر اگر مذہب اور اہل مذہب موجودہ ارتقاء کا ساتھ نہیں دیسکتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس میں قابل الزام کون قرار دیا جائیگا؟ وہ جسنے گھر بیٹھے بغیر کسی زحمت کے لاسلکی حج کر لیا یا وہ جس نے مذہب کے حدود کو وسیع نہ کر کے تمام مہذب دنیا کیلئے اس کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

جاپان کی صحافت

اگر کسی قوم کی حالت کا صحیح اندازہ کرنا ہو، تو اس کی صحافت پر غور کرو جس سے تم کو ان کی فردی و اجتماعی زندگی، ان کے عزائم و آمال اور ان کے اخلاق و عادات کا تجربی علم ہو سکتا ہے۔ اس لئے تمدن جدید میں سب سے بڑی قوت جس سے کسی متنفس کو انکار نہیں ہو سکتا، صحافت کی قوت ہے۔

یورپ میں بلا استثناء تمام ممالک اس لحاظ سے بہت ترقی یافتہ ہیں اور ان میں جرائد و رسائل کی کثرت اب اس حد سے بڑھ گئی ہے کہ اس کا بار بار ذکر کیا جائے لیکن بدقسمت ایشیا میں صرف جاپان ہی ایک ایسا خوش نصیب ملک ہے جو اس لحاظ سے ممالک یورپ کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت جاپان میں بعض اخبار ایسے ہیں جن کی اشاعت روزانہ بیس لاکھ ہے اور لطف یہ ہے کہ ان میں سوائے سیاسی، اقتصادی، علمی و ادبی مضامین کے اور کچھ نہیں ہوتا جیسا کہ یورپ کے اخبار میں محض توسیع اشاعت کے لئے جرائم اور طلاق وغیرہ کے قصے بھی درج کئے جاتے ہیں۔

ان جرائد میں سے ایک جریدہ کی آمدنی بارہ ملین ڈالر (یعنی تقریباً ساڑھے تین کروڑ روپیہ) سالانہ ہے جس میں خالص نفع ڈھائی ملین گنی ہوتا ہے۔ یہ سنکر ممکن ہے کسی کو شک پیدا ہو کیونکہ جاپان کی وسعت صرف امریکہ کے ایک صوبہ کالیفورنیا کے برابر ہے اور آبادی صرف ساڑھے چھ کروڑ ہے (حالانکہ اس کے مقابلہ میں امریکہ کی آبادی گیارہ کروڑ سے زیادہ ہے) لیکن یہ واقعہ ہے کہ آبادی اور وسعت کے لحاظ سے جاپان کی صحافت امریکہ کے مقابلہ میں زیادہ وسیع و ترقی یافتہ ہے

جاپان میں اس وقت ۱۱۴۷ روزانہ اخبار، ۲۴۵۰ ہفتہ وار اور ماہوار رسائل شائع ہوتے ہیں۔ اور روزانہ اخبارات کی مجموعی اشاعت دس کروڑ ہے۔ یعنی ہر چھ آدمی کے لئے ایک کاپی شائع ہوتی ہے۔ اس ترقی کا راز صرف وہاں کی وسعت

تعلیم ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ مدارس ابتدائی سے فارغ ہونے والے طلبہ ۱۹ فیصدی ثانوی مدارس میں جاتے ہیں اور جملہ مدارس کی تعداد وہاں ... ۴۴ ہے جن میں ایک کروڑ ۵ لاکھ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔

وہاں مطالعۂ کتب کا شوق جسقدر بڑھا ہوا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۱۹۲۵ء میں ۸۲۰۰۰ کتابیں مختلف علوم وفنون کی شائع ہوئیں اور یوروپین ممالک کی کتابیں ۵ لاکھ گنی قیمت کی ملک میں آئیں۔

ابھی ہمنے ذکر کیا ہے کہ جاپان کے اخباروں کی اشاعت ایک کرور تک پہونچی ہوئی ہے اس کی تقریباً نصف اشاعت صرف اُن دس بڑے بڑے اخبارات کی ہے جو ٹوکیو اور اوساکا سے شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک اخبار کی اشاعت ۱۲ لاکھ اور دوسرے کی ۸ لاکھ روزانہ ہے۔

چھ سال کا زمانہ ہوا کہ اوساکا کے اخبار نے نہایت عظیم الشان عمارت طیار کرائی جو پانچ منزل کی ہے اور جسپر ۲۵ لاکھ گنی صرف ہوئی۔ اسی طرح ٹوکیو کے اخبار نے ۳ لاکھ گنی صرف ایک عمارت اپنے لئے طیار کرائی۔ ٹوکیو اور اوساکا کے دونوں شہروں کے درمیان خبریں وغیرہ بیجانے کے لئے ہر وقت پانچ ہوائی جہاز کام کرتے رہتے ہیں۔ ان اخباروں میں باہم مقابلہ بھی نہایت شدید ہے۔ اگر ایک اخبار شام کا اڈیشن مفت تقسیم کرتا ہے تو دوسرا بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ جاپان کے اخباروں کی ایک عجیب غریب خصوصیت ان کے ضمیمے یا تتمے ہیں جو روزانہ تیرہ تیرہ شائع ہوتے ہیں اور ہر شہر کے لحاظ سے علٰحدہ ہوتے ہیں۔ یہ ضمیمہ ایک چھوٹا سا ورق ہوتا ہے اور اخبار بیچنے والے جب اس کو لیکر نکلتے ہیں تو یہ عالم ہوتا ہے گویا حشر برپا ہے اور ہر شخص اس بے صبری کے ساتھ اس کو لینا چاہتا ہے گویا وہ اندیشہ کرتا ہے کہ کہیں یہ دنیا تباہ ہو جائے اور میں اس خبر کے پڑھنے سے محروم رہوں۔

خبریں حاصل کرنے کے لئے یہ اخبارات بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء کے زلزلۂ جاپان کی خبریں حاصل کرنے کے لئے اوساکا کے اخبار نے ۴۴ ہزار گنی صرف کی جلد سے جلد خبر حاصل کرنے کے لئے جو اہتمام کیا جاتا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جب ۱۹۲۶ء میں شاہ جاپان بستر مرگ پر تھا اوساکا اور ٹوکیو کے دونوں اخباری کمپنیوں نے قصر شاہی ہی کے قریب دو مکان کرایہ پر لئے اور وہاں اپنے اپنے مخبر متعین کئے تاکہ ہر لحہ کی خبر جلد سے جلد مرکز تک پہونچائیں پھر اسی کے لئے نئے ٹیلیفون تصویر لینے کے کیمرے پیام رساں کبوتر، موٹر سائکل، ہوائی جہاز وغیرہ ہر وقت ہر مکان میں طیار رہتے تھے اور ساٹھ آدمی شب و روز جاگتے رہتے تھے۔

اوساکا کے اخبار میں ۳۶۴۵ آدمی کام کرتے ہیں جن میں ۴۰۵ شعبۂ تحریر میں ہیں اور ۲۶۰ شعبۂ ادارت میں۔

امریکہ کی دولت گزشتہ سال امریکہ کی دولت و ثروت اس حد تک پہونچ گئی کہ اس سے قبل تاریخ میں اس کا نظیر نہیں ملتا یعنی زمانۂ قدیم میں بھی کوئی سلطنت ایسی نہیں ہوئی جو اتنی بڑی ثروت کی مالک رہی ہو۔

اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کا قرض اس وقت دوسرے ملکوں پر اس قدر ہے کہ اگر تمام دنیا کی سونے کی پیداوار کو سہ چند کر دیا جائے تو بھی قرض کی مقدار زاید ہوگی۔ اس وقت امریکہ کے بنکوں میں ایک ارب ۹۰ کرور گنی تو فیری کی

صورت سے پائی جاتی ہیں ۱۸ لاکھ پتیلیوں کی تعداد وہاں گیارہ ہزار سے کم نہیں ہے۔ وہاں کی پبلک کے پاس ۲۰ کروڑ بیس لاکھ موٹریں اور ٹیلیفون اور آلات لاسلکی کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ اگر تمام دنیا کے ٹیلیفون اور آلات لاسلکی شمار کئے جائیں تو بھی امریکہ سے کم ہوں گے۔ تمام ملک میں ریل کا ایسا جال پھیلا ہوا ہے کہ تمام دنیا کی ریلوں سے ۳۰ فی صدی زیادہ ہے صرف وہاں کے سیاح ہر سال ۱۲ کروڑ گنی صرف کرتے ہیں۔

صناعت و زراعت کے لحاظ سے بھی انکا تفوق ظاہر ہے کیونکہ باوجود اس کے کہ آبادی میں وہ یورپ کے پانچویں حصہ سے زیادہ نہیں ہے۔ تمام دنیا کی زرعی و صناعی پیداوار میں نصف سے زیادہ انکا حصہ ہے۔ ۱۹۲۶ء میں ۵۵ فیصدی رہا ۵۱ فیصدی تانبا ۶۲ فیصدی پٹرول، ۴۳ فیصدی کوئلہ، ۵۲ فیصدی لکڑی ۸۰ فیصدی گندھک اور ۵۵ فیصدی روئی اہل امریکہ نے پیدا کی۔ چنانچہ اسی دولت کا نتیجہ ہے کہ صرف ایک شہر نے ایک سال کے اندر سے ۵ لاکھ گنی گھوڑ دوڑ بازی کی تفریح میں صرف کر دئے اور یونیورسٹیوں پر ۶۰ ملین گنی کی جائداد انھوں نے وقف کر دی۔

دارالاشاعت پنجاب لاہور

عورتوں کے لئے کتابیں

وہ تصانیف جو اخبار تہذیب نسواں کے سلسلے میں شائع ہو کر ملک میں بیحد مقبول ہوئیں اور جن کا ہر تعلیم یافتہ گھرانے میں موجود ہونا ضروری ہے

خانہ داری

محترمی محمدی بیگم صاحبہ مرحوم اڈیٹر تہذیب نسواں کی نہایت ہی مفید اور قابل عمل تصنیف جو نہایت سلیس سادہ اور دلنشین انداز میں لکھی گئی ہے اس کتاب میں ۴۴ مضامین ہیں۔ جو خانہ داری کی تمام ضروریات پر حاوی ہیں۔ مکان باورچی خانہ خرید اجناس۔ غلہ و اجناس کی حفاظت۔ کھانے پینے کے متعلق مختلف قسم کی ہدایات۔ مہمان میزبان۔ پوشاک۔ غسل۔ ضبط۔ اوقات۔ کتب خانہ۔ بچوں کی تعلیم و تربیت۔ بیماری اور اس کا علاج۔ زچہ خانہ۔ کفایت شعاری۔ تقریبات۔ خانہ داری۔ اخلاق۔ ان میں سے چند مضامین ہیں کتاب امیروں اور غریبوں کے یکساں طور پر مفید ہے اور کامیاب زندگی کی جانب مستورات کی رہنمائی کرتی ہے۔ قیمت ۱۲ر

نعمت خانہ - ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک تمام ہندوستانی کھانوں۔ نیز انگریزی کھانوں بیماروں کی غذاؤں اور اچار۔ چٹنیوں اور مربوں کی نہایت صحیح ترکیبیں۔ خود کئی بار تجربہ کرنے کے بعد لکھی گئی ہیں۔ طبع چہارم قیمت ۱۲ر

رفیق عروس - یعنی نئی دلھن کی سہیلی جو اسے سسرال کی زندگی کامیابی سے بسر کرنا سکھاتی ہے۔ طبع چہارم قیمت ۱۲ر

آداب ملاقات - وہ تمام آداب جو مہذب و معزز گھرانوں میں مہمان اور میزبان برتتے ہیں۔ طبع چہارم۔ قیمت ۶ر

طبیب نسواں - عورتوں اور بچوں کے عام امراض کا بیان اور انکی سستی اور مجرب دوائیں۔ ہر بیاہی عورت کے لئے مفید کتاب قیمت عمر

بچے کی تندرستی - بچے کی پیدائش سے لے کر سیانے ہونے تک کی حالت کے متعلق ضروری باتیں اور تدابیر حفظ صحت قیمت ۱۲ر

خواب راحت - ہندوستان کی مشہور اور دلچسپ لوریاں اور بچوں کا دل بہلانے کے فقرے طبع سوم قیمت ۴ر

رسوم دہلی - دہلی کی بیاہ شادی کی دلچسپ رسوم کا تذکرہ قصے کے پیرائے میں۔ قیمت ۴ر

عورتوں کی انشاء - خط و کتابت کی بہترین رہنما کتاب قیمت عمر

ہفتہ وار اخبار تہذیب نسواں

لڑکیوں اور عورتوں کے لئے سب سے پہلا ہفتہ وار۔ پابند اوقات۔ کثیر الاشاعت اور مقبول عام اخبار جو تیس سال سے جاری ہے اور جس میں خانہ داری۔ مذہب و اخلاق۔ تربیت اطفال۔ حفظ صحت۔ تاریخ و سیر دستکاری اور معاشرتی مسائل پر مقبول و مدلل مضامین شائع ہوتے ہیں اور ہفتے بھر کی ضروری خبریں اور عالم نسواں کے واقعات درج کئے جاتے ہیں۔ نمونہ مفت چندہ سالانہ صر

دارالاشاعت پنجاب ۱۹۵ - ریلوے روڈ۔ لاہور۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴ جلد ۱۳ - شمارہ ۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ کو شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول عہ

فہرست مضامین مئی ۱۹۲۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۲　　مئی ۱۹۲۸ء　　شمارہ ۵

ملاحظات

وقت و موسم کی قوت مسلم ہے اور تمام عالم خلق کا تغیر بڑی حد تک اسی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، انسان کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح اس کے مضر و مکلف اثرات کا مقابلہ کرے، اور چونکہ فطرت کے ساتھ اس کی یہ جنگ ابتدائے کائنات سے چلی آ رہی ہے، اس لئے اس قدر کہنہ مشقی کا فائدہ صرف یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وہ بقدر جبر حیات کامیاب بھی ہو جاتا ہے، لیکن اکثر نہیں۔ مدعا یہ ہے کہ لکھنؤ کا آتشیں موسم شروع ہو گیا ہے۔ اور اب "دلِ راحت طلب" کو اکثر اُستاد وزیر کا یہ مصرع یاد آتا رہتا ہے کہ:-

زمینِ کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

اگر ان حالات کے ماتحت آئندہ چند ماہ میں کوئی "بدحواسی" مجھ سے سرزد ہو جائے تو معاف فرمایا جاؤں، کیونکہ اب پریس کی نگرانی کے خیال سے میں لکھنؤ کو چھوڑ کر باہر کسی سرد مقام پر بھی یہ زمانہ بسر نہیں کر سکتا۔

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں جو مضمون کلام دردؔ کے متعلق شائع ہوا تھا، اسپر جناب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے بھی ایک طویل مضمون مرحمت فرمایا ہے۔

جو مقالہ گزشتہ اشاعت میں، جناب آرگس کا شائع ہوا تھا اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ دیوان درد جو نظامی پریس

بدایوں سے شایع ہوا ہے وہ بہت غلط ہے اور اسی سلسلہ میں کلام درد کے جو مختلف جدید و قدیم نسخے ملے اُن کا مقابلہ کرکے یہ بتایا گیا کہ فلاں شعر میں فلاں نسخہ قابل اعتبار معلوم ہوتا ہے۔

جناب اثر لکھنوی کو اکثر مقامات پر جناب آرگس کی تحقیق سے اتفاق ہے لیکن مرسلہ مضمون میں صرف اختلافات کو ظاہر کیا گیا ہے، مگر یہ اختلافات اکثر و بیشتر وہ ہیں جو صرف ذوق سلیم اور قیاس کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں۔ حالانکہ ضرورت یہ تھی کہ بحث کو کلام درد کے مختلف نسخوں ہی تک محدود رکھ کر انھیں کے اندر قیاس سے کام لیا جاتا۔ بہرحال جناب اثر لکھنوی کی یہ انتہائی "ادب پرستی" ہے کہ اُنھوں نے باوجود کثیر مشاغل کے یہ مقالہ تحریر فرمایا جو غالباً کسی آئندہ اشاعت میں درج ہو سکیگا۔

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں، جناب آسی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے، مجھ سے ایک جگہ غلطی ہو گئی ہے اس کو ظاہر کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں — جناب آسی کا شعر ہے :-

کرم اے تمکنتِ حسن غریبوں پہ کرم کیا ملیگا انھیں خود بین و خود آرا کر کے

میں نے یہ سمجھ کر کہ دوسرے مصرع میں "انھیں" کا مرجع "غریبوں" ہے، یہ اعتراض کیا تھا کہ غریبوں یعنی عشاق میں خود بینی و خود آرائی پیدا ہونے کی پیشین گوئی نامناسب ہے۔ لیکن جناب آسی نے فرمایا کہ انھیں سے مراد انکا محبوب ہے، اور میں نے سمجھنے میں غلطی کی جسکا مجھے اعتراف ہے اس صورت میں شعر پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

کلام آسی پر تنقید کے سلسلہ میں گزشتہ ماہ کچھ فقرے میرے قلم سے ایسے بھی نکل گئے ہیں، جن سے ایک شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ شاید میرے نزدیک لکھنؤ میں کوئی شاعر آج تک ہوا ہی نہیں اور نہ اس وقت موجود ہے۔ مضمون شائع ہونے کے بعد جب میں نے اُسے غور سے پڑھا تو میں نے بھی اس کو محسوس کیا اور تکلیف کے ساتھ محسوس کیا۔ میرا مقصود ہرگز وہ نہیں تھا جو عام طور پر سمجھا گیا، بلکہ مدعا یہ تھا کہ عام طور پر یہاں کا موجودہ رنگِ سخن اچھا نہیں ہے اور غالب حصّہ متشاعرین کا ہے۔ وہ حضرات جو اپنی بعض خصوصیات شعری کے لحاظ سے شاعر تسلیم کر لئے گئے ہیں اُن کی طرف یہ روئے سخن نہ تھا۔

اس ماہ کے مضامین میں دوسرا مضمون میر ممنون کی شاعری پر ہے جسے جناب آسی نے لکھا ہے۔ ممنون کا کلام اس وقت تقریباً نایاب ہے اس لئے جناب آسی کی یہ کوشش قابل تحسین ہے کہ انھوں نے ممنون کی شاعری سے ہمکو روشناس کرایا ہرچند ممنون میرے نزدیک شاعر ہونے کے لحاظ سے کوئی خاص مرتبہ نہیں رکھتے اور نہ وہ اس درجہ لائق ستائش تھے۔ جس قدر جناب آسی نے انھیں سراہا ہے لیکن یہی کیا کم ہے کہ عہد ذوق و غالب کے ایک نہایت ہی مشہور و مستند شاعر کے کلام کا انتخاب اس طرح ہاتھ آگیا جو اس سے قبل کہیں شائع نہیں ہوا میری رائے میں جناب آسی نے بہترین خدمت ادب انجام دی ہے۔

کلیات قطب شاہ پر جناب عالی رفاعی نے جو تحقیقی و تنقیدی مضمون تحریر کیا ہے وہ ہر چند دلچسپ اور سلجھی ہوئی عبارت میں نہیں لکھا گیا ہے، لیکن کام کی چیز ضرور ہے۔

موجودہ مضمون "تذکرۂ آبحیات" پر اس مہینے کے رسالہ میں شروع کر دیا گیا ہے اور آئندہ ماہ کی اشاعت میں ختم ہو جائیگا آرگس نے اس مضمون میں صرف اُن فاحش اغلاط یا غلط بیانیوں کے دکھانے کی کوشش کی ہے جو آزاد سے قصداً یا سہواً سرزد ہوئیں اور جو ایک مورخ یا تذکرہ نویس کے لئے حد درجہ باعث ننگ ہو سکتی ہیں۔ آزاد کی آب حیات پر اس کے انشاء کے لحاظ سے بھی بحث کرنا پیش نظر ہے، لیکن چونکہ وہ ایسا زیادہ اہم موضوع نہیں ہے اس لئے اس کو کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی رکھا گیا۔ آبحیات کی طرز تحریر پڑھنے والے کے سامنے جس منظر کو پیش کرتی ہے وہ قریب قریب وہی ہوتا ہے جو آپ نے کٹھ پتلیوں کے تماشہ کے وقت دیکھا ہوگا کہ بادشاہ کا دربار قائم ہے اور چوں چوں کرتی ہوئی پتلیاں یکے بعد دیگرے آتی جاتی ہیں اور تماشہ والا ان کا تعارف کراتا ہے کہ یہ بیربل ہیں، یہ فیضی ہیں یہ فلاں ہیں، ——— میرے نزدیک اس سے زیادہ کوئی اہمیت آبحیات کی انشاء کو حاصل نہیں ہے۔ تذکرہ یا تاریخ کے لئے جس سادہ و سنجیدہ زبان کی ضرورت ہے اس کی ہوا بھی آبحیات کو نہیں لگی اور طرز تحریر کے اسی نقص نے آزاد کے لئے تحریف میں اس قدر آسانیاں پیدا کر دیں۔ آبحیات کا مقدمہ ایک مستقل تنقید کا محتاج ہے کیونکہ اس میں آزاد نے اور زیادہ بے راہ روی سے کام لیا ہے ممکن ہے اسی سلسلہ میں وہ بھی آجائے

نظموں میں مسٹر حامد اللہ افسر کی نظم "پنکھڑیاں" کے عنوان سے ایک خاص رنگ کی شاعری ہے جو لوریوں کا جواب کہی جا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں بچوں کے لئے کوئی لٹریچر نثر میں بھی ایسا موجود نہیں ہے جو ان کے سادہ و معصوم دماغ کو فطری اصول کے لحاظ سے اپنی طرف متوجہ کرے، چہ جائیکہ نظم، اس لئے افسر صاحب کی یہ کوشش یقیناً قابل داد ہے اور ضرورت ہے کہ دیگر شعراء بھی اس طرف متوجہ ہوں۔

جناب حافظ غازی پوری کی نظم "عروس سحر" کا اکثر حصہ خوب ہے اور جس نزاکت خیال کے ماتحت شروع کیا گیا ہے اُس کو اخیر تک نباہنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈائری کے سلسلہ میں جو واقعہ یا فسانہ شروع ہوا تھا وہ اس ماہ میں ختم ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس لئے اس کو جگہ دی گئی کہ یہ سب سے اخیر میں لکھا گیا ہے۔ اور یہی کاپی ہمیشہ سب کاپیوں کے بعد ہی چھپتی ہے آئندہ بھی ڈائری کا سلسلہ قائم رہیگا "چنگاری" غالباً جون میں ختم ہو جائے۔ "زن مرید"، جناب عابد بلہوری کا فسانہ ہے اور انشاء و طرز بیان کے لحاظ سے خوب ہے۔ پلاٹ بھی برا نہیں ہے۔ محشر عابدی کا "نغمہ پرست" مسز بیسنٹ کے کسی مضمون سے لیا گیا ہے۔

نیاز فتحپوری

ڈائری کا ایک ورق

(مسلسل)

درین روش بچہ امید دل تواں بستن
میانۂ من و او شوق حائل افتادست

شنبہ ۶

کل کے انکشافات ایسے نہ تھے کہ میں یوں آسانی سے رات بسر کر لیتا، سوچتا رہا کہ افضال نے جو کچھ کہا وہ ناممکن تو نہیں ہو سکتا لیکن اُس کے لئے ممکن ہونا ایک حد تک ضرور ناممکن معلوم ہوتا ہے غالب کا یہ شعر بار بار مجھے یاد آیا اور سوچتا رہا کہ اگر افضال کا بیان درست ہے تو پھر اس کے نفسیاتی توجیہ اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ

میانۂ من و او شوق حایل افتادست

کیونکہ شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے میں نہ اس نزاکت کا قایل ہوں کہ

"ہاتھ آدیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے"

اور نہ اس خلاف فطرت جذبہ کا کہ

"میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے"

یہ سب تاویلاتِ بدنصیبی ہیں، ورنہ جن ہونٹوں کا انکار بھی حوصلہ افزا ہو، ان کے اقرار کا کیا کہنا۔ بہرحال صبح ہونے کے بعد نہ اس لئے کہ افضال کے واسطے کوئی تدبیر نکالوں، بلکہ محض بربنائے شوقِ جستجو یہ جی چاہا کہ کچھ وقت تنہائی شیریں کا ملجاتا تو اس باب میں اس کے خیالات بھی معلوم کرتا۔ میں اب جلد واپس جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہی دن کے اندر کام کا کسقدر انبار ہو گیا ہوگا میں نے ایک دفعہ گھبرا کر سامنے میز سے کاغذ کا ایک پرزہ لیا تاکہ اس کو اطلاع دوں، اتنے میں افضال آگیا، میں نے اس سے ذکر کیا تو وہ ہنسا اور بولا کہ "نہیں اب اس کی ضرورت نہیں رہی، جو دنیا کل تھی آج نہیں ہے، آپ سے گفتگو کرنے کے بعد حالات میں بہت انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ شیریں سے بہت جلد جدا ہو جاؤنگا۔ کیونکہ انسان اپنی زندگی میں بہت سے کھیل ایسے بھی کھیل سکتا ہے، جن کو کمیڈی یا ٹریجڈی بننے سے پہلے ہی ختم ہو جانا چاہیے۔"
میں نے اُسے تعجب سے دیکھا اور پھر بالکل بے اختیارانہ طور پر دریافت کیا۔ "کب" ——— "شاید آج ہی ابھی"

سارا دن گزر گیا اور شیریں سے ملاقات نہ ہو سکی، وہ کسی خاص معاملہ میں اپنے مشیر قانونی سے مشورہ کرنے گئی تھی، اُس کے جانیکے بعد افضال سے یہ مختصر گفتگو ہوئی اور پھر اُس کا بھی پتہ نہ چلا۔ شام کو وہ واپس آئی تو بہت مسرور نظر آتی تھی، مجھے دیکھتے ہی چہک

افضال ہیں" میں نے کہا وہ تو آپ کے بعد ہی فوراً چلے گئے اور پھر نہیں آئے" وہ یہ سنکر کچھ سوچتی ہوئی اپنی خوابگاہ میں داخل ہوگئی اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے اندر بلاکر کہا "آپ نے کچھ اور بھی سنا، یہ دیکھئے آپ کے افضال صاحب میرے نام ایک خط چھوڑ گئے ہیں ملاحظہ کیجئے :-

۱۹ر نومبر - ۸ بجے صبح

میری آپکی زندگی کا افتراق، جسے دنیانے ہمیشہ اپنی غلطی سے یا ہم لوگوں کی غلط تعبیر حیات سے اتحاد سمجھا اسوقت سے متوازی چل رہی ہیں، جب آپ نے تھک کر اور میں نے آپ کو تھکا ہوا جان کر، ایک راستہ کو بغیر چلنے بوجھے منزل تک پہونچنے والا سمجھ کر اختیار کر لیا۔ پھر جس طرح دو ہمسفر مسافر اس اندیشہ کی بنا پر کہ دوسرا تنہائی میں اس کی دولت نہ لوٹ لے، ایک محتاط خاموشی کے ساتھ راستہ کاٹ دیتے ہیں، اسی طرح میں نے اور آپ نے یہ سفر اختیار کیا اول اول تو اس نے بہت لطف دیا، کیونکہ یقین تھا کہ منزل پر پہونچنے کے بعد خاموشی وضبط کا یہ کھیل اسی طرح ختم ہو جائیگا کہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑیں گے اور گلے مل جائیں گے لیکن بعد کو ہم نے محسوس کیا کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ منزل کا نشان کچھ دھندلا ہوتا جاتا ہے اور راستہ کی اٹھکیلیاں سنجیدگی میں تبدیل ہو رہی ہیں مجھے نہیں معلوم کہ آپ اپنی جگہ کن جذبات کو لئے ہوئے تھیں لیکن جہاں تک میں نے غور کیا، آپ کے اوقات بھی چند دن بعد اس فکر میں بسر ہونے لگے کہ نقاب کے نیچے کا اصلی چہرہ کیونکر دکھایا جائے اور جس "غلط" کو "صحیح" بنا کر پیش کیا گیا ہے، اس کو کس طرح مٹایا جائے پھر، اس تمثیل کی دنیا میں، آپ نے کتنے دن زندگی بسر کی؟ اس میں شک نہیں کہ یہ زمانہ چند سال کا تھا لیکن جب اُسے گذرنا پڑا تو معلوم ہوا کہ مکر وفریب کی زندگی کا ہر ہر لمحہ ایک مستقل "گرانجانی" ہوتا ہے اور اس کا تحمل بسا اوقات بہت دشوار ہو جاتا ہے

ہم لوگ جس تہذیب کے عادی ہو گئے ہیں اس کی مثال ایک بازیگر کا صندوق ہے جس کے اندر سے وہ ہر مرتبہ ہاتھ ڈال کر ایک ہی چیز کو مختلف صورتوں میں پیش کرتا ہے، درانحالیکہ حقیقت ان سب سے جُدا ہے چنانچہ اس وقت بھی جبکہ میں تمام قدیم رشتوں کو توڑنے کے لئے آمادہ ہوں ——————— اتنی جرأت نہیں کر سکتا کہ جو کہنا ہے صاف صاف کہہ دوں، بلکہ وہی پیچیدگی وہی ایک ایک جملہ میں بیسیوں منحنی زاویے وہی "کجامی نماید کجامی زند" کی قسم کا انداز بیان اب بھی قائم ہے — خیر بہر حال کوشش کرونگا کہ کم از کم اپنے چہرہ سے تو اب نقاب الٹا ہی دوں اور ممکن ہو تو آپ کو بھی بے نقاب کر دوں۔ سنئے، دنیا میں مرد وعورت کی یکجائی اس حال میں کہ وہ یکذات نہیں ہیں اس قدر مہمل وبے معنی چیز ہے کہ کوئی ذی عقل اس کی تاویل کر ہی نہیں سکتا احسان کی وہ حد نہایت ہی خطرناک ہوتی ہے جب دوسرا اپنے عدم استحقاق کو محسوس کرنے لگے اور میرے خیال میں محسن کشی کے جذبات اسی جگہ سے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگر آج میں اپنے آپ کو آپ سے منحرف پاتا ہوں تو اس کا سبب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ مجھ میں اب آپ کے الطاف وکرم کے برداشت کرنے کی تاب نہیں ہے اور میں لیا

محسوس کرنے لگا ہوں کہ آپ اپنی عنایتوں سے اس حال میں کہ میں ان کا مستحق نہیں ہوں مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہیں۔
بہر حال آج میں اپنے دل کی بغاوت کا آپ سے اعلان کرتا ہوں اور مجبور ہوں کہ کوئی راہ اپنی زندگی کی ایسی نکالوں جو جسمانی حیثیت سے خواہ کیسی ہی مجروح کیوں نہ ہو، لیکن روحانی حیثیت سے بے نیاز اور پرسکون ہو۔
اب جو کبھی سوچتا ہوں کہ اتنے دن میں نے کیوں اور کس اُمید پر آپ کے ساتھ بسر کئے تو "ساحل و موج کا تعلق میرے پیش نظر ہو جاتا ہے اور اپنی تشنہ لبی" کے جمود پر افسوس کرتا ہوں، ممکن ہے آپ کو اپنی "تموج تابی" پر اب بھی فخر و ناز ہو۔ بہر حال جس طرح ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے، اسی طرح میرے صبر و ضبط کی بھی ایک عمر تھی جو آج ختم ہو گئی اور میں اُس کی موت کا اعلان آپ سے بھی کر رہا ہوں۔
میں چند دن سے اس مسئلہ پر غور کر رہا ہوں کہ جب دنیا میں رہنا ہے تو اس کے مقرر کردہ اصول پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، اور اس لئے دوا کے ایک تلخ گھونٹ کی طرح ازدواج کے غیر شاعرانہ طریقہ کو بھی برداشت کرنا چاہئے، لیکن چونکہ آپ کی طرح میں نے بھی اس کو کبھی پسند نہیں کیا تھا اس لئے کہنے کی جرأت نہ ہوئی اب بھی اس کا ذکر اس لئے نہیں کرتا کہ آپ مان ہی لیں، بلکہ صرف اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ آپ اس کے بعد مجھ سے نفرت ہی کرنے لگیں اور اس طرح بھی مجھے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جانے کا بہانہ ہاتھ آ جائے۔
چونکہ میں اب اس معاملہ میں زیادہ رومان پیدا کرنا مناسب نہیں سمجھتا، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ میں ایک خودکشی کرنے والے کی طرح ایسی اطلاع دوں جس کا کوئی علاج ممکن نہ ہو، میں ابھی یہیں رہوں گا اور سیسل ہوٹل میں قیام کروں گا
میں سمجھتا تھا کہ اس خط کا شیریں پر بڑا اثر ہوگا، اور ممکن ہے کہ ایک عورت کی طرح اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آ جائیں، لیکن یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ وہ بہت مسرور و مطمئن تھی اور جس وقت میں خط پڑھ چکا، تو ایک ایسے قہقہہ کے ساتھ جو میں نے کبھی نہیں سنا تھا اُس نے وہ خط مجھ سے واپس لیا اور کہا کہ "مہربانی کرکے آپ افضال کے کمرہ میں جائیے اور دیکھئے ان کے نام کا کوئی خط تو وہاں نہیں ہے، اگر ہو تو لیتے آئیے"
میں گیا تو ایک لفافہ اس کے نام کا میز پر موجود تھا، میں اس کو لے آیا۔ اُس نے دیکھ کر کہا کہ "آپ کو زحمت تو ہوگی، لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ اس کو برداشت کریں گے اور یہ تحریر ان تک اسی وقت پہونچا دیں گے"
مجھے پہلے کچھ حیرت ہوئی کہ یہ کیا قصہ ہے لیکن اس کے سمجھنے سے زیادہ ضروری یہ معلوم ہوا کہ کسی طرح افضال سے جا کر ملوں ——— جس وقت میں پہونچا تو وہ برآمدہ میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرایا اور بولا کہ "میں سمجھتا تھا کہ آپ آئیں گے"
میں نے کہا ——— "مگر یہ تو نہ معلوم تھا کہ آئیں گے اور کچھ ساتھ لائیں گے" میں نے وہ خط اُسے دیا اور جب اُس نے کھولا تو یہ معلوم کرکے سخت حیرت ہوئی کہ شیریں نے یہ خط اس کے خط لکھنے سے دو گھنٹہ قبل لکھا تھا۔

خط بہت مختصر تھا لیکن توارد خیال کی عجیب وغریب مثال۔ اس کا مضمون یہ تھا:۔

۱۹ نومبر ۶ بجے صبح

میری آپ کی خاموش جنگ آج ختم ہوتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ میں اپنی شکست کا اعتراف کرتی ہوں اور میرا یہ خط لکھنا گویا آپ کے سامنے سپر ڈال دینا ہے۔

ہرحال اب چارۂ کار سوائے اس کے کوئی نہیں کہ خیالی دنیا کی زندگی ختم کرکے سوسائٹی کے اصول پر کاربند ہوں اور وہی کروں جو اس سے قبل کرنا چاہئے تھا۔

آج میں اپنے مشیر قانونی سے گفتگو کرکے، کل ہمیشہ کے لئے عمل کے لحاظ سے بھی وہی ہو جاؤنگی جو اب تک خیال کے لحاظ سے تھی۔

یعنی آپ کی ہمیشہ

شیریں

شام کے وقت وہ منظر بھی کس قدر دلکش تھا کہ افضال و شیریں دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے افضال اس امر پر متاسف تھا کہ کیوں نہ اس کو شیریں کا خط پہلے ملگیا اور شیریں اس بات پر نادم کہ کیوں اُس نے خط لکھنے میں دو گھنٹہ کی عجلت کی۔

یہ بھی قدرت کی ستم ظریفیاں ہیں کہ پہلے تو پورے چھ سال ان دونوں کے اس کوشش میں بسر کرائے ایک دوسرے پر غالب ہو کر نتیجہ تک پہونچیں اور پھر جب فیصلہ کا وقت آیا تو صورت یہ پیدا کردی کہ دونوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ شکست کا معترف تھا۔ میں نے یہ منظر دیکھا اور دونوں کو مخاطب کرکے کہا کہ:۔

وہ صلح جو فریقین کی شکست پر قائم ہوتی ہے زیادہ مستحکم ہوا کرتی ہے" انھوں نے سنا اور ایک دوسرے کو دیکھکر مسکرانے لگے

نیاز

جدید نمایندۂ نگار

اس وقت تک متعدد نمایندے نگار کے ہوئے، لیکن سب بیکار ثابت ہوئے۔ لیکن اب جناب تبسم نظامی علیگڑھی نے اس خدمت کے بار کو اپنے سر لیا ہے اور فی الحال یوپی کا دورہ کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ ارباب ذوق اُن کی سعی کو مشکور بنانے میں کوشش فرمائیں گے

نیاز فتحپوری

میر ممنون

دہلی کے مایۂ ناز شعراء میں سے ایک ہستی میر ممنون کی بھی تھی، میر ممنون کا نام نظام الدین اور تخلص ممنون تھا۔ مگر تخلص کچھ ایسا اس قدر مشہور ہوئے کہ لوگ اصل نام بھول گئے۔ ممنون، میر قمر الدین منت کے بڑے بیٹے تھے۔ قدیم وطن سونی پت تھا۔ رسم زمانہ کے موافق ابتدائی کتابیں مختلف اساتذہ سے پڑھیں مگر انتہائی درسی کتب کی تکمیل اپنے والد سے کی، فارسی کی درسیات تمام وکمال پڑھیں اور عربی کی بھی بقدر ضرورت تحصیل کی۔ جب شعر و شاعری کی طرف توجہ کی تو ابتدائی کلام پر اصلاح بھی اپنے والد سے لی۔ چنانچہ اسی پر ناز کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ممنون اک جہاں کو ہے اپنے سخن سے فیض منت کی تربیت سے ہوئے فیضیاب ہم

مذہب کے بارہ میں اگرچہ اہل تذکرہ خاموش ہیں مگر ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہب امامیہ کے پیرو تھے، جو ان کے والد کا مسلک تھا، چہاردہ ائمہ معصومین کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

احمد کہ تمام آل اس کی ہے نیک ساتھ اس کے ہیں متحد سیزدہ لیک
نام اس کا جو طٰہٰ ہے کر اس میں تک غور چودہ یہ عدد ہیں پہ حقیقت میں ایک

کیا نعت رتبۂ علی کیجئے بیاں ہر فکر بلند آکے ہو پست یہاں
جس دوش پہ تھا مہر نبوت کا نقش بنتا ہے وہیں اسکے قدم کا بھی نشاں

اسی قسم کی متعدد رباعیاں اور متعدد اشعار ان کے دیوان میں پائے جاتے ہیں جس سے ان کے مذہب و مسلک پر کافی روشنی پڑتی ہے۔
میر ممنون اوائل عمر میں دلی میں رہے اس کے بعد اپنے والد کے ہمراہ کچھ دن تک لکھنؤ میں قیام رہا مصحفی، انشاء وغیرہ کے ساتھ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے اور یہاں انکی مشق کی قوت نہایت ترقی کر گئی

وہ جب لکھنؤ سے دہلی کی جانب واپس گئے تو وہ وقت تھا کہ اکبر شاہ ثانی دہلی کی سلطنت ختم ہو چکی تھی۔ پھر بھی چونکہ علم و فضل کی قدر دانی خاندان تیموریہ کی خصوصیت تھی لہذا بہت سے شعراء اون کے دامن فیض سے وابستہ تھے شاہ نصیر اور ان کے معاصرین کا دہلی میں طوطی بول رہا تھا۔ ذوق اور غالب مومن وغیرہ کی شاعری کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا۔ بادشاہ کو شعر و شاعری کا شوق تھا اور خود بھی کبھی کبھی کچھ کہتے تھے۔ ذرہ تخلص کرتے تھے۔ میر ممنون کی شہرت چونکہ کافی ہو چکی تھی اس لئے آتے ہی دربار تک رسائی ہوئی اور چند ہی روز میں بادشاہ کے استاد مقرر ہوئے اور پیشگاہ سلطانی سے فخر الشعراء کا خطاب ملا۔ مفتی صدر الدین آزردہ انہیں

کے شاگرد تھے۔

دربار شاہی میں انکی کافی قدر دانی ہوئی مگر حکام انگریزی نے اور بھی قدر دانی کی اور صدر الصدوری کے ممتاز عہدہ پر متعین کرکے اجمیر بھیجدیا جہاں وہ ۱۲۴۰ھ بلکہ ۱۲۵۰ھ تک رہے دلی اس وقت باکمالوں سے بھری ہوئی تھی کبھی کبھی وطن کی کشش اتنے دور دراز مقام سے کھینچکر دلی لے آتی تھی۔ اور یہاں مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔

آخر عمر میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوکر مستقلاً دہلی چلے آئے تھے اور یہیں ۱۲۶۰ھ میں ہنگامۂ غدر کے بعد انتقال کیا۔ تاریخ وفات یہ ہے:—

میر ممنوں از جہاں بگزشت ونزد عاقلے   زندگی رہ از ممات او بود حکم ممات
سر بجیب فکر بردم گفت ناگہ پیر عقل   "شاعر شیریں زبان ہند" تاریخ وفات

میر ممنون کی شاعری

جس زمانہ میں میر ممنون شعر و شاعری کی دشوار گزار وادی کو طے کر رہے تھے وہ زمانہ ایسا تھا کہ دہلی سیکڑوں باکمالوں کا مجمع تھا اور دلی ان کی ذات سے مایۂ فخر و ناز بنی ہوئی تھی۔ مومن۔ آشفتہ۔ صہبائی۔ ذوق آزردہ۔ غالب۔ شاہ نصیر۔ رنگین۔ انشا۔ مصحفی ایسے باکمال اپنے فیض کمال سے علمی محافل و مجالس کو آراستہ رکھتے تھے سودا۔ میر۔ درد۔ سوز اور قائم کے رنگ کو بدل کر شاعری کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ پرانے الفاظ اور محاورے شعر سے خارج کر دئے گئے تھے اسلوب بیان میں ایک خاص قسم کی جدت پیدا ہوگئی تھی۔ اسیوجہسے اس دور میں بجز ان لوگوں کے جو حقیقتاً اہل تھے کسی کو شہرت نہ ہوسکتی تھی، چنانچہ میر ممنون کا اُس عہد میں مشہور ہوجانا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ کوئی خاص بات اپنے اندر رکھتے تھے ۔ وہ نہ صرف دربار تک پہونچے بلکہ شاہ وقت کے استاد بنے اور نہ صرف استاد ہی بنے بلکہ بیٹھگاہ سلطانی سے فخر الشعراء کا معزز خطاب بھی حاصل کیا۔ اور یہ نیکنامی صرف خطاب ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ بڑے بڑے اہل کمال ان کے کمال کے بارہ میں یکدل و یک زبان ہوگئے۔ مصحفی انکو ایک اعلیٰ درجہ کا خوشگو جانتے ہیں بلکہ انکو ان کے باپ کے برابر مانتے ہیں۔ شہزادہ مرزا قادر بخش صابر اپنے تذکرۂ گلستانِ سخن میں ان کو ایک طرز تازہ کا مخترع ٹھراتے ہیں۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ جن کی بے پناہ تنقید اچھے اچھوں کو نیچا دکھاتی ہے۔ متعدد تعریفی جملوں سے گلشن بیخار میں یاد کرتے اور ہر طرح انکی استادی کے مقر رہوتے ہیں۔ سرسید مرحوم آثار الصنادید میں لکھتے ہیں۔ کہ سخن میں ایک طرز تازہ ایجاد کیا۔ مولوی عبد الغفور ایسے بیباک تذکرہ نویس بھی لکھتے ہیں کہ شعر ان کے بہت خوب ہوتے ہیں۔ اور تو اور میرزا نوشہ مرزا غالب جب میر مہدی کو خط لکھتے ہیں تو میر ممنون کو کس افسوس کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ ان کے نہونے سے دلی کو ایک ویرانہ سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں "ا دمیاں سیدزادے۔ آزادے۔ دلی کے عاشق دلدادے۔ ڈھئی ہوئی اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں۔ مومن خاں کہاں۔ ایک آزردہ سو خاموش۔ دوسرا غالب وہ بیخود و مدہوش نہ سخنوری رہی نہ سخندانی کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی وائے دلی بھاڑ میں جائے دلی۔

طرز خاص کے ایجاد کے بارہ میں غور و خوض کے بعد میں صرف اسی نتیجہ پر پہونچ سکا کہ متقدمین کا جو طرز بیان تھا ممنون نے اس کو بدلکر ایک تازہ طریقہ جسپر مومن اور غالب خصوصیت سے کاربند تھے ایجاد کیا۔ فارسی ترکیبوں سے اپنے کلام کو گل و گلزار بنایا اور معنی آفرینی کے پھولوں سے اس کو چمن زار بنایا اگر غالب کسی طرز خاص کے موجد و مخترع ہیں۔ اگر مومن نے کوئی طرز تازہ اور روش خاص نکالی تو یقینی ممنون بھی موجد ہیں۔

ممنون کی خصوصیات کلام میں سے دو چار باتیں بے شک و شبہہ ایسی ہیں کہ اونکو ان کے معاصرین سے ممتاز بنا دیتی ہیں مثلاً ایک یہ کہ وہ نہایت دقت پسند طبیعت رکھتے ہیں ایسی سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کہتے ہیں کہ ذوق اور شاہ نصیر سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اگرچہ مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کرنا کسی شاعر کے واسطے باعث فخر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ بسا اوقات ذوق سلیم سے شاعر کو ہٹ جانا پڑتا ہے۔ لیکن ممنون کے ہاں یہ عیب نہیں ہے۔ مشکل سے مشکل ردیف و قوافی میں انکی سیکڑوں غزلیں ہیں۔ اور دیوان میں یہ رنگ عام ہے۔ مگر بدمذاقی کا کہیں نام نہیں۔ سیلاب آتش کا۔ آب آتش کا، کس قدر مشکل زمین ہے مگر ممنون اسمیں یہ شعر نکالتے ہیں ؎

نگاہ گرم سے اُسکی دل بیتاب کِس پر
حریف آخر ہوا یہ پارۂ سیماب آتش کا
مرے یہ گرم آنسو پونچھ مت دستِ حنائی سے
کہ ان آنکھوں سے رہتا ہے رواں سیلاب آتش کا

در حباب کا۔ گر حباب کا۔ ایک مہمل زمین ہے مگر کہتے ہیں ؎

ہر آبلہ ہے دل کا دوچار فغان گرم
صرصر سے یاں مقابلہ ہے ہر حباب کا
دریا میں کون رشکِ قمر دہو رہا ہے منہ
لبریز ماہتاب ہے ساغر حباب کا

اسیطرح ہر ردیف میں مختلف مشکل زمینیں بے تعداد ہیں مگر وہ معاملات حسن و عشق کو نہایت ہی خوبی سے ادا کرتے چلے جاتے ہیں ل نے غش کیا۔ گل نے غش کیا کتنی مشکل زمین ہے مگر وہ ایک نہایت عارفانہ مسئلہ اس خوبصورتی سے کہتے ہیں کہ زمین کے مشکل ہونے کا خیال ذہن سے دور ہوجاتا ہے۔ بتاتے ہیں کہ عشق کا جزو کل کیصورت اختیار کر لیتا ہے اور اس کی ابتدا انتہا ہوجاتی ہے۔ اور اسی اظہار میں مطالب کی تہ میں ظرافت کی غیر محسوس ہلکی سی چاشنی دیتے ہیں۔ طنز کا ایک ستھرا پہلو شامل کرکے شعر کو آسمان پر پہونچا دیتے ہیں ؎

دریا کشی کا مژدہ انھیں ہیں جو اہل ظرف
ہم کو تو ایک ہی قدح مل نے غش کیا

ہر زمین کو تشریح کیساتھ لکھنا طوالت مضمون کا باعث ہوگا اس لئے اس قضیہ کو اہل ذوق کی منصفانہ نگاہ پر چھوڑکر میں چند مشکل زمینوں سے انتخاب کرکے کچھ شعر پیش کرتا ہوں۔

ذرا روکے یاں جبکہ داماں نچوڑا
ہر اک تار سے ایک طوفاں نچوڑا
گریہ و نالہ کیا ضبط دل نازک میں
ایک شیشہ میں لئے پھرتے ہیں ہم آتش و آب

راحت کہیں نہیں بغلِ گور کے سوا　　اڑ جائے زندگی کا الٰہی شتاب رنج
ہے دردناک اُمیدیٔ ہجر انکی یہ دوا　　ہر چند صبر ہے دل پر اضطراب تلخ
جاتا ہوں کس گلی سے کہ ہر ہر قدم کے بعد　　پھیر ادھر کو دیے ہے دل بیقرار رُخ

ہے بہت قصۂ ضعفِ دلِ رنجور دراز　　لب تلک آہوں کو ہے آنا سفر دور و دراز
زندگانی میں ہی محسوب اگر روزِ فراق　　عمر رکھتے ہیں بہت ہی ترے مہجور دراز
دمبدم آتا ہے لب پر نالۂ آتش فشاں　　تو ہی اس آفت سے ہو یارب نگہدار نفس
بغیر کینہ مت چشمِ کرم رکھ چرخِ گردان سے　　بجائے آب اے ناداں ہے اس دولاب میں آتش
آشناؤں سے کچھ خوشی بھی ہے　　پر نہایت ہیں درد و غم مخصوص
جا مسیحا فکرِ دردِ دل نکر ملتا ہے یہاں　　پلۂ لطفِ حیات جاودانی میں مرض
نگاہِ تیغ پہ دل یہ جگر یہ سینہ ہے　　کہ عاشقوں کو کرے زخم امتحاں محفوظ
ہزار طرح کے عقدے پڑے مری دل میں　　کھلا نہ ایک ترا عقدۂ نقاب دریغ
کیا دل میں آگ تھی کہ دمِ نزع جوں چراغ　　بھڑکا کچھ اور بجھ بھی گیا ایکبار داغ
کھل گئے آج وہ سب ربطِ نہاں تھے جو ہم　　کس قدر آہ ہوا سن کے ترا نام قلق
وہ دردمند ہوں جو رکھوں پنبۂ داغ پر　　ہو جائے دلخراشیٔ تقدیر سے نمک
ساتھ اپنے گر گیا دلِ بیتاب زیرِ خاک　　تو ہو چکا نصیب مجھے خوابِ زیرِ خاک

ادھر مژگاں ترحم شعلہ ریزی تا بکے　　جل اُٹھا دامن اُدھر سے اور ادھر سے آستیں
کنجِ تنہائی میں یہ کچھ شغل رہتا ہے ہمیں　　شام تک رہتی ہے آنکھوں پر سحر سے آستیں
سمجھ کر کچھ تڑپنا اے شہیدِ شوقِ پابوسی　　نہ کرنا دامنِ قاتل کو کچھ بہرِ خدا رنگیں
غش پہ غش آ ہی رہی جاتا ہے کچھ ڈوبا سا　　کیا ہوا چارہ گرو نبض مری دیکھو تو
نہ روئے کس طرح دل خون ہو آویں کیونکر نہ آنکھیں　　جو دیکھوں تیرے زانو اور لبوں پر جام و آئینہ
لکھا تھا نشترِ مژگانِ سرمہ سا کا وصف　　زبانِ خامہ سے اب تک وہاں ہے خونِ سیاہ
ملتے ہی آنکھ برق سی دل پر چمک گئی　　کتنی تری نگاہِ فسوں کار گرم ہے

مندرجۂ بالا زمینوں کے علاوہ بھی بہت سی ایسی مشکل زمینوں میں غزلیں موجود ہیں اُنکو دیکھکر ایک منصف مزاج نقاد

دیکھتے ہوئے کہ ذوق مرحوم کو انکی محاورہ بندی اور چند سنگلاخ غزلوں نے اور شاہ نصیر کو صرف ان کے مشکل سے مشکل ردیف و قوافی میں غزلیں کہنے نے استاد بنادیا میر ممنون کے مسلم الثبوت اور قادر الکلام استاد ہونے کا قائل ہوجاتا ہے۔ اسپر بھی جب یہ غور کیا جاتا ہے کہ شاہ نصیر اور ذوق مرحوم ہر جگہ اپنے مذاق صحیح کو اتنا قائم نہیں رکھ سکے اور ممنون نے حسن کے ساتھ ہر جگہ اس کو نباہا تو ان کا رتبہ بلند تر ہوجاتا ہے۔

ممنون کے کلام میں دوسری مابہ الامتیاز چیز انکی وہ ترکیبیں ہیں جسمیں وہ غالب اور مومن کے ساتھ ساتھ ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ وہ دونوں مشہور ہیں اور ممنون غیر مشہور۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ممنون پر بھی فارسی کا اتنا ہی اثر ہے جتنا کہ ان دونوں پر۔ مرزا غالب کی طرح وہ بھی فارسی ترکیبوں کی خوشنمائی کے سامنے محاورات اردو کی پروا نہیں کرتے۔ انکی شاعری دلی اور لکھنؤ کے روزمرہ کی پابند ہے کیونکہ غالب کی طرح وہ بھی اس کوچہ سے گزرنا اپنے لئے ننگ و عار کا باعث جانتے ہیں جس سے عوام کی آمد و رفت ہو وہ ایک خوددار دل پہلو میں رکھتے ہیں اور چونکہ ان کی شاعری بھی خودداری کی آغوش میں پرورش پائی ہوئی ہے وہ عوام کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور کہتے ہیں

خود پسندان فرومایہ کے آگے ممنوں　　میں نہ زنہار پئے عرض ہنر جاؤں گا

مگر ان کی فارسی ترکیبوں سے یہ دھوکا کھانا ایک خطرناک غلطی ہے کہ وہ محاورات اردو نہیں جانتے۔ نہیں ہرگز نہیں پوری طرح سے اسپر قادر ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ کوئی دماغ جب خیالات عالی پیدا کرتا ہے تو ان کے واسطے اسی شان و شکوہ کے الفاظ بھی تلاش کرتا ہے مشاق اور پختہ کار اسمیں کامیاب ہوتے ہیں اور باقی ناکام۔ اور یہیں سے انکی شاعرانہ کجروی کا اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ خیالات گراں پایہ کے ساتھ اگر الفاظ سبک ہوں گے تو توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی بلند مضمون کے لئے ہمیں اسلاف اخیار کے ذخیرہ میں الفاظ نہیں ملتے تو قوت ابداعی اپنا کام کرکے الفاظ تراشتی ہے ناواقفان فن کو اس پر طرح طرح کے دھوکے ہوتے ہیں مگر واقف کار اس کو ایک قوت اجتہاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ فلسفیانہ خیالات کبھی محاورات میں ادا نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ مشاق ان کے واسطے دوسری زبان سے مدد لیتے ہیں اول تو یہ قاعدہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ جسم و جان روح و پیکر دونوں ساتھ ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ جہاں ایک مشاق کے ذہن میں خیال عالی پیدا ہوا ہوگا۔ وہیں خود بخود پرشکوہ الفاظ بھی سامنے آجائیں گے۔ اور اگر کہیں ضرورت پڑیگی تو وہ تراش و خراش سے کام لیگا۔ انجان منہ دیکھیں گے اور رہ جائیں گے۔ میر ممنون کی خوشنما ترکیبیں دیکھئے۔ ہم تراکیب پر صرف خط کھینچدیں گے۔ جی چاہتا ہے کہ انکی خوشنمائی پر کچھ بحث کریں مگر طوالت مضمون کا خوف مانع ہے آپ خود ہی اندازہ کیجئے:-

اے آہ بے ادب نہ اسے آگ دی کہ ہے　　دل جلوہ گاہ پردہ نشینان راز کا

تبسم لب غنچہ کو دیکھ روتا ہوں　　کہ رنگ ہے یہ اسی خندۂ نہانی کا

مجھے وداع کرو ہم نشیمنان چمن　　کہ نخل شعلہ پہ ہے قصد آشیانے کا

ستارہ صبح کا یا عقدۂ آب لطافت ہے　　ہوا جو تکمۂ الماس زینت اس گریباں کا

نمک میں سودۂ الماس کو آلودہ کیا
ملاکر زخم دل روکش کیا اس نے نمکداں کا

جگر ہے ٹکڑے ٹکڑے کونسی طاقت یہ ہوں ہمدم
حریف کاو کاو نشتر و ہمطرح پیکاں کا

بجھا کے سوزنِ الماس زہر میں لاؤ
کہ یاں ہے دھیان شگاف جگر سلانے کا

ترنم غزل تازہ ساز کر ممنوں
کہ اشتیاق ہے ہر اک کو اس ترانے کا

تا عدم ہے شور اپنی آہ بے تاثیر کا
ہے سویدائے دل عنقا ہدف اس تیر کا

گرم رفتار بیابانِ فنا کو چاہیئے
کوئی دم آرام کو سایہ تری تلوار کا

چرخ سے کہہ دو کہ کشتی تھم سکے تو تھامے
آج ہے طوفاں سرشک چشم دریا بار کا

پہلوئے رخنہ رخنہ سے جھلکے ہے داغ دل
ہر روزنہ میں جلوہ ہے اس آفتاب کا

روکش ہزار لطمۂ صرصر سے ہے مدام
ٹک دیکھو تو حوصلہ اپنے حباب کا

یاں ہر دل شگفتہ میں سیر کائنات
اے جم کسی خیال ہے جام دو نیم کا

چھکے ہے نیم تبسم یہ خونبہا اپنا
ہمارے قتل پہ کیا ہے سبب تامل کا

رکھے ہے رنگ اے ساقی شراب ناب آتش کا
مقطر کیا گیا لیکر گل شاداب آتش کا

ساتھ بوسہ کے ہے دشنام کا کچھ بھی موقع
آبحیواں کو نہ آمیختۂ سم کیجے گا

برق بید رو نے یکدست جلایا یہات
خار صحرا جو مرزوق تہی پائی تھا

یہاں سدا کاوش نہاں سے نہاں ہیں نشتر
نہوا دل یہ کوئی کیسۂ فصاد ہوا

ہم کے نیت اک غم نو یا الم تازہ بسا
سینہ معمورۂ غم دل الم آباد ہوا

ناتوانی سے یہ کاہیدہ ہوئے ممنون اب
ان کو درکار عصائے مژۂ مور ہوا

دشنہ سے سیر کچھ نہوئی کشتگان شوق
دل وقف غمزۂ ستم اندیش ہو گیا

دل کاو کاو غمزۂ نیم پرنیش ہو گیا
یکقطرہ خوں حریف دو صد نیش ہو گیا

رقاص موج بادہ نوا سنج تھے طیور
کل کیا سماں درون گل و خار بند ہو گیا

نہوئے بخیہ مرے زخم جگر عیسیٰ سے
مفت فرسودہ سر سوزن تدبیر کیا

نگیا چشمۂ حیواں پہ جو حلق تشنہ
آج منت کش آب دم شمشیر ہوا

نمونہ کے لئے اس قدر ترکیبیں جو صرف ردیف الف کی چند غزلوں سے انتخاب کی ہیں کم نہیں ہیں اسی قسم کی سیکڑوں ترکیبوں سے دیوان ممنون ایوان جواہر نگار بنا ہوا ہے سب کا چھننا نہ ہمارے امکان میں ہے اور نہ چنداں ضرورت ہے لہذا چند اُن نادر تشبیہوں کیطرف توجہ کرتے ہیں جو بالکل اچھوتی اور نئی معلوم ہوتی ہیں اور جنھوں نے ممنون کا رتبہ بلند سے بلند تر کر دیا ہے۔ ماہ ہاتھ میں بلور کا ساغر لئے کھڑے ہے

دور فلک میں کسکو نہیں میکشی کا ذوق
چلتا ہے ماہ ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

غنچہ، غنچہ نہیں ہے بلکہ آہ بلبل کا شعلہ گرہ ہو کر رہ گیا ہے۔

نہیں ہے جلوہ نما غنچہ شاخ پر گل کا
کہ ہو رہا ہے گرہ شعلہ آہ بلبل کا

صحن میں جو پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں وہ پتیاں نہیں کسی مست شباب نے شراب پی پی کر مستی میں پیالے توڑ دئے ہیں

ہے صحن چمن برگ گل و لالہ سے رنگیں
توڑے تری مستی نے ہیں کیا جام زمیں پر

تکمۂ گریباں کی لطیف تشبیہ۔

ستارہ صبح کا یا عقدۂ آب لطافت ہے
ہوا جو تکمۂ الماس زینت اس گریباں کا

صورت بے معنی کی تشبیہ کس لطافت سے دی گئی ہے۔ ایک عام تشبیہ میں حسن بیان اور زور تخیل نے جان ڈالدی۔

جو نظر آتی ہے صورت ہے وہ معنی سے تہی
اس زمانہ میں مرقع ہے جہاں تصویر کا

شمع اک مسافر بریدہ ہے جو گرم روی کے ساتھ منزل فنا کو طے کر رہی ہے۔

کیا الگ محفل ہستی سے عدم تک پہونچی
سیکھ اس راہ میں تو بے سر و سامانی شمع

جام مے۔ دراصل جام نہیں ہے بلکہ دودمان رز کا چشم و چراغ ہے

بچ جائے باد حادثۂ محتسب سے جام
ہے یہ بھی خانوادۂ انگور کا چراغ

اشک شور اور چشم سفید کی عجیب تشبیہ۔

چشم سفید سے مرے گرتے ہیں اشک شور
کرتا ہے جوش یاں قدح شیر سے نمک

بلبل کے نغمۂ رنگیں سنکر پھول شرما رہے ہیں۔

بلبل سنا سنا کے نکر نغمہ خوانیاں
ہے سر بجیب دیکھ ذرا تو حیائے گل

جذب عشق اور اسکی نازک تشبیہ معہ ثبوت

تاثیر عشق دیکھ کہ بلبل کے واسطے
ہر شاخ گل نے ہاتھ پہ گلشن میں رکھا گل

رخسار معشوق پر پسینہ سوکھنے کی تمثیل کس قدر عجیب ہے۔

عرق اُس رخ پہ یوں ہوتا ہے کم آہستہ آہستہ
سحر میں ڈوبتے دیکھا ہو جوں گا ہے ثریا کو

داغ کی ستارۂ دنبالہ دار سے تشبیہ ملاحظہ ہو۔

ہوا ستارۂ دنبالہ دار ہر اک داغ
رکھے ہے ربط تو بس نالۂ رسا دل کا

اسی طرح ہزاروں نازک استعارے اور تشبیہات ممنون کے دیوان میں ملتے ہیں جنکا انتخاب ایک مکمل کتاب تصنیف کرنے کی استدعا کرتا ہے مگر ہم "داماں نظر تنگ و گل حسن تو بسیار" کہتے ہوئے اُن کے ادعائیہ طرز کی طرف توجہ کرتے ہیں جو اپنی نزاکت کی وجہ سے اپنا آپ ہی

جواب ہے ملاحظہ ہو:-

شمع کو ایک معشوق فرض کر کے کہتے ہیں۔

تکیہ بہ حسن یہ اب سرکشی اتنی اے شمع　　صبح کے ہوتے ہی چہرہ پہ ترے نور نہیں

ایک ہی بات سے چند ادعا کئے ہیں۔

دھویا ہے کس نے منہ کہ یہی لطف آب کا　　لبریز رنگ گل سے ہی ساغر حباب کا
دھویا ہی چشم مست کو دریا میں کس نے صبح　　گرداب ہو گیا ہے پیالہ شراب کا
دریا میں کون رشک قمر دھو رہا ہی منہ　　لبریز ماہتاب ہے ساغر حباب کا

فلک تک شور ہی کسکی خود آرائی و مستی کا　　لئے ہر صبح نکلے شاہ خاور جام آئینہ
الٰہی کونسے خورشید طلعت کے مقابل ہیں　　رکھیں ہیں اب جو اکثر دیدۂ تر جام آئینہ

یہ رنگ بھی اُن کے کلام میں عام ہے اور ادعا کو تشبیہ سے ملا کر ایسی ایسی گلکاریاں کرنا ان کا ایک معمولی طریقہ ہے۔

میر ممنون کے کلام میں کہیں کہیں لکھنؤ کا طرز بھی شامل ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے والد ماجد میر منت کے ساتھ چند روز لکھنؤ میں رہے۔ چونکہ اس وقت لکھنؤ کی دنیائے شاعری تمثیل اور استعاروں اور زلف چوٹی کے مضامین سے بھری ہوئی تھی اسلئے ان کو بھی وہی رنگ اختیار کرنا پڑا۔ میں کسی خاص وجہ سے مایۂ امتیاز بنا کر اس قسم کے کلام کو پیش کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ ایک استاد جس طرف متوجہ ہوتا ہے اپنی قادر الکلامی سے دریا بہا دیتا ہے۔ میر ممنون کے لئے اس رنگ میں کچھ لکھنا ایک نقل سے زیادہ نہیں ہے مگر اس نقل کو اصل کر دکھانا انہیں کا کام ہے۔

وہ زلف اور وہ قد وہ دہان دیکھ مٹ گیا　　زاہد کے دل سے نقش الف لام میم کا
کھولا جو پیچ طرۂ عنبر شمیم کا　　مشک ختن سے بھر گیا دامن نسیم کا
کسی کے ہونٹھ کے ہلتے ہی ہم تمام ہوئے　　مزا ملا نہ ہمیں گالیاں بھی کھانے کا
کسی کی چشم کا عاشق ہوں ساغر مے پر　　کرو تہیہ مرے فاتحہ دلانے کا
ہمیں تنوں کے خلعت زریں کا محو ہوں　　نے جستجوئے زر ہے نہ کچھ شوق سیم کا
مشہد پہ اُسکے لاتا ہے شمع سبز لازم　　جو بے گنہ ہے کشتہ اک سر شعلہ خو کا
طوفاں اٹھا رہا ہے اب طفل اشک خون　　لڑکا تھا یہ تو اپنے آنکھوں کے روبرو کا
خوشۂ اشک نہیں مزرعۂ دل میں ہم نے　　تخم الفت کا جو بویا تھا ثمر ہے اسکا
داغ دل افروز کو کیا ہم آہ گرم سے　　صد مۂ صرصر سے کب گل ہو چراغ آفتاب

نہ ایک رات بھی اس مہ سے بھر سکی آغوش — کیا ہے آپ کو خالی برنگ ہالہ عبث

انگلیاں مہندی بھری کیا کیا کھٹکتی ہیں پڑی — اس سے بہتر تھا کہ ہو ل برخون میں خنجر جا بجا

میں ایک سرو قامت گلرو کا محو ہوں — نے گل کی آرزو ہے نہ شمشاد کی ہوس

مرغ پامال ہے یہ اس سے اُڑا جائے کہاں — چھوڑ کر تیرے قدم رنگ حنا جائے کہاں

ہماری تشنہ کامی کو نوید کامرانی ہے — وہ آب چشمۂ شمشیر آب زندگانی ہے

یہ رنگ گو ممنون کے لئے طغرائے امتیاز نہو مگر اس صورت میں بھی اپنے ستھرے مذاق کو قائم رکھنا انکی استادی کی بین دلیل ہے میر ممنون جس زمانہ سے گزر رہے تھے اس میں اور بھی باکمال موجود تھے اسیوجہسے ضروری ہے کہ دوسروں سے انکا تقابل کیا جائے تاکہ دیکھنے والے ہماری رائے کو یکطرفہ فیصلہ نہ سمجھیں اور سمجھ لیں کہ وہ اپنے معاصرین سے کسی طرح کمزور نہیں ہیں۔ انشا کی یہ غزل نہایت مشہور ہے۔

انشا:۔ یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں — وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

ممنوں:۔ اُسے کیا خدا کا ڈر ہو جو مثال میش قرباں — مجھے ذبح کر کے سمجھا کہ ہوا ثواب اُلٹا

یہ بہت ممکن ہے کہ میش کا لفظ آج کانوں کو بُرا معلوم ہو مگر ممنون کے زمانہ میں عیب کی بجائے یہ لفظ باعث حسن ہو تو عجب نہیں۔ دونوں خیال ایک ہیں خدا معلوم پہلے کس نے کہا۔ اور اگر کہیں ایک ہی مشاعرے میں دونوں پڑھے گئے تو توارد کی عجیب مثال ہے۔ ممنون کی اس زمین میں اور شعر بھی ہیں جو نہایت خوب ہیں۔

جو کیا سوال بوسہ تو ملا جواب اُلٹا — مرے منہ پہ ہاتھ مارا بصد عتاب اُلٹا

جو بنائے کار دنیا وہ بگاڑتا ہے ممنوں — جو رہا سنوارنے میں وہ ہوا خراب اُلٹا

مرزا غالب کی یہ غزل دل نہیں رہا۔ قابل نہیں رہا مایۂ ناز غزل ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ممنون کی غزل بھی سن لیجئے

یاں ذوق زخم خنجر قاتل نہیں رہا — دل چاہے تڑپنے کو اور دل نہیں رہا

وا حسرتا کہ قاتل بیرحم بعد ذبح — اک لحظہ پیش دیدۂ بسمل نہیں رہا

اے کاوش خدنگ ترسم کر کہ یاں — ٹکڑے جگر ہے سینہ میں ور دل نہیں رہا

وا کر چکا ہوں عقدۂ بند نقاب کو — آخر حجاب پردۂ حائل نہیں رہا

کم تاب دل بھی گرچہ پر کاہ سے دلے — کب برق طور سے یہ مقابل نہیں رہا

مرزا غالب کی یہ غزل۔ سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں۔ نہایت عمدہ غزل ہے۔ مگر ذرا ممنون کی غزل بھی سنئے۔

کس دن مری جراحت دل خونچکاں نہیں — بستر پہ سرخ کب تہ پہلو نشاں نہیں

یہ اگرچہ بہت بلند مطلع ہے مگر مرزا غالب کے اس قافیہ کا جواب نہیں۔

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں — گویا جبیں پہ سجدۂ بُت کا نشاں نہیں

مگر زبان کا بہت بہتر قافیہ ممنون نے کہا ہے۔

غالب:- پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

ممنون:- کیا کہئے وہ مزاج تو نازک ہے اور یہاں — قصہ دراز بخت زبوں اور زباں نہیں

غالب:- ہر رنگ گردش آئینہ ایجاد درد ہے — اشک سحاب جز بوداغ خزاں نہیں

ممنون:- پژمردہ ایک مشت گیاہ بریدہ ہوں — آئی بہار پر مری جاتی خزاں نہیں

غالب اور ممنون کی یہ غزل بھی ملتی ہے۔

غالب:- ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

ممنون:- چھیلتا زخم جگر کا کوئی انگور نہیں — ہمت اے ناخن غم تجھ سے یہ کچھ دور نہیں

ان دونوں کی غزلوں میں اور شعر ہم قافیہ نہیں اس لئے .... میر ممنون کے دو شعر لکھے دیتا ہوں۔

تاب ہر چند کہ ہے کاہ سے کم لیکن یاں — شوق لب گرم مصاف شرر طور نہیں

ساعد و بازوئے قاتل کو نہ کھینچے انجیں — شہد عشق ہے یہ آہنی دستور نہیں

کونسا زخم نمک بند ہے سینہ میں مرے — کہ وہ لب تشنۂ آب دم ساطور نہیں

میر ممنون اور مرزا غالب کے اتحاد مذاق کے سبب بہت سے مضامین مل جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایک کے کلام پر دوسرے کا دھوکا ہوتا ہے۔ ناظرین کی تفریح کے لئے بعض مضمون سپرد قلم کرتا ہوں۔

ممنون:- قتل پوچھ نہ کر مجھکو کہیں گے کیا ہوں — کوئی نہ کوئی تو ذمہ مرے تقصیر لگا

غالب:- دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر — کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آئے

ممنون:- رکھ دیجئے قلق میں دم تیغ پر یہ دل — لیکن خیال بوسۂ ابرو نہ کیجیے

غالب:- دہن شیر میں جا بیٹھئے لیکن اے دل — نہ کھڑے ہو جیے خوبان دل آزار کے پاس

میر و سودا، شیفتہ، ذوق، آزردہ وغیرہ کی ہم طرح غزلیں بھی ان کے دیوان میں پائی جاتی ہیں مگر ان کا لکھنا بہت طوالت ہے لہذا اب ہم ممنون کا وہ کلام پیش کرتے ہیں جو میر درد اور میر تقی میر اور سودا کے رنگ میں ہے اور یہی انکا اصل رنگ اور ان کے لئے مایۂ ناز ہے:-

گماں نہ کیونکہ کروں تجھپہ دل چرانے کا — جھکا کے آنکھ سبب کیا ہے مسکرانے کا

وفور گریہ ترحم ہجوم نالہ کرم — کہ ہے ارادہ اُسے درد دل سنانے کا

ترے وسیلے سے ہے رو شناس صد اندوہ — وگرنہ کون تھا ای عشق آشنا دل کا

سمجھ کے رکھیو قدم رہرو وادیٔ عشق
رواں ہے یاں دم خنجر پہ قافلہ دل کا

ناتواں ہم سے بھی دنبال میں ہیں یاں ہرواں
توسن عزم کو مت تیز قدم کیجئے گا

برق بیدرد نے یکدست جلایا ہیہات
خار صحرا جو مرا رزق تہی پائی تھا

ہاتھ میں جنبش محمل کی عناں ہی اپنے
ورنہ یاں کسکو سر آبلہ فرسائی تھا

روبرو ہوتے ہی اس برق بلا کے ممنوں
نذر آتش مرا سامان شکیبائی تھا

خاموش ہم زباں یہ لیا تونے کس کا نام
دل میں اٹھی وہ ہوک کہ دم سا نکل گیا

اے واے سادگی وفا بد صد فریب
آج اسکے جھوٹے وعدے پہ میں پھر سنبھل گیا

تفاوت قامت یار اور قیامت میں ہے کیا ممنوں
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

مدت سے آب ہو کے بہا چشم تر کی راہ
ممنون کیا بیاں کروں ماجرائے دل

ممنوں قضا نے ہمکو دیا کیا بغیر دل
سو وہ بھی نذر کاہش و تشویش ہو گیا

ہائے ری بیکسی دامن دیے یار نے جیب
کہ مرا دست جنوں بستۂ زنجیر رہا

شغل شب فراق یہی تھا کہ دھیان میں
ایک ایک شکن گنا تری زلف دراز کا

چھاتی سے قبر مجنوں کیا کیا لگا کے رویا
دل کا بخار بارے کچھ میں نکال آیا

مدت سے سمجھتے تھے بغل میں خلش دل
پہلو کو جو چیرا تو بجز خار نہ پایا

دی شوق رخ گل نے یہ آتش کہ قفس میں
آج ایک پر مرغ گرفتار نہ پایا

ہر دم طپش دل سے نوا زن ہوں قفس میں
نالہ نے گذر تا سر منقار نہ پایا

جب کیا قہقہہ مانند صراحی ہم نے
گریۂ خوں بھی یہاں ساتھ گلوگیر رہا

اسباب عیش جمع ہیں سب کچھ وسے یہاں
کیا ہوئے خرمی دل خرم نہیں رہا

ہیں رواں ناقہ کے دنبال ہزاروں بیتاب
تم کہیں پردۂ محمل نہ اٹھانا اپنا

اے فوج تاک اب سر تاراج کس لئے
تختہ تباہ تو مرے داماں کا ہو چکا

نکلا نہ عہدۂ لب یک زخم سے بہر دل
معلوم مجھکو سوز نمکداں کا ہو چکا

ایک سا دل تھا کہ ذرا اس سے رہیں تھیں باتیں
غم غلط کرنیکو وہ بھی نہ رہا یا قسمت

رفتار تری اب دل مضطر میں بھری ہے
آگئی ہے قیامت بہ تماشائے قیامت

غالباً گزرے نسیم باغ سوئے کوئے دوست
بوئے گل میں کچھ ملی آتی ہے مجھکو بوئے دوست

نہ سی پہلو کے چاک اسے بخیہ گر آج
نکلنے دے ذرا دود جگر آج

منت بخیہ و مرہم دل افگار نہ کھینچ
خون ہو ناز کسی شخص کا زنہار نہ کھینچ

ہمصفیرو نکو کر آتش حسرت پہ کباب
نالہ بس سوز سے اے مرغ گرفتار نہ کھینچ

یاں ہے سر سلسلۂ اہل جنوں ممنوں بھی
قیس آنا نہ سوئے خار مغیلاں گستاخ

باندھ پر۔ دام میں رکھ۔ یا کر ذبح
آ پھنسے اب ترے بس میں صیّاد

یک نیم قطرہ خوں سے ہی کمتر دل و جگر
ہے کس پہ سو جراحت بیداد کی ہوس

ہم بیزباں اور وہ ممنون بید ماغ
دل میں رہی نہاں دل ناشاد کی ہوس

دل دیوانہ چل بسا شاید
اس گلی میں نہیں ہے آج خروش

کھینچوں نکیونکہ میں نفس خونچکاں کہ آہ
دل ایک لاکھ زخم جگر اک ہزار داغ

وہ تیرہ بخت ہوں کہ ہوئیں سو سحر و لے
چھائی ہوئی گھر میں ہے شام ابتلک

قصور فہم ہے طول امل کیا فائدہ اس سے
جہاں تک ہم رہے بالفرض لیکن یہ جہاں کب تک

دیکھ منہ حسرت دیدار سے رو دیتا ہوں
کہیں ہنستا ہے کوئی یار اگر یار سے مل

اے تند باد آہ بس آہستہ جنبشیں
اوڑتے پھرے ہیں چار طرف پارہ ہائے دل

طپش دل نے نہ چھوڑا کہ کبھی ہم اکبار
لائیں تسکین کیلئے لب پہ ترا نام تمام

ادہر کرم ہو سبکدستی جنوں یارب
کہ تحت جیب و گریباں سی زیر بار ہیں ہم

ہیں یک کف خاک سر راہ پہ تیری
بیٹھے ہیں دلے منتظر باد صبا ہم

ڈر تھا کہ ترا دل نہ دکھے چشم نہ بھر لائے
تابوت پہ دل کے نہ ہوئے نوحہ سرا ہم

جنوں کی سبک دستیوں کی قسم ہے
نچھوڑونگا گردن پہ تار گریباں

وقت نظارہ اک نگہ آرزو نہیں
جس سے کہ حسرتوں کا ٹپکتا لہو نہیں

جان عزیز یاس کی ہم کو قسم کہ اب
سینہ میں خوں نگشتہ کوئی آرزو نہیں

تیرے مریض غم کی یہ حالت ہے ضعف سے
اک آہ ناتواں بھی کبھو ہے کبھو نہیں

تھا شوق کار فرما محفل میں پر ادب سے
کافر ہوں گر نگاہیں مژگاں تک آئیاں ہوں

دل کیوں نہ تنگ ہووے جب ہر طرف سے یارب
حرمان و یاس و حسرت سینہ میں چھلیاں ہوں

ہونہ ممنوں کا قاتل ہی کہ تابوت کیساتھ
کچھ پریشان سا تھا ایک جواں کہتے ہیں

دل سے طوفان سرشک امڈے ہی پر خیر کہ تھا
ہم کوئی حسرت دل اپنی سنا سکتے ہیں

ہول یہ اٹھے ہے دل میں کہ اڑا جائیگو رنگ
گو گیا ضبط پہ کیا حال چھپا سکتے ہیں

سبب جو مرگ مجنوں کا سنا کرتے کہانی میں
مرض ایسا وہ بھی لگ گیا ہمکو جوانی میں

کہا گردوں نے سو فتنے مبارک ہوویں عالم کو
نکالا جب کہ پردے سے کسی نے روئے زیبا کو

نہیں معلوم ان نے کیا کیا وعدہ کہ سینے میں
کیا ایجاد دل نے محشر یاس و تمنا کو

جلایا داغ دل نے سینہ و جان و جگر دیکھو
جو گھر کا تھا چراغ اس سے پھنکا سب گھر کا گھر دیکھو

ہرے ہیں داغ دل کے اجلاک و زخم آسے ہیں
نہ لگ جائے کہیں ٹک ہاتھ میرے سینہ پر دیکھو

تھی وقت ذبح بوسۂ پا دل کی آرزو
خوں ہو کے بہ چلی ترے بسمل کی آرزو

ہوں کشتۂ رسم درۂ قربانگہ الفت
مقتول سے واں بازوے قاتل کو دعا ہے

صبا پیغام یہ کہیو ہمارے ہم صفیروں کو
سنا جا یا کرو آواز گاہے ہم اسیروں کو

میں ہوں در کنج قفس زمزمہ سنجان چمن
تم نے آواز بھی گاہے نہ سنائی مجھکو

گہہ فلک پر کبھی دیر پہ نگہ وصل کی شب
بسکہ تھی عادت شبہائے جدائی مجھکو

عکس بھی تیرا نہ شوخی سے کہیں ٹھہرے ہے
سخت حیران ہیں آئینہ دکھلانے والے

ہمکو رونا آئے ہے ممنون تجھکو کیا ہوا
دمبدم کیوں رنگ پر تیرے بھلا تغیر ہے

....

ملتے ہی آنکھ برق سی دلپر چمک گئی
کتنی تری نگاہ فسوں کارگر ہے

چشمۂ شمشیر قاتل سے یہاں لیتے ہیں کام
بوالہوس یہاں سے نہیں وقف سبو کچھ اور ہے

دست بر دوش نفس آتی ہے ابتک آج آہ
حضرت دل زور پر ہے ناتوانی آپکی

وصل میں بھی نگاہ شوق تا مژہ یاں آسکی
عشوہ کے اہتمام سے غمزہ کی دورباش ہے

میں کہوں تھا دل سوزاں پہ نہ رکھو انگشت
آبلے ہاتھ میں آخر نہ تمھارے نکلے

آئینے سے جو کہ بگڑے بار بار
اس خود آرا سے صفائی ہو چکی

بخت بد صیاد غافل دام سخت
ہم اسیروں کی رہائی ہو چکی

قبر مجنوں پہ جو گزرا تو صدا آئی مجھے
یوں ہی آوارۂ صد دشت محن ہم بھی تھے

دل ہوا خوں جو کیا مرغ چمن نے گل ہائے
ایک دن بال زن طرف چمن ہم بھی تھے

اک تغافل میں ہو گئی حرماں
دل میں جتنی امیدواری تھی

کس تجے دلپر رکھا تھا تم نے ہاتھ
رات یاں دل کو بیقراری تھی

نہ ہوا دا کسی طرح ممنوں
کل تجھے کیسی سوگواری تھی

دے سب کو بلی مگر ہمارے — قسمت میں ہے خوں ناب باقی
کیا کیا نہ مجھے کہا ہے اس نے — کوئی بھی نہیں خطاب باقی
کرنے نپائے ایک تبسم کہ بس چلے — جوں غنچہ رنگ گلشن ہستی پہ ہنس چلے

. . . .

اسکی بالیں پر نہ ہو سکتا تھا ہم سے گریہ ضبط — حال ممنوں دیکھ کر اپنی عجب حالت ہوئی
گر کلفت ہر گھڑی بڑھتی ہی جاتی ہے یہاں — خاطر نازک نہ ٹھہری شیشۂ ساعت ہوئی
میں نامہ و پیغام سے گزرا کہیں یارب — ٹک قاصد بیچارہ کی اپنے خبر آئے
سخت کچھ افسردہ و دلگیر سے رہتے ہو تم — خیر باشد میر ممنوں تم پہ کیا افتاد ہے
پھر دل کے ساتھ ہیں صف مژگاں کی کاوشیں — جو یوں رواں ہے خون کا سیلاب سینہ سے
ممنوں بہ اضطراب کا اتنی ہے کیا سبب — کب کا نکل گیا دل بیتاب سینہ سے
رہ و رسم دیار عشق کا کشتہ ہوں سوچی ہے — کہ جسکے قتل کا محضر ہے اسکی ہی گواہی ہے
اب جنبش نفس سے بھرے دلکو جنگ سا ہے — لطمہ ہوا کا شیشۂ خالی پہ سنگ ہے
مت کیجیو غرور کہ یہاں حشمت مور ہیں — وسعت تمام ملک سلیماں کی تنگ ہے
برہنہ پائی نے اپنی رلایا دشت وحشت کو — کہ ہر خار مغیلاں شکل خوں آلودہ مژگاں ہے
بلبل ہی اس چمن سے نہ کچھ نوحہ گر گئی — باد سحر بھی آکے دم سرد بھر گئی
پُر درد کوئی شعر پڑھا آہ سرد کی — اس مشغلہ میں رات ہماری گذر گئی
اس سیل اشک کا نہ گھٹا زور اور یہاں — سو بار سر سے جو آب چڑھی اور اتر گئی
کب کا غبار تھا تجھے مجھ سے بھلا صبا — جو میری مشت خاک کو برباد کر گئی
یہی ہے گر قلق اور یہی کاوش تو ممنوں اگر تو دل رہا — دل مضطر مبادا چیر کر پہلو نکل آئے
یہ دل بھڑکا کہ جان نہیں کچھ خبر مجھے — سینہ میں آگ ہی آگ بھڑکتی نظر مجھے
مروں ہوں اس نگہ التفات پنہاں پر — جفائے فتنہ کی جو عذر خواہ ہوتی ہے

ممنون ایک نہایت غیور آدمی تھے چونکہ وقت پسندی ان کے کلام کا جوہر تھی اور زمانہ دوسری جانب متوجہ تھا مرزا غالب کی طرح جیسی کہ ان کی قدر ہونا چاہئے تھی نہ ہوئی۔ لوگوں نے حسد و بغض سے ان کے بعض اشعار پر سرقہ کا عیب لگایا یہ اُن پر بہت شاق گزرا اور آخرکار انھوں نے مشاعروں میں جانا ترک کر دیا اور عمر بھر یہی کہتے رہے کہ؎ خود پسنداں فرومایہ کے آگے ممنوں — میں نہ زنہار پئے عرض ہنر جاؤنگا

اور اسی گوشہ انزوا میں آخر ہو گئے۔ ان کا ضخیم دیوان موجود ہے مگر افسوس کہ طبع ہونے کی کوئی اُمید نہیں وہ تمام اصناف سخن پر یکساں قادر تھے اور تمام اصناف میں کلام موجود ہے

عبدالباری آسی

نغمہ پرست

وفا و محبت کا ایک تاریخی افسانہ

سارنگ پور، ایک چھوٹا گاؤں، کالی ندی کے کنارے آم اور پیپل کے گھنے درختوں کے سایہ میں آباد تھا۔ روپ متی اس گاؤں کے ایک ویش خاندان میں پیدا ہوئی تھی ——— پیدا ہوئی تھی اور پیار اور شفقت کی گودوں میں پلکر بڑی ہوئی تھی —— جوں جوں وہ جوان ہونے لگی۔ اس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلنے لگی اور روز بروز ترقی کرتی گئی۔

مگر یہ شہرت اس کے حسن کی نہ تھی اس کی خوبصورتی نے اسے ہر دلعزیز بنایا تھا۔ اس کی ساحرادا ؤں نے لوگوں کے دلوں میں گھر نہ کیا تھا۔ اس کے رُخ پرنور کی عالمتاب کرنیں اُسے اس قدر وقعت نہیں دے رہی تھیں۔ اس کا جہاں سوز جمال اس کی شہرت اور تسخیر کا باعث نہ تھا۔ بلکہ اس کی دلکش موسیقی نے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ گرویدہ ہی نہیں بلکہ پجاری بھی۔ رفتہ رفتہ وہ موسیقی کے نئے نئے رازوں سے واقف ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ اس پر گانے کے عجیب عجیب بھید کھلتے گئے ——— آخر وہ اس زمانہ کی بہترین مغنیہ بن گئی اسے فن موسیقی میں کمال حاصل ہوگیا —— اور یہاں تک کمال حاصل ہوگیا کہ لوگ اس کے فنِ موسیقی کی گہرائیوں تک پہنچنے سے عاجز ہوگئے۔ اور اس کے مرتبہ کو بہت جلد سمجھنے لگے۔

باز بہادر ایک طاقتور، دلیر اور بہادر پٹھان نے مالوہ پر حملہ کرکے اس کی حقیقی اور جائز حاکم سے چھین لیا اور سرزمین مالوہ کا خودمختار بادشاہ بن بیٹھا۔

جب خونخوار اور دہشتناک لڑائیاں سکون میں تبدیل ہوجاتیں، جب سرگرم حملے اختتام پذیر ہوتے اور جب شاہی فرائض ادا ہوچکتے تو باز بہادر ستار یا بربط اٹھالیتا۔ اور گھنٹوں اس میں محو رہا کرتا۔ عجیب عجیب سُریلی اور دلکش تانیں، روح پرور راگ الاپتا اور اکثر تاروں بھری پرسکون اور فرحت بخش راتیں وہ دلکو مست کرنے والے اور عشرت آفریں راگوں میں بیخود ہوکر گزار دیتا۔

اتفاقاً روپ متی کی شہرت باز بہادر کے کانوں میں بھی پہنچ گئی۔ اور روپ متی مجسم نغمہ کی نے، موسیقی کا دل افروز راگ بنکر اُسکے قلب پُر سرود کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ وہ اس کی شہرت کا شیدائی بنگیا۔ وہ روپ متی کو چاہنے لگا۔ بغیر دیکھے۔ وہ عاشق ہوگیا۔ صرف نام سنکر اس کا شیدائی۔ اس کی آنکھوں، خیال، دماغ، اور دنیائے آرزو میں روپ متی بس گئی ——— اس کی آہیں بے اثر نہ تھیں بلکہ اس کے عشق کی گرمیوں میں تاثیر کے بے پایاں سمندر موجزن تھے اس کے جذبات میں کشش تھی —— کشش تھی،

ایسی کشش جو محبت کرنے والے دلوں میں ہوا کرتی ہے۔

اس زمانہ میں، جبکہ باز بہادر کا دل کشش محبت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مالوہ کی فضا میں ایک حیرت ناک انقلاب رونما ہوا، اس انقلاب نے مالوہ کے ساتھ ہندوستان کا بھی رنگ بدل دیا۔ اور ساتھ ہی باز بہادر کی تحریر قسمت میں بھی فطرت نے ایک اضافہ کردیا ——— روپ متی اور باز بہادر کی شادی ہوگئی۔ ساز کو مضراب مل گئی اور مضراب کو نغموں کا خزانہ۔

روپ متی جو کہ نغمہ کی پجاری تھی اور اعماق قلب سے اس کی قدر دان ——— وہ جو عشق کی راگنیوں میں گم تھی اور تنہا — جو خود بھی مجسمۂ محبت تھی۔ باز بہادر کے ساتھ نہایت آرام اور عشرت سے زندگی کے خوشگوار لمحے گزار رہی تھی۔ موسیقی کی غمگین لے۔ عشرت کا رنگین نغمہ بن گئی تھی۔

باز بہادر نہ صرف روپ متی سے محبت کرتا تھا۔ بلکہ اس کی عزت اور احترام بھی کرتا تھا۔ روپ متی کی ادنیٰ خواہش اور معمولی آرزو کو بھی وہ ایک حکم شاہی اور اپنا فرض سمجھتا۔ روپ متی بھی اس قدر دانا، فہیم اور نکتہ رس تھی کہ کبھی کوئی ایسی ناجائز خواہش یا حرکت نہ کرتی جو اس کے شوہر کو ناگوار ہو یا جس سے اس کے قلب مسرور کو صدمہ پہنچے۔

اس کی زینت، آرائش حسن اور راحت کیلئے پاکیزہ ترین ہیرے، یاقوت۔ نیلم۔ الماس، چمکدار موتی اور بیش قیمت مرصع زیور تھے۔ اور نہایت نازک، قیمتی اور زریں ملبوسات اس کے رہنے اور برتنے کے لئے فردوس نما خوبصورت محل اور مشرقی صنعت تعمیر کے بہترین نمونے کے قصر فلک بوس تھے۔

لیکن آہستہ آہستہ روپ متی نے ایک حاکم اور ایک بادشاہ کو جسے ہمیشہ ملکی معاملات سے دلچسپی لینی چاہئے جس کے کان رعایا کے کان ہونے چاہئیں جسے ملک کی حفاظت اور رعایا کی خبرداری کے لئے ایک ان تھک نگہبان اور ہوشیار محافظ ہونا چاہئے۔ ہاں اسی حاکم اور اسی بادشاہ کو، نغمہ کے زیر و بم نے آوارہ کردیا۔ وہ تقریباً ہر وقت باز بہادر کو اپنے ساتھ رکھتی تاکہ نئے نئے راگ اسے بتائے اور عمدہ عمدہ گانا سنائے۔ ساحر موسیقی، دلدوز ترنم، رسیلا راگ، جو صدہا برس سے ہندوؤں میں پشت بہ پشت چلا آتا ہے۔

بادشاہ دن بدن ملکی فرائض سے دل برداشتہ ہونے لگا۔ دل برداشتہ اور تقریباً بالکل بے نیاز۔ وہ دربار سے بہت کم دلچسپی لیتا تھا اگر کوئی ملازم کاغذ لیکر حاضر ہوتا تو اسے اور زیادہ ترنم ریزی کا موقع ملجاتا اکثر اوقات کئی گھنٹوں کے بعد اسے معلوم ہوتا تھا کہ وزراء اور دیگر حکام اس کے منتظر تھے اور کام کا وقت گزر چکا ہے اگر کوئی بڑا سفیر کسی اہم معاملہ کے متعلق بغیر ملاقات کئے واپس چلا جاتا۔ تو اس بات کی کوئی پروا نہ کی جاتی لیکن اگر کبھی کبھی دلچسپ راگ یا نغمہ پیدا ہونیکا امکان ہوتا تو بادشاہ صرف اس کے تخیل سے مست ہوجاتا تھا اس کی ہرگز فکر نہ تھی۔ کہ مظلوم اپنی اپنی التجائیں اور درخواستیں حضور میں پیش کرنے کو مجتمع ہیں۔ جہاں تخت شاہی پر منوں گرد جم گئی ہے اور اس کا مطلق خیال نہ کیا جاتا کہ وہ مضطرب اور مغموم اپنے بادشاہ کی لاپروائی پر روتے پیٹتے چلے جائیں گے، ہاں یہ کہ طبلہ، ستار،

سارنگی اور بربط جو بہت صاف ستھری، چمکدار اور دلچسپ آواز سے لبریز ہوں۔ اگر تیار ہوتے تو بادشاہ کی ہستی میں ایک کیف رقصندہ پیدا ہو جاتا بہر کیف ملک بادشاہ کی نغمہ پرستی کی وجہ سے تباہی اور بربادی کی بڑھا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت باز بہادر کی حکومت کی اور اس کے دیوان کے ہاتھوں میں تھی گو وہ انتظام اچھا کر رہا تھا۔ مگر ایسا ہی اچھا کہ رعایا پریشان اور تباہ حال تھی۔

سات برس اس عیش و راحت میں گزر گئے۔ سلطنتِ مغلیہ کے دور دور از دارالخلافہ میں جاسوس آ پہنچے اور انھوں نے دربار شہنشاہی میں عرض کی۔ کہ ایک حکومت بالکل شکستہ حال ہو رہی ہے۔ کیا دربار کا کوئی بہادر سردار اسے فتح کر سکتا ہے۔؟ ایسا ملک جہاں کا بادشاہ صرف نے نواز ہے جہاں ایک دیوان نہایت بدسلیقگی اور بے ایمانی سے حکومت کر رہا ہے۔ جہاں کی فوج بوڑھے گوسئے کی آواز سے زیادہ ناکارہ ہے نہ کوئی اس کا جنرل ہے نہ سردار۔

آدم خاں، ایک بہادر سردار نے جو اکبر بادشاہ کی فوج میں ملازم تھا۔ عرض کی کہ وہ یکایک پوشیدہ طور سے جا کر مالوہ پر دھاوا کر دیگا شہنشاہ اکبر نے اس کی التجا کو منظور کر لیا۔ اور ایک زبردست فوج اس کے ہمراہ کر دی۔

ایک دن باز بہادر اپنی ملکہ کے ساتھ گانے میں مشغول تھا۔ کہ یکایک تمام محل میں ایک دہشتناک ہلچل مچ گئی اور لوٹ مار کی آوازیں آنے لگیں۔ دردناک اور حسرت آگیں فریادیں بادشاہ کو مدد کے لئے پکار رہی تھیں۔ آوازیں اور قدموں کی چاپ رفتہ رفتہ بالکل قریب آ پہنچیں۔ اور آخر کار وزرا۔ امرا اور دیگر حکام اکرم دوڑ پڑے اور گریہ و زاری کرنے لگے: "بادشاہ سلامت ہمیں بچائیے۔ ہمیں پناہ دیجئے۔ دشمن ۔۔ دشمن۔ سڑکوں پر لوٹ مار مچا رہے ہیں" اس کے بعد فریادیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

باز بہادر نکل کر باہر آیا۔ اس کے کانوں میں روپ متی کی شیریں صدا "خدا تمہیں فتح دے" گونج رہی تھی۔ اُس نے بہت عجلت میں اپنا فوجی لباس اور زرہ بکتر زیب تن کیا۔ منتشر فوج کو یکجا کیا۔ اسے حیرت ہوئی ۔۔ وہ تعجب سے دیکھنے لگا۔ کیونکہ وہ بالکل مختصر تھی اور بے قاعدہ۔ لیکن اس نے کوئی پروا نہ کی ۔۔۔۔۔۔ اب اس کا دل ایک بہادر اور جواں مرد کا دل نہ تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موسیقی کی محبت نے اس کے چاروں طرف ایک جال سا بچھا دیا ہے اور اس سے جنگ اور فتح کی طاقت چھین لی گئی ہے۔ اس نے غنیم کا مقابلہ کیا لیکن بہت ہی بزدلانہ۔ اس میں آج اتنا جوش نہ تھا کہ خود بھی دلیری سے بڑھتا اور فوج کو بھی اُبھار کر آگے بڑھاتا۔ اس کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ اور زیادہ تر موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔ اور وہ خود بھی نکل کر جنگلوں کی طرف بھاگ گیا اس کے بعد کسی نے اس کے متعلق کوئی خبر نہ پائی۔

محل میں خاموشی حکمران تھی۔ اور روپ متی فاتح شوہر کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن جب اس نے ایک غیر محرم قدم کی چاپ سنی۔ جو اُس کے دروازہ پر آ کر کھڑا ہو گیا، تو وہ خوف و دہشت سے لرزنے لگی۔ پردہ کھول دیا گیا۔۔

—— ایک طویل قامت، شجاع، طاقتور، اور زرہ پوش انسان، جس کا فولادی جسم جنگ کے گرد و غبار سے آلودہ تھا۔ سامنے کھڑا تھا —— روپ متی مبہوت و متحیر کھڑی، خائف نگاہوں سے ہیبتناک اور پر رعب آدم خاں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے خوف پر مسکرا دیا اور کرخت لہجہ میں کہا۔ "تم خوف زدہ ہو۔ ؟ لیکن میں تمہیں دیکھکر بیحد مسرور ہوں۔ تمھارا شوہر میدان جنگ سے بھاگ گیا —— آج رات کو تم میرے حرم میں داخل کی جاؤگی"۔ دل شکستہ روپ متی، رنجیدہ اور غمگین، روپ متی نے کوئی جواب نہ دیا وہ سالت کھڑی دیکھتی رہی دوسری مرتبہ پردہ کھینچا گیا —— اور آدم خاں چلا گیا۔ تو وہ زمین پر گر پڑی اور انتہائی حسرت آمیز لہجہ میں کہنے لگی: "پیارے شوہر! کیوں چلے گئے۔ آہ کیوں چلے گئے۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر۔ آہ اکیلا اور بے یار و مددگار۔ تمھارے سوا اور کسے میں اپنا سرتاج کہوں۔ ؟ آہ تم نے کیوں مجھ حرماں نصیب کو اس آفت و مصیبت میں تڑپنے کے لئے خیرباد کہدیا۔ میں تمھاری بیوی ہوں —— میرے شوہر تمھاری وفادار۔ تمھاری عاشق بیوی۔ تمھاری ہمدرد و راحت۔ تمھاری غمگسارِ حیات۔ آہ اگر تم جنت کو سدھارے تو میں بھی اب تمھارے پاس آتی ہوں۔

—— اگر تم زندہ ہو تو کبھی نہیں۔ آہ ہرگز میں دوسرے کی زینتِ آغوش بننے کی ذلت گوارا نہیں کر سکتی"۔ وہ اس عالم محویت میں بہت دیر تک سربسجدہ رہی۔ وہ آہ و زاری کرتی رہی —— آہ و زاری، نالہ و فغاں۔ اور غم کے آنسوؤں سے منہ دھوتی رہی۔ اس کے قلب و جگر میں اضطراب کا دریا لہریں لے رہا تھا اور وہ شکستہ کشتی کی طرح بہی جا رہی تھی —— وہ چونک پڑی۔ کسی اطمینان بخش خیال نے اسے خواب گمشدگی سے بیدار کر دیا وہ اٹھ بیٹھی —— مطمئن اور شاد۔ اٹھ بیٹھی اور کھڑی ہوگئی اس کے قیمتی آنسو خشک ہو چکے تھے۔ "میرے سرتاج۔ میں آتی ہوں" اس نے سرد آہ کے ساتھ کہا اور اپنے ویران اور سنسان کمرہ کی طرف چلی گئی۔

دن گزر گیا۔ شام ہوتے ہی روپ متی نے اپنی کنیزوں سے کہا قبل اس کے کہ آدم خاں اپنی عروس سے ملاقات کے لئے آئے۔ مجھے ایک شہزادی کی طرح، ایک عالی وقار ملکہ کی طرح اس کے استقبال کو تیار ہو جانے چاہئے۔ کیوں۔ ؟ کنیزوں نے گردن ہلائی روپ متی نے کنیزوں کو حکم دیا۔ مجھے جلد بہترین لباس اور زر و جواہر سے آراستہ کرو۔ آج رات میں اپنے شوہر کی نظروں میں زیادہ خوبصورت معلوم ہونگی۔

خوفزدہ اور متحیر کنیزوں نے اُسے ہر قسم کی آرائش اور زیوروں سے سنوارا۔ اور اس کی خلوت گاہ کو بھی خوب سجایا۔ خوشبودار پھولوں سے تمام کمرہ کی فضا معطر ہوگئی۔ مسہری پر کمخواب اور زربفت کا زریں بچھونا تھا —— اور اس پر حسین روپ متی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرہ پر ریشم کا ایک باریک نقاب پڑا تھا اور اس کے حسن کی تجلیاں نقاب سے چھن چھن کر سارے کمرے کو بقعہ نور بنائے ہوئے تھیں۔ اور اس پر رنگین فانوس اور شمع کی روشنیاں جھلملا جھلملا کر اپنی گلابی اور سنہری کرنوں سے نور برسا رہی تھیں

آدم خاں محل میں داخل ہوا۔ وہ اس وقت فوجی زرہ بکتر نہ پہنے تھا بلکہ نہایت قیمتی اور شاندار لباس میں اپنی عروس غمزدہ کو دیکھنے آیا تھا۔ ایسا دلکش اور بصیرت افروز منظر دیکھکر فرط مسرت سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے اس وفا شعار

کنیز میں کسی قسم کی غم والم کی نشانی نہ دیکھی اور نہ گریہ وفغاں کی آواز سنی ـــــ اب پردہ اس کے پیچھے گر چکا تھا ـــــ وہ مسہری کے قریب پہونچ گیا اور پُر ارمان نگاہوں سے روپ متی کو دیکھنے لگا۔ وہ خوش ہوا۔ روپ متی کے پھول جیسے چہرہ پر تبسم کی چمک تھی اور اس کے نازک لب گلگوں مسکراہٹ کے انداز سے بند تھے۔ لیکن وہ کس قدر خاموش تھی؟ ـــــ خاموش اور خود فراموش ـــــ چپ اور انتہائی سکوت میں گم سم۔

آدم خاں نے آہ سرد بھر کر کہا۔ "پیاری حسین خاتون" اور آگے بڑھکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جو چادر کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ لیکن وہ سرد تھا ـــــ سرد اور بالکل برف۔ وہ بیقرار ہو کر چلا اُٹھا اور اپنا ہاتھ اس کے سینہ پر رکھا لیکن اُس میں کوئی حرکت نہ تھی ـــــ گھبرایا اور وحشت زدہ کمرہ سے باہر آیا ـــــ اور روپ متی سوتی رہی ـــــ وفا شعاری کی نیند میں کھوئی ہوئی محبت کے خواب میں گم ـــــ گہری اور راحت دائمی کی نیند ـــــ زہر پہلے ہی کامل طور پر اپنا اثر کر چکا تھا۔ بعد میں اس کی تکیہ کے نیچے ایک کاغذ ملا۔ جس میں حسب ذیل الفاظ درج تھے۔

"پیارے باز بہادر ـــــ اب دنیا کی ہر راحت اور ہر عشرت میرے لئے بیسود ہے تمہارے بغیر مجھے کسی چیز میں لطف محسوس نہیں ہو سکتا۔ اور یہاں زیادہ ٹھہرنے سے سوائے رنج وغم کے کچھ حاصل نہیں۔ اس لئے اب میں آتی ہوں۔ اب میں آتی ہوں"۔

(مختار)

محشر عابدی

لارڈ رپن کا عہدِ حکومت

(مسلسل)

سیلف گورنمنٹ کا مستقبل

برطانوی ہندوستان میں سیلف گورنمنٹ کے مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نیم خود مختار دیسی ریاستوں کے متعلق چند سطور تحریر کی جائیں۔

سیاسی حالات کا مشاہدہ کرنے والے کو دیسی ریاستوں سے جو دلچسپی ہوگی وہ اپنے دو مقصد رکھتی ہے وہ اول یہ کہ جو تصویر وہ پیش کرتے ہیں اس سے ہندوستان کے گزرے ہوئے ایام کا کسی قدر اندازہ ہوسکیگا (اگرچہ یہ بالکل صحیح نہ ہوگا) اور ہمارے نظام حکومت نے جو اچھی یا بڑی تبدیلیاں رائج کی ہیں ان کے مختلف دوروں سے کسی حد تک واقفیت ہوسکیگی۔ اور دوسرے یہ کہ اس سے اندازہ ہوجائیگا کہ ملکی اقوام میں خود اختیاری حکومت کا مادہ کہاں تک موجود ہے۔

جبکہ کوئی شخص کسی دیسی دربار کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے اور آداب و درجات کا مشاہدہ کرلیتا ہے تو وہ گویا قدیم حکومت کی روایت کے بارے میں جس کا مدراس اور بنگال میں عرصہ ہوا خاتمہ ہوچکا ہے، ایک ایسی بات سیکھ لیتا ہے جو سیکڑوں کتابیں پڑھنے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتی اس کے بعد اسے اندازہ ہوجائیگا کہ گزشتہ زمانہ میں حاکم و محکوم کے تعلقات کس قدر خوشگوار تھے، شاہزادوں کا عام باشندوں سے کس قدر گہرا تعلق تھا اور رہبر ذات اور مذہب کو جو مسلمہ درجہ حاصل تھا اس سے بربادی کا کس قدر اظہار ہوسکتا تھا۔ یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ ہندو برہمن اور مسلمان امرا جیسے دو مختلف عناصر ایک ہی نظام کے ماتحت کیسی قدرتی زندگی بسر کرتے تھے جو ہر قسم کی مخالفت سے مبرا ہوتی تھی اور یہ کہ زندگی کی عملی جد وجہد میں وہ ایک دوسرے کی رائے کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ محض تاریخ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ وہ کونسی وجہ تھی جسکے سبب سے لکھنؤ کا ایک مسلمان کسی راجپوت شہزادے کی فوج کا کمانڈر مقرر کردیا جاتا تھا یا نظام دکن کے یہاں کوئی ہندو مدبر وزارت کے درجہ پر فائز ہوجاتا تھا۔ لیکن دیکھنے کے بعد یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے اور یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ قدرتی قانون خشکی اور تری کے رہنے والوں کو متحد کئے ہوئے ہے جس کے باعث یہ ناممکن ہوگیا ہے کہ باہمی لڑائیاں ہمیشہ ہمیشہ قائم رہیں" قدیم ہندوستان کی روایتی زندگی میں حیرت انگیز بردباری برتی جاتی تھی جو اب غیر بردباری میں تبدیل ہوگئی ہے اور ایک قسم کا ایسا مادی استغنا پایا جاتا تھا جسے جنگ یا دیگر خطرات بھی زائل کرنے میں ناکام رہے۔ خالصتہً دیسی عدالتوں کو دیکھنے کے بعد یہ رائے رکھنا ناممکن ہے کہ ہندوستانی حکومت کرنے قابل نہیں ہیں۔ سر سالار جنگ مرحوم لارنس اور ڈلہوزی کے مانند زبردست مدبر تھے اور مرہٹوں میں ایسے وزیروں کی کمی نہیں ہے جو ہر سرکاری عہدہ کے فرائض کو ادا کرنے کے پورے طور پر اہل ہوں۔

ساتھ ہی یہ امر بھی بدیہی ہے کہ قدیم ہندوستان اپنی ذہنی ترقیوں کے باوجود جسکا اندازہ خودمختار ریاستوں سے کیا جاتا ہے موجودہ ہندوستان سے ایک صدی سے زیادہ پیچھے تھا۔ دیسی رئیسوں کے دارالسلطنتوں میں ذہنی نشوونما نہایت ہی کم درجہ پر ہے ان میں نہ تو بڑے بڑے اسکول ہی ہیں نہ پبلک کے لئے کتب خانے موجود ہیں، نہ وہاں کتابیں چھپتی ہیں اور نہ اخبارات ہی شائع ہوتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہر دنیا سے کلیتہً جدا ہیں اور اپنے ہی مقامی معاملات میں غرق رہتے ہیں اور ذہنی لحاظ سے بالکل خوابیدہ حالت میں ہیں۔ بعض دیسی درباروں میں داستان گو تاریخ کے علماء نظر آتے ہیں اور درباری شعرا ادبیات کے اور نجوم سائنس کے سلطنت کی عام سیاسیات جاہل شہریوں کو متاثر کرتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ لارڈ ریپن کی داخلی پالیسی کے متعلق گذشتہ موسم سرما میں جو طوفان برپا ہوا تھا، اس سے دیسی ریاستیں بالکل غیر متاثر رہیں اس میں اچھے اور برے دونوں پہلو مضمر ہیں۔

اگر ان کی مادی خوشحالی کا برطانوی ہند سے مقابلہ کیا جائے تو اس کے متعلق میں یہ کہونگا کہ دیسی رؤسا کے علاقے ہندوستان کے زرخیز ترین علاقہ جات نہیں ہیں اور یہ شبہ اپنے دل سے نہیں نکالا جا سکتا کہ ان کا افلاس ہی سب سے بڑا سبب ہے جسکے باعث وہ الحاق سے مصؤن و مامون رہتی ہیں۔ نظام اور ہلکر اور سندھیا کے علاقوں میں ایسے جنگلات کے وسیع رقبے موجود ہیں جو غیر مزروعہ حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان ملکوں کے پاس نہ کوئی بندرگاہ ہے اور نہ جہاز رانی کے قابل کوئی دریا ہی ہیں۔ مزید برآن اُن کی مزروعہ زمینیں اول درجہ کی زرخیز نہیں ہیں، برخلاف اس کے راجپوت رؤسا ایسے اضلاع کے مالک ہیں جو بالکل ریگستان ہی ریگستان ہیں لہذا ان ریاستوں کے کسانوں کی مادی دولت کا بنگال والوں سے یا ساحل مدراس کی زرخیز زمین سے مقابلہ کرنا غلط فہمی پیدا کرنا ہے کیونکہ حالات سب جگہ ایکساں نہیں ہیں لیکن اگر معمولی زمین کا معمولی زمین سے مقابلہ کیا جائیگا تو میرے خیال میں اس قسم کا تقابل دیسی ریاستوں کے لئے نقصان دہ نہ ہوگا۔ جب میں انگریزی علاقہ سے نظام کے علاقہ میں داخل ہوا تو موخر الذکر ملک میں بہتر حالات کو دیکھکر میرے دل پر خاص اثر پڑا وہاں کبھی کبھی کاشتکار گھوڑے پر سوار ہوکر اپنی محنت کی نگرانی کرنے کی غرض سے جا نکلتا ہے اور یہ نظارہ وہ ہے جو برطانوی دکھن میں کبھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ نظام کے بعض دیہات میں کم سے کم یہ حقیقت دیکھنے میں آئی ہے کہ وہاں کوئی شخص مقروض نہیں ہے۔ اور مجھے یقین دلایا گیا ہے کہ ایام قحط میں ہز مجسٹی کی مملکت میں جس قدر اموات ہوئیں ان سے بہت کم نظام کی سلطنت میں وقوع میں آئیں۔

مگر یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ کسی دیسی ریاست میں ہندوستان کی قدیم کفایت شعاری اپنی اصلی شان میں باقی ہے۔ فری ٹریڈ (آزاد تجارت کے اصول) نے ان کے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ ان کی روایتی صنعتیں تباہ ہوگئی ہیں اور نمک کے اجارہ سے انہیں سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ ان میں سے بعض میں مالگذاری کی انتہائی انگریزی شرح وصول کی جا رہی ہے اور ٹیکس اجناس کے بجائے سکوں کی شکل میں لئے جاتے ہیں جس سے کسان صریح طور پر گھاٹے میں رہتا ہے بحیثیت مجموعی حیدرآباد کے علاقہ کی زراعتی حالت مجھے مدراس کے مقابلہ میں قدرے بہتر معلوم ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ سرحد پار کے لوگ نقل وطن کرکے ادہر آرہے ہیں الور کی راجپوت ریاست کے متعلق مجھے بتایا گیا ہے کہ وہاں برطانوی راجپوتانہ کے مقابلہ میں کم مالگذاری وصول کیجاتی ہے۔

ہندوستان کے بہترین نظم و نسق رکھنے والے اضلاع وہ معلوم ہوتے ہیں جہاں کسی دیسی رئیس کے لئے کسی نہایت قابل اور سمجھدار انگریز کی خدمات حاصل ہوگئی ہوں اور جسے یہ اجازت دیدی گئی ہو کہ وہ آمدنی بڑھانے کی خاطر لگان کا تعین نہ کرے بلکہ رعایا کا حقیقی فائدہ ملحوظ رکھے۔ بعض راجپوتی ریاستوں میں ایسے افسر پائے جاتے ہیں جہاں کی زراعت پیشہ آبادی اگرچہ غریب ہے تاہم دوسرے حصص ملک سے زیادہ خوش اور بشاش زندگی بسر کرتی ہے، اس لئے کہ ایسا افسر اس پریشانی سے آزاد رہتا ہے جو برطانوی علاقوں میں اسے ضلع کی حیثیت واستطاعت سے زیادہ آمدنی پیدا کرنے کے خیال میں ہر وقت مستغرق رکھتی ہے اور چونکہ اظہار سختی سے اسے ذاتی طور پر کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اسلئے وہ زیادہ مہربانی آمیز جذبات کا استعمال کرتا ہے اور تھوڑے عرصے میں وہ لوگوں کا محافظ بن جاتا ہے مجھے اعتماد ہے کہ ان تمام باتوں سے یہ مطلب نہ نکالا جائیگا کہ انگریز ہندوستان پر اس کی فائدہ رسانی کی خاطر حکومت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ برطانوی علاقوں میں جو موجودہ نظام قائم ہے اُس کے ماتحت رہ کر ذاتی اغراض اور خود غرض حکومت کے اغراض بہت بڑی رکاوٹ پیدا کرتے ہیں مثلاً یہ یقینی امر ہے کہ حیدرآباد کے صوبۂ برار نے انگریزی انتظام کے ماتحت نہایت خوشحالی حاصل کی ہے اور اسکی خوشحالی بعینہٖ وہ استثنا پیش کرتی ہے جس سے افلاس کا عام کلیہ ثابت ہو جاتا ہے جو بات کسی قسم کی غلطی کا ارتکاب کئے بغیر بیان کیجا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ دیسی ریاستوں کے بہترین نظم و نسق رکھنے والے اضلاع وہ ہیں جو ہندوستان بھر میں اپنے نظم و نسق کے لئے بہترین شمار کئے جاتے ہیں۔

شہری آبادی کے متعلق یہ ہے کہ میں نے جن چند خود مختار دیسی ریاستوں کے دارالسلطنتوں کو دیکھا ہے وہاں مجھے باشندوں کی خوشحالی کی علامتیں نظر آئی ہیں وہ برطانوی حکومت کے ماتحت اسی حیثیت کے شہروں میں مجھے مفقود دکھائی دیں۔ بمبئی کے سوائے جو غیر معمولی طور پر ترقی یافتہ اور خوشحال شہر ہے مختلف صوبجات کے بڑے بڑے شہروں کے دیسی حصوں کی حالت بے رونق اور گندی دکھائی دیتی ہے۔ مدراس کا کالا شہر ویسٹ منسٹر کی خرابے یاد تازہ کر دیتا ہے۔ کلکتہ کے یورپین مکانات کی شان و شوکت کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کی مصیبت و تباہی چھپی رہتی ہے۔ اندرون ملک کے شہر یقیناً خستہ حالت میں ہیں لکھنو اور دہلی جو ایک زمانے میں نہایت مشہور دارالسلطنت تھے، اب ان کا نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔ شمالی ہندوستان میں جہاں جاؤ وہاں لوگوں کے چہروں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہیں کسی مخالفانہ وجود کا احساس ہے گویا کہ وہ کسی مفتوح شہر میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ برخلاف اسکے ہندوستانی ریاستوں کے دارالسلطنتوں میں اس قسم کا کوئی احساس نہیں پایا جاتا اور انگریزی حکومت سے دیسی حکومت میں آنے پر جو عام تبدیلی معلوم ہوتی ہے وہ بہت نمایاں ہے۔ حیدرآبادیوں کے چہرے سے بآسانی یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو تو ملتا ہے اور یہ بات دوسرے اندرونی شہروں میں نظر نہیں آتی۔ ساتھ ہی بلحاظ لباس وہ ہندوستان بھر میں خوش پوشاک ہیں۔ اس شہر میں رونق اور شگفتگی معلوم ہوتی ہے اور لوگوں پر کسی قسم کا خوف و ہراس طاری نہیں ہے۔ انگریزی آبادیوں کی اطاعت گزیں خاموشی کے بعد سیاح کو اول الذکر حالت کا مشاہدہ کرنے سے تسکین ہو جاتی ہے۔ ہاتھی، اونٹ، سوار حیدرآباد میں سب چیزیں جاندار اور متحرک معلوم ہوتی ہیں اور وہاں کے بازاروں میں سے گزرتے وقت وہ زمانہ آنکھوں کے

سامنے آجاتا ہے جبکہ ہندوستان دولت اور شان و شوکت کا مرکز بنا ہوا تھا یہ ممکن ہے کہ اس شان و شوکت اور ظاہر داری کی نمائش میں مفلسی بھی پنہاں ہو (اور انگریز کہتے ہیں کہ یہ بات ممکن ہے) لیکن یہ حالت اس سے بہتر ہے کہ کسی قسم کی بھڑک اور شان نہ ہو اور غیر ملکی چھاؤنیوں کے بنگلوں کے سوائے خوشحالی کی علامت کسی اور جگہ موجود نہو۔

بہتر حالت کا سبب معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ جو کچھ آمدنی دیسی دربار لوگوں سے حاصل کرتا ہے وہ لوگوں پر ہی صرف کردی جاتی ہے۔ روپیہ ملک سے باہر نہیں جاتا بلکہ وہیں گردش کرتا رہتا ہے۔

برطانوی ہندوستان میں گورنر جنرلوں اور لفٹنٹ گورنروں کا تماشہ اے ڈی کانگوں اور ان کے دوستوں کے سوائے اور کسی کو اچھا نہیں معلوم ہوتا اور آمدنی کا بہت بڑا حصہ ہر سال یونہی ضائع ہوجاتا ہے اس سے اگر فائدہ پہنچا ہے تو دوسرے ممالک اور وہاں کے رہنے والوں کو۔

دیسی ریاستوں میں انصاف حاصل کرنے کے طریقہ کے متعلق صحیح معلومات معلوم کرنے کا مجھے کوئی موقع نہیں ملا۔ لیکن مجھے یہ یقین کرنے میں تامل نہیں ہے کہ برطانوی ہندوستان کے مقابلہ میں کم تشفی بخش ہے۔ جو بات مجھے قابل ترجیح نظر آئی وہ سول عدالتوں کی غیر موجودگی ہے جن کے متعلق زور شور سے یہ شکایت کی جارہی ہے کہ وہ بیاج کو ترقی دیتی ہیں۔ یہ بات دہرانے کے قابل ہے کہ ہندوستان بھر میں صرف نظام ہی کے علاقہ میں مجھے چند گاؤں ایسے ملے جسکے باشندے قرض سے پاک تھے۔ اغلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ قطع نظر اس کے برطانوی انصاف ہر جگہ دیسی انصاف کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مجسٹریٹوں اور ججوں کے کاموں پر دیسی ریاستوں میں رائے عامہ کے ذریعہ کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کی جاتی۔ اس بارے میں دیسی ریاستیں امپریل نظام سے بہت پیچھے ہیں اس لئے کہ ان میں صرف شخصی حکومت کا طریقہ رائج ہے اور وہاں کوئی ایسا نظام موجود نہیں ہے جس کے ذریعہ سرکاری انصاف کی تحقیقات کیجاسکے یا اسکی نگرانی وقوع میں آسکے۔ ہندوستان میں آزادی کے خیالات آہستہ آہستہ پھیل رہے ہیں اور دیسی ریاستوں تک ابھی ان کا اثر نہیں پہنچا (جہاں ابھی تک اصلاح کے نفاذ کے متعلق کوئی آواز بلند نہیں کی گئی) یہ تمام خیالات پیش کرنے کے بعد میں دیسی ریاستوں کے بارے میں برطانوی ہند کے مسئلہ پر بحث کرونگا۔

قارئین نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ اس سوال کے جواب میں جو کتاب کے شروع میں کیا گیا تھا یعنی یہ کہ آیا انگلستان اور ہندوستان کا باہمی تعلق ہندوستانیوں کے لئے فائدہ بخش ہے یا نہیں اور یہ کہ آیا ہندوستانی بھی اسے مفید سمجھتے ہیں یا نہیں، میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ بحیثیت مجموعی یہ تعلق مفید ہے۔

میرے دلائل یہ ہیں۔ اچھائی اور برائی دونوں کو جانچنے کے بعد میں نے ایک جانب یہ بات مشاہدہ کی ہے کہ کسی حد تک انگریزی گورنمنٹ کی خودغرضانہ تجارتی پالیسی کے باعث اور کسی حد تک انگریزی افسروں کی خودغرضانہ فضول خرچیوں کی وجہ سے اقتصادی پریشانی وسیع پیمانہ پر پھیل رہی ہے۔

بعض دیہات میں کسانوں کی حالت ایسی خراب دیکھنے میں آئی ہے کہ ان کی نوبت فاقہ کشی تک پہنچ گئی ہے۔ قرض میں ان کا

ایک ایک بال جکڑا ہوا ہے اور اپنی حالت کو بہتر بنانے کیلئے ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ دولت محض چند بڑے شہروں میں جمع ہوگئی ہے اور صرف چند مالداروں کے ہاتھ میں ہے۔ ملکی آمدنی کا معتدبہ حصہ ہندوستان سے باہر خرچ کیا جاتا ہے اور بہت سا روپیہ ان افسروں کی تنخواہوں کی صورت میں چلا جاتا ہے جو چھٹی پر چلے گئے ہیں یا پنشن لے چکے ہیں۔ میں اپنے تئیں یہ یقین دلانے کے ناقابل رہا ہوں کہ ۱۸۸۵ء کا ہندوستان بہ حیثیت مجموعی اس زمانے سے زیادہ غریب نہیں ہے جبکہ ہم نے ..اسال ہوئے اس کی مالیات کا انتظام کرنا شروع کیا تھا۔ میرا ہندوستانی ماہرین اقتصادیات سے اس بارے میں اتفاق رائے ہے کہ مالیات کا موجودہ نظام درست نہیں ہے، یہ کہ مالگذاری کے ذریعہ بہت بڑی رقم جمع کیجاتی ہے اور یہ کہ موجودہ کثیر آمدنی زراعتی آبادی کی مادی بہبودی کو نقصان پہونچاکر برقرار رکھی جاتی ہے۔ ملکی قرضہ کی مقدار بھی بہت بڑی ہے اور مستقبل میں مجھے مزید مالی مشکلات نظر آرہے ہیں۔

مزید برآں قدیم سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہوگیا ہے۔ مشرق کے سیدھے سادے قانون کی جگہ مغرب کے پیچیدہ قانون نے لیلی ہے۔ قرض وصول کرنے کے اختیارات وسیع ہوگئے ہیں اور ان کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مقدمہ بازی اور بیاج میں مزید سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ اس کے علاوہ افسروں کے ہاتھ میں دن بدن زیادہ اختیارات دئے جارہے ہیں اور وہ دن بدن ان اضلاع سے کم دلچسپی لے رہے ہیں جن کا انتظام اُن کے سپرد ہے۔ قصّہ مختصر یہ کہ پُرانے نظام میں ایسی جدید باتیں داخل کیجارہی ہیں جو مفید نہیں ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تمام باتیں غیر مفید ہیں بلکہ یہ کہ ملک کے مناسب حال نہیں ہیں اور اپنی اچھائی کے مقابلہ میں بہت گراں پڑتی ہیں مجھے ہندوستان ایک ایسی وسیع جائداد کے مانند معلوم ہوتا ہے جہاں اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا متعدد تجربات کرنے کے بعد مالدار بنکر اپنے ملک کو سدھار جاتا ہے۔ ہر چیز نہایت عملی طریقہ سے کیجاتی ہے، ستھری اور نئی حالت میں رکھی جاتی ہے بالخصوص ناظم کا مکان لیکن کھیتوں پر صرف اہل ہنر مزدور کام کرسکتے ہیں۔ اور وہ بھی بہت اخراجات اُٹھانیکے بعد حالانکہ کثیر رقم ڈبادی گئی ہے اور حسابات ہیں کہ معائنہ یا جانچ پرتال کی تاب نہیں رکھتے۔

باقی ——— باقی

ض۔ا۔ب۔ بی اے

کُلیاتِ قطب شاہ

رسالۂ "اُردو" میں

کلیات قطب شاہ زمانے کی گردش کے ساتھ ایک سیاح کے طور سے مدتوں دہلی اور کلکتہ وغیرہ کی سیر کرتا رہا۔ مگر قطب شاہی ملک و دولت کے مالک حضرت آصف جاہ سابع سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخاں بہادر سلطان دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ نے اُسے اپنا زر خرید بناہی لیا۔ اِسی کلیات پر "انجمن ترقی اُردو" کے رسالہ اُردو (اورنگ آباد دکن) جلد دوم حصۂ پنجم بابتہ جنوری ۱۹۲۲ء میں ریویو ہوا ہے۔ اس ریویو کے دو حصے ہیں۔ پہلا تاریخی اور دوسرا ادبی۔ تاریخی حصے سے سر دست ہمیں کوئی بحث نہیں ہے کیونکہ اسمیں اکثر تواریخ کا اقتباس ہے۔ ہاں پہلا ادبی حصہ رسالۂ اُردو کے قابل اڈیٹر اور انجمن ترقی اردو کے لائق سکرٹری مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کیطرف سے لکھا گیا ہے۔ چونکہ اس ادبی حصہ کی اکثر سطریں ذاتی رائے پر مبنی ہیں۔ اور سطح ظاہر سے ذرا ہٹ کر نظر غور سے کام لیا جائے تو بعض واقعات بھی خلاف حقیقت نظر آتے ہیں۔ اسلئے مناسب معلوم ہوا کہ اُن غیر صحیح واقعات کی صحت کیجائے تاکہ عوام میں انصاف سے شبہہ ہوے واقعات اصلیت کی جگہ نہ لے لیں اور غیر حقیقی خیالات حقیقت کی صورت نہ اختیار کرلیں۔

اس ادبی حصہ کی ابتدا یوں کی گئی ہے۔

"اُردو نے اگرچہ شمالی ہند یعنے گنگا جمنا کے دوآبے میں جنم لیا لیکن وہ بات چیت کام کاج سودا سلف تک محدود رہی۔ اہل علم نے اُسے کبھی منہ نہ لگایا اسلئے اس نے تقریر سے نکل کر تحریر کی کہیکر نہ اٹھائی۔ سب سے اول ادبی صورت اس نے دکن میں حاصل کی اور دکھنی کہلائی۔ اور گرد و عوام سے نکل کر مجلس خاص میں آئی شعرائے دکن جن کے تخیل کی جولان گاہ فارسی تھی۔ اب اس نئی زبان میں طبع آزمائی کرنے لگے جب تک اُردو زبان زندہ ہے دکن کو اس کا فخر حاصل رہے گا اُردو زبان کی کوئی تاریخ اس تذکرہ سے خالی نہ ہوگی۔ اسکو ہمارے یہاں کے اساتذہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎ خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے۔ معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا۔ قائم کہتے ہیں ؎ قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ۔ ایک بات لچر سی بزبان دکنی تھی۔ اس میں دکن کی اسقدر تنقیص مقصود نہیں ہے جسقدر اپنی تعلی منظور ہے ایک جگہ میر صاحب نے دکن میں اپنے شعر کی شہرت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎ سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ۔ ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ"

اس عبارت کا مکمل جواب اس خاکسار نے اپنے ایک مضمون **تحقیق اُردو میں**[1] "پہلے سوال کا جواب" کے عنوان سے مکمل طور پر اور مدلل طریقہ سے دیدیا اور یہاں مختصر طور پر اتنا لکھدینا کافی ہے کہ شمالی ہند میں اُردو کے جنم لینے کی روایت اصلیت سے دور ہے بلکہ اُردو کا اصلی مولد دکن ہے جسکی پوری پوری صراحت حوالہ مذکور میں درج ہے۔

[1] یہ مضمون رسالہ تحفہ حیدرآباد دکن جلد دوم نمبر ۲ ۱۳۴۳ھ میں شائع ہوا ہے۔ عالی رفاعی

غرض میر صاحب کے پہلے شعر کے معنی ظاہر ہیں کہ انھوں نے استاد کو معشوق سے یاد کیا ہے۔ اور قائم کے شعر سے "نے" کے لفظ کی عمر کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ کتنے دنوں سے شمالی ہند میں "نے" کا استعمال جاری ہے حالانکہ اہل دکن کے مقابل اہل ہند مدعی ہیں کہ "نے" کا استعمال ہماری ایجاد ہے اور بہت پہلے سے ہم اسکے پابند ہیں۔ لیکن تواریخ اور تذکروں کی ورق گردانی بتلا رہی ہے کہ دلی اورنگ آبادی سے تقریباً سو برس بعد قائم چاند پوری کا زمانہ ہے اور ولی اورنگ آبادی کا ایک شعر ہے۔ [۱]

ولی جن نے نہ باندھا دل کو اپنے نہالان سوں
نہ پایا پھل جہاں میں اون نے ہرگز زندگانی کا

جب شمالی ہند ولی اورنگ آبادی سے پیشتر اردو کا کوئی باضابطہ صاحب دیوان شاعر نہیں پیش کر سکتا تو نے کے استعمال کی سند ولی سے پیشتر کی کہاں پیش کرے گا۔ ایسی صورت میں شمالی ہند والوں کا یہ قول کہ نے کا استعمال ہمارا ایجاد ہے کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

اِس کے علاوہ قائم کے شعر میں **غزل طور کیا** کی ترکیب سے اوس وقت دہلی اور نواح دہلی کی مروجہ ترکیبوں کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ولی کے سو برس بعد تک بھی اہل دہلی نے اردو زبان میں کوئی قابل قدر ترقی نہیں کی تھی۔ چنانچہ ہستی ملک خوباں۔ محبوباں۔ وغیرہ ایسے الفاظ میر و سودا اور اُن کے معاصرین کے کلام میں بکثرت نظر آتے ہیں۔ اور نہ صرف میر و سودا بلکہ ان میں سے بعض الفاظ مومن غالب ذوق کے دواوین میں موجود ہیں۔

میر صاحب کا دوسرا شعر (سر سبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ ؛ ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ) خود اس بات کی گواہی ہے کہ ہندی میں میر کا سخن نہیں چمکا بلکہ دکن میں بھی جو اردو مولد و مصلح ہے میر کا کلام شہرت رکھتا ہے۔

طرز بیان کا قاعدہ ہے کہ کمزور درجہ کا پہلے اور پر زور درجہ کا بعد کو بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً آپ ہی ہیں نہیں مانتے بلکہ سارا شہر ملتا ہے (دیگر) دو چار کیا آٹھ برس بھی مقابل ہو جائیں تو خوف نہیں قائل یوں کہتا ہے کہ صرف ہندی کے باغبان ہمارے سر سبز سخن کے قائل نہیں ہیں بلکہ چمن دکن کے کدیور بھی ہماری آبیاری خیالات کو تسلیم کرتے ہیں اِس شعر سے تو دکن کی اولیت اور عظمت خود ظاہر ہے۔

---

[۱] ایک لطیفہ یاد آیا (آب حیات تذکرہ سودا) سودا اور ناخر کا جھگڑا طول کھینچا فاخر کے ایک شعر سے گرفتہ بود درین بزم چون قدح دل من شگفتہ روئی صہبا شگفتہ کرد مرا۔ پر اعتراض کیا کہ قدح کو دل گرفتہ کہنا بیجا ہے۔ اہل نشاط نے ہمیشہ قدح کو کھلے پھول سے تشبیہ دی ہے۔ یا ہنسی سے کہ اسے بھی شگفتی لازم ہے۔ بقا (شاگرد فاخر جو جواب ادا کرنے مرزا کے پاس آئے تھے) نے جواب میں شاگردی کا پسینہ بہت بہایا۔ اور آخیر کو باذل کا ایک شعر بھی سند میں لائے سے چون نشاط بادہ بخشد بمن خراب بے تو بہ دل گرفتہ ماند قدح شراب بے تو۔ مرزا رفیع سنکر بہت ہنسے اور کہا اپنے استاد سے کہنا کہ استادوں کے شعروں دیکھا کرو تو سمجھا بھی کرو یہ شعر تو میرے اعتراض کی تائید کرتا ہے یعنے باوجود کہ پیالہ ہنسی اور شگفتگی میں ضرب المثل ہے اور پیالہ شراب سامان نشاط ہے مگر وہ بھی دل افسردہ کا حکم رکھتا ہے۔ حالی زماعی۔

اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ ایسے اشعار اشعار تعلی کہلاتے ہیں۔ اس قسم کے مبالغہ آمیز اشعار سند میں نہیں لئے جاتے کیونکہ تقریباً ہر شاعر اسی قسم کے تعلی آمیز مضمون کہنے کا عادی ہوتا ہے چنانچہ ولی کا ایک مصرع ہے ع "دو باعرق کے بیچ عراقی عراق میں" کیا یہ امر ممکن الوقوع ہو سکتا ہے ؟ -

اس کے بعد فاضل مخاطب ولی دکنی کی اولیت کا عام خیال بیان کرتے ہوئے دو تین وجوہ بیان کرکے اُن کی تردید کرتے ہیں۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ولی ایک زمانے تک پہلا شاعر سمجھا گیا لیکن یہ بات غلط ثابت ہونے پر بھی زبان اور قلم سے ولی کی اوّلیت نکل ہی جاتی ہے اور یہ بات عقیدے میں شامل ہو گئی ہے۔ ولی اردو شاعری کا نہ آدم ہے جسطرح خیال کیا جا رہا ہے اور نہ فارسی والوں کی وضع سے ردیف دار اپنا دیوان ترتیب دینے والوں میں پہلا شخص ہے کیونکہ ولی سے پیشتر کا قطب شاہ کا کلیات دستیاب ہو گیا ہے "

ولی اورنگ آبادی کی نسبت جو عام خیالات بیان کئے گئے ہیں اور اُن غلط خیال کی تردید کیگئی گو ایک حد تک درست ہے۔ مگر ولی کو "آدم شاعری کہنے کی اصلی وجہ بیان نہیں کیگئی۔ اور اگر اصلی وجہ بیان کیجاتی تو اس کا جواب ناممکن تھا۔

اسکی اصلی وجہ سننے سے پیشتر یہ معلوم کرنا ضرور ہے کہ اس خیال کے بانی پہلے اہل ہند بھی ہوئے ہیں اور اسکے بعد اس بے بنیاد خیال نے عالمگیر صورت اختیار کر لی اہل ہند کی پیروی کرنیوالے یا غیر محقق اہل دکن نے بھی ولی کو اردو شاعری کا آدم قرار دے لیا۔

ولی کو اہل ہند نے اردو شاعری کا آدم اسلئے قرار دیا کہ جب تک ولی کا دیوان دکن سے دہلی نہیں پہنچا تھا۔ اسوقت تک نواح دہلی تو خیر دہلی بھی اس ضخیم دیوان سے ناواقف تھی۔ صرف دوہے اور کبت وغیرہ ہی انکی عین شاعری تھی اور یہی سرمایہ اس کے بعد جو کچھ سیکھا۔ ولی کے دیوان سے سیکھا۔ اور جو کچھ بولے ولی کی زبان سے بولے ایسی صورت میں ولی ان مقلدوں کا استاد تھا پیر تھا ہادی تھا! اہل ہند کو سب سے پہلے کوئی فارسی وضع کی غزل اور اسی طرح غزلوں سے مرتبہ دیوان نظر آیا تو دیوان ولی ہی تھا۔ ان کے لئے وہ نئی بات تھی اور نئی چیز ، ۔ اسی حقیقت کو نظر رکھکر انھوں نے ولی کو شاعری کا آدم قرار دیا۔ اور ایسا نہ کرتے تو کیا کرتے۔ انکی نظروں میں اس رتبے اور اس اولیت کا مستحق سوائے ولی اور کون ہو سکتا تھا۔ اور یہ بات اُن کے عقیدہ میں کسطرح شامل نہ ہو جاتی ؟ (ہونا ہی چاہئے) ۔ یہاں تذکرہ آبحیات کی چار سطریں نقل کیجاتی ہیں:-

"۔ دل کی امنگ نے پیش قدمی کا تمغہ حاصل کرنے کو اس کام پر آمادہ کیا جو سلف سے اس وقت تک کسی کو نہ سوجھا تھا۔ وہ یہی کہ فارسی کے قدم بقدم چلیں اور پورا دیوان مرتب کریں۔"

اس کے بعد پھر لکھتے ہیں۔ "غرض جب اون کا دیوان دہلی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا۔ قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت نے زبان سے پڑھا۔

گیت موقوف ہوگئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں انھیں کی غزلیں گانے بجانے
لگے ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انہیں
دیوان بنانے کا شوق ہوا۔

اب کلیات قطب شاہی کو لیجئے کہ اسکا علم اکثروں کو اب ہوا ہے اور اس نسخے کے ذریعے ہوا ہے جو عمدہ کاغذ پر عمدہ کتابت کیا ہوا خاص شاہی کتب خانے کا تھا۔ لیکن اہل دکن کو اس نسخے کے وجود کا علم ہونے کے پیشتر بھی کلیات قطب شاہ کا علم تھا۔ اور بعض جگہ اس کلیات کی نقلیں موجود تھیں[1]۔ پھر واقف کار اہل دکن ولی کی اولیت کے کس طرح قائل ہو سکتے ہیں؟

صاحب تبصرہ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان ہمیشہ سے پامال السنہ رہا ہے سنسکرت سے لیکر انگریزی تک کوئی نہ کوئی غیر زبان اس پر مسلط رہی۔ محمد قلی قطب شاہ کی حکومت گولکنڈہ میں تھی جہاں سرکاری اور درباری زبان فارسی اور رعایا کی زبان تلنگی تھی یہی حال عادل شاہیوں کا بیجاپور میں تھا۔ کہ ملک کے آس پاس کی زبان کنڑی تھی:۔"

منقولہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ قطب شاہیہ دار الحکومت کی دفتری اور درباری زبان کا ذکر کیا گیا ہے کہ فارسی تھی۔ عام رعایا کی زبان بھی بتلائی گئی ہے کہ تلنگی تھی اسی طرح عادل شاہیہ کی رعایا کی زبان تو بتلائی گئی ہے کہ ملک کے آس پاس کنڑی تھی مگر عادل شاہی دار السلطنت بیجاپور کی دفتری اور درباری زبان کا اظہار ضرور تھا۔

بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ اول کا سنہ جلوس ۹۴۱ھ ہے
گولکنڈہ میں قلی قطب شاہ کا " " " ۹۱۸ھ ہے
" " سلطان محمد قلی قطب شاہ کا " " " ۱۰۲۰ھ ہے

بیجاپور میں دفتری اور درباری زبان ۹۴۱ھ سے ریختہ دکنی کر دی گئی تھی تو عوام پر اس کا کیا اثر ہونا چاہئے۔ وہ ظاہر ہو سکتا ہے اور اور اس سے یہ بھی واضح ہو سکتا ہے کہ ۹۴۱ھ میں ریختہ زبان میں الفاظ کا کتنا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔
اور ایک سلطنت کی درباری اور دفتری زبان بننے کی قابلیت اس میں کتنی تھی۔ پھر معلوم نہیں کہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے نے
"یہی حال عادل شاہیوں کا بیجاپور میں تھا کہ ملک کے آس پاس کی زبان کنڑی تھی"
لکھ کر عبارت کیوں ختم کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر دو۔ ہوان قطب شاہ کے زمانے کے پیشتر ہی سے بیجاپور میں دفتری زبان ریختہ تھی لیکن اسکا حوالہ درج نہیں کیا گیا۔ جو غالباً عمداً ترک کیا گیا معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] چنانچہ آج سے بیس بائیس سال پیشتر مولوی عبدالجبار صاحب ملکاپوری بلاری نے اپنے تذکرے محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن میں اس کلیات کا ذکر کیا ہے۔ عالی زماں

اس کے بعد صاحب تبصرہ پھر لکھتے ہیں۔

"یہ دونوں (یعنی تلنگی اور کنڑی) زبانیں دراوڑی ہیں۔ اور انھیں آریائی زبانوں سے
کوئی تعلق نہیں اس ملک میں جب اردو نے ادبی صورت اختیار کی تو اس کے خط و
خال کیا ہوں گے تلنگی اور کنڑی دونوں اجنبی اور غیر مانوس ان سے کسی قسم کا میل ہو ہی نہیں
سکتا۔ لامحالہ فارسی کا رنگ اس پر چڑھ گیا۔ اول تو فارسی آرائی دوسرے صدہا سال
کی یکجائی۔ دونوں ایسے گھل مل گئیں جیسے شیر و شکر۔"

اگر غور سے صدر کی منقولہ سطروں کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ بھاکا کو آریائی اور اس کی ہمشیرزاد فارسی کا آپس میں میل قرار دیکر واقعہ بیان کیا جارہا ہے مگر اس کے متعلق اس خاکسار کے مضمون "تحقیق اُردو" میں صراحت سے جواب دیا جاچکا ہے۔ چونکہ وہ بہت طویل ہے اسلئے اسکی نقل بھی یہاں طوالت کا سبب ہو جائے گی مختصر یہ کہ اس قسم کا خیال رکھنے والے اہل ہند خصوصاً فاضل مخاطب کو اس مضمون پر ایک نظر ڈال لینا چاہیے پھر ظاہر ہو جائے گا۔ کہ ریختہ کے جزو اعظم عربی اور مرہٹی ہیں نہ کہ فارسی اور بھاکا ——!!

اس کے علاوہ بہمنی دور سے دکن میں ریختہ کا جو ڈھانچہ تیار رہا اس میں دکن کی مختلف زبانوں کو دخل ہے۔ اور اتنا دخل ہے کہ جس نے ریختہ کو بھاشا کے مرہون منت ہونے سے سبکدوش کر دیا۔

صاحب تبصرہ ص۱۸ پر لکھتے ہیں۔ "ورنہ جو تھوڑا سا امتیاز اُردو ہندی میں پایا جاتا ہے وہ بھی نہ رہتا۔"

پھر صاحب تبصرہ ص۱۹ پر لکھتے ہیں —: "دکن میں جب ہندی نے ادبی صورت اختیار کی تو فارسی کے سانچے میں ڈھل گئی۔" مذکورۂ بالا ہر دو عبارت سے متضاد صورت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ کبھی آپ یہ ایک کلیہ سمجھتے ہیں کہ اُردو اور ہندی علحدہ علحدہ زبانیں ہیں۔ اور کبھی آپ کی تحریر سے یہ مطلب برآمد ہوتا ہے۔ کہ ہندی نے دکن میں ادبی صورت پیدا کی — آپ کسی کلیہ پر قائم ہو جائیں تو کہنے والا کچھ کہہ سکتا ہے ورنہ کس پہلو کا جواب دیا جائے صاحب تبصرہ ص۱۹ پر لکھتے ہیں: "لیکن بہت سے ہندی الفاظ اور ہندی ترکیبیں اور بعض ہندی خصوصیتیں ویسی ہی باقی رہیں —" (یعنے قطب شاہ کے وقت کی ریختہ میں)

پھر اس کے بعد ہی لکھتے ہیں: "اور یہی وجہ ہے کہ اُس وقت کی زبان میں گنگا جمنی ترکیبوں کی جھلک نظر آتی ہے۔"

پھر ص۲۳ پر لکھتے ہیں "غرض کہ اس قسم کے اشعار سے سارا دیوان بھرا پڑا ہے ہندی شاعری کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے اور بجائے ہمدم و مونس کے سکی (سکھی) سہیلی اور ساجن اور بجائے رقیب دوتی، وتن۔ اور پریم، نیہ، پرت، اور، برہ کے الفاظ ہمارے قول کی تصدیق کرتے ہیں —"

فاضل مخاطب کی طرز تحریر سے ٹپکتا ہے کہ پریم، پرت، برہ ساجن وغیرہ الفاظ صرف ہندی ہی کے ہیں۔ اور اسوقت ہی سے ریختہ میں گنگا جمنی اثر کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ سراسر خیال ہے۔ کیونکہ یہ الفاظ ملک دکن کی مختلف زبانوں تلنگی۔ مرہٹی وغیرہ کے بھی الفاظ ہیں — یہاں مزید صراحت کی غرض سے مختصر نمونے دکھلائے جاتے ہیں: —

اُردو	تلنگی	مرہٹی	کنڑی	اُردو	تلنگی	مرہٹی	کنڑی
محبت	پیرے ما۔ پے ما	ممتا	.	منت سماجت	.	نبتی	.
شوہر	پرت۔ پرتلو۔ برتلو	.	.	غذا	انم	انّ	ان
کام۔ دہام۔ سمار	سمار	سول سار	.	نام	.	ناؤن	ناؤن
سخی۔ مالک	داتار	داتا۔ دہنی	دہرم داتا	سہیلی	.	سکھی	.
خیال یار	دیاونت	.	.	اونچا	.	اُونچھ	.
غور۔ خیال فکر	ڈیاں۔ دیانم	دہیاں	جتم	اندہا	.	اندھ	.
دنیا عالم۔ جوطرف	جگت	برتھوی	.	رنگ	.	رنگ	.
فقیر۔ جوگی	گسائیں	سنت سادہو گسائیں	.	پر۔ مگر	.	پنٹرہ	.
شام کام	انند	.	انندم	نہانا۔ حمام		اشنان	.
دنیا۔ جگ	جگ	جگت	لوگت	نوکر۔ چاکر		چاکر	.
عورت	استری	ستری۔ نار	.	ہے		آہے	.
مست اگن	اگن	سکھی	.	بیماری۔ آزار		آزار۔ آجار	.
ریت۔ رسم۔ وضع	ریت	طرح	.	رقم		رکم	.
صورت۔ روپ	روپ	.	.	حفاظت		جتن	.
پانی	نیر	جل	نیر جلم	نقد		نگد	.
				کاغذ		کاگد	.
گناہ۔ پاپ	پاپ	.	.	سخت		کٹھنہ	.
رات	رین	راتر	راتری	ہمیشہ		نت	.

اب یہاں یہ خیال ہوتا ہے کہ آیا بہاکا قدیم زبان ہے یا تلنگی۔ مرہٹی۔ کنڑی۔ قدیم زبانیں ہیں۔ کیونکہ جل۔ نیر۔ سکھی اور روپ وغیرہ یہ الفاظ مشترکہ طور پر بہاکا اور تلنگی وغیرہ زبانوں میں یکساں مستعمل ہیں۔

مشاہدات تواریخ نے یہ عقدہ بھی حل کر دیا ہے کہ تلنگی۔ اور مرہٹی وغیرہ زبانیں بہت قدیم ہیں۔ اور اُس زمانے سے ہندوستان میں رائج ہیں جبکہ بہاکا کی ماں یعنے سنسکرت کا بھی ہندوستان میں وجود نہ تھا کیونکہ سنسکرت کا ایرین رہنا تواریخ سے ثابت ہے مگر اس کا ثبوت ہنوز نہیں ملا کہ زبان ایرین کے ساتھ ہندوستان میں آئی ہے یا ایرین کی خاص زبان ہندوستان میں آکر اور منضبط ہو کر سنسکرت سے موسوم ہوئی ہے ؟

اور ایرین ہندوستان میں آنے سے قبل بھی تقریبا د و سو برس پیشتر تلنگی اور مرہٹی وغیرہ زبانیں ہندوستان میں موجود تھیں۔
اب تو آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ قدیم ریختہ بھی آپکی ہندی یعنے بھاکا کے میل سے بے نیاز رہی ہے اور قدیم ریختہ میں بھی آپ جن الفاظ کو ہندی سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ دراصل ہندی نہیں ہیں۔ بلکہ ملک دکن کی قدیم مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں۔ الفاظ سے قطع نظر کرکے اب بعض تراکیب کو بھی دیکھ لیجئے

عربی میں انا کا جو محل استعمال ہے۔ تلنگی میں اسی موقع پر باسقاط الف صرف نا مستعمل ہے اور فارسی رفتم گفتیم میں تیم علامت واحد متکلم سمجھی جاتی ہے۔ اُسی طرح یوتم تیتم کی میم تلنگی میں بھی واحد متکلم سمجھی جاتی ہے۔ اور جمع متکلم کیلئے جو فارسی لفظ ما ہے تلنگی میں بھی جمع متکلم کیلئے ماہی بولا جاتا ہے اور فارسی والے محل استعمال کے لحاظ سے واحد متکلم کو بشکل اعزاز و غرور جمع تعظیمی ما بولتے ہیں۔ اسی طرح تلنگی میں بھی ویسے ہی موقع پر ما مستعمل ہوتا ہے۔

جستجو کرنیوالے کو اسکے علاوہ اور بہت سی چیزیں دستیاب ہوسکتی ہیں [1]

صاحب تبصرہ پھر صفحہ پر لکھتے ہیں۔ لیکن باوجود ان تمام اثرات کے ایک بات خالص ہندی ہے۔ جو

"اسکے کلام میں شروع سے آخر تک پائی جاتی ہے۔ یعنے بخلاف فارسی شاعری کے عورت کیطرف سے عشق و محبت کا اظہار ہوتا ہے وہ مرد کو بیوفائی کے طعنے دیتی ہے۔ سوکن (رقیب عورت) کی طرف بدگمانی اور رشک ظاہر کرتی ہے برہ کی راتیں بیقراری میں کاٹتی ہیں۔ غرض وہ عاشق ہے اور مرد معشوق یہ ہندی شاعری کا رنگ ہے۔"

شاعری کی اس طرز کو کہ عورت عاشق ہے اور مرد معشوق، آپ ہندی طرز فرماتے ہیں مگر یہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ تلنگی، مرہٹی کنڑی وغیرہ زبان کی شاعری میں بھی عشق کی ابتدا عورت ہی کی طرف سے ہوتا ہے اور مرد معشوق قرار پاتا ہے۔ اگر آپ اس کا ثبوت چاہتے ہیں تو پہلے تلنگی، کنڑی وغیرہ زبانوں سے واقفیت حاصل کیجئے۔ اور ان زبانوں کی شاعری کا گہرا مطالعہ فرمائے اس کے بعد آپکو سب کچھ علم ہوسکتا ہے۔

بلکہ تلنگی، مرہٹی زبان دانی اردو (ریختہ) کی واقفیت کیلئے ضروری سمجھی جانا چاہئے ہاں شمالی ہند کی موجودہ اردو کی واقفیت کے لئے آپ بھاشا زبان دانی ضروری سمجھتے ہیں تو وہ اور بات ہے۔ اور ایسی اردو جسمیں فارسی، عربی الفاظ کم کرکے نئے بھاکا کے محاورات بڑھا دئے گئے ہیں۔ یا بڑھا دے جارہے ہیں۔ اردو کیا صرف بھاکا ہی بھاکا رکھی ہے۔ ایسی اردو آپ ہی کو مبارک۔

[1] اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ زبانیں آپس میں ایک ہیں۔ مگر تقاضائے فطرت اس امر کا متقاضی ہے کہ جنس انسان کے خیالات الفاظ، اور لب لہجہ وغیرہ اگر زیادہ نہیں تو کم سہی مگر یکانگت پیدا کرے گو کہ یہ مقامات کی آب ہوا اور ضروریات مجبور کرتے ہیں کہ اختلاف پیدا ہو۔ لیکن آب و ہوا اور ضروریات سے فطرۃ زیادہ قوی چیز ہے۔ حالی رفاعی

زیر بحث تبصرہ علم کلام کی نظر سے

بیان طرز بیان اور فن کلام کی تفہیم اور صراحت مقصود نہیں ہے لیکن ہر دو رنگ کے بعض اجزا کے متعلق ضروری نکات سے مطلب ہے ہمارا یہ مفہوم نہیں ہے کہ اس فن کے جاننے والے مفقود ہو گئے ہیں۔ ایسا نہیں بلکہ یہ فن اپنے جاننے والوں کی وجہ سے زندہ ہے ہرچند اس فن کے جاننے والے کم ہیں۔ اور حقیقی جاننے والے جنھیں اس فن کا برموقع برتنا آتا ہے وہ بہت کم۔

اس فن کا یہ مقصد ہے کہ قائل کا قول سامع کے ذہن نشین ہو۔ اور اس طرح ذہن نشیں ہو کہ اس کا حاصل سمجھ میں آجائے + جس نکتہ کو مدنظر رکھ کر کلام شروع کیا گیا تھا۔ وہ باوجود کثرت کلام اور طول بیان کے اصلی مفہوم سے الگ ہونے پائے اور تسلسل بیان باوجود تمثیلات و تحویلات و ملحقات کے اصلی مقصد سے اتنی دور نہ جا پڑے جس سے مرکز فہم غیر ضروری خیالات کا مسکن بنجائے۔

فن کلام میں مکررات نہ صرف حسن کلام کھو دیتے ہیں۔ بلکہ حقیقی مطلب فوت کر دیتے ہیں اور دلبستگی سے بھی علحدہ کر دیتے ہیں۔ اور پھر بعض ایسے مکررات جو ایک قسم کی متضاد صورت رکھتے ہیں، رہی سہی بات بھی ضایع کر دیتے ہیں اور اگر ایسے مکررات کو فن بلاغت کی ایک قسم اطناب کہیں تو بھی ناموزوں ہے۔ کیونکہ اطناب کے معنی مطلب کو وضاحت سے پھیلا کر بیان کرنے کے ہیں۔ نہ کہ مکررات اور مکررات بھی متضاد شکل کے!

زیر بحث ادبی تبصرے میں فاضل مخاطب مولوی عبدالحق صاحب کی تحریر نے جہاں مکررات اور متضاد کی صورت اختیار کر لی ہے اس کے بعض نمونے بھی ہدیۂ ناظرین کرنا مناسب ہے!!

مثال مکررات کی

اتنی سی بات کو کہ۔ اُردو میں ابتدا ہی سے فارسی عروض کی تقلید کیگئی ہے۔ مکررات میں یوں بیان کرتے ہیں:۔

ص پر لکھتے ہیں

تمام اصناف سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ، رباعی، غزل اُردو میں بلاتکلف آگئے الفاظ تشبیہات استعارات بے بنائے تیار مل گئے۔ الفاظ کے ساتھ خیالات بھی داخل ہو گئے اور قصیدہ مثنوی اور رباعی اور غزل میں وہی شان آگئی جو فارسی میں پائی جاتی ہے۔

ص۱۲ پر لکھتے ہیں۔ اوپر جو نمونے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام سے پیش کئے گئے ہیں ان سے فارسی شاعری کا اثر صاف ظاہر ہے۔ خیالات وہی ہیں۔ استعارات و تشبیہات پر بھی وہی رنگ ہے، اور بحر بھی فارسی ہیں۔"

ص۳۳ پر لکھتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات عموماً سب کے سب فارسی ہیں البتہ دو ایک جگہ ندرت دکھائی ہے"۔

ص۳۲ پر لکھتے ہیں۔ تمام بحریں (سوائے ایک آدھ کے) فارسی ہیں۔ عروض کا قومی زبان اور خیالات سے خاص لگاؤ ہوتا ہے اُردو نے ابتدا سے یعنے جب سے اسے ادبی حیثیت ملی ہے غیر زبان کا عروض اختیار کیا اگر بجائے فارسی (عربی) عروض کے ہندی عروض ہوتا تو اُردو ہندی نظم اور زبان میں مغائرت جو اس وقت نظر آتی ہے نہ رہتی۔ یا بہت کچھ کم ہو جاتی۔"

مکررات متضاد کی مثال اور قطب شاہ کے کلیات پر فاضل مخاطب کی رائے

ص۱۹ پر لکھتے ہیں جو لوگ فارسی شاعری کے دلدادہ ہیں اور جنکے ذوق کی بنیاد ایرانی شعرا اور بعد کے اردو کلام پر ہے انھیں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں خیالات کی جدت استعارات و تشبیہات کی ندرت تخیل کی بلند پروازی بندش کی چستی نظر نہیں آئیگی۔

صـ۲۰ پر لکھتے ہیں:- اگر زبان کی قدامت کا پردہ حائل نہ ہو تو سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہمارے ہاں کے اوسط درجہ کے شعرا سے کسیطرح کم نہیں۔"

صـ۲۲ پر لکھتے ہیں:- ان اشعار سے جو صاف اور سادہ ہیں قطب شاہ کی شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے جو لوگ قدیم زبان سے واقف ہیں۔ انھیں اس کا خاص لطف آئیگا۔"

صـ۲۳ " " ":- اگر وہ ایک شاعروں کو مستثنیٰ کر دیا جاوے جنکا درجہ درحقیقت نہایت بلند ہے تو ہمارے ہاں کی عشقیہ شاعری میں کوئی بات نئی نظر نہیں آتی۔"

صـ۲۳ " " ":- چار سو برس پہلے کا کلام اگر آج کل کے شعرا کے عشقیہ کلام کے سامنے رکھہ دیا جاوے تو سوائے زبان تغیر و شستگی کے کوئی اور فرق معلوم نہ ہوگا۔"

صـ۲۳ " " ":- ذیل میں ایک غزل کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ ان سے شاعر کے رد ز کلام اور قوت بیان کا بہت اچھا اندازہ ہو سکتا ہے۔

صـ۲۵ " " ":- کیا یہ اشعار اپنے خیالات اور ندرت بیان میں کسی شاعر کے کلام سے کم ہیں؟ —"

صـ۲۵ " " ":- (اسی سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے):- علاوہ ان خوبیوں کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور جو ہمارے شعرا میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔
سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ایک بات نئی دیکھی گئی ہے جو اردو شعرا میں سوائے سودا اور نظیر کے کسی دوسرے کے کلام میں نہیں پائی جاتی وہ یہ ہے کہ اس نے اپنی شاعری کو صرف عشق و محبت۔ حمد و نعت۔ منقبت و مرثیہ تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انسانی معاشرت اور مظاہر قدرت پر بھی نظر ڈالی ہے۔ مثلاً متعدد مثنویاں پھولوں میووں پر ہیں۔ ایک مثنوی سبزی ترکاری کے بیان میں ...... وغیرہ اگرچہ یہ مثنویاں معمولی ہیں اور شاعری کے لحاظ سے اعلیٰ رتبہ نہیں رکھتیں۔"

صـ۲۵ پر لکھتے ہیں:- اور اپنے مشاہدہ کو کلام میں لاکر ایسی چیزوں پر نظمیں لکھیں جن سے اُردو کے بعد کے شاعر بھی قاصر رہے۔"

صـ۲۶ " " ":- غرض سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام ہر لحاظ سے قابل قدر ہے تبصرہ زیر بحث کی نسبت مجمل اور مختصر طور پر مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ کہدیا۔

اور اب اردو زبان کی اصلاح اور ترقی کیلئے اتنا کہدینا بھی ضروری ہے کہ کسی زبان کی اصلاح اور ترقی اسی ملک کا حصّہ ہے جہاں بادشاہت قائم ہو کیونکہ زبان کی ترقی اور اصلاح کے لئے سب سے اول اثرات کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہ ایک حاکم کی طرف سے رعایا اور ملازمین کا بڑا گروہ وجوباً اسی اصطلاح یا محاورے کو قبول کرے۔ جو حاکم کی طرف سے بولا جا رہا ہے۔ یا بولنے یا پڑھنے کیلئے کتب وغیرہ میں پیش کیا جا رہا ہے اور دوسری

ضرورت سرمایہ کی ہے۔ اور ایک شخص ایک کمیٹی یا انجمن وغیرہ اتنے مصارف برداشت کر نہیں سکتی جو ایک سلطنت صرف کر سکتی ہے۔

غرض اصلاح وصفائی اور ترقی اردو کے جو جو لوازم ہونا چاہیئے وہ بحمد اللہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد (دکن) میں کافی طور پر موجود ہیں۔ اور اب سے نہیں بلکہ صدیوں سے اور ہم اردو زبان کے مصلح ہیں۔ مالک ہیں۔ اہل زبان ہیں اب ہماری اردو پر انگشت نمائی کرنا خود انگشت نما ہونا ہے۔ یہ مانا کہ بیجا خودداری کرنیوالا گروہ ہماری اردو پر معترض ہے مگر انکی کوشش بے سود اور ہمارے مقابل بے شمار ارکی فوج کی سینہ زوریاں جنون آمیز مضحکہ خیز ہیں۔

عالی رضاعی حیدرآبادی

زن مرید

(۱)

اسکی صورت بیحد دلکش تھی، بڑی معصوم جیسے باغ ارم کی کوئی خوبصورت کلی، اسے دیکھکر کون کہہ سکتا تھا کہ اس کا دل حریص بھونرے کے مانند سیاہ ہوگا

اتنی حسین، ایک نوجوان تعلیم یافتہ لڑکی، اس کلجگ میں پرستش کے قابل سمجھی جاتی ہے اس پر یتیم کہ نئی دلہن، عارف نعیمہ کو دیکھتے ہی شیدائی ہوگئے، بالکل بے خود، جیسے چاند کو دیکھکر چکور بے خود ہو جاتا ہے،

وہ ناسمجھ نہیں تھے، نہ جاہل تھے، ازدواجی زندگی کے موٹے موٹے اصولوں سے بیخبر ہی نہ تھے، شادی سے چند روز پہلے انہوں نے تعلقات زن وشوہر پر ایک مضمون کی کتابت بڑی دلچسپی سے کی تھی "عورت کے تعلق کی ابتدا ہی سب کچھ ہے" اس مضمون کا یہ ایک جملہ تھا جسپر ہوائی قلعہ بنانے میں انکی کئی راتیں صرف ہوچکی تھیں بیوی کے ساتھ میرا کیا طرز عمل ہوگا، میں کیسی سنجیدگی کے ساتھ محبت کا اظہار کروں گا، کس طرح اسپر اپنی عظمت کا سکہ بٹھاؤں گا، وہ کیونکر شوہر پرستی کے طریقوں سے آگاہ ہوگی، یہ اور اس قسم کے دوسرے امور پر خوب غور و فکر کرکے انہوں نے حیات ازدواجی کا ایک وقار آمیز لائحہ عمل تیار کیا تھا، لیکن وہ پہلی رات ہی کو نئی دلہن کی رونمائی میں ان الفاظ کے ساتھ نذر کر دیا گیا:-

تم کتنی خوبصورت ہو، کیسی پیاری، کسقدر شرمیلی، نعیمہ! میرے دل کی ملکہ!! میری طرف دیکھو" نعیمہ کسی امیر گھرانے کی لڑکی نہ تھی، اسے مختصر جہیز ملا تھا، اور معمولی زیور، لیکن رخصت کے وقت ماں سے ایک اور بھی جہیز لائی تھی، سخت مہلک نہایت خوفناک، جسے وہ زندگی کا سدا بہار پھول سمجھتی تھی، یہ اسکی ناعاقبت اندیش ماں کی نصیحت تھی "نعیمہ بیٹی! جس طرح ہوسکے اپنے میاں کو قبضہ میں رکھنا، مرد بس میں ہوتا ہے تو عورت سسرال میں حکومت کرتی ہے" یہ بیش قیمت جہیز جو ماں نے دیا تھا بیٹی کے دماغ میں اچھی طرح پھیل گیا تھا، نعیمہ کی بہت بڑی آرزو تھی کہ عارف اسکے بس میں رہیں، سسرال میں اسکی حکومت قائم ہو جائے۔

عارف بیتابانہ التجاؤں کا دریا بہا رہے تھے، نعیمہ کے دل میں مسرت کی لہریں اٹھ رہی تھیں، جیسے اسے کسی بڑے دفینہ کا پتہ معلوم ہوگیا ہو، وہ نئی دلہن تھی، پہلی رات میں بات چیت کرنا مناسب نہ سمجھی، لیکن بہت سی ناولیں اسکی نگاہ سے گزر چکی تھیں، وہ جانتی تھی کہ عورت کا پہلا فریب محبت کبھی بیکار نہیں جاتا، اسے اظہار محبت کے اور طریقے بھی معلوم تھے، جب عارف کی التجاؤں کا اچھا خاصا ہجوم ہوگیا، تو اسنے خاموشی کے ساتھ ان سب کا ایک جواب دیدیا، کتنا دلفریب کیسا پر اثر جواب، اس نے شرما کر گوری گوری باہیں عارف کے گلے میں ڈالدیں۔

---

(۲)

اب عارف کیلئے نعیمہ ہی کُل کائنات تھی، دل و جان سے فدا تھے، جیسے شمع پر پروانہ، ماں باپ کا ادب، نہ بھائی بہن کا لحاظ، سارا دن اور تمام رات گھر میں رہتے، خلوت ہوتی تو اظہار محبت کا طومار باندھ دیتے، جلوت ہوتی تو بیٹھے اسکی صورت تکا کرتے، جب وہ نگاہ اٹھا کر دیکھتی، یہ نہال ہو جاتے، وہ مسکرا دیتی، کیسا کھلا ہوا چہرہ، وہ مسکرا دیتی، یہ کہاں تھے، وہ ہنستی یا کوئی بات کہتی، یہ دل ہی دل میں کہتے کیسے پھول جھڑ رہے ہیں، ایک منٹ کی جدائی گوارا نہ تھی، کبھی دل پر بڑا جبر کرکے باہر نکلتے تو اجازت لیکر، بہت جلد واپسی کا وعدہ کرکے، نعیمہ نے کچھ ایسا جادو کر رکھا تھا کہ اس کے دیکھے بغیر انکو کہیں چین نہ آتا، جو کہتی سو کرتے، جو کرتی سو ٹھیک، غرض انکی محبت کیا تھی ایک طوفان تھا، بے شمار گھروں کو تباہ و برباد کردینے والا طوفان، انکا دل تھا کہ ایک سر مضطر

(مضطرب جسطرح چاند کی جانب چکور کی پرواز، بالکل ناکام قطعاً مہلک پرواز۔

عارف ایک مشہور کاتب تھے، خوش نویسی میں انہیں اچھا ملکہ حاصل تھا، وہ مصوری سے بھی ذوق رکھتے تھے، مطابع اور جرائد کے مالکان انکی بڑی قدر کرتے تھے، مطبوعات کی اعلیٰ کتابت کیلئے عارف کا نام بہترین ضمانت سمجھا جاتا تھا، شادی سے پہلے وہ ایک ممتاز اخبار میں ملازم تھے، لیکن شادی کے بعد مالکان اخبار نے انکی بے نیازی اور دو ہفتہ کی مسلسل غیر حاضری سے تنگ آکر انہیں جدا کر دیا، عارف کو ذرا بھی خیال نہ ہوا، کیا وہ معمولی کاتب تھے، انکے جز کتابت کرنیوالے انکی بڑی شہرت تھی، انہوں نے اس فیصلہ کو حقارت کے ساتھ سنا، اور کہہ دیا، مجھے اسکی پرواہ نہیں، آج سے ملازمت کی ایسی تیسی، جسے سو دفعہ غرض ہوگی میرے دروازہ کی خاک چاٹنے آئے گا، بات غرور بھری ضرور تھی مگر تھی ٹھیک، شروع میں ایسا ہی ہوا، غرض مند گھر بیٹھے کام بلکہ پیشگی دام دیجاتے لیکن عارف کے سر پر تو محبت کا بھوت سوار تھا، کام کون کرتا، تقاضے پر تقاضے کرتے تھے وعدہ پر وعدہ کئے جاتے تھے، جسکا کام لیا رو رو کر کیا، اور اسے دلاکر دیا، ضرورت مند ضرورت مند ہوتے ہیں پاگل نہیں ہوتے، دام دیں اور کام بھی نہ ہو، تھوڑے دنوں تک یہ رنگ رہا، اس کے بعد لوگوں نے اسکی طرف توجہ کم کر دی،

(۳)

نعیمہ کی تعلیم تو کچھ ایسی زیادہ نہ ہوئی تھی تاہم وہ معمولی طور پر لکھ پڑھ سکتی تھی، اُسے ناولوں سے بڑی دلچسپی تھی، اردو رسالوں میں وہ افسانے زیادہ پسند کرتی، یا وہ مضامین، جو مغربی تہذیب کی حمایت میں لکھے جاتے، اسے افسانہ لکھنے کا بھی بڑا شوق تھا، اس کا ایک فسانہ "عورت کی محبت" ایک مشہور رسالہ میں شائع بھی ہو چکا تھا، جس نے اس کے ذوق افسانہ نویسی کا اور بھی اشتہار دیدیا تھا، یہ افسانہ حقیقت میں تو کچھ نہ تھا، لیکن مدیر رسالہ کے الفاظ تحسین، عبارت کی رنگینی، اور خصوصاً "مس نعیمہ بیگم" کا نام، یہ چیزیں اُسے لے اوڑیں نوجوان طبیعتوں سے خوب داد ملی،

نعیمہ تہذیب جدید کی شیدائی تھی، بڑی بوڑھی عورتوں کو جاہل سمجھتی اور پرانے خیالات کی ہمشنوں کو دقیانوسی اولاد کہتی، پردہ کی سختیوں سے جلتی، فیشن پر مرتی، بناؤ سنگار سے بہت رغبت رکھتی، کنگھی چوٹی کرنے بیٹھتی تو آئینہ کے سامنے گھنٹوں بال کی کھال نکالا کرتی، ساری باندھتی، انگریزی فیشن کا جوتہ پہنتی، حیا نہ شرم اسینہ کا خیال نہ گھونگھٹ کی فکر، بہو کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھکر ساس کے ہوش اُڑ گئے، نئی نئی دلہن، کچھ کہتے ہوئے لحاظ معلوم ہوتا تھا اور بغیر کہے رہا نہ جاتا، کبھی پی جاتی کبھی نرمی سے سمجھا دیتی، ساس کی نصیحتیں نعیمہ کو زہر معلوم ہوتی تھیں وہ انگریزی بال نہ بنائے، ترچھی مانگ نہ نکالے، ساری نہ پہنے، کسی کے سامنے میاں سے باتیں نہ کرے، اسکی طرف دیکھے بھی نہیں، سُسر کے پیروں کی چاپ سنکر ڈیڑھ ہاتھ کا گھونگھٹ نکال لے منہ کھولکر باتیں نہ کرے، ہنسنے والی بات پر بھی زور سے نہ ہنسے، چلنے میں جھانجھ اور چھڑوں سے چھم چھم کی آواز نکلنے نہ پائے۔ اس جہالت کا کوئی ٹھکانا بھی ہے، ان باتوں کے لئے کیا کوئی اور زمانہ آنیوالا ہے، کیا وہ جوان نہیں ہے، یا اپنی جوانی کی امنگوں کو کسی کے بڑھاپے پر قربان کر دے، پھر کسی جاہل عورت کو کیا حق ہے کہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی کو نصیحت کرے، اس میں نعیمہ کی کتنی سخت توہین تھی، وہ ساس کی باتوں پر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی اور پہروں سوچا کرتی جس گھر کا یہ رنگ ہے وہاں ہماری حکومت کیسے جم سکتی ہے

(۴)

ایک رات جب عارف اظہار محبت میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے، نعیمہ نے کہا "زیادہ محبت نہ کرو لوگ جلتے ہیں۔"

عارف کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے محبت کی شراب چڑھی ہوئی تھی جوش کے ساتھ بولے:۔ جلنے دو نعیمہ پیاری، دشمنوں کو جلنے دو!

و نعیمہ بولی :- دشمن نہیں تمہارے اپنے سگے،

عارف ذرا چونکے، پوچھا کون ؟

نعیمہ :- تمہارے ماں باپ، تمہارے بھائی بہن تمہارا سارا کنبہ اور کون "تم نے کیا سمجھا، اے خدا واسطے کا بیر کس لئے ؟ محبت کے نشہ میں یہ پوچھنے کا ہوش کسے تھا جیسے کوئی شرابی، ساغر کو لبوں سے لگائے ہوئے لڑکھڑا لڑکھڑا کر بہکی باتیں کرتا ہے، اسیطرح عارف کہنے لگے :- دو دلوں کے ملنے پر کم بخت جلتے ہیں، یہ محبت کی توہین ہے، خدا انھیں غارت کرے کیا اماں بھی جلتی ہیں ؟

نعیمہ نے گردن موڑ کر طنز کے ساتھ جواب دیا :- ہیں ، وہ ۔ کیوں جلنے لگیں، بڑی نیک ہیں ! بس گی گانٹھ تو وہی ہیں، ساری آگ تو انھیں کی لگائی ہوئی ہے ۔ وہ اب بوڑھی ہوئیں، عقل ٹھکانے نہیں رہی انکی بات کا برا نہ مانا کرو۔

نعیمہ :- چلو بس رہنے دو، پاگل نہیں ہیں وہ بوڑھی ہیں کہ جوانوں کے کان کاٹتی ہیں، ابھی کل کی بات ہے تمھارے ابا جان نے تمھیں پوچھا وہ کام پر کیوں نہیں جاتے، تڑاق سے بول اٹھیں، جائیں کیسے، بیوی ہونے تو پلو سے باندھ رکھا ہے، پوچھو یہ خدا واسطے کا بیر مجھ سے کیوں ہے، میں نے کیا کسی سے کہہ دیا ہے کہ گھر میں بیٹھے میری صورت تکا کرو۔

عارف دل ہی دل میں جھلا رہے تھے، کیسے مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں یہ جھمیلا کمبخت بیچ میں کہاں سے نکل آیا، وہ ٹالنے کے طور پر کہنے لگے :- ہوگا بھی جانے دو، جاہل ہیں، کوئی بات منہ سے نکل گئی ہوگی۔

نعیمہ :- کوئی بات ابھی یہاں روز یہی رنگ ہے، دیکھتے دیکھتے دل خون ہوگیا، سنتے سنتے کلیجہ پک گیا، میں تم سے کیا کہوں، انھیں تو جیسے ہول دل ہوگیا ہو، جس سے دیکھو اس سے بیٹھی یہی دکھڑا رو رہی ہیں، موئی مہترانی، اسکی کیا اوقات ایک دن اس سے ہی تمھارے بارے میں کہنے لگیں، جورو کے مرید ہوگئے ہیں، کمائی نہ دھمائی ٹھسو بنے گھر میں پڑے رہتے ہیں "

عارف کو ایک مہترانی کے سامنے کیسا ذلیل کیا گیا تھا، یہ ماں تھی یا دشمن اس بات پر انھیں بڑا غصہ آیا لیکن وہ پیچ و تاب کھا کر خاموش رہ گئے، نعیمہ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

ابھی اسدن جب تم مٹھائی لینے بازار گئے تھے، پڑوس کی بڑھیا آئی، سارے زمانے کی لتری کٹنی حرامزادی، باتوں میں تمھاری کوئی بات چلی تو بس کہنے لگیں میاں بیوی نہیں ہیں عاشق معشوق ہیں، لیلی مجنوں، حیا شرم تو دونوں نے جیسے گھول کر پی ڈالی ہو، دن ہے تو کمرہ بند، رات ہے تو کمرہ بند، تو بیچ کوئی ایسا بے غیرت ہو۔ دنیا میں اور بھی تو جوان ہیں، بہن تم نے دیکھا ہوگا، ہماری بھی تو کبھی جوانی تھی، کسی کو کانوں خبر نہ ہوتی تھی، بھاڑ میں جائے ایسی جوانی، توبہ توبہ، بتاؤ یہ مر جانے کی جگہ ہے یا نہیں، ہم سے تو یہ باتیں نہیں سنی جائیں گی، اتنے دنوں میں تو انھوں نے مجھے طعنوں سے چھید ڈالا۔ کلیجہ میں اب جگہ نہیں رہی، بس للہ تم مجھے میرے میکے پہونچا دو" آخری جملے کے ساتھ نعیمہ کے گلابی رخساروں پر اشکوں کے موتی ڈھلک آئے، عورت کے فریب میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ مرد کبھی اس کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا، عارف بیتاب ہوگئے نعیمہ کے آنسو پونچھتے ہوئے بولے :-

رو نہیں پیاری، میں تمھیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، دیکھو میرا دل سینہ سے باہر نکلا پڑتا ہے۔

نعیمہ نے جو تیر چلایا تھا، وہ ٹھیک نشانہ پر بیٹھ گیا، یہ دیکھکر اسے کیسی خوشی ہوئی، مگر فریبی عورت مسرت پر غم کا پردہ ڈال سکتی ہے، اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا: آہ ... یہ رونا تو عمر بھر کا ہے، آج تم نے آنسو پونچھ لئے۔

اب عارف کس طرح صبر کر سکتے تھے، انکی نئی دلہن کے نازک دلکو بڑا صدمہ پہونچایا گیا سارا قصور انکی ماں کا ہے، اس جوم کو بیوی کے آنسوؤں نے کتنا سنگین بنا دیا۔ جیسے اس ڈائن کا گناہ، جو دوسروں کے بچے کھا کر اپنی اولاد کی تباہی کا باعث بنتی ہے نعیمہ سے دشمنی کرنا خود نعیمہ کے حق میں کانٹے بونے سے کم نہ تھا، غم و غصہ کی ملی ہوئی آگ بھڑک اٹھی، کہنے لگے۔ کیسی باتیں کر رہی ہو، تم سے کون آدھی بات کہہ سکتا ہے صبح ہونے دو میں اس ڈربہ ہی میں اگ لگائے دیتا ہوں۔

(۵)

عارف نے سچ مچ ڈربہ ہی میں آگ لگا دی، وہ ماں باپ سے علحدہ ہو گئے، اس میں کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں تھی، یہ محبت کا امتحان تھا، نعیمہ کی مراد پوری ہو گئی، ابھی تک عارف دوسروں کے ہاتھ میں تھے اب صرف اسکے بس میں رہیں گے۔ آج وہ گھر کی مالک ہے، بالکل خود مختار، نہ ساس کا ڈر کا سسر کا ڈر، اسے کتنے دنوں میں بعد کھلی ہوا میں سانس لینا نصیب ہوا، وہ بہت خوش تھی، جیسے کوئی قیدی کال کوٹھری سے چھوٹا ہو۔ مگر عارف بہت پریشان تھے، کیا انھیں ماں سے جدا ہونے کا رنج تھا جسنے کتنی مصیبتوں، کتنی منتوں، کتنے ارمانوں کے ساتھ انہیں پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا یا باپ سے علحدہ ہونے کا صدمہ تھا جس نے کیسی شفقت، کیسی توجہ کیسی محنت سے انھیں اس قابل بنایا تھا، یا پھر اس گھر کے چھوٹنے کا افسوس تھا، جہاں پیدا ہوئے پروان چڑھے، بیاہ شادی ہوئی، نہیں، انھیں ان باتوں کا ذرا بھی خیال نہ تھا، بیوی کی محبت اتنی ذلیل نہیں ہو سکتی تھی ساری پریشانی خرچ کی تھی۔ کام کہیں ملتا نہ تھا، کسی پران کو بھروسہ ہی نہ رہا تھا، قرض سے زندگی بسر نہیں ہو سکتی، اب دوست احباب بھی منہ چرانے لگے تھے، ضروریات کس طرح رک سکتی تھیں، صبح کیوقت دودھ جلیبیوں کا ناشتہ نہ ہوتا تو نعیمہ بیگم کے حلق میں دن بھر کانٹے پڑے رہتے، ایکدن ناغہ ہو گیا تھا تو بیوی بنوئے تڑسے کہہ دیا تھا، جداکس برتے پہ ہوئے ہو۔ کھانے میں دال اسے وبال تھی، دونوں وقت گوشت نہ ہو تو نوالہ اٹھانا حرام۔ پہننے میں ہوئی ململ کھاروے سے بدتر، جکن۔ گلبدن کے بغیر چین نہیں، سنگاردان میں کوئی چیز کم ہو گئی بس سہاگ اجڑ گیا، کسی ناول کی تعریف کانوں نے سنی یا آنکھوں سے دیکھی، اب اس کے پڑھے بنا بے کلی ہے، آزادیٔ نسوان کے حامی دو رسالوں کی خریداری قومی فرض اور ایک انجمن خواتین کی رکنیت کا چندہ پہلی تاریخ کو بھیج دینا لازمی تھا عارف کی جان بڑی الجھن میں تھی، مگر نعیمہ کو اسکی کیا پرواہ، کوئی لڑکی اپنے پیاروں کو مصیبت اٹھانے کے لیے نہیں چھوڑتی، اسکی جوتی کو کیا غرض پڑی تھی کہ دوسرے کے ساتھ فکروں میں اپنی جان گھلایا کرے۔

ایک روز عارف بہت متفکر تھے، نہ جانے نعیمہ کو خدا کا کیا خوف آیا کہنے لگی آج تم بہت پریشان معلوم ہوتے ہو!

عارف جیسے منتظر ہی تھے، بولے کچھ نہیں، اسدن تمھیں جڑاؤ ٹونگے بہت بھلے معلوم ہوئے تھے، میرے پاس کچھ تھا نہیں، ایک دوست سے قرض لیکر خرید لئے تھے، آج کا وعدہ ہے بیسوں تدبیریں سوچتا ہوں مگر بے سود،

نعیمہ نے پوچھا، پھر؟ جیسے اُسے بڑی ہمدردی ہو۔

عارف کہنے لگے۔ کوئی صورت نہیں نکلتی،.... (ذرا رک کر) برا نہ مانو تو ایک بات کہوں مناسب سمجھو تو اپنے ہاتھوں کے کڑے دیدو، بس دس دن میں آجائیں گے، اسوقت بات رہ جائیگی۔ کڑے کا نام سنکر نعیمہ چونک پڑی، جیسے کسی نے اسکی طرف گولی چلائی ہو، اور بولی کیا کہا کڑے، یہ کڑے تو اماں نے بڑی مصیبت سے بنوائے ہیں، تم چاہو تو اپنی دی ہوئی انگوٹھی لے سکتے ہو اور رہن دیکھو، بات پہ بات کہی جاتی ہے تمھیں اپنے دوست کے وعدہ کا تو اتنا خیال ہوا

اور اسدن جب میں چولھے کے سامنے آگ سے فکر لیپنہ مین شرابور اٹھی ہوں اور درد کے مارے میرا بھی آگرا پڑتا تھا اسوقت تم نے سر دباتے ہوے کہا تھا نعیمہ پیاری ایں کل ہی تمہارے لئے کوئی چھوکری لادون گا" آج کتنے کل ہو چکے ہیں، نعیمہ پیاری اب بھی روز چولھا ہو نکتی ہین اور چھوکری جو آنے والی تھی ہے، اب آئے یا جائے جہنم میں ایں صاف صاف کہے دیتی ہوں، سنبھئے یہ چولھا برتن نہین ہو سکتا،

کیوں نہیں ہو سکتا؟ تم کہاں کی نواب بیگم ہو، بڑی بڑی رئیس زادیاں کرتی ہین، وقت پڑتا ہے تو جو پہلی نہیں بیٹھ سکتی تھیں وہ وہاں کوٹتی ہیں" اتنی بات کہنے کی جرأت کسے تھی بیوی کے غصہ پر بھی پیار نہ آیا تو وہ محبت ہی کیا، عارف نے ہنسکر کہا:۔ بہت اچھا سرکار ناراض کیوں ہوتی ہو، تم سے نہین ہو سکتا تو میں خود ہی کر لیا کرون گا۔ چھوکری بھی جلد آجائے گی"۔

---

(۶)

جب پڑتی ہے تب حقیقت کھلتی ہے اس زمانے میں زر کے بغیر عشق بھی نہین کیا جا سکتا یہ سبق عارف کو بہت جلد مل گیا، وہ اچھے کاتب تھے، کام ملنا انھیں کیا دشوار تھا، یہ پریشانی خود ہی مول لے رکھی تھی، جب تک تقدیر کو کوستے رہے کچھ نہ ہوا اب اپنی حماقتوں کی خبر لی تو معقول آمدنی ہونے لگی۔

دو میاں بیوی مہینہ میں ساٹھ ستر روپے، کم نہیں ہوتے کوئی سگھڑ ہوتی تو سونے کی اینٹیں گڑھوا لیتی مگر نعیمہ بیگم کو سارا مہینہ جھینکتے ہی کٹا آج آٹا نہین ہے کل گھی ختم ہو گیا، پرسوں لکڑیاں نہیں رہیں، چولھے میں کیا ہاتھ پیر کاٹ کر جھونکے جائیں گے۔ دیکھو جی تم سے میرا خرچ نہیں اٹھ سکتا تو صاف کہدو، مین ابھی اپنے میکہ چلی جاؤں۔ یہ ترس ترس کر زندگی کاٹنا مجھے گوارہ نہین ہے،

جب نئی نئی محبت کا جوش تھا اسوقت نعیمہ کے احکام معشوقانہ ناز و انداز تھے، اسکی حرکتیں کیسی پیاری تھیں، اسکی باتیں کتنی رسیلی تھین، اب انہین باتوں پر عارف کو رنج ہوتا تھا، زیادہ صدمہ انھیں نعیمہ کی خود مختاری اور مجبوری کا تھا، میں اسکی نگاہوں میں کسقدر ذلیل ہوں، وہ میری باتوں کو کیسی حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیتی ہے۔ اسکے احکام میں میرے لئے کتنی بے عزتی ہے! انکے دلمین جب یہ خیالات آتے تو کلیجہ میں تیر سے لگتے تھے مگر وہ کیا کر سکتے تھے۔ آقا کو فرمانبردار بنانا، حکومت سے بغاوت کرنا، آسان کام نہین ہے، انہوں نے اپنے واضح اعمال سے نعیمہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا،

کہاں جاتے ہو۔ کیا کام ہے کب تک واپس آؤگے، جب تک نعیمہ کو ان سوالات کا اطمینان بخش جواب نہ مل جاتا اسوقت تک عارف کے لئے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی، میں کبھی نہ جانے دونگی، یہ فیصلہ جب اسکی عدالت سے صادر ہو جاتا تو پھر کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہوتا عارف کو اسکی خلاف ورزی کی مجال نہیں تھی، بیوی کے علم و اجازت بغیر اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی میں سے کچھ صرف کرنے کا انہین حق نہ تھا غرضیکہ وہ اپنے ہی گھر میں ایک غلام کی مانند محتاج تھے،

چولھا بجھا پڑا ہے، بیٹھے ہوے دیکھ رہے ہیں، میں دوپٹہ میں سل بٹہ رکھ رہی ہوں اتنا نہیں ہوتا ذرا اٹھکر دو پھونک مار دیں" وغیرہ ایں ہوکے جیسے (سل پر بٹہ مار کر) بھاڑ میں جائیں، ہم سے نہیں پستے، جیسے لائے ہو ویسے پیسو، جب کوئی خادمہ نہین تھی تب نعیمہ کا یہ رنگ تھا، اب کام کرنے کیلئے ایک لڑکی رکھ لی گئی تو یہ نقشہ بدلا،، انہیں دو قدم اٹھکر پانی پینا دشوار ہے، اب پائخانہ میں لوٹا بھی اسی سے رکھواتا، حکومت جتانے کا ایسا ہی شوق تھا

ہے تو ایک نوکر کیوں نہیں رکھ لیا جاتا؟ چل ری سلیمن تو مصالحہ پیس، ہانڈی کو دیر ہو رہی ہے، جب پیاس ہوگی آپ اٹھ کر پی لے گا۔

احباب کے یہاں جانے، یا اُن سے ملنے کی عارف کو اجازت نہ تھی، اور کبھی کوئی شامت کا مارا دوست ملنے کیلئے خود ان کے گھر آگیا، تو اسے بیٹھے ہوئے ابھی دو گھڑی نہیں گذریں کہ نعیمہ بیگم کا مزاج برہم ہوگیا۔ "گھر بار سے نکالے ہوئے نگوڑے نجانے کہاں سے آمرتے ہیں، اور پھر ایسے جم کر بیٹھتے ہیں کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے ہیں دیکھ تو سلیمن! یہ باہر کیا کر رہے ہیں، ذرا یہاں بلا تو لا"۔

نعیمہ کا میاں پر تو کوڑا تھا اور خود بالکل آزاد رہتی، جہاں چاہتی جاتی، جسے چاہتی بلاتی، بے غرض بے سود ڈولی منگا بیکہ میں حاضر کیہ بلا کسی سہیلی کے یہاں موجود، عارف کو دم مارنے کی مجال نہ تھی، اسکے سخت تیوروں سے ان کا دل ہل اٹھتا تھا، کہتا کون کہ نیک بخت تم سے کس خدا نے کہا ہے کہ جہاں جی چاہے چلی جاؤ، جو مزاج میں آئے کرتی رہو ایک صبح عارف بیٹھے کتابت کر رہے تھے، نعیمہ اپنے تازہ افسانہ نئی دلہن پر نظرثانی کر رہی تھی، اس افسانہ میں اس نے یہ دکھایا تھا کہ نئی دلہنوں پر رسم و رواج کے کیسے شدید مظالم توڑے جاتے ہیں، اور ایک ناواقف بھولی بھالی لڑکی کو ان سے کس طرح نجات مل سکتی ہے

جب وہ افسانہ پر نظرثانی کر چکی تو اسنے آواز دی: سلیمن!

لڑکی دوڑتی ہوئی سامنے آئی اور بولی: جی بیگم صاحب!

نعیمہ نے کہا، جاؤ اختر صاحب ہوں تو بلا لاؤ،

عارف چونک پڑے، جیسے کسی نے انکے تیر مارا ہو۔ ذرا تلخ لہجہ میں پوچھا؟ کون۔

اختر صاحب؟ وکیل صاحب کے لڑکے،

"ہاں"

"وہ سامنے والے مکان میں رہتے ہیں۔

"ہاں ہاں جی ... وہی،

"انہیں کیوں بلا رہی ہو، اُن سے تمہیں کیا کام ہے"؟

"اور تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ تمہارے پوچھنے کا مطلب کیا ہے"؟

عارف کا مطلب کیا تھا، وہ بیچارے مطلب کیا بتاتے، مگر انہیں بڑا غصہ تھا، غصہ کے ساتھ بیوی کی برہمی کا خوف بھی تھا، اسوقت انکی عجیب حالت تھی کچھ کہنا چاہتے تھے پھر زبان روک کر رہ جاتے تھے، آخر کار انہوں نے بڑی جرأت کرکے کہا: دیکھو جی عورت کو اپنی حد سے باہر نہیں ہونا چاہئے، میں تم سے کہتا ہوں کہ کوئی صاحب میرے گھر میں نہیں آسکتے،

نعیمہ کتنی تدبیروں سے عارف کو اپنے بس میں کیا تھا کیسی کوششوں سے گھر پر اسکی حکومت قایم ہوئی تھی، یہ بنا بنایا کھیل یکایک بگڑا جا رہا تھا، مدت کی محنت اکارت جا رہی تھی اسکی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا، وہ اس طرز عمل کی عادی کب تھی، اس لئے یہ لہجہ کہاں سنا تھا۔ اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی، چمک کر بولی کیا کہا، نہیں آسکتے کیوں نہیں آسکتے؟ کیا وہ کوئی بدمعاش ہیں، یا میں کوئی کسبی ہوں آئینگے اور ضرور آئیں گے، پہلے چاہے نہ بلاتی، مگر اب بلاؤنگی دیکھیں تو تم ان کا کیا بگاڑ لے

تجربہ کی بنا پر نعیمہ کو یقین تھا کہ اب عارف کی زبان کو کچھ بولنے کی جرأت نہیں ہو سکتی، ایسا ہی ہوا۔ عارف کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ درحقیقت وہ بیچارے اُس کا بگاڑ ہی کیا سکتے تھے، خاموش ہو گئے نعیمہ کو کتنی بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے شان فتحمندی کے ساتھ گردن کو دوسری طرف موڑا، سلیمن ابھی اسی جگہ کھڑی تھی، نعیمہ نے ڈانٹ کر کہا تو ابھی تک گئی نہیں، چڑیل کی بچی چلی جا، اُنھیں بلا لا، آج ہمیں ان کی زبان دیکھنا ہے۔ سلیمن گئی، اختر صاحب آئے، بیٹھے چلے بھی گئے، مگر عارف نے دم نہ مارا سر جھکائے لکھتے رہے، البتہ غصہ کے جوش میں کاپی کا ایک صفحہ پھٹ گیا دو قلم ٹوٹ گئے، دوپہر کا کھانا نہیں کھایا، اور شام تک چادر سے سر منہ لپیٹے رہے۔

(۸)

اختر ذات کے شریف تھے، عادتوں کے شریف نہ تھے، بچپن سے صحبت خراب پائی تھی تربیت بھی کچھ اچھی نہیں ہوئی تھی، تعلیم کی کوشش تو بہت کی گئی مگر یونہی سا پڑھ کر چھوڑ دیا۔ باپ تھے وکیل، آمدنی تھی اچھی، ٹھاٹ سے رہتے تھے، اور شاعری کرتے تھے کبھی کبھی افسانے بھی لکھ لیتے تھے، طبیعت تھی شاعرانہ، دل تھا حسن پرست اور نفس کے لئے کوئی لگام نہ تھی، بدنگاہی کا بُرا چسکا پڑ گیا، راستہ چلتے کوٹھوں پر نگاہیں اٹھی رہتیں، دروازوں سے آنکھ لگی رہتی، کوئی چہرہ مہرہ کی اچھی نک سک درست نظر آ گئی بس اب گھنٹوں اسی گلی کے صدقے ہو رہے ہیں۔ ایک روز یہ اپنے کمرہ میں شاعری کی دھن میں بیٹھے ہوئے قافیہ پیمائی کر رہے تھے، کسی بلند مضمون کی تلاش تھی، سامنے تھا عارف کا مکان۔ نعیمہ دروازہ پر آئی، کسی کام سے جھانکی اُن کی نگاہ لڑ گئی، اف مار ڈالا ظالم کیا حسن پایا ہے، مجسم شاعری مکمل شعر، پردہ سے باہر اس کا خوبصورت چہرہ جیسے بادل کے ٹکڑے سے چاند نکل آیا ہو۔

یہ بدنگاہی کے عادی مجرم، وہ حیا کی کی زندہ تصویر، دونوں نے ایک دوسرے کو خوب دیکھا اختر نے اشاروں ہی اشاروں میں بتایا تمہاری قاتل نگاہوں کا تیر میرے دل میں پیوست ہو کے رہ گیا ہے، یہاں اس سے انکار کب تھا، نعیمہ نے بھی ایک خاص ادا سے مسکرا کر جرم کا اقبال کر لیا، نگاہوں کا یہ تعارف بڑھتا گیا، اور تکلف کو کم کرتا گیا، یہاں تک کہ نعیمہ کے افسانے پر اختر صاحب کی اصلاح ہونے لگی حسن و عشق کے سامنے زانوئے ادب تہ کر دیا۔ اس طرح گناہ کے لئے راستہ کھل چکا تھا۔ تھوڑی سی رکاوٹ رہ گئی تھی، وہ اب پوری ہو گئی اختر صاحب گھر میں بھی بلائے گئے، اور عارف کی موجودگی میں نئی دلہن کے چند صفحوں پر اصلاح دے گئے۔

ایک دن عارف گھر میں نہیں تھے، نعیمہ اختر کو نئی دلہن کا آخری حصہ سنا رہی تھی، سنتے سنتے یکایک اختر صاحب اچھل پڑے واہ واہ کیا خوب لکھ رہی ہو، عبارت نہیں جادو ہے، الفاظ تیر کی طرح دل میں اترے جاتے ہیں، موتی پرو دئے ہیں واللہ موتی، جی چاہتا ہے، انگلیاں چوم لوں،

نعیمہ چونک پڑی، انگلیاں چوم لوں!! اس میں اس کے لئے کتنی کشش تھی، کسے معلوم تھا کہ پردہ ہی پردہ میں یہ دونوں کہاں پہونچ چکے ہیں۔ عورت کا حصہ شرم ہے، یہ اُٹھ جائے تو اس کی عصمت کا خدا ہی حافظ ہے۔

نعیمہ بولی:۔ یہ انگلیاں اس قابل نہیں'
اختر کا دل دھڑک اُٹھا، بجلی کی تیز روکی مانند امید پیدا ہوکر ان کے سینہ میں جگمگا اٹھی کہنے لگے یہ انگلیاں کیسی ہیں' آہ اسے میرے دل سے پوچھو جسے تم نے دیوانہ بنا رکھا ہے'...... بس زیادہ نہ تڑپاؤ" للہ رحم کرو۔ صبر کی اب تاب نہیں'
تاب کی ضرورت بھی نہ تھی، اختر نے پردہ کے اندر ہاتھ ڈالا یا' اور نعیمہ کا ہاتھ اپنی طرف کھینچ کر اس کی انگلیاں چوم لیں۔
ایں ایں یہ کیا، چھوڑئے مجھے یہ بات پسند نہیں'
نعیمہ کہنے کو تو یہ کہہ رہی تھی، مگر اس کے دل کی کیا کیفیت تھی اُسے کیسی لذت حاصل ہو رہی تھی' یہ عارف کا بوسہ نہیں تھا، ایک زن مرید شوہر ایک فرمانبردار مرد کے پیار میں عورت کے لئے لذت ہی کیا ہو سکتی ہے۔
نعیمہ کی اس نہیں میں ہاں سے زیادہ طاقت تھی۔ اختر نے کہا" آپ کو نہیں پسند ہے' مجھے تو پسند ہے" اور پھر اسی گناہ کا اعادہ کیا
نعیمہ نے آہستگی سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا:۔ پھر وہی' بس اب ہاتھ تو چھوڑ دیجئے' خدا کے لئے یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا" کیا ہوگا' اس پر غور کرنے کے لئے' ہوش کسے تھا، متوالے شرابی کو ایک اور بوتل پلا کر ہوش کی دوا پوچھی جا رہی تھی، سمندر میں ڈوبنے والے سے ڈوبنے کا انجام معلوم کیا جا رہا تھا، کیسا انجام، ماضی و مستقبل کا خیال ہو تو انجام سوچا جائے' یہاں تو سامنے صرف حال تھا اور حال بھی اختیار سے باہر' اختر پر ایک کیف بے خودی طاری تھا" جو کچھ ہو میری جان' اب انجام کی فکر کسے ہے"۔ یہ کہہ کر انھوں نے اضطراب کے ساتھ نعیمہ کو اپنی جانب پردہ سے باہر کھینچ لیا۔
" ایں ایں آپ کو میرے سر کی قسم' چھوڑئے' اے ہے' نہیں مانتے' یہ کیا غضب کر رہے ہیں' آپ دیکھئے تو سہی' سلیمن آتی ہوگی" یہ کہتی ہوئی نعیمہ اختر کی آغوش میں آرہی۔

(۹)

"میں نے کتنی بار کہا ہوگا کہ تم میرے معاملات میں دخل نہ دیا کرو' مگر نہیں باز آتے' تمیں تو جیسے کوئی بیماری ہو' کہاں گئی تھی' جہنم میں گئی تھی ایک تعلیم یافتہ بیوی کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کا مرد کو حق ہی کیا ہے' کہاں گئیں تھی اس توہین آمیز سوال پر نعیمہ کو کیسا طیش آگیا بیوی کے کڑے تیور دیکھ کر عارف گھبرا گئے' ڈیڑھ گھنٹہ کی مردانہ کد و کاوش سے تنبیہ کے لئے جتنے الفاظ تراشے تھے سب فراموش ہوگئے' دل میں غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی' اس پر پانی پڑ گیا۔ انھوں نے آنکھیں نیچی کریں' پھر بھی آخر مرد تھے۔ بہت جی کڑا کرکے بولے:۔ میں بات پوچھتا ہوں' تم کاٹنے دوڑتی ہو' لاحول ولاقوت' یہ بھی کوئی انسانیت ہے"
نعیمہ نے جھلا کر کہا:۔ لاحول بھیجو اپنی صورت پر' بڑی انسانیت لیکر آئے ہیں' کیا اس کو کہتے ہیں انسانیت کہ ابھی ڈولی سے اتر کر گھر میں اچھی طرح قدم بھی نہ رکھنے پائی تھی۔ موئے کہاروں کو کہاری بھی تو نہیں دی گئی اور مواخذہ ہونے لگا صاحب کہاں گئیں تھیں جہاں جی چاہا تھا، وہاں گئے تھے چلئے آپ ہمارا کیا کریں گے، تم آپ تو جہاں دل چاہے' جاؤ' دن دن بھر غائب رہو دوستوں کے ساتھ سیر

بازار کرو، اور میں جو ذرا دیر کے لئے کہیں جی بہلانے چلی جاتی ہوں، بس تمہیں زہر ہو جاتا ہے"

نعیمہ کا مزاج برہم ہو گیا تھا، یہ کوئی ادنیٰ بات نہیں تھی، عارف کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں اب کیسی مصیبت کے ساتھ دن کٹینگا کس طرح اس قیامت صغریٰ کو ٹالا جا سکتا ہے، وہ نرم لہجہ میں کہنے لگے:- اس میں زہر کی کونسی بات تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں، جانے کو کون مردود منع کرتا ہے، مگر آدمی کھانے پینے کی تو فکر رکھتا ہے، یہ وقت ہونے کو آیا، تمہیں بتاؤ اب کب کھانا تیار ہوگا اور کب کھایا جائیگا۔

نعیمہ نے تنک کر جواب دیا:- صاحب! بندی کوئی ماما تو ہے نہیں جو ٹھیک وقت پر سرکار کے سامنے دسترخوان لگا دے، دیر ہو رہی ہے تو میری بلا سے، انتظار کی ضرورت ہی کیا تھی، بازار سے کچھ لا کر کھا لیا ہوتا، اور اس وقت تو یوں بھی لانا پڑیگا، مارے درد کے سر ابھی جاتا پڑتا ہے۔

ایک دن کی بات ہو تو صبر کیا جائے، نعیمہ کا روز یہی رنگ تھا، عارف کی جان سخت عذاب میں تھی کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی، اور بڑی ہمت کر کے کہتے تو ایک کے بجائے چار سنتے اور اپنا سا منہ لیکر رہ جاتے، پچھتاتے تھے کہ شادی کر کے کس بلا میں گرفتار ہو گیا۔ تنہائی میں بیٹھتے تو پہروں سوچا کرتے، اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی تدبیر بھی ہے۔ طلاق دیدوں تو مہر کے دس ہزار سرخ دینار کہاں سے آئیں گے، کہیں منہ کالا کر جاؤں؟ غیرت کا یہ تقاضہ نہیں، زہر کھاؤں؟ خودکشی حرام ہے۔

ادھر انکی یہ حالت تھی، ادھر محبت کے پینگ بڑھ رہے تھے، اختر دوسرے تیسرے برابر آتے، دروازہ پر آواز دیتے، منشی جی!! نعیمہ بول اٹھتی، آئیے، یہ آجاتے، عارف گھر میں نہ ہوتے تو اظہار محبت کے لئے میدان بالکل صاف ہوتا اور موجود ہوتے تو کبھی "لُٹ ہے خدا کی مار اس گھر پر، جب کوئی آتا ہے تبھی پان ندارد، جیسے کوئی آن ہو" اور کبھی "اس گرمی سے خدا کی پناہ، آگ برس رہی ہے آگ، گھڑوں میں پانی جیسے ادہن ہو"

"منشی جی! ذرا چوراہے سے دو پیسے کا برف تو لے لو، مارے پیاس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں" کہکر میدان صاف کر لیا جاتا، اختر و نعیمہ کو کیسی آزادی حاصل تھی، لیکن ان کے دلوں اندرونی تڑپ کے لئے یہ آزادی بھی کیا تھی، وہ تو نفس کے کھیل کھیلنے کے لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر رہنا چاہتے تھے،

گھر خالی ہے، دولت کا ڈھیر سامنے ہے، پہرہ دار کا پتہ نہیں، دنیا اپنے کاموں میں مشغول ہے، پھر بھی چوروں کو دھڑکا لگا ہوا ہے ہوا کی سنسناہٹ، راہگیروں کی آواز پر اختر و نعیمہ باتیں کرتے کرتے چونک اٹھتے،

یہ خوف ان کی محبت کے ولولوں اور جوانی کی امنگوں میں کتنا حارج ہوتا تھا، انہیں اس خوف پر کیسا غصہ آتا تھا کوئی جاندار چیز ہوتی، تو زہر دیکر اس کا خاتمہ کر دیتے،

پھر بھی وہ کہاں تک اس روح فرسا اذیت کا مقابلہ کرتے رہتے، خوف اور رسوائی پر محبت کی لذتوں کو کب تک قربان کیا جا سکتا تھا آخر کار انہوں نے طے کر لیا کہ "رہیئے بس ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو" یہ تجویز ہی تجویز تھی، ایک تہیہ تھا مستقل، ایک ارادہ تھا مضبوط،

ایک روز موقع پاکر نعیمہ زیور کا صندوقچہ اور کپڑوں کا بکس لیکر اختر کے ساتھ چلدی،

بیوی کے حاکمانہ اقتدار نے عارف کی مردانہ حمیت کو کم کردیا تھا پھر بھی یہ حادثہ کم شرمناک تھا، یکایک ان کی دبی ہوئی غیرت ابھر آئی، وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے، ان کی بیوی ایک غیر مرد کے ساتھ بھاگ گئی، کیسی شرم و ذلت کی بات تھی اس شرم و ذلت کے سامنے رسی کا پھندا، چھری کی دہار، زہر کا پیالہ کیا حقیقت رکھتا ہے،

ان سب چیزوں کے مقابلہ میں عارف نے دریا کی موج کا سہارا لینا زیادہ مناسب سمجھا، وہ موت کے بعد بھی دنیا کو اپنی صورت نہیں دکھانا چاہتے تھے،

ہوا بھی یہی کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی کہ اس دنیا کے ہنگامہ میں جہاں بیشمار میاں بیوی لطف و مسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ایک زن مرید شوہر نے گنگا کی لہروں کے تھپیڑے کھا کھاکر دم توڑ دیا۔

اختر و نعیمہ نے جو گناہ کی عمارت کھڑی کی تھی، اس کی بنیادیں پانی پر تھیں، نفس کے دریا میں زندگی کی ناؤ پار نہیں لگائی جاسکتی ایک مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ اختر کے لئے نعیمہ میں کوئی دلکشی باقی نہ رہی، اس کی اداؤں کا ترکش خالی ہوگیا، لذت ہی کا خاتمہ نہیں ہوا تھا، زیور بھی ختم ہوگیا تھا۔

ایک دوست کے ساتھ گرمی کا ایک صفہ کشمیر میں بسر کرنے کا وعدہ بھی، جو انھوں نے اپنے باپ سے کیا تھا، پورا ہو لیا، اُن کی شادی کے دن بھی قریب آگئے تھے بھونرے کی طرح، جو ایک کلی کا رس چوسنے کے بعد دوسری کو آزار پہونچانے کا ارادہ کرتا ہے، انہیں نئی نویلی دلہن کا خیال بے چین کئے ہوئے تھا، وہ کس طرح اب نعیمہ کے ساتھ رہ سکتے تھے، بالآخر ایک دن ایسے غائب ہوئے کہ بدنصیب عورت کو پھر ان کی صورت تک دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ پردیس کی جگہ، بالکل تنہائی کسی سے جان نہ پہچان، ہاتھ میں پیسہ نہ کوڑی زیور پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔

لیکن ان مصیبتوں سے نجات پانا نعیمہ ایسی عورت کے لئے کیا مشکل تھا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ معصیت کی تکرار ہی نتیجہ معصیت کا علاج ہے۔

عابد لہوری

فلسفۂ مذہب

(گزشتہ سے پیوستہ)

مذاہب اور قومیت

دنیا میں عموماً دو قسم کے مذہب پائے جاتے ہیں ایک قومی اور دوسرے عمومی۔ قومی مذاہب ہنود، یہود، مجوس ہیں عمومی مذاہب بودھ، نصرانیت اور ایک حد تک اسلام ہیں۔ پہلے قسم کے مذہب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک قوم کے لئے مخصوص ہوتا ہے اور دوسری قوم میں اس کی اشاعت ممنوع و ناممکن ہوتی ہے اس کے برخلاف دوسرے قسم کے مذہب ہیں مگر اسلام کی صورت دونوں کے بین بین عجیب ہے۔ وہ اس لحاظ سے قومی مذہب ہے کہ قرآن کے ساتھ مذہب کا جزو وہ قومی شریعت بھی ہے جو بالخصوص عرب کے لئے قرآن اور زیادہ تر روایات سے تدوین کی گئی ہے کیونکہ جب کسی مذہب کے ساتھ شریعت جزو لازم ہو تو وہ قومی مذہب پایا جائیگا اور اس کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ قانون ایک خاص معاشرت کے قوم کے ساتھ مخصوص ہوگیا ہے۔ عمومی مذہب شریعت کا پابند نہیں ہو سکتا بشرطیکہ اس مذہب میں ہر قوم کو شریعت میں اختیار کا حق حاصل ہو۔ لیکن باوجود اس کے کہ اسلام ایک عربی شریعت کا پابند بنا دیا گیا ہے۔ اسلام کے پیرو مختلف جنس و قبائل کے لوگ ہیں اور اس کی اشاعت دوسری قوموں میں ممنوع نہیں۔ اور اسلام کے منجملہ تمام دوسرے حسنات و مآثرات کے جو اقوام عالم پر بیان کئے جاتے ہیں سب سے دلچسپ مبحث اس کے اس اثر کا ہے جو اس نے مختلف قوموں کو ایک رنگ اور ایک خیال میں ڈھالکر اس کو ایک مرکز و ایک شریعت سے وابستہ کر دیا ہے ہمارے لئے تو یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو ہم اسلام کے حسنات میں شمار کرتے رہے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے اسی "ایک فعل" نے مسلمانان عالم کی ایک عجیب صورت بنا کر ان کو قومی و دنیاوی ترقی سے خالی کر دیا ہے بلکہ اسلام کی تبلیغی ترقی میں اس درجہ حارج ہے کہ بلاشبہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم صاف لفظوں میں اس کی خرابیوں کا اعادہ کریں اگرچہ وہ اکثر اصحاب فہم کے لئے ایک چونکا دینے والا نظریہ ہوگا۔

سب سے پہلے ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کہ اسلامی اخوت دنیا کے لئے باعث امن ہے ضروری ہے اس میں شک نہیں کہ اسلام نے خود اپنی جداگانہ قومیت دنیا میں بنائی ہے جس کے صرف یہ معنی ہیں کہ قوموں کے شمار میں ایک عجیب معجون مرکب قوم کا اضافہ ہوگیا ہے جس کا تعلق دوسری غیر مسلم قوموں سے بالکل اسی طرح ہے جس طرح دوسری مخالف اور مختلف قوموں میں اس لئے جب تک وہ خیر القرون جس کی امید صرف ظہور امام مہدی کے وقت کیجا سکتی ہے یعنی جبکہ دنیا میں صرف ایک مذہب اسلام پھیل جائیگا اور تمام مذاہب مفقود یا اسلام میں جذب ہو جائیں گے ہم سے دور ہے۔ اس وقت اسلام کے وجود سے دنیا کے امن میں کسی اضافہ کی اُمید رکھنا عبث ہے۔ اسلام نے جو کچھ اب تک کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے خود اپنی ایک جداگانہ قومیت بنائی ہے جس کے اندر خواہ کتنی ہی اخوت کیوں نہ پائی جائے غیر مذاہب (خواہ ان کے افراد اسلام کی بوقلموں قومیت کے اندر ایک ممتاز ہستی کیوں نہ رکھتے ہوں) کے ساتھ اس کے تعلقات میں وہ ساری خرابیاں

موجود ہیں جو دو قوموں میں اکثر پائی جاتی ہیں۔ بس بالفعل اسلام نے بجائے اس کے کہ قومیت کی لعنت کو کم کرے ایک اور قوم کا اضافہ کرکے اُن کو بڑھا دیا ہے نہ صرف یہ بلکہ وہ افتراق جو ایک قوم میں پہلے سے نہ تھا اور نہ ہونا چاہئے اس قوم میں اسلام پھیلنے پر پیدا ہوگیا یعنی وہ ایک قوم جلد دو قوم میں تقسیم ہو جاتی ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ وہی معاشرت رکھتے ہیں جو دو متضاد قوموں میں ہوتی ہے مثال کے لئے ہندوستان کے اندر اس تفرقے کو دیکھ لیجئے۔ راجپوت و جاٹ شمالی ہندوستان کی دو ممتاز قومیں ہیں، جو اپنی قومیت پر جتنا مفتخر ہوں بجا ہے۔ اسلام نے راجپوت و جاٹ کے دو ٹکڑے کر دئے ہیں، مسلمان راجپوت و ہندو راجپوت جن میں سے ایک کا مرکز ہندوستان رہا اور دوسرے کا عرب و عجم ہو گیا۔ کیا مسلمان راجپوت اور ہندو راجپوت میں ویسی ہی قومیت نہیں ہے جیسی انگریزوں، فرانسیسوں یا جرمنوں میں ہے مسلمان راجپوت بجائے اس کے کہ اپنی قومیت پر فخر کرتا وہ اپنے کو ——— ایک نئی مسلمان قوم میں شمار کرنے لگتا ہے وہ بالکل اپنی قوم سے بیگانہ ہو کر اپنے نسب۔ اپنے وطن، اپنے لباس ——— اپنی قومی روایات و مراسم سکو (معلوم نہیں کیوں) عرب و عجم سے ملانے کا شائق پایا جاتا ہے شاید یہ خاصہ ہندوستان کی ذہنیت کا ہے کہ قوم ہند ایک مدت سے ذلت کی زندگی بسر کر رہی ہے اسیطرح اگر ہم دوسرے ممالک کے مسلمانوں پر نظر ڈالیں تو غالباً البانیہ کے مسلمانوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے باوجود اپنی قومیت و خصوصیت کیساتھ مسلمان ہیں یہ کلیہ تمام دنیا کے مسلمانوں پر صادق آتا ہے۔ روس و پولینڈ میں جب کبھی روس یا پولش مسلمان ہو جاتا ہے تو اس کا شمار تاتاری جماعت میں ہونے لگتا ہے اس کا سر منڈ جاتا ہے اور کلاہ تاتاری زیب سر ہو جاتی ہے۔ اسلامی ممالک میں عیسائی جب تک عیسائی رہتا ہے وہ اپنی پرانی تاریخی قومیت ارمنی۔ کلدانی سریانی قبطی کے نام سے مفتخر رہتا ہے مگر جہاں اس نے اسلام کا کلمہ پڑھا وہ ترک یا عرب بن جاتا ہے حتیٰ کہ افریقہ کے وحشی سماترہ و جاوا کے ملائی اور چین و منغولیا کے مغل بھی اسلام کے بعد اپنے ابنائے وطن سے جدا گانہ ایک قومیت کی بنیاد ڈالتے ہیں سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی ساری قومی خصوصیت کو بدل کر عرب و عجم کی خصوصیت اختیار کر لیں یا تو وہ غلطی سے اسلام کو عرب کا مرادف سمجھتے ہیں جس طرح زمانہ وسطے کے اہل یورپ تمام مسلمانوں کو مور یا سراسن کی قوم جانتے تھے اور ایسا کرنا شرط اسلام جانتے ہیں یا اسلام لاکر ان کو اپنی قوم سے ایسی نفرت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی قوم کی کوئی بات اختیار کرنا اپنے لئے باعث عار جانتے ہیں یہ یہی آخری صورت ہے جس کی ذمہ داری اگر اسلام کو دیجائے تو اسلام کے متعلق یہ کہنا پڑے گا کہ اس نے دنیا میں بجائے نیکی کے ایک لازمی برائی کا بیج بویا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس عالمگیر مذہب کو جو قرآن بتاتا ہے ان خرافات سے کوئی تعلق نہیں البتہ اگر اسلام کے لئے بجائے قرآن کے فقہ و حدیث کی سند ہو تو ہم کو اسلام کی بالکل ایک نئی صورت ملتی ہے جو مسلمانوں کے لئے عربوں کی خصائل و عادات کا اظہار کرنا ہمارے لئے شرط اسلام جانتا ہے یا دوسرے معنے میں مذہب کو قومیت اور اعتقاد کا ایک طرفہ معجون بنا دیتا ہے اور اس صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو قدیم مذہب یہود سے ترجیح دیکر اختیار کریں

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کی اصل صورت کیا ہے۔ اگر اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جیسا کہ ہم سب بجا طور سے خیال کرتے ہیں اور اس کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے تو کیوں ہم عربی قومی خصائص کے لئے مثلاً ختنہ، عقیقہ، طواف کعبہ، سعی صفا و مروہ

امتناع لحم خنزیر احکام وراثت نکاح وطلاق وازدواج بیع وشرا بلکہ ایک خاص طریقہ عبادت کے لئے (جو بالتحقیق عربی زبان میں ہو) مجبور کئے جاتے ہیں اور بغیر اُن کے ہم مسلمان نہیں سمجھے جاتے ظاہر ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں کا بلحاظ آب وہوا۔مزاج۔زبان۔عادات معاشرت وتمدن وغیرہ اختلاف رکھنا ایک فطری خاصہ ہے۔کوئی شخص انگلستان کے مروجہ قانون کو بلا لحاظ ہندوستان کے طبائع کے رائج کرنے کا خیال نہ کریگا بلکہ وہ اس کے مطابق ایک نیا قانون بنائے گا جیسا کہ ہم واقعتاً دیکھتے ہیں۔پس اگر اسلام عربی قوم کے لئے مخصوص تھا تو اس کا دوسری قوم میں پھیلانا بے معنی ہے۔اور اگر پھیلایا جائے تو اس کی اول شرط یہ ہونی چاہئے کہ ایسی قوم کو پہلے عربیت میں ڈھالنا چاہئے اور اس کے بعد اُن کو مسلمان کرنا چاہئے۔حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے پر کبھی غور نہیں ہوا اور عربوں نے اپنی فتوحات کے ساتھ اپنی تمام قومی خصوصیات کو اسلام کے ساتھ ایسا گڈمڈ کرکے پیش کیا ہے کہ ہم اب تک دونوں کو ایک سمجھتے رہے اور اسیکو مدنظر رکھ کر، فقہ وقیاس سے کام لیا نتیجہ یہ ہوا کہ جو قومیں فطرتاً عرب کے عادات اختیار کرنے کے قابل نہ تھیں خصوصاً جو سرد ملکوں مثلاً یورپ کی رہنے والی تھیں ان کو اسلام لانے میں ہمیشہ تکلف ہوا اور اسلام صرف اُن ممالک میں پھیل کر رہگیا جہاں تک عربوں کی تلوار وسلطنت وسیع ہوئی ——————

یا ان گرم ممالک میں جہاں ان کو سیاحت وتجارت لیگئی اور آب وہوا کے لحاظ سے اور زیادہ تر عربوں کے مقابلہ ادنےٰ تمدن کے سبب سے وہ عربوں کی عادات وخصوصیات اختیار کرنے کے لئے زیادہ مستعد پائے گئے۔اور اسلام ایک حد کے اندر پھیل کر ٹھہر گیا۔پس یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عربوں نے خودغرضی سے اسلام کو اپنا مرکب بنایا اور خود راکب بنے۔درانحالیکہ ان کو یہ امانت اس لئے ودیعت کی گئی تھی کہ وہ مرکب بنیں اور اسلام راکب ہو —— چنانچہ اہل شام ومصر وبربر کو مجبوراً اپنا تمدن بدلکر مستعرب قوم بننا پڑا۔اور اہل عجم نے —— اپنا قومی شعار وزبان عربوں کے لئے نہ بدلی انھوں نے شریعت کے قیود سے باہر ہوکر صوفیت کی بناڈالی۔اسلام کو اس خطرناک غلطی کا اسوقت تک پتہ نہ چلا جب تک عرب پر حکومت کا خمار تھا مگر جب یہ خمار ٹوٹا تو اس کیسّاتھ اسلام کا رشتہ ترقی بھی تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ کر زمین پر گر پڑا۔اور اب یہ حالت ہے کہ اگرچہ اسلام متعدد قوموں میں پھیلا ہوا ہے اور وہ سب ملکر ایک قوم "اسلام" کے ماتحت ہیں مگر سب حالت انحطاط میں پڑے ہوئے زندگی بسر کر رہے ہیں۔انھوں نے اسلام کا ایک قومی لباس مقرر کر چھوڑا ہے ——————

—— خود ہمارے ملک کو دیکھو مسلمانان ہند کو اپنی قوم ہند کی ترقی سے کوئی سروکار نہیں۔وہ بحیثیت مجموعی ایک جداگانہ قوم ہیں، جن کی زبان جُدا، معاشرت جدا، تمدن جدا، روایات جدا، وہ اپنے ملکی لٹریچر سے نابلد۔ہندوستان کی ہی ترقی سے متنفر اپنے ملکی آبا واجداد کی اولاد ہونے سے عار۔اپنے سرزمین کے آثار عظیم سے بے خبر ومعرا۔ان کو اگر بے دیگر کچھ یاد ہے تو ہارون رشید وتیمور کی داستان یاد ہے۔اگر اُن کو کسی کے انتساب سے فخر ہے تو وہ عرب وعجم ہے۔

پس مذہب اور قومیت کی بحث میں ہم اسلام کی یہ مثال دیکر سوال کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہم مذہب کے لئے کس قدر مکلف ہوسکتے ہیں۔

دنیا کا مذہب جیسا ہم پہلے لکھ آئے ہیں خود رو رہا جبکہ اس کی خاص خصوصیتیں حجر و اشجار - ارواح خبیثہ - سانپ و عناصر عالم کی بندگی و قربانی ساحریت و کہانت تھیں بذریعہ ارتقاء یا بذریعہ علم لدنی انسان کو توحید و معاد کی طرف توجہ کرنی پڑی —— یہاں تک تو مذہب ہے - مگر اکثر انبیا جب اپنی قوم میں مبعوث ہوئے تو ایک طرف وہ حامل اسلام تھے اور دوسری طرف وہ خود اپنی قوم کے مقنن و مصلح تھے - ایک حیثیت انکی روحانی ہوئی — اور ایک مادی اور دنیاوی تاریخ نے ہمارے دو پیغمبروں کے نام پیش کئے ہیں - جو مقنن و صاحب شریعت و امر کے ساتھ معلم دینی بھی تھے یعنی جناب موسیٰ علیہ السلام و جناب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم ممکن ہے کہ جناب بودہ و زر دشت و مسیح کو بھی یہی درجہ عطا ہوا ہو مگر اول دو کے بارے میں مجہول ہے اور تیسرے کے بارے میں منکر ہے - جناب موسیٰ علیہ السلام نے مذہب کے ساتھ اپنی قوم کو متمدن بنانے کے لئے بہت سے مشاغل دنیاوی بھی الہامی ذریعے سے بتائے اور چونکہ ان کے زمانے کی ہر قوم میں پیغمبر مبعوث ہوا کرتے تھے اس واسطے نہ تو ان کا مذہب قانون و شریعت سے علیحدہ کیا گیا اور نہ ان کے بنائے ہوئے مذہب کی اشاعت سوائے بنی اسرائیل کے دوسری قوم میں کی گئی اور نہ اس کی ضرورت سمجھی گئی - بدہ او مسیح کو دنیاوی شریعت سے کوئی تعلق نہ تھا وہ خود کسی شریعت کے موجد نہ تھے بلکہ غالباً ایک ہندو شریعت اور دوسرا یقیناً یہودی شریعت کا پابند رہا - گویا یہ دونوں اصحاب ہنود و یہود مذہب سے ہی تعلق رکھتے تھے جو ہمارے صوفیائے کبار کا تھا - مگر ہمارے پیغمبر کیساتھ جو خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ حضرت موسیٰ کی طرح ایک طرف حامل اسلام تھے تو دوسری طرف وہ عرب قوم کے صاحب شریعت و امر بھی تھے - لیکن جس مذہب اسلام کے وہ حامل تھے اس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ تمام عالم کے لئے ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہیگا - یعنی ایک طرف وہ تمام عالم کے لئے مبعوث نبی تھے اور دوسری طرف ایک قوم کے دنیاوی سردار تھے - ہم جانتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان کے دونوں کاموں میں روح القدس کی مدد بلاشبہ اُن کو ہوئی اور جو قرآن ان کو دیا گیا ہے اس کا ایک حصہ اگر مذہب اسلام کے عالمگیر معرفت اعتقاد سے مخصوص تھا تو دوسرا حصہ ملت عرب کے احیاء دنیاوی کے لئے مگر ہم نے کبھی اسپر غور نہ کیا کہ ایک کا مخاطب تمام عالم ہے اور دوسرے کا صرف اس زمانے کے عرب - یعنی اس کا ایک حصہ ازلی و انتہائی پہلو لئے ہوئے تھا جس میں عبادت حق - خدمت حق تزکیہ نفس اعتقاد توحید و معاد پر مشتمل تھا اور دوسرا حصہ زمانی و مکانی یعنی وقتی و عرب کے لئے مخصوص تھا جس میں طہارت جسم و لباس معاشرت کے بعض اصول مثلاً اذن لیکر دوسرے کے گھروں یا خلوت میں جانا عورتوں کو بے حیائی کے ساتھ مردوں کے سامنے آنے کی ممانعت —— وراثت ازدواج و طلاق - یا تعزیرات مثلاً قطع ید سارق، وغیرہ کو —— بہ نظر اس کے کہ عربوں سے بہت جلد تبلیغ اسلام کا کام لینا تھا اور اس کے لئے دنیا کے ایک بڑے خطے پر حکمراں کرنا تھا محض بطور احسان مزید کے بتا دیا ورنہ الہام درحقیقت ان معاملات کے تعلیم کیلئے مکلف نہیں کیونکہ فطرت انسانی نے خود دنیاوی ترقی کے مدارج پر پہونچنے کے لئے کافی عقل و تمیز انسان کو عطا کی ہے - عربوں نے اصول معاشرت و سیاست اور وہ اصول سیکھ لئے جو انکی ہمسایہ قومیں عرب کے ترقی کے بعد سیکھ رہی تھیں اور ابھی تک اس میں کامل نہیں ہوئی تھیں - اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ واقعی وہ پچاس برس کی مدت میں تمدن قوموں کی زمرے میں کھڑے ہوگئے - دنیا کے فاتح ہوے اور اپنے ساتھ اسلام کی پیام

چنگاری

(مسلسل)

(۸)

یوسف، وارجلنگ ہوٹل کے کھانے کے کمرہ میں، جہاں ہر چیز اپنی نفاست و پاکیزگی کے لحاظ سے بڑی معلوم ہوتی تھی بیٹھا ہوا تھا اور یہ دیکھکر کہ یہاں جو بھی ہے انتہائی نشاط کے عالم میں" جوہر معنیٰ" سے لبریز شفاف گلاسوں سے مشغول نظر آتا ہے، دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ سب کے سب احمق ہیں؟ کیا سارا مغرب جو اپنے دماغی نشو و نما کے لحاظ سے آج بجا طور پر مشرق کو صدائے لن ترانی سنا سکتا ہے، بیوقوف ہے؟ اگر یہ حماقت اس قدر زیرک انسان پیدا کر سکتی ہے، اگر یہ بیہوشی ایسے ذہوش دماغوں کو مجبوب ہے۔ تو مجھے یا کسی کو بھی عقلمند باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے ——— اس تمام مجمع میں صرف یوسف ہی ایک ایسا شخص تھا جو تنہا پایا جاتا تھا، ورنہ ہر مرد کے پہلو میں کوئی نہ کوئی حوا کی بیٹی اس مختصر سی جنت میں ضرور شریک نشاط تھی۔ وہ اپنی تنہائی کا خیال کر کے کبھی ایسا محسوس کرتا کہ شاید اُسے سب لوگ حقیر و ذلیل خیال کر رہے ہیں اور اس خیال سے اس کے چہرہ پر پسینہ آجاتا —— وہ سمجھنے لگا تھا کہ مرد کا تنہا وجود اس کے لئے ایک لعنت ہے اور مدعائے حیات بغیر اُس کے دوسرے نصف حصّہ کے ملے ہوئے پورا نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ دوسرا گمشدہ "نصف حصّہ" کہاں ملے؟ اس خیال نے پھر مس ہلن کی تصویر اس کے سامنے پیش کر دی اور اپنی ناکامی اور اس کی بیوفائی (جسکو وہ ہنوز شرارت ہی سے تعبیر کرتا تھا) کے خیال سے پھر دلگرفتہ سا ہو گیا اور مس ہلن کے اس فقرہ پر غور کرنے لگا کہ "جس تیتری پر آپ قابو حاصل کرنا چاہتے ہیں اسپر دسترس حاصل کرنے کے لئے پہلے سر دینا ضروری ہے"

کیا "سر دینے" سے واقعی جان دینا مراد ہے؟ نہیں یہ تو صرف شاعری ہے، پھر کیا اس سے یہ مقصود ہے کہ حواس کھو دوں، دیوانہ ہو جاؤں۔ نہیں یہ بھی لغو بات ہے، پاگل کو کون پوچھتا ہے۔ تو کیا یہ مدعا ہے کہ میں انتظار کی غیر معمولی تکلیف برداشت کروں، لیکن یہ کیوں؟ کیا میں یوں اُن کی عزت کرنے کے لئے طیار نہیں؟ ممکن ہے یہ صرف ان کی شوخی ہو، یا پھر یہ دیکھنا مقصود ہو کہ میں کس حد تک اپنے شوق کی رعایت سے اُن کی جستجو کر سکتا ہوں ——— سوچ ہی رہا تھا کہ ہوٹل کا خادم آیا اور اس وثوق کی بنا پر کہ اس حمام میں کون ہے جو عریاں نہیں، اس کے سامنے بھی ایک شفاف گلاس شراب کا رکھ کر چلدیا۔ یوسف کو توجہ اُس وقت ہوئی جب وہ کمرہ کے دوسرے بعید گوشہ میں پہونچ چکا تھا، آواز دینے کی ہمت نہ ہوئی اور چونکہ اب بعض اور لوگوں کی نگاہیں اسپر پڑ رہی تھیں اس لئے یہ بھی مناسب نہ معلوم ہوا کہ واپس کر کے یا دور ہٹا کر اپنی وحشت کا ثبوت دے، یہ خاموش ہو گیا اور اپنے چہرہ پر ایک ایسی کیفیت پیدا کر لی، جس سے یہ ثابت نہ ہو کہ وہ اس تہذیب معاشرت سے ناواقف ہے اور اُس نے کبھی شراب نہیں پی۔ لوگوں کے دکھانے کے لئے گلاس کو اور قریب کر لیا اور سوچنے لگا کہ اب احتراز اس سے کیونکر ممکن ہے، خادم کو بلا کر واپس کر نہیں سکتا کہ اس کا وقت

گزر چکا تھا، فرش پر پھینک نہیں سکتا تھا کہ اس کا کوئی موقع نہ تھا، چھوڑ کر جا نہیں سکتا تھا کہ یہ تہذیب کے خلاف تھا، وہ دیر تک چھوٹے چھوٹے سنہرے بلبلوں کو جو سوڈا کی تیزی کی وجہ سے پیدا ہو کر گلاس کی تہ سے شراب کی سطح تک آ آ کر مٹ رہے تھے دیکھا کیا اور غور کرتا رہا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ چونکہ اس سے قبل کبھی اس نے پی نہ تھی اور وہ ایک قسم کا خوف جو شراب نہ پینے والے کے دل میں پینے سے قبل جاگزیں رہتا ہے، اس کے دل میں بھی موجود تھا اور ناواقف لوگوں کی طرح شراب کو وہ بھی بدحواسی ہی کا مترادف سمجھتا تھا اس لئے ہمت کرتا تھا اور رہ جاتا تھا، گلاس کی طرف ہاتھ بڑھتا تھا اور رُک جاتا تھا اُس نے نگاہ اُٹھا کر چاروں طرف دیکھا تو سب کو اپنے حواس میں پایا، اچھی طرح اطمینان سے باہم گفتگو کرتے دیکھا۔۔۔ اسی وقت نیچے سڑک پر ایک شخص یہ شعر الاپتا ہوا گزرا:۔

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اس شعر نے فوراً اس کا خیال اپنی طرف متوجہ کیا اور ایک ہلکا سا تبسم اس کے چہرہ پر دوڑ گیا۔ وہ سوچنے لگا، کیا واقعی شراب ایسی چیز ہے کہ شاعر اپنے آخری لمحاتِ حیات میں بھی اسی کی خواہش کرتا ہے۔ اب اس کے سامنے ایک ایک کرکے تمام اکابر شعراء کا خیال آنے لگا اور بہت سے وہ اشعار یاد آنے لگے جن پر اس نے پہلے کبھی غور بھی نہ کیا تھا۔ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ حافظ کو کس چیز نے یہ کہنے پر مجبور کیا کہ

مے نوش کہ عمرِ جاودانی این ست

اور یہ کہ کیا واقعی حافظ کا یہ فلسفہ بالکل صحیح ہے کہ

خوش باش دمے کہ زندگانی این ست

اس کے بعد خیام کے خمریات نے اس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا، اور اس کے اس پر زور اعتراف پر مسکرانے لگا:۔

من مے خورم و ہر کہ چو من اہل بود
مے خوردنِ من بنزد او سہل بود

ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا، بادل گھر آئے، ترشح ہونے لگا، بجلی چمکنے لگی، ہال کے تمام برقی قمقمے جگمگا اُٹھے، ہر چیز روشن و منور ہوگئی اور اس نے حافظ کی اس رباعی سے فتویٰ حاصل کرکے

آں بہ کہ ز جام بادہ دل شاد کنیم | وز آزرِ گزشتہ کم یاد کنیم
ویں عاریتے روانِ زندانی ما | یک لحظہ ز بندِ عقل آزاد کنیم

آخرکار گلاس کو اٹھایا اور ڈرتے جھجکتے اس کو لبوں تک پہونچا ہی دیا۔ تلخی اور بُو سے جو جھرجھری سی جسم پر پیدا ہوتی ہے، اُس کو ضبط کیا اور ہمت کرکے ایک ہی منٹ کے اندر اس نے دو دفعہ کرکے سارے گلاس کو ختم کر دیا تاکہ اس منزل سے جس قدر جلد ممکن ہو گزر جائے۔

سب سے پہلے جو اثر اُس نے محسوس کیا وہ کان کی گرمی تھی اور اس کے ساتھ ہلکی سی حرارت دماغ میں، وہ دل ہی دل میں ہنسا کہ

میں تو شراب پینا بڑی بات سمجھتا تھا، لیکن یہ تو بہت آسان نکلا، تھوڑی دیر بعد اُس نے محسوس کیا کہ ہوا کی برودت اور موسم کی خنکی کچھ زائل سی ہونے لگی ہے اور اس کی آنکھوں میں کبھی کبھی ایک چنگاری سی پیدا ہو جاتی ہے اب اس کے بدن میں بھی سنسناہٹ پیدا ہونے لگی اور اس کا جی چاہنے لگا کہ جسم کو ذرا ڈھیلا چھوڑ کر کرسی کی پشت سے پیٹھ لگا دے۔ وہ ہلکی سی بے اختیاری کے ساتھ سیدھا ہو کر پیچھے جھکا اور کرسی سے پیٹھ لگا دی، اب وہ اپنی نگاہ میں، اپنے دماغ میں اپنے احساس میں ایک قسم کا استغنا محسوس کر رہا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ ہال کا وہی ہجوم جس پر وہ اس سے قبل کچھ ڈری ہوئی، سہمی ہوئی نگاہ ڈالتا تھا، اس وقت بے معنی سی چیز نظر آتا تھا اور وہ ایسا محسوس کرنے لگا تھا کہ دنیا میں اس کا وجود بھی کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی کیفیت بڑھتی جاتی تھی اور اس کی حرکت و جنبش میں سرعت سی پیدا ہوتی جاتی ہے، اُس نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا لیکن خاص تیزی کے ساتھ، دیا سلائی روشن کی مگر ایک جھٹکے کے ساتھ، دیا سلائی کو سامنے کی طشتری میں ڈالا لیکن اس طرح جیسے دور سے کسی چیز کو پھینک دیا جاتا ہے اور پھر کرسی سے پیٹھ لگانے کے لئے جھکا مگر زیادہ ڈھیلے پن کے ساتھ۔ اس کے حواس درست تھے، اس کا دماغ معطل نہ تھا، وہ پوری طرح اپنی حالت کا تجزیہ و تنقید کر سکتا تھا اور کیفیت کے ہر تغیر میں وہ امتیاز پیدا کر سکتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ یہ حالت اب قائم سی ہو گئی ہے اور اُس نے اس خیال سے کچھ بے لطفی سی محسوس کی، کیونکہ ابھی تک اس نے اپنے اندر کوئی ایسی خاص بات نہ پائی تھی، جو جواز یادہ خواری کو ضروری قرار دیتی اس لئے وہ سمجھا کہ اس کیفیت کو اور بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس نے خادم کو آواز دی اور ایک گلاس اور طلب کیا۔ وہ لایا اور یہ بلا تامل اسی کے سامنے نصف حصہ ختم کر گیا، اس نے دیکھا، ان کی اس بے قاعدگی پر ایک متبسم نگاہ ڈالی اور پھر جب یوسف کی نظر اوپر اٹھی تو اُس نے نہایت ادب کے ساتھ سر جھکا کر کہا کہ "حضور بہت تھوڑی تھوڑی ایک ایک گھونٹ کرکے کم از کم آدھ گھنٹہ میں اس گلاس کو ختم کریں تو بہتر ہے"! یوسف نے سنا اور باوجود اس کے کہ شراب کو گھونٹ گھونٹ کرکے پینے کے متعلق اس کو کتابی علم بھی حاصل تھا، اس نے کہا کہ "نہیں" اور جس طرح کوئی بچہ ضد کر بیٹھے، باقی نصف حصہ بھی ختم کرکے گلاس کو ناز ور سے میز پر رکھ کر حکم دیا کہ "اور لاؤ"۔ خادم سر جھکا کر واپس گیا اور پھر اپنی حالت و کیفیت کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ وہ جو نشہ میں ایک قیام کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس میں تغیر پیدا ہونے لگا اور زیادہ تیزی کے ساتھ یہاں تک کہ چند منٹ کے اندر اب وہ اپنے آپ کو کسی اور ہی عالم میں پاتا تھا۔ قمقموں کی روشنی اسے تھرتھراتی ہوئی نظر آتی تھی، ہال کا فرنیچر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید مائل پرواز ہے، اور وہاں کے آدمی ایسے نظر آتے تھے جیسے کہیں بہت دور بیٹھے ہیں اور ان کی آوازیں نہایت ہلکی ہو کر اس کے کانوں تک پہونچ رہی ہیں۔ اب اس کے اندر نشاط تھا اور نشاط کامل، نہ مس ہلن کا وجود اب اس کے سامنے کوئی اہمیت رکھتا تھا اور نہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کل اُسے کیا کرنا ہے۔ ایک بیخودی تھی غم ربا، ایک وارفتگی تھی روح افزا، ایک جسارت تھی لطف انگیز، ایک ولولہ تھا مسرت خیز۔ اس وقت ایک ایک چیز اس کو مسکرا مسکرا کر ہنس ہنس کر دعوت قہقہہ دیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور "چشم وا کردم زمین تا آسمان آغوش داشت"

اب وہ اپنے آپ کو ایسا محسوس کرتا تھا کہ شاید کائنات اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے اور بار بار حافظ کے "ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم" کی اہمیت اس کے سامنے آ جاتی تھی۔ جوشِ مسرت میں اس کا جی چاہتا تھا کہ زور سے باتیں کرے، بلند

آواز سے گائے، اُٹھکر رقص کرے، تالیاں بجائے اور کسی نہ کسی طرح اس ہنگامہ کو دنیا کے سامنے پیش کردے جو اس کے دل کے طوفان کی طرح لہریں لے رہا ہے۔ لیکن اسی وقت پھر کوئی شخص سڑک سے یہ شعر گاتا ہوا گزرا:-

میں اور شغلِ بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

اس سے قبل بارہا وہ اس شعر کو سن چکا تھا لیکن اتنا لطف کبھی نہ آیا تھا۔ اب اول مرتبہ اس کو کم نگاہی اور بزمِ شراب کا صحیح مفہوم معلوم ہوا وہ خود بھی بے اختیار ہوکر زرا بلند آواز سے اس شعر کو گنگنانے لگا اور بغیر اس خیال کے کہ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا خود ہی اس کی داد دینے لگا اور آپ ہی جھومنے لگا۔

اَب اس کے لئے ایک جگہ بیٹھنا دشوار تھا، ایک خاص قسم کی بےچینی اور بیتابی اپنے اندر پا رہا تھا، وہ اُٹھا لیکن ہلکی سی لغزش قدم کے ساتھ، اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور آہستہ آہستہ چلکر برآمدہ میں پہونچا جہاں بالکل تنہائی تھی وہ زیادہ اپنے آپکو نہ سنبھال سکا اور ایک آرام کرسی پر گر کر انگلیاں اپنی ران پر اس طرح جلدی جلدی چلانے لگا جیسے کوئی پیانو بجا رہا ہے اسی سرمستی کے عالم میں اس کی نگاہ زہرہ کے اس مرمری مجسمہ پر پڑی جو برآمدہ کے ایک گوشہ میں قائم تھا مجسمہ کے سر پر بجلی کا قمقمہ روشن تھا اور اسکے چاروں طرف شاداب کھجوروں کے گملوں کا جھنڈ نہایت دلکش کنج کا منظر پیش کر رہا تھا وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا اور اسکی جھکی ہوئی نگاہوں کو اپنے لئے پنہاں نویدِ محبت سمجھ رہا تھا، مجسمہ کے اعضا کا تناسب، سینے کا ابھار، کمر کی نزاکت چہرہ کی دلکشی آنکھوں کی پُرجیا سحر آفرینی، جابجا اس کے جسم میں ناگن کا سا بل اور ہر بل کے ساتھ نرم نرم سی شکنیں۔ ایک ایسا منظر تھا کہ یوسف زیادہ تاب نہ لا سکا اور اُٹھکر وہاں پہونچا اور تھوڑی دیر تک آہستہ آہستہ ہات سے مس کرنے کے بعد بے اختیارانہ اپنے لبوں کو اس کے لبوں سے ملا دیا۔ اس وقت وہ بیتاب تھا کہ اس کو اپنی آغوش میں کھینچ لے اس کو اپنے فشار سے چور چور کردے نہ سمجھ رہا تھا کہ دنیا اس وقت سنسان ہے۔ کائنات غیر آباد ہے اور تنہا وہی ایک آدم اس جنتِ ارضی کا مالک ہے۔ لیکن پشت کی طرف سے کسی نے آکر اس کے اس لذیذ خواب کے سلسلہ کو ختم کر دیا ہوٹل کے خادم نے طشتری پیش کی جس پر ایک ملاقاتی کارڈ رکھا ہوا تھا۔

یوسف ــــ "میں نہیں جانتا کہ مس گارڈن کون ہے کیوں مجھ سے ملنا چاہتی ہے"۔ خادم، تھوڑے سے تامل کے بعد بولا کہ "مجھے نہیں معلوم کون ہیں، لیکن وہ کہتی تھیں کہ کسی ضروری کام سے آئی ہیں"

مس گارڈن ایک بازاری قسم کی اینگلو انڈین عورت تھی، جو ہوٹلوں کے خادموں سے ملکر اور ان کو انعام و اکرام کی لالچ دلاکر نئے آنے والوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرتی تھی اور بیوقوف بناکر خوب لوٹتی تھی۔ چونکہ عورت بہت صورتدار تھی اور تہذیب جدید کی کوئی ادائے دلربائی ایسی نہ تھی جس سے وہ واقف نہ ہو اس لئے بہت کم اس کا تیر خطا ہوتا تھا اور دارجلنگ آنے والے نوعمر امرا میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس کا صید نہ ہوا ہو۔

نشۂ شراب یوں بھی ہر چیز کو اک خوشنما رنگ دیکر پیش کرتا ہے، چہ جائیکہ واقعی کوئی جمیل منظر سامنے آجائے۔ یوسف جسوقت

اندر کمرے میں داخل ہوا تو نشہ کا عروج اور اس کی بیباکیاں بدستور قائم تھیں اور تر دماغی کی وہ انتہائی کیفیت جو ہر چیز کو طبیعی طراوتِ حسن کے ملبوس میں پیش کرتی ہے اس پر پوری طرح مستولی تھی۔ جس وقت یہ اندر پہونچا اور مس گارڈن کو، ایک نوجوان جمیل عورت کو جو سر سے پانوں تک رعنائی و شگفتگی تھی، دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ شاید شراب کا ایک اور گلاس اس نے پی لیا ہے اور بدمست ہوکر بیہوش گر جانے کے لئے صرف زرا سے بہانہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ جس وقت مس گارڈن کا نرم و نازک ہاتھ یوسف کے ہاتھ میں آیا تو یہ گویا بہانہ بھی ہات آگیا اور وہ کوچ پر گر کر اس طرح پڑ گیا جیسے اس کے اعضا سے قوتِ حرکت بالکل سلب کر لی گئی ہو۔

مس گارڈن جو اس وقت تک اپنا ایک خاموش تعارف صرف اس حد تک کرا چکی تھی کہ وہ ایک عورت ہے اور برق افگن عورت، یوسف کی اس حالت سے بہت خوش ہوئی، کیونکہ قدرت کی طرف سے اسے موقع ہاتھ آگیا تھا کہ وہ اسپر اپنا اثر جلد قائم کرے، چنانچہ اس نے یوسف کے سر کو ہات کا سہارا دیکر ران پر رکھ لیا اور اپنا معطر رومال لیکر اس کے چہرہ و پیشانی کو ہوا دینے لگی۔ شرابی جب ایک بار گر جاتا ہے تو اس کا اُٹھنا آسان نہیں ہوتا اس لئے باوجود کوشش کے بھی یوسف بہت دیر تک اپنے آپ میں نہ آسکا، اور جسوقت صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو مس گارڈن موجود نہ تھی۔ مگر اس کے کپڑوں کو خوشبو اس کے رومال کی عطریت اب بھی اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ یوسف کے لئے یہ تمام باتیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا ہو، لیکن خمار کی تکلیف اس خواب کے خیال کی لذت کو بھی تباہ کر دینا چاہتی تھی۔ اس لئے جب خادم آیا تو سب سے پہلے اُس نے جس چیز کی خواہش کی وہ شراب کا گلاس تھا۔ کیونکہ جس لطف و سرور کے ساتھ رات اُس نے بسر کی تھی وہ ایسا نہ تھا کہ پھر اس کی تکراری خواہش اس کو نہ ہوتی وہ چاہتا تھا کہ اسکی زندگی اک سکر دوام میں تبدیل ہو جائے اور ساری دنیا میں وہ معصیت کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا جائے۔

باقی،

نیاز

تذکرۂ آبحیات پر ایک ناقدانہ نظر

یعنی

محمد حسین آزاد کے ادعائے باطل

اور

اُن کے طامات وترّہات کا کشفِ حجاب

اردو کے دنیائے تذکرہ میں جو شہرت محمد حسین آزاد کی تالیف آبحیات کو دورِ آخریں میں ہوئی، اس سے غالباً کوئی شخص ناواقف نہ ہوگا لیکن اس حقیقت سے کم لوگ آگاہ ہوں گے کہ وہی تذکرہ، جو بعض جماعتوں کے نزدیک شاید اب بھی معجزۂ ادب و تحقیق سمجھا جاتا ہے اور جو نہ صرف اپنی انشا بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی "فاتوا بسورۃ من مثلہ" کا بت بنالیا گیا ہے، اس کو اگر نظرِ تحقیق اور نگاہِ حقیقت شناس سے دیکھا جائے تو بیدل کے یہ فقرے بے اختیار سامنے آجاتے ہیں کہ:-

"غبارے سطرِ آشفتگی بر ہوا نگاشت و نسخۂ نشئی طومار کہکشانم پر کاہے بنیاد
فطرت بر باد گزاشت، پنداشت مصنف کتاب آسمانم"

"آبحیات" اگر اپنی انشا کے لحاظ سے تیسرے درجہ سے بھی گری ہوئی چیز ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا، کیونکہ ادیب ہونے کی حیثیت سے آزاد کا کوئی کارنامہ قابلِ ذکر موجود نہیں ہے، رہا ذوقِ شعری، سو اس اعتبار سے تو خیر، غریب کا مرتبہ ایک "متشاعر" کے درجہ کو بھی نہیں پہونچتا، لیکن طرفہ مضمون یہ ہے کہ آبحیات کو ایک تاریخی تصنیف کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے تنقید عالی کا بیشل صحیفہ بنا کر سامنے لایا گیا ہے، در انحالیکہ اس لحاظ سے وہ ایک مجموعۂ موضوعات و مزخرفات سے زیادہ نہیں اور اس اعتبار سے وہ ایک ایسی جنس کاسد ہے جس کی قدر کم از کم آنکھ رکھنے والوں کے بازار میں تو ہو نہیں سکتی

آبحیات کے طرز تحریر اور ان کے موضوع مقدمہ سے بحث کرنا اس وقت میرا مقصود نہیں ہے، ہر چند یہ بھی نہایت ضروری واہم کام ہے، مگر ممکن ہے یہ سعادت کسی اور شخص کے حصہ میں آئی ہو بہر حال اس صحبت میں مجھے تاریخی و تنقیدی اہمیت کے لحاظ سے اس تصنیف کی حقیقت پر روشنی ڈالنا ہے اور بتانا ہے کہ یہ بدیۂ تاریخی، سخافت و دنائت کا کتنا عظیم الشان انبار ہے۔

اگر آبحیات کے متعلق میری رائے اختصار کے ساتھ طلب کی جائے تو میں ایک لحہ تامل کئے بغیر یہ کہدونگا کہ واقعات

کی تحریف، حقیقتوں کی تکذیب صداقت کی توہین اور باطل کی تائید کا جیسا کھلا ہوا منظر اس کتاب میں نظر آتا ہے، وہ مشکل ہی سے کسی اور تصنیف میں ملسکتا ہے، اور جس بُری طرح آزاد نے اپنے بطون کو اس کتاب کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے اس کی نظیر کتب تذکرہ و تاریخ کی فہرست میں تو کہیں مل نہیں سکتی، ممکن ہے تیسری چوتھی صدی ہجری کے واضعان حدیث اس باب میں ان سے بڑھ گئے ہوں

یہ مضمون میری اسی مختصر رائے کی تفصیل اور میرے اسی دعوے کی دلیل ہے، جس سے اعتبار و بصیرت کی توقع تو نہیں، لیکن یہ اُمید ضرور کی جاتی ہے کہ اسلاف کی روحوں کی طرف سے جن کے حق میں یہ تالیف ایک بہتان عظیم سے کسی طرح کم نہیں ہے شاید یہ ایک جائز انتقام ہو جائے۔

آبحیات کے طومار اغلاط پر نگاہ ڈالی جائے تو اس کی چار قسمیں ہو سکتی ہیں:-

(۱) وہ تحریفات جن کے ذریعہ سے بعض اکابر پر بد اخلاقی کی تہمت تراشی گئی ہے۔

(۲) وہ روایات جو مصنف کے جہل و ناواقفیت پر دال ہیں۔

(۳) وہ بیانات جو یا تو یکسر غلط ہیں یا صد درجہ ضعیف۔

(۴) وہ اشعار جو آزاد ہی کی طبع رسا کا نتیجہ ہیں لیکن اُنھیں منسوب کیا ہے دوسروں کے نام سے

میں ان قسموں کو علیحدہ کر کے مثالیں پیش نہیں کرونگا، بلکہ شروع سے تمام ان شاعروں کے حالات کے متعلق تنقید کرونگا جن کا ذکر آزاد نے کیا ہے اور اس سلسلہ میں آپ کو خود معلوم ہو جائیگا کہ کہاں کہاں کس قسم کی غلطی آزاد نے کی ہے۔

ولی آزاد نے ان کا نام شمس ولی اللہ لکھا ہے، حالانکہ ان کے نام و لقب میں بہت اختلاف ہے۔ میر تقی میر نکات الشعراء میں صرف ولی لکھتے ہیں، میر حسن اور مولوی عبدالغفور نساخ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں گلشن بیخار میں کوئی نام درج نہیں۔ تذکرہ گل رعنا میں لقب شمس الدین اور نام ولی اللہ لکھا ہے۔ آزاد نے نہ ان تمام اختلافات کو ظاہر کیا اور نہ کوئی معقول وجہ بتائی کہ ان کو شمس ولی اللہ پر کیوں اعتماد ہے۔

ولی کو قریب قریب تمام تذکرہ نویسوں نے ایک مرد صاحبدل تسلیم کیا ہے یہاں تک کہ لفظ شاہ ان کے نام کے ساتھ ضم ہو گیا خود انھوں نے بھی اپنے رسالۂ نور المعرفت میں اپنے آپ کو "محمد نور الدین صدیقی سہروردی کے مریدوں کا خاکپا" تحریر کیا ہے، لیکن آزاد کا انداز بیان ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:-

> "قاعدہ ہے کہ جب دولت کی بہتات اور عیش و نشاط میں کچھ نیکی کے خیالات آتے ہیں تو صوفیانہ لباس میں ظاہر ہوا کرتے ہیں، اسوقت محمد شاہی دور نے در و دیوار کو دولت سے مست کر رکھا تھا، جس سے تصوف کے خیالات عام ہو رہے تھے، دوسرے وہ خود فقر کے خاندان عالی میں سے تھے اور فقیر ہی کے دیکھنے والے بھی تھے، تیسرے زبان اردو کے والدین یعنی بھاشہ اور فارسی بھی صوفی ہیں،

ان جذبوں نے انھیں تصوف شاعرانہ میں ڈالا"

آزاد کی یہ عبارت اپنے الفاظ و معنے کے لحاظ سے جیسی لغو و مہمل ہے اس پر تنقید کی ضرورت نہیں، عیش و نشاط کی فراوانی کے ساتھ تصوف کا پیدا ہونا اس قدر عجیب و غریب دعویٰ ہے کہ آزاد کے سوا کوئی اسے پیش نہیں کر سکتا لیکن چونکہ آزاد کا مقصود صرف تصوف اور اسی کے ساتھ ولی کی توہین مقصود تھی، اس لئے انھوں نے یہ اپج کی لی اور خاک سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں اور دنیا اسے کیا سمجھے گی۔ آگے چلکر ان کے دل کا کانٹا زیادہ نمایاں طور پر زباں سے نکلتا ہے لکھتے ہیں:-

"ہماری زبان کے مورخ اور ہمارے شعرا کے تذکرہ نویسوں نے اس کے ولی اور خدارسیدہ ثابت کرنے میں تو بڑی عرق ریزی کی لیکن ایسے حال نہ لکھے جس سے اس کے ذاتی خصائل و حالات مثلاً دنیا داری۔ یا گوشہ گیری۔ اقامت۔ یا سیاحی معلوم ہوں"۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ولی کی سیاحت۔ یا طلب علم۔ یا اخلاق و عادات کا حال نہیں ملتا۔ انصاف سے دیکھئے تو تصوف سے ان کے اخلاق و دنیا داری وغیرہ سب باتوں کا پتہ چل جاتا۔ مگر تصوف کو وہ اس قدر لایعنی لغو اور فضول سمجھتے ہیں کہ ولی کے دیوان کے بارہ میں یہ جملے ان کے زہر آلود قلم سے نکل جاتے ہیں" غرض جب ان کا دیوان دلی پہونچا۔ تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا........ گیت موقوف ہوگئے قوال معرفت کی محفلوں میں انہیں کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ اگرچہ اس اعتبار سے یہ نہایت خوشی کا موقع ہے کہ عمدہ جوہر انسانیت پسندیدہ لباس پہنکر ہماری زباں میں آیا۔ مگر اس کوتاہی کا افسوس ہے کہ کوئی ملکی فائدہ اس سے نہ ہوا اور اس کی یہ وجہ ہے کہ وہ کسی علمی یا آئینی رستہ سے نہیں آیا۔ بلکہ فقیرانہ شوق یا تفریح کی ہوا سے اڑکر آگیا تھا۔ کاش شاہنامہ کے ڈھنگ سے آتا" آزاد کے ایک ایک فقرہ سے جو زہر ٹپک رہا ہے اس کو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔

آزاد نے ولی کو اردو کا پہلا شاعر مانا ہے اور چاسر، رودکی اور مہلہل کا مرتبہ دیا ہے۔ گو وہ یہ مانتے ہیں کہ اردو میں متفرق شعر ہوتے تھے۔ مگر پھر بھی وہ مندرجۂ ذیل خصوصیات کو ولی کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ تمام بحریں فارسی کی اردو میں لائے۔ شعر کو غزل غزل کو ردیف و قافیہ سے سجایا۔ ردیف دار بنایا۔ ساتھ اس کے رباعی قطعہ مخمس اور مثنوی کا رستہ بھی نکلا۔ حالانکہ ان میں سے ایک بات بھی صحیح نہیں۔ تخمیناً سو سوا سو برس پہلے سے یہ سب اصناف موجود تھیں۔ یہ راز طشت از بام ہو چکا تھا کہ محمد قطب شاہ، قلی قطب شاہ، اور عبداللہ قطب شاہ کے دیوان حیدرآباد میں موجود ہیں۔ نصرتی کا دیوان اگرچہ نایاب ہے۔ مگر زبیری نے بساطین السلاطین میں اس کا ذکر کیا ہے۔ جس میں قصاید بھی شامل ہیں اور بعض قصاید کا دیکھنا مولانا عبدالحی صاحب مولف تذکرہ گل رعنا نے بھی بیان کیا ہے اسی طرح مثنوی پھول بن جو نشاطی کی تصنیف ہے سنہ ۱۰۶۵ھ میں تصنیف ہوئی بلکہ اس کی زبان اس قدر صاف ہے جس کی اس زمانہ میں کبھی امید نہیں کی جاسکتی نمونہ کے لئے یہ چند شعر دیکھئے۔

اول میں حمد رب العالمیں کا ۔۔۔ دل و جان سے کہوں جاں آفریں کا
خداوندا تجھے ہے جم خدائی ۔۔۔ ہمیشہ تجھکو ساجے کبریائی

زباں کو میں ادب کے ساتھ کھولوں نبی کے جانشیں کا مدح بولوں
علی سارے نیاں میں ہے سپہدار علی سارے دلیاں میں ہے سردار

جو کوئی ہے باغباں اس پھول بن کا چمن لاتا ہے یوں تازے سخن کا

نہ تھا بیٹا سو کوئی اس شاہ کے گھر ہوا تھا راج بیٹی پر مقرر

اسیطرح غواصی کا فسانۂ سیف الملوک نظم اردو ۱۰۲۷ھ کی تصنیف ہے جس کی نسبت وہ خود کتاب مذکور میں لکھتا ہے

برس اک ہزار ہور ستاویس ۱۰۲۷ھ میں کیا ختم یہ نظم دن تیس میں

نیز طوطی نامہ ملا ضیاء الدین بخشی ۱۰۴۹ھ میں تصنیف ہوا جس کے آخر میں خود مصنف نے لکھا ہے

برس اکہزار اور چالیس پہ نو ہوے ستھے یہ موتیاں پرویا ہوں تو

۱۰۴۲ھ میں تحفۃ النصایح کا زبان دکنی میں ملا قطبی نے ترجمہ کیا۔ ۱۰۶۳ھ میں ایک مثنوی ماہ پیکر احمد جنیدی نے لکھی شاہی شاہ قلی خاں تانا شاہ کے مصاحب خاص تھے اور مرثیے بھی کہتے تھے غزل بھی کہتے تھے۔ تذکرہ میر حسن اُن کی غزل کا نمونتاً یہ شعر درج کرتا ہے

ملنا تہیں کا غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ مچ کہے کس کس کا منہ موندوں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

غرضکہ تمام اصناف سخن کے نمونے مکمل طریقہ سے زبان اردو میں موجود تھے۔ بحریں وہی تھیں جو فارسی میں مروج تھیں چنانچہ طبعی اور نشاطی کی مثنوی ہزج مسدس محذوف الاخر۔ غواصی کی بدیع الجمال اور سیف الملوک بحر متقارب۔ بحری کی مثنوی من لگن، ہزج۔ اخرم۔ و اشتر میں موجود ہیں۔ اسیطرح غزلیں اور مخمس دوسری بحروں میں پائے جاتے ہیں۔ اور آزاد کے اس خیال سے کہ ولی ہی نے سب بحریں اردو میں پیدا کیں کبھی صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

چوتھی غلطی یہ کی ہے کہ انھوں نے ولی کا وطن، احمد آباد گجرات بیان کیا ہے حالانکہ تذکرۂ میر میں انہیں اورنگ آبادی لکھا ہے تذکرہ گل رعنا میں لکھا ہے کہ آبحیات میں ان کو گجرات کا باشندہ اور علامہ وجیہ الدین علوی کی نسل سے بتایا ہے۔ مگر اسبات کی کوئی تاریخی سند نہیں۔ اسیطرح تذکرہ آصفی اور تذکرہ دکن ان کو احمد آبادی بتاتے ہیں۔ تذکرۂ میر حسن میں ان کو گجراتی کہا گیا ہے اسیطرح آبحیات میں اُن کی سنہ ولادت اور سنہ وفات کو قریب قریب بالکل حذف کر دیا ہے۔ حالانکہ دوسرے تذکروں میں اختلافی طریق پر یہ سنین درج کئے گئے ہیں۔

اس کے بعد جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے تو آزاد کے اس جملے کی وقعت کسی طرح بھی قائم نہیں رہتی کہ وہ شاہ وجیہ الدین کے مشہور خاندان میں تھے۔ کیونکہ وہ گجرات کے رہنے والے تھے اور ان کے بعد ان کا خاندان بیجاپور

چلا آیا تھا ممکن ہے کہ ولی کی کوئی دور کی قرابت اُن سے ہو۔

ولی کی شاگردی کے متعلق بھی آزاد نے ایسی ہی فضول بے سر و پا تقریر کی ہے جیسی کہ ان کی عادت ہے۔ لکھتے ہیں کہ "ابوالمعالی (ان کے نام کے ساتھ سے سید کا لفظ اڑا دیا ہے) کے ساتھ دلی آئے۔ یہاں شاہ سعد اللہ گلشن کے مرید ہوئے۔ شاید ان سے شعر میں اصلاح بھی لی ہو" حالانکہ دوسری جگہ خود ولی کی زبانی یہ بات بیان کرتے ہیں کہ "میں شاہ سعد اللہ گلشن کا شاگرد ہوں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ نہیں لکھا کہ کس امر میں" پھر یہ بھی لکھتے ہیں "دیوان کی ترتیب یقیناً ان کے اشارہ سے کی" حالانکہ میر تقی میر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے ولی کو ہدایت کی کہ "این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ خود بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت" دیوان اردو کی ترتیب - دیوان کا حرف بحرف شاہ صاحب کو سنانا۔ شاہ صاحب کی شاعری کے متعلق ہدایات وغیرہ - اور اسپر آزاد کی یہ ناواقفیت کہ معلوم نہیں کس بات میں شاگرد تھے۔ ایسی بوالعجبی ہے جو سمجھ میں نہیں آتی۔ ظاہر ہے کہ اتنی ہدایتوں کے بعد ان کو صرف شاعری ہی میں شاہ صاحب کا شاگرد قرار دیا جا سکتا ہے۔

سب سے بڑا ستم جو آزاد نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ میر تقی میر کے تذکرے میں ان کے تذکرے کا ذکر لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میر نے ولی کے متعلق لکھا ہے " ولی شاعرے است از شیطان مشہور تر" اور اس کے ساتھ ہی ایک فرضی افسانہ میر خاں کمترین کا بیان کر دیا ہے میں نے تذکرۂ میر کو اول سے آخر تک دیکھا لیکن یہ فقرہ کہیں نہ پایا بلکہ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ " از کمال شہرت حاجت تعریف ندارد" یا "احوالش کماینبغی معلوم من نیست" اس کے سوا کوئی خلاف شان نقرہ یا جملہ ولی کی بابت نہیں ہے۔ مگر آزاد کا تو مطلب ہی کچھ اور تھا اس لئے انھوں نے آخر کار انھیں شیطان ہی بنا دیا۔

شاہ مبارک آبرو

ان کے بارہ میں بھی آزاد نے اپنی عادت جاریہ کی موافق بہت زیادتیاں کی ہیں۔ ایک لطیفہ بیان کیا ہے کہ چونکہ یہ یکچشم تھے اسی لئے مرزا مظہر علیہ الرحمۃ نے ان پر چوٹ کی اور یہ شعر کہا۔

آبرو کی آنکھ میں اک گانٹھ ہے
آبرو سب شاعروں کی . . . ہے

اور اُنھوں نے جواب میں یہ کہا۔

کیا کروں حق کے کئے کو کو میری چشم ہے
آبرو جگ میں رہے تو جان جانا . . . ہے

اصل واقعہ یہ ہے کہ آزاد کو دونوں شاعروں پر سب و ستم کرنا منظور تھا جسے ایک لطیفہ کی صورت سے پورا کیا۔ ورنہ بجز اسبات کے کہ آبرو کے یکچشم ہونے کا ثبوت تذکروں سے ملتا ہے۔ قدما کے جسقدر تذکرے میری نظر سے گزرے کسی میں یہ واقعہ درج نہیں ہے۔ دوسری یہ بات بھی کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ مرزا جان جاناں مظہر جن کی سنجیدگی کے تمام اہل تذکرہ قائل ہیں اور جن کی تمام عمر زہد و ورع میں بسر ہوئی کبھی ایسی نازیبا حرکت کے مرتکب نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی طرح آبرو خود ایک کہن سال بزرگ تھے اُن سے ایسی خلاف تہذیب حرکات کا سرزد ہونا ممکن نہیں۔ یہ غیر مہذب لطیفہ اور ناقابل برداشت تہمت رکھکر بھی آزاد کا جی خوش نہیں ہوتا، بلکہ وہ پیر کہن باکباز کے ساتھ شاہ مبارک کے عشق کا ایک فرضی افسانہ گھڑتے ہیں، جس کا ذکر کسی تذکرے میں اشارۃً

بھی نہیں ہے۔ ایک جگہ آزاد لکھتے ہیں کہ "آبرو ایک بڑے شاعر تھے اور اسیطرح مکھن پاکباز کے حال سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک معاصر شاعر تھے جن کا تین ہزار شعر کا ایک دیوان یادگار ہے۔ یہ ایک خوش وضع خوش شکیل اور نہایت عابد و زاہد شخص تھے"۔ اور پھر دوسری جگہ یہ فرماتے ہیں کہ "ان کے شعر جب تک میر مکھن پاکباز کے کلام سے چھڑے نہ جائیں تب تک مزا نہ دیں گے"۔ اور اس واقعہ کو چمکانے کے لئے ایک شعر مکھن کا آبرو کے شعروں میں شامل کر کے یوں لکھتے ہیں "پہلے ایک شعر انکا لکھتا ہوں۔ اس زمانہ کے خیالات پر خیال کرو

مجھے درد و الم گھیرے ہے نت میری میاں صاحب　　خبر لیتے نہیں کیسے ہو تم میرے میاں صاحب

اس شعر کو آبرو کے کلام کا آغاز ٹھہرانا اور ان فقروں کے بعد لکھنا صاف بتاتا ہے کہ آزاد آبرو پر ان اتہامات کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں جو پہلے ان کے قلم سے نکل چکے ہیں۔ پڑھنے والا دو میں پڑھتا ہوا چلا جاتا ہے اور یہ آبرو کا ایک مزاحی شعر معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے میر مکھن کے لئے کہا ہے۔ حالانکہ واقعہ بالکل برعکس ہے۔ یہ شعر میر مکھن پاکباز کا ہے جو غالباً انھوں نے اپنے کسی بزرگ کی شان میں کہا ہے۔ آزاد نے تک بندی اور واقعات کو مسلسل کرنے کے لئے اس کو ذرا الفاظ کا پہلو بچا کر آبرو کے کلام میں شامل کر دیا۔ یہ تمام طوفان غالباً اس شعر پر اٹھایا گیا ہے۔

مکھن میاں خفا ہیں فقیروں کے حال پر　　آتا ہے اُن کو جوش جمالی کمال پر

غالباً مکھن میاں کسی سے خفا ہوئے ہیں اور آبرو نے واقعہ نگاری کے طریق پر یہ لکھدیا ہے۔ ورنہ میر مکھن ایک گوشہ نشین شخص تھے جن کا حال نکات الشعرا میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"پاکباز تخلص شخصے ست گوشہ نشین۔ بسیار کم اختلاط۔ گویا آشنا شدن را نمیداند۔ پسر میاں شاہ کمال نبیرۂ شاہ جلال در مجمع شاعران ریختہ کہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ قرار یافتہ است اگر بفراغ و نسا میکند تشریف می آرد۔ مزاجش خالی از وحشت نیست"۔

میر محمد شاکر ناجی | اِن کی نسبت تذکرۂ میر حسن میں لکھا ہے کہ "مردے ظریف طبع بود اکثر از لطائف ظرائف مردماں را خندہ می آورد و خود نمی خندید۔ مگر تبسمی میکرد متوطن شاہجہاں آباد بود تلاش صنعت ایہام بسیار داشت" میر تقی میر نے لکھا ہے کہ مزاجش بیشتر مائل بہزل بود"۔ مگر آزاد نے ان دونوں بیانوں سے قطع نظر کر کے ان کو ایک عجیب قسم کا فسادی آدمی بنا کر دکھایا ہے ملاحظہ ہو۔ تیز مزاج اور شوخ طبع بہت تھے۔ راہ چلتے سے الجھتے تھے اور جسکے گرد ہوتے تھے اسے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا تھا۔

یکرنگ | آزاد نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ آخر میں کلام اپنا مرزا جان جاناں مظہر کو بھی دکھاتے تھے۔ مگر در اصل یہ خان آرزو کے شاگرد تھے جیسا کہ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے اگرچہ مصحفی نے ایک قول کیموافق انہیں شاہ مبارک ہی کا شاگرد بتایا ہے۔ مگر اس قول کی تذکرہ میر حسن سے تردید ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ان کو میاں آبرو کا معاصر لکھتے ہیں میر تقی میر یہ بھی کہتے ہیں کہ مجھے انکے حال سے اچھی طرح آگاہی نہیں اور پھر بھی آبرو کا معاصر ہی کہتے ہیں۔ کم از کم آزاد کیلئے ان اختلاف کا اظہار ضروری تھا انکے نام میں بھی اختلاف ہے بعض تذکرہ نویسوں نے مصطفےٰ خاں لکھا ہے۔ مگر علی الرغم سب کے میر حسن نے مصطفےٰ قلی خاں نام لکھا ہے

اشرف علیخان فغاں | فغاں کی بابت آزاد نے لکھا ہے کہ مصحفی اپنے تذکرہ میں انہیں قزلباش خاں امید کا شاگرد لکھتے

ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے مصحفی کے الفاظ یہ ہیں: "شعر را بصفائے میگوید۔ و نسبت شاگردی بہ ندیم میرساند چنانچہ خود گفتہ

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں دو دن کے بعد دیکھو استاد ہو گیا

اگرچہ نکات الشعرا میں قزلباش خاں اُمید کا شاگرد لکھا ہے۔ مگر یہ شاید فارسی کے کلام کی بابت ہو گا ورنہ اردو میں فارسی کے حوالے کی ضرورت نہ تھی۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ آزاد لکھتے ہیں: "ایک دن اختلاط میں انکا کپڑا نواب کے ہاتھ سے جلگیا۔ یہ رنجیدہ ہو کر عظیم آباد چلے گئے" اور واقعہ در اصل یہ تھا کہ نواب نے ایک دن جوش اختلاط میں گرم پیسے سے انکا ہاتھ جلا دیا تھا۔ یہ واقعہ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔ اور مصنف تذکرۂ گل رعنا بھی اُسکی توثیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ معلوم نہیں آزاد نے کپڑے کی روایت کہاں سے لی ہے۔

مرزا جان جاناں

آزاد لکھتے ہیں کہ "اگرچہ نظم کے جوش و خروش اور کثرت کلام کے لحاظ سے میر اور سودا کے ساتھ ان کا نام لیتے ہوئے تامل ہوتا ہے لیکن چونکہ صانع قدرت نے طبیعت کی لطافت اور اصلی نفاست اور ہر بات میں انداز کی خوبی اور خوبصورتی ان کے مزاج میں رکھی تھی اور زمانہ بھی سبکا ایک تھا۔ اس کے علاوہ پُرانے پُرانے تذکرہ نویس لکھتے ہیں بلکہ بزرگوں کی زبانی بھی سنا کہ زبان کی اصلاح اور طرز کی ایجاد میں انہیں ویسا ہی حق ہے جیسا کہ سودا و میر کو"

مندرجۂ بالا عبارت کے ایک ایک حرف سے آزاد کی ناانصافی اور جانبداری ظاہر ہوتی ہے یہاں اُن کو کلام کی کثرت اور جوش و خروش کی عدم موجودگی کی شکایت ہے۔ مگر میر محسن خلیق اور میر ضاحک کے یہاں وہ دونوں چیزیں بڑی آسانی سے مل گئی ہیں حالانکہ میر ضاحک کا صرف ایک شعر۔ اور میر خلیق کے دو شعر ملے ہیں۔ مگر اسد اللہ ذرا حالات لکھنے کے لئے اضطراب تو ملاحظہ ہو میر ضاحک کے حال میں لکھتے ہیں: "ابتدا سے دل چاہتا تھا کہ اس خانوادۂ سیادت کا سلسلہ مسلسل لکھوں۔ مگر پھول ہاتھ نہ آئے جو لڑی پروتا۔ اب کہ طبع ثانی کا موقع ہے آرزوئے قدیم پھر دل میں لہرائی ناچار برسوں کے سوکھے مرجھائے پھول دل افسردہ کے طاق میں پڑے تھے انہیں کا سہرا بنا کر سادات عظام کے روضوں پر چڑھاتا ہوں" میر ضاحک جو کبھی ایک نقل محفل سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے۔ اور جنکو مسخرگی کے سوا اور کچھ بھی نہ آتا تھا جن کی شاعری پر میر حسن بھی کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے میر خلیق جو اپنے زمانہ کے ایک معمولی مرثیہ گو تھے۔ یوں اُن کی نظروں میں جگہ پائیں اور مرزا جانجاناں سا باکمال جسکے علم و فضل کا ایک زمانہ مقر ہے یوں انکی نگاہوں سے گر جائے پیچ ہے۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

ان کی توجیہات ملاحظہ کیجئے تو ہنسی آتی ہے۔ مولوی قدرت اللہ کے تذکرہ میں جو ۱۲۰۸ھ میں تالیف ہوا ہے صاف صاف لکھا ہوا ہے: "میگویند اول کسے کہ طرز ایہام گوئی را ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوئے معلےٰ شاہجہان آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ مروج ساختہ۔ زبدۃ العارفین۔ قدوۃ الواصلین۔ واقف رموز جناب اکبر کاشف طریقہ پیغمبر مرزا جان جاناں متخلص بہ مظہر است۔"

مصحفی با آواز بلند کہہ رہے ہیں "در ابتدائے شعر کہ ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصہ نیامدہ بود و در دور ایہام گویان بود اول کسیکہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ وست نقاش اول زبان ریختہ باعتقاد فقیر مرزا است بعدہ تتبعش بہ دیگراں رسیدہ"

میر تقی میر جوش عقیدت میں کہتے ہیں "بندہ بخدمت او رفتہ سعادت اندوز گشتہ است اکثر اوقات دریاد الٰہی صرف میکند خوبیش تقریرہم مرتبہ ایست کہ در تحریر نمی گنجد۔ دیوان مختصر شعر فارسی او بنظر فقیر مولف آمدہ است۔ از سلیم و کلیم پایہ کمی ندارد۔ اگرچہ شعر گفتن دون مرتبہ او ست۔ لیکن گاہے متوجہ ایں فن بے حاصل نیز مے شود" اکابر ادب کی تو رائیں یہ ہیں مگر آزاد نہایت تحیریں لہجہ میں یوں زہر افشانی فرماتے ہیں "ان کے باب میں بہت سے لطایف ایسے مشہور ہیں کہ اگر آج کسی میں پائے جائیں تو زمانہ کے لوگ اچھا نہ سمجھیں گے۔ لیکن وہ ایک زمانہ تھا کہ صفات مذکورہ داخل فضایل تھیں۔ کچھ تو اس اعتقاد سے کہ ع خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔ اور کچھ اس سبب سے کہ اگر ایک لطیف اور شفاف سطح پر کوئی داغ ہو اور وہ ایک عمدہ نظرگاہ میں جلوہ گر ہو تو وہاں وہ دھبا بدنما نہیں بلکہ گلکاری معلوم ہوتا ہے اور جسے بُرا معلوم ہو وہ خوش عقیدہ نہیں۔ میں روسیاہ بزرگوں کی ہر بات کو چشم عقیدت کا سرمہ سمجھتا ہوں مگر مقتضائے زمانہ پر نظر کر کے نمونہ پر اکتفا کرنا چاہیئے" مگر اسپر بھی صبر نہیں آتا۔ اور تاباں کا تعلق مرزا مظہر کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں "مرزا صاحب بھی چشم محبت اور نگاہ شفقت سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مرزا صاحب بیٹھے ہیں اور ان کی صحبت میں جہاں کبھی وعظ و ارشاد اور کبھی نظم و اشعار کا جلسہ رہتا تھا تاباں بھی حاضر تھے اور باادب اپنے مرشد کی خدمت میں بیٹھے ہیں۔ حضرت اگرچہ محفل ارشاد کے آداب سے گرمجوشی ظاہر نہ کرتے تھے مگر معلوم ہوتا تھا کہ انہیں دیکھتے ہیں اور مارے خوشی کے باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ تاباں بھی مزاجداں تھے اشعار اور لطائف رنگین کہتے۔ حضرت سن سن کر خوش ہوتے کوئی بات سب کے سامنے کہنی خلاف ادب ہوتی تو جو اہل عقیدت میں ادب کا طریقہ ہے اسیطرح دست بستہ عرض کرتے کہ کچھ اور بھی عرض کیا چاہتا ہوں۔ حضرت مسکرا کر اجازت دیتے۔ وہ کان کے پاس منہ لیجاتے اور چند کلمے چپکے چپکے ایسے گستاخانہ کہتے کہ سوا اس پیارے عزیز کے کوئی نہیں کہہ سکتا۔ جسے بزرگوں کی محبت نے گستاخ کیا ہو۔ پس حضرت مسکراتے اور فرماتے کہ درست ہے پھر وہ اسی قسم کی کچھ باتیں کہتے آپ فرماتے یہ بالکل درست ہے جب تاباں اپنی جگہ پر آ بیٹھتے تو پھر حضرت خود کہتے کہ ایک بات کا تمہیں خیال نہیں رہا۔ تاباں پھر کان کے پاس منہ لیجاتے اس وقت اس سے بھی تیز تر کوئی لطیفہ آپ اپنے حق میں کہتے اور اپنے پیارے عزیز کی مہربانی کا لطف حاصل کرتے" میں نے جہانتک تلاش کیا کوئی تذکرہ اس واقعہ کی شہادت نہیں دیتا میر تقی۔ یا میر حسن وغیرہ میں اس کا ذکر بھی نہیں اس لئے یہ ایک صریح اتہام ہے۔ اصلیت صرف اتنی ہے کہ تاباں مرزا صاحب کے ایک عقیدتمند مرید تھے۔ اور مرزا صاحب ان پر عنایت فرماتے تھے۔ مگر جو شخص پیر و مرید کے آداب سے واقف ہی نہ ہو وہ اگر یہ خرافات نہ لکھے تو کیا کرے۔ اس قصہ کو صرف اس لئے گھڑ لیا گیا ہے کہ میر عبد الحئی تاباں نہایت جمیل تھے۔ اور مرزا کی مریدی کا شرف انہیں حاصل تھا۔ ابتداء حال میں انہیں میگساری کی بھی عادت تھی جس سے آخر میں تائب ہو گئے تھے میرزا کی نسبت جو اور لطایف لکھے ہیں وہ بھی اس سے کم نہیں ہیں چنانچہ نواب صاحب والا لطیفہ۔ اور چارپائی کی کان والا قصہ جسکے ذریعہ سے

بجائے نفاست طبع کے مرزا کو مجنون ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح افسانے جو (یہی) خوش عقیدگی کے ثبوت میں حکایت بیان کی ہے آزاد اس کو مرزا علیہ الرحمۃ کی عاشق مزاجی کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ڈھونڈنے سے بھی یہ قطعہ مجھکو سودا کے کلیات میں نہیں ملا، مگر آبحیات میں لکھا ہے کہ مرزا رفیع السودا نے اپنی آزادی اور بیباک روی کی زور میں آکر مرزا جان جاناں کی ہجو میں یہ شعر بھی لکھا ہے۔

القصہ اسکا حال یہی ہے جو سچ کہوں   کتا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

اسپر آزاد نے ایک خلاف عقل حاشیہ چڑھا دیا ہے کہ مرزا مظہر نے ایک دھوبن گھر میں ڈالی تھی اس واقعہ کا بھی کہیں ثبوت نہیں ہے

آخر میں مرزا صاحب کی شہادت کے متعلق بھی تذکرۂ قاسم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "مرزا صاحب اپنے کلام میں اکثر اشعار حضرت علی کی مدح میں کہا کرتے تھے اسپر بگڑ کر کسی سنی نے یہ حرکت کی۔" افسوس ہے کہ تذکرۂ قاسم اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے ورنہ ممکن تھا کہ اور سب باتوں کی طرح یہ روایت بھی غلط ثابت ہوتی اور اگر بالفرض یہ کہنا صحیح بھی ہے۔ تو دوسرے تذکروں (گلشن بیخار۔ سخن شعراء۔ وغیرہ) کے مقابلہ میں ایک تذکرہ کو ترجیح نہیں دیجا سکتی۔ تیسرے یہ کہ حضرت علی کی مدح کسی اہل سنت کے نزدیک عیب یا گناہ نہیں بلکہ فخر وصواب ہے پھر یہ کیونکر قرین وقیاس ہو سکتا ہے کہ کسی سنی سے یہ حرکت سرزد ہو۔

افسوس کہ وہ مرزا جان جاناں جنھوں نے اپنا خون اپنے قاتل کو بحل کر دیا ان کے واقعات زندگی کے لکھنے میں تحریف وافترا سے کام لیکر آزاد نے قاتل کی طرح انصاف کا خون اپنی گردن پر لے لیا۔

تاباں

آزاد نے تاباں کو شاہ حاتم اور میر محمد علی حشمت کا شاگرد لکھا ہے۔ لیکن تذکرۂ گلشن بیخار میں ان کو سودا کا بھی شاگرد بتایا ہے۔ اگرچہ میر کی اس تنقید کی وجہ سے کہ "نسبت بہ شعرا استاد و در رتبۂ شاگردی او نبود" وہ محمد علی حشمت ہی کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ میر صاحب سودا کو ایک بڑا شاعر مانتے تھے وہ تاباں کو سودا پر ترجیح نہ دیتے اور بعض نے میر درد کا شاگرد بھی بیان کیا ہے

تاباں کو تمام تذکرہ نویس متفقہ طور پر نہایت حسین وجمیل لکھتے ہیں۔ اور آغاز شباب ہی میں انکا مرجانا بیان کرتے ہیں۔ مگر آزاد ایک واقعہ اور اختراع فرماتے ہیں کہ "زمانہ اور وقت کے خیالات کو دیکھنا چاہیئے کہ بادشاہ خود سوار ہو کر اس راہ سے نکلے انھیں بھی خبر ہو گئی بنے سنورے اور بازار کیطرف مونڈھا بچھا کر آ بیٹھے۔ بادشاہ جب اس مقام پر پہونچے تو اس لئے کہ ٹھہرنے کو ایک بہانہ ہو وہاں آبحیات مانگا اور پانی پیکر دیکھتے ہوئے چلے گئے۔" بہ فرض محال اگر یہ روایت کسی تذکرہ میں ہو بھی تو درایتاً ہرگز صحیح نہیں ہو سکتی۔ بادشاہ کا ایک نوعمر خوبصورت لڑکے کو دیکھنے کے لئے جانا خلاف عقل ہے۔ اگر واقعی بادشاہ کو دیکھنے کا اتنا اشتیاق تھا تو کون مانع تھا کہ ان کو دربار میں نہ بلوا لیتے دوسرے آزاد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کا اشتیاق و ارادہ اسقدر شہرت پا گیا تھا کہ اسکی خبر مشتہر عام ہوتے ہوتے تاباں کو بھی پہونچ گئی تھی۔ پھر بادشاہ کا ارادہ کرکے تاباں کے مکان کی طرف جانا۔

اور وہاں ٹھہرنے کے لئے پانی کا بہانہ کرنا۔ آزاد کو یہ ضعیف اور ناقابل قبول روایت بیان کرکے یہ بھی سوچنا چاہئے تھا کہ وہ تاباں جکو ہر کہ ومہ اس وقت یوسف ثانی کہتا تھا۔ وہ تاباں جس کے اشتیاق میں بقول ان کے بادشاہ تک کوچہ گردی کرتے تھے۔ وہ تاباں جن کی ہر دلعزیزی کیوجہ سے بقول اکثر تذکرہ نویسوں کے کسی بڑے سے بڑے امیر کی محفل خالی نہ رہتی تھی۔ اگر ان کو اپنا ——— عقیدت کیش سمجھکر مرزا جان جاناں بھی محبت کرتے تھے تو کیا برا تھا۔ انھوں نے باوجود اس کے کہ مظہر کے کلام میں اس قسم کی لغویات کا ذکر نہیں پایا پھر بھی اُن کو ایک سنگین گناہ کا مرتکب بنایا۔ مگر افسوس ہے کہ میر کی اس فریاد وفغاں پر زرا توجہ نہیں کی ؎

داغ ہے تاباں علیہ الرحمۃ کا چھاتی پہ میر   ہو نجات اُسکی بچارا ہمسے بھی تھا آشنا

میر کا اس محبت و احترام سے تاباں کا ذکر کرنا دلیل ہے اس امر کی کہ تاباں اپنے اخلاق کے لحاظ سے کس قدر بلند انسان تھا ورنہ میر جس نے خوبرو لڑکوں کا ذکر نہایت بے غیرتی کے ساتھ کیا ہے۔ کبھی ان کے ساتھ رعایت نہ کرتے۔

مرزا سودا سودا کے تخلص میں بھی آزاد نے عجیب منطق سے کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ تخلص سودا اسواسطے رکھا گیا ہے کہ سودا یا جنون تمغائے عشق ہے جسپر ایشیائی شاعری کا دار ومدار ہے یا پھر باپ   رعایت سے رکھا گیا ہے کہ اس کے جزو اول میں سودا داخل ہے اور اس نقرے کا تو جواب ہی نہیں کہ سوداگری کی بدولت ایہام کی صنعت گھاتے میں آئی

آزاد نے مرزا رفیع سودا کی ولادت سنہ ۱۱۲۵ھ لکھی ہے اور سنہ ۱۱۸۵ھ میں انکا لکھنؤ پہونچنا۔ اس حساب سے انکی عمر ساٹھ برس کی ہوتی ہے مگر وہ اپنے قول سے خود اپنے قول کی تردید کرتے ہیں کہ ساٹھ یا چھاسٹھ برس کی عمر میں دلی سے نکلکر فرخ آباد میں نواب بنگش کے پاس رہے معلوم نہیں یہ شبہ اُن کو کس بنا پر پیدا ہوا ہے ——————— اسی کے بعد یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ جب یہ نواب شجاع الدولہ سے ملے تو وہ ان سے بہت اعزاز سے پیش آئے لیکن بے تکلفی یا طنز سے ان سے کہا کہ مرزا وہ رباعی تمھاری ابتک میرے دلپر نقش ہے۔ اور اس کو مکرر پڑھا۔ انہیں اپنے حالپر بڑا رنج ہوا۔ اور بہ پاس وضعداری پھر دربار نہ گئے۔ یہانتک کہ شجاع الدولہ مر گئے اور آصف الدولہ مسند نشین ہوئے۔

رباعی کا قصہ یوں بیان کیا ہے کہ ان کے کلام کا شہرہ جب نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ میں سنا تو کمال اشتیاق سے برادر من مشفق مہربان من لکھکر خط معہ خرچ سفر بھیجا اور طلب کیا۔ انہیں دلی کا چھوڑنا گوارا نہ ہوا جواب میں فقط اس رباعی پر حسن معذرت کو ختم کیا۔

سودا پے دنیا تو بہر سو کب تک   آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نا کہ دنیا ہووے   بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

آزاد نے نواب شجاع الدولہ کا لکھنؤ میں رہنا بیان کیا ہے حالانکہ نواب شجاع الدولہ کبھی لکھنؤ نہیں رہے بلکہ ان کا مسکن فیض آباد تھا، اور یہیں ان کی آخری عمر تمام ہوئی۔ اسیطرح وہ براہ راست لکھنؤ کا آنا بیان کرتے ہیں مگر اصل یہ ہے کہ فرخ آباد سے سنہ ۱۱۸۵ھ میں جب نواب مہربان خاں کا انتقال ہوا تب یہ فیض آباد آئے آگے چلکر سودا کی وضعداری کے لئے جو لطیفہ تراشا گیا ہے وہ صحیح

نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص دلی سے سفر کرکے گرتا پڑتا فیض آباد جائے اور وہاں پہونچکر ایک نہایت معمولی بات پر بدل ہوکر بیٹھ رہے یہ بالکل ناممکن ہے۔

کلیات سودا کو دیکھئے اکثر قصیدے نواب شجاع الدولہ کی تعریف میں موجود ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ سب کائنات پہلی ہی دفعہ میں پیش کردی گئی ہو۔ مصحفی ان کے حال میں لکھتے ہیں "ہر جا کہ می رفت عزت و حرمت می یافت نواب مرحوم و مغفور نیز بودن اورا در سرکار خود بسیار غنیمت می دانستند" ظاہر ہے کہ یہ فقرے اسیوقت لکھے جاسکتے ہیں جب سودا نواب مرحوم کی حین حیات تک اُن کے دربار میں رہے ہوں۔ مگر آزاد کو سودا کا استغنا دکھانا منظور تھا آزادی کے ساتھ جو چاہا لکھدیا۔

آزاد نے سودا کے دلی کے قدردانوں میں مہربان خاں کا نام لکھا ہے۔ مگر دراصل یہ مہربان خان رند ہیں جو فرخ آباد کے ایک سیر چشم۔ دریا دل امیر تھے اور جن کی فیاضی سے سودا نے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا جس طرح سودا ان کے پاس رہے اسطرح میر سوز مدت تک یہاں رہے۔ اسی بنا پر میر حسن نے اپنے تذکرہ میں انہیں میر سوز۔ اور سودا کا شاگرد لکھا ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں بیان کیا ہے کہ اگرچہ شخص جاہل بود اما سلیقہ صحبت شعرا درہم بعرصۂ قلیل بمرتبۂ والائے شاعری رسانیدہ"

سودا کی بابتہ جو لطائف آزاد نے بیان کئے ہیں وہ سب لغو ہیں اور کوئی پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچتا۔ کہتے ہیں لوگوں نے پوچھا بلبل مذکر ہے یا مونث تو جواب دیا کہ ایک ہو تو مرد ہے، عورت ہوجاتی ہے۔ یا میر جعفر زٹل اور سودا کے لطائف میں جو زبان درازی کی ہے وہ بھی کچھ کم نہیں۔

میر ضاحک میر ضاحک کا ذکر تذکرہ میں لانا ہرگز مناسب اور قرین انصاف نہ تھا کیونکہ وہ صرف ایک ہزلگو تھے۔ میر حسن اُن کو ہزل دوست لکھتے ہیں۔ اور انکی زندگی ہی میں جب کہ تذکرہ لکھ رہے تھے تین شعر سے زیادہ نقل نہیں کرتے اور باقی کلام کو یہ کہکر ٹال جاتے ہیں "چون گنجائش دریں پارچہ کاغذ نبود از ہزل گرشتہ بہ غزل اکتفا نمود" مگر آزاد کی خوش اعتقادی نے انہیں بھی ایسے ایسے کملائے فن میں شامل کردیا۔ آگے چلکر لکھتے ہیں۔ میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کے لئے گئے اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے، بعد رسم عزا پرسی کے (میر حسن سے) اپنی یاوہ گوئی پر بہت عذر گئے۔ اور کہا سید مرحوم نے دنیا سے انتقال فرمایا تم فرزند ہو جو کچھ اس روسیاہ سے گستاخی ہوئی معاف کرو۔ بعد اس کے نوکر سے دیوان منگاکر جو ہجویں ان کی کہی تھیں سب چاک کرڈالیں۔ میر حسن نے بمقتضائے علو حوصلہ و سعادتمندی اسی وقت دیوان باپ کا گھر سے منگایا اور جو ہجویں انکی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں مگر یہ واقعہ بالکل غلط ہے۔ سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔ اور میر ضاحک ان سے تین برس بعد مرے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انکا انتقال ۱۱۹۸ھ میں ہوا۔ چنانچہ تذکرہ گارسن ڈیٹاسی میں یہ واقعہ بہ تفصیل لکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ آخر میں تذکرہ گلزار ابراہیمی کا حوالہ دیتے ہوے خود بھی ضاحک کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ ۱۱۹۶ھ میں زندہ و بخیریت لکھنؤ میں موجود ہیں

خواجہ میر درد آزاد لکھتے ہیں کہ ان کا خاندان بسبب پیری مریدی کے دلی میں نہایت معزز اور معظم تھا اس کی وجہ کچھ نہیں

لکھی کیونکہ میر درد کا خاندان پچیس واسطوں سے امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اور یہ آزاد کے لئے نیشتر تھا آگے چلکر لکھتے ہیں کہ سودا اور میر تقی کی غزلوں پر جو غزلیں لکھی ہیں وہ ہرگز ان سے کم نہیں۔ اگرچہ خواجہ میر درد اور میر سودا وغیرہ کی ہمطرح غزلیں موجود ہیں۔ مگر قراین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے خواجہ صاحب کی طرحوں پر طبع آزمائی کی ہوگی۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں خواجہ میر درد کو جو شہرت اور مقبولیت تھی ان دونوں کو حاصل نہ تھی یہ دونوں حضرات انکے اتباع کو اپنی سعادتمندی سمجھتے تھے۔ جس کا ثبوت میر کے ان الفاظ سے ملتا ہے "بزرگ و بزرگ زادہ جوان صلح از درویشی بہرۂ وافی دارد۔ فقیر را بخدمت او بندگی خاص است"۔ حقیقت یہ ہے کہ خواجہ میر درد ایک گوشہ نشین فقیر تھے اُن کو اتنی فرصت اور اتنا دماغ کہاں تھا کہ بیٹھکر کسی کی غزلوں پر غزلیں کہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ ان کی غزلیں میر و سودا کی برابر ہیں یا نہیں یہ بحث بہت زیادہ تفصیل چاہتا ہے۔ مگر مختصر یہ ہے کہ خواجہ میر درد ہی ایک ایسا شاعر ہے جس پر دور سوم کو جس قدر ناز ہو کم ہے۔ میر سودا اپنی جگہ پر بہت اچھے ہیں لیکن حال و قال میں بڑا فرق ہے۔ تصنع کی پرواز کبھی حقیقت کو نہیں پہونچتی۔ اور سُنے سنائے خیالات واردات کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ یہی سبب ہے کہ میر حسن اپنے تذکرہ میں خواجہ صاحب کے دیوان کے بارہ میں لکھتے ہیں "دیوانش اگرچہ مختصر است۔ لیکن چوں کلام حافظ سراپا انتخاب" ایسی ہی راے سید امداد امام صاحب اثر نے کاشف الحقایق میں انکی نسبت ظاہر کی ہے۔ خود آزاد کو بھی لکھنا پڑا ہے کہ ان کی غزل سات ۹ شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے۔ تصوف جیسا انھوں نے کہا ہے اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔

میر تقی پر اتہام رکھتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں کہ میر صاحب نے انہیں آدھا شاعر شمار کیا ہے" حالانکہ میر صاحب درد کے بیحد عقیدتمند ہیں فرماتے ہیں" جوش بہار گلستان سخن۔ عندلیب خوش خوان چمن این فن۔ زبان گفتگویش گرہ کشاے زلف شاہد مدعا۔ مصرع نوشتہ اش بر صفحہ کاغذ از کاکل صبح خوشنما۔ طبع سخن پردازش سرو مائل چمستان انداز ست گاہے در کوچۂ باغ تلاش بطرق گلگشت قدم رنجہ میفرماید۔ در چمن شعرش لفظ رنگین چمن چمن۔ گلچین خیال او در گل معنی دامن دامن۔ شاعر زور اور ریختہ در کمال علاقگی وآراستہ" یہ ہیں وہ الفاظ جو میر نے نکات الشعرا میں خواجہ میر درد کے لئے استعمال کئے ہیں۔ معلوم نہیں نصف شاعر ہونا کہاں سے اخذ کیا گیا ہے۔ آزاد کو خواجہ صاحب کے کلام پر غلطی کا بھی شک ہے۔ چنانچہ اس شعر کی نسبت بھی یہی خیال ہے۔

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا ہم سبھی مہمان تھے تو آپ ہی صاحبخانہ تھا

لکھتے ہیں مدرکہ" بتخانے کو کثرت استعمال کے سبب سے ایک لفظ تصور کیا کہ دیر کے حکم میں ہو گیا ورنہ ظاہر ہے کہ یہ قافیہ صحیح نہیں۔ اعتراض کی نوعیت میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بتخانہ کی سند کیا دوں۔ لاکھوں جگہ قافیہ کی صورت میں مستعمل ہے اسیطرح انھوں نے صاحبخانہ پر بھی خط کھینچا ہے۔ یہاں البتہ فک اضافت کیوجہ سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ قافیہ درست نہو مگر سند میں منجملہ بہت سے اشعار کے ایک یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

انچہ ما کردیم بر خود ہیچ نابینا نکرد در میاں خانہ گم کردیم صاحبخانہ را

آزاد آگے چلکر در پردہ ان کی درویشی اور ان کے توکل کو مصنوعی ٹھہراتے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ مذمت کرتے ہیں "اگلے وقتوں کے لوگ خوش اعتقاد بہت ہوتے تھے اسیواسطے جو لوگ اللہ کے نام پر توکل کرکے جیٹھ رہتے تھے ان کی سب سے اچھی گزر جاتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ خواجہ صاحب کو نوکری یا دلی سے باہر جانے کی ضرورت نہ ہوئی دربار شاہی سے بزرگوں کی جاگیریں چلی آتی ہیں۔ امیر و غریب خدمت خدا کو سعادت سمجھتے تھے یہ بے فکر بیٹھے اللہ اللہ کرتے تھے" حالانکہ میر لکھتے ہیں" از درویشی بہرۂ وافی دارد" اور میر حسن کا بیان ہے۔ "سالک مسالک مکاشفات دینی۔ و ناہج مناہج مجاہدات یقینی از عرفاے عالیمقام و فقہاے ذوی الاحترام بر آسمان سخن بلند خورشید فرد خواجہ میر المتخلص بہ درد" خواجہ صاحب کے مکان پر جو فقرا اور اہل اللہ کا ایک بڑا جلسہ ہوتا تھا اسکی تحقیر ان الفاظ میں کرگئے ہیں "ماہ بماہ ایک معمولی جلسہ اہل تصوف کا ہوتا تھا" آگے چلکر بادشاہ کا بھی وہاں آنا بیان کرتے ہیں۔ ممکن ہے اسوقت معمولی جلسوں میں بادشاہ وقت بھی شریک ہوا کرتے ہوں۔ آزاد نے خواجہ صاحب کے ساتھ ہی خواجہ ناصر عندلیب کی بھی اسی طرح خبر لی ہے لکھتے ہیں "مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کا گھرانہ اور یہ خاندان ایک محلہ میں رہتے تھے ان کے والد مرحوم کے زمانہ میں شاہ صاحب عالم طفولیت میں تھے ایکدن اس جلسہ میں چلے گئے اور خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ ان کی مرید بہت سی کنچنیاں بھی تھیں اور چونکہ اس وقت رخصت ہوا چاہتی تھیں اسلئے سب سامنے حاضر تھیں باوجودیکہ مولوی صاحب اسوقت بچہ تھے۔ مگر ان کا تبسم اور طرز نظر دیکھکر خواجہ صاحب اعتراض کو پا گئے اور کہا فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ماں بہنوں کو عوام الناس میں لیکر بیٹھنا کیا مناسب ہے خواجہ صاحب خاموش ہو رہے" اس حکایت میں چند باتیں غور طلب ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ اس روایت کے ماخذ کا پتہ نہیں ہے دوسرے یہ کہ اگر جلسہ میں کنچنیاں تھیں تو ظاہر ہے کہ جلسہ خاص ہوگا اور اسیطرح محلہ کے بے شعور بچہ کا وہاں جانا کوئی معنے نہیں رکھتا تیسرے اگر شاہ عبدالعزیز صاحب ایسے خرد سال نا سمجھ بچے تھے کہ ان کو کوئی روکنا فضول سمجھتا تھا۔ تو اس حالت میں انکی طنز یہ ہنسی کیسی۔ اس سے لازم آتا ہے کہ وہ سمجھدار ہوں گے۔ اگر وہ سمجھدار تھے۔ اور اس احتراز و اعتراض کا شعور ان میں موجود تھا تو وہ خود ایک ناجائز مجلس میں کیوں شریک ہوئے۔ اگر وہ چلے گئے تھے اور اتفاقاً ان کو یہ جلسہ نظر آیا تو ان کا ٹھہرنا بھی کوئی معقول سبب نہیں رکھتا چوتھے یہ کہ اس زمانہ کے بچے آجکل کے بچوں کی طرح بے باک نہ تھے کہ بزرگوں کے سامنے اور بزرگ بھی وہ جو ہم محلہ ہو گستاخوں کی طرح دریدہ دہنی سے کام لیتے پانچویں یہ کہ ایک بچہ کی ہنسی کو خواجہ ناصر ایسے بزرگ کا اس قدر اہم قرار دیکر بجائے سرزنش کرنے کے اسقدر مرعوب ہونا اور یہ جواب دینا کہ فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں کہاں تک قرین قیاس ہے۔ چاہئے تھا کہ بچہ کی ہنسی پر ہنس دیتے۔ یا زیادہ سے زیادہ ڈانٹ دیتے ——— چھٹے یہ کہ دونوں بزرگ ہم محلہ بھی نہ تھے بلکہ دونوں مکانوں میں کافی فاصلہ تھا۔ شاہ صاحب کا مکان فیروز شاہ کے کوٹلہ میں تھا اور یہ بھوجلا پہاڑی پر رہتے تھے۔ آزاد کی عادت تھی کہ وہ جس سے خفا ہوتے ہیں حتی الوسع اس کی توہین میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں "ان کے یہاں (خواجہ صاحب کے یہاں) ایک صحبت خاص ہوتی تھی اس میں خواجہ میر درد صاحب نالۂ عندلیب یعنی اپنے والد کی تصنیفات اور اپنے کلام کچھ کچھ بیان کرتے تھے ایک دن مرزا رفیع سے سر راہ ملاقات ہوئی خواجہ صاحب نے تشریف لانے کے لئے فرمائش کی مرزا صاحب نے کہا کہ صاحب مجھے یہ نہیں بھاتا کہ سو کوے کائیں کائیں کریں اور بیچ میں ایک پدا بیٹھکر چوں چوں کرے"

اس حکایت کی تردید کے لئے غالباً آزاد ہی کی بیان کی ہوئی وہ حکایت کافی ہے جو انھوں نے میر درد کے تذکرہ میں بیان کی ہے کہ ایک شخص لکھنؤ سے دلی کو آنے لگے تو سودا سے پوچھا کہ کسی کو کوئی پیام کہنا ہو تو کہدیجئے انھوں نے جواب دیا کہ میرا دلی میں کون ہے۔ ہاں اگر کبھی خواجہ میر درد کی طرف جا نکلو تو سلام کہدینا۔ اس حکایت سے آزاد نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ درد اور سودا کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ یہاں تک کہ وہ سودا کے لکھنؤ چلے آنے پر بھی قائم رہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص غیبت میں اس قدر یاد رکھے اور مواجہہ میں یہ دل آزاری روا رکھے۔ آزاد ایک اور تہمت مرزا سودا پر لگاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "مرزا موصوف نے ایک قصیدہ نواب احمد علی خاں کی تعریف میں کہا ہے اور تمہید میں اکثر شعرا کا ذکر انہیں شوخیوں کے ساتھ کیا ہے جو ان کے معمولی انداز ہیں چنانچہ اسی ضمن میں کہتے ہیں:—

درد کس کس طرح ہلاتے ہیں   کرکے آواز منحنی و حزیں
اور جو احمق ان کے سامنے ہیں   لڑکے مکتب کے سب کہیں آمیں
کوئی پوچھے ذرا کہ عالم میں   فخر کس چیز کا ہے انکے تئیں
شعر و تقطیع ان کے دیوان کی   جمع ہووے تو جیسے نقش نگیں
اسمیں بھی دیکھئے تو آخرکار   یا تو آورد ہوا ہے یا تضمیں
اتنی کچھ شاعری پہ کرتے ہیں   میخ در..... آسمان و زمیں

اس قصیدہ کے نقل کرنے سے غرض یہ ہے کہ عام ناظرین یہ سمجھیں کہ سودا نے یہ چوٹ میر درد پر کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قصیدہ میں درد کا سودا نے ایک جگہ کے کہیں نام بھی نہیں آیا۔ یہ ایک قصیدہ ہے جسمیں عام شعرا کے حالات بتائے ہیں کہ آج کل یہ حالت ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

یعنی سودا و میر و قائم و درد   لے ہدایت سے تا کلیم و حزیں
کیا غرور دماغ کیسا نخوت   کونسا کبر ہے جو ان میں نہیں
میر مجلس کی تاب و طاقت کیا   کرے تکلیف شعر اُن کے تئیں
خلق کو انتظار کش کرکے   یکدو مصرع پڑھیں جواب کہیں
درد کس کس طرح ملاتے ہیں   کرکے آواز منحنی و حزیں

یہ ہے تمام حقیقت مگر آزاد نے تحریف کرکے ملاتے کو (ہلاتے) بنایا۔ جس سے بادی النظر میں گردن کا شبہ ہوتا ہے اگرچہ صراحت نہیں ہے۔ مگر در اصل شاعر کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ لوگ شعر پڑھتے ہیں تو آواز میں کیسا کیسا درد شامل کرتے ہیں اب پوچھا جائے کہ آپ کو درد کے بیان میں اس قطعہ کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ بجز اس کے کہ معمولی نگاہیں اس سے دہوکہ کھائیں افسوس کہ آزاد کو یہ یاد نہ رہا کہ سودا میر درد کا اتنا احترام کرتے تھے کہ ان کی غزل کی غزل کہنا بھی بے ادبی سمجھتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں:—

سودا بدل کے قافیہ تو اس غزل کو لکھ   اے بے ادب تو درد سے بس دو بدو نہ ہو

یہیں اسبات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ میر و سودا درد کی غزلوں پر غزلیں لکھتے تھے یا درد بقول آزاد ان کی غزلوں پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ مندرجۂ بالا قطعہ کو اگر آزاد نے واقعی درد کے حق میں سمجھا تو ان کے ذوق سخن فہمی پر ایک کافی روشنی پڑتی ہے انکی سخن سنجی کا بین ثبوت یہ بھی ہے کہ پہلے درد مرحوم کی یہ رباعی نقل کرتے ہیں۔

اے درد یہ درد جی کا کھونا معلوم   جوں لالہ جگر سے داغ دہونا معلوم

گلزار جہاں ہزار پھولے لیکن — میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

اور پھر اسیر سرقہ کا الزام قایم کرنے کے لئے لکھتے ہیں۔ کہ شاہ حاتم کی رباعی بھی اسی مضمون میں لاجواب ہے

ان سیم بروں کیساتھ سونا معلوم — قسمت میں لکھی ہے خاک سونا معلوم

حاتم افسوس دی داہر زر گزشت — فردا کی رہی امید سونا معلوم

حالانکہ یہ دونوں رباعیاں سوائے ہمقافیہ و ہمردیف ہونے کے ہم مضمون کسی طرح نہیں ہوسکتیں آگے چلکر لکھتے ہیں کہ قیام الدین قایم ان کا دہ شاگرد تھا جیسے استاد کو فخر کرنا چاہیے۔ اگرچہ قائم کی خوشگوئی میں شبہ نہیں مگر ان کو میر درد کا خاک پا بھی سمجھنا قصور عقل اور کوتاہی فہم ہے۔

"آرگس"

(باقی)

اگر آپ خطوکتابت میں نمبر خریداری نہیں لکھتے تو جواب کی توقع بیکار ہے۔

منیجر نگار

نصراللہ بُلڈانوی ۔ عبدالماجد دریابادی

اور

نیاز فتحپوری

جناب نصراللہ صاحب بی اے، بلڈانہ (صوبۂ برار) کے کوئی بزرگ ہیں، جنھوں نے ہمارے محترم و فاضل دوست مولوی عبدالماجد دریابادی (مدیر سچ) کے نام ایک تحریر روانہ کی جو ۲۰؍ اپریل ۲۸ء کے سچ میں مع جواب کے شائع کی گئی ہے۔ بلڈانوی صاحب کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے :-

"جولائی ۱۹۲۶ء کے نگار میں دریافت کیا گیا تھا کہ خضرؑ واقعی کوئی ہستی ہے یا نہیں یا یونہی کسی فرضی شخصیت کو تصور کر لیا گیا ہے، اس کا جواب نیاز صاحب فتحپوری مدیر نگار نے یہ دیا کہ خضرؑ نہ کوئی بزرگ ہیں، نہ ہوئے تھے، نہ ہوں گے۔ یہ سب یہودیوں کے من گھڑت قصے ہیں جو اسلام میں خدا معلوم کس طرح لے لئے گئے"

اس کے بعد بلڈانوی صاحب حد درجہ بےچینی و اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میں نے متعدد بار نیاز صاحب سے دریافت کیا مگر انھوں نے کوئی جواب نہ دیا اس لئے میری دلی خواہش ہے کہ آپ (یعنی مولوی عبدالماجد) جیسے جید عالم کی رائے اس بارہ میں معلوم کروں تاکہ جن الجھنوں میں مبتلا ہوں، وہ دور ہو جائیں"

اس استفسار کا جواب بھی اجمال و تفصیل کے بین بین مولوی عبدالماجد صاحب نے تحریر فرمایا ہے جو سوائے حصۂ تمہید کے جس سے مجھے سخت اختلاف ہے اور جس کی اظہار کے لئے میں نے قلم اُٹھایا ہے نہایت معقول و پسندیدہ ہے قبل اس کے کہ میں اصل مقصود پر آؤں، یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ بلڈانوی صاحب کی اول تو کوئی تحریر میرے پاس نہیں آئی اور اگر آئی بھی ہوتی، تو میں اس کا کیا جواب دیتا جبکہ اس سے قبل ہی اپنی رائے وجود خضر کے متعلق بالتفصیل جولائی ۲۶ء (نہ کہ جولائی ۱۹۲۷ء) کے نگار میں ظاہر کر چکا تھا۔

بلڈانوی صاحب نے ایک اور غلط الزام میرے سر یہ لگایا ہے کہ "نیاز صاحب نے یہ جواب دیا کہ خضرؑ نہ کوئی بزرگ ہیں نہ ہوئے تھے، نہ ہوں گے۔ یہ سب یہود کے من گھڑت قصے ہیں جو اسلام میں خدا معلوم کس طرح مشہور ہو گئے"

حالانکہ میں نے جو کچھ جولائی ۲۶ء کے نگار میں اس مسئلہ کے متعلق لکھا تھا وہ صرف ان مطالب پر حاوی تھا کہ :-

"خضرؑ کے متعلق جو روایات عوام میں مشہور ہیں وہ قابل وثوق نہیں ہیں اور جن

احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے وہ ساقط الاعتبار ہیں۔ حضرت موسیٰ کی ملاقات اُن کے سفرِ مدین کے وقت ضرور ایک ایسے انسان سے ہوئی جو اس نواح کا جاننے والا تھا اور جس نے موسیٰ کی رہبری کی، لیکن یہ ایک واقعہ تھا جو اسی وقت ختم ہو گیا اور نہ اب اُس شخص کا وجود باقی ہے اور نہ وہ صحرا نوردوں کی دستگیری پر مامور۔ اگر سبز پوش ہونے یا اسی طرح کسی اور ظاہری سبب کے بنا پر اُس کو خضر کہا جاتا ہے تو یہ اس کا اصلی نام نہیں ہو سکتا، لیکن اگر اس نام کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اور تمام خلافِ عقل باتوں کا ظہور اس سے منسوب نہ کیا جائے۔"

میں نے نہ صرف اس قدر بلکہ یہ بھی لکھا تھا کہ ہرچند خضر کی نبوت میں اختلاف ہے، لیکن اگر ان کو نبی مان لیا جائے تو بھی کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔

یقین ہے کہ میرے اس بیان سے یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ میں نے خضر کے متعلق کیا لکھا تھا اور نصراللہ صاحب نے کس قدر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اب اس کے بعد میں مولوی عبدالماجد صاحب کے جواب کے اُس حصہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جس سے مجھے اختلاف ہے اور ہرچند اس کا تعلق مسئلۂ وجودِ خضر سے تو نہیں ہے لیکن اس لحاظ سے کہ وہ نہایت ہی مہلک اصولِ استبداد کی حمایت میں لکھا گیا ہے اس کی مخالفت ضروری خیال کرتا ہوں۔

مدیر سچ نے اپنے جواب کی ابتدا یوں کی ہے:-

"مکتوب بالا میں جس رسالہ نگار کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ میری نظر سے نہیں گزرتا، اسلئے نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کیا لکھا گیا اور کیا دلائل پیش کئے گئے ہیں، لیکن رسالہ مذکور کی "جدت و اجتہاد" کی پہلی مثال میرے علم میں نہیں آئی ہے مسایل دین میں اس کی "تحقیق و اجتہاد" سے متعلق پیشتر بھی بعض مراسلے دفتر سچ میں موصول ہو چکے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اس باب میں کچھ قصور جواب بننے والے کا ہے تو سوال کرنے والا بھی اس سے کم مجرم نہیں ——— آپ کا کوئی عزیز قریب اگر خدانخواستہ علیل ہے اور آپ.......... بجائے کسی طبیب حاذق کے مطب کی جانب رخ کرنے کے شہر کے ایک کامیاب وکیل کے دفتر میں قدم رکھتے ہیں..........،، اور وہ بیدردو وکیل صاحب بجائے آپ کو کسی طبیب کے پاس جانے کی ہدایت کرنیکے اگر خود اپنی اٹکل اور ذہانت سے بعض دواؤں کے نام سنا دیں اور وہ نسخہ بےاثر یا مضر ثابت ہو تو اس افسوس ناک تیجہ میں خطا تنہا ان وکیل صاحب ہی کی ہوگی یا کچھ

ذمہ داری آپ پر بھی عاید ہوتی ہے، پھر یہ کیا قیامت ہے کہ جوش و ولولہ تو آپ کو سایل
دین کی تحقیق کا ہوتا ہے اور رجوع آپ "ادب لطیف" اور "افسانہ نگاری" کے "رئیس التحریر"
سے کرنے لگتے ہیں ——— اس سے بڑھکر ستم ظریفی یہ ہے کہ مدیر سچ کو
بکمال فیاضی جید عالم کی سند عطا فرماکر اُن سے اپنی تشفی چاہی جاتی ہے، اگر میرا
شمار کسی اعتبار سے اور کسی معنے میں بھی جید عالموں میں ہو سکتا ہے تو عامی اور مسائل
دین سے جاہل کا اطلاق ہندوستان بھر میں شاید کسی پر بھی نہ ہو سکے، اس قحط الرجال
میں بھی خدا کے فضل سے دہلی، یوپی، بہار، حیدرآباد، ہندوستان کا کوئی ٹکڑا
مستند و جید علماء سے خالی نہیں ہے، حیرت ہے کہ آفتاب و ماہتاب اور ستاروں
کو چھوڑکر روشنی کی طلب ریگ کے ذروں سے کیجاتی ہے ....

....

بہرحال اگر تشفی و تحقیق منظور ہے تو کسی مستند عالم دین ہی کی جانب رجوع کرنا چاہئے
البتہ اگر ایک عامی کی علمی واقفیت و معلومات ہی کا امتحان لینا مقصود ہے تو عرض
ہے کہ :— (اس کے بعد اصل جواب شروع ہو جاتا ہے)

میں اس تمہید کے ان اجزاء سے بحث نہیں کرونگا، جن میں مدیر سچ نے اپنے آپ کو ازراہ عجز و انکسار یا بر بنائے رسم و رواج ایک ناواقف و عامی شخص ظاہر کرتے ہوئے، سایل کو اوّل اوّل کسی "مستند عالم دین" کی جانب رجوع کرنے کی ہدایت کی ہے اور پھر اس خیال سے کہ کہیں ان کی معلومات کا امتحان لیا جانا مقصود نہ ہو، ایک عالمانہ جواب دینے کو بھی سعی فرمائی ہے، کیونکہ کبھی کبھی میں نے بھی اس سے زیادہ زوردار الفاظ میں اپنی بے مائگی و کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے سوالات کا جواب دیا ہے اور ہر وہ شخص جو نفسیاتی اصول سے واقف ہے، اس نوع کے فقروں کا استعمال کیا کرتا ہے حالانکہ ان کا مفہوم وہ نہیں ہوا کرتا جو الفاظ سے متبادر ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ اگر میں نے وکیل ہوکر طبیب کی خدمت انجام دینے اور ادب لطیف و افسانہ نگاری کا رئیس التحریر ہوکر تحقیق مسائل دین کی ناروا جسارت کی تھی، تو بالکل وہی الزام بلکہ اس سے زیادہ مولوی عبدالماجد صاحب پر عاید ہوتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے عامی و جاہل ہونے کا اعتراف کرنے کے بعد عالمانہ رنگ کا جواب دینے کی سعی فرمائی اور میں نے جواب دینے سے قبل "عذر" تا عجز" کی صورت سے بھی اپنے جہل و عدم علم کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اگر مدیر سچ خود بغیر کوئی جواب دئے ہوئے سائل کو ان علماء کی طرف (جن کو وہ جواب دینے کا اہل سمجھتے ہیں) رہنمائی کر کے خاموش ہو جاتے تو بیشک اُن کا مجھے ملامت کرنا جائز ہو سکتا تھا، لیکن جب خود انھوں نے وہی طرز عمل اختیار کیا جو میرے حق میں اُنھیں قابل اعتراض نظر آتا ہے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ "منکر مے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن" کیا معنے رکھتا ہے۔ سوائے اس کے کہ — مدیر سچ کا مقصود یہ ہو کہ کسی مسئلہ

دینی میں رائے دینے کا حق بہ نسبت مدیر نگار کے ان کو زیادہ حاصل ہے کیونکہ ادھر خلافت کمیٹی کا صدر ہونے کی حیثیت سے انھیں قدرت کی طرف سے مسائل دینی کے سمجھنے کی بھی سند مل چکی ہے۔ اور "ادب لطیف اور افسانہ نگاری" کا ذوق رکھنے والے شخص کے حق میں صم بکم عمی فہم لا یفقہون کی نص قطعی موجود ہی ہے۔

اگر عالم دین ہونے کے لئے ریش دراز و بروت کوتاہ کی شرط ضروری ہے، اگر مسائل مذہب سمجھنے کے لئے طویل جبہ و شملہ ناگزیر ہے، اگر تفقہ فی الدین کا حق اتنا ہی زیادہ ایک شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جتنا زیادہ "عبوساً قمطریرا" ہو، تو مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ان میں سے کسی شرط کا حامل نہیں ہوں، اور مجھ سے زیادہ ناواقف دین، بلکہ نامسلم اور کوئی نہیں ہو سکتا، لیکن اگر قرآن میں "تفکر و تدبر" کا حکم عام ہے جس میں عرب و عجم، شرق و غرب، وضع و صورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے، تو پھر مدیر سچ معاف فرمائیں، اگر میں یہ کہوں کہ دن کو دن اور رات کو رات سمجھنے کی اہلیت مجھ میں بھی انھیں کی طرح موجود ہے، البتہ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ میں نے اپنی صورت بگاڑ کر اپنے آپ کو مولانا کہلوانا پسند نہیں کیا، ورنہ یہ چنداں دشوار نہ تھا جبکہ ہر مسجد کا موذن و امام باوجود انتہائی جہل کے نہایت آسانی سے مولانا بنجاتا ہے۔

اب رہا سوال اُس ظاہری و کتابی علم کا، جو ممکن ہے کہ مدیر سچ کے نزدیک کوئی بڑی اہمیت رکھتا ہو، سو اس لحاظ سے بھی مدیر نگار ایک سے زائد اسناد اپنے پاس رکھتا ہے، اور جن کتابوں کے سمجھنے کی اہمیت مولانا عبدالماجد دریابادی یا ہند کے اور کسی "علامۃ اللوذعی" میں پائی جا سکتی ہے، ان کو بحمد اللہ مسٹر نیاز فتحپوری بھی سمجھ سکتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ وہ متقدمین کو خدا اور ان کی کتابوں کو صحائف آسمانی سمجھتے ہیں اور یہ ان کو ایک انسان ــــــ سمجھکر ان کی تحقیق کو "آخری لفظ" قرار نہیں دیتا۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ انسان کی بہترین صفت تقلید و اتباع ہے اور اس کا مسلک یہ ہے کہ دیگر حیوانات سے انسان کو ممتاز بنانے والی صفت صرف اُس کی قوت اجتہاد و ابداع ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نام ہے ابوحنیفہ یا مالک و حنبل کی تحقیقات پر آنکھ بند کر کے عمل کرنے کا اور اس کے نزدیک وہ شخص مسلمان ہی نہیں جس نے خود اپنے اندر کوئی اجتہادی قوت فکر پیدا نہیں کی ان کا اعتقاد یہ ہے کہ انسان کی پیداوار صرف ساتویں صدی کے وسط تک ہو کر بند ہو گئی اور اس کا خیال یہ ہے کہ خلیفۃ اللہ فی الارض پیدا ہونے کی استعداد جس قدر اب پائی جاتی ہے، پہلے نہیں تھی۔ وہ ہیں کہ اسلام کی جستجو صرف بخاری و مسلم میں کرنی چاہتے ہیں کیونکہ قرآن کا سمجھنا ان کے سمجھنے پر منحصر ہے اور یہ معتقد ہے کہ قرآن کا علم صرف قرآن ہی سے ہو سکتا ہے اور اس کے سمجھنے کا ہر وہ شخص مدعی ہو سکتا ہے جو غور و فکر سے کام لے۔ اگر مذہب کی ہئیت اجتماعی، انفرادی یقین سے مرتب ہوتی ہے یعنی اگر مذہب کی صحیح بنیاد انفرادی اعتقاد پر قائم ہوتی ہے، تو دنیا کا بڑے سے بڑا انسان بھی یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی کو اپنے مزعومات کے تسلیم کرنے پر مجبور کرے۔ لا اکراہ فی الدین سے مقصود یہی نہیں ہے کہ مذہب کے باب میں تیغ و تفنگ کا استعمال ناجائز قرار دیا جائے بلکہ اس سے مدعا یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی خاص اعتقاد و یقین پر قائم رہنے کے بعد ہی اس منزل تک پہونچ سکتا ہے جو فطری دین کا مقصود ہے، تو کسی کو تعرض کا حق حاصل نہیں ہے۔

جہاں تک خالص تحقیق و تفتیش کا تعلق ہے جس حد تک ایمان و اعتقاد کے تحفظ کے لئے جستجوئے انسانی وسیع ہو سکتی ہے اس حد تک نہ بخاری و مسلم کی تحقیق سند ہو سکتی ہے اور نہ بیہقی و رازی کے دلائل سنداً پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ہر شخص کا ایمان یعنی اس کے قلب کا سکون بالکل جدا چیز ہے اور وہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب خود ہی اس کے قلب کے اندر یہ کیفیت طمانیت پیدا ہو جائے۔ پھر بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ بڑے بڑے حکما و عقلا کے اقوال و نصائح، براہین و دلائل یہ کیفیت پیدا نہ کر سکے اور دفعتہً حالت میں تغیر پیدا ہو گیا ایک ایسی چیز سے جو حقیقت کے لحاظ سے لاشئی محض تھی۔ میں نے سنا ہے کہ خود عبدالماجد صاحب دریابادی کو جس چیز نے فلسفہ کی گمراہی سے ہٹایا وہ خواجہ حسن نظامی کا ایک مضمون "خرام قبلہ و شملہ" تھا۔

اس لئے آج کل میرے نزدیک کسی شخص کو تلقین ایمان کرنے کے لئے یا اس کے اخلاق درست کرنے کے لئے متقدمین کے دلائل کا دفتر بے پایاں لیکر بیٹھ جانا، یا خلاف عقل باتوں کو صرف اس طرح باور کرنا کہ "حدیث میں ایسا آیا ہے یا فلاں بزرگ نے اس طرح لکھا ہے" ایک ایسی بے معنی صورت رشد و ہدایت کی ہے کہ میرے نزدیک اس سے زیادہ تباہ کن چیز اسلام کے لئے کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ عقلی بے برگ و باریاں اور ذہنی بے مائگیاں، اسی طریق کار کی غارتگری کا نتیجہ ہیں اسلام ہو یا کوئی اور خدائی مذہب اس کی صداقت کی بہترین دلیل یہ نہیں ہے کہ اس کے مسائل و تعلیمات کو شجر ممنوع قرار دیدیا جائے اور ایک مفکر و مدبر کو یہ کہکر روکدیا جائے کہ ہر شخص کی عقل اس کی کنہ تک نہیں پہونچ سکتی، کیونکہ اس صورت میں اسکے معنے یہ ہوں گے کہ وہ مذہب صرف متقدمین کا ہے اور انھیں کی عقل کو معیار قرار دیکر اس کے مسائل منضبط کئے گئے ہیں یا پھر یہ مراد ہوگی کہ اب ساری دنیا بیوقوفوں سے بھر گئی ہے اور کسی دماغ میں یہ اہلیت باقی نہیں کہ حق و باطل میں تمیز کر سکے۔

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مدیر سچ یا اور کوئی مدعی علم و فضل اگر کسی حدیث یا آیت قرآنی کو استدلال میں پیش کر کے اس کا مفہوم لوگوں کو بتائے تو اس میں چون و چرا کی گنجایش نہ ہو لیکن نیاز فتحپوری اگر دعویٰ کرے کہ وہ بھی انھیں کی طرح سمجھنے اور سمجھانے کی قوت رکھتا ہے تو اس پر مضحکہ اڑا دیا جائے محض اس لئے کہ ایک نے وعظ و تلقین کا پیشہ اختیار کر لیا ہے اور دوسرا اس قسم کی تجارت کو پسند نہیں کرتا۔

مدیر سچ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کا قرآن ہندوؤں کا وید نہیں ہے جس کا سمجھنا صرف پنڈتوں ہی کے لئے مخصوص تھا اور دوسرے لوگ اسے چھو بھی نہیں سکتے تھے اسپر غور کرنے کی دعوت ہر کہ و مہ کو دی گئی ہے اور ہر شخص جو غور یا وہ تفکر و تدبر کر سکتا ہے خواہ وہ کسی زمانہ میں ہو قرآن کے سمجھنے کا اہل ہے پھر اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کر دینا چاہئے کہ عقول انسانی کے لئے یہ زمانہ ایسی زبردست ترقی کا آیا ہے کہ اب منقولات کی سپر اس کے مقابلہ میں کام نہیں دے سکتی اور حفاظت کی صورت اگر کوئی ہے تو صرف معقولات، لیکن معقولات بھی صدرہ شمس بازغہ، شرح چغمنی اور ہدیہ سعیدیہ کے قسم کے نہیں جن میں سوائے مغالطہ کے اور کچھ نہیں ہے، بلکہ وہ جو فطرت نے ہر صحیح دماغ انسانی میں ودیعت کئے ہیں اور جن کے استعمال کا ہر شخص کو فطری حق حاصل ہے

اسلام کو اگر آپ فطری مذہب سمجھتے ہیں تو اصول فطرت ہی کے مطابق اس کو سمجھنے دیجئے اور غیر متعلق باتوں کو اس میں شامل کرکے مذہب کی سادگی کو تباہ نہ کیجئے۔ اگر ایک شخص کلام مجید کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا نہیں ہوئے خضر کی زندگی دوام لایعنی سی بات ہے۔ موسیٰ کا ید بیضا صرف ایک تعبیر کامیابی ہے، یونس کا دہان ماہی کے اندر چلا جانا خلاف حقیقت ہے یوسف کا معجزۂ حسن و جمال صرف ایک افسانہ ہے، تو کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ اُسے دائرہ اسلام سے خارج کردے کیونکہ وہ قرآن کی صحت کا منکر نہیں ہے، بلکہ قرآن پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہے اور اسی صورت سے وہ قرآن کو الہامی کتاب مان سکتا ہے۔ اگر آپ نے اس پر یہ الزام لگایا کہ وہ قرآن نہیں سمجھتا تو وہ بھی آپ پر یہی الزام قائم کرسکتا ہے۔ اس کے بعد آپ زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتے ہیں کہ اپنی حمایت میں ایک بیشمار متقدمین کی کتابوں کا سامنے لاکر ڈال دیں، لیکن اسکا نتیجہ یہ ہوگا وہ ان سب کو ناقابل اعتبار کہدیگا یا پھر سرے سے قرآن ہی کی اہمیت و صداقت کا منکر ہو جائیگا

ہر ترقی کرنے والے مذہب کی جان وسعت نظر و خیال ہے، یعنی جب تک اس کی آغوش وسیع نہ ہوگی ترقی ممکن نہیں۔ اور اس کے آغوش کی وسعت یہی ہے کہ شروط مذہب کو آسان اور پابندیوں کو کم کیا جائے، نام و مقام وضع ولباس، معاشرت و معیشت وغیرہ سب سے بے نیاز ہوکر اسلام کے دائرہ کو وسیع کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ گنگا دھر، جوزف، شاپورجی اور رمزد اپنے اصلی ناموں اور اپنے خاندانی وضع لباس، حالت و صورت کے ساتھ بھی مسلمان شمار کئے جائیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا اور آخر کار یہ تنگ نظری ناقوس و اذان کی نزاع تک پہونچ جاتی ہے، حالانکہ ایک مسلمان کے نزدیک مندر کے ناقوس، کلیسا کے گھنٹے کو بھی ویسا ہی عزیز ہونا چاہئے جیسا وہ اذان کو سمجھتا ہے بلکہ اگر ضرورت ہو تو خود ناقوس پھونکنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے جب اذان و ناقوس کا مقصود بالکل ایک ہی جب ان دونوں سے مراد نمازیوں، یا پجاریوں کو نماز یا پوجا کے لئے بلانا ہے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نزاع و مجادلہ کیسا؟ کیا اگر کسی منزل پر پہونچنے کے لئے متعدد راستے گئے ہیں تو ان راستوں کے چلنے والوں کو باہم لڑنا چاہئے کیا ہر ایک کو اپنی منزل صرف اس جھگڑے میں کھوئی کرنا چاہئے، کہ "ہمارا راستہ صحیح ہے اور تمہارا غلط"

مسلمانوں میں اس تنگ نظری پیدا کرنے کی ذمہ داری خواہ وہ ہند میں ہوں یا بیرون ہند، صرف گروہ علماء پر عاید ہوتی ہے اور مذہب و قوم کی جملہ خرابیوں کا سرچشمہ انھیں کے جامد اور خود غرض دماغ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس جماعت کے اکثر افراد اپنے علم کے لحاظ سے اس قدر جاہل، مذہب کی حیثیت سے اس درجہ نامسلمان اور اخلاق کے لحاظ سے اتنی منافق ہوتے ہیں کہ اگر اسلام کا معیار صرف ان کی ذات کو قرار دیا جائے تو پھر معیار کفر و نامسلمانی قائم کرنے کے لئے کوئی اور ہستی نہیں مل سکتی۔ یہ سمجھتے ہیں کہ بہشت و دوزخ کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں ہیں، کسی کو مسلمان قائم رکھنا یا کافر بنا دینا ان کے اقتدار میں ہے، مذہب اسلام ایک راز ہے جس کے امین صرف وہی ہیں اور دنیائے اسلام کا فرض ہے کہ ان کے مواعظ کے سامنے خواہ وہ کتنی ہی دور از عقل باتوں سے کیوں نہ لبریز ہوں سر بسجود ہو جائے کیا اس دور جمہوریت و آزادی میں اس عہد حریت فکر و رائے میں بھی یہ تیج اس استبداد کے قائم رکھنے میں کامیاب ہوسکیں گے کہ وہ تو ایک امر پر اظہار رائے کریں اور میرا منہ بند کردیں شاید یہ اثر ہے اس ہلکی سی

مولویت کا جو جمعیتہ العلماء کے ممبر ہونے کی حیثیت سے ان کو حاصل ہوگئی ہے بہر حال وہ اپنی جگہ اپنے آپ کو کچھ ہی نہ سمجھیں اور مذہب کا مخصوص یونیفارم رکھنے والوں کے متعلق وہ کیسی ہی رائے کیوں نہ رکھتے ہوں، لیکن کم از کم میں ان بتوں کی پرستش کے لئے طیار نہیں اور میرا ایمان و یقین ہے کہ جب تک پوری قوت کے ساتھ ان کو مسمار نہ کیا جائے گا اس وقت تک کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔

افغانستان و ترکی کی ترقی کی تاریخ اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب اس جماعت کے افراد کو گردن پکڑ کے باہر نکالا گیا اور ان کے جھوٹے علم و تقدس کے چہرہ سے نقاب نوچ کر دنیا کو بتایا گیا کہ ان کا باطن کس قدر سیاہ اور ان کے اخلاق کس درجہ مکروہ ہیں

نیاز

نادرات

موت اور فقر دو بڑی مصیبتیں ہیں، لیکن موت ان میں زیادہ آسان ہے۔

قرابت محبت کی محتاج ہے اور محبت قرابت سے مستغنی

اس شخص کو، جو اپنی بیوی کو دیکھتا ہے اس حال میں کہ وہ حسین ملبوس میں آراستہ ہے، یا تو فیلسوف ہو جانا چاہئے یا بیوقوف

مرد ایسی عورت سے محبت نہیں کرتا جسے اس کو درس دینا پڑے بلکہ وہ اس عورت سے محبت کرتا ہے جو خود اسے درس دے

حسین چہرہ کا نظارہ دل میں امیدیں پیدا کر دیتا ہے۔

دنیا کا کوئی احساس اتنا مغرور نہیں، جتنا عورت کا وہ احساس جب وہ اول اول ماں بننے کو ہوتی ہے۔

دنیا میں اس سے زیادہ لذت کسی چیز میں نہیں ہے کہ انسان محبوب ہو۔

آدمی کو چاہئے کہ اپنی صورت آئینہ میں دیکھے، اگر وہ حسین ہے تو غور کرنا چاہئے کہ اس میں کسی قبیح بات کو شامل کرنا کس قدر بری بات ہے اور اگر قبیح ہے تو اس میں کسی اور قبیح کا اضافہ کرنا اور زیادہ قبیح ہے۔

وہ شخص جو وطن کی خیانت کرتا ہے ایسا شخص ہے جو اپنے باپ کا مال چوروں کو کھلا رہا ہے۔ حالانکہ اس کی اجازت نہ باپ نے دی اور نہ یہ مال چوروں کو مطمئن کر سکتا ہے۔

کوئی حکومت بغیر افراد کے نہیں ہوتی۔ اچھے افراد بغیر مال کے بیکار ہیں، مال نہیں ملتا مگر انصاف سے اور انصاف نہیں ہوتا مگر علم سے، اس لئے حکومت کی بنیاد علم ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قوت کو غرور ضعیف کر دیتا ہے اور ضعیف کو کوشش قوی بنا دیتی ہے۔

مومن اپنے گناہ کو اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ ایک پہاڑ ہے جو خدا جانے کس وقت اس پر گر جائے اور ایک فاجر کے نزدیک معصیت گویا ایک مکھی ہے جو ناک پر سے گزر گئی۔

حسین عورت ایک قیمتی جوہر ہے اور اس کی حسین فطرت ایک بڑا خزانہ ہے۔

باب الاستفسار

قارُون اور اُسکی دولت

(سید علی احمد صاحب زبیری - جلگاؤں)

جس طرح یوسف کا حسن ضرب المثل ہے' اسی طرح قارون کی دولت بھی بہت مشہور ہے' کہا جاتا ہے کہ اسکے خزانہ کی کنجیاں خدا جانے کتنے گدھوں پر لادی جاتی تھیں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کی بددعا سے مع اپنے تمام خزانہ کے زمین میں دھنس گیا اور برابر قیامت تک دھنستا چلا جائے گا۔ جس طرح آپ نے حسن یوسفی کی حقیقت کو آشکارا کیا ہے' اسی طرح براہ کرم قارون کے متعلق بھی کچھ لکھئے۔

(نگار) قارون کا قصہ ابن خلدون نے تو لکھا نہیں لیکن ابن اثیر جزری نے مختلف روایات کو ملا کر جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:-

قارون بن یصہر بن قاہث، حضرت موسیٰ کا عم زاد بھائی تھا اور اس قدر دولت مند تھا کہ اس کے خزانوں کی کنجیاں چالیس خچروں پر بار ہوتی تھیں، نشۂ دولت سے سرشار ہو کر جب اس نے لوگوں کو ستانا شروع کیا تو اس کو لوگوں نے سمجھایا لیکن اس نے کچھ پرواہ نہ کی اور کہا کہ اگر خدا مجھ سے راضی نہ ہوتا تو اتنی دولت کیوں دیتا۔ جب موسیٰ نے اس کو زکوٰۃ دینے کا حکم دیا تو اس نے بنی اسرائیل کو جمع کرکے کہا کہ اب موسیٰ تم لوگوں کے مال پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے کوئی تدبیر اس کو زک دینے کی سوچنا چاہئے۔ اور آخرکار ایک عورت اس امر پر راضی کی گئی کہ وہ موسیٰ پر زنا کی تہمت رکھے' لیکن جب یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی اور موسیٰ کو سارا حال معلوم ہوا تو انھوں نے بددعا کی اور وہ زمین میں دھنس گیا۔ اور اب بھی برابر دھنستا چلا جا رہا ہے۔

اس قصہ میں غور طلب امر صرف دو ہیں۔ ایک یہ کہ خزانہ کی کنجیاں چالیس خچروں پر بار ہوتی تھیں اور دوسرے یہ کہ وہ زمین میں دھنس گیا اور دھنستا چلا جا رہا ہے۔ قرآن پاک میں قارون کا ذکر تین جگہ آیا ہے۔ سورۃ المومن میں، سورۃ العنکبوت اور سورۃ القصص میں، سورۃ المومن میں صرف اس قدر ذکر ہے:-

ولقد ارسلنا موسیٰ بایٰتنا وسلطان مبین۔ الیٰ فرعون وہامان وقارون فقالوا سحر کذاب

تحقیق بھیجا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور کھلی ہوئی سند لیکر فرعون ہامان اور قارون کی طرف اور انھوں نے اس کو جھوٹا جادوگر کہکر پکارا

اس آیت سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ کی تکذیب کرنے والوں میں فرعون ہامان کی طرح قارون بھی بہت اہم اور قابل

ذکر ہستی تھا۔

سورۃ العنکبوت میں قارون کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :۔

وقارون وفرعون وہامان ولقد جاءہم موسیٰ بالبینات فاستکبروا فی الارض وما کانوا سابقین۔ فکلا اخذنا بذنبہ، فمنہم من ارسلنا علیہ حاصبا ومنہم من ـــــ اخذتہ الصیحۃ ومنہم من خسفنا بہ الارض و منہم من اغرقنا وما کان اللہ لیظلمہم ولاکن کانوا انفسہم یظلمون۔

(اور ہم نے تباہ کیا) قارون، فرعون اور ہامان کو اور تحقیق موسیٰ نشانیاں لیکر آئے لیکن انھوں نے زمین میں غرور کیا اور ہم سے بازی نہ لیگئے۔ پس ہم نے ہر ایک کو گناہ کا مواخذہ کیا، پھر انہیں میں سے ایک پر طوفان بھیجا، کسی کو زلزلہ نے پکڑا کوئی زمین میں دھنس گیا اور کسی کو ہم نے غرق کیا۔

اس سورت میں بھی قارون کا ذکر فرعون وہامان کیساتھ آیا ہے لیکن یہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قارون کی ہلاکت کا ذریعہ کیا ہوا۔ زمین میں دھنس جانے کا ذکر قارون ہی کی موت کی طرف اشارہ ہے۔

سورۃ القصص میں قارون کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ ہے، مسئلہ زیر بحث کے متعلق جسقدر حصہ ہے اسے نقل کرتے ہیں

ان قارون کان من قوم موسیٰ فبغیٰ علیہم وآتینٰہ من الکنوز ما ان مفاتحہ لتنوء بالعصبۃ اولی القوۃ اذ قال لہ قومہ لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین۔

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا، پس اس نے بغاوت کی اور ہمنے دئے تھے اس کو خزانے یہاں تک کہ اس کی دولت ایک قوت والی جماعت سے بھی نہ اٹھ سکتی، جب اس کی قوم والوں نے اُس سے کہا کہ اتراؤ مت اللہ اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

. . . .

. . . .

فخسفنا بہ وبدارہ الارض۔ فما کان لہ من فئۃ ینصرونہ من دون اللہ وما کان من المنتصرین واصبح الذین تمنوا مکانہ بالامس یقولون ویکان اللہ یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ ویقدر۔ لولا ان من اللہ علینا لخسف بنا

پس دھنسا دیا ہمنے اس کو اور اسکے گھر کو زمین میں اور نہ کوئی اس کا مددگار ہوسکا اور نہ وہ خود اپنی مدد کر سکا۔ اور وہ لوگ جو کل اس کی جگہ کی تمنا کرتے تھے کہنے لگے، اللہ جسکو چاہتا ہے اس کے رزق میں وسعت پیدا کر دیتا ہے اگر وہ ہم پر مہربان نہ ہوتا تو ہمیں بھی تباہ کر دیتا۔

کلام مجید میں جہاں اس کے خزانہ کا ذکر آیا ہے وہاں لفظ، مفاتح بھی موجود ہے اور اسی سے لوگوں کا خیال خزانہ کی کنجیوں کی طرف گیا ہے، حالانکہ مفاتح، جس طرح جمع ہے، مفتاح (کنجی) کی اسی طرح وہ مَفتَح (خزانہ) کی بھی جمع ہے اور کلام مجید میں مفاتح کا لفظ مفتح (خزانہ) ہی کی جمع کی صورت میں آیا ہے، جس کا ثبوت اس کی ضمیر سے بھی ملتا ہے جو واحد ہے اور جس کا مرجع قارون ہے، اگر مفاتح سے مراد کنجیاں ہوتیں تو اس کے بعد ضمیر جمع کی آتی کیونکہ اُس کا مرجع کنوز ہوتا جو جمع ہے۔ اس لئے کنجیوں کا مسئلہ تو طے ہو گیا۔ اب رہا زمین میں دھنسنے کا واقعہ سو کلام مجید میں صراحتہً اس کا ذکر موجود ہے۔ مکانوں کا دھنس جانا خاص کر ایسی صورت میں جبکہ نیچے تہ خانے ہوں، بارہا دیکھنے میں آیا ہے اس لئے ایسا تسلیم کرنے میں کوئی استحالۂ عقلی

عقلی نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم "محو کر دینا یا تباہ کر دینا" ظاہر کیا ہے جو باعتبار نتیجہ کے تو غلط نہیں ہے لیکن بہ لحاظ واقعہ ضرور نا درست ہے۔ اس امر کی تصدیق کہ قارون زمین کے بیٹھ جانے سے معہ اپنے مکان کے خاک میں دفن ہوگیا۔ سورۂ عنکبوت کی ان آیتوں سے بھی ملتا ہے، جن کو ہمنے یہاں نقل کیا ہے۔ ان آیات میں قارون، فرعون، ہامان کا ذکر کرکے ہر ایک کی تباہی کی نوعیت کا ذکر علٰحدہ علٰحدہ کیا ہے، چنانچہ فرعون کا غرقِ آب اور قارون کا پیوند خاک ہونا وہاں بھی صراحۃً مذکور ہے،

اب رہا یہ امر کہ خدا نے موسیٰ سے کہا کہ زمین پر میں تجھے اختیار دیتا ہوں اور یہ اختیار پانے کے بعد موسیٰ نے زمین سے کہا کہ قارون کو پکڑلے، پھر قارون کا معافی طلب کرنا، موسیٰ کا نہ ماننا اور خدا کا کہنا کہ اگر قارون مجھ سے معافی طلب کرتا تو میں دیدیتا، یا یہ کہ قارون کا قیامت تک زمین کے اندر دھنستا چلا جانا، یہ سب حکایاتِ یہود کے ٹکڑے ہیں جن کو ہمارے ہاں کے مفسرین بغیر نقد و جرح کے لے لیا کرتے ہیں اور جو پیشہ ور مولویوں اور واعظوں کے ذریعہ سے عوام تک پہونچتے رہتے ہیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نہ کلام مجید سے ان بے سروپا باتوں کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

نیاز

پنکھڑیاں

بچوں کی معصوم دنیا میں

نندیا پور

دور، بہت ہی دور، یہاں سے		اور اس سے بھی دور
ندی اک نکلی ہے جہاں سے		اور اس سے بھی دور
دلدل ہے گہری سی جہاں پر		دلدل سے بھی دور
جنگل میں ہے بڑھیا کا گھر		جنگل سے بھی دور
یاد ہے اس کو ایک کہانی		ہے اس میں اک حور
حور یہ ہے اک ملک کی رانی		ملک ہے نندیا پور
اس جنگل کو دیکھوں گا میں		جنگل سے بھی دور
حور کے ملک میں جاؤنگا میں		یعنی نندیا پور

کنکوا بن جاؤں

تارہ سا لہراؤں		کنکوا بن جاؤں

جب اماں تم آؤ
چھت کو خالی پاؤ
چپ کی چپ رہ جاؤ
سارے میں ڈھنڈواؤ

پھر بھی میں تو نہ آؤں		کنکوا بن جاؤں

ڈور کو جب تم پاؤ
کھینچو اور کھنچواؤ
اور ہنستی بھی جاؤ
اور پھر مجھکو بلاؤ

تب میں گھر میں آؤں		کنکوا بن جاؤں

حامد اللہ افسر

عروسِ سحر

بہار سبزہ زار میں نشاطِ میگسار میں
ہجومِ برگ و بار میں غنائے آبشار میں
سرورِ میں خمار میں خیالِ کیف بار میں
فضائے کوہسار میں گلوں کی ہر قطار میں
ضیائے مستعار میں قلوبِ داغدار میں
چمک تھی ایک نور کی
حریفِ برقِ طور کی

شعاع تھی وہ نور کی کہ داستاں غرور کی
تجلیاں تھیں ہر طرف عروسِ ناصبور کی
وہ نکہتِ گلاب میں شمیم زلفِ حور کی
نسیمِ خوش خرام میں خبر تھی دور دور کی
مچل رہی تھیں لذتیں سرور میں سرور کی
شباب پر بہار تھی
کہ چشم میگسار تھی

وہ مستئ بہار تھی کہ لغزشِ خمار تھی
گلوں پہ بلبلِ چمن نظیرِ بادہ خوار تھی
شفق کی سرخیِ "ہو" انیسِ لالہ زار تھی
چمن کی سرد و تر ہوا محیطِ کیف بار تھی
وہ صبح کی گھڑی تھی کب عروسِ تاجدار تھی
پیامِ زندگی تھی وہ
کہ نورِ سرمدی تھی وہ

حسین عاشقِ سحر یکایک آگئی نظر
رباب ہاتھ میں لئے خموشیوں کی پردہ در
تغنن لطیف سے تھی ہوشیار و باخبر
نمودِ حسن میں نہاں فروغِ برقِ فتنہ گر
غرور تمکنت سے تھی شباب سے نڈر مگر
تکلم شباب تھی
تبسم حجاب تھی

وہ زلفِ پر غرور تھی کہ دامگاہ سوز تھی
جبین تھی وہ عرق عرق کہ صبح ناصبور تھی
وہ چشمِ وحشت آشنا کہ یک نزد و دور تھی
وہ غمزہ فردشں تھی ادا کہ مژدۂ سرور تھی
وہ سادگی لباس میں کہ فطرتِ غیور تھی
شباب بے نقاب تھا
نقاب میں شباب تھا

وہ خال کفر دل ربا کہ نقطۂ خدا نما
وہ بادہ ریز آنکھیں تھیں کہ بجلیاں تھیں برملا
وہ عارضِ صبیح تھے کہ وجہ جوشِ مدعا
وہ گلفروش لب تھے یا کہ مرکزِ نشاط زا
وہ تنگنائی دہن کہ بابِ گوہرِ صفا
وہ گردن بلور تھی
کہ منبع غرور تھی

وہ خندۂ ارم نما وہ جلوۂ صنم نما
وہ نازِ مستیٔ نظر وہ غمزۂ عدم نما
وہ جوششِ ادا طلب وہ عشوۂ الم نما
وہ فتنۂ ستمگری وہ جادۂ ستم نما
وہ تمکنت شباب کی وہ ظلم بھی کرم نما

وہ شورشِ خموش تھی
مگر نمودِ دوش تھی

وہ گرم جوشیٔ جہاں وہ رنگ و بوئے گلستاں
وہ نغمہائے شوق تھے کہ حسن کی تھی داستاں
تڑپ وہ گلبُنوں میں تھی چمک رہی تھیں بجلیاں
ابل رہی تھی کیفیت مچل رہی تھیں مستیاں
وہ آہوئے رمیدہ تھی کہ حسن سے تھی بدگماں

ہزار پردہ پوش تھی
مگر ادا فروش تھی

بہار عطر دوش تھی خمارِ کیف ہوش تھی
قدم میں لغزشیں تھیں اگرچہ بادہ نوش تھی
ربابِ حسن صوت سے اسیرِ جذب جوش تھی
تلاطمِ حیات میں وہ فتنۂ خموش تھی
مگر فراقِ دہر سے وہ درد و غم فروش تھی

وہ حسن پُر بہار تھی
سعید کا نگار تھی

عروس بے رفیق تھی انیس درد و ضیق تھی
محیطِ بحرِ لطف میں شناورِ دغریق تھی
شگفتگیٔ دل کی وہ انیس تھی شفیق تھی
ہجومِ لالہ زار میں وہ پیکرِ عقیق تھی
مگر نگاہِ غور میں وہ نکتۂ دقیق تھی

صبوحیوں کی لہر میں
عیاں ہوئی تھی دہر میں

جو گا کے کچھ ٹھہر گئی تو لذتِ سحر گئی
اٹھی کسک سی دل میں پھر چمک کے تا جگر گئی
کچھ اشکِ سُرخ بہ چلے شفق پہ جب نظر گئی
وہ زلفِ عنبریں غضب بکھر کے تا کمر گئی
وہ تھرتھرا کے گر پڑی کہ جان سے گزر گئی

وہ دورِ عیش مٹ گیا
کہ وقت ہی پلٹ گیا

یہ انقلابِ دہر ہے کہ صد بلائے قہر ہے
حیات کی ہر کشمکش کہ بحرِ غم کی لہر ہے
ثبات کی بھی چاشنی اثر میں خاص زہر ہے
تباہ بھی وہ ہو گیا بسا جو آج شہر ہے
وجودِ حافظِ حزیں حبابِ موجِ نہر ہے

اُٹھو اُٹھو کہ سو چکے
عزیز عمر کھو چکے

حافظ غازیپوری

ترانۂ خودی

۱

جبکہ جبریل میں بھی جوہر کردار نہیں　　زندگی اہل فلک کی مجھے درکار نہیں
وہ فرشتے ہیں تو ہوں اس سے غرض کیا مجھکو　　دیکھنا یہ ہے کہ مجبور ہیں مختار نہیں

۲

جوہر دل سے کف خاک جہاں گیر ہوئی　　یعنی اکسیر یہ اکسیر سے اکسیر ہوئی
ہے فرشتوں کی تمنا کہ وہ جوہر مل جائے　　خاک یہ جس سے آئیں صاحب تدبیر ہوئی

۳

سوز گر سینۂ خورشید میں ہے ساز نہیں　　اور پردے میں تڑپ سی ہے تو انداز نہیں
مجھکو معلوم ہے جو کچھ ہے فرشتوں کا نیاز　　اس جبیں سائی کے پردہ میں آئین ناز نہیں

۴

اس سے انکار نہیں ہے کہ کف خاک ہوں میں　　جوہر دل سے مگر صاحب ادراک ہوں میں
ہر دو عالم میں ہے شہرہ مری بے باکی کا　　اے آئیں! پردہ در فطرت چالاک ہوں میں

۵

میں وہ قطرہ ہوں کہ دریا کے ہیں ساماں اس میں　　میں وہ ذرہ ہوں کہ صحرا کے ہیں ساماں اس میں
میں وہ تاباں ہوں کہ ہے گلشن جنت بکنار　　میں وہ نقطہ ہوں کہ دنیا کے ہیں ساماں اس میں

۶

آزر بتکدۂ دہر مرا ہی دل ہے　　جو ملائک کا ہے مسجود وہی وہ گل ہے
روئے فطرت کو اسی نے ہی بنایا دلکش　　صیقل آئینۂ حسن ازل یہ دل ہے

امین حزیں

غزلیات

آزاد انصاری

تیرے ستم جو آج نہ بھولے تو کل سہی تو	لیکن ترا خیال بھلایا نہ جائے گا
انجام کار کا بھی تجھے کچھ خیال ہے	کیا جو ستائیگا وہ ستایا نہ جائے گا
غیروں کے واسطے ہی مسیحائے وقت ہو	ہم کو تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا
آزاد مفت جان کھپانے سے فائدہ	قسمت کی خوبیوں سے بھرایا نہ جائے گا

نہ تو ہے اور نہ تیری تجلیاں محدود تو	کہاں تک آنکھ کرے وسعتِ نظر پیدا
ملی ہے اور نہ ملے فکر این و آں سے نجات	ہوئی ہے اور نہ ہو صورتِ مفر پیدا

پھر اچانک وحشتِ دل سوئے صحرا لے چلی	پھر ہمارا کاروبارِ شوق ابتر ہو گیا
پھر اٹھی گرد ہجوم یاس دل سے پھر اٹھی	پھر مری امید کا مطلع مکدر ہو گیا
آفریں اچھی مسیحائی دکھائی آفریں	زندگی تو زندگی مرنا بھی دوبھر ہو گیا
آج وہ دن ہے کہ اک ساقی کے دستِ خاص سے	پی اور اتنی پی کہ میں حقدارِ کوثر ہو گیا
کس نے تا منزل رفاقت کی طلب کے شوق نے	کون رہبر ہو گیا ۔ اللہ رہبر ہو گیا

تم اور چارۂ غم فرقت ۔ خوشا نصیب	دکھ کو دوا نصیب مرض کو شفا نصیب
اس خوبیٔ نصیب کے قربان جائیے	حسرت ستم نصیب ۔ تمنا بلا نصیب
میں بے نصیب تھا مرے سر منڈھ دیا گیا	غم آشنا نصیب ۔ ستم آشنا نصیب

افسوس کر کہ وقتِ تلافی گزر گیا	عبرت پکڑ کہ چشم کرم رائگاں ہے اب
وہ دن گئے کہ ضبط شکایت شعار تھا	مجبوریوں کے ہاتھ میں دل کی عناں ہے اب

باسط بسوانی

قربان میں تیرے رونے کے دشمن کیلئے کیوں روتا ہے
منہ کھول ذرا آنکھیں تو ملا کچھ ہنسنے کا شک ہوتا ہے

جسکی نہ پلک جھپکی تھی کبھی وہ موت کی نیند اب سوتا ہے
بیمار کی تھمنے کی نہ دوا اب رونے سے کیا ہوتا ہے

قربان میں ایسی راتوں کے تقدیر سے ایسا ہوتا ہے
میں اسکی بلائیں لیتا ہوں وہ فتنۂ عالم سوتا ہے

جب دل پہ مصیبت ہوتی ہے تب آنکھ میں آنسو آتے ہیں
اتنا تو سمجھ لے اے ظالم کیا کوئی خوشی سے روتا ہے

گو آنکھ سے آنسو بہتے ہیں خاموش مگر ہم رہتے ہیں
یہ بھی تو نہیں کچھ کہتے ہیں کیا عشق میں ایسا ہوتا ہے

مجھ سا بھی کوئی مجبور نہ ہو مجھ سا بھی کوئی معذور نہ ہو
مجھ سا بھی کوئی رنجور نہ ہو میں ہنستا ہوں دل روتا ہے

اے دشمن جان اہل وفا کچھ ہم پہ فقط موقوف نہیں
محفل سے تری جو اٹھتا ہے وہ بیٹھ کے در پہ روتا ہے

منزل کی طرف سب اہل سفر کس شوق سے بڑھتے جاتے ہیں
اور ایک مصیبت کا مارا تقدیر کو بیٹھا روتا ہے

روشن ہو سواد منزل بھی یوں داغ جگر کو روشن کر
اے رہرو الفت دیر نہ کر اب دیکھ اندھیرا ہوتا ہے

کیوں شکوۂ ظلم و جور کروں بہتر ہے کہ باتیں اور کروں
چپکے سے وہ ہنسکر کہتے ہیں جو ہوتا تھا وہ ہوتا ہے

باسط جو ہمارا مسلک ہے کیا اس سے نہیں تم واقف ہو
دن یاد بتاں میں کٹتا ہے، شب ذکر خدا کا ہوتا ہے

جعفر علی خان اثر لکھنوی

خبر تھی کسے طور بے طور ہوگا
نہ وہ بزم ہوگی نہ وہ دور ہوگا

جو خورشید کہئے تو کہتا ہے شب ہے
اگر ماہ کہئے کہے اور ہوگا

بس اتنی توقع ہے اس بیوفا سے
تغافل کے بدلے کبھی جور ہوگا

ستمگر کے اس قول نے مجھکو مارا
ترا قتل کیا سہل ہے غور ہوگا

تہجد پڑھے جو در میکدہ پر
اثر تو نہوگا کوئی اور ہوگا

مسعود علی ذوقی

خوشدلی سے تلخکامی کا مداوا کیجئے
عشق کی مجبوریوں کو یوں گوارا کیجئے

طالبانِ دید پر کھل جائے رازِ زندگی — اس طرح بھی اک نگاہ بے محابا کیجئے
دہر میں پیشِ نظر ہے گر تلاشِ عافیت — زندگی کی تلخیوں کو بھی گوارا کیجئے
جا پڑے گا خود بخود اڑ کر گلستاں میں قفس — دل میں پہلے جراتِ پرواز پیدا کیجئے
وسعتِ غم کے لئے کافی نہیں دل کے حدود — ہائے کس صورت سے تکمیلِ تمنا کیجئے
خود بخود اٹھ جائے گا ذوقِ تکلف کا حجاب
بزم میں بیگانہ وش ساقی کو دیکھا کیجئے

تبسم نظامی

عشق کی قوت سے شرحِ حسنِ جاناں چاہئے — ایک "افسانہ" اس فسانے کا عنواں چاہئے
بے اثر پھر ہو چلی ہے داستانِ آرزو — پھر مجھے کیفیتِ شوقِ فراواں چاہئے
عشق کا دامن جو خالی ہے تو ہو الجھن دست — تیرے دامن میں بہارِ گل بداماں چاہئے
دل کی رگ رگ میں کیا تھا جس نے اک طوفاں بپا — پھر وہی مجھ کو نگاہِ حشر ساماں چاہئے
حسن ہے خاموش، آنسو عشق کی آنکھوں میں ہیں — ایسے عالم میں کوئی لحنِ پریشاں چاہئے
پھر جنوں کی شورشیں ہیں آستیں در آستیں — میرا پیراہن گریباں در گریباں چاہئے
رات پُر نم چاندنی چھٹکی ہوئی ہے ہر طرف — میرے سینے پر تری زلفِ پریشاں چاہئے
پاس رہنا ہو تو کیا ہو اس کا آئینِ قیام — دور رہ کر بھی جسے قربِ رگِ جاں چاہئے

جگر بریلوی

تم نہیں پاس کوئی پاس نہیں — اب مجھے زندگی کی آس نہیں
کشمکش میں نہ روح پڑ جائے — یوں تو مرنے کا کچھ ہراس نہیں
راہ میں اپنی خاک ہونے دے — اور کچھ میری التماس نہیں
عمر سی عمر ہو گئی برباد — دلِ ناداں عبث اداس نہیں
سانس لینے میں درد ہوتا ہے — اب ہوا زندگی کی راس نہیں
کیا بتاؤں مآلِ شوقِ جگر
آہ قائم میرے حواس نہیں

معلومات

موسیقی کا دوام

مارکونی کے نام سے ایک کمپنی ہے جو "لاسلکیات" کی صنعت و تجارت کے لئے قائم ہے۔ اس کمپنی کے پاس کسی ماہر فن کی تحریر موصول ہوئی ہے کہ گانے والوں کی آوازیں جو اس وقت لاسلکی کے ذریعے دنیا میں منتشر و مشتہر کی جاتی ہیں اور پھر غائب سی ہو جاتی ہیں، فنا نہیں ہوتیں، بلکہ ابد الآباد تک کے لئے قائم ہیں، کیونکہ امواج لاسلکی فنا ہونے والی چیزیں نہیں ہیں اور ایسے آلات کا بنانا ممکن ہے جن کی شدت احساس تمام ایسے نغموں کو جو فضا میں کسی وقت پھیل گئے ہیں ڈھونڈ نکالے اگر یہ صحیح ہے تو اس میں بھی شک نہیں کہ ایسا آلہ ضرور بن کر رہیگا اور پھر نہ صرف آوازیں بلکہ فضا کی تمام وہ چیزیں جن کا تعلق امواج کہربا سے ہے انسانی اقتدار میں آجائیں گی۔

لاسلکی طیران

جنوب فرانس میں ایک ماہر پرواز نے ایک ہوائی جہاز کو بغیر اسکے کہ اسپر چلانے والا یا کوئی اور سوار ہوتا محض لاسلکی کی مدد سے اڑایا۔ اس نے یہ تجربہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ پے در پے دس مرتبہ دکھایا۔ جہاز صرف لاسلکی امواج کہربا کی قوت سے از خود زمین سے بلند ہوتا اور جب تک وہ شخص چاہتا فضا میں ادہر ادہر پھرتا اور پھر ایک معین مقام پر اتار دیتا۔ حکومت فرانس نے یہ ایجاد مول لینے کا ارادہ کیا ہے تاکہ جنگ کی وقت اگر کبھی ضرورت ہو تو ایسے جہاز استعمال کئے جا سکیں۔

نور کی رفتار میں کمی

فرانس کے ایک ماہر فلکیات کا بیان ہے کہ نور کی رفتار میں کمی پیدا ہوتی جا رہی ہے، کیونکہ ہر سال نور کی رفتار کا تعین بتاتا ہے کہ ہر سال اس میں کمی ہوتی جاتی ہے اور اس کمی کا اوسط ہر سال ۳ میل فی سکنڈ ہے گزشتہ سال نور کی رفتار کا اندازہ ۱۸۶۲۸۴ میل کیا گیا تھا۔ جو سال ماقبل سے کم تھا، اگر سال آئندہ، سال رواں کے لحاظ سے کمی پائی گئی تو یہ بیان بالکل پایۂ تحقیق کو پہونچ جائیگا۔ ہر چند عام لوگوں کے نزدیک یہ نہایت خفیف سا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھ سکتا لیکن علمائے طبیعیات کو اپنے بہت سے آرا و افکار میں اس کی وجہ سے تبدیلی کرنا پڑ جائیگی

سماوی شعاعیں

سنہ ۱۹۰۳ء میں دو ماہرین کہربا نے ظاہر کیا تھا کہ بجلی الکٹرسکوپ (آلۂ برق پیما) سے رستی رہتی ہے خواہ وہ کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو جسکے معنے یہ ہوئے کہ ایجابی و سلبی کہربائی شعاعیں اندر آلہ کے پہونچ جاتی ہیں۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک ماہر برقیات آلۂ برق پیما کو غبارہ میں اپنے ساتھ لیکر اڑا اور جس وقت وہ ۴۰۰۰ فٹ کی بلندی پر پہونچا تو معلوم ہوا کہ بہ نسبت سطح زمین کے، فضا میں برق پیما کی بجلی زیادہ کم ہو گئی، اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ جن شعاعوں نے یہ فرق پیدا کیا وہ زمین کی نہ تھیں بلکہ فضا کی تھیں۔ اس کے بعد چار سال تک قبل آغاز جنگ جرمنی وغیرہ کے بعض ماہرین فن اس کی

تحقیق میں مصروف رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غبارہ جس قدر زیادہ بلند ہوتا جاتا ہے، برق پیما کی بجلی کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ۹۰۰۰ میٹر کی بلندی پر بہ نسبت زمین کے نو گنا بجلی کم ہو جاتی ہے۔ جنگ کے دوران میں چونکہ تمام علمی تحقیقات معرض التوا میں پڑ گئی تھیں اس لئے یہ سلسلہ جوں کا توں رہا، لیکن سنہ ۱۹۲۱ء سے پھر امریکہ کے دو پروفیسروں نے اس کا تجربہ کیا اور نتیجہ وہی نکلا اسی سلسلہ میں اس تحقیقات کو زیادہ وسیع کر دیا گیا اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر، برف کے اندر عمیق گڑھوں میں، سمندر کی تہ پر غرض مختلف صورتوں سے مختلف نشیب و ارتفاع اور مختلف درجات حرارت و برودات میں تجربہ کرنے سے معلوم ہوا کہ فضا کے سیاروں سے کہربائی شعاعیں برابر زمین کی طرف آتی رہتی ہیں جو نامعلوم طور پر زمین کے تمام کہربائی کاروبار پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ لیکن نہ ابھی تک اس کا صحیح علم ہو سکا ہے کہ یہ شعاعیں کن سیاروں سے زیادہ آتی ہیں اور یہ کہ ان کا اندفاع کیونکر ممکن نہیں ہے تو ان سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ ان شعاعوں کا نام (Cosmic rays) یا سماوی شعاعیں رکھا گیا ہے۔

بحری طیارے

گزشتہ ستمبر میں بحری طیاروں کی دوڑ کا مقابلہ ہوا جس میں برطانیہ اور اطالیہ کے بحری طیاروں نے بحر اڈریاٹک میں شنیڈر کپ جیتنے کے لئے مقابلہ کیا۔ اس سے قبل کے سال میں یہ کپ امریکہ کے مقابلہ میں اطالیہ نے جیتا تھا اور اس مرتبہ برطانیہ نے جیتا۔

انگریزی بحری طیارے کی رفتار فی منٹ ۲۸۱ میل سے کچھ زائد تھی ہر چند جہاں جہاں ساحل سیدھا تھا وہاں اس کی رفتار فی منٹ ۳۰۰ میل تھی لیکن موڑ کے مقامات پر پلٹ جانے کے اندیشہ سے اس رفتار کو کم کرنا پڑتا اور اوسط ۲۸۱ میل رہا۔ یہ مقابلہ ۲۲ میل میں ہوا جس میں ۲۲ مقامات پر موڑ تھے۔

متحرک پہاڑ

اس سے قبل پہاڑ ایسی جامد چیز خیال کیا جاتا تھا کہ اس کا اپنی جگہ سے جنبش کرنا محال سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ثابت قدمی کی مثال ہی پہاڑ سے دیتے تھے، لیکن اب جا کر یہ معلوم ہوا کہ فطرت کے زبردست ہاتھ میں بڑے سے بڑا پہاڑ پرکاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ قلمرو اطالیہ میں بحیرۂ ماگیوری سے جانب شمال تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے جسے جبل اریمنو کہتے ہیں یہ پہاڑ ۵۰۶۰ فٹ اونچا ہے اور اطالیہ کی ماہر طبقات الارض جماعت نے ثابت کیا ہے کہ یہ پہاڑ سنہ ۱۸۸۹ء سے حرکت کر رہا ہے اور اس کی چوٹی سنہ ۱۹۰۵ء تک (۱۶ سال کے عرصہ میں) ۶ فٹ جانب شرق ہٹ گئی تھی اور سنہ ۱۹۲۶ء میں ایک فٹ اور سرک گئی ہے۔ اس کا علم سب سے پہلے اس طرح ہوا کہ جو درخت چوٹی پر قائم تھے ان کا میلان شرق کی طرف نظر آیا اس لئے اس کے شرقی وادی کے لوگ اب اس جگہ کو چھوڑ رہے ہیں کیونکہ بہت جلد اس چوٹی کے گر جانے کا اندیشہ کیا جاتا ہے

سال گزشتہ کے معجزات علم و تحقیق

طب و علاج :- جاپانی ڈاکٹر نے گزشتہ سال اعلان کیا ہے کہ اس نے ان جدید جراثیم کو دریافت کیا ہے جو مفاصلی تپ کا باعث ہوتے ہیں۔

بوسٹن کے ایک ڈاکٹر نے ثابت کیا ہے کہ پتہ کا عدم انقباض اس میں سنگریزے پیدا دیتا ہے اور ایک جاپانی ڈاکٹر نے ثابت کیا ہے کہ وٹیامین کے بعض اقسام کا کھانے میں نہ پایا جانا پتہ اور گردوں میں

سنگریزے پیدا کردیتا ہے۔

فن طیران:- امریکہ کی ایک کمپنی نے ہوائی جہاز کے لئے ایک نہایت قوی محرک بنایا ہے جس کی قوت ۱۲۰۰۰ گھوڑوں کی ہے۔ ایک اور آلہ محرکہ طیار ہوا ہے جس کا وزن صرف ۵۰۰ پونڈ ہے اور قوت ۵۲۰ گھوڑوں کی رکھتا ہے۔

فن تعمیر:- کولوراڈو (امریکہ) میں ایک سرنگ ۶ میل کی طویل طیار ہوئی ہے اور ایک سرنگ دریائے ہڈسن کے نیچے، نیویارک اور نیوجرزی کے درمیان دو میل کی طویل بنائی گئی ہے جس کے اندر سے موٹروں کی آمد و رفت ہوتی ہے

فن تصویر:- فوٹو میں سرخ و زرد رنگ سیاہ ہوجاتے ہیں اور نیلا رنگ سپید۔ لیکن کوڈک کمپنی نے سال گزشتہ ایسی شدید حس کے فلم طیار کئے ہیں جو ان رنگوں میں نمایاں امتیاز پیدا کردیتے ہیں۔

فلکیات:- چار دُمدار ستارے نئے دریافت ہوئے اور یہ ثابت ہوا کہ جس وقت پورا خسوف ہوتا ہے تو سطح قمر کی حرارت کم ہوجاتی ہے۔ زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل کی رنگین تصویریں لی گئیں اور اس طرح بہت سے جدید حقائق ان سیاروں کی بابت دریافت ہوئے

مقناطیس جدید

امریکہ کے ایک ڈاکٹر نے دو معدنی چیزوں کو ملاکر ایک تیسری دھات ایسی پیدا کی ہے جس سے برقی قمقموں کے تار بنائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مرکب نہایت شدید مقناطیسیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا ایک پونڈ وزن کا ٹکڑا ۱۳۰ پونڈ وزن کے لوہے کو اُٹھا سکتا ہے۔

حیرتناک سرعت حرکت

جاپان کے بیرن شیبا نے جو انجمن فنی پرواز کا ناظم ہے، ایک ایسا آلہ تصویر کھینچنے کا طیار کیا ہے جو ایک منٹ میں متواتر دو ہزار تصویریں لے سکتا ہے۔ اس آلہ کے ذریعہ سے جو تصویریں سنیما کے لئے لی جائیں گی اُن کو دکھانے میں بحساب دو ہزار تصویر بیس منٹ صرف ہوں گے اس آلہ کے ذریعہ سے ان افعال طبیعی کے بھی تصویر لی جاسکے گی جنکی اپنی سرعت کے لحاظ سے تصویر نہیں لیجا سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب انھیں تصاویر کو آہستہ آہستہ کر کے دکھایا جائیگا تو علماء ان مدارج و منازل کے تحلیل کر سکیں گے جو کسی حدوث طبیعی کے وقت پیدا ہوتے ہیں۔

رنگین تصاویر اور لاسلکی

اسوقت تک لاسلکی کے ذریعہ سے جو تصاویر منتقل ہوتی تھیں وہ صرف سیاہ و سپید خطوط کا مجموعہ ہوتی تھیں، لیکن اب ڈاکٹر کاروس نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے رنگین تصویریں بھی منتقل ہوسکیں گی۔

تاریخ عجیب

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جسے شیر محمد صاحب کاکوروی نے حضرت سلمان فارسی کے حالات و سوانح میں تحریر کیا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں حجام قوم کی بھی تحقیق کی گئی ہے کہ وہ کس قدر شریف اصلیت رکھتی ہے اور اس قوم کے موجودہ اوضاع و اطوار پر بھی تنقید کی ہے قیمت ۸ ملنے کا پتہ:- ایس۔ ایچ۔ شیر محمد مشین ساز نظیر آباد لکھنؤ۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴ جلد ۱۳ شمارہ ۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول عہ

فہرست مضامین جون ۱۹۲۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۳ | جون سنہ ۱۹۲۸ء | شمارہ ۶

ملاحظات

اس رسالہ کے ساتھ تیرہویں جلد نگار کی ختم ہوتی ہے ہرچند رسائل کے باب میں آغاز و انجام کوئی اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ کسی جلد کا ختم ہونا کسی منزل تک پہونچنا تو ہے نہیں کہ ٹھہر کر زرا دم لے لیا جائے، لیکن بعض حضرات چونکہ درمیان سے رسالہ کا مطالعہ پسند نہیں کرتے اس لئے اُن کی اطلاع کے لئے یہ لکھنا ضروری تھا۔

نگار کی گزشتہ جلد میں تنقیدی مضامین زیادہ شائع ہوے اور چونکہ تنقید ہمیشہ تعلقات کو ناخوشگوار بنا دیتی ہے، اسلئے حیرت کی بات نہیں اگر بعض لوگوں کو شکایتیں پیدا ہوگئی ہوں۔ لیکن اس کا تکلیف دہ منظر اگر کوئی ہوسکتا ہے تو یہ کہ نگار کی اس روش کو فرقہ دارانہ سمجھکر مجھپر یہ الزام قائم کیا گیا کہ میں شیعہ شعراء و مصنفین کی تنقیص کے لئے ایک خاص پروپگنڈا کر رہا ہوں اور ایک مخفی جماعت اس مقصود کے لئے ترتیب دے رہا ہوں۔ اتنے بڑے الزام کے ثبوت میں ایک مضمون تو وہ پیش کیا جاتا ہے جو غالب کے متعلق شائع ہوچکا ہے اور دوسرا آبحیات کی تنقید کا اور ممکن ہے اسی سلسلہ میں میرے اس نوٹ کو بھی شامل کر لیا جائے جو علی عباس حسینی کے ایک فسانہ پر شائع ہوا تھا۔ اور اگر اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے کہ "دشمن کا دوست دشمن ہوتا ہے"، تو نگار کے مومن نمبر کو بھی فہرست دلائل میں شامل کر لیجئے۔ الغرض تمام وضعی و غیر وضعی دلایل جو میری عصبیت کے ثبوت میں

پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ اور اس قدر ہیں۔ میں اس کو بھی تنگ نظری سمجھتا ہوں کہ اس نوع کی تنگ نظریوں کی طرف توجہ کروں، لیکن چونکہ میرے حلقۂ احباب میں شیعہ حضرات کی بھی کافی جماعت ہے، اور ان میں سے میں بعض کے خلوص و محبت کے لئے میں نہایت حریص ہوں، اس لئے اس قدر اظہار ضروری خیال کیا گیا۔

بہرحال مجھے اپنی صفائی میں زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو شخص مذہب کے باب میں اس قدر آزاد ہو کہ اعتقادات میں محض توحید اور عبادات میں صرف تصفیۂ اخلاق کو اسلام کے لئے ضروری خیال کرتا ہو اور جو مسلک و مذہب کی تفریق کو پوری طرح سمجھتا ہو، اس پر یہ الزام قائم کرنا کہ وہ تشیع و تسنن کے فرق کو پیش نظر رکھکر ادبی تنقید کرتا ہے، اتنا بڑا گناہ ہے کہ "لایقاس بہ ذنب"

بہرحال جو بات میرے نزدیک حق ہے اس کا اعلان ہمیشہ کرونگا، خواہ اس کے جواب دینے میں کوئی شخص کتنی ہی سخت غلطی میں کیوں نہ مبتلا ہو جائے۔

تذکرۂ آبحیات پر تنقیدی مضمون اس مہینے میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کی کامیابی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی نصف ہی مضمون شایع ہوا تھا کہ لوگوں میں بےچینی پیدا ہو گئی —— اور سب و شتم کا نام جواب رکھ کر ایک مختص بالجماعت پرچہ میں اُسے شائع کر دیا گیا۔ چونکہ جواب میں اصل اعتراضات سے اعراض کر کے صرف آبحیات کے انشاء کی تعریف میں زور قلم صرف کیا گیا ہے اس لئے لازم آیا کہ اب منشی محمد حسین آزاد کے معجزات ادب پر بھی روشنی ڈالی جائے اور بتایا جائے کہ آزاد کے جن مخصوص کارناموں کو وہ اس قدر "چمکتا ہوا" بتاتے ہیں، حقیقتاً "سونا" وہ بھی نہیں ہیں۔ آئندہ اشاعت کا انتظار کیا جائے۔

ایک فلسفی کا انجام والیٹر، فرانس کے مشہور فسانہ نگار کے ایک فسانہ کا ترجمہ ہے جو عربی سے لیا گیا ہے

دیوان یقین پر جناب سید محی الدین قادری زور کا مقالہ قیمتی چیز ہے۔ جناب اعظم کریوی نے اپنے فسانہ نگار میں اپنے مخصوص مدعا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ نقد الشعر سلسلہ کا مضمون ہے اور از بس کارآمد۔ ڈرامے کا ایک سین جناب احسن لکھنوی کا عطیہ ہے جو فن ڈرامہ نگاری میں خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ فلسفۂ مذہب کا سلسلہ جاری ہے اور ابھی رہیگا۔ لارڈ ریڈنگ کا عہد حکومت اس نمبر میں ختم ہو گیا۔ مسٹر بلنٹ کی جس کتاب کا یہ ترجمہ ہے وہ سیاسی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتی ہے اور ہر چند اس کا ترجمہ اب اتنے زمانہ کے بعد شائع ہونا کوئی برمحل امر تو نہیں ہے، لیکن کبھی نہ ہونے سے دیر میں ہو جانا ہی غنیمت ہے۔ ندوہ کی شرح مبادلہ پر ابو المنصور حمید کا مضمون مختصر ہے لیکن عام پبلک کے لئے ابھی ایسے ہی مبادیاتی مضامین کی ضرورت ہے۔ ڈائری کا ایک ورق ایک اور دلچسپ افسانہ کا آغاز کرتا ہے جو غالباً ماہ آئندہ میں ختم ہوگا۔ باب الاستفسار میں ایک ایسے مسئلہ کا آغاز ہوا ہے جو غالباً کئی ماہ تک جاری رہیگا۔

منظومات میں جناب حافظ غازیپوری کی نظم بہت کچھ کیفیات کی حامل ہے، کاش اس میں عاشقانہ عجز و نیاز کی سادگی بھی ہوتی روش صدیقی کی نظم پرستش خیال بھی ولولۂ شباب کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے لیکن اسمیں تخلیقی رنگ کی کمی ہے

ابن حزین کی نظم جو اسباب مخاصمت کی غیر شاعرانہ عنوان سے شائع ہوئی ہے، خوب ہے۔ اور ان کے پیغام شاعری کو بہت نمایاں طور پر ظاہر کر رہی ہے۔ نظیر لودھیانوی کے "حسیات" اس رنگ سے جدا نہیں ہیں جو اُن کی طبیعت کی خصوصیت ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ کچھ دن سے ان کے اشعار میں "تاثرات عشق" زیادہ پائے جانے لگے ہیں اور بجائے اس کے کہ وہ دوسروں کو کوئی درس دیں خود اپنی جراحت کا اعلان زیادہ کرتے ہیں۔

غزلوں کے بھی بعض بعض شعر بہت اچھے ہیں۔

تذکرۂ ظرفاء کے متعلق جو اعلان منیجر کی طرف سے شائع ہو رہا ہے اس کے متعلق ممکن ہے کہ بعض حضرات کو غلط فہمی پیدا ہو جائے اس لئے میں ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ تذکرہ مکمل ہو چکا ہے، کتابت شروع ہو گئی ہے اور جلد سے جلد اس کو شائع کر دیا جائے گا لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جلد سے جلد کے معنی بھی لیتھو پریس کی دنیا میں مہینوں ہوا کرتے ہیں، اس لئے جو حضرات پیشگی روپیہ روانہ کریں وہ یہ سمجھکر بھیجیں کہ ابھی کئی مہینے تک اُن کو تذکرہ کا انتظار کرنا پڑیگا۔ بہر حال اگر وہ چند ماہ کا انتظار کر سکتے ہیں تو اس میں شک نہیں کہ اسوقت دو روپیہ بھیجدینے سے اُن کو ایسی کتاب ملیگی جو بعد تکمیل کسیطرح چار پانچ روپیہ سے کم میں فروخت نہ ہوگی۔

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں مدیر سچ (جناب عبدالماجد صاحب دریابادی) کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا اس پر آخر کار اخبار سچ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۲۵ء میں ۲½ کالم کا ایک نوٹ شائع ہو ہی گیا ہرچند کہ اُدھر جناب عبدالماجد صاحب "رسالہ نگار کی زیارت سے علی العموم محروم رہتے ہیں" اور ادھر میں "اخبار سچ کی زیارت سے علی الخصوص محروم رہتا ہوں" لیکن پھر بھی رسالہ نگار کو اُنھوں نے اور سچ کو میں نے دیکھا اور اس طرح بحمد اللہ آخر کار "کفر و اسلام" کا تصادم ہو ہی گیا۔

حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

فاضل مدیر نے جس لطف کے ساتھ میرے کفر و الحاد، میری ضلالت و گمراہی کا ذکر فرمایا ہے، اس کی داد اس دنیا میں تو انہیں مل نہیں سکتی اور عاقبت کی خبر خدا جانے صاحب موصوف نے کنایتہً اس سے بھی انکار کیا ہے کہ وہ خواجہ حسن نظامی کے مضمون فرام قبلہ تو شملہ سے متاثر ہوئے ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو کیونکہ میں نے بھی محض سماعت کی بنا پر لکھا تھا۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی تو بظاہر کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ فلسفی شاہ کا لقب بھی بہر حال ان کو اسی دربار سے ملا تھا جسے خاموشی سے قبول کر لیا گیا۔

نیاز

تذکرۂ آبحیات پر ایک ناقدانہ نظر

(بسلسلۂ نگار ماہ مئی ۱۹۲۸ء)

میر سوز

آزاد لکھتے ہیں کہ یہ وہی شخص ہیں جنہیں میر تقی نے پاؤ شاعر مانا ہے۔ یہ وہی لطیفہ ہے جسے آزاد نے نہایت فرصت میں تراشا ہے اور میر درد، سودا وغیرہ کے بارہ میں جگہ جگہ لکھا ہے ورنہ غریب میر نے تو اپنے تذکرہ میں ان کی نسبت یہ لکھا ہے "میر تخلص جوانے است بسیار اہل خوش طبع۔ ہرچند طرز علیحدہ دارد لیکن از خود کردن تخلص من نصف دلم از و خوش ست" یہ غلط بیانی میر صاحب پر ایک بہتان صریح ہے۔

آزاد نے لکھا ہے کہ شاہ عالم کے زمانہ میں جب اہل دہلی کی تباہی حد سے گزر گئی تو ۱۱۹۱ھ میں لباس فقر اختیار کرکے لکھنؤ چلے گئے۔ یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ میر سوز پہلے نواب مہربان خاں رند کے یہاں فرخ آباد گئے۔ اور وہاں زمرۂ مصاحبین میں داخل ہوئے یہی وجہ ہے کہ نواب کی استادی میں انکا بھی نام لیا جاتا ہے اور نواب کا انتقال ۱۱۸۵ھ میں ہو چکا تھا۔ آزاد کو گلزار ابراہیمی کے تذکرہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ میں مقیم تھے۔ اسی پر قیاس کرکے انھوں نے یہ کہدیا۔ ورنہ اصل یہ ہے کہ ان کے جانے کے متعلق معلوم نہیں کہ کب وطن سے گئے تھے۔

آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ چلے گئے مگر وہاں سے ۱۲۱۲ھ میں ناکام مرشد آباد گئے۔ یہ بھی بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ ۱۱۹۱ھ سے ۱۲۱۲ھ تک اکیس برس کی مدت ہوتی ہے ———— کیا وہ اکیس برس تک ناکام تلاش معاش میں پھرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ جب لکھنؤ پہونچے تو آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ مگر یہاں سے انکا جی گھبرایا تو مرشد آباد گئے جب دوبارہ واپس آئے تو آصف الدولہ ان کے شاگرد ہوگئے

ان کی شاعری کے بارہ میں آزاد لکھتے ہیں کہ انھوں نے غزل کے سوائے کچھ نہیں کہا۔ پھر انہیں کے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے لکھتے ہیں کہ ۱۲ سطر کے صفحہ سے ۳۰۰ صفحہ کا کل دیوان ہے۔ اسمیں سے دو سو اٹھاسی صفحہ غزلیات۔ باقی مثنوی۔ رباعی مخمس کہنے والا اس تھوڑی سی کائنات کو دیکھکر کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کا ذخیرہ بھی کافی تھا۔ مگر وہ انقلاب عالم کی زد میں آگیا اور محفوظ نہیں رہ سکا۔

آزاد میر سوز کی وفات ۱۲۱۳ھ میں لکھتے ہیں اور ستر برس کی عمر بیان کرتے ہیں حالانکہ یہ بات مختلف فیہ ہے۔ بیل صاحب اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ۱۲۱۳ھ میں بعمر اسی سال وفات پائی۔ نساخ کا بھی یہی قول ہے۔ نساخ ان کی جائے وفات لکھنؤ بتاتے ہیں۔ تذکرہ فیروز ۱۲۱۳ھ کی تائید کرتا ہے۔

آزاد، میر سوز کے تخلص کے بارہ میں بھی عجیب وغریب فضول اور مہمل روایات بیان کرتے ہیں اور مشاعرہ میں سوز کی

دریدہ دہنی کا ذکر کرتے ہیں مگر یہ سب باتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ جلسہ میں کسی نے باآواز بلند پوچھا کہ آپ کا تخلص کیا ہے تو انھوں نے فرمایا کہ صاحب قبلہ فقیر نے تخلص تو میر کیا تھا مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کمال کے سکے میرا نام روشن نہ ہوسکے گا۔ ناچار سوز تخلص کیا۔ یہ ایک روایت ہے جس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ پہلے میر تقی میر نے یہ تخلص اختیار کیا تھا جیسا کہ وہ خود اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ:-

از خود تخلص من منفعلم از در خوش است۔ یعنی چونکہ میرا تخلص انھوں نے رکھ لیا اس لئے میں ان سے کچھ ناراض ہوں

اہل تذکرہ کے بالاتفاق لکھا کہ میر سوز کے پڑھنے کا ایک خاص اسلوب تھا۔ مگر آزاد نے جو کچھ اس کے متعلق لکھا ہے وہ صرف اُن کی خوش بیانی ہے۔

میر تقی میر

آزاد لکھتے ہیں کہ میر صاحب سراج الدین علیخاں کے بھانجے تھے مگر اس طرح کہ جب اُن کی والدہ مرگئی تھیں تو اُن کے والد نے دوسرا عقد خان آرزو کی بہن کے ساتھ کیا تھا۔ یہ بالکل غلط ہے بلکہ معاملہ برعکس ہے پہلے خان آرزو کی بہن سے شادی ہوئی تھی بعد کو میر تقی میر کی والدہ سے۔ اس لئے کہ میر صاحب اپنی سوانحعمری ذکر میر میں لکھتے ہیں۔ کہ نادر شاہ کے حملے کے بعد پھر دہلی گیا اور اپنے بڑے بھائی کے ماموں (یا خالو) سراج الدین علی خاں آرزو کا منت کش ہوا۔ ظاہر ہے کہ اگر خان آرزو کی ہمشیرہ سے ان کی والدہ کے مرنے کے بعد نکاح ہوتا تو وہ یعنی حافظ محمد حسن جنکا ذکر میر میں کئی جگہ تذکرہ ہے، ان سے بڑے کیونکر ہوتے دوسری جگہ لکھتے ہیں" باپ کے مرنے کے بعد دلی میں آئے اور خان آرزو کے پاس انھوں نے اور اُن کی شاعری نے پرورش پائی مگر خانصاحب حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ۔ اس پر نازک مزاجی غضب "غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہوگئے۔ یہ واقعہ بالکل غلط ہے کسی مسئلہ وغیرہ پر کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ بلکہ میر صاحب نے ذکر میر میں خود یہ واقعہ لکھا ہے کہ ——— بھائی محمد حسن کا خط خان آرزو کے پاس اس مضمون کا پہونچا کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے ہرگز اس کی تربیت میں سعی نہ کیجائے وہ عزیز (آرزو) واقعی دنیا دار شخص تھا اپنے بھانجے کے لکھنے پر میرے درپے آزار ہوگیا جب کبھی ملاقات ہوجاتی تو برا بھلا کہتا اور طرح طرح کی تکلیفیں پہونچانے کی کوشش کرتا رہتا۔ اور دشمن کی طرح میرے ساتھ پیش آتا تھا" واقعہ صرف اتنا ہے جسے آزاد نے مذہبی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ صرف خانگی معاملات تھے جن کو اس قدر اہم بنا دیا۔ مگر یہاں بھی یہ شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ شاید اسی تعصب کی بنا پر انکی دل آزاری کی گئی ہو۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے میر صاحب عاشق مزاج تھے۔ یہی اوائل جوانی کی عشقبازی اُن کے بھائی کو آوارگی معلوم ہوتی تھی اور وہ ان کی اس حالت سے نہایت خفا تھے۔ ان کے عشق کا حال تذکرۂ بہار بیخزاں سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ میر صاحب کے بدنام اور رسوا ہونے کا ذکر یوں کرتے ہیں "بہ شہر خویش باپری تمثالے کہ از عزیزانش بود، در پردہ تعشق و میل خاطر داشت۔ آخر عشق او خاصۂ مشک پیدا کردہ میخواست کہ بخیہ بکار رسوائی رسوائی میکند۔ حسن بے پردہ جلوہ گری درآید از ننگ افشائے راز وطن اقربا با دل بغل پروردۂ حیرت و حرماں و با خاطر ناشاد دست و گریبان قطع رشتۂ حب وطن ساختہ از اکبرآباد از خانہ برا نداز بہا بہ شہر لکھنؤ رسید" واقعہ دراصل یہ تھا۔ مگر آزاد کہیں سے کہیں پہونچ گئے۔

آزاد تذکرۂ شورش اور بزرگوں کی سنی سنائی باتوں اور سودا کے اس قطعہ کی جو ان کے کلیات میں نہیں ہے شبہ میں پڑتے
ا کہ میر صاحب دراصل سید تھے یا نہ تھے۔ خود ہی اس شبہ کو مستحکم کرتے ہیں اور خود ہی ان کی سیادت کی توثیق فرماتے ہیں یہ
ب واقعہ ہے ——— ذکر میر میں میر تقی کے والد کے نام کے ساتھ ہر جگہ میر عبداللہ لکھتے ہیں اور بیٹے کے
ہ کے ساتھ بھی میر شامل فرماتے ہیں جن کا نام میر فیض علی بتایا گیا ہے۔ مگر میر صاحب اپنے والد کا نام میر علی متقی اور بیٹے
یر عسکری لکھتے ہیں۔ اس سے آزاد کے شبہ کا دفعیہ ہوتا ہے لیکن باپ اور بیٹے کے ناموں کی تحقیق باطل ہو جاتی ہے۔

آزاد ۱۱۹۰ھ میں اُن کا جانا بیان کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ لکھنؤ میں پہونچکر جیسا مسافروں کا دستور ہوتا ہے ایک سرائے
ں اترے۔ معلوم ہوا کہ یہاں آج ایک مشاعرہ ہے رہ نہ سکے اور اسیوقت ایک غزل لکھی اور مشاعرہ میں جاکر شامل ہوئے"
اقعہ سرتاپا غلط ہے۔ ذکر میر میں خود میر صاحب نے اس کو اس طرح بیان کیا ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ میں دلی سے بہت دل برداشتہ
اور چاہتا تھا کہ کہیں چلا جاؤں۔ کہ نواب آصف الدولہ بہادر کو میرا خیال ہوا کہ اگر میرے پاس میر آجائے تو اچھا ہے۔ چنانچہ میرے
نواب سالار جنگ پسر اسحٰق خاں موتمن الدولہ سے جو وزیر اعظم کے خالو تھے کہا چونکہ ان کے میرے خالو سے قدیم تعلقات تھے اسواسطے
دں نے کہا کہ اگر نواب زادہ راہ دیں تو میر یہاں آجائے۔ انھوں نے حکم دیا اور خرچہ دیا۔ تا اینکہ یہ حکم مجھے پہونچا۔ میں تنہا دلی
نہ ہوا۔ فرخ آباد پہونچا اس وقت یہاں مظفر جنگ برسر حکومت تھے۔ انھوں نے ٹھہرایا میں نہ ٹھہرا اور لکھنؤ آیا۔ سب سے پہلے سالار جنگ
یہاں پہونچا اور انھوں نے بڑی عزت کی اور جو کچھ مناسب خیال کیا نواب کو اس کی اطلاع دیدی۔ چار پانچ روز بعد اتفاقاً نواب
دں کی لڑائی دیکھنے آئے میں بھی وہاں تھا ملا۔ نواب نے از روے فراست مجھے پہچان لیا اور کہا کہ تم میر تقی میر ہو میں نے
اب دیا تو نواب بغلگیر ہوے۔ اس کے بعد شاہی قیام گاہ پر پہونچے اور مجھے ساتھ لے گئے۔ اپنی غزل سنائی۔ سبحان اللہ کیا کہنا
م الملوک ملوک الکلام۔ مجھ سے کلام سنانے کی فرمائش کی میں نے بھی ایک غزل کے چند شعر سنائے جب رخصت ہونے لگا تو سالار جنگ نے نواب
، کہا کہ اب حسب الحکم میر صاحب آگئے ہیں جیسا کچھ ارشاد ہو نواب صاحب نے فرمایا کہ دو تین روز میں کچھ مقرر کرکے اطلاع دیدوں گا
ین روز بعد میں نے نواب کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا۔ اور پھر میں مقرر ہو گیا اور ہمیشہ نواب صاحب مجھ پر مہربانی فرماتے رہے۔
، آپ خیال فرمائیے کہ کہاں آزاد کی یہ ہزیاں سرائی کہ خرچہ پاس نہ تھا تو ایک شخص کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور ادا ۔ نے
ہیں کیں تو میر صاحب خفا ہو گئے اور لکھنؤ میں گئے سرائے میں اترے اور مشاعرہ میں گئے اور قطعہ پڑھا۔ اور پھر نواب کو خبر ہو گئی۔ اور
سو روپیہ ماہوار مقرر کر دئے اور پھر غزل کی فرمائش کی اور پھر دوسرے روز غزل کا تقاضہ کیا تو میر صاحب نے کہا کہ جناب عالی مضمون
ام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں ہیں۔ مچھلیوں کے کھیل تماشے پر نواب سے برہمی اور پھر درباری تعلقات سے انقطاع۔ اور پھر
ب نے انہیں بازار میں بلایا تو کہا بازار میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ جنہیں آزاد نے آبحیات میں خوب
مرچ لگا کر بیان کیا ہے کہاں تک صحیح ہیں۔

آزاد نے لکھا ہے کہ نواب نے ان کی تنخواہ بند کر دی تھی۔ یہ واقعہ بھی بالکل غلط ہے۔ مرزا علی لطف اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں

"اگرچہ گرفتہ مزاجی سے اُن کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہوا - اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج تک کہ ۱۲۱۵ھ ہے وہی حال ہے" ظاہر ہے کہ جب یہ واقعہ غلط ہے تو انشا کا جانا اور دعوت کا روپیہ لیجانا - اور بلانا وغیرہ یہ سب باتیں بادر ہوا ہوں گی -

آزاد کہتے ہیں کہ امرا کی تعریف میں قصیدے نہ کہنے کا یہ بھی سبب تھا کہ توکل اور قناعت انہیں بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے میر صاحب کے یہاں آصف الدولہ بہادر کی مدح میں قصیدے موجود ہیں - رہا توکل اور قناعت اگرچہ ایسے باکمالوں کا شیوہ بھی ہے مگر میر صاحب تا حد مقدور امرا کی صحبتوں میں رہے ہیں اور برابر مصاحبین کے فرائض ادا کرتے رہے ہیں - تذکرۂ میر کو اٹھا کر دیکھئے اُس سے یہ سب حال آئینہ ہوجاتا ہے -

آزاد نے میر صاحب کو مخمس کا موجد قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ میر صاحب کے یہاں واسوخت دو ہیں اور کچھ شک نہیں کہ لاجواب ہیں - اہل تحقیق نے فغانی و وحشی کو فارسی میں اور اردو میں انہیں واسوخت کا موجد تسلیم کیا ہے - اس بات سے انکار نہیں کہ میر صاحب کے یہاں واسوخت نہایت عمدہ ہیں مگر عمدگی کے یہ معنی نہیں کہ وہ موجد بھی مانے جائیں - چنانچہ اس بات سے انکار کرنا محال ہے کہ موجودہ طرز کا واسوخت صرف ایک مسدس ہے - مگر یہ تعین دشوار ہے کہ مسدس کے موجد میر صاحب تھے - یا اور کوئی

آزاد نے میر صاحب کی تصنیف نکات الشعرا پر عجیب طریقہ سے نگاہ ڈالی ہے اور اس کو ایک ہوا بنا کر پیش کر دیا ہے جس سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے صرف سنی سنائی باتیں لکھی ہیں اور اس تذکرہ کو وہ دیکھ نہیں سکے - لکھتے کہ دیباچہ میں میر صاحب نے یہ لکھا ہے - کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے - اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا - مگر اُن کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو - ان ہزار میں ایک بچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا - دلی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے اس کے حق میں فرماتے ہیں "وے شاعر یست از شیطان مشہور تر" یہ اور اس قسم کی بہت سی باتیں آزاد نے اس تذکرہ کے متعلق لکھی ہیں - مگر آج پردہ اٹھ گیا اور تذکرہ ہماری نظر کے سامنے ہے - نہ تو اس میں یہ لکھا ہے کہ اس میں ایک ہزار شاعر کا ذکر لکھوں گا - نہ یہ ہے کہ اُن کو نہیں لکھوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو - بلکہ نہایت فراخ دلی سے کام لیا گیا ہے - کل سوسوا شاعروں کا حال ہے - جیسیں ایسے بھی ہیں جن کا صرف نام ہے کلام ہے باقی کچھ حال نہیں - ایسے بھی ہیں جن کی بابت کچھ یونہی سا حال اُن کو معلوم ہے اور صاف صاف لکھ دیا ہے کہ مجھے اُن کی حالت سے کچھ اطلاع نہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں کہ جنہیں میر صاحب یہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ اوباش تھے - شعر و شاعری سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا - مگر چونکہ شاعر تھے اس واسطے ان کا ذکر ضرور کیا گیا ہے - ان کی مثال میں عطا جعفر زٹل وغیرہ کو پیش کیا جا سکتا ہے رہا آزاد کا یہ فقرہ کہ ہزار میں سے ایک بچارہ بھی طعن و تشنیع سے نہیں بچا یہ بالکل غلط ہے حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب نے تذکرہ نویسی کا حق ادا کیا ہے - ادنیٰ ادنیٰ شعرا کی تعریفیں اس میں موجود ہیں - جس سے ان کے انکسار مزاج کا پورا حال معلوم ہوتا ہے - بعض بعض جگہ بے تعصبانہ نہایت مہذب طریقہ سے بے لاگ رائیں بھی دی ہیں - چنانچہ خاکسار - ثاقب - شیخ حاتم - انعام اللہ یقین - تابان - میر علی نقی - وغیرہ کے حال پڑھنے سے یہ حقیقت آئینہ ہوجاتی ہے اور اس وقت آزاد کے مندرجہ بالا فقرہ کا حال

لکھتا ہے انھوں نے کس قدر زیادتی کی ہے۔ ولی کے فقرے کی بابت ولی کے بیان میں ہم لکھ چکے ہیں اعادہ و تکرار بیکار ہے۔

آزاد لکھتے ہیں کہ سب تذکرے نالاں ہیں کہ اگر یہ غرور اور بے دماغی فقط امرا کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی۔ افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی ان کو دکھائی نہ دیتے تھے۔ اس بات کا حال صحیح طریقہ سے اسی شخص پر کھل سکتا ہے جس نے میر صاحب کے تذکرے نکات الشعرا کو دیکھا ہو جہاں میر صاحب نے بلا امتیاز تخصیص نہایت فراخ دلی سے ہر اچھے کہنے والے کی داد دی ہے کتنا بڑا ظلم ہے آزاد کا یہ لکھنا کہ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔

اسی طرح میر قمر الدین منت اور سعادت یار خان رنگین کی شاگردی کا قصہ بھی آزاد کی جولانی طبع کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ قمر الدین منت گو میر صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے مگر پھر بھی ان کے معاصر ضرور تھے وہ میر نور الدین نوید اور میر شمس الدین فقیر کے شاگرد تھے۔ اور رنگین شاہ حاتم کے شاگرد تھے جیسا کہ ان کی مجالس رنگیں سے معلوم ہوتا ہے

آزاد نے سودا۔ خواجہ میر درد اور سوز کی شاعری کے متعلق لکھا ہے کہ میر درد کو آدھا اور سوز کو پاؤ شاعر مانتے تھے اس کا ذکر ہر ایک کے بیان میں آچکا ہے اب اعادہ بیکار ہے۔

اسی طرح نواب سعادت علی خاں کے عہد میں بھی دربار سے علیحدگی وغیرہ کے حالات مشکوک ہیں گو ان کی صحبت نواب سے اچھی طرح سر بر نہ ہوتی تھی پھر بھی علیحدگی وغیرہ کا حال کہیں نہیں ملتا جیسا کہ ہم تذکرۂ لطف کا حوالہ دیتے ہوئے اس سے پہلے لکھ چکے ہیں۔ کہ ۱۲۱۵ھ تک ان کی تنخواہ جاری تھی۔ جس کے بعد وہ دس سال تک زندہ رہے ——— آزاد نے میر صاحب کے دو تین شعر عطار کے لونڈے کے دیوان میں دیکھکر محلہ میں ایک عطار بھی پیدا کر دیا ہے اور اس کے لڑکے کو بنا سجا کر گزرگاہ نظر پر لا رکھا ہے مگر اسکا کوئی ثبوت ہم نہیں پہونچتا ان کی عادت ہے کہ جہاں کوئی شعر اپنے مطلب کا پاتے ہیں اس سے کام ضرور لے لیتے ہیں اور ایک گورکھ دھندا بنا کر پیش کر دیتے ہیں جسکے سلجھانے میں دوسرے تذکروں قیاس اور تاریخ کی ضرورتیں پیش آتی ہیں۔

غرضکہ میر صاحب کے تذکرہ میں آزاد نے جہاں تک ہو سکا ہے قیاس۔ افترا اور دروغ بیانی سے کام لیا ہے اور اسکے دیکھنے والوں کے واسطے ایک خوان نمکین تیار کر دیا ہے۔ اور بہت سے چھوٹے واقعات ایسے ہیں جن سے آزاد کی اس فطرت اہتمام پسند کا پتہ چلتا ہے لیکن ان سب کا استقصا کون کرے۔

جرأت آزاد نے انکا اصلی نام یحیٰی اماں لکھا ہے حالانکہ میر حسن۔ شیفتہ۔ نساخ۔ جنمیں سے حسن اور شیفتہ اُن کے دیکھنے والوں میں ہیں کوئی سوائے قلندر بخش کے جرأت کا نام نہیں جانتا۔ مگر آزاد معلوم نہیں کس بنا پر اصلی نام یحیٰی اماں بتاتے ہیں۔

متعدد تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں چیچک کے عارضہ میں جاتی رہی تھیں۔ آزاد نے بھی اول میں یہی لکھا ہے مگر خدا جانے کس خیال سے مجبور ہو کر انہیں پھر بزرگوں کی بیان کی ہوئی حکایت یاد آئی ہے اور لکھا ہے کہ۔ مشہور کہتے ہیں کہ "پہلے وہ اصلی اندھے نہ تھے بعض ضرورتوں سے کہ شوخی عمر کا مقتضا ہے خود اندھے بنے رفتہ رفتہ اندھے ہی ہو گئے" یہ حکایت ایسی ہے

کہ اسکا اعتبار عقلاً و نقلاً کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ گلشن بیخار میں لکھا ہے کہ "نیک و بد زمانہ کمتر دیدہ چشم از نظارہ بر بست" نساخ لکھتے ہیں کہ "انیس برس کی عمر میں چیچک کے عارضہ سے انکی بصارت زائل ہو گئی" آزاد نے ان کو نہایت ہی اوباش مزاج بنا کر پیش کیا ہے مگر میر حسن جو ان کے دیکھنے والے ہیں لکھتے ہیں "دریں نوجوانی بسیار بحلم و حیا بسر مے برد خدا اش سلامت دارد" آزاد نے اسیطرح لکھا ہے کہ میر تقی میر نے ان کی شاعری پر یہ رائے دی تھی کہ تم شعر تو کہہ نہیں سکتے ہو اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو۔ یہ فقرہ بھی آزاد کی تصنیف ہے کیونکہ سوائے آبحیات کے کسی اور تذکرہ میں اس کا پتہ نہیں چلتا ——————— دوسرے لطائف بھی قریب قریب ایسے ہی ہیں جسپر آزاد نے بھی عدم توثیق کا شبہ کیا ہے

میر حسن آزاد نے لکھا ہے کہ میر حسن نے خواجہ میر درد۔ اور مرزا رفیع سودا کو غزلیں دکھائیں اور ان کے شاگرد رہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ میر حسن ضیاء کے شاگرد تھے جب ان سے ان کی طرز نبھ نہ سکی تو مجبوراً ان بزرگوں کے رنگ میں کہنا شروع کیا جیساکہ وہ خود اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "اصلاح سخن از میر ضیاء سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز اوشاں از من کما حقہ سرانجام نیافت۔ بر قدم دیگر بزرگاں مثل خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر تقی میر نوو م" اس میں شک نہیں کہ اتباع بھی ایک قسم کی شاگردی ہے مگر صریحاً شاگرد لکھنا واقعات کو غلط کرنے سے کم نہیں ہے۔ آزاد نے لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے والد سے بھی اصلاح لی یہ بالکل غلط ہے۔ چنانچہ حسن میر ضیا کے بیان میں لکھتے ہیں کہ "اکثر شاعران آن دیار (عظیم آباد) اصلاح سخن از میر موصوف میگیرند بندہ ہم استفادہ سخن آزاں بزرگوار حاصل نمودہ استاد فقیر مولف کتاب ہمان است" حسن اوائل شباب میں دہلی سے نکلے تھے اس حالت میں کیونکر مانا جائے کہ میر درد سے انھوں نے اصلاح لی ہوگی۔

آزاد نے دوسرا ستم یہ کیا کہ کلام کی نایابی اور عدم دستیابی کیوجہ سے حسن کے کلام میں دوسرے حسن کا کلام شامل کرکے پیش کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ غزل ؎

وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا
کھڑا اُسپہ میں جان وارا کیا

چار شعر کی ہے جو آبحیات میں درج ہے مگر در اصل یہ میر حسن کی غزل نہیں ہے بلکہ خواجہ حسن خلف خواجہ ابراہیم جو غیاث الدین مودودی کی اولاد میں تھے اور جعفر علی حسرت سے اصلاح لیتے تھے اس کے مصنف ہیں۔ خواجہ حسن لکھنؤ کے رہنے والے تھے بخشی طوائف سے تعلق تھا اور مقطعوں میں بہ التزام بخشی کا نام لاتے تھے۔ چنانچہ اس غزل کے مقطع میں بھی وہی نام ہے ؎

کیا قتل اور جاں بخشی بھی کی
حسن اس نے احساں دوبارا کیا

جرأت کے بڑے دوستوں میں تھے۔ چنانچہ جرأت نے ایک مثنوی خواجہ اور بخشی کے معاشقہ کے بیان میں کہی ہے۔ یہ غزل نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے خواجہ حسن لکھنوی ہی کے نام سے لکھی ہے۔ میر حسن کے دیوان میں اس غزل کا کہیں پتہ نہیں۔ آزاد نے میر حسن کا حلیہ بیان کرتے ہوئے ان کا قد میانہ لکھا ہے۔ مگر وہ ایک طویل القامت شخص تھے جیساکہ تذکرہ گارسن ڈیٹاسی میں مذکور ہے۔

سید انشاء اللہ خان آزاد نے میر انشاء اللہ خاں کی بابت جو لطائف لکھے ہیں اس کے لئے تو کچھ لکھنا بیکار ہے اسواسطے کہ لطیفہ تو

لطیفہ بھی ہے اور اسمیں غلطیاں نکالنا ایک فضول سی بات ہے۔ البتہ دو تین باتیں ایسی ہیں جن کا لکھنا ضروری ہے اور جنپر آزاد نے ضرورت سے زیادہ اپنے زور بیان کو صرف کر دیا ہے۔ مصنف تذکرۂ گلشن بیخار نے انشا کی نسبت جو بے لاگ رائے دی ہے وہ یہ ہے کہ "دیوانے دارد مشتمل بر اضناف سخن و ہیچ صنف را بطریقۂ راسخہ شعرا نہ گفتہ"۔ ظاہر ہے کہ انشا کے یہاں اکثر اصناف سخن موجود ہیں مگر ان کی شوخی طبع اور ہزالی سب میں اپنا کام کر رہی ہے انتہا یہ کہ تصوف جسمیں انھوں نے مثنوی شیر و برنج لکھی ہے اس میں بھی وہی رنگ ہے جس کا آزاد کو بھی اقرار ہے لکھتے ہیں کہ تصوف کو تمسخر کر دیا ہے۔ دوسری جگہ آزاد نے خود بیتاب کا قول بھی نقل کیا ہے جو یہ ہے کہ سید انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھو یا۔ اور شاعری کو نواب سعادت علی خان کی مصاحبت نے ڈبو یا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی وہ لکھتے ہیں کہ "نواب مصطفےٰ خاں کا گلشن بیخار جب دیکھتا ہوں تو خار نہیں کٹار کا زخم دل پر لگتا ہے" یہ بالکل کھلی ہوئی عصبیت ہے جو انصاف اور حقیقت پر پردہ ڈال رہی ہے۔ حالانکہ خود آزاد بھی —————— ایک جگہ لکھتے ہیں "مگر عالم یہ ہے کہ ابھی کچھ ہیں ابھی کچھ ہیں۔ جو غزلیں یا غزلوں میں شعر با اصول نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی وہاں ٹھکانا نہیں۔ غزلوں میں غزلوں کی اصول کی پابندی نہیں"۔ ایک جگہ ضمناً ریختی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ریختی کا شوخ رنگ سعادت یار خاں رنگیں کا ایجاد ہے مگر سید انشا کی طبع رنگیں نے بھی موجد سے کم سگھڑاپا نہیں دکھایا ہے"۔

آزاد کی اس رائے میں بھی بڑا کلام ہے۔ رنگین کو ریختی کا موجد کہنا آزاد ہی کی ایجاد ہے ورنہ اصل واقعہ نہیں ہے خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم میں ریختی کے متعلق یہ عبارت ہے کہ بعض کے نزدیک اس کا مخترع رحیم معاصر رحمان دہلی ہے جس کے یہ دو شعر ہیں ؎

ارے نادان تیں اپنے سجن کو کیوں رُٹھایا ہے　　رُٹھا کر پیو کو جگ میں کسی نے ذوق پایا ہے

بہت پچھتائگی میری نصیحت مان کہتی ہوں　　سکھی کو رات سوہی ہے پیارے کو جو بھایا ہے

تذکرۂ شعرائے دکن میں آصفی ملکاپوری نے۔ نیز تذکرہ دکن میں اردو، وغیرہ میں ہاشمی بیجاپوری کے جو انشا اور رنگین سے صدیوں پہلے کے شاعر ہیں یہ دو شعر لکھے ہیں ؎

رضا گر مجھکو دیتی ہے کرونگی گھر میں جا دارو　　اگر مجھ ہو دیگی فرصت سحر پھر آنگی چھوڑ دو

اگر کوئی آکے دیکھیگا تو دل میں کیا کہیگا وہ　　مجھے بدنام کیا کرتے کہیں بن جانگی چھوڑ دو

شعر الہند میں مولوی عبد السلام نے لکھا ہے "کہ مولانا ہاشمی کے بعد سید محمد قادر ایک باکمال شاعر گزرے ہیں جو غالباً ولی کے ہمعصر تھے اُن کا تخلص خاکی تھا اور ان کا مکمل دیوان ۱۱۸۲ھ کا لکھا ہوا مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کے کتبخانہ میں موجود ہے اسمیں دو ایک ریختیاں بھی ہیں جو ہندی شاعری کا نمونہ ہیں"۔ ان تمام اسناد سے معلوم ہوتا ہے کہ موجد ریختی کے نہ انشا ہیں نہ رنگین بلکہ کوئی اور ہے صابر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "دیوان دوم کے دیباچہ میں (رنگین نے) ریختی کو اپنا ایجاد بیان کیا ہے۔ راقم کے عندیہ میں تو ادعائے محض ہے"۔

سید انشا اپنے طرز کی وجہ سے سخن سنجوں کی نظر میں بیحد سبک ہوگئے ہیں اس لئے آزاد نے چند فقرے لکھکر اس طرح اس

داغ بدنامی کو دور کرتے ہیں": لوگ کہتے ہیں کہ سید انشار کا کلام رندانہ ہے اور جو اس منزل میں ہزل ہے نہ بقدر نمک ہے بلکہ غذا کی مقدار سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے مگر اس کا سبب یہ ہے کہ حاکم وقت جابر ہے اور پسند عام اس کا واضع قانون ہے اوس وقت شاہ وامراسے لیکر گدا ارغریب تک انہیں باتوں سے خوش ہوتے تھے" آزاد کا یہ لکھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ انشار دو درباروں سے وابستہ رہے۔ ایک شاہ عالم۔ دوسرے سعادت علی خان ان دونوں بادشاہوں کے حالات مفصل لکھنے کی گنجایش نہیں مگر دیکھیے تو معلوم ہوجائے گا کہ دونوں نہایت متین اور بیحد مہذب تھے۔ بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ سعادت علی خان کے دربار سے علحدگی کا سبب اُن کا رندانہ مذاق ہی ہوا تھا۔ چنانچہ آگے چلکر ہم بیان کریں گے۔ اصل یہ ہے کہ انشا خود ایک رند لاابالی تھے جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ اور جو جی میں آتا تھا کہتے تھے۔ آزاد کے حاشئے چڑھانے سے بدنامی کا داغ ان کے دامن سے دور نہیں ہوسکتا۔

——— اگر آزاد کا لکھنا صحیح ہوتا تو میر و مرزا۔ مصحفی و منت وغیرہ جو اس وقت کے اکابر شعرا میں سے تھے سب کا کلام ایسا ہی کیوں نہ ہوتا۔ خود آزاد لکھتے ہیں: "مثلاً اکثر میلوں تماشوں میں چلنے کے لئے کچھ احباب کا تقاضا کچھ ان کی طبیعت اصلی کا تقاضہ غرض انہیں جانا ضرور اور یہ سعادت علی خان کی طبع کے بالکل مخالف۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ اپنے کاغذات دیکھ رہے ہیں مصاحبوں کے ساتھ یہ بھی حاضر ہیں اس میں ایک آدھ لطیفہ بھی ہوجاتا انھوں نے عرض کی حضور غلام کو اجازت ہے وہ بولے کہ ہوں۔ کہاں انھوں نے کہا حضور آج آٹھوں کا میلا ہے۔ انھوں نے کہا لاحول ولا قوۃ "ایسی ایسی باتیں بعض موقع پر نواب کو موجب تفریح ہوتی تھیں بعض دفعہ بمقتضائے طبیعت اصلی مکدر ہوجاتے تھے"۔

آزاد نے انشا کی دیوانگی کے متعلق نہایت غمخواری اور درد کے ساتھ ایک لمبی چوڑی روایت بیان کی ہے مگر وہ بھی غلط ہے کسی دوسرے تذکرے سے اسکی تائید کیا اور تردید ہوتی ہے۔ چنانچہ مصنف حیات دبیر نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو میر انشار اللہ خاں کے نواسے تھے۔ کہ سید انشا نہ مجنون ہوئے نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علی خاں نے حکم دیدیا تھا کہ وہ سوائے دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں اور دربار میں بھی اس وقت حاضر ہوں جب اُن کو بلایا جائے۔ چنانچہ اُن کے اس شعر کو سنداً مصنف گل رعنا نے پیش کیا ہے۔

بدون حکم وزیر الممالک اے آغا — جیساں کنم حرکت نوکری ست یا بازی

اسی تذکرہ میں مولانا حکیم عبدالحی صاحب مرحوم فرماتے ہیں کہ آزاد نے لکھا ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ بحالت دیوانگی مشاعرے میں گئے تو یہ غزل پڑھی اور کاغذ پھینک کر رخصت ہوگئے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں — بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

حالانکہ یہ غزل ان کی اُس زمانہ کی ہرگز نہیں ہوسکتی جو اُن کے جنون اور بیچارگی کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے کیونکہ اس غزل کے چند شعر تذکرۂ مصحفی میں بھی درج ہیں اور یہ تذکرہ اس وقت لکھا گیا ہے جب کہ سید انشار دلی ہونچے بھی نہ تھے بلکہ وہاں تک کا حال ہے کہ وہ مرشدآباد سے دلی آگئے تھے۔

میں نے تذکرۂ انیس الاحبا میں دیکھا ہے۔ کہ سید انشا چند روز مرنے سے پہلے تک مصنف تذکرۂ مذکور کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ یہ تذکرہ غیر مطبوعہ ہے جسے موہن لال انیس نے راجہ تکیت رائے کے حکم سے لکھا اور اکثر شاگردان مرزا فاخر مکیں کا اس میں ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آخر میں سعادت علی خاں انشا سے ناراض ہوگئے تھے مگر دیوانگی وغیرہ کی نوبت نہیں آئی۔

مصحفی آزاد نے مصحفی کی بابت لکھا ہے کہ ان کے چھ دیوان ہیں اور یہی عام تذکرے لکھتے ہیں۔ مگر تذکرۂ نساخ میں لکھا ہے کہ ان کے آٹھ دیوان ہیں۔ اس لحاظ سے آزاد نے جو صرف اپنی معلومات کی بنا پر لکھا ہے کہ آٹھ دیوان ہیں یہ کوئی نئی رائے نہیں ہے اس سے شاید یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ آٹھ دیوان کا راز صرف ہم جانتے ہیں۔

آزاد مصحفی کے کلام کی نسبت یہ رائے دیتے ہیں کہ مصحفی کا کلام کچھ زور دار نہیں ہے اور اس کو طرح طرح سے ظاہر کرتے ہیں۔ کہیں ان کے بڑھاپے پر اسبات کا الزام رکھتے ہیں کہیں انکی پرگوئی کو ملزم بناتے ہیں۔ کہیں ان کو امروہہ کا رہنے والا سمجھکر دیہاتی جانتے ہیں اور یہ سب اس وجہ سے ہے کہ سید انشا کو ان پر ترجیح دیجاسکے چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"یہ بھی مطلب کو بہت خوبی سے ادا کرتے ہیں مگر کیا کریں کہ وہ امروہہ پن نہیں جاتا۔ ذرا اکڑ کر چلتے ہیں تو ان کی شوخی نازبے نمک معلوم ہوتا ہے سید انشا سیدھی سادی باتیں بھی کہتے ہیں تو اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ کہتا اور سنتا گھڑیوں رقص کرتا ہے۔ اور چٹخارے بھرتا ہے۔ ان کا یہ حال ہے کہ اصول سے ناپ کر اور قواعد سے تول کر بات کہتے ہیں پھر بھی دیکھو تو کہیں پھیکے ہیں کہیں میٹھے" ذرا انصاف سے دیکھئے کہ آزاد کی زبردستیاں ظلم کی حد پر پہونچی ہوئی ہیں یا نہیں۔ افسوس ہے کہ انشا کی غلط کاریاں ان کو محبوب ہیں مگر مصحفی کی احتیاط اور قواعد دانی بھی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ یہ ظاہر ہے کہ آزاد سے پہلے لوگوں پر بھی یہ بات ظاہر تھی کہ مصحفی امروہہ کے رہنے والے ہیں۔ بڈھے بھی ہیں پرگو بھی ہیں مگر وہ سب مصحفی کی نسبت یہ لکھتے ہیں "بجمیع اصناف سخن قادر تھے" (نساخ) "بندش نظم میں اس کے صفائی اور شیرینی۔ اور معنی بندش میں اس کے بلندی اور رنگینی" (لطف) "طبع روانش جدول کتاب فصاحت۔ و فکر بیانش مسطر بیاض بلاغت۔ رنگینی نظمش سرخی باب گلستان و پیچیدگی الفاظش چوں سنبل بوستان حسن" یہ ہیں اکابر کی رائیں مصحفی کی بابت۔ مگر ع۔ ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیبے ست۔ آزاد کو انشا کے سامنے جو باوجو سب باتوں کے مسخرے بھی تھے ایک متین اور زبردست شاعر کا کلام بے نمک معلوم ہوتا ہے ؎

بمیر تا برہی اے کلیم رنج ہست کہ از مشقت او جز بمرگ نتواں رست

رہا امروہہ پن۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا فیصلہ نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ دلی اور لکھنؤ والے ہمیشہ اسی بات پر ناز کرتے رہے کہ ہمارا وطن دلی ہے اور ہم لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ اور یہ کبھی غور نہ کیا کہ انپر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

غریب مصحفی اور اہل شاہجہاں میں دلی میں جارہے تھے اور وہیں کی ان کی زبان ہے دلی پر وہ فخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

مگر آزاد کو یہ کچھ بھی قبول نہیں اور انہیں ان کے کلام میں جابجا امروہہ پن نظر آتا ہے ————— اور وہ مصحفی ———————————

کو انشا کے مقابلہ پر بُرا ہی جانتے ہیں۔ کوئی یہ سوال کرے۔ کہ حضرت امروہہ تو پھر بھی دہلی کے قریب ہے۔ مگر کشمیر۔ اور مرشد آباد جہاں انشا کے بزرگوں اور انشا کی عمر گزری، اُن کی نسبت جناب کا کیا خیال ہے تو یقین ہے کہ ان کو جواب نہ بن آئے گا خود حضرت آزاد سے پوچھا جائے کہ آپ دلی میں پیدا ہوے مگر عمر بھر لاہور میں بسر کی۔ تو اب آپ کی زبان کو کیونکر مستند مانا جائے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ آپکی تصانیف میں جابجا ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے لکھنو اور دلی والے دونوں کانوں پر ہاتھ دہرتے ہیں۔

مصحفی پر ایک یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ وہ میر کو اتنا بزرگ اور برتر مانتے تھے کہ کسی شعر پر داد دی تو اٹھ سلام کئے اور اپنے کمال کا منتہا سمجھا اور اسی قسم کی بعض اور باتیں جو میر و مصحفی کی بابت ہیں۔ مگر انصاف یہ ہے کہ مصحفی کسی طرح میر سے کم نہ تھے وہ اپنے کمال کے آگے میر کو کچھ بڑا نہ جانتے تھے چنانچہ کہتے ہیں ؎

کچھ میں جرأت نہیں اے مصحفی تیغ زباں میر و مرزا سے لڑانے یہ غزل جاؤنگا

انشا و مصحفی کے ہنگامے کو آزاد نے اس جوش و خروش سے لکھا ہے کہ دیکھکر ایک نبرد گاہ کا منظر نظر کے سامنے پھر جاتا ہے۔ مگر ہر جگہ یہ خیال رکھا ہے کہ لکھنو کو انشا ہی کا طرفدار دکھایا جائے۔

شیخ ناسخ آزاد نے اپنے تمام بیان کی بنا مولانا عمی کی تحریر پر رکھی ہے۔ مگر اس میں بعض باتیں ہرگز قابل اعتبار نہیں ہیں۔ ایک وقت کھانا کھانا اور دفعتہ پانچ سیر کھالینا۔ اور یہی روزانہ کا معمول ہونا۔ لکھنو کے ایک زبردست شاعر کو حیوان بناکر پیش کرتا ہے۔ یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں جن پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

یہ روایت کہ انھوں نے ایک بے معنی دیوان لکھکر رکھ لیا تھا بالکل غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کم سے کم دس بیس شعر تو اور مشہور ہوتے اس کی کوئی تذکرہ تصدیق نہیں کرتا۔

آزاد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ نے اہل و عیال کا جنجال ہی نہیں رکھا تھا۔ یعنی انھوں نے شادی نہیں کی تھی مگر یہ صحیح نہیں ہے قیصر التواریخ میں سید محمد میرزا ئر نے لکھا ہے کہ ناسخ مرحوم نے بیٹوں کو بہت اچھی تعلیم دلوائی۔ انکے ایک بیٹے کا نام زین العابدین بتایا ہے۔ جو مرزا حکیم محمد علی کا شاگرد تھا۔

آتش آزاد آتش کے متعلق لکھتے ہیں "مصحفی کے شاگرد تھے اور حق یہ ہے کہ اُن کی آتش بیانی نے استاد کے نام کو روشن کیا بلکہ کلام کی گرمی اور چمک دمک نے استاد شاگرد کے کلام میں اندھیرے اجالے کا امتیاز دکھایا" یہ فقرے ایسے ہیں کہ غور کرنیسے ہر شخص اس نتیجہ پر پہونچتا ہے۔ کہ آزاد کو سخن فہمی کا ملکہ قدرت کی طرف سے ذرا بھی نہیں تھا۔ مصحفی کا کلام اور آتش کے کلام کا موازنہ کیجئے تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ جو شخص ہندی نژاد ہوکر نظیری کے دیوان کا جواب لکھے

اپنے بعد دو تذکرے جو اصناف سخن پر تنقید سے معمور ہوں اور آٹھ دیوان ریختہ کے چھوڑ جائے اور ہر ایک صنف سخن پر قادر ہو۔ جو میر و مرزا کا مد مقابل ہو جس کی استادی پر بڑے بڑے نقادوں کا اجماع ہو اُس کے حق میں یہ لکھنا کس قدر ستم ہے کہ آتش نے ان کے نام کو روشن کیا اور پھر لطف یہ کہ اگر کوئی بڑا فاضل یا کامل شاعر ہو اور اس کی شاعری کے بارہ میں کچھ غلو کیا جائے تو ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے نہ یہ کہ وہ شخص جس کے لئے ہر ایک نقاد کی یہ رائے ہو کہ وہ ایک بے علم اور کم لیاقت کے آدمی تھے اور سوائے غزل کے اور کسی صنف پر قادر نہ تھے۔ آتش کے کلام کو دیکھ لیجئے بہ استثنائے بعض اشعار۔ ابتذال۔ ناواقفیت فن۔ وغیرہ کا ایک روشن آئینہ ہے جذبات اور فلسفہ کی بجائے رکاکت اور ابتذال کے دریا بہ رہے ہیں۔

آزاد لکھتے ہیں "دوستوں کی تاکید سے درسی کتابیں دیکھیں باوجود اس کے کافیہ کو کافی سمجھکر آگے پڑھنا فضول سمجھا" جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ کافیہ نحو عربی میں ایک انتہائی کتاب ہے۔ جس کے بعد درس میں صرف اس کی شرح پڑھائی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آتش نے عربی قواعد کی کتابیں کافی پڑھ لی تھیں۔ مگر آتش کے کلام کو دیکھئے تو انھوں نے اس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں ایک معمولی درجہ کے مبتدی سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے۔ پھر آگے چل کر خود آزاد نے بیان کیا ہے کہ وہ اپنے مذہب کی موافق نماز کے طریقوں سے بھی واقف نہ تھے۔ ناسخ نے ایک مرتبہ اُن کو لکھا تھا۔

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب ۔ بو مسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب

آزاد نے لکھا ہے کہ وہ بالے خاں کی سرائے میں رہتے تھے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ بالے خاں کی کوئی سرائے لکھنؤ میں نہیں ہے بلکہ وہ پہلے نواز گنج کے قریب چوبٹیوں سے آگے مادھو لال کی چڑھائی کے پاس مقیم تھے۔ بعد کو آخر عمر میں معالی خاں کی سرائے میں اٹھ آئے تھے۔

مومن

مومن کے ساتھ آزاد نے سب سے بڑا ستم یہ کیا کہ پہلے ایڈیشن میں انکا نام ہی خارج کر دیا اور سرے سے ان کو اس قابل ہی نہ سمجھا کہ وہ آبحیات میں جگہ پا سکیں۔ مگر سخن سنجوں کی کمی نہیں۔ ملک نے اس فروگزاشت کے لئے سخت شورش کی تب جاکر کہیں آزاد نے چند عذرات لنگ پیش کرتے ہوئے اُن کو بھی دوسرے شاعروں کے ساتھ شامل کیا۔ اور وجہ یہ لکھی۔ کہ دور پنجم سے ان کا تعلق ہے بلکہ دور سوم و چہارم کو بھی اہل نظر دیکھیں جو اہل کمال اس میں بیٹھے ہیں، کس لباس و سامان کے ساتھ ہیں، کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ اسی سامان و شان اور وضع ولباس کے ساتھ ہو جو اہل محفل کے لئے خاص ہے نہ ہو تو نا موزوں معلوم ہوتا ہے" آزاد کے یہ جملے ایک مورخ کی حیثیت سے نہایت ہی لچر اور لغو ہیں۔ یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ تذکرہ نساخ۔ اور شیفتہ جنہیں مومن کی نسبت یہ لکھا ہے" بزعم فقیر بقوت شاعری ایشاں کم کسے برخاستہ در ہر جنس سخن مکانتے وافی دارد کہ کسے را در یک صنف ہم میسر نیامدہ و باوجود تخالف لسانین بہر دو لفظ چنداں دستگاہے نصیب او گشتہ کہ پارسیاں از آں خودی انگارند" (تذکرۂ شیفتہ) جمیع اصناف سخن پر قادر تھے اشعار ان کے پُرمضمون وشیریں و عاشقانہ ہوتے ہیں، راقم کے زعم میں اس مرتبے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں گزرا نہیں" (تذکرہ نساخ) پھر یہ دیکھتے ہوئے

کہ مومن ایسے باکمال کے لئے جو اپنے کسی معاصر سے کسی حیثیت سے کم نہیں تھا یہ لکھنا کہاں تک درست تھا سوائے اس کے کہ آزاد کی اس فرو گزاشت کو اغراض ذاتی پر محمول کیا جائے اور کیا کہا جا سکے۔

آزاد نے لکھا ہے کہ میں نے مومن کے متعلق بہت سی روایتیں کم کر دی ہیں۔ کیونکہ نفس شاعری سے انکا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ اصول حقیقتاً قابل تحسین ہے۔ مگر کاش وہ دوسرے شعراء کے یہاں بھی یہی ملحوظ رکھتے۔ لیکن کیا کیا جائے ع

وقت گرم در بغل وقت دعا بر خدا

ذوق اس میں شک نہیں کسی شئے کی محبت انسان کو بہرا گونگا اور اندھا بنا دیتی ہے اور اس حالت میں عاشق کے لئے معاف ہے وہ جو کچھ کہے اسے معذور رکھا جائے گا۔ فردوسی نے شاہنامے میں ایسے ایسے جلیل القدر بادشاہوں کا ذکر کیا ہے جن کے سطوت و جلال کے سامنے بڑے بڑے لوگ سر تسلیم خم کرتے تھے۔ مگر پھر بھی وہ جہاں کہیں رستم کا ذکر کرتا ہے وہ مجبور ہو جاتا ہے اور اسکی نظر میں کسی کی کوئی وقعت نہیں رہتی مگر کیا کیا جائے وہ مجبور ہے معذور ہے جیسے رستم کی محبت نے اس کی آنکھوں پر دے ڈال دئے ہیں اسیطرح آزاد جب ذوق کے تذکرے پر پہونچتے ہیں۔ تو وہ تذکرے جو دیکھنے والے نے ابھی تک دیکھے ہیں سب نقش باطل کی طرح نظروں میں ہیچ ہو جاتے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب برائے بیت تھا۔ در اصل لکھنے والے نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب ذوق کیلئے ہے۔ غریب بڈھا بادشاہ ظفر آزاد کی زد میں آجاتا ہے اس کی وہ تمام شاعرانہ کاوشیں جو اس نے ہر زبردست سے زبردست انقلاب میں قائم رکھی ہیں ضبط ہو جاتی ہیں۔ اسکی تمام سخن سنجیوں پر پانی پھیر دیا جاتا ہے اور اس کی تمام مملکت سخن کا ذوق ہی کو تاجدار تسلیم کر لیا جاتا ہے یہ جانتے ہوے بھی کہ بادشاہ کی مشق سخن شاہ نصیر کے وقت سے جاری تھی اور وہ ذوق سے بہت پہلے سے اس بہار بے خزاں کی گلگشت میں مصروف تھے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اکثر اختراع و ایجاد ان کے ارادہ میں تھے اور بعض بعض ارادے شروع ہوے مگر ناتمام رہے۔ کیونکہ بادشاہ کی فرمائشیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھیں اور تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ اتنا تھا کہ بات نکالتا اور اُسے نباہ نہ سکتا تھا۔ اُس کا کیا ہوا انہیں سنبھالنا پڑتا تھا۔ وہ اپنی غزل بادشاہ کو سناتے نہ تھے۔ اگر کسی طرح اُس تک پہونچ جاتی تو وہ اسی غزل پر خود غزل کہتا تھا۔ آپ اگر نئی غزل لکھ کر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا۔ ۶۰ برس کا سخن فہم تھا اگر اس سے چست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے ناچار اپنی غزل میں انکا تخلص ڈال کر" یہ فقرہ اور اسی قسم کے اور فقرے ذوق کے ذکر میں بھرے پڑے ہیں۔ مگر عقل سلیم رکھنے والے ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے کہ ۶۰ برس کا سخن گو استادی کے بل بازو پر عمر بھر رہا ہوگا۔ اس کو اگر ضرورت ہوئی ہوگی تو شاہ نصیر کے زمانے میں ہوئی گی مگر ذوق کے وقت میں وہ خود ایک کہنہ مشق تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ذوق نے انکی اصلاح میں پورے پورے تصرفات سے کام لیا ہو مگر اس کے یہ معنے نہیں ہو سکتے جو آزاد نے پیدا کئے ہیں۔

آزاد نے لکھا ہے کہ اکبر شاہ کو شعر و شاعری سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ گویا اکبر شاہ کو شاعری سے خارج ہی کر دیا ہے۔ حالانکہ در اصل واقعہ یہ ہے کہ اکبر شاہ کو بھی اردو شاعری کا اچھا خاصہ ذوق تھا۔ شاہ نصیر، احسان وغیرہ ان کے درباری شاعر تھے اور وہ خود

ممنون کے شاگرد تھے۔ شجاع تخلص کرتے تھے۔ آزاد نے ایک اور بھی سخت ظلم کیا ہے جسطرح شاہ نصیر کی اصلاح کو اڑا دیا ہے اسیطرح غالب کی محنت اور جگر کاوی کا بھی کہیں ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ یہ مسلم ہے کہ جب استاد ذوق کا انتقال ہوا تو اس کے بعد مرزا غالب بادشاہ کے استاد ہوئے اور آخری دیوان اور تیسرے دیوان کا آخری حصہ انھوں نے دیکھا اور بنایا جیساکہ سخن فہم آج بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اول کے دو دیوانوں سے تیسرے اور چوتھے دیوان کا رنگ بالکل علیحدہ ہے۔ غالب کی یہ زبردست استادی تھی کہ اپنے کلام کی بادشاہ کے کلام کو ہوا بھی نہ لگنے دی اور جو کچھ انہیں دیا وہ ایسا ہے کہ آج اسپر کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا۔

آزاد نے نواب الٰہی بخش خان معروف پر بھی بڑا ستم کیا ہے۔ نواب صاحب کو انکا شاگرد بتایا ہے اور طرح طرح کے نمکین فقرے درج کئے ہیں مگر یہ ایک صریح اتہام ہے۔ نواب سعید الدین احمد خان طالب مرحوم نے ایک مضمون کے ذریعہ سے اس کی پرزور تردید کی تھی افسوس کہ آج وہ مضمون میرے پیش نظر نہیں ہے ورنہ میں کچھ اور لکھتا۔ اس وقت جتنے تذکرے موجود ہیں وہ اس بات پر متفق ہیں کہ وہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اور کوئی شخص سہواً بھی آزاد کے ساتھ ہم نوا نہیں ہوگیے کہ نواب مرحوم استاد ذوق سے بھی خفیہ مشورہ کرتے تھے۔

آزاد نے غضب ہی کیا ہے کہ ان کے دونوں دیوان کے ساتھ۔ تسبیح زمرد بھی جو نواب الٰہی بخش خاں کی عمر بھر کی کمائی تھی ذوق کی پروائی بتائی ہے۔ مگر یہ ایک افترا صریح ہے اور اس کا آزاد کی خوش بیانی کے سوائے دنیا میں اور کوئی ثبوت نہیں غالب کے متعلق مجھے کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے مگر اس قدر کہ آزاد نے ان کو جابجا ذوق سے گھٹانے کی کوشش کی ہے مگر زمانہ نے اُسے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ اور آج ذوق ذوق ہے اور غالب غالب۔ آخر میں اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ جن لوگوں نے آزاد کے شیرین استعارہ اور مبالغہ آمیز عبارت پر بھروسہ کرکے ——— واقعات کو صحیح سمجھا وہ سخت دہوکے میں ہیں۔ آبحیات، ایک دام فریب ہے جسکے تراشے ہوئے الفاظ اہل ذوق کو دعوت نظر دیتے ہیں مگر جاننے وا اور غور سے دیکھنے والے کو سخت مایوسی ہو جاتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ آزاد نے ایک لفظ بھی ذاتی مناقشات اور اغراض نفسا سے جدا ہوکر نہیں لکھا۔ اب تک اسبات پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ آزاد کی زبان کیا تھی۔ عوام ان کو سحر گفتار سمجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ حقیقۃً انکی زبان ہرگز قابل اعتماد نہیں۔ اس میں غلطیاں بھی ہیں۔ اور خلاف محاورہ الفاظ بھی۔ چنانچہ اگر ضرورت ہوئی اور فرصت مل گئی تو آئندہ تفصیل کے ساتھ مقدمۂ آبحیات کی بے سروپائی۔ اور آزاد کی زبان کی بے مایگی پر کچھ روشنی ڈالی جائے گی سردست ان تاریخی واقعات پر اکتفا کرتا ہوں

ہم خوش ہیں کہ آج ہماری زبان میں بعض ایسے تذکرے موجود ہیں جنھوں نے آزاد کی بہت سی غلط بیانیوں کے پردے اُٹھائے اور ان میں سے تذکرہ گل رعنا۔ اور شعر الہند نہایت قابل قدر ہیں اور ہمکو اعتراف ہے کہ بہت سی مدد ان سے ہمکو ملی۔ یہ بھی کہدینا ضروری ہے کہ جن تذکروں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ سب قریب قریب اس مضمون کے لکھتے وقت ہمارے پیش نظر تھے اور ہر جگہ اصل ہی سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں نقل پر بھروسہ نہیں کیا۔

"آرگس"

ایک فلسفی کا انجام

(والیٹر کا ایک فسانہ)

ایک دن ممنون کے دل میں آیا کہ "مجھ کو فلسفی ہونا چاہئے اور فلسفی بھی ایسا کہ ساری دنیا میں میری شہرت ہو اور ہر شخص میری عزت کرے" پھر اس نے سوچا کہ یہ مقصود حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نفس کو برائیوں سے بچاؤں، اور ایسے مشاغل سے احتراز کروں جو خواہشات میں ہیجان پیدا کرتے ہیں۔ بیشک یہ بہت دشوار امر ہے لیکن اس کی اولین تدبیر یہ ہے کہ محبت سے دور رہوں اگر کوئی جمیل عورت نظر بھی آئے تو مجھے اپنے دل کو یوں سمجھانا چاہئے کہ "اس کے رخساروں کی تازگی و رونق بالکل فانی چیز ہے اور چند دن میں زائل ہو جائے گی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کا جادو اور اس کے نگاہوں کی تڑپ عارضی ہے اور شباب زائل ہو جانے کے بعد ان میں سے کوئی کیفیت باقی نہ رہیگی، اسی طرح اسکا بلوریں سینہ بھی ڈھل کر ایک نہ ایک دن بے معنی چیز ہو جائے گا، بال سفید ہو جائیں گے اور تیر سا قد بھی جھک کر کمان ہو جائے گا۔ دوسری احتیاط یہ ہونی چاہئے کہ مسکر چیزوں سے پرہیز کروں کیونکہ نقدان عقل، نقصان صحت اور تضییع اوقات کا بڑا سبب نہیں مسکر اشیاء کا استعمال ہوا کرتا ہے، اسی کے ساتھ کھانے کے مسئلہ میں بھی یہ التزام ہونا چاہئے کہ صرف اسی قدر کھایا جائے جتنی ضرورت ہے کیونکہ کھانا زندگی کے لئے ہے نہ کہ زندگی کھانے کے لئے۔ اس کے علاوہ چونکہ میری ضروریات کم ہیں اور دولت کافی ہے جو شاہی خزینہ دار کے پاس جمع ہے اس لئے میں استغنا کے ساتھ اپنی پوری زندگی بسر کر سکتا ہوں، نہ مجھے کسی حاکم کے پاس جانے کی ضرورت ہوگی، نہ میں کسی پر حسد کرونگا، نہ مجھ پر کوئی حسد کرے گا، خوش قسمتی سے بعض سچے دوست بھی مجھے ملگئے ہیں۔ میں کوشش کرونگا کہ یہ رشتۂ الفت قائم رہے، جب میں اُن کے افعال و حرکات پر کوئی تنقید ہی نہ کرونگا تو پھر کوئی جھگڑا بھی پیدا نہ ہوگا"

جب ممنون اپنی اس کارگاہ خیال سے فارغ ہوا اور تمام تدبیریں منضبط ہو گئیں تو اس نے اپنے کمرہ کا دروازہ بند کیا اور دریچہ کے پاس کرسی ڈال کر نہایت اطمینان سے بیٹھ گیا، گویا اس نے ان تدبیروں پر عمل شروع کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے دریچہ سے دیکھا کہ دو عورتیں اس کے گھر کے سامنے سڑک پر جا رہی ہیں جنمیں سے ایک بہت ضعیف ہے ——— لیکن اس کے چہرہ سے اطمینان ٹپک رہا ہے، دوسری بہت کمسن و جمیل ہے مگر اس کے بشرہ سے علامات قلق و اضطراب پیدا ہیں اور برابر رو رہی ہے اور جس قدر روتی جاتی ہے اس کا حسن و جمال زیادہ دلکش ہوتا جاتا ہے۔

اس منظر کا ہمارے فیلسوف کے قلب پر بہت اثر ہوا لیکن یہ اثر اس کے حسن کی وجہ سے نہ تھا کیونکہ اس کا تو وہ عہد کر ہی چکا تھا صرف ہمدردی اس کا سبب تھا، یہ جلدی جلدی نیچے اتر کے گیا اور اس سے گریہ و زاری کا سبب دریافت کیا۔ لڑکی نے اپنے لب و لہجہ میں ہر ممکن تاثیر پیدا کرتے ہوئے اپنی داستان درد سنائی اور بولی کہ "میرے چچا نے میرا سارا سامان چھین لیا ہے اور میری

ساری میراث سے مجھے محروم کر دیا ہے، اسی کے ساتھ وہ مجھے سخت جسمانی عذاب میں مبتلا کرتا ہے حتیٰ کہ میں جان سے بیزار ہو گئی ہوں اور سوائے اس کے کوئی چارۂ کار سمجھ میں نہیں آتا کہ خودکشی کر لوں۔ آپ بہت ذی فہم انسان معلوم ہوتے ہیں اگر تکلیف نہ ہو تو زحمت کر کے گھر تک چلئے اور میرا سارا قصہ تفصیل سے سنئے، ممکن ہے آپ میری مدد کر سکیں"

ممنون اس پر راضی ہو گیا اور کوئی وجہ راضی نہ ہونے کی نہ تھی۔ جب یہ گھر پہونچے تو ممنون کو وہ ایک نہایت آراستہ کمرے میں لے گئی اور تخت پر بٹھا کر انتہائی حسن تاثیر کے ساتھ اپنا حال بیان کرنا شروع کیا، وہ روتی جاتی تھی اور حال بیان کرتی تھی، حال بیان کرتی جاتی تھی اور اپنا سحر گفتگو بھی پوری طرح صرف کر رہی تھی۔ ممنون نہایت غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا اس کی دلکش اداؤں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اور نامعلوم طور پر دونوں میں فصل مکانی کم ہوتا جاتا تھا۔ ٹھیک یہی وقت تھا کہ دفعتہً دروازہ کھول کر لڑکی کا چچا اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرہ سے انتہائی غیظ و غضب ٹپک رہا تھا۔ لڑکی تو یہ دیکھکر بھاگ گئی اور ممنون مبہوت و متحیر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ یہ موقعہ ایسا نہ تھا کہ ممنون اپنے فلسفہ کی مدد سے نجات حاصل کر سکتا، اسلئے مجبوراً اس کو اپنی جان و آبرو بچانے کے لئے جو کچھ اُس کے پاس موجود تھا، لڑکی کے چچا کے حوالہ کر دینا پڑا۔

ممنون نہایت محجوب و شرمندہ حالت میں گھر واپس آکر پڑا ہوا تھا کہ اس کے بعض احباب کی طرف سے دعوت طعام کا رقعہ آیا۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ "اگر میں گھر میں تنہا رہوں گا تو تفکر کا اور زیادہ ہجوم ہوگا۔ کھانے کی بھی خواہش نہ ہوگی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ صحت پر خراب اثر پڑیگا، اس لئے چلنا ہی مناسب ہے ممکن ہے اُن کی باتوں میں جی بہل جائے" چنانچہ وہ یہ سوچکر دعوت میں شریک ہوا اور وہاں احباب نے اس کے چہرہ پر آثار ملال دیکھ کر شراب پینے پر اصرار کیا۔ ممنون نے دل میں سوچا کہ "تھوڑی سی شراب جس سے یہ ملال دور ہو جائے چنداں مضر نہیں ہو سکتی بلکہ مفید ہوگی" اس لئے اُس نے اول اول چند جرعے پیئے اور پھر آہستہ آہستہ جب احساس کُند ہونے لگا تو اور زیادہ پینے کی خواہش ہوئی یہاں تک کہ پورا نشہ اس پر مستولی ہو گیا۔ عشاء کے بعد جب دوستوں نے جُوا کھیلنے کی ترغیب دی تو اُس نے پھر یہ سوچکر کہ "احباب کے ساتھ اس قسم کے مشاغل تفریحی بُرے نہیں ہوتے" جوا بھی کھیلا اور اس حد تک کہ جو کچھ اس کے پاس تھا وہ ہارا اور اس سے چہار چند کا قرض ہو گیا۔ اس کے بعد کسی بات میں نزاع پیدا ہوئی اور اس جھگڑے میں ایک شخص نے ایسی سخت ضرب اس کے چہرہ پر لگائی کہ ایک آنکھ پھوٹ گئی — اب یہ گھر واپس آیا لیکن اس حال میں کہ جو کچھ مال اس کے پاس تھا وہ ندارد ہو چکا تھا اس کا چوگنا قرض ہو گیا تھا اور ایک آنکھ بھی غائب ہو چکی تھی۔

دوسرے دن صبح کو اس نے اپنا خادم شاہی خزانچی کے پاس بھیجکر کچھ روپیہ طلب کیا تاکہ رات کا قرض ادا کرے لیکن خادم نے واپس آکر مطلع کیا کہ اُس نے اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا ہے، اور اب ایک پیسہ بھی ملنے کی اُمید نہیں یہ سنکر ممنون نے ایسا محسوس کیا جیسے اس پر بجلی گر گئی ہو وہ اُٹھا اور آنکھ پر پٹی باندھ کر قصر شاہی کی طرف روانہ ہوا تاکہ اس سے فریاد کرے اور شاہی خزانچی کے مکر و فریب کا حال بیان کرے۔

قصرِ شاہی میں پہونچا تو یہاں بہت سی عورتیں امرا کی نظر آئیں جنمیں سے بعض اُس کو جانتی تھیں اور انھوں نے پوچھنا شروع کیا کہ "ممنون تمہاری آنکھ کیونکر جاتی رہی" اس سوال سے اس کا غصہ اور بڑھتا جا رہا تھا، لیکن مجبوراً خاموش رہا اور کسی نہ کسی طرح قصرِ شاہی کے قریب پہونچکر زمین بوس ہوا اور درخواست پیش کی۔ بادشاہ نے اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ درخواست لیلے اور مضمون سے اطلاع دے۔ سکریٹری درخواست پڑھکر ممنون کو علیحدہ لے گیا اور بولا کہ "تو مجھے کوئی بیوقوف مسخرا معلوم ہوتا ہے ورنہ بغیر میری وساطت کے درخواست براہِ راست بادشاہ کے سامنے پیش کرنا کیا معنے رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ تونے یہ بھی نہیں دیکھا کہ کس شخص کی شکایت کر رہا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ میرا چچازاد بھائی ہے اور میری حمایت اسے حاصل ہے۔ اس لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ اس دعوے کو بھلا دو اور ٹھنڈے ٹھنڈے گھر جاؤ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری دوسری آنکھ سلامت رہے"۔

ممنون نے عہد کیا تھا کہ وہ محبت نہ کرے گا، مسکرات سے احتراز کریگا، جوا نہ کھیلیگا جو بنیاد ہے فساد کی اور امن و راحت کی زندگی بسر کریگا، لیکن چوبیس گھنٹے بھی نہ گزرے تھے، کہ ایک ایک کرکے اس کے تمام عہد باطل ہوگئے اور وہ ایک بدترین انسان کی حیثیت سے اپنے مکان کی طرف واپس آیا۔ جب یہاں پہونچا تو معلوم ہوا کہ عدالت کے لوگ اس کے گھر کی چیزوں کو باہر نکال کر نیلام کر رہے ہیں اور ممنون کے احباب جن سے اس نے قمار بازی میں قرض لیا تھا وہاں موجود ہیں اور اپنے روپیہ کو اس طرح وصول کر رہے ہیں۔ یہ دیکھکر اس کو اس قدر سخت صدمہ ہوا کہ وہیں ایک درخت کے نیچے سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر میں اُس خوبصورت لڑکی کو اپنے چچا کے ساتھ ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ جب ان دونوں نے ممنون کو اس حال میں دیکھا تو قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔ غروبِ آفتاب کے بعد ممنون گھاس کے فرش پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا اور نہایت شدید تپ میں مبتلا ہوکر غافل سا ہوگیا۔ اس نے خواب میں ایک فرشتہ دیکھا جس کے نور سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں اور جس کے چہرہ حسین پر تھے۔ ممنون نے اس سے دریافت کیا "تم کون ہو"

—"تیرا محافظ فرشتہ"

—"تو پھر مجھ پر رحم کرو اور میری کھوئی ہوئی آنکھ، صحت، دولت اور عقل واپس دلادو"

—"ہم اپنی دنیا میں ان حادثات سے دوچار نہیں ہوتے"

—"اے متبرک روح، تیرا قیام کہاں رہتا ہے"۔

—"بہت دور، کرۂ آفتاب سے ایک ارب پچاس کروڑ میل کے فاصلہ پر، ایک نہایت چھوٹے سے ستارہ میں"۔

—"کیسا مبارک ہے تمہارا وطن کہ نہ وہاں مکر و فریب میں مبتلا کرنے والی لڑکیاں ہیں، نہ جھوٹے دوست جو مال بھی چھین لیں اور آنکھ بھی پھوڑ دیں، نہ خائن لوگ ہیں کہ دیوالہ نکال کر دوسروں کا مال ہضم کر جائیں اور نہ ایسے حاکم جو عدل د

وانصاف طلب کرنے پر بُری طرح نکالدیں"

—— "خدا کا شکر ہے کہ یہ باتیں جن کا تم نے ذکر کیا ہے ہمارے ہاں نہیں ہیں۔ ہم عورت کی محبت کی طرف سے بھی محفوظ ہیں کیونکہ ان کی آنکھوں میں ہمارے لئے کوئی اثر نہیں ہے، نہ کھانے پینے کی افراط ہوسکتی ہے کیونکہ ہم کھاتے پیتے ہی نہیں نہ ہمیں مفلس ہونے کا ڈر ہے کیونکہ وہاں سونے چاندی کا وجود نہیں، نہ آنکھوں کے جانے کا ڈر ہے کیونکہ ہمارے جسم ہی نہیں ہے اور نہ ظلم وجور کا اندیشہ ہے کیونکہ سب مساوی درجہ رکھتے ہیں"

—— "لیکن اے محترم فرشتے، آپ اپنا وقت کس طرح بسر کرتے ہوں گے جبکہ آپ عورت کی معاشرت اور کھانے پینے کی چیزوں سے محروم ہیں"

—— "ہمارا وقت ان لوگوں کی امداد میں بسر ہوتا ہے جو ہماری حفاظت میں دے گئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت میں تمہاری بہتری کے لئے آیا ہوں"

—— "افسوس، آپ کل کیوں نہ آئے کہ یہ مصائب مجھ پر نہ پڑتے"

—— "کل میں ایک تیرے دوسرے بھائی کی خدمت میں مشغول رہا جو شاہ ہندوستان کے پاس ملازم تھا اور وہ تجھ سے زیادہ مستحق اعانت تھا کیونکہ بادشاہ نے اس کی دونوں آنکھیں نکلوالی ہیں اور ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے زندان میں ڈالدیا ہے۔ بہرحال اب میں تمہاری مدد کے لئے آیا ہوں۔ تمہاری آنکھ تو البتہ واپس نہیں ملسکتی، لیکن اور تکلیفیں رفتہ رفتہ ضرور زائل ہو جائیں گی۔ اگر تم نے پھر کبھی فلسفی بننے کا قصد نہ کیا"

—— "تو کیا فلسفی بننا اس قدر دشوار ہے؟"

—— "ہاں، یہ ایسا ہی دشوار ہے جیسے حکمت وقوت، قدرت وسعادت میں کمال حاصل کرنے کی خواہش۔ یہ تمام کُرے جو فضا میں نظر آتے ہیں اور جن کی تعداد لاکھوں تک پہونچتی ہے، یہاں ہر چیز تدریج کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ اور تم بھی اصلح وافضل تدریج ہی کے ساتھ ہوسکتے ہو"

یہ سنکر ممنون نے ایک سرد آہ کے ساتھ کہا کہ "ہاں ہوگا، لیکن میں تو اس وقت تک اس کی تصدیق نہیں کرسکتا۔ جب تک میری کھوئی ہوئی آنکھ نہ مل جائے"

نیاز

ضرورت ہے

جولائی، اگست ۳۴ء وفروری ومارچ ۳۵ء کے نگار کی۔ (منیجر نگار لکھنؤ)

دیوان یقین

(مخطوط۔ انڈیا آفس۔ کتب خانہ لنڈن)

انعام اللہ خاں "یقین" اظہرالدین خاں دہلوی کے فرزند، مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد اور مخلص اولمنذار ردو شاعری کے اُس دور کے غزلگو ہیں جس کے متعلق بہت سے امور ابھی تحقیق طلب ہیں اس دور کے شعراکے حالات اوران کا کلام اَب تک پردہ ہی میں ہے اور شاید سوائے حاتم اور یقین کے دیوانوں کے فی الحال کسی اور کلام کی موجودگی کا عام طور پر علم بھی نہیں۔

یقین کی وفات کے متعلق تذکروں میں عجیب طرح کے فسانوی قصّے درج ہیں۔ اگرچہ ہمارے اس مضمون کا مقصد یقین کے حالات زندگی سے بحث کرنا ہرگز نہیں ہے، تاہم ــــــ ابراہیم خاں کے تذکرہ گلزار ابراہیم (مخطوط برٹش میوزیم) کے مندرجہ ذیل الفاظ کا اظہار نا مناسب نہ سمجھا جائے گا کیونکہ اس سے مرزا علی لطف کے تذکرۂ گلشن ہند کے اُن مبہم الفاظ کی وضاحت ہوجاتی ہے جو یقین کے متعلق علی ابراہیم کے انہی الفاظ کا ترجمہ ہیں اور علی لطف کے اور بہت سے ترجموں کی طرح شخص زیر بحث کے متعلق اکثر شبہات پیدا کر دیتے ہیں۔

اس منقولہ عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوجائے گا کہ اردو میں مقفیٰ ترجمہ کرنے کی خاطر علی لطف نے علی ابراہیم کی سادہ سے سادہ عبارتوں کو کس شکل اور پیچ در پیچ طریقوں سے پیش کیا ہے۔

پہلے علی لطف کی عبارت کو ہم ذیل میں بالکل انہی علامتوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں جو اُن کے مقفّیٰ جملوں اور فقروں کو جدا جدا کرنے کی خاطر تذکرہ گلشن ہند (مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور ۱۹۰۶ء صفحہ ۱۰۵) میں لکھی گئی ہے۔

"مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت میں بہ سبب کسی حرکت نامعقول کے، کہ وہ صادر نہ ہوئی تھی یقین سے باپ نے اسکے اس کو قتل کیا، اور نعش کو اس کی دریا میں بہا دیا۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اس عمل شنیع کا گزرا تھا۔ اس کے باپ نے دھیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں۔ یقین نے اس مقدمہ میں اکثر متنبہ کیا۔ ایک دن اُس نے خفا ہوکر اس بچارے کا جی ہی لیا۔ علم غیب کا بدرستی خدا ہی کو ہے۔"

علی ابراہیم خاں کے اصل الفاظ (از مخطوط برٹش میوزیم ورق ۲۵۲۔ب اور ۲۵۳۔الف) اس امر سے متعلق یہ ہیں۔

"گویند بعہد احمد شاہ بادشاہ بنابر امر نا ملایمی کہ از یقین صادر نمی شد اورا پدرش بقتل رسانیدہ نعش بدریا انداخت و بعضے گویند پدرش ارتکاب امرے داشت کہ ممنوع

جمیع ادیان بود ــــــ او منع مینمود پدرش برآشفت وخونش بریخت"

ــــ :(×):ــــ

یقین کے کلام کے متعلق ان کے معاصرین میں ایک خیال یہ پھیل گیا تھا جیسا کہ بعض تذکروں سے ظاہر ہے کہ در اصل مرزا جان جاناں اُن کے نام سے شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ لیکن یہ ایک مضحکہ خیز سی بات ہے۔ اگرچہ ایک سو سال پیشتر بھی اس سے انکار کیا جا چکا ہے لیکن اب خود یقین کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد کم از کم مجھے تو یقین ہو گیا ہے کہ یقین کے معاصرین نے غالباً حسد سے اس قسم کی افواہ مشہور کر دی تھی۔ وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ یقین جیسے نوجوان سے اس درجہ کا کلام غیر متوقع نظر آتا ہے۔ علاوہ اس کے تذکرۂ گردیزی کے دیکھنے سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ تذکرۂ گردیزی اس وقت تک طبع نہیں ہوا برٹش میوزم میں اس کا قلمی نسخہ میری نظر سے گزرا ہے اور اس نے یقین کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے، اس سے یہ الزام بالکل رفع ہو جاتا ہے۔ فتح علی حسینی گردیزی میر کی طرح یقین کا شناسا ہے اور یقین ہی کی زندگی میں اُس نے یہ تذکرہ لکھا تھا۔ یقین کے متعلق گردیزی کے خیالات ملاحظہ ہوں:۔

"صاحب تلاش معانی رنگیں انعام اللہ خاں یقین پسر اظہر الدین خان بہادر مبارک جنگ، نبیرۂ حضرت شیخ مجدد الف ثانی است، و نواسۂ نواب حمید الدین خاں مرحوم۔ شہباز خیالش لصید معنی بلند پرواز است۔ وہمائے اندیشہ اش بر قلۂ سخن بہ پر افشانی ممتاز۔ لی الاعراف (؟) ریختہ گوئی را برطاق ملن گزاشتہ وتخم معنی در زمین کاشتہ۔ وانچہ از طبعش سرزدہ از فرطِ شیوع وحُسن قبول در تمام ہندوستان بر افواہ والسنہ جاری است۔ استفادہ سخن از افادہ میرزا جان جاناں مظہر گرفتہ چنانچہ گوید شعر

جوں نماز اپنے پہ صبح وشام لازم کر یقین حضرت استاد یعنے شاہ مظہر کی ثنا

با مولف اخلاص دارد۔ واکثر ہا بملاقات بہ دارد" (ورق ۵، مخطوطۂ تذکرہ گردیزی۔ برٹش میوزیم)

معلوم ہوتا ہے کہ یقین اسی زمانہ میں مشہور بھی ہو گئے تھے کیونکہ گردیزی نے اور شعرا کے حالات میں بھی اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ ظہور کے ذکر میں لکھا ہے۔

"بخوش بیانی ونیکو بیانی مشہور است۔ در ریختہ تتبع دیوان انعام اللہ خان یقین میکند" (ورق ۵۵)

عروہ کے ذکر میں لکھا ہے" در ریختہ تتبع انعام اللہ خان یقین می نماید

دشعر را بشستگی و رنگی می گوید" (ورق ۵۶)

خود یقین نے اس بات کا نہایت ایمانداری اور صداقت کے ساتھ اپنے اشعار میں اقرار کیا ہے کہ مرزا مظہر نے ان کی شاعری میں بے حد مدد کی اور اگر مظہر مدد نہ کرتے تو غالباً اُن کے شعر اس درجہ کو نہ پہونچ سکتے وہ کہتے ہیں ؎

شعر خاطر خواہ مجھ سے ہو نہیں سکتا یقین
ہو جب استعداد ناقص پیر کامل کیا کرے

ساتھ ہی وہ یہ بھی ظاہر کر دیتے ہیں کہ میری اس ناقص استعداد کو درست کر کے مرزا مظہر نے خاصہ احسان کیا ہے اور شا یرنے سوا کوئی بھی ان کی قدر نہیں جان سکتا

مجھ سے پتھر کو کیا ہے جیوں نگین حرف آشنا
کون پہچانے یقیں بن حضرت مظہر کی قدر

اس کے علاوہ یقین اپنے اس اعتقاد اور خلوص کا بھی اعلان کر دیتے ہیں جو انہیں مظہر کی ذات کیساتھ حاصل ہے اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مظہر نے کس طرح ایک صاحب ذوق نوجوان کو اپنی شاعرانہ قوتوں اور روحانی صفتوں کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں ؎

سایہ بے شخص ٹھہرتا نہیں کہتا ہے یقیں
آپ سے مجھکو جدا حضرت مظہر نہ کرو

اس خلوص و اعتقاد کے بعد ایک درجہ وہ بھی آتا ہے کہ یقین کو اپنے استاد کی ذات پر ناز ہونے لگتا ہے اور وہ اپنی شاعری کی خوبی یا خرابی کی داد صرف انہیں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ کوئی دوسرا ان کے شعر سمجھتا بھی ہے یا نہیں، بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ سوائے مظہر کے اور کوئی ان کی شاعری سے لطف بھی نہیں حاصل کر سکتا۔ کس مزے سے، قسم کھا کر کہتے ہیں

یقین کی گفتگو کے لطف کو واللہ کب کوئی
بغیر از حضرتِ استادِ مرزا جانِ جاں سمجھے

اس کے علاوہ یقین کے کلام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنی شاعری پر فخر بھی تھا وہ جہاں مظہر سے مستفید ہونے کا ذکر کرتے ہیں اپنی اس کامیابی کا بھی اظہار کر دیتے ہیں جو اس استفادہ سے انہیں نصیب ہوئی تھی اور ایک جگہ کہتے ہیں ؎

یقین تائید حق سے شعر کے میدان کا رستم ہے
مقابل آج اس کے کوئی آسکتا ہے؟ کیا قدرت!

ایک اور جگہ اپنے کلام کے اثر کے متعلق نعرہ زن ہیں ؎

سخن کی سحر سے نزدیک ہے یقیں کہ کرے
مری زمینِ غزل دیکھ کر یہ گردوں رقص

اس تعلی کے ساتھ ہی ان کا خیال ہے کہ میں ریختہ گوئی کی طرف جس طرح چاہئے، متوجہ نہیں ہوا اگر متوجہ ہوتا تو اور بھی کمال حاصل کرتا کہتے ہیں ؎

نہ آیا سرفرو اید ہر یقین کی فکرِ عالی کا
زمینوں کو وگرنہ ریختہ کی آسماں کرتا

اس قسم کے دعوؤں کے باوجود یقین کے دل سے کبھی اپنے استاد کے احسان کا خیال دور نہیں ہوتا وہ صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ۔

طبیعت شعر کی اصلاح بن فاسد ہی رہتی ہے
وہی سمجھے یقین یہ بات جو نبضِ سخن جانے

یقین کی شاعری، جو صرف غزلوں تک محدود ہے، اعلیٰ درجہ کی ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، متاثر ہو کر لکھا ہے۔ پیشہ ور شاعروں کی طرح ان کے یہاں بھرتی کے شعر نام کو نہیں۔ ان کے اشعار زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ ہمارا کہنے والا دراصل ایک حساس ہستی ایک محبت کا متوالا اور ایک پرجوش عاشق ہے۔

یقین نے عشق و محبت کے جن جذبات پر نہایت جوش اور ولولہ کے ساتھ اشعار لکھے ہیں ان پر ایک تفصیلی تبصرہ کرنا فرصت کا کام ہے اور شاید اردو غزل گویوں میں ایک اچھی سی جگہ حاصل کر سکتا ہے۔ سرسری مطالعہ میں جو اشعار اخذ کئے جا سکتے تھے وہ ذیل میں پیش ہیں ؎

میرا جو کام وفا تھا سو ہو سکا نہ یقین　　وگرنہ اس کی جفا میں تو کچھ قصور نہ تھا!
گزر جا وصل سے اگر ہجر میں دیکھے رضا انکی　　محبت میں یقیں! لیتا ہے نام مدعا کوئی؟
ناصحو یہ بھی کچھ نصیحت ہے؟　　کہ یقین یار سے وفا نہ کرے
حق مجھے باطل آشنا نہ کرے　　میں بتاں سے پھروں! خدا نہ کرے
پیام کہو اے بلبلو! کس باغ سے آتے ہو تم　　ہے ہماری بھی تمہیں کچھ آشیانے کی خبر
جو یار غیر کے ساتھ اس طرف سے ہو گزرے　　خدا کے واسطے کوئی مجھے خبر نہ کرے
بدلہ ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے　　اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے
خلوت ہو اور شراب ہو معشوق خوب رو　　زاہد! تجھے قسم ہے، جو تو ہو تو کیا کرے؟
یقین مارا گیا جرمِ محبت پر، زہے طالع!　　شہادت اسکو کہتے ہیں، سعادت اسکو کہتے ہیں

شاید اس آخری شعر میں اپنی بیوقت موت کی طرف شاعر نے پیشین گوئی کی ہو!

زبان اور اسلوب بیان کے نقطۂ نظر سے بھی ہمیں یقین ایک اچھے شاعر نظر آتے ہیں اُن کی زبان نہایت صاف اور پاکیزہ ہے، اس قدر صاف اور پاکیزہ کہ اُن کے قریبی زمانہ میں سوائے سوز کے شاید کوئی ان کی اس بے ساختگی اور روانی میں ان پر فوقیت نہیں رکھ سکتا۔ بعض شعر مثالاً پیش ہیں۔

جو کچھ کہیں یہ مجھکو، یقیں! ہے سزا تری
بندہ جو تو بتوں کا ہوا کیا خدا نہ تھا؟

دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس
کوچۂ یار میں کیا سایہ دیوار نہ تھا؟

تری جدائی میں کیا جفا اُٹھائی ہیں
مرے جو پاس تو آتا وفا سے دور نہ تھا

پلو کو اپنے یقین کی چشم گریاں پر نہ رکھ
مت کرائے گل آ بجو میں دامن رنگیں خراب

تری آنکھوں کی کیفیت کو میخانے سے کیا نسبت
نگہ کی گردشوں کو دور پیمانے سے کیا نسبت

بہار آخر ہوئی ہے اتو سینے دے گریباں کو
یقیں! اگر تا ہے کوئی اسقدر دیوانہ پن اِبسکر

تو نہ تھا حیف یقیں! ورنہ روا نہ ہوتا
آج اس طرح کا دیکھلے پہ بزاد کہ بس

زبان اور مطالب کی خوبیاں یقیں کے یہاں سخت سے سخت بندشوں میں بھی ہاتھ سے نہیں جانے پاتیں۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ فارسی کے آخری دور کی طرح شمالی ہند کی شاعری کے پہلے دور میں ردیف اور قافیہ کی سخت سے سخت بندشیں شروع ہوگئی تھیں یہ چیز بھی اردو شاعری کے مضر عناصر میں سے ہے یقین کی غزلیں قافیہ اور ردیف کی رنگینیوں سے معمور ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان کی ردیفیں بڑی بڑی بھی ہوتی ہیں۔ بعض زمینوں کے ردیف و قافیے ملاحظہ ہوں۔

۱ رنجور رو دینا۔ کافور رو دینا
۲ کھانے کے کام آتا۔ بت خانے کے کام آتا
۳ آسمان کے ہاتھ کیا آیا۔ باغباں کے ہاتھ کیا آیا
۴ گلزار کیوں ہوتا۔ دلدار کیوں ہوتا۔
۵ پروانہ سے کیا نسبت۔ غم کھانے سے کیا نسبت
۶ آزار کیا کہئے۔ بیمار کیا کہئے
۷ داد کو پہونچے۔ فصاد کو پہونچے
۸ صیاد کے آگے۔ فریاد کے آگے۔

اس زمانہ کے اور شاعروں کی طرح یقین کے کلام میں بھی وہ الفاظ اور ترکیبیں موجود ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ متذکرہ
عار میں اس قسم کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ ایک دو یہاں بھی پیش کی جاتی ہیں۔

بتاں خوں کرکے میرا سب لگے آپس میں یوں کہنے یہ کافر جیتا رہتا تو بت خانے کے کام آتا

نہیں معلوم اب کی سال بیمانہ پہ کیا گزرا ہمارے توبہ کرنے بیچتے میخانہ پہ کیا گزرا

خوباں یقیں کو معذور اب تو رکھو کہ اسکے لہو نہیں جگر میں آنسو نہیں نہیں میں

یقین کی غزلوں کو آخری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کسی غزل میں پانچ سے زیادہ یا کم شعر نہیں۔ شاید یہ بات عجیب سی ہے۔

یقین کے کلام کے اس مخطوطہ میں کل ۲۹ ورق ہیں۔ تقطیع $\frac{1}{2}$ ۱۰ × $\frac{1}{2}$ ۶ - خط نسخ۔ عبدالرزاق خاں نے ۱۱۹۵ھ
ں نقل کیا۔ اسپرنگر کی "فہرست کتب خانجات شاہ اودھ" کے صفحہ ۲۴۶ میں یقین کے ایک اور دیوان کا ذکر ہے جو ۱۱۵۵ھ
ں لکھا گیا تھا

سید محی الدین قادری
(ام اے ام' ار' اے' ایس (لندن))

بیگار

فسانہ

"مہاراج! اس بیلے (وقت) تو مور (میرا) جی جرا (ذرا) کھراب (خراب) ہے ماف (معاف) کر دیو" یہ کہکر بڈھا جگنا کراہنے لگا۔

مہاراج رام اوتار تھے تو چار روپئے کے پیادہ لیکن مزاج ان کے زمینداروں سے بھی بڑھے ہوئے تھے ان کو جگنا کے حال زار پر کچھ بھی رحم نہ آیا بگڑ کر بولے "میں اسوقت تیری بات نہ مانوں گا اگر تو اپنی خیر چاہتا ہے تو سیدھے سیدھے میرے ساتھ ضلع تک چل وہیں کارندہ صاحب کے سامنے فریاد کر لینا"

جگنا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے پھر کہا۔ "آج تو مورے حال پر دیا کرو کوئی اور بیگار پکڑ لو"—— "نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا آج تیری باری ہے تجھکو چلنا پڑے گا"

جگنا کی عورت "میکی" ایک طرف بیٹھی ہوئی موج کوٹ رہی تھی اُس نے "مونگری" ہاتھ سے رکھدی اور بولی "ان کو تو کال (کل) سے بڑے جور کا بکھار (بخار) چڑھا ہے چلو نہیں سکت ہیں (چل بھی نہیں سکتے) مہاراج اپنی "لو دہ بندی" لاٹھی سے زمین کریدتے ہوئے گرجے "حرامزادی تو کیوں ٹرٹر کر رہی ہے" جگنا نے بات بگڑتی دیکھکر اپنی عورت کو ڈانٹ بتائی اور مہاراج سے کہا "مہرارو (عورت) کی بات کا تم کچھ خیال نہ کرو رام دے مورے ماں تنکو جور ہوت تو میں جرور چلتیوں (اگر مجھ میں ذرا بھی طاقت ہوتی تو میں ضرور چلتا) ٹھیک اسی وقت جگنا کا لڑکا مصریا گھر میں گھسا۔ پڑھا نہ لکھا بالکل اکھڑ پورے چھ فٹ کا قد۔ کسرتی بدن۔ شباب کا عالم مہاراج کی باتیں سنکر اُس کو غصہ آگیا اور بول اٹھا۔ "دیکھت تو ہو کہ بابا کا جی کھراب ہے ایسا جلم تو نہ چاہی (دیکھتے تو ہو کہ میرے باپ کا جی نہیں اچھا ایسا ظلم تو نہ کرنا چاہیئے) مصریا کی یہ مجال کہ وہ پیادہ سے زبان لڑائے۔ چمار کی یہ ہمت کہ وہ مہاراج کو آنکھیں دکھلائے۔ میکی کی بات ہی سے مہاراج کا مزاج بگڑا ہوا تھا مصریا کی باتوں نے ان کے تن بدن میں آگ لگا دی اُنھوں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ جھپٹ دوا جوتا اتار کر مصریا کے سر پر جا دیا اسی گڑبڑی میں مہاراج کی لاٹھی ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی مصریا نے اپنا سر بچانا چاہا اتفاق سے لاٹھی اچٹ کر مہاراج کے سر میں لگ گئی بس اب کیا تھا۔ مہاراج نے مصریا کو مارتے مارتے زمین پر لٹا دیا جب تھک گئے تو گالیاں دیتے ہوئے "ضلع" کو واپس ہوئے جاتے وقت یہ دھمکی بھی دیتے گئے۔ "دیوان جی سے کہکر تم لوگوں کو قید نہ کرا دیا تو میرا نام رام اوتار نہیں"

مہاراج چلے گئے تو اب پڑوسیوں نے آکر جگنا کو گھیر لیا "کیا ہوا؟ مہاراج کیوں بگڑ گئے؟" جگنا تو خاموش رہا لیکن میکی خوب چیخی چلائی۔ سب لوگوں نے زبانی ہمدردی سے کام لیا اس سے زیادہ وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ زمیندار کے پیادہ اور ایک

پنچ اسامی کا معاملہ تھا اگر ساتھ دیتے تو ان کا بھی وہی حال ہوتا جو مصریا کا ہوا تھا۔ ایسے واقعات تو گاؤں میں روز ہی ہوا کرتے ہیں جب بڑدمیوں کی بھی میدان صاف ہو گیا تو میکی نے جگنلے سے کہا۔ "اب کا ہوئی (اب کیا ہوگا) مصریا بیچ ہی میں بول پڑا ہوئی کا۔ زیادہ دکھ دیہیں تو ڈپٹی صاحب سے جا کر فریاد کر بہوں۔ سرکاری عملداری میں ایسا ظلم نہیں ہو سکت۔ جب سے میں لال گنج میں کسان سبھا دیکھ آیو ہوں اب کوؤ سے نہیں ڈرتیوں (ہوگا کیا اگر زیادہ تکلیف دیں گے تو ڈپٹی صاحب سے جا کر فریاد کروں گا سرکاری عملداری میں ایسا ظلم نہیں ہو سکتا جب سے میں نے لال گنج میں کسان سبھا دیکھی ہے اب کسی سے نہیں ڈرتا)" جگنا نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں تیں تو بڑا سورما ہے چپ نہیں بیٹھا جات۔ مہاراج رسیائے کے رحقا ہو کر لگے گئین ہیں اب جو کچھ نہ ہوے و تھوڑا ہے۔"

۲

برسات ختم ہو گئی تھی شروع جاڑے کا مہینہ تھا تالابوں کا پانی خشک ہو چلا تھا کنول کا پھولنا کم ہو گیا تھا صبح کے وقت زمین شبنم سے بھیگنے لگی تھی شام کو گاؤں کے اوپر دھواں منڈلانے لگا تھا اس وقت صبح کا وقت تھا۔ سردی سے کانپتے ہوئے دیہاتی لڑکے سورج دیوتا سے باہر نکلنے کی التجا کر رہے تھے ایک ساتھ سب چلا اٹھتے تھے "اللہ میاں گھام (دھوپ) کرو بادل (بدی) اسلام کرو" پنگھٹ پر گاؤں کی البیلی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ پانی بھرنے کے لئے نہیں بلکہ ہنسی مذاق کرنے کے لئے۔ کوئی کلسہ کو کنویں میں ڈالے اپنی پہیلی ساس کی نقل کر رہی تھی تو کوئی اپنی سکھی سے دیدے مٹکا مٹکا کر راز و نیاز کی باتیں کر رہی تھی۔ بوڑھی عورتیں اپنے پوتوں کو گود میں لئے دروازے پر کھڑی اپنی بہوؤں کو کوس رہی تھیں کہ اتنی دیر ہو گئی اب تک کنوئیں سے نہیں لوٹیں۔ پنگھٹ کے سرے پر ایکھ والے کھیت کے اس طرف خوشنما کھپریلوں کا ایک کچا مگر نفیس مکان تھا گاؤں والے اس کو "حلقہ" (ضلع) کہتے تھے اس ضلع میں موضع "بھدین" کے کارندہ لالہ سالک رام رہا کرتے تھے۔ "بھدین" ضلع مرزاپور کا ایک غیر معروف گاؤں ہے اس گاؤں کے زمیندار کنور دلپت سنگھ شہر مرزاپور میں رہتے تھے انہیں اپنے عیش و آرام سے کام تھا کبھی بھولے بسرے بھی "بھدین" میں نہ آتے تھے۔ لالہ سالک رام ان کے باپ کے وقت کے کارندے تھے اسی وجہ سے کنور صاحب کو لالہ جی پر بڑا اعتبار تھا۔ کبھی کنور صاحب کو ایک بیگار کی ضرورت ہوتی تو لالہ جی دس بیگار بھیج دیتے۔ فصل پر آم۔ جامن۔ کٹھل۔ میوہ۔ اناج اور بھوسہ کی گاڑیاں بھی پہنچا دیتے۔ کنور صاحب اسی میں خوش ہو جاتے۔ "بھدین" میں پٹی داری کا بھی جھگڑا نہ تھا کل گاؤں کے بلا شرکت غیرے لالہ جی ہی مالک تھے تنخواہ تو کل بارہ روپیہ تھی لیکن اوپر کی آمدنی سے مالا مال تھے۔ اضافہ لگان اور بیدخلی سے وہ اسامیوں کا خون چوس لیتے تھے۔ جہاں کسی اسامی نے نذرانہ دینے میں کچھ حیلہ کیا اور انھوں نے لگان بڑھا دیا۔ مہاراج رام اوتار اور سمیا پاسی ان کے دو پیادے تھے۔ یہ ڈال ڈال تھے تو وہ پات پات۔ جس وقت مہاراج رام اوتار مصریا چمار کو پیٹ پاٹ کر ضلع پر واپس ہوئے تو اس وقت لالہ سالک رام "الاؤ" کے سامنے ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے آگ تاپ رہے تھے۔ کبھی کبھی "جمبندی" کی

ورق گردانی بھی کرتے جاتے تھے ان پاس ہی زمین پر "دلو" چودھری اور منشی جمال الدین بیٹھے ہوئے تھے سمیا پاسی ایک طرف بیٹھا ہوا گانجے کا دم لگا رہا تھا۔ مہاراج کو دیکھکر لالہ جی نے پوچھا "کیوں مہاراج بڑی دیر لگائی کیا کوئی بیگار نہیں ملا ڈپٹی صاحب کے ڈیرہ پر اگر دو گھنٹے کے اندر گھاس نہ پہنچی تو مصیبت آجائیگی"

گاؤں والے اپنی اصطلاح میں کارندہ صاحب کو "دیوان جی" کہتے تھے مہاراج نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ "دیوان جی اب تو گاؤں میں رہنا نہ ہوگا۔"

"کیوں! کیوں! خیریت تو ہے"

جب چمار بھی اکڑنے لگے تو اب کیسے کام چلے گا۔ میں آج صبح اُٹھتے ہی جگنا چمار کو بلانے گیا تو وہ بہانہ کرنے لگا کہ میری طبیعت خراب ہے میں اس سے باتیں کر رہا تھا کہ اس کا لڑکا مصریا آگیا اور وہ مجھ سے لڑ پڑا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں آپ کا خیال کرکے چپ ہوگیا۔ نہیں تو مارتے مارتے سالے کا دم نکال دیتا۔"

دلو چودھری بول اُٹھے "مصریا کو تم ایسا ویسا نہ سمجھو وہ تو کسان سبھا میں بھی جاتا ہے۔ بڑا پاجی ہے"۔ منشی جمال الدین کیوں خاموش رہتے۔ کارندہ اور پیادوں کی خوشامد ہی سے تو گاؤں میں عزت ہوتی ہے کہنے لگے "درین چہ شک۔ واللہ ان چماروں کی ذات بھی اس قابل ہے کہ جب تک ان کی اُٹھتے بیٹھتے خبر نہ لی جائے اُن کا مزاج درست نہیں ہوتا۔"

سمیا پاسی کیوں سب سے پیچھے رہتا۔ ایک مرتبہ اس کی بکری جگنا کے کھیت میں چلی گئی تھی تو مصریا نے سمیا کی خوب خبر لی تھی۔ اس کا بدلہ لینے کا تو یہی موقع تھا۔ چلم کو ایک طرف زمین پر رکھتے ہوئے بولا "مہاراج بڑی چوک بھئی۔ موکا (مجھے) اپنے ساتھ لیے چلتے (لے چلتے) تو میں مصریا کی ہیکڑی بھلائے دیتوں (دیتا) دیوان جی حکم ہو تو جاکر ان دونوں چماروں کو پکڑ لاؤں"۔

دیوان جی نے سر ہلا کر کہا۔ "ابے ہاں۔ پوچھتا کیا ہے ابھی جا اور ان دونوں کو پکڑ لا"

مہاراج نے کہا "میں بھی چلتا ہوں"

دونوں پیادے کندھوں پر لاٹھی رکھے ہوئے جگنا کی منڈیا پر پہنچے۔ میکی کہیں سے ہلدی مانگ لائی تھی اس کو پیس کر الاؤ کے سامنے بیٹھی ہوئی مصریا کے بدن پر لگا رہی تھی۔ جگنا ایک طرف پوال پر پڑا ہوا پھٹی پرانی "کتھری" اوڑھے کراہ رہا تھا۔

سمیا نے پکارا "ابے او جگنا۔ ابے او مصریا چل تو کا دیوان جی بلاوت ہیں (چلو دیوان جی بلاتے ہیں)"

اس مرتبہ جگنا کی آہ و زاری نے کچھ کام نہ دیا مصریا اور جگنا کو دونوں پیادے کشاں کشاں "ضلع" کی طرف لے چلے پیچھے پیچھے میکی بھی "سنکٹا دیوی" کی منتیں مانتی ہوئی روانہ ہوئی۔ گاؤں کے تماشائی بھی ساتھ ہوئے۔ جب یہ سارا قافلہ ضلع پر پہونچا تو تماشائی باہر ہی رہ گئے احاطہ کے اندر جانے کی ان میں ہمت نہ تھی "کر گہ چھوڑ چلا ہے جائے۔ ناحق چوٹ بیچارہ کھائے" والی مثل سے وہ لوگ خوب واقف تھے۔

———— - - - - - - ————

۳

آج کل حاکم پرگنہ دورہ پہ تھے "بھدین" کے قریب ہی ایک باغ میں ان کا خیمہ لگا تھا چونکہ ڈپٹی صاحب ابھی حال ہی میں تبدیل ہو کر آئے تھے۔ ہر شخص ان کو خوش کرنے کی تدبیریں کر رہا تھا۔ پرانے ڈپٹی صاحب سے تو لالہ سالک رام کی جان پہچان تھی لیکن نئے ڈپٹی صاحب سے ناواقف تھے پھر بھی انکو خوشی تھی کہ پیشکار صاحب تو ان کے پُرانے دوست ہیں چنانچہ پیشکار صاحب نے جب کہلا بھیجا کہ بیگار کی ضرورت ہے تو فوراً اس کا انتظام فوراً کر دیا لیکن احتیاطاً ایک اور بیگار لانے کے لئے مہاراج رام اوتار کو حکم دیا لیکن آج سویرے سویرے ہی زندگی بھر میں پہلی مرتبہ دیوان جی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا غصہ میں بھرے بیٹھے ہی تھے کہ جگنا تھ اور مصریا اُن کے سامنے پیش کئے گئے تمام غصہ انہیں سرکشوں پر نکالا اور چلا کر بولے "کیوں بے حرامزادو اب تم لوگوں کی یہ ہمت ہوگئی ہے کہ مہاراج سے جھگڑا کرنے لگے ہو دیکھو اب میں تمہاری کیا گت بناتا ہوں"

جگنا نے ہاتھ جوڑ کر ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ہجور (حضور) میں تو مہاراج سے اتنے کہوں رہا کہ مو کا بکھار ہے بس یہی پھر یہ رسیا گیں اور مصریا کو مارن لاگین (میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ مجھے بخار ہے بس اتنی سی بات پر مہاراج خفا ہوگئے اور مصریا کو مارنے لگے) مہاراج نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ "ابے جھوٹ کیوں بولتا ہے"

دیوان جی کو اپنا بدن دکھاتے ہوئے مصریا نے دبی زبان سے کہا: "سرکار خود دیکھ لیں"

بڑے آدمیوں میں یہ ایک خاص صفت ہوتی ہے کہ جس بات کا وہ پہلے فیصلہ کر لیتے ہیں اس کے خلاف پھر کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ رام اوتار برہمن تھے مصریا اور جگنا چمار تھے ان کا مقابلہ ہی کیا تھا۔ ایک "شریف" برہمن کے سامنے نیچوں کی کون سنتا ہے۔ دیوان جی کے سامنے نیکی اور بدی میں جنگ ہو رہی تھی۔ ایک طرف فرض دوسری طرف غرض۔ ایک طرف محبت دوسری طرف انصاف۔ ایک طرف دنیا دوسری طرف دین کا خیال تھا۔ لیکن دیوان جی کا تو دل چھل۔ کپٹ۔ فریب و ریاکاری سے سیاہ ہو چکا تھا۔ خودغرضی دولت اور ثروت نے ان کی آنکھوں پر پٹی اور کانوں میں روئی دیدی تھی ایسی حالت میں انسان سنتا ہے مگر نہیں سنتا دیکھتا ہے مگر نہیں دیکھتا۔ دیوان جی نے سوچا کہ اگر وہ چماروں کا ساتھ دیں گے تو جگ ہنسائی ہوگی مہاراج کا تمام علاقہ میں اثر ہے۔ وہ بڑی بدنامی کرائیں گے بالائی آمدنی کا ذریعہ جاتا رہے گا یہی سب کچھ سوچ کر انھوں نے قصداً انصاف کا خون کیا۔ انھوں نے اشاروں ہی اشاروں میں سمیا پاسی کو اپنا فیصلہ دیدیا ــــ اور بڈھے جگنا اور مصریا پر مار پڑنے لگی ان کی آہ و بکا سے "ضلع گونج اٹھا" تم ولی اس جگہ سے ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ دوسروں کے بل پر اکڑنے والے سنگدل مونچھوں پر تاؤ دینے لگے "میکی" سرکار کی دُہائی دینے لگی ٹھیک اسی وقت باہر کچھ شور ہوا۔ "ڈپٹی صاحب آگئے" سمیا نے ہاتھ روک لیا۔ لالہ جی اپنی دھوتی سنبھالتے ہوئے کھڑے ہوگئے مہاراج کے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔

جگنا ایک طرف زمین پر بیہوش پڑا تھا اس کے زیادہ چوٹ لگی تھی۔ مصریا طاقتور تھا اتنی مار کھانے پر بھی وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ دیوان جی نے بڑے ادب سے جھک کر پہلے ڈپٹی صاحب کو اور پھر پیشکار صاحب کو سلام کیا۔ ڈپٹی صاحب کو تو خوف یا ڈر سے

لیکن پیشکار صاحب کو اپنا مددگار سمجھکر۔ آخر انہیں کے لئے تو یہ مفت کی بیگاری تھی گیا اب وہ دیوان جی کی مدد نہ کریں گے؟

ڈپٹی جانتی پرشاد بڑے نیک دل اور منصف مزاج تھے آج کل اس صفت کے حاکم مشکل سے ملتے ہیں لیکن اس زمانہ میں کوئی ہر ایک کا خوش نہیں رکھ سکتا چنانچہ جہاں ڈپٹی صاحب سے سارا علاقہ خوش تھا وہاں ایسے بھی لوگ تھے جو ان سے ناراض تھے ان کی منصف مزاجی سے پیشکار۔ اردلی غرضکہ ان کا سارا عملہ نالاں رہتا تھا۔ پرانے ڈپٹی صاحب کے زمانہ میں اہلکاروں کی چاندی تھی لیکن اب سوکھی تنخواہ میں ان کا مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔ ڈپٹی جانتی پرشاد کے سامنے امیر غریب سب برابر تھے شریف پردر ہوتے ہوئے غریب پرور بھی تھے۔ جگوا اور مصریا کے حال زار پر ان کو رحم آگیا ان کی تجربہ کار نظروں نے سب کچھ معلوم کرلیا ظالم اور مظلوم کی حالت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ حاکم پرگنہ کے قیام کے زمانہ بھی یہ اندھیر کھاتہ! ایسا ظلم! ان کے خواب دخیاں میں بھی نہ آیا ہوگا۔ ڈپٹی صاحب دیوان جی سے مخاطب ہوکر پوچھا "کیا آپ ہی اس گاؤں کے کارندہ ہیں؟"

دیوان جی نے خوشامدانہ لہجہ میں جواب دیا "جی حضور"

ڈپٹی صاحب نے چماروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان غریبوں کی ایسی کونسی خطا تھی جسکی پاداش میں آپ کو قانون اپنے ہاتھ میں لینا پڑا؟"

اب تو دیوان جی کی گھگھی بندھ گئی گھبرا کر پیشکار صاحب کی طرف دیکھنے لگے ایک مرتبہ پہلے ہی جب دیوان جی نے کسی اسامی کو پٹوایا تھا تو اس نے سابق ڈپٹی صاحب سے جاکر فریاد کی لیکن پیشکار صاحب کی عنایت سے دیوان جی کو تو کچھ نہ ہوا بلکہ الٹا اسامی ہی کو تین ماہ کے لئے جیل جانا پڑا تھا۔ لیکن آج خلاف معمول پیشکار صاحب کی آنکھوں سے بجائے ہمدردی کے نفرت کا اظہار ہو رہا تھا دیوان جی کو "بسوہ کے بجائے بیگھہ" "کاشت کو غیر کاشت" "موروثی کو غیر موروثی" بنادینے کا خوب تجربہ تھا لیکن انھیں اس کا بالکل تجربہ نہیں تھا کہ اہلکار حاکم پرگنہ کے اشاروں پر ناچتے ہیں جس رنگ میں اپنے حاکم کو دیکھتے ہیں اسی میں وہ خود بھی رنگ جاتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب کی نگاہیں پھری دیکھکر بھلا پیشکار صاحب کچھ سفارش کرنے کی کیسے جرأت کر سکتے تھے۔

دوان جی کو بحر خیال میں غوطے لگاتے دیکھکر ڈپٹی صاحب نے مکرر دریافت کیا تو دیوان جی نے کہا "حضور! ان چماروں نے میرے پیادے کی جو برہمن ہے بڑی بے عزتی کی ہے"

ڈپٹی صاحب نے مسکرا کر کہا "ان غریب چماروں نے؟"

ڈپٹی صاحب کو مسکراتے دیکھکر دیوان جی پھول گئے۔ بقول تلسی داس جی جس طرح سوکھے تال اور تلیاں برساتی۔ پانی پاکر آپے سے باہر ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح کمظرف آدمی بھی ذرا سی بات پر اترانے لگتا ہے۔ دیوان جی نے اپنے خاص فتنیانہ لہجہ میں جواب دیا۔ "حضور آپ ان چماروں کو غریب نہ سمجھیں یہ بڑے موٹے اسامی ہیں ان کی سرکشی تو گاؤں بھر میں مشہور ہے۔ یہ آپ ہی لوگوں کا اقبال ہے کہ میں ان کو دبائے رکھتا ہوں ورنہ یہ لوگ تو ہمارا گاؤں رہنا دشوار کردیں۔ حضور ابھی ان لوگوں سے واقف نہیں ہیں"

ڈپٹی صاحب کا لہجہ بدل گیا انھوں نے کہا "یہ سب کچھ سہی مگر آپ کو یہ کسی نے اختیار نہیں دیا کہ آپ ان لوگوں کو کوئی سزا دیں

اگر ان کے خلاف آپ کو کوئی شکایت تھی تو آپ قانونی کارروائی کر سکتے تھے آخر ہم لوگ کس واسطے ہیں" یہ کہکر ڈپٹی صاحب نے مصریا سے اس کا حال پوچھا وہ خوف بھری نظروں سے دیوان جی کی طرف دیکھنے لگا جس کا مطلب تھا" بتانے کو تو سب بتا دوں لیکن آپکے جانے کے بعد میری جو گت بنے گی اس کا ذمہ دار کون ہوگا" ڈپٹی صاحب اس کا مطلب سمجھ گئے انھوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا" تم کچھ خوف نہ کرو اب دیوان جی تمہارا کچھ نہیں کر سکتے" لیکن مصریا اب بھی خاموش تھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکتا تھا۔ آخرکار اس مشکل کو اس کی ماں میکی نے ڈپٹی صاحب کے سامنے آکر حل کر دیا۔ عورت کا دل نازک ہوتا ہے۔ جوان بیٹے اور بڈھے شوہر کی مصیبت کو دیکھکر وہ کیسے خاموش رہ سکتی تھی۔ جب کوئی اس کا ہمدرد نہ تھا تب تو وہ چپ نہ رہ سکی تھی اب ڈپٹی صاحب ایسے ہمدرد کو پاکر وہ اس موقع کو بھلا کیوں ہاتھ سے جانے دیتی۔ وہ روتی ہوئی ڈپٹی صاحب کے پاؤں پر گر پڑی ——— "دہائی ہے سرکار کی۔!"

ڈپٹی صاحب جلدی سے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے اس خیال سے نہیں کہ میکی چمارن ہے بلکہ اس وجہ سے کہ خوشامد انصاف کا خون کر دیتی ہے۔

میکی نے رو رو کر ساری سرگزشت شروع سے لیکر اخیر تک سنا دی۔ اب انصاف کی باری آئی دیوان جی، مہاراج، رام اوتار، سمیا پاسی کے بیانات قلمبند کئے گئے۔ منشی جمال الدین اور چودھری دو موقع کے گواہ بنائے گئے

ڈپٹی صاحب نے میکی سے کہا "تمہارے لڑکے اور شوہر کو ڈاکٹری معائنہ کے لئے مرزاپور جانا پڑے گا" میکی جوشِ انتقام میں پاگل ہو رہی تھی اس نے کہا "جو حکم ——"

۴

سول سرجن نے مصریا کو "ضرب خفیف" اور جگنا کو "ضرب شدید" کا سرٹیفکٹ دیا۔ اب پولیس کی کارروائی شروع ہوئی۔ داروغہ جی مع اپنے چند "نفر" کانسٹبلان کے "بھدین" میں رونق افروز ہوئے۔ ضلع پر سب کچھ موجود تھا۔ گھوڑے کے سامنے گھاس ڈال دی گئی۔ دودھ کے گھڑے آ گئے۔ خوان نعمت بچھ گیا تر لقمے اڑنے لگے جنھیں اپنے گھر میں سوکھی روٹی بھی مشکل سے ملتی تھی وہ پوری کچوری حلوہ وغیرہ کو دیکھکر ناک بھوں چڑھانے لگے۔ دماغ زمین سے آسمان پر پہنچا۔ ان سب "تکلفات" یا "حقوق" سے فراغت پاکر داروغہ جی نے تفتیش شروع کی۔ اڑوس پڑوس میں بھاد حکڑ ہونے لگی کسی کو ڈرایا کسی کو دھمکایا۔ حاکم پرگنہ کے حکم سے اس مقدمہ کی بنیاد پڑی تھی ان کا خیمہ ڈیرہ بھی بھدین کے قریب لگا ہوا تھا اس وجہ سے داروغہ جی کو زیادہ پاؤں پھیلانے کا موقع نہ ملا پھر بھی انھوں نے اپنا کچھ بھلا کر ہی لیا شہادت کافی سے زیادہ بہم پہنچ گئی اور داروغہ جی نے اپنی تفتیش مکمل کر کے ڈپٹی جانتی پرشاد کے یہاں مہاراج رام اوتار۔ دیوان جی سالک رام اور سمیا پاسی کا اس جرم میں چالان کر دیا کہ ان لوگوں نے جگنا اور مصریا کو حبس بیجا میں رکھکر اذیت جسمانی پہنچائی۔ اس کی خبر بھدین کا تو ذکر کیا دور دور تک پہنچ گئی۔ کنور صاحب کو تو اپنے عیش و عشرت سے کام تھا۔ معاملہ مقدمہ سے ان کی روح فنا ہوتی تھی پھر بھی ضمانت دیکر ملزموں کو رہائی دلائی ایسا نہ کرتے تو ان کی بدنامی ہوتی لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکے ڈپٹی صاحب کے

پاس جاکر سفارش کرنے کی انہیں جرأت نہ ہوئی مرزاپور واپس جاکر مقدمہ کی پیروی کرنے کے لئے انہوں نے ایک وکیل بھیجدیا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا۔ دیوان جی اور مہاراج نے وکیل صاحب کے سامنے رو رو کر کہا "وکیل صاحب! جس طرح بھی ہو ہماری عزت بچالو۔ روپیہ پیسہ کی کچھ فکر نہ کرنا ہم آپ کو خوش کردیں گے۔"

وکیل صاحب مقدمہ کے حالات سے واقف ہوچکے تھے انھوں نے جواب دیا۔ "مقدمہ بہت سنگین ہے کامیابی کی بہت کم اُمید ہے۔"

یہ سنتے ہی مہاراج اور دیوان جی کے چہروں پر اداسی چھاگئی۔ دیوان جی نے اداس ہوکر کہا۔ "تو کیا اب ہماری عزت کسی طرح نہیں بچ سکتی؟"

وکیل صاحب نے کہا۔ "بس ایک ترکیب رہ گئی ہے۔"

سوکھے دھانوں میں پانی پڑگیا سب نے ایک زبان ہوکر کہا۔ "وہ کیا"

وکیل صاحب نے جواب دیا۔ "قانون سے تو تم لوگ کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ ہاں اگر جگنا ڈپٹی صاحب سے جاکر کہدے کہ اُسکو تم لوگوں سے کوئی شکایت نہیں ہے تو بہت ممکن ہے کہ ڈپٹی صاحب مقدمہ خارج کردیں۔" ترکیب تو اچھی ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ جگنا سے کون جاکر کہے اور کہے بھی تو کس منہ سے۔ مصریا اور جگنا کی بےعزتی کرکے کوئی اُن سے سفارش کی کیسے درخواست کرسکتا تھا ایک بات اور تھی مہاراج اور دیوان جی چماروں کے سامنے جاکر کیا اپنا سر اُٹھا سکتے تھے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وکیل صاحب کی رائے پر کوئی عمل کرنے کرنے لئے تیار نہ ہوا۔ دیوان جی کا اپنا "بھدین" میں کوئی نہ تھا جو ان کے غم میں شریک ہوتا۔ ایک دور کے رشتہ دار کو اپنے وطن غازی پور سے بلایا تھا لیکن اُنھوں نے بھی کورا جواب بھیج دیا تھا کہ "مجھے فرصت نہیں ہے" مہاراج کا گھر "بھدین" ہی میں تھا۔ "مہاراجن" کے سوا ان کا بھی اس دنیا میں کوئی اپنا ساتھی نہ تھا۔ سمیا پاسی کا کنبہ بڑا تھا لیکن اس کی بساط ہی کیا وہ تو دیوان جی اور مہاراج کے ہاتھوں میں کھلونا تھا۔ جب وکیل صاحب کے پاس سے مہاراج اپنے گھر پر پہنچے تو مہاراجن نے پوچھا—

"سب کشل (خیریت) تو ہے۔"

مہاراج نے اداس ہوکر جو کچھ انھوں نے وکیل صاحب سے سنا تھا مہاراجن سے کہدیا۔

"مقدمہ کب ہوگا؟"

"کل سویرے ۱۰ بجے"

مہاراجن کا کلیجہ دھڑکنے لگا اس نے کہا۔ "میں میکی سے جاکر کہونگی وہ میری بات ضرور مان لیگی"۔ "نہیں نہیں تم ان چماروں کے یہاں ہرگز نہ جانا میں یہ بےعزتی نہیں برداشت کرسکتا کہ تم چماروں کی خوشامد کرو اس سے تو مرجانا ہی اچھا ہے" مہاراجن چپ ہوگئیں مہاراج تھوڑی دیر کے بعد پھر گھر سے چلے گئے اُن کے جانے کے بعد مہاراجن نے بھی گھر سے قدم باہر نکالا، دن ڈوب رہا تھا مویشی چراگاہ سے واپس ہو رہے تھے چھوٹے چھوٹے بچے جو دنیا کی فکروں سے آزاد ہیں کوئی مٹی کے گھروندے بناکر کھیل رہا تھا اور کوئی

"گلی ڈنڈا" سے اپنا دل بہلا رہا تھا - مہاراجن نے جلدی جلدی اپنا قدم بڑھایا وہ میکی سے ملنے جا رہی تھیں پہلے تو انھوں نے بھی یہی سوچا تھا کہ چماروں کی خوشامد کرنے سے تو مر جانا ہی اچھا ہے لیکن جب انھوں نے مہاراج کی آنے والی مصیبت کا خیال کیا تو انکا کلیجہ کانپ اُٹھا شوہر کی محبت میں وہ اس بے عزتی کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوگئی اور بہت جلد میکی کے پاس پہنچ گئیں - جگنا اور مصریا تو کہیں باہر گئے ہوئے تھے میکی ہی اکیلی اپنے منڈیا میں بیٹھی ہوئی "کلنی" کا بھات پکا رہی تھی - مہاراجن کو دیکھکر اس کا دماغ عرش پر پہنچ گیا میکی کے دل میں خوشی کے جذبات اُٹھنے لگے - وہ سوچنے لگی "ادہو مہاراجن میری خوشامد کرنے آئی ہیں اب ان کا وہ غرور کدھر گیا کاش اس وقت مصریا اور اس کا باپ گھر پر ہوتا کاش تمام گاؤں والے آکر دیکھتے کہ مہاراجن ایک نیچ چمارن کے یہاں آئی ہیں" یہ پہلا انتقام تھا میکی نے اپنی طبیعت کو سنبھال کر کہا - "دہن ہے مہاراجن! گریبن (غریبوں) کی منڈیا میں تم کیسے آگئیں؟"

جملہ طعنہ آمیز تھا کوئی اور وقت ہوتا تو مہاراجن میکی کی خوب خبر لیتی لیکن آج بگڑنے کا موقع نہیں تھا - مہاراجن نے کہا "میکی ——"

میکی مہاراجن کی طرف غور سے دیکھنے لگی تھوڑی دیر تک مہاراجن چپ رہیں وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں - ایک طرف مہاراجن کی خودداری اور خاندانی وقار ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ ایک چمارن سے کوئی درخواست کریں لیکن دوسری طرف مہاراج کی عزت کا سوال تھا اگر ان کو سزا ہوگئی وہ قید ہوگئے تو کیا اس میں مہاراجن کی بے عزتی نہ ہوگی آخرکار مہاراجن نے رک رک کر کہا "میکی! میں آج تم سے بھیک مانگنے آئی ہوں" اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکیں - منھ ڈھاپ کر رونے لگیں -

میکی کانپ اُٹھی - مہاراجن اور ایک نیچ چمارن سے بھیک مانگیں، میکی کے کانوں میں یہی صدا گونجنے لگی - "میں تم سے بھیک مانگنے آئی ہوں" میکی گنوار اور جاہل ہوتے ہوئے بھی اتنی بیوقوف نہ تھی کہ وہ مہاراجن کا مطلب نہ سمجھتی - اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے سر پر انتقام کا بھوت سوار تھا لیکن مہاراجن کی حالت پر اسکو دیا آگئی - وہ عورت تھی عورت کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتی تھی - مہاراجن کے دردآمیز جملہ نے اس کا دل پگھلا دیا اس کے سر پر سے انتقام کا بھوت اتر گیا - میکی کا تو یہی مقصد تھا کہ دشمنوں کا سر نیچا ہو دشمن خود اپنی زبان سے شکست کا اقرار کرے یہی بجی فتح ہے میکی نے کہا - "مہاراجن گسیاں (پرماتما) تمیں بنائے رکھیں ہم تمسرے حکم سے باہر نہ ہوئیے (رہوں گے)"

مہاراجن کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں انھوں نے جوش محبت میں میکی کا ہاتھ تھام لیا اور کہا - "ڈپٹی صاحب سے کہلا دو کہ وہ مقدمہ اُٹھا لیں" یہ کہکر مہاراجن نے ایک پوٹلی جن کو وہ اپنے کپڑوں میں چھپائے ہوئی تھیں نکال کر میکی کے پاؤں پر رکھدی اس کے اندر کچھ روپیہ اور مہاراجن کے چاندی کے زیور تھے لیکن سخت اصرار کرنے پر بھی میکی نے لینے سے انکار کر دیا - آج مہاراجن کو بھی اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ شرافت کسی کا ورثہ نہیں یہ لعل بے بہا کبھی اونچے گھرانوں کے محلوں میں چمکتا ہے تو کبھی گھاس پھوس سے چھائی ہوئی جھونپڑیوں کو بھی روشن کرتا ہے -

میکی کے اطمینان دلانے پر مہارانی خوش خوش اپنے گھر واپس ہوئیں۔

۵

آج ڈپٹی جانتی پرشاد کی عدالت میں خاص رونق تھی وہ لوگ جو عدالت سے دور بھاگتے تھے انھوں نے بھی آج پرانے کپڑوں کو دھو دھلاکر زیب تن کیا۔ خوب سنبھال کر پگڑی باندھی اور عدالت میں پہنچ گئے جن کو اندر جگہ نہ ملی وہ باہر ہی کھڑے ہو کر مقدمہ کی کارروائی دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ تماشائی ٹوٹے پڑتے تھے۔ وقت مقررہ پر ڈپٹی صاحب تشریف لائے چاروں طرف خاموشی چھاگئی لوگ سانس لیتے تھے مگر رک رک کر کہ کہیں آواز نہ نکل جائے اور چپراسی عدالت سے باہر نکال دے۔ دیوان جی سالک رام۔ مہاراج ورام اوتار اور سمیا پاسی ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے تھے ملزموں کے اداس چہروں پر سب کی نگاہیں پڑ رہی تھیں مقدمہ کی کارروائی شروع ہی ہونے والی تھی کہ جگنا نے ہاتھ جوڑ کر ڈپٹی صاحب سے کہا "حجور ہمکا کچھ شکایت نہیں ہے مقدمہ اٹھالیں" سب لوگوں نے حیرت سے جگنا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے خوف یا ڈر کے بجائے استقلال کا پتہ چلتا تھا۔ دروغہ جی غضب آلود نظروں سے جگنا کو گھورنے لگے ڈپٹی صاحب کو بھی اس کا یا پلٹ پر سخت تعجب معلوم ہوا ملزموں نے احسانمند نگاہوں سے جگنا کی طرف دیکھا۔ ان نگاہوں میں معذرت کا پیغام پوشیدہ تھا۔

ڈپٹی صاحب نے سوچا شاید جگنا کو رشوت دی گئی ہے یا اس پر کسی نے زور ڈالا ہے انھوں نے کہا "جگنا خوب سوچ سمجھ لے۔ تجھے کسی نے ڈرایا دھمکایا تو نہیں ہے اگر ایسی کوئی بات ہو تو صاف صاف بتادے تجھے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"

جگنا نے جواب دیا "حجور ہم پر کسی نے دباؤ نہیں ڈالا ہم خوشی سے چاہت (چاہتے ہیں) کہ آپ مقدمہ اٹھالیں"

اب کچھ کہنا سننا فضول تھا۔ ڈپٹی صاحب انصاف پسند ہوتے ہوئے شریف پرور بھی تھے وہ صلح صفائی کی کارروائی میں کوئی اعتراض نہیں کرتے تھے انھوں نے سوچا کہ ملزموں کی کافی بے عزتی ہو چکی ہے جگنا اور مصریا کو گاؤں میں رہنا ہے "دریا میں رہ کر مگر سے بیر" بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے انھوں نے ملزموں سے مخاطب ہو کر کہا "دیکھو اب کبھی بیگار نہ لینا اسامیوں پر سختی نہ کرنا میل جول سے جو کام نکل جاتا ہے وہ ظلم سے کبھی نہیں نکل سکتا ہے۔ اپنی حماقت کا تم لوگوں کو کافی سبق مل چکا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اب تم لوگ آئندہ احتیاط سے کام لوگے"

یہ کہکر ڈپٹی صاحب نے مقدمہ خارج کر دیا۔ عدالت سے باہر نکل کر گاؤں والے دیوان جی اور مہاراج کو مبارکباد دینے لگے لیکن ان لوگوں نے بھیڑ سے نکل کر جگنا کو آواز دی "جگن بابا"

جگنا کو آج تک کسی نے "جگن بابا" کہکر نہیں پکارا تھا وہ فرط خوشی سے بیتاب ہو گیا اور دوڑ کر دیوان جی کا پاؤں چھو لیا۔ مصریا نے مہاراج کے قدموں پر سر جھکا دیا۔ اسوقت دیوان جی یا مہاراج کو اس بات کا خیال بالکل نہیں تھا کہ چاروں نے ان کے پاؤں کیوں چھوا اس وقت انکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے یہ آنسو خوشی کے تھے رنج یا حقارت کا ان میں کوئی نشان نہ تھا۔ اس وقت نیچ "اونچ" کا سوال نہ تھا یہ پریم ملاپ تھا۔ سمیا پاسی کے ساتھ ہی سب لوگ یکبارگی چلا اُٹھے "جگن بابا کی جے"

اعظم کریوی

نقد الشعر

(بہ سلسلۂ ما سبق)

تجنیس اس کے معنے متشابہ الفاظ کا استعمال کرنا ہے اس کی سات قسمیں ہیں:-
تجنیس تام - تجنیس ناقص - تجنیس زائد - تجنیس مرکب - تجنیس مزدوج - تجنیس مطرف - تجنیس خط -

تجنیس کی تمام قسموں کا استعمال نظم اور نثر دونوں میں دلیل فصاحت ہے بشرطیکہ استعمال میں مذاق سلیم کو دخل ہو ورنہ یہی "حسن" عیب بن جاتا ہے -

مذاق سلیم کے دخل کے یہ معنے ہیں کہ اسکا استعمال اس طرح نہ ہو کہ اس میں زیادتی اور تعدد نامناسب ہو - اس میں تناسب کا خیال اچھا ہے ایک شعر میں دو سے چار الفاظ تک اہل نظر کے نزدیک "حسن" ہے

تجنیس تام - اسکی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک جگہ دو کلمے متفق اللفظ اور مختلف المعنے اس طرح استعمال کئے جائیں، جیسا خاقانی کہتا ہے :-

مفخر خاقانیست مدح تو تا در جہاں
صبح بزد آب ماہ میوہ برد ماہ آب

ایک اور شاعر کہتا ہے :-

اے چراغ ہمہ بتانِ خطا　　دور بودن ز روی تست خطا

تجنیس ناقص اس میں ایسے کلمات متجانس ہوتے ہیں کہ حروف متفق لیکن حرکات مختلف ہوتے ہیں - مثلاً قطران کا شعر ہے :-

پیادہ شود دشمن از اسپ دولت　　چو باشی براسپِ سعادت سَوار
براسپ سعادت سواری وداری　　بدست اندروں از سعادت سوار

پہلے شعر میں سوار (فتح سین سے) ہے جس کے معنے مشہور راکب کے ہیں - دوسرے شعر میں سوار (کسر سین سے) ہے جس کے معنے کنگن کے ہیں - تجنیس زائد - یہ ہے کہ ایک کلمۂ متجانس دوسرے سے بمقدار ایک حرف زیادہ ہو مثلاً :-

در حسرت رخسار تو اے زیبا روے
از نالہ چو نال گشتم از مو یہ موے

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں نالہ اور نال مویہ اور موے میں تجنیس زائد ہے -

تجنیس مرکب - اسمیں الفاظ متجانس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک کلمہ مفرد ہوتا ہے اور دوسرا دو کلمہ سے مرکب ہوتا ہے مثلاً :-

سرو بالاے کہ دارد بر سرِ سرو آفتاب لو
آفتِ دلہاست و ندر دیدگاں زاں آفت آب

دوسرا شعر دیکھئے :-

دررہ تو تا زندہ ام بربوے تو تا زندہ ام

اس شعر کے پہلے مصرع میں تازندہ مرکب ہے تا اور زندہ سے یعنی جب تک میں زندہ ہوں - دوسرے مصرع میں تازندہ مفرد ہے جس کے معنے دوڑنے والے کے ہیں - اس میں تا اور زندہ اور تازندہ میں تجنیس مرکب ہے -

تجنیس مزدوج اس تجنیس میں کلمات متجانس ایک دوسرے کے مترادف ہوتے ہیں - معزی کے اشعار ہیں -

ہست شکر بار یاقوتِ تو اے عیار یار نیست کس را نزد آں یاقوت شکر بار بار

سال سرتاسر چو گلزار است خرم عارضت چون دل من صد دل اندر عشق آں گلزار زار

نیمۂ دینار ماند آں دہانِ تنگِ تو صد دلِ تنگم نگند آں نیمۂ دینار نار

کبھی اس کی صورت تواتر کی ہوتی ہے اس کی مثال یہ ہے :-

افتادمرا با دل مکار تو کار
وافگند دریں دلم دو گلنار تو تار

معزی کہتا ہے :-

اے گوے زنخ سخن زگویت گویم وے موئے میاں زعشق کے مویت مویم

کبھی تکرار کی صورت اس طرح ہوتی ہے :- رشید کہتا ہے -

زہے مخالفتِ امر تو خطا و خطا زہے موافقتِ رائے تو صواب صواب

ایک اور شعر اسی صنعت میں ہے :-

جہاں از دولت سلطانِ اعظم
بہار اندر بہار اندر بہار ست

تکرار کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ لفظاً تکرار ہو لیکن باعتبار معنے کے اس میں خوبی سمجھی جائے مثلاً :-

پیش شمال، ویت پائے شمال در گل
پیش سحاب رستت، دست سحاب بر ہم

ایک صورت تکرار متکلف کی ہوتی ہے عسجدی کہتا ہے :-

بارانِ قطرہ قطرہ ہمی بارم ابروار ہر روز خیرہ خیرہ ازیں چشم سیل بار

زان قطرہ قطرہ قطرۂ باراں شدہ خجل
زان خیرہ خیرہ خیرہ دل وجان من نگار

تجنیس مطرف۔ اس میں دو کلمہ متجانس تمام حروف میں سوا حرفِ طرف کے باہم متفق ہوتے ہیں۔ حرفِ طرف آخر حرف کو کہتے ہیں مثلاً:۔

ازشرار تیغ بودے بادساداں راشراب
وز طعان رمح بودے خاکساراں راطعام

جب دونوں کلمے متقارب ہوں تو اس کا نام "اشتقاق" ہوگا۔ مثلاً

نوا ے توا ے خوب چہر نمائیں   در آرزو درکار من بے نوای

تجنیس خط۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ الفاظ صورت میں بظاہر ایک معلوم ہوتے ہیں لیکن معنے میں فرق ہوتا ہے مثلاً:۔

ہماں خوشتر کہ نوشی اندریں مدت مے صافی
ہماں بہتر کہ پوشی اندریں موسم خز ادکرہ

نوشی اور پوشی لفظاً اگر ن اور پ پر نقطے نہ دیجے تو ایک معلوم ہوں گے نقطے دینے سے صورت ایک رہتی ہے صرف خط و خال میں فرق معلوم ہوتا ہے لیکن معناً دونوں باہم بالکل مختلف ہیں۔

مطابقت لغت میں کسی چیز کا مقابلہ کسی ایسی چیز کے ساتھ جو اس کے مثل ہو، اصطلاح میں متضاد اشیا کو ایک سلسلے میں لانے کا نام ہے نظیری کا ایک شعر دیکھئے اس میں آٹھ چیزیں یکجا کی ہیں:۔

بزم ور زمش ور دو خار و عفو و خشمش نور و نار
امن و بیمش تخت و دار و مہر و کینش فخر و عار

دو شعر کسی کے اس صنعت میں بہترین یہ ہیں:۔

غم بالطفِ تو شادمانی گردد   عمر از نظر تو جاودانی گردد
گر باد بدوزخ برد از کوی تو خاک   آتش ہمہ آب زندگانی گردد

تشبیہ ایک چیز کو دوسری چیز کے مشابہ کرنے کو کہتے ہیں، دونوں مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان کسی مشترک شے کا ہونا ضروری ہے ارباب فن کے نزدیک کامل تر اور بہترین تشبیہ وہ ہے کہ اگر چاہیں تو مشبہ اور مشبہ بہ کو باہم تشبیہ دیکین مثلاً زلف کو رات کہہ سکتے ہیں۔ اور رات کو زلف۔

ناقص تشبیہ کی بنیاد صرف وہم و خیال پر ہوتی ہے خارج میں اس کی مثال نہیں ہوتی۔ مثلاً کوئی شخص تنورہ آتش کو مشک سے بھرے ہوئے دریا سے تشبیہ دے، ارزقی نے اس قسم کی تشبیہات سے اپنے اشعار کو اکثر ناپاک کیا ہے۔

آج کل نئی فارسی کے نئے شاعر، نئی روشنی کے اردو شاعر اس قسم کے تماشے اکثر کرتے ہیں اور تماشہ بینوں سے داد لیتے ہیں۔

تشبیہ کی حسب ذیل قسمیں ہیں:-

تشبیہ صریح۔ تشبیہ کنایہ۔ تشبیہ مشروط۔ تشبیہ معکوس۔ تشبیہ مضمر۔ تشبیہ تسویت۔ تشبیہ تفصیل

تشبیہ صریح۔ اس میں الفاظ تشبیہ ہمچناں، بداں، می ماند وغیرہ مذکور ہوتے ہیں مثلاً ازرقی کہتا ہے:-

بیچیدں افعی بکمندت ماند ....

اندیشہ برفتن سمندت ماند   خورشید بہ ہمت بلندت ماند

تشبیہ کنایہ۔ وہ ہے کہ حروف تشبیہ سے خالی ہو مثلاً عنصری کا یہ شعر:-

گاہ برماہ دو ہفتہ گرد مشک آری پدید تو

گاہ مرخورشید را در غالیہ پنہاں کنی

تشبیہ مشروط۔ وہ ہے جس میں حرف شرط مذکور ہو مثلاً:-

اگر مورے سخن گوید و گر موے رواں دارد

من آں مور سخن گویم من آں مویم کہ جاں دارد

تشبیہ معکوس۔ وہ ہے جس میں ایک شے دوسری شے سے تشبیہ دی جاتی ہے، پھر مشبہ بہ کو پہلے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مثلاً عنصری کہتا ہے:-

زسم ستوران وگرد سیاہ   زمین ماہ روی و زمین روے ماہ

زمین کے چہرے کو گھوڑوں کے نعل کے نشاں کی وجہ سے چاند سے تشبیہ دی ہے اس کے بعد چاند کو کثرت غبار سے زمین کہدیا ہے۔

تشبیہ مضمر۔ وہ ہے کہ شاعر کسی وصف میں تشبیہ کو مضمر رکھتا ہے اور اس معنے سے اس کی مراد وہی تشبیہ ہوتی ہے مثلاً:-

گر انگبیں لبی سخن تو چراست تلخ

ور یاسمیں بری تو بدل چونک آہنی

اس جگہ شاعر شہد سے معشوق کے لب کو تشبیہ دیتا ہے اور آغوش کو یاسمین سے

(باقی)

کیفی چریاکوٹی

ڈرامے کا ایک سین

نمبر ۱

شاہنواز بانی سلطنت جمہوری کا جہاز بندرگاہ دمشق پر کنارے کے قریب پہونچ چکا ہے کہ اتفاقاً اُس میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس خوفناک منظر کو یعقوب ملک التجار کنارے سے دیکھتا ہے اور اپنی کشتی مصیبت زدہ مسافروں کی امداد کو روانہ کرتا ہے اتفاق سے صرف ایک ہی شخص یعنی شاہنواز یعقوب کے مددگاروں کے ذریعہ سے زندہ کنارہ پر پہونچتا ہے اور باقی سب طعمۂ اجل ہوجاتے ہیں۔

نمبر ۲

زبیدہ یعقوب کی حسین لڑکی حالت بیماری میں شاہنواز کی تیماردار ہوتی ہے، ایک طویل زمانہ کی یکجائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پری جمال زبیدہ نوجوان شاہنواز کو دل دے بیٹھتی ہے لیکن خلاف اُمید شاہنواز اس کی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ تلوار کا عاشق عورت کی محبت کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ اب وہ وقت ہے کہ شاہنواز اپنے محسن سوداگر یعقوب سے رخصت طلب کرتا ہے اور اپنی نوآبادی کا ارادہ کرتا ہے رخصت مل جانے پر ایک آخری اُمید زبیدہ کو پیدا ہوتی ہے اور ایک رقعہ کے ذریعہ سے شاہنواز کو اپنے باغ میں بلواتی ہے۔

نمبر ۳

حسب قرار داد زبیدہ آدھی رات گزر جانے کے بعد مقام مقررہ پر شاہنواز کا انتظار کر رہی ہے۔

زبیدہ (آپ ہی آپ) مہیب رات - خوفناک وقت - وحشت انگیز رات نے
اپنی زلف دراز کا سایہ مخلوقات عالم پر پھیلا دیا ذیحیات ہستیاں محو خواب ہیں

شب تاریک نے ڈالے ہیں دو آسا نہیں　　چھپے ہیں خوف ظلمت سے پرندے آشیانوں میں
ہوا کی سنسناہٹ تیر بن جاتی ہے کانوں میں　　چمکتے ہیں نجس نمونکو جادو گر مسانوں میں

ہوا پر اڑ کے ٹکڑے ابر کے طوفان لائے ہیں
کہاں پر کھینچ کر مجھکو مرے ارمان لائے ہیں

وہ ابھی تک نہیں آیا - آئیگا ضرور آئیگا اور دنیا کے اسٹیج سے یہ سیاہ پردہ اُٹھنے سے پہلے میری قسمت کا فیصلہ ہوجائیگا۔

شاہنواز ایک سیاہ جبہ میں داخل ہوتا ہے

زبیدہ - دھوئیں کی طرح شب تاریک میں صنف نازک کی طرف بڑھنے والے سایہ (خفیہ لفظ)

شاہنواز - پریسیڈنٹ سلطنت جمہوری

زبیدہ - اوہ مجھے انتظار کی تکلیف دیر تک اٹھانا نہیں پڑی، اس لئے میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں - پیارے شاہنواز!

شاہنواز۔ (بات کاٹ کر) ٹھہرو۔ تم نے کیا کہا "پیارے شاہنواز" بیگم اس بیباکی کے کیا معنے جو لفظ عشق کی دنیا میں استعمال کیا جاتا ہے وہ ایک سپاہی کو مخاطب کرنے کے لئے موزوں نہیں اور پھر میری معمولی خدمت کسی غیر معمولی شکریہ کی سزاوار نہیں۔

بیگم۔ (خود بخود) کیا دلشکن لہجہ کیسا تلخ جواب! اچھا بہادر بریگیڈیر صاحب مجھے اس قدر تو مایوس نہ کیجئے کہ اظہار مدعا کے الفاظ تلخ ہو کر میرے ہونٹوں سے نفرت کرنے لگیں۔

شاہنواز۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس مشتبہ ملاقات کو جلد سے جلد ختم کر دیں گے۔

بیگم۔ کیا بیوفایانہ برتاؤ اور کیسا بیمروتانہ طرز عمل ہے سنو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے میں کہونگی اور تمہیں سننا پڑے گا

شاہنواز۔ اچھا یہ بھی سہی اگرچہ میں نے عورتوں کے حکم کی تعمیل آج سے پہلے کبھی نہیں کی۔

بیگم۔ شاید تمہارے دلمیں اس ودیعت کی قدر نہیں جس کو تعلیم یافتہ انسان محبت کہتے ہیں۔

شاہنواز۔ (تبسم آمیز لہجہ میں) میں سپاہی ہوں اور سپاہی کو محبت کی دلفریبی کا حس نہیں ہوتا۔ ہاں تو آپ اس غرض خاص کو بیان کرنے میں ذرا جلدی کریں جسکے سننے کیلئے میں بلایا گیا ہوں۔

زبیدہ (خود سے) ناامیدی مایوسی عجیب شخص! غالباً تم اب تک یہی نہیں جانتے کہ عشق کیا چیز ہے

شاہنواز۔ بس اتنا ہے کہ انسانوں کے ہر طبقہ میں ایک مجنونانہ حرکت کا نام عشق ہے

زبیدہ۔ پیارے شاہنواز۔ اسے توبہ معاف کرنا خدا برا کرے جذبۂ بے اختیار شوق کا جس نے مجھے دوبارہ گنہگار بنا دیا شاید ابھی آپ نے حکم دیا تھا کہ میں پیارے کا لفظ آپ کے لئے استعمال نہ کروں۔

شاہنواز۔ بالکل صحیح ہے کیونکہ ایک سپاہی کو مخاطب کرنے کے لئے اس نسوانیت اثر لفظ میں کوئی شان پیدا نہیں ہوتی۔

زبیدہ۔ تم جاہل ہو

شاہنواز۔ اس کا مجھے فخر سے اعتراف ہے کیونکہ بہادر اور جاہل قریب قریب ہم معنی الفاظ ہیں۔

زبیدہ تم نے عشق کی تعریف کرنے میں غلطی کی

شاہنواز۔ یہ بھی ممکن ہے۔ اب آپ عشق کی صحیح تعریف بیان کر دیں

زبیدہ۔ سنو عشق اک الہامی طاقت ہے وہ اپنے سحر آفریں کرشموں سے عقل کی طاقت پر غالب آتا ہے اور ہر جگہ نئی صورت اختیار کرتا ہے

کہیں وہ نور بنتا ہے کہیں وہ نار بنتا ہے　　کہیں وہ پھول بنتا ہے کہیں وہ خار بنتا ہے
کبھی وہ دلشکن بنتا ہے گہہ دلدار بنتا ہے　　کہیں وہ دارد صحت اور کہیں آزار بنتا ہے
کہیں پورا مسیحا ہے کہیں بیدرد قاتل ہے
کہیں چمکی ہوئی قسمت کہیں ٹوٹا ہوا دل ہے

شاہنواز۔ اخاہ یہ تین حرف کا لفظ اور جذبات انسانی کا مجموعہ خیر بیگم اگر یہ عشق کی سچی تعریف ہے تو ہوگی

بس اس سے طالبان عشق کو آرام آئیگا　　مجھے کیا عشق سے مطلب یہ کس کام آئیگا

زبیدہ۔ کیا تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی

شاہنواز۔ کی ہے اور اب بھی کرتا ہوں

زبیدہ۔ کس سے

شاہنواز۔ تیر سے تلوار سے خنجر سے اور بھالے سے　　خون بھری شمشیر سے لاشوں بھرے میدان سے
فوج کی موجوں سے بحر موت کے طوفان سے　　خون کے سیلاب سے اور زخم کے ارمان سے

ہوتا ہی رہا ہر قدم پر انقلاب زندگی
زیست کا وقفہ سپاہی کو ہی خواب زندگی

زبیدہ ۔ نبرد آزما نوجوان انہیں شجاعت کے قصوں نے انہیں جوانمردی کے داستانوں نے ایک عورت پر بھی وار کیا ہے۔

یہی قصے ہیں اب آمادہ دل آزاری پر
جو سنائے ہیں مجھے بستر بیماری پر
دوست دشمن کو بہر کیف دغا سے مارا
تیرے اسکو مجھے تیر ادا سے مارا

شاہنواز ۔ بیگم اب ہماری آپ کی ملاقات ختم ہونا چاہیے

زبیدہ ۔ نہیں شاہنواز نہیں بشر کہدو کہ زبیدہ میں تجھے چاہتا ہوں

شاہنواز ۔ تم غلط فہمی میں مبتلا ہو جذبات جوانی تمہیں دھوکا دے رہے ہیں اور تم اپنی عالم فریب حسن کو ایک سپاہی کی تلوار پر قربانی چڑھا رہی ہو ۔ سوچو ۔ سمجھو ۔ اور غور کرو ۔

میں سپاہی ہوں مجھے حسن و ادا سے کیا غرض
بیوفا سے کیا تعلق باوفا سے کیا غرض
اک دل وحشی کو طرز دلربا سے کیا غرض
گیسوئے خمدار و چشم فتنہ زا سے کیا غرض
عشق بے ہنگام کا انجام بدنامی نہ ہو
ڈز ڈیمونا کی طرح آخر میں ناکامی نہ ہو

زبیدہ ۔ اف ری بیدردی ایک جائز و وفا شعار بیبی بننے کیلئے میرے غرور نے تمہارے آگے سر جھکایا مگر تم نے اُسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔

ملایا خاک میں تم نے مرے جذبات پنہاں کو۔
جلایا دل کو سینہ کو جگر کو جسم کو جاں کو
جفا کے نشتروں سے یوں مجروح کر ڈالا
محبت کو وفا کو شوق کو حسرت کو ارماں کو

شاہنواز ۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ آپ دلفریب شاعری کو بیمحل استعمال کر رہے ہیں ۔ اگر کسی حسن پرست شاہزادے کے سامنے آپ اپنی فصاحت و بلاغت سے اظہار مدعا کریں

تو وہ قدر محبت اس قدر تو کم سے کم کرتا
کہ اپنے تاج والے سر کو ان قدموں پہ خم کرتا
یہ مانا آپ بہتر حسن میں ہیں سب زمانے سے
مگر کیا فائدہ اندھے کو آئینہ دکھانے سے

زبیدہ ۔ شاہنواز بہت زیادہ میرے حسن کی توہین اور میرے درخواست کی تحقیر ہو رہی ہے کیا تم پر کچھ اثر نہیں ہوتا ۔

شاہنواز ۔ ہاں میرے دل کو میدان جنگ کے خونی نظاروں نے پتھر بنا دیا اسمیں قبول محبت و عشق کی قابلیت نہیں رہی

رہے جنگل میں جو وہ کیا کریگا قدر باغوں کی
کھلی رہتی ہیں کلیاں سامنے زخموں کی داغوں کی
جلاؤ شمع حسن اس میں کہ جس گھر میں اندھیرا ہو
کہیں بھی چاندنی میں قدر ہوتی ہے چراغوں کی

زبیدہ ۔ یہ بیمروتانہ جواب ہے

شاہنواز ۔ اپنے فائدہ کے لئے آپ کی مرضی کے خلاف جواب دینا کوئی بیوفائی نہیں ۔

زبیدہ ۔ سن او غارت گر رسم وفا سن جب تو بستر بیماری پر لاش کی طرح بیحس و حرکت پڑا ہوا تھا اور آتش زدہ جہاز کے زخموں کی تکلیف سے آخری سانس کا انتظار کر رہا تھا اسوقت او بیمروت اسوقت میں نے تیرے بدبو دار زخموں کو اپنے ہاتھوں سے دھو دھو کر مرہم لگایا ہے کیا اتنی جلد بھول گیا۔

سہارا میرا جسم نازنیں تھا راہ چلنے میں
مدد دیتے تھے میرے ہاتھ کروٹ کے بدلنے میں
بہت کم وقت باقی رہگیا تھا دم نکلنے میں
نہ تھا ہاتو نہ کچھ قابو کف افسوس ملنے میں

ذرا سن وہ بھی تو اک وقت تھا بیدا اگر تیرا
مرے ہاتھوں میں تیرے ہاتھ تھے زانو پہ سر تیرا

شاہنواز۔ آہاہ تو میری تیمارداری سچی ہمدردی انسانی نہ تھی آہ یہ اک خود غرضی کا راز تھا۔

اب وہ خود غرضی نمایاں بن کے رسوائی ہوئی
کرتی ہے عرض ندامت آنکھ شرمائی ہوئی
مارنے کے واسطے زندہ کیا تو کیا کیا
قتل کرنے کو جلایا کیا مسیحائی ہوئی

زبیدہ۔ افسوس میں کیا جانتی تھی کہ اپنے باپ کی تعمیل حکم کر کے اتنی ذلتیں اٹھانا پڑیں گی۔

شاہنواز۔ ہاں ہاں تم اکیلی اس معاملہ میں قابل ملامت نہیں تمہارا باپ بھی ہے۔

زبیدہ۔ احسان فراموش میرے باپ نے کیا قابل ملامت کام کیا۔

شاہنواز۔ اُس نے جوانی کے نشہ میں بدمست لڑکی کو ایک اجنبی جوان کی آغوش میں ڈھکیل دیا اس سے زیادہ غلطی کیا ہو سکتی ہے

رکھ دیا کیوں دانۂ بارود انگارے کے پاس
آگ کو رکھتے نہیں عاقل کبھی پارے کے پاس
عمر بھر پچھتائے گا اس طرح کا ناداں طبیب
جس نے بٹھلایا ہو مستسقی کو فوارہ کے پاس

زبیدہ۔ تو اس سے کیا ہوا۔

شاہنواز۔ اس سے یہ ہوا کہ محبت و عشق کے طوفانی موجوں نے قلعۂ عصمت کی بنیاد کو جڑ سے ہلا دیا اور اگر میں چاہتا تو اسیوقت تمہاری دامن عصمت کی دھجیاں کر کے ہوا میں اُڑا دیتا۔

زبیدہ۔ زبردستی بغیر رضامندی۔

شاہنواز۔ او عورت کی رضامندی کو کتنی دیر لگتی ہے ناپاک بوسہ کی ایک چنگاری دامن عصمت کے ساتھ وہ سلوک کرتی ہے جو ایک چنگاری تمام خرمن کے ساتھ۔

تجھ میں جذبہ مجھ میں طاقت تجھ میں خواہش مجھ میں جوش
مرد اگر چاہے تو عورت دم میں ہو عصمت فروش
عشق کی طاقت سے کوئی آج تک جیتا نہیں
میں کوئی یوسف نہیں ہوں تو کوئی سیتا نہیں

زبیدہ۔ اچھا شاہنواز خدا حافظ۔ مگر ہاں کیا میں یہ اُمید کروں کہ آج کی رات کے واقعات تم بھول جاؤ گی۔

شاہنواز۔ بانو اطمینان رکھو یہ راز مرتے دم تک میرے سینہ میں دفن رہیگا۔

دونوں اپنی اپنی طرف جاتے ہیں

شاہنواز۔ (زبیدہ کو روک کر) خاتون معظمہ ذرا صبر کیجئے آپ نے اپنے احسان کی یاد دلا کر میرے دل پر نشتر لگایا ہے اس لئے میں گھٹنے ٹیک کر معافی کا خواستگار ہوں کہ اپنی ذات کو محفوظ رکھنے کے لئے میں نے اگر گستاخانہ مقابلہ کیا ہو تو آپ اسے معاف فرمائیں گی۔

(گھٹنے تک جھکتا ہے اور زبیدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بوسہ لیتا ہے یعقوب جو آڑ سے دیکھ رہا ہے اس کو بدگمانی ہوتی ہے کہ شاہنواز میری لڑکی کو بہکا رہا ہے وہ مغلوب الغضب بڑھا غصہ میں بھرا ہوا داخل ہو کر شاہنواز کو گردن سے پکڑتا ہے)

یعقوب۔ شیطان وبائی کیڑوں کی طرح شریف انسانوں کے خون میں زہر پھیلانے والے سیاہ کار قزاقوں کی طرح گناہ نیم شبی کے مرتکب بتا احسان فراموش یہ سب کیا تھا اور میری آنکھوں نے کیا دیکھا۔

زبیدہ۔ ابا جان

یعقوب۔ خاموش بدچلن لڑکی خاموش۔

زبیدہ ۔ حضور
یعقوب ۔ ایک لفظ نہیں
شاہنواز ۔ میرے محسن آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے خوفناک غلط فہمی
یعقوب ۔ روز روشن میں طلوع آفتاب سے انکار کرکے تو اپنی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے ۔
شاہنواز ۔ جناب غصہ کرنے سے پہلے معاملہ سمجھنے کی ضرورت ہے
یعقوب ۔ نجس کتے میرے مکان کی در و دیوار کو ہوس پرستی کی ناپاک سانسوں سے دوزخ بنانے والا کیا تو نہیں ۔ ایک فرشتہ خصلت لڑکی کی عصمت کو گندے عشق کے جذبات سے مجروح کرنے والا کیا تو نہیں ۔
شاہنواز ۔ ذرا مجھے چھوڑئے مجھے واقعات صحیح بیان کرنیکا موقع دیجئے
یعقوب ۔ کبھی نہیں ترا گلا ترا گریبان میرے ہاتھ سے اس وقت تک نہیں چھوٹ سکتا جب تک تو لاش ہو کر میرے قدموں پر نہ گر پڑے ۔
شاہنواز ۔ ہاہا ہاہاہا) دھوکا میرے محسن غلط فہمی وہم شک بدگمانی ،
شاہنواز ۔ ہنستا ہے بے غیرت شرم کر ۔
شاہنواز ۔ میں ہنستا ہوں اور اس لئے ہنستا ہوں کہ ایک کمزور بوڑھا جسکو موت طفل شیر خوار کی طرح گود میں لئے پھرتی ہے ایک مشہور بہادر نبرد آزما کو کتے کی طرح جھنجوڑیاں دے رہا ہے اور وہ پاسِ احسان سے کچھ نہیں کہتا ۔
یعقوب ۔ کہہ اگر تیری زبان میں شریفانہ جنبش اور تیرے ضمیر میں اخلاقی طاقت ہے تو کہہ ۔
شاہنواز ۔ بس اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے مجھے جلتے ہوئے جہاز اور اُبلتے ہوئے سمندر سے نکال کر زندگی کے محفوظ کنارہ پر پہونچایا ہے اس لئے میرا شریف دل اجازت نہیں دیتا کہ اس بزدل گستاخی کا انتقام لوں ۔

کیا کروں میں ہاتھ محسن پر اُٹھا سکتا نہیں
گالیاں سنتا ہوں لیکن سر اٹھا سکتا نہیں
شرم سے خون شرافت کا رگوں میں جوش ہے
دل بہت بے چین ہے لیکن زباں خاموش ہے

یعقوب ۔ مکر پیشہ ، روباہ خصال ، تو خوشامد سے مجھے خوش نہیں کر سکتا ۔
شاہنواز ۔ بس بہت ہو چکا ایک سپاہی کے سینہ میں مغرور دل ہوتا ہے زیادہ سخت گیری مجھے گناہگار نہ بنادے میں التجا کرتا ہوں کہ میرا گریبان چھوڑ دیجئے بس چھوڑ دیجئے ۔
یعقوب ۔ دہمکی ! احسان کے بندے ، مہربانی کے محتاج میرے رحم پر جینے والے ۔ میں ان دہمکیوں کی پروا نہیں کرتا ۔
شاہنواز ۔ آخری التجا ہے کہ تم ہوش میں آجاؤ ورنہ مجھے سزا دینے کی ضرورت پڑے گی ۔
ایک مشت استخواں کا نعرۂ پر شور کیا
تم ہو کیا اور یہ تمہاری ہستیِ کمزور کیا
دل نہ روکے گر غضب کی آندھیاں چلتی ہوئی
کاٹ ڈالوں تیغ سے منہ میں زباں چلتی ہوئی

یعقوب ۔ محسن کش احسان فراموش کیا یہی تیرا فرض تھا ۔
شاہنواز ۔ صاحب میں اپنا فرض نہیں بھولا ۔ مگر آپ نے اپنا فرض بھلا دیا ۔
یعقوب ۔ میں نے اپنا فرض بھلا دیا وہ کیونکر ۔
شاہنواز ۔ وہ یہ کہ آپ کا فرض تھا کہ اپنی جوان لڑکی کو ایک نوجوان کی صحبت سے بچاتے ، مگر ایسا نہیں ہوا

کیوں نہ اس احمق کو ہوں رنج و بلا کے سامنے
شمع روشن کر کے جو رکھدے ہوا کے سامنے
باپ بیٹی کی حفاظت کرنے والا چاہیئے
جس خزانہ میں ہو دولت اسمیں تالا چاہیئے

یعقوب کیا تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ تو نے میری غلطی سے فائدہ اٹھایا۔

شاہنواز۔ یہ دوسری غلطی ہے

یعقوب۔ یعنے

شاہنواز۔ یعنی میں بیگناہ ہوں خدا اور اس کے فرشتے انسان حیوان، نباتات، جمادات، ——— حشرات ملکہ صحن عالم کا ایک ایک ذرہ شہادت دیگا کہ شاہنواز کا دامن ہوس پرستی کی نجاست سے پاک ہے۔

خوف کیا دنیا اگر ہو دشمن جانی مری
صورت یوسف ہی ثابت پاکدامانی مری

یعقوب۔ گناہ پر گناہ ناپاک گناہ شرمناک گناہ میری رسوائی کے زندہ اشتہار تو اس گھر کی چار دیوار کے باہر نہیں جا سکتا۔ میں تیرے منہ پر موت کا قفل لگاؤنگا۔

شاہنواز۔ کس کی مجال ہے

یعقوب۔ زبان درماز لے اور قیامت تک کے لئے خاموش ہو جا۔ (ریوالور چلاتا ہے ریوالور پھٹ جانے سے گولی پیچھا کرتی ہے یعقوب مردہ ہو کر گرتا ہے)

شاہنواز۔ (لاش کو غور سے دیکھکر) مر گیا۔

زبیدہ۔ کس نے مارا۔

شاہنواز۔ انصاف و قدرت کے زبردست ہاتھ نے

زبیدہ۔ شاہنواز قسمت نے راستے کی ٹھوکر دور کر دی کیا تم اب اپنا خیال بدل دوگے۔

شاہنواز۔ بیحیا عورت آخر یہ تیرا باپ تھا۔

زبیدہ۔ مگر ایسا باپ جو اولاد کی ارمانوں کا خون کرنے والا۔

شاہنواز۔ صدمۂ مرگ پدر اسکو ذرا کچھ بھی نہیں

دل میں رحم اور آنکھ میں شرم و حیا کچھ بھی نہیں
ناخلف اولاد تو ہے باپ کے مرنے سے خوش
تجھ سے اب دنیا کو امید وفا کچھ بھی نہیں

زبیدہ۔ وہ تمھارا دشمن تھا اسلئے میں اسکی دشمن تھی۔ کہو اب کیا جواب دیتے

شاہنواز۔ جواب صاف

زبیدہ۔ او نا انصاف عورت کی فطرت جتنی بھولی ہوتی ہے مکاری میں اتنی ہی بیباک بھی ہوتی ہے۔

شاہنواز۔ اس دھمکی سے کیا مطلب ہے

زبیدہ۔ مطلب مطلب یہ کہ میرے باپ کو قتل کر کے تو زندہ نہیں بچ سکتا۔

شاہنواز۔ کیا تو مجھ پر اس خون کا الزام رکھے گی۔

زبیدہ۔ بیشک۔ قطعی

شاہنواز۔ کچھ پروا نہیں چڑیل عورت میں تیرے مکر سے تیرا غلام نہیں بن سکتا

زبیدہ۔ ہاں تو لو۔ ارے دوڑو خدارا دیکھو اس شیطان نے میرے باپ کی جان لے مارا

(سپاہیوں کا داخلہ شاہنواز کی گرفتاری۔)

احسن لکھنوی

فلسفۂ مذہب

(بسلسلۂ گزشتہ)

مذہب اور قومیت پس دنیاوی معاشرت میں مذہب کا دخل ہونا یا تو ایک احسان وقتی ہوگا اور یا پھر فضول ولایعنی، اگر وہ اس کی ابدیت اور عمومیت پر اصرار کرے۔ کیونکہ اس کی پابندی صرف ایک ہی مخصوص قوم سے ایک ہی زمانے میں ہوسکتی ہے اور ایسی صورت میں مذہب صرف ایک دنیاوی قانون ورسوم کی صورت اختیار کرکے قومیت کا مرادف بنجاتا ہے اور جب مذہب قومیت کی جگہ لے لیتا ہے تو قومیت کی لعنت المضاعف ہوجاتی ہے۔ فلسفی شیراز سعدی نے بالکل ٹھیک کہا ہے

"ایماں براے طاعت و مذہب براے جنگ"

مسلمان میری اس تحریر پر آپے سے باہر نہ ہوں بلکہ خود قرآن سے اس نکتہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ نماز روزہ اور زکوٰۃ اسلام کے رکن عظیم ہیں۔ قرآن نے اُن کو بجا طور سے فرض کیا ہے کہ یہ اعتقاد صالح کی عملی صورت ہے، ہر انسان پر تین حقوق ہیں اور ان اعمال کی بجاآوری درحقیقت ان تین حقوق کی بجاآوری ہے نماز خالق کے حقوق کی بجاآوری۔ زکوٰۃ حقوق عباد اور روزہ حقوق نفس کی بجاآوری ہے۔ مگر یہ عجیب و دلچسپ بات ہے کہ ان کے عملی طریقوں کے لئے قرآن نے اس قدر اختصار و ابہام سے کام لیا ہے کہ سوائے اُس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ قرآن کا مقصد صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کے سامنے اسلام پیش کرنے کا ہے۔ اور خدا جانتا ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں کے طبائع ایسے واقع ہوئے ہیں کہ ان پر ایک مخصوص زبان و طریقے کے ساتھ عبادت تکلیف مالا یطاق سے کم نہ ہوگی اور اگر وہ بجا بھی لائیں گے تو بغیر رجوع قلب کے۔ ارکٹک کا رہنے والا اسکیمو جو برف کے مکان اور نصف سال کی رات میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ یقیناً عرب کے طریقہ پر عبادت کرنے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے معذور رہے۔ اس لئے قرآن کا صاف و صریح منشاء عملی طریقوں پر سکوت اختیار کرنے کا یہی تھا کہ عبادت محض خدائے واحد کی ہو کیونکہ وہ مذہب کا ایک رکن عظیم ہے۔ خواہ وہ کسی طریقہ سے ہو۔ اس خیال کی تائید خود قرآن کی ان آیتوں سے ہوسکتی ہے۔

(۱) ان الذین آمنوا والذین ہادوا والنصاریٰ والصابئین والمجوس من آمن باللہ وعمل صالحاً فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

(۲) لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ فلا ینازعنک فی الامر وادع الی ربک انک لعلی ھدی مستقیم۔

(۳) قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔

برخلاف اس کے دنیاوی ومعاشرتی احکام جن کا مقصد عربوں کو اصول تمدن سکھانے کے سوا دوسرا نہ تھا مثلاً طلاق، وراثت، حجاب و اعتاق و کتابت وغیرہ۔ ان کی نسبت قرآن نے کافی وضاحت سے کام لیا ہے۔ لہٰذا قومی مذہب ایک قومی شریعت کیساتھ

عمومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ کبھی وہ ایک قوم سے باہر پھیل سکتا ہے۔ جب تک کہ وہ سب مل کر خود ایک علحدہ قوم نہ بن جائیں۔ اور اگر یہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا تھا اس وقت کے عرب عموماً سوتے وقت اپنے سارے کپڑے اُتار کر برہنہ سوتے تھے اور اس زمانے کی عرب کی عورتیں بالکل اسی طرز پر رہتی تھیں۔ جیسا کہ موجودہ زمانے کی بدوی عورتیں دیکھی جاتی ہیں۔ اُن کو پیروں میں جھانجھ یا پازیب پہننے کا شوق تھا اور اس کے ساتھ وہ اپنا سینہ کھلا رکھتی تھیں۔ اب دیکھو اگر قرآن کا ہر ایک حکم ہر زمانے اور ہر قوم پر فرض سمجھا جائے تو ان احکام کی تعمیل کہ کسی کے سوتے وقت بلا اذن اس کے خلوت میں نہ جاؤ۔ یا عورتوں کے لئے جب وہ چلیں تو اپنے پازیبوں میں آواز پیدا کرتی ہوئی نہ چلیں اور اپنے سینوں کو دوپٹوں سے بند رکھیں، اُن قوموں کے لئے جن کی یہ قومی عادتیں نہیں ایک فضول حکم ہوگا۔ اسی پر وضو و طہارت کے دوسرے احکام کو قیاس کر لو۔ اسی اصول سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ شریعت اسلامی میں چوری زنا۔ قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں اُن میں کہاں تک عرب کے رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ موجودہ صورت میں اختلاف زمانہ کے لحاظ سے کہاں تک اجتہاد کی گنجائش ہے۔

غالباً حضرت شاہ ولی اللہ نے متاخرین میں سے اس نکتہ کو ایک حد تک سمجھا ہے۔ چنانچہ وہ حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

ولہذا المعنی اختلف شرائع الانبیاء۔ والراسخ فی العلم یعلم ان الشرع لم یجیٔ فی النکاح والطلاق والمعاملات والزینۃ واللباس والقضاء والحدود ـــــ بما لم یکن لہ بہ علم او تیرددون فیہ اذا کلفوا۔ نعم انما وقع اقامۃ المعوج و تصحیح السقیم

اور اسی وجہ سے انبیاء کی شریعتیں مختلف ہیں اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ جانتے ہیں کہ شریعت نے نکاح۔ طلاق و معاملات آرائش۔ لباس۔ قضا و تعزیرات وغیرہ میں کوئی ایسی بات پیش نہیں کی جسکو وہ لوگ پہلے سے نہ جانتے ہوں یا ایسے مسئلے جن کو قبول کرنے میں ان کو پس و پیش ہو۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ جو کجی تھی وہ سیدھی کر دی گئی اور جو خرابی تھی رفع کر دی گئی۔

(حجۃ اللہ البالغہ)

آگے پھر فرماتے ہیں۔

فکذالک یعتبر فی الشرائع علوم مخزونۃ فی القوم و اعتقادات تجاری فیہم ولذالک نزل تحریم اللحوم لابل والبانہا علی بنی اسرائیل دون بنی اسمعیل ولذالک کان الطیب والخبیث والمطاعم مفوضاً الیٰ عادات العرب ولذالک حرمت نبات للاخت علینا دون الیہود

اسی طرح شریعت میں ان علوم و اعتقادات و عادات کا لحاظ کیا جاتا ہے جو قوم میں جاری و ساری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل پر حرام ہوا اور بنی اسمٰعیل پر حرام نہ ہوا اور یہی وجہ ہے کہ کھانوں میں پاک اور نجس کی تفریق عرب کے مذاق پر محمول کی گئی اور یہی وجہ ہے کہ بھانجی سے شادی کرنا ہمارے مذہب میں حرام ہے اور یہود کے ہاں نہیں ہے۔

اسی بحث میں آگے چلکر لکھتے ہیں۔

واعلم ان کثیراً من العادات والعلوم الکامنة یتفق فیہا العرب والعجم وجمیع سکان الاقالیم المعتدلة واہل الامزجة القابلة لاخلاق الفاضلة کالحزن لمیتہم والاستحباب الرفق بہ کالفخر بالاحساب والانساب فتلک العادات والعلوم احق الاشیاء بالاعتبار ثم بعدہا عادات وعقاید تختص بالمبعوث علیہم فتعتبر تلک ایضا

جاننا چاہئے کہ بہت سے مراسم اور علوم ایسے ہیں جن میں تمام عرب و عجم اور تمام معتدل ممالک کے رہنے والے اور تمام وہ لوگ جن میں اخلاق فاضلہ کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے سب متفق ہوئے ہیں مثلاً مردہ کا غم کرنا اور ان پر رحم کھانا یا مثلاً حسب و نسب پر فخر کرنا تو یہ مراسم اور یہ اصول سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں ان کے بعد وہ مراسم ہیں جو خاص اسی قوم میں جاری ہیں جس پر وہ پیغمبر مبعوث ہوا ہے تو ان مراسم کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ پیغمبر جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے اس کی شریعت میں اس قوم کے عادات اور خصوصیات کا خاص طریقے پر لحاظ ہوتا ہے لیکن جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہو اس کے طریقہ تعلیم میں یہ اصول چل نہیں سکتا کیونکہ نہ تو وہ تمام دنیا کی قوموں کے لئے الگ الگ شریعتیں بنا سکتا ہے اور نہ تمام قوموں کی عادات اور خصوصیتیں باہم متفق ہوسکتی ہیں۔ اس لئے وہ پہلے اپنی قوم کی تعلیم و تلقین شروع کرتا ہے اور اس کو محاسن اخلاق کا نمونہ بنا دیتا ہے اور یہ قوم اس کے اعضا اور جوارح کا کام دیتی ہیں اور اسی کے نمونے پر وہ اپنی تلقین کا دائرہ وسیع کرنا چاہتا ہے۔ اس کی شریعت میں اگرچہ زیادہ تر قواعد اور اصول عام ہوتے ہیں جو قریباً تمام دنیا کے لوگوں میں مشترک ہوتے ہیں تاہم اپنی قوم کی عادات اور خصوصیات کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے لیکن جو احکام ان عادات اور حالات کے بنا پر قائم ہوتے ہیں ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ اسپر چنداں زور دیا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے صفحہ ۱۲۳ میں اس اصول کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔

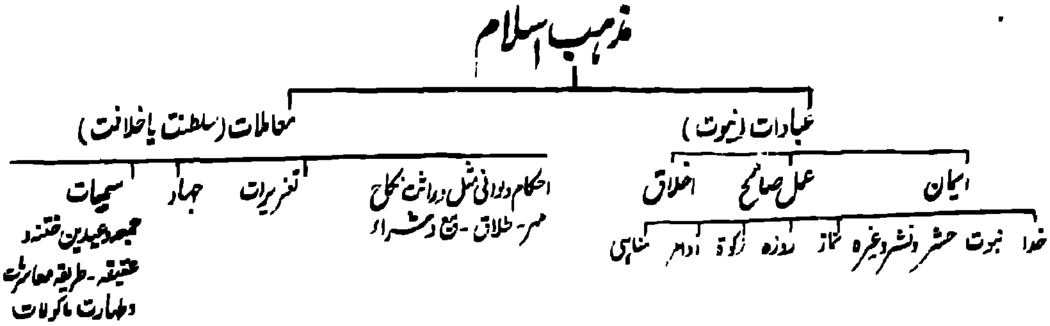
وہذا الامام الذی یجمع الامم علی ملة واحدة تحتاج الی اصول الاخری غیر الاصول المذکورہ فیما سبق منہا ان یدعو قوماً الی السنة الراشدة ویزکیہم ویصلح شانہم ثم یتخذہم بمنزلة جوارحہ . . . وذالک لان ہذا الامام نفسہٗ لا نیاتی منہ مجاہدة امم غیر محصورة واذا کان کذالک وجب ان یکون مادة شریعتہ ما ہو بمنزلة المذہب الطبعی لاہل الاقالیم الصالحة عربہم وعجمہم ثم ما عند قومہ من العلم والارتفاقات ویراعی فیہ حالہم اکثر من غیرہم ثم یحمل الناس جمیعاً علی اتباع تلک الشریعة لانہ لا سبیل الی ان یفوض الامر الی کل قوم او الی ائمة کل عصر اذ لا یحصل منہ فائدة التشریع

یہ امام جو تمام قوموں کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے اس کو اور چند اصول کی" جو اصول مذکورۂ بالا کے علاوہ ہیں" حاجت پڑتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہ راست پر بلاتا ہے اس کی اصلاح کرتا ہے اسکو پاک بناتا ہے . . .
یہ اس لئے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ یہ امام تمام قوموں کی اصلاح میں جان کھپا لے اس لئے ضرور ہوا کہ اس کی شریعت کی اصلی بنیاد تو وہ ہو جو تمام عرب و عجم کا فطری مذہب ہو اس کے ساتھ خاص اس قوم کی عادات اور مسلمات کے اصول بھی لئے جائیں اور انکے حالات کا لحاظ بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تر کیا جائے۔ پھر

صلاً ولا الی ان ینظر ماعند کل قوم ویمارس کلا منہم فیجعل لکل شریعۃ فلا احسن ولا ایسر من ان یعتبر فی الشعائر والحذود و الارتفاقات عادۃ قومہ المبعوث منہم فلا یضیق کل التضیق علی الاٰخرین الذین یاتون بعد"

تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کی تکلیف دی جائے کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر قوم اور ہر پیشوا اسے قوم کو اجازت دیجائے کہ وہ اپنی شریعت آپ بنالیں (مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں مصنف) ورنہ تشریع محض بیفائدہ ہوگی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کی عادت وخصوصیات کا تجسس کیا جائے۔ اور ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت بنائی جائے اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی طریقہ نہیں کہ شعار تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کی عادت کا لحاظ کیا جائے جس میں امام پیدا ہوا ہے اسکے ساتھ آنیوالی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔

اب دیکھنا چاہئے کہ مذہب کے اصول و فروع کیا ہیں اور مذہب کا تعلق قومیت وحکومت سے کہاں تک ہے اور مذہب کی عملی پیروی سے قومیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ہم اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لئے پہلے ایک شجرہ ترتیب دیتے ہیں اور پھر اس کی تشریح کریں گے۔



یہ صحیح ہے کہ مذہب بغیر سلطنت کے ایک فلسفہ ہے اور اس بنا پر میں نے مذہب کے ماتحت عبادات ومعاملات کی دو شاخیں نکالی ہیں جنمیں ایک قابل تبدیلی ہے، حسب حال زمانہ وقوم۔ اور دوسرا ازلی۔ یا یوں کہئے کہ ایک کا تعلق نبوت وروحانیت سے ہے اور دوسرے کا مادیت اور سلطنت سے۔ اس لئے مذہب کے معنی درحقیقت نہایت وسیع ہوئے۔ یعنی انسان کا ہر فعل ایک طور سے مذہب کے ماتحت آجاتا ہے۔ خود مذہب کے لفظی معنے سے یہی مطلب نکلتا ہے جس کا مادہ ذہب ہے جس کے معنے چلنے کے ہیں۔ یعنی انسانی روش وطریقے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کی مختصر تعریف "علم" ہے اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ "کافر" یا مذہب سے بیگانہ کے لفظی معنی عربی میں وہی ہیں جو انگریزی لفظ (Pagan) یا (Heathen) کے ہیں کافر جس کی جمع کفار ہے اس کے بھی معنی کاشتکار

وکسان و دیہاتی کے ہیں قرآن میں ہے کمثل الغیث یعجب الکفار ــــ عربی میں کسی دیہات کو کہیں گے کفر فلان یعنی فلاں قریہ اور یہی معنے انگریزی الفاظ کے ہیں تو گویا کافر یعنی غیر مسلم ایک اجڈ بے علم دیہاتی ہے۔ اس کے برخلاف ایک مومن یا مسلم ایک تعلیم یافتہ مہذب شہری ہوا اور یہ ہمارے پہلے قول کی تائید ہے کہ وحشیوں کو مذہب سے کوئی سروکار نہیں مختصر یہ کہ "بے علم تواں خدا را شناخت"۔

ایک پیغمبر جب کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو وہ قوم دنیاوی حیثیت سے متمدن ہے۔ اور اس صورت میں پیغمبر صرف مجدد روحانی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کو شریعت وحکومت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ جیسا مسیح کی نبوت اور اگر وہ قوم بالکل ہی وحشی ہے تو نبوت نہ صرف روحانی تعلیم کے لئے ہوتی ہے بلکہ شریعت وحکومت بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے آخری صورت میں قوم کی اصلاح بذریعہ نبوت اس طرح شروع ہوتی ہوگی۔ کہ پہلا کام جو نبی کریگا یہ ہوگا کہ وحشی کو بتلائے کہ فلاں کام اچھا ہے۔ فلاں کام بُرا ہے اور وحشی کو اس وقت ایک اچھے کام کی رغبت اور دوسرے سے نفرت ہوگی جب ایک کے کرنے پر اس کو انعام ملیگا یا کم سے کم اگر انعام نہ ملیگا تو دوسرے کے کرنے پر اس کو عقوبت ضرور دیجائیگی اس تمیز کے لئے نبی کو تعزیرات وحکومت سے کام لینا پڑا ہوگا۔ اور یہ صورت اس وقت تک کے لئے کافی ضمانت ہوگی جب تک وحشیوں کی صرف ایک مختصر جماعت ہو تاکہ نبی اس کے ہر فعل کی نگرانی کر سکے۔ لیکن فرض کرو کہ جماعت عظیم ہے اور مختلف فرقوں میں منقسم ہے۔ ایک وحشی چھپ کر بُرائی کرنے کا اکثر موقع پاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ خاموشی سے اپنی ہم جنس کی نہیب وغارت کو اس کو عقوبت سے بچائے رکھے گی یا اگر کسی طرح نبی کو اس کی خبر ہوگی تو وہ جاکر ایسی جماعت میں شامل ہو جائیگا جو نبی کے دسترس سے باہر ہو۔ جب نبی نے دیکھا کہ وحشی کو برائی سے روکنے کے لئے اس کی دنیاوی تعزیر کافی نہیں ہوئی تو لامحالہ وہ ایسی تدبیر سوچیگا جس کے ذریعہ سے وحشیوں کے قلوب موثر ہوں اور اُن کو خود بخود بدی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت ہو۔ تو ہم نے دیکھا کہ پہلے وحشی کو سمجھانا کہ فلاں کام اچھا ہے اور فلاں کام بُرا ہے۔ کافی نہ ہوا۔ اس کے بعد اچھے کام پر انعام اور ہر کام پر عقوبت بھی کافی نہ ہوئی اب تیسری صورت اگر باقی ہے تو یہی ہے کہ خود بدی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت اسکی طبیعت ثانیہ بنا دی جائے اور یہیں سے اصل مذہب کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ مگر ان سب کا مقصد وہی ایک ہے یعنی دنیا میں امن وسلامتی اور بقائے قوم ہے۔

ہم یہاں پر یہ بحث کرنا نہیں چاہتے کہ صاحبان بصیرت وارباب نبوت نے کس طرح اپنی قوموں کو خدا شناسی کی تعلیم دی اور ان کو یقین دلایا کہ موت کے بعد ان کی زندگی پھر قائم ہوگی اور خدا ان کو پچھلے اعمالوں کی سزا دیگا۔ مگر اس تلقین کا مقصد ظاہر ہے کہ سوائے اسکے کچھ نہیں کہ جو باتیں حکومت وتعزیرات دنیوی سے حاصل نہ ہوں وہ اس صورت ــــ سے حاصل ہو جائیں۔ شائد ابتدا ہی میں خدا کو ایک خدا سمجھنا اس قدر ضروری نہ رہا ہو جتنا اُس کو موت کے بعد حشر ونشر سزا وجزا پر قادر سمجھنا کہ یہ خطرہ ایک وحشی کو انسانیت کے جامے میں لانے کے لئے سب سے زیادہ موثر سبب بنجاتا ہے۔ جب وحشی کے دل میں اس خیال سے خشیت پیدا ہوئی تو وہ بُرائی کرنے پر مل ہوا پھر اس خیال کے راسخ ہونے کے لئے نفسیات کے عام اصول پر متواتر عمل صالح کی تلقین کی گئی جس کا طبعی نتیجہ نیکی سے انتساب اور بدی سے احتراز ہے اور یہی اصل مذہب ہے۔ اس لئے مذہب اور حکومت کا تعلق چولی دامن کا سا ہے اور جس طرح مذہب حکومت کا عصا ہے۔ اسی طرح حکومت کا عصا مذہب ہے۔ لیکن جتنے مذاہب دنیا میں اسوقت ہمارے سامنے ہیں انمیں صرف

اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ باوجودیکہ اس نے اپنے ابتدائی نشوونما میں قومی مذہب کی صورت اختیار کی۔ قرآن نے اس کو واضح کر دیا کہ اصول مذہب کی حیثیت سے وہ عالمگیر مذہب ہے اور یہ دعویٰ سب سے پہلے اسلام ہی نے کیا۔

مسلمان کوئی قوم نہیں بلکہ وہ ایک مذہب کی پابند جماعت ہے۔ قوم ہونے کی حیثیت سے ہم کو ہموطن غیر مسلم قوم کی معاشرت سے جدا معاشرت قائم نہ کرنا چاہیئے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ خیال اب موجودہ ترکی و مصر و شام میں جاگزیں ہو رہا ہے۔ مگر ہمارے ہندوستان کے مسلمان ابھی تک ایک علٰحدہ قوم بنے ہوئے ہیں۔ ورنہ اگر شرک و بت پرستی کو علٰحدہ کر دیا جائے تو ہندوستان کے مسلمانوں کی ہولی و دیوالی و دسہرہ کو قومی تہوار و مراسم سمجھنے یا گائے کے گوشت سے احتراز کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا عرب کے مسلمانوں کو ختنہ و عقیقہ و حج و عیدین کے مراسم بجا لانے اور سور کے گوشت سے پرہیز، یا عجم کے مسلمانوں کے جشن نوروز کے منانے میں، خلفاے عرب سے نفرت کرنے کا جس مذہب نے قومیت و قومی شعار کو مذہب سے علٰحدہ رکھا ہے وہ دنیا میں نہ صرف تبلیغی حیثیت سے بلکہ مادی طریقہ سے برسراوج ہے اور جو کسی قسم کی تبلیغی یا مادی ترقی سے محروم ہے وہ وہی مذہب ہے جو قومیت کے مرادف ہوگیا۔ لوگوں کا یہ غلط خیال ہے کہ مذہب دنیا میں سب سے زیادہ خونریزی کا باعث ہوا ہے وہ مذہب نہیں ہے۔ بلکہ قومیت کی ایک صورت ہے۔

خلاصہ اس ساری بحث کا یہ ہوا کہ تمام وہ باتیں جن کا اثر ہر قوم و ہر زمانے میں عام نہیں وہ سب مذہب کے فروع ہیں اور اس میں احکامات دیوانی و فوجداری و جہاد۔ قومی مراسم بلکہ طریقۂ عبادات بھی شامل ہیں۔ مذہب کی عملی پابندی کے لئے اگر ایک شریعت ضروری ہے تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی دنیا کے اندر ہر قوم و ہر زمانے میں ابوحنیفہ پیدا ہوا کریں جو اپنے ملکی حالات و معاشرت کو پیش نظر رکھ کر اجتہاد کریں۔ مگر پہلی صدی ہجری کے ائمہ کے قیاسات مذہب کے عام اصولوں کے ساتھ روا ای سمجھنا اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے بہت بڑا ہے اور خود "قوم" اسلام کی دنیاوی ترقی کا سد باب ہے۔ یہ ایسی غلطی ہے جس کا خمیازہ ہم نے ابتک اٹھایا ہے یورپ کی نشست و برخاست و لباس، اور عرب کے نشست و برخاست و لباس میں زمین آسمان کا فرق ہے عرب اپنی مسجد میں زمین پر بیٹھکر آسانی سے عبادت کر سکتا ہے مگر یورپ کرسی کا عادی ہے۔ کیوں نہ یورپ کا ابوحنیفہ عبادت کا طریقہ ان کے عادت کے موافق اجتہاد کرے جب کہ قرآن نے مصلحتاً اس میں سکوت اختیار کیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ قرآن نے اوقات نماز کی تعیین اس خوبی سے کی ہے کہ اگر ہم حدیث کی مدد نہ لیں تو ہم یورپ کے لئے صرف تین وقت کی نماز متعین کر سکتے ہیں ——— کیونکہ ظہر و مغرب کی نماز کی کہیں صراحت نہیں کی گئی عرب جو اپنا بیشتر وقت قہوہ خانوں کی گپوں میں صرف کرتے ہیں وہ پانچ نہیں بلکہ پچاس وقت کی نماز پڑھیں تو بہتر ہے۔ مگر یورپ کے ایک مشغول کاروباری سے کہو کہ تم مغرب کے وقت جبکہ وہ اپنے کام سے راحت پاتا ہے یا ظہر کے وقت کوئی نماز ادا کرے اور اسی پر اس کے اسلام کا انحصار ہو تو وہ کیونکر اسلام کو فطری مذہب مان سکتا ہے۔ جب میں نے حدیث کی مدد سے قرآن کے سمجھنے کی کوشش کی تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا ——— کہ حدیث ہم کو یہودی بنا دیتی ہے اور قرآن ہم کو مسلم۔ اور اب مسلمانوں کو اختیار ہے خواہ وہ یہودی بنیں یا مسلم۔ صرف قرآن کی ایک آیت لیلو۔

فلا تطرد الذین یدعون ربہم بالغدوۃ والعشی یریدون وجہہ ما علیک من حسابہم من شیٔ وما من حسابک علیہم من شیٔ فتطردہم فتکون من الظالمین

اس کے مقابلہ میں آمین بالجہر اور رفع یدین پر تکفیر کے فتووں کو دیکھو کیا قرآن کا یہ قول ہم پر صادق نہیں آتا - ان قومی اتخذ و فرانا مہجوراً

چونکہ ہمکو فلسفہ مذہب میں محض اصول مذہب پر بحث کرنی ہے ہمنے سوچا کہ اگر ہم ایک مذہب کا معیار مقرر کرکے اسپر بحث کریں گے تو بہترین معیار ہمارے لئے اسلام ہوگا - مگر اسی کے ساتھ یہ خیال بھی ہے کہ مذہب اسلام کے جزو اعظم یعنی معاملات کو کیونکر نباہیں گے - اس لئے ہمنے اس عنوان میں مذہب اور قومیت کی بحث کرکے اسلام کو ان مجہولات سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے جو غالباً بعض کے نزدیک بقول غالب -

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ ؎

اور بعض کے نزدیک بقول رومی " استخواں پیش سگاں انداختن " ہوگا

باقی ------- باقی

سیّد مقبول احمد

اعلان

ہندوستانی ایکاڈیمی کو ایسے مترجموں کی ضرورت ہے جو انگریزی سے بامحاورہ اردو ہندی زبانوں میں ترجمہ کر سکیں -

مترجم ایکاڈیمی کے ملازم نہ ہوں گے - جو لوگ سائنس اور ادبی کتابوں کا ترجمہ کرنا چاہتے ہوں ان کو نمونے کیساتھ ۳۰ رجون تک درخواست دینا اور شرائط طے کر لینا چاہئے -

(ڈاکٹر) تاراچند

جنرل سکریٹری ہندوستانی ایکاڈیمی الہ آباد

چنگاری

(فسانہ)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

۹

یوسف کے قیام کو دارجلنگ میں ایک مہینے سے زیادہ زمانہ گزر گیا ہے اور روز ولا (کوٹھی) میں جو ایک مرتفع مقام کے بہترین کنج میں واقع ہے ٹھہرا ہوا ہے۔ مس گارڈن جس نے اپنی ساحرادائوں سے کام لیکر یوسف پر ایک قاہرانہ قبضہ قائم کر رکھا ہے، اس کی شب روز کی جلیس ہے اور ہر صبح، شام کے لئے ایک جدید "لائحۂ نشاط" مرتب کرکے یوسف کی شب بھر کی "خستۂ معصیت" روح میں نئی زندگی پیدا کر دیتی ہے۔

یوسف جس کی پیدایش اور تعلیم و تربیت نہایت ہی معصوم اور پاکیزہ ماحول میں ہوئی تھی اور جوان ہونے کے بعد بھی عرصہ تک یہی سمجھتا رہا کہ "میل راہ" کی طرح ساکت لیکن رہنا یا۔ زندگی بسر کر دینا ہی عین مقصود حیات ہے، کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس عالم کے ماورا بھی کوئی عالم ایسا ہو سکتا ہے، جو اس کی توجہ کو جلب کر سکے۔ مس ہلن سے ملنے کے بعد اول اول تو وہ صرف اس قدر سمجھ سکا کہ عورت کا وجود اس قدر زیادہ غیر ضروری اور دلچسپ وجود نہیں ہے، اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کی اہمیت روشن ہونے لگی، یہاں تک کہ مس ہلن کے سامنے اس نے اپنی شکست کا اعتراف کیا اور انتہائی شغف کے عالم میں اپنا وہ سب کچھ اس کے قدموں پر ڈالدینا چاہا جس پر ایک مرد ناز کر سکتا ہے، لیکن جب اس کو رد کر دیا گیا تو پھر یہ امر اس کے اختیار سے باہر تھا کہ وہ اپنی وسیع ہو جانے والی تمناؤں کو سمیٹ سکتا۔ شاہین جب کسی شکار کے لئے فضا میں بلند ہوتا ہے تو پھر اس وقت تک وہ نیچے نہیں آتا جبتک کہ کوئی دوسرا طائر اس کے خواہش صید کو پورا کرنے والا نہ ملجائے۔ یوسف میں اس نوع کی خواہش پرواز مس ہلن ہی کو دیکھ کر بلکہ اسی کی ترکیبوں اور کوششوں سے پیدا ہوئی تھی پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ مس ہلن کا فریب شعبدہ کھانے کے بعد وہ چین سے بیٹھ جاتا، اس کے اندر آگ بھڑک چکی تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اگر کوئی بجھانے والا نہ ملا تو پھر اس کا جلکر خاک ہو جانا یقینی ہے۔

پھر چونکہ، شباب کی سرشند بینا نے جوش میں آجانے کے بعد اس کی بصارت زائل کر دی تھی، اس کے دل و دماغ میں جیسا کہ ہمیشہ زہد و ورع کے ردعمل کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، اب صرف یہی ایک خیال جاگزیں تھا کہ دنیا کی "لذت و نشاط" کو کیونکر اپنے لئے مخصوص کر لیا جائے اس لئے عین اسوقت جبکہ وہ مس ہلن نہیں، بلکہ صرف ایک عورت کے لئے بیتاب تھا، مس گارڈن کا ملجانا گویا سیلاب کے لئے ساحل کا ٹوٹ جانا تھا۔ کہ پھر پانی کی رو کا رخ متعین کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ الغرض وہ گرا اور بری طرح گرا، اگر کبھی وہ ہوش میں آتا بھی تو اُسے تکلیف ہوتی کہ کیوں "این و آن" کے خیال سے اس پُرلطف خواب کی لذت کو تباہ کیا جائے

شباب بجائے خود ایک ایسا زبردست طوفان ہے کہ اس کو روکنے کی کوشش کرنا گویا فطرت کے رخ کو بدل دینا ہے، چہ جائیکہ اس کی اعانت کے لئے حسن و شراب بھی موجود ہو کیونکہ یہیں آکر صحیح معنے میں انسان کی مجبوری ثابت ہوتی ہے ——— دن گزرتے گئے، تعلقات قلب کی بندشیں قوی ہوتی گئیں، معصیت عادت میں اور عادات طبیعت ثانیہ میں بدلتی گئی، یہاں تک کہ دو مہینے کے اندر ہی یوسف کی قلب ماہیت ہوگئی اور سارے دارجلنگ میں اس سے زیادہ شراب خوار، اس سے زیادہ قمار باز، اس سے زیادہ جری شاہد باز اور اس سے زیادہ خوش ادا رقص کرنے والا کوئی اور نہ تھا، گویا تہذیب کلب کے تمام معیاری اخلاق اس میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے وہ یہاں ایک نواب کی حیثیت سے رہتا تھا اور نواب ہی کی طرح بیدریغ روپیہ صرف کر رہا تھا۔

ایک دن شام کو وہ پوری کیفیت شراب میں بیٹھا ہوا صرف حال کی لذتوں کو سرمایۂ حیات سمجھکر ان پر مسرور ہو رہا تھا کہ خادم نے حبیب کا کارڈ لاکر اس کو دیا۔

حبیب! حبیب!! اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد حبیب کے ساتھ اُس نے مس ہلن کو بھی ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے شاید کسی نہایت گہرے خواب سے بیدار ہو رہا ہے، اور اسی کے ساتھ جب مس ہلن کی تمام گزشتہ بے اعتنائیاں (جن کے بھلانے ہی کے لئے اُس نے یہ تمام کارگاہ نشاط قایم کی تھی) یاد آئیں، تو اس کی مردانہ غیرت و خودداری میں پھر ایک تحریک پیدا ہوئی اور اس نے کوشش کرکے اپنی حیرت، اپنی مسرت اور تمام ان کیفیات کو جن سے حبیب یا مس ہلن کو معلوم ہو سکتا کہ اسپر کوئی خاص اثر ہے، ضبط کیا اور نہایت ہی غیر متاثرانہ انداز سے اُس نے کھڑے ہوکر ان دونوں کی پذیرائی کی اور قریب کی کرسیوں پر بیٹھنے کی درخواست کرکے خود بھی بیٹھ گیا اور ہاتھ ملتے ہوئے مصنوعی تبسم چہرہ پر پیدا کرکے نہایت رسمی شکریہ تکلیف فرمائی کا ادا کیا اور میز سے سگریٹ کا ڈبہ اٹھاکر پیش کیا۔ دونوں متحیر تھے اور یوسف کے اس پر تکلف اور اجنبی طرز ملاقات کی کوئی تاویل نہ کر سکتے تھے۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد مس ہلن نے ایک خاص پندار اعتماد کے ساتھ چہرہ پر تبسم پیدا کرکے کہا: "مسٹر یوسف میں دیکھکر بہت خوش ہوئی کہ اب آپ کی صحت غیر معمولی طور پر شگفتہ نظر آتی ہے"۔ یوسف نے اس کے اندر چھپے ہوئے نشتر کی چبھن کو محسوس کیا اور حد درجہ مستغنی انداز سے بولا کہ "جی ہاں اس سے قبل موسیٰ پر بھی یہی گزرا تھا۔ کہ گئے تھے آگ لینے مگر ہاتھ آگئی پیمبری، مجھے کیا خبر تھی کہ کبھی "وہم" کا تعاقب کرنا بھی "حقیقت" تک پہونچا دیتا ہے"۔

یہ سنکر مس ہلن کے چہرہ پر غصہ کا سرخ رنگ دوڑ گیا، اس نے اگر نشتر کا استعمال کیا تھا تو جواب تیر سے دیا گیا۔ یوسف نے اسکو محسوس کیا اور نہایت اطمینان سے گفتگو کا رخ اور لب و لہجہ بدلکر سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں دیکھتا ہوں کہ میں نے کافی جوش کے ساتھ آپ کی پذیرائی نہیں کی، لیکن اس سے یہ نہ خیال کیجیے کہ میرا دل مسرت سے خالی ہے۔ باور کیجئے میں حیران ہوں کہ آپ لوگوں کی اس زحمت کی تلافی کیونکر مجھ سے ممکن ہے"۔

یوسف کا یہ خشک انداز، یہ بے پروایانہ طریق پذیرائی اور اسی کے ساتھ گفتگو کا وہ طعن جس میں زہر سے زیادہ نفرت پنہاں تھی

ایک ایسا خلاف توقع انکشاف تھا کہ مس ہلن ششدر رہ گئی اور دیر تک کچھ سوچتے رہنے پر مجبور

دو ہی دن کے قیام میں یوسف کی آزادی کے تمام حدود جیب و ہلن پر روشن ہوگئے اور جیب نے باوجود مس ہلن کی مخالفت کی آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ اس کو کسی طرح مجبور کرکے یہاں سے واپس کرنا چاہئے ۔ ایک صبح گفتگو اسی ارادہ سے شروع کی گئی لیکن جیب نے اسکی ابتدا ہی کی تھی کہ یوسف نے ایک ایسی ہنسی کے ساتھ جس میں نہایت قوی عزم شامل تھا کہا کہ "جیب میں ابھی دارجلنگ نہیں چھوڑ سکتا۔ اور اگر دارجلنگ چھوڑ دوں تو بھی یہ ممکن نہیں کہ گھر واپس جاؤں اگر یہاں نہ رہوں گا تو پھر وہاں جاؤنگا جہاں اس سے زیادہ سامان دلچسپی میرے لئے مہیا ہو۔"

جیب۔ "کیا گھر میں اس سے زیادہ سامان دلچسپی فراہم نہیں ہو سکتے"

یوسف۔ (بے اختیار ہنسکر) آپ پروفیسر ہوکر ہر مخاطب کو بچہ ہی سمجھنے لگے، کچھ اور ذکر کیجئے۔ دنیا میں ناصح بننا کوئی مستحسن فعل نہیں ہے کسی کو نصیحت کرنا، اس کو بیوقوف سمجھنا ہے اور آپ بیوقوف کو بھی بیوقوف کہیں گے تو اسے غصہ آجائے گا، یہی ہے انسانی دماغ کی سائکالوجی۔"

مس ہلن۔ "نصیحت ہمیشہ دانشمند ہی کو کیجاتی ہے کیونکہ اسی سے توقع سننے اور سمجھنے کی ہوتی ہے۔"

یوسف۔ (ہنسکر) کم از کم آپ تو مجھے دانشمند نہ کہئے، آپ خوب واقف ہیں کہ مجھ میں بیوقوف بن جانے کی کتنی صلاحیت موجود ہے وہ تو کہئے بالکل حسن اتفاق تھا کہ خود فراموشی کی دنیا مجھے نصیب ہوگئی، ورنہ کسی پر دسترس حاصل کرنے کے لئے میں تو سر دیدینے کیلئے بھی تیار ہوجاتا۔"

تھوڑی دیر کے لئے سناٹا ہوگیا، جیب خاموش تھا اور مس ہلن سر سے پانوں تک عرق عرق۔ مس ہلن کے لئے یوسف کا یہ فقرہ ایسا سخت طعن تھا اور اس کی آخری تحریر کا (جسے وہ دارجلنگ ہوٹل میں چھوڑ گئی تھی) اس قدر نشتریں جواب تھا کہ وہ اپنی جگہ تڑپ کر رہ گئی اور اپنی خفت کو مٹانے کے لئے سوائے اس کے کچھ نہ کہہ سکی کہ "اگر آپ خفا ہوتے ہیں تو میں ایسی گفتگو نہ کرونگی۔"

یوسف۔ "میں ! اور آپ سے خفا !! محسن سے خفا ہوجانا تو فطرت انسانی کے خلاف ہے، آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتی ہیں۔ اگر میرے لب و لہجہ سے آپ نے ایسا خیال کیا تو میں کوشش کرونگا کہ حقیقت سے ہٹ کر آپ سے گفتگو کروں تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو

جیب نے یہ دیکھکر کہ گفتگو نے غلط پہلو اختیار کر لیا ہے، قطع کلام کرکے کہا کہ "یوسف، سنو، مجھے یہ گفتگو مطلق پسند نہیں، خیال کی دنیا سے الگ ہوکر عملی دنیا میں آؤ اور پھر غور کرو کہ تمہاری موجودہ حالت کہاں تک قابل برداشت ہے

مجھے صاف صاف کہنا چاہئے کہ تمہاری یہ فضول خرچیاں، عیاشیاں، بیباکیاں اور خدا جانے کیا کیا کسی طرح مناسب نہیں مجھے حیرت ہے کہ یا تو تمہارا وہ عالم تھا کہ ایک معمولی کسان کے حدود معیشت و معاشرت سے آگے نہ بڑھتے تھے، یا اب یہ کیفیت ہے کہ سارے دارجلنگ میں تم سے زیادہ اوباش کوئی اور نظر نہیں آتا، برا نہ ماننا مجھے حق ہے کہ تمہارے لئے اس سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کروں۔ تم کو سوچنا چاہئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا اور کب تک اس مکروہ زندگی کو اختیار کئے رہوگے ؟"

یوسف نے نہایت نرمی کے ساتھ جواب دیا کہ "آپ کو جو کچھ کہنا ہے ایک مرتبہ کہہ لیجئے تاکہ میں بھی ایک ہی بار اس کا جواب دیکر خاموش ہو جاؤں"

جیب :- "مجھے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہنا کہ تم میرے ساتھ واپس چلو"

یوسف :- میں ابھی واپس نہیں جا سکتا - اور شاید کبھی نہیں، اس طرح ابھی نہ میں اس مکروہ زندگی کو ترک کر سکتا ہوں اور غالباً کبھی نہیں، معاف فرمائیے میری روح کی بغاوت ایسی معمولی نہیں کہ آپ یا کوئی اور اس پر غالب آ سکے - جن کی آزادی حاصل کرنے کے بعد کسی طائر کو قفس کی پُر امن زندگی کی دعوت دینا کوئی اچھی قسم کا فریب نہیں ہے - وہ شخص جس نے یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ انسانی تگ و دو کی اصل غایت حصول نشاط ہے تو پھر وہ "اسباب نشاط" کی فراہمی کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہے - اب رہا یہ امر کہ وہ چیز جسے میں "راحت روح یا نشاط زندگی" سے تعبیر کرتا ہوں، وہ حقیقتاً ایسی ہے بھی کہ نہیں - سو اس کا معیار مقرر کرنا مشکل ہے یہ بالکل انفرادی چیز ہے - اور اس کو اجتماعی مسئلہ قرار دینا غلطی ہے - اگر میں آپ کی نزدیک اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہوں تو ہونے دیجئے، لطف کی موت، بے لطفی کی زندگی سے اچھی ہے - کل مس گارڈن نے کلب میں پانچ ہزار مجھ سے جیتے اور اس سے قبل بھی ہمیشہ وہی جیتی میں رہیں - یقیناً یہ رقم میری حیثیت سے کچھ زائد ہے لیکن میں خوش ہوں کیونکہ اس مادی نقصان کی تلافی جس روحانی نفرت کے ساتھ ہو جاتی ہے وہ کافی سے زائد ہے کیونکہ محبت و خلوص کی ادنیٰ قیمت جان ہے اور یقیناً میری زندگی میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ صحیح معنے میں اس کا تجربہ مجھے حاصل ہوا"

وہ یہ کہتا جا رہا تھا اور مس ہلن کے چہرہ پر ایک غیر معمولی مسرت کی کیفیت پیدا ہوتی جاتی تھی - جیب نے دیکھا اور تعجب سے دیکھا لیکن چونکہ وہ غریب خود معترف تھے کہ انھوں نے اس وقت تک مس ہلن کا کافی مطالعہ نہ کیا تھا، اس لئے یہ سمجھکر کہ ممکن ہے مس ہلن کی یہ مسرت کسی خاص جذبۂ ہمدردی کے بنا پر ہو خاموش رہگیا۔

اس واقعہ کے بعد دو دن تک مس ہلن اور جیب کا قیام دارجلنگ میں رہا اور یوسف یہ دیکھکر بے انتہا مسرور ہوا کہ مس ہلن اور مس گارڈن کے تعلقات باوجود جدید ہونے کے بہت پُر خلوص تھے اور برخلاف جیب کے مس ہلن نے ایک مرتبہ بھی مس گارڈن کے خلاف کوئی بات نہیں کہی، بلکہ جب ذکر آیا اس کی تعریف ہی کی۔ . . . .

ان لوگوں کو رخصت ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور یوسف اپنے مکان میں تنہا بیٹھا ہوا تھا کہ مس گارڈن کا خادم ایک خط ہاتھ میں لئے ہوئے آیا اور بولا کہ میم صاحب کے نام یہ خط رجسٹری شدہ اس وقت کی ڈاک سے آیا ہے انھوں نے حکم دیا تھا کہ ڈاک فوراً ان کو پہونچا دیجائے اس لئے میں اس خط کو لایا تھا کہ انھیں دیدوں۔

یوسف :- مگر وہ تو یہاں نہیں آئیں - گھر سے نکلے ہوئے کتنی دیر ہوئی؟

خادم - ایک گھنٹہ ہوا ہوگا، تو پھر میں یہ خط یہیں چھوڑے جاتا ہوں کیونکہ میرے خیال میں اب وہ آتی ہی ہونگی، ڈاک خانہ جانے کو کہہ رہی تھیں، ممکن ہے وہاں دیر لگ گئی ہو - انھیں کلکتہ ایک بیمہ کرنا تھا"

یوسف :- بیمہ! کس کے نام! کیا وہاں کوئی انکا عزیز رہتا ہے"؟

خادم :- عزیز کا حال تو معلوم نہیں، لیکن اس سے قبل کئی مرتبہ میں خود ڈاک خانہ بیمہ کا لفافہ لیکر گیا ہوں، تھوڑی سی انگریزی جانتا ہوں اس لئے میں نے اسپر مس ہلن کا نام پڑھا تھا۔ ان سے ہماری میم صاحب کی بڑی دوستی ہے۔

یوسف (انتہائی حیرت سے) مس ہلن! مس ہلن!!

خادم :- جی ہاں، مس ہلن، آپ کو نہیں معلوم، ابھی تو وہ آئی تھیں، آپ کے ہاں کئی دن ٹھہری رہیں؟"

یوسف :- ہاں، ہاں میں جانتا ہوں، لیکن یہ خبر نہ تھی کہ تمہاری میم صاحب سے ان کی پرانی جان پہچان ہے"۔

خادم :- بہت پرانی جان پہچان ہے، وہ ہمیشہ دارجلنگ آکر یہیں ٹھہرتی ہیں اور دونوں تک قیام کرتی ہیں، اب کی مرتبہ بھی کئی مرتبہ ان سے ملنے آئی تھیں۔ یوسف دیر تک خاموش رہا اور اس کا دماغ عجیب و غریب خیالات کا جولانگاہ بنا رہا۔ اول اول جب مس گارڈن کا اس نے تعارف کرایا تو وہ بالکل اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملیں اور کسی ادا سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ باہم متعارف نہیں ہیں اس لئے یہ خیال کرکے کہ جو کچھ اسپر ظاہر کیا گیا، بالکل خلاف حقیقت تھا اس کو تکلیف ہوئی مگر پھر یہ سوچکر کہ خادم کھٹکا جائے اس نے ضبط سے کام لیا اور یہ کہکر کہ "ہاں، مجھے اُن کی دوستی کا حال معلوم ہے"! اس گفتگو کو ختم کردیا۔ خادم نے کہا کہ "میم صاحب آتی ہونگی دیدیجئے گا" اور خط میز پر رکھ کر چلا گیا۔

یہ مستطیل لفافہ تھا اور چاروں کونوں پر سرخ لاکھ کی مہریں لگی ہوئی تھیں سواد خط دیکھ کر یوسف سمجھ گیا تھا کہ مس ہلن کا خط ہے، اور چونکہ اسی وقت بالکل نئی بات ان دونوں کے متعلق معلوم ہوئی تھی اس لئے یہ لفافہ ایک ایسا معمہ ہو گیا، جس کے حل کرنے کے لئے اس کی فطرت بے چین ہو گئی۔

وہ دیر تک خط کو ہاتھ میں لئے ہوئے دیکھتا رہا، غور کرتا رہا کہ اس میں کیا ہوگا۔ اس قدر احتیاط کے ساتھ بھیجنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے الٹ پلٹ کر دیکھتا، مہروں کو چھوتا، ہات پر رکھ کر اس کے وزن کا اندازہ کرتا اور کبھی کبھی بے اختیارانہ طور پر اس کو چاک کرنے کے لئے کونے پھاڑنے پر آمادہ ہو جاتا۔ لیکن اس خیال سے کہ خط کے آنے کا علم مس گارڈن کو ضرور ہو جائیگا اور چاک کیا ہوا خط دینا ناممکن ہوگا۔ پھر باز آجاتا۔ وہ نہایت شش و پنج میں تھا، اور اس کی خلش جستجو ہر دم بڑھتی جاتی تھی! ٹھیک اسی وقت کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی اور یوسف نے بے اختیاری کے ساتھ خط کو اپنی جیب میں چھپا لیا۔ آتے ہی مس گارڈن نے پوچھا کہ "میرا کوئی خط تو نہیں آیا"؟ اور یوسف نے بھی گھبرا کر انکار کردیا۔ مس گارڈن یہ سنتے ہی خط لانے کی غرض سے الٹے پانوں واپس گئی اور قبل اس کے کہ یوسف کچھ کہے یا اُسے روکے وہ جا چکی تھی۔ مس گارڈن کے اس اضطراب نے اور زیادہ اسے متحیر کیا، یہانتک کہ اس کا جذبۂ جستجو حد ضبط سے بڑھ گیا اور اُس نے دروازہ بند کرکے خط کو چاک کرکے پڑھنا شروع کیا۔ خط طویل تھا اس لئے یوسف کو اس کے ختم کرنے میں دیر لگی، لیکن جس وقت وہ اُس کو ختم کر چکا تو اُس کا چہرہ غصہ سے سرخ تھا اور ایسا کرب اس کی ہر ادا سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

تھوڑی دیر تک تامل کرنے کے بعد، اُس نے خادم کو آواز دی اور حکم دیا کہ فوراً اس کے سفر کا مختصر سا سامان درست کردے،

سب سے پہلی ڈاک سے اس کو روانہ ہو جانا ہے۔

جاتے وقت اُس نے ہدایت کی کہ مکان مقفل کر دیا جائے اور اگر مس گارڈن آئیں تو ان سے کہدے کہ وہ نہایت ضروری کام سے دو دن کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔

(۱۰)

حبیب کے مسرت کی انتہا نہ تھی کیونکہ مس ہلن نے اُن سے عقد کا وعدہ کر لیا تھا۔ اور کالج کے ہر حلقہ میں اسی خوش کام اندواج کا ذکر تھا، حبیب یقیناً متموّل خانداں کا فرد تھا۔ لیکن یہ کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ وہ عروس کی رونمائی میں بیس ہزار کی رقم دینے کیلئے آمادہ ہو جائیگا۔

مس ہلن نے یہ رقم اپنے حسن و شباب کی قیمت میں نہیں لینا چاہی تھی بلکہ صرف اس لئے کہ وہ اپنی اور حبیب کے مواصلت کی یادگار میں ایک زنانہ صنعتی اسکول قائم کرے۔ یہ خیال اس قدر عجیب تھا کہ کالج کے ہر فرد کو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور ہر شخص ان دونوں کی وسعت نظر و سیر چشمی کی داد دے رہا تھا۔

نکاح کے منجملہ دیگر شرائط کے علاوہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ حبیب بیس ہزار روپیہ ایک زنانہ صنعتی اسکول قائم کرنے کے لئے مس ہلن کو دیگا اور رقم کی ادائی کے بعد ایک ہفتہ کے اندر دونوں کا عقد ہو جائے گا۔

شام کا وقت تھا مس ہلن کے علاوہ دو چار پروفیسر حبیب کے بنگلہ میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ حسب قرارداد حبیب نے بکس سے بینک کی کتاب نکال کر چک پر بیس ہزار کی رقم درج کی اپنے دستخط ثبت کئے اور مس ہلن کی طرف بڑھایا، لیکن ابھی مس ہلن لینے کے لئے جھکی ہی تھیں کہ دفعتہً دروازہ نہایت زور سے کھلا اور یوسف انتہائی بدحواسی کے ساتھ دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور فوراً یوسف کے ہاتھ سے اس نے چک چھین کر اپنی مٹھی میں لے لیا۔

ہر شخص حیران تھا، کہ یہ کیا قصہ ہے، حبیب باوجود غیر معمولی سنجیدہ انسان ہونے کے برہم تھا کہ یہ کیا حرکت اس نے کی، یوسف کا چہرہ بالکل دیوانوں کا سا تھا، سر کے بال پریشان تھے اور لباس بے ترتیب اضطراب اور بے چینی اس کی ہر ہر ادا سے ظاہر ہو رہی تھی۔ مس ہلن نے اُس کو دیکھا اور کچھ سہم گئی۔ قبل اس کے کہ یہ منظر کوئی اور صورت اختیار کرے یا کوئی گفتگو شروع ہو، یوسف نے مس ہلن کے ہاتھ سے انکا چھوٹا بیگ ایک جھٹکے کے ساتھ چھین لیا اور اسے کھول کر ایک لفافہ نکالا جس میں کچھ کاغذات ملفوف تھے۔

مس ہلن اب چونکہ سارے معاملہ کو سمجھ چکی تھی اس لئے وہ گھبرا کر اٹھی تاکہ دروازہ کھول کر باہر نکل جائے، لیکن یوسف نے بڑھ کر انکو روک دیا اور بولا کہ "مس ہلن ذرا صبر کیجئے اور اپنا پاسپورٹ اور جہاز کا ٹکٹ تو ساتھ لیجائیے ورنہ پرسوں کی ڈاک کے جہاز میں آپکا جانا ممکن نہ ہوگا"

یہ کہکر اُس نے لفافہ کے اندر سے مس ہلن کا پاسپورٹ اور جہاز کا ٹکٹ نکال کر سب کے سامنے میز پر ڈال دیا اور بولا کہ:-

"حبیب تم مجھ سے ضرور خفا ہو گے کہ میں نے عین اسی وقت جبکہ جام تمہارے لبوں سے قریب تر ہو گیا تھا چھین کر پھینک دیا، لیکن

باور کرو کہ وہ جام شراب کا نہ تھا بلکہ نہایت قاتل زہر کا تھا" اور یہ کہکر اس نے اپنی جیب سے وہی خط نکالا جو مس ہلن نے مس گارڈن کے نام لکھا تھا اور حبیب کی طرف بڑھا کر کہا کہ "اسے بھی پڑھ لو تاکہ تم سمجھ سکو کہ ہندوستان کے مشہور سیاہ سانپ میں بھی وہ زہر نہیں ہوتا جو یورپ کی سفید رنگ کی ناگنوں میں پایا جاتا ہے"

خط کا مضمون یہ تھا:—

"مائی ڈیر مس گارڈن"

میں اس لحاظ سے بیشک تمہاری بڑی معترف ہوں کہ تم نے اپنا کام نہایت کامیابی اور ہوشیاری کے ساتھ انجام دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک اصل معاملہ میں مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا مطالبہ ابھی اور باقی ہے۔ خود مسٹر یوسف سے مجھے معلوم ہوا کہ صرف ایک تاریخ میں پانچ ہزار روپیہ تم نے اُن سے حاصل کئے اور اس سے قبل بھی بارہا ہزار دس روپیہ تم نے جیتے کیا میں اس رقم میں برابر کی شریک نہیں ہوں۔ غور کرو کہ شروع سے لیکر اخیر تک، یوسف کے دماغ کی سائکالوجی کا مطالعہ کر کے تدریجی تدبیریں جو میں نے اختیار کیں، کس طرح کامیاب ہوئیں یہاں تک کہ میں ٹکو اس کو بمبئی کے سہراب جی والے معاملہ سے بھی زیادہ صحیح نشانہ خیال کرتی ہوں، اس وقت تک وقتاً فوقتاً مجھے صرف چار ہزار روپیہ ملے ہیں، لیکن تم خود سمجھ سکتی ہو کہ یہ کس قدر کم ہے ہر حال مجھے یقین ہے کہ تمہاری نیت درست ہوگی اور کسی خاص وجہ سے تم نے اس طرف توجہ نہ کی ہوگی۔ میں نے مسٹر حبیب کے متعلق تمام واقعات سے اس مرتبہ دارجلنگ کے دوران قیام میں آگاہ کر دیا تھا۔ وقت آگیا ہے کہ اس معاملہ کو بھی ختم کر دوں بیس ہزار کی رقم غالباً ۲۰ کو مجھے ملجائیگی اور علی گڑھ سے یہ رقم وصول کر کے سیدھی بمبئی جاؤنگی — ۲۲ کی صبح کو امریکن ہوٹل میں ملو تاکہ باہم ملکر حساب کریں اور حبیب کے معاملہ کا جتنا روپیہ تم کو ملنا چاہئے وہ میں تمہیں دیدوں اور تم سے مجھے جو کچھ لینا ہے وہ لیلوں بالکل تیار ہو کر آنا۔ اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہو تو تار دو تاکہ تمہارے ٹکٹ کا بھی انتظام کروں باقی تفصیلی باتیں ملنے پر ہونگی"

اس واقعہ کے بعد مس ہلن کا ہمیشہ کے لئے ساحل ہند کو خیرباد کہدینا اور مس گارڈن کا لاپتہ ہوجانا بالکل قدرتی نتیجہ تھا، لیکن سب سے زیادہ عجیب انقلاب وہ تھا جو یوسف کی زندگی میں پیدا ہوا۔ وہی خلد آباد ہے اور وہی اسکی ہری بھری کھیتیاں، جہاں صبح سے شام تک یوسف دھوپ میں کھڑے ہوکر کام کرتا ہے اور شام کو جب واپس آتا ہے تو گاؤں کے معصوم لڑکیوں کے گیتوں کو سن کر اس کی خستگی ایک خاص قسم کی روحانی لذت محسوس کرتی ہے

نیاز

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(مسلسل)

دوسری جانب میں نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ قدیم ایام کی خانہ جنگیاں ختم ہوگئی ہیں اور ان کے بجائے امن و امان قائم ہوگیا ہے اور زندگی زیادہ محفوظ ہوگئی ہے میں نے کسی ہندوستانی کو اس فائدہ کی اہمیت کو گھٹاتے نہیں دیکھا اسی طرح وہ ذہنی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی قدر و عافیت کا بھی معترف ہے۔ ذہنی نشوونما کے لئے ایک حد تک سیاسی آزادی لازمی شے ہے۔ جہاں لوگ اظہار خیالات پر جرمانہ، قید یا موت کی سزا پاتے ہوں وہاں خیالات ترقی نہیں پا سکتے اور شخصی آزادی کی کمی نے ہندوستان کو صدیوں تک ذہنی غلامی میں مبتلا رکھا ہے۔ لیکن باوجود تمام نقائص کے انگریزی حکومت کے ماتحت خیالات آزاد رہے ہیں اور جن اشخاص نے غور و فکر کرنے کی جرات کی ہے انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ایک ایسی نسل تیار ہوگئی ہے جو آزادی رائے کو بہت گرانمایہ شے شمار کرتی ہے اور اس کے باعث وہ دلیر ہوگئی ہے۔ شہروں کے رہنے والے ہندوستانی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، وہ کتابیں تصنیف کرتے ہیں، اخبارات نکالتے ہیں، ———— جلسوں میں شامل ہوتے ہیں۔ عام تقریریں کرنے کی غرض سے دورے کرتے ہیں، بے خوف ہو کر سوچتے، گفتگو کرتے اور بحث و مباحثہ کرتے ہیں اور ان سب کا نتیجہ عام ذہنی اور اخلاقی بیداری ہے۔ مزید برآں یہ معمولی بات نہیں ہے کہ بڑے درجوں کے آدمیوں میں جرائم کی تعداد کم ہوگئی ہے اور قدیم شاہانہ درباروں کی عیاشیاں جاتی رہی ہیں۔ جادو، زہر خورانی، قتل اور بدمعاشی کی زندگیوں میں کمی واقع ہو رہی ہے، ستی کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ اور صغرسنی کی شادی کے خلاف جوش و خروش جاری ہے یہ نمایاں فوائد ہیں اور کوئی انگریز یا ہندوستانی ان کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا۔ اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اُن میں اُس امید کا عنصر مضمر ہے جو باقی تمام برائیوں کا نجات دہندہ ثابت ہوگا۔

لہٰذا ہندوستانی محبان وطن کی یہ نادانی ہوگی اگر وہ انگریزی تعلق کو مطعون کرنے کی کوشش کریں گے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ابھی اسے برا بھلا نہیں کہہ رہے ہیں صوبجات بنگال، مدراس اور بمبئی میں مشکل سے کوئی سمجھدار ہندوستانی ہوگا جو انگریزی تاج سے اپنے ملک کی فوری علیحدگی کا خیال دل میں لاتا ہو۔ بیرونی خطرات سے قطع نظر کرکے اندرونی ملک کے خطرات ایسے ہیں جنہیں سب تسلیم کرتے ہیں۔ ہندوستانی ایک قوم نہیں ہیں نہ وہ صرف مذہب کے پیرو ہیں اور نہ وہ ایک زبان ہی بولتے ہیں۔ اس کی سرحد میں ایسے حصص شامل ہیں جو بالکل جنگی ہیں۔ پہاڑی اقوام برچھیوں اور ڈھالوں سے ابھی تک مسلح ہیں اور امن پسند زراعتی آبادی نہایت جاہل ہے۔ تعلیم کا کام ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچا اور نہ حفاظت کی ضرورت کا خاتمہ ہوا ہے اسے سب تسلیم کرتے ہیں اور مسلح امپیریل حکومت کی ضرورت کو سمجھتے ہیں کہ اگر اُسے ہٹا لیا جائے تو موجودہ مہذب سیاسی ڈھانچہ قائم نہیں رہ سکتا اور یہ بات مشتبہ ہے کہ آیا کوئی اور نظام اُس کی جگہ لے سکتا ہے یا نہیں۔ میں دیکھنے سے قاصر ہوں کہ انقطاع تعلقات ہندوستان کے لئے مفید ہوگا اور سمجھنے سے عاری ہوں کہ انگریزی حکومت کے بجائے کسی اور غیر ملکی حکومت کا قیام اُن کی حالت کو بہتر بنا دیگا

ساتھ ہی میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ ناممکن ہے کہ موجودہ صورت حالات چند سال سے زیادہ قائم رہ سکے۔ اینگلو انڈین حضرات کے نظام سے ہندوستانی کلیۃً متنفر ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ انگلستان پھر کسی فوجی بغاوت کو فرو کرنے کے قابل ہوسکیگا جسکے ساتھ لازمی طور سے تمام باشندوں کی ہمدردی شامل حال ہوگی۔ لیکن اگر اس بغاوت کے منحوس دن کا التوا بھی ہوجائے تو بھی فوجی طاقت کے ذریعہ جو حکومت کی جائے گی وہ بہت گراں ثابت ہوگی اور عرصہ تک اس کا چلانا ناممکن ہوگا۔ یہ خیال کرنا سخت غلطی ہے کہ ہندوستان پر انگریزی تلوار کے ذریعہ حکومت کیجاتی رہی ہے۔ لوگوں کی رضامندی حکومت کرنے میں ہمیشہ شامل رہی ہے اور اگر عام طور پر ترک موالات عمل میں آجائے تو موجودہ حکومت گھنٹہ بھر بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ فی الحال ہندوستانی انگریزی حکومت کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ ان کے لئے مفید ہے اور اگر انہیں ایک مرتبہ یہ یقین ہوجائے گا کہ انگریز ان سے بہتر سلوک کرنا نہیں چاہتے اور انہیں زیادہ آزادی دینے کے خواہشمند نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ بغاوت کئے بغیر وہ حکومت کو ناممکن بنا دیں۔ یہ بات زیادہ زور سے بیان کرنے کے قابل ہے کہ ہمارا نظام حکومت ہندوستانی باشندوں کی مرضی اور موالات پر منحصر ہے۔

آخر علاوہ ریفارم کیا ہونی چاہئے اور وہ کون انتہائی مطمح نظر ہے جسے سیاسیات میں مصلحین کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے جب میں کلکتہ میں تھا تو اتفاقیہ بہت سے جلسوں میں میں نے شرکت کی تھی جہاں ہندوستان کے مختلف حصص کے ڈیلیگیٹ آئے تھے اس لئے میں کم و بیش صحت کے ساتھ ہندوستانی مزاج

کے متعلق ہندوستانی خیالات کی ترجمانی کر سکتا ہوں۔ یہ بات بآسانی بیان کیجا سکتی ہے کہ اگرچہ وہاں سب کے سب اپنی امید دل کے پورا ہونے کا یقین رکھتے تھے لیکن کوئی شخص بھی ان میں ایسا نہ تھا جو یہ خیال کرتا ہو کہ ہندوستانی حکومت کے نظام میں ضروری تبدیلی پیدا کئے بغیر کامیابی ممکن ہے۔

ان کا استدلال حسب ذیل ہے :- اسوقت تک کوئی اصلاح عمل میں نہیں آسکتی جب تک کہ خود گورنمنٹ کی اصلاح نہ ہو جائے یہ انتہا درجہ کی قدامت پسند، خود غرض اور ہندوستانی جذبات و ضروریات سے بالکل اجنبی ہے اور جس طرح سے کہ انگلستان کے مصلحین اس صدی کی ابتدا میں پہلے پارلیمنٹ میں اصلاح کرنے کے موید تھے اسی طرح سے ہندوستانی مصلحین بھی پہلے ملک کی حکمران جماعت کی اصلاح کے خواہشمند ہیں ——— اور ملک کی طاقتور رائے اس امر کی تائید میں ہے کہ ہندوستانی توقعات اور کسی طرح پوری نہیں کی جا سکتیں نہ ہندوستانی مشکلات اور کسی طرح ٹالی جا سکتیں۔

موجودہ ہندوستانی نظام اس زمانہ سے ورثہ میں ملا ہے جبکہ حکام کے دل میں یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ اُن کا مطمح نظر ہندوستانیوں کو فائدہ پہنچانا ہے اس نظام کی بانی مبانی ایسٹ انڈیا کمپنی تھی جو ایک غیر ملکی تجارتی کمپنی تھی جو ملک کو اپنا مال قرار دیتی تھی اور جس کا یہ خیال تھا کہ فائدہ خالصۃً اس کے ممبروں کو پہنچے خواہ سود کی شکل میں یا شرکائے کمپنی کے رشتہ داروں اور دوستوں کو ملازمت دینے کی شکل میں ہندوستانیوں کا صرف اتنا خیال رکھا جاتا تھا کہ ان کی خوشحالی کا اثر کمپنی پر پڑتا تھا اور ابتدا میں تو یہ خیال بھی نہ تھا۔ ہندوستان مالدار ملک تھا اور برسوں تک اسے دولت کی نہ کم ہونے والی کان سمجھا جاتا۔ بالعرف وارن ہیسٹنگز کے مقدمہ کے بعد متعلقہ اشخاص کی حرص و آز کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ لندن کے ڈائرکٹران اور تینوں صوبوں میں ان کے ملازمین کا مقصد ایک تھا یعنی یہ کہ روپیہ کمانا اور جب کبھی ان کے درمیان اختلاف رائے ہو جاتا تھا تو وہ صرف نفع کی تقسیم کے متعلق ہوا کرتا تھا وہ سب کے سب مالدار بننا چاہتے تھے۔

بعد ازاں حکومت ڈائرکٹروں کے بورڈ کے سپرد ہو گئی جو انڈیا ہاؤس میں بیٹھ کر سول سروس کے ذریعہ انتظام چلاتا تھا اور چونکہ بسا اوقات ڈائرکٹران خود اس کے ممبر رہ چکے تھے اس لئے وہ اس ملازمت کی روایات کو برقرار رکھتے تھے یہ حکمران جماعت غایت درجہ کی استبداد پسند اور ہر قسم کی نگرانی سے مبرا بیوروکریسی تھی جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی اسلئے کہ نہ تو وہ کسی شہنشاہ کی مرضی کے تابع تھی اور نہ رائے عامہ کے روبرو جوابدہ تھی۔ اس کی خود غرضی کو اگر کوئی قوت روک سکتی تھی تو وہ اس کے بعض ممبروں کی انفرادی نیکی تھی۔ صرف کمپنی کے نئے چارٹر عطا کئے جانے کے موقع پر انگریزی پارلیمنٹ اور پبلک اس امر کی متوقع تھی کہ کسی قسم کی دخل اندازی شاید ممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا ڈھرا غدر تک چلتا رہا۔

مگر ۱۸۵۸ء میں کمپنی کا بہ حیثیت کمپنی کے خاتمہ ہو گیا۔ ڈائرکٹروں کے بورڈ کو موقوف کر دیا گیا اور ہندوستانی سرمایہ پر سود دینا بند ہو گیا اور حکومت ہند برائے نام انگریزی تاج کو منتقل کر دی گئی۔ اسوقت نظام حکومت کی اصلاح کے بارے میں بہت کچھ شور و غل کیا گیا اور اس امر کا باقاعدہ اعلان بھی ہو گیا کہ آئندہ سے ہندوستان پر ہندوستانیوں کی فائدہ رسانی کی خاطر حکومت کی جائیگی۔ برطانوی ہندوستان کے باشندگان کے نام جو شاہی اعلان شائع ہوا اس میں انگریزی رعایا کی حیثیت سے انکا مساوی درجہ تسلیم کیا گیا۔ سرکاری اعتماد کے فرائض کی ادائیگی میں اُن کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی اور امپیریل پالیسی میں بھی یہ طے پا گیا تھا کہ انگریزی فوائد کو ہندوستانی فوائد پر ترجیح نہ دی جائیگی یہ پروگرام نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا اور ہندوستان میں اسکا جوش اور مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا اور انگریزی تاج کے لئے اسوقت جس حقیقی جذبات وفاداری کا اظہار کیا گیا تھا اس میں ابھی تک کمی واقع نہیں ہوئی اس میں صرف یہ نقص رہا ہے کہ اس پر آج تک عملدرآمد نہیں ہوا۔ تمام سرکاری اطلاعات پالیسی کے بیانات اور شاہی اعلانات کے باوجود ہندوستانی حکومت کا اصول وہی ہے جو قدیم سے چلا آ رہا ہے یعنی یہ کہ حکومت محض انگریزی تجارت اور انگریزی ملازمین کے فوائد کی حامی و نگران ہے۔

اس عظیم ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ جب طاقت کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر تاج کے ہاتھ میں آگئی تو اسوقت پرانے نظام کو برقرار رکھنا بہت سہل معلوم ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک سول سروس قائم کر رکھی تھی جس میں اسی کے نامزد شدہ اشخاص داخل ہوا کرتے تھے جن کے فوائد رفتہ رفتہ کمپنی کے اغراض و مقاصد میں شامل ہو گئے۔ انہیں ایک خاص معاہدہ کے مطابق مقررہ مدت ملازمت اور بعد میں پنشن کے حقوق عطا کئے گئے۔ ان حقوق کو انگریزی حکومت نے اب تسلیم کر لیا اور ان سے پھر اسی معاہدہ کی تجدید ہو گئی جو انھوں نے پہلے کمپنی سے کر رکھا تھا اور اسی طریقہ سے نظام حکومت میں مخصوص فوائد برقرار رہے جن کے باعث آزاد نشوونما کی راہ میں ہمیشہ سے رکاوٹیں پیش آتی رہی ہیں۔

۱۸۵۳ء میں جو حقیقی تبدیلی عمل میں آئی وہ یہ تھی کہ نامزدگی کے بجائے تقرر امتحان پاس کرنے کے بعد کیا جاتا تھا لیکن سروس کی ترکیب جوں کی توں قائم ہے اور موجودہ زمانہ کا انگریز سولین کمپنی کے زمانہ کی طرح اب بھی ہندوستان کا عملی طور پر مالک ہے۔ اس کی موجودہ پوزیشن ایک جماعت کے فرد کی سی ہے یعنی یہ کہ نہ تو اسے برطرف کیا جا سکتا ہے اور نہ اس سے جواب طلب کیا جا سکتا ہے اور نہ وہ اپنے ہم ملکیوں کے علاوہ اور کسی کے اختیار کے

آگے سر تسلیم خم کر سکتا ہے۔ تمام انتظامی اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں، وہی تمام آمدنی کو خرچ کرتا ہے اور وہی تمام ادنیٰ ملازمتوں کا تقرر کرتا ہے۔ در حقیقت وہی خود گورنمنٹ ہے اور گورنمنٹ بھی نہایت مطلق العنان قسم کی +

لیکن یہ سول سروس کلیۃً قدامت پرست ہے۔ اگرچہ وہ ایک وسیع حد تک اعلیٰ اور دیانتدار اشخاص پر مشتمل ہے۔ (اور یہ وہ اشخاص ہیں جو اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہیں اور صرف کبھی کبھی فرض منصبی سے زیادہ بھی کام کر لیتے ہیں) تاہم اس میں وہ تمام خرابیاں موجود ہیں جو اس قسم کی جماعتوں میں ہوتی لازمی ہیں۔ وہ پہلے اپنے فائدہ پر نظر رکھتی ہے اور پھر ہندوستانیوں کے مفاد کا خیال کرتی ہے اس امر کا بیان کرنے سے ان کے ممبروں پر کسی قسم کی برائی عائد نہیں ہوتی۔ ابھی تک دنیا میں کوئی ایسی جماعت پیدا نہیں ہوئی جو اپنی جیب کو نقصان پہنچا کر عامۃ الناس کی بھلائی کرنے کی خواہشمند ہو اور انڈین سول سروس جو اس قاعدہ کی مستثنیات میں سے نہیں ہے، یہ دیکھ رہی ہے کہ ریفارم ہوتے ہی اس کی تنخواہ میں کفایت شعاری پیدا ہو جائیگی، اس کے حقوق کم کر دئے جائیں گے اور ملازمت کا میدان محدود ہو جائیگا۔ اس قسم کی ملازمت فطرتاً ہر کفایت شعاری اور ہر تبدیلی کی دشمن ہوا کرتی ہے +

لہٰذا جب میں ہندوستانی مصلحین کے ساتھ ہم نوا ہو کر یہ کہتا ہوں کہ اس سول سروس کی اصلاح کیجائے، تو سب سے پہلے میری اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ رکاوٹ کو ہٹا دیا جائے۔ لیکن سول سروس لباس پارینہ ہو چکی ہے اور اب ضرورت نہیں ہے کہ اس فضول خرچی کو قائم رکھا جائے ممکن ہے کہ پچیس، چالیس یا پچاس برس پیشتر تک اس امر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہو کہ تعلیم یافتہ انگریزوں کی خدمات نہایت شاندار تنخواہیں دیکر عمر بھر کے لئے اس زمانہ کے ہندوستان جیسے دور دراز ملک کے لئے حاصل کیجائیں۔ ایک نسل پہلے ایسے لوگ کمیاب تھے اور اس لئے ممکن ہے کہ انڈیا ہاؤس (جو اب انڈیا آفس کہلاتا ہے) اپنی ضرورتوں کے باعث خاص خاص حقوق دینے اور اعلیٰ درجہ کی تنخواہیں دینے پر مجبور رہو لیکن موجودہ زمانہ نے سب کچھ تبدیل کر دیا ہے اور قابلیت کی بہم رسانی اس قدر زیادہ ہے کہ کسی قسم کا خاص معاہدہ کئے بغیر اچھی سے اچھی شے میسر آسکتی ہے۔ تجارتی کمپنیوں نے اس پرانے خیال کو اب ترک کر دیا ہے اور اب وہ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان کے لئے بھی کھلی منڈی میں اپنے آدمی تلاش کرتی ہیں اور انھیں محض اس وجہ سے گھٹیا مال دستیاب نہیں ہوتا کہ وہ عمر بھر کے پٹے نہیں لکھتیں اور اگر گورنمنٹ آف انڈیا مالی لحاظ سے اپنا سر پانی کی سطح سے بلند رکھنا چاہتی ہے تو اسے بھی آئندہ زمانہ میں اسی اصول پر عملدرآمد کرنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ مساوی قابلیتوں کے انگریز ½ تنخواہ پر میسر آسکیں گے اور ان کیلئے کسی خاص معاہدہ کی ضرورت پیش نہ آئیگی۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اعلیٰ ترین مدارج کے سوائے باقی تمام انگریزی سروس کا خاتمہ کر دینا بدرجہا بہتر ہوگا اور ان کے بجائے کم شرح کے ہندوستانی اشخاص ملازم رکھے جائیں، جن کے لئے یہ کم شرح بھی بہت ہوگی۔ بہت زیادہ تعداد میں انگریزوں کو ملازم رکھنے کا رجحان حال ہی میں پیدا ہوا ہے اور اس میں ہر طرح کا نقصان ہی نقصان ہے +

لہٰذا سول سروس کے بجائے ایک مخصوص سول سروس رونما ہوگی گو جسکے ساتھ خاص حقوق شامل ہوں گے۔ اس کے افراد زیر نگرانی ہونگے اور حقیقی معنوں میں ملک کے خدمتگار اور ملازم متصور ہوں گے۔ موجودہ زمانہ میں وہ اس کے آقا بنے ہوئے ہیں +

یہ امر کہ وہ اس کے آقا ہیں، کافی طور پر اُن کوششوں کی کامیابی سے ثابت ہو گیا ہے جو گزشتہ تین سال میں لارڈ رپن کی پالیسی کو ناکام بنانے میں عمل میں آچکی ہیں۔ لارڈ رپن ہندوستان میں ایسے زمانہ میں آئے تھے جبکہ مڈلوتھین کی فتح[۱] حالت شباب میں تھی اور وہ ان خیالات کو عمل میں لانے کے نہایت سرگرم مؤید تھے۔ جن کا اظہار انھوں نے اپنی تقریروں میں کیا تھا۔ اُن کے خیالات میں اگرچہ اب تک کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی لیکن اُن کے وائسرائے بننے سے خاک فائدہ نہیں پہنچا۔ جو مسودۂ قانون بھی انھوں نے پیش کیا وہ تفصیلات میں پڑ کر بالآخر ناکام رہا۔ اور سول سروس اس قدر طاقتور ثابت ہوئی ہے کہ اس نے ہندوستان کے بارے میں آزاد پالیسی کو ترک کر دینے کے لئے انگلستان کی حکومت کو بتدریج مجبور کر دیا۔ جب میں ہندوستان پہنچا تو میں نے لارڈ رپن کو اسکول کے اس طالب علم کی طرح پایا جو اپنے ہمجولیوں کے ساتھ دوڑ میں سب سے آگے بھاگا جا رہا ہے اور اُسے اتنی خبر نہیں کہ اس کے باقی ساتھی رک گئے ہیں۔ اور یہ کہ باقی ساری دنیا اس کی غیر ضروری سرگرمی پر خندہ زن ہو رہی ہے۔ مڈلوتھین کے باوجود اینگلو انڈین بیوروکریسی اپنے تئیں انکا آقا ثابت کر چکی تھی +

لیکن اگر سول سروس مردہ کمپنی کا رکاوٹ پیدا کرنے والا اور تکلیف دہ ورثہ ہے تو لندن میں ہندوستانی گورنمنٹ کے نظام کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہئے ۱۸۵۸ء میں جب کمپنی کا خاتمہ ہوا تو انڈیا ہاؤس کے بجائے انڈیا آفس قائم کیا گیا۔ اور بورڈ آف ڈائرکٹرز کے بجائے انڈین کونسل کا وجود ظہور میں آیا

[۱] اس سے مراد وہ فتح ہے جو گلیڈ اسٹون کو اس وقت حاصل ہوئی جبکہ انھوں نے مڈلوتھین کے مقام میں اپنی آزاد پالیسی کا اعلان کر کے میجارٹی کو اپنا ہمخیال بنا لیا +

اس تبدیلی سے دکھانا بہت کچھ مقصود تھا مگر عملاً کچھ بھی نہیں ہوا۔ انڈیا آفس مجبور ہے کہ پرانی روایات کی نمائندگی کرے اور کونسل جو اسکی کارروائیوں کو روکنے کے لئے بنائی گئی تھی بورڈ آف ڈائرکٹرز سے کہیں زیادہ قدامت پسند اور رکاوٹ ثابت ہوئی ہے اس کا سبب بالکل بدیہی ہے۔ کونسل جو کم و بیش پنشن یافتہ سول اور ملیٹری ملازمین پر مشتمل ہوتی ہے صرف اینگلو انڈین سروس کے نقطۂ خیال سے ہندوستانی معاملات پر بحث کرتی ہے۔ وہ جدید خیالات کو قبول کرنے کی جانب مقابلتہً کم مائل ہے اور ہندوستانیوں کے جدید خیالات سے بالکل نابلد ہے۔ وہ تجربہ کے اعتبار سے ایک نسل پیچھے ہی رہتی ہے۔ اسی طرح سے وزیر ہند جو کلیتہً اس اندھے رہنما پر اپنا انحصار رکھتا ہے، انگلستان میں بعینہٖ وہی حیثیت رکھتا ہے جو وائسرائے کی ہندوستان میں ہے۔ بالعموم وہ ہندوستانی معاملات سے بے خبر رہتا ہے اور انڈیا آفس اور اپنی اینگلو انڈین کونسل سے مشورے طلب کرتا ہے اور اس لئے وہ کبھی بچائی معلوم نہیں کر سکتا یہی سبب ہے کہ انکی رہنمائی میں وہ اندھے پن میں غلطیاں کرجاتا ہے خواہ وہ کتنا طاقتور اور سنجیدہ ہو اس کے لئے ناممکن ہے کہ مصلح کی حیثیت سے ان کے مقابلہ میں قائم رہ سکے +

لہذا جو اصلاحات ہندوستانی باشندے انگلستان اور ہندوستان میں نہایت زور اور اصرار کے ساتھ طلب کر رہے ہیں وہ ہندوستان کے متعلق تو اتنی ہیں کہ سول سروس کے نظام کو بالکل بدل دیا جائے اور عمر بھر کے پٹے اور معاہدے منسوخ کرکے ہندوستانیوں کو آزادانہ طریقہ سے آئیں بغیر کسی معاہدہ کے داخل کیا جائے وہ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ جوں جوں جگہ خالی ہوتی جائیں ووں ووں ہندوستانیوں کے لئے مناسب تعداد محفوظ رکھدی جائے اور اس طرح سے بتدریج سوائے اعلیٰ ترین عہدوں کے باقی سب کے سب ہندوستانی باشندوں سے پر کئے جائیں مزید برآں لندن کی کونسل میں وزیر ہند کو مشورہ دینے کے لئے ہندوستانی اور اینگلو انڈین پنشن یافتہ افسر ہونے چاہئیں انکا خیال ہے کہ جب تک ایسا نہ کیا جائیگا اسوقت تک گورنمنٹ آف انڈیا تاریکی میں رہیگی اور اصلاحات کی سب کوششیں رائیگاں ہوجائیگی +

یہ ظاہر ہے کہ ایسے ابتدائی تغیرات زیادہ ضروری اصلاحات کی جانب صرف پہلا قدم ہیں۔ ہندوستانی جس شے کا مطالبہ کرتے ہیں وہ سوراج ہے یعنی یہ کہ نہ صرف انتظامی طاقت ان کے ہاتھ میں دیدی جائے بلکہ یہ کہ قوانین وضع کرنے اور مال کے اختیارات انھیں سونپ دئے جائیں۔ فی الحال ہر صوبہ میں قانون وضع کرنے کا اختیار گورنر بااجلاس کونسل کے ہاتھ میں ہے اور پبلک کے نمایندوں کو اس میں شریک کرنے کا کوئی انتظام نہیں کونسلیں کلیتہً نامزد شدہ ممبروں پر مشتمل ہوتی ہیں جن کا کام محض مشورہ دینا ہے۔ کیونکہ وہ کسی چیز کو پیش کرنے یا اسے نامنظور کردینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ ہر کونسل میں چند ہندوستانیوں کو جگہ دیدی گئی ہے مگر وہ کسی اعتبار سے ملک کے نمایندے نہیں کہلائے جا سکتے بلکہ گورنمنٹ کے نامزد شدہ ممبر ہیں اور محض اس لئے منتخب کئے گئے ہیں کہ ان میں گورنر کی ہاں میں ہاں ملانے کی قابلیت موجود ہے۔ باقی تمام ممبر انگریز (سول اور ملیٹری افسر) ہوتے ہیں جو ممبری کو اپنی خدمات کا انعام تصور کرتے ہیں اور جو محض سرکاری خیالات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ لارڈ رپن نے بلاشبہ اپنی سو بہ بہم کونسل میں آزاد خیال ہندوستانیوں کو داخل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جو لوگ بالعموم اس عہدے پر مقرر ہوتے ہیں ان کی دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی سہ سالہ میعاد کے بعد دوبارہ ممبر مقرر کئے جائیں اس لئے ہندوستانیوں کے جذبات کی نمایندگی کرنے کے بجائے وہ گورنر کی ہمنوائی کرتے ہیں ؎

آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

یہ خوشگوار صورتِ حالات نہیں ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ پبلک کی مختلف جماعتوں کو اپنے نمایندے منتخب کرنے کا اختیار دیا جائے اور ان کی توسیع میعاد کا اختیار گورنر کے ہاتھ میں ہو اور جب کونسلروں کی تعداد بڑھ جائیگی اور بحث و مباحثہ کرنے اور سوالات پوچھنے کا میدان وسیع کردیا جائے گا تو اسوقت اس نظم و نظر کی اچھی خاصی بنیاد پڑجائیگی جسے ہندوستانی صوبہ دار پالیمنٹ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں یہ تسلیم نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کم سے کم ابتدائی قسم کی لوکل پارلیمنٹ کی اہلیت نہیں رکھتا بلاشبہ کچھ عرصے کے لئے کونسلوں میں انگریزی عنصر کی زیادہ مقدار رکھنے کی ضرورت ہوگی لیکن ہندوستانی دماغ بہت جلد باتیں اخذ کرلیتا ہے اور دوسری نسل میں بغیر کسی خطرہ کے قوانین سازی کا سارا کام انہی کے سپرد کیا جا سکتا ہے اور مالیات کی کلی نگرانی بھی انہی کے ہاتھ میں دیجا سکتی ہے +

اس سے یہ مطلب نکالا جائے کہ میں ہندوستان کے لئے امپیریل پارلیمنٹ کا مطالبہ کررہا ہوں۔ ہندوستان اسقدر وسیع ملک ہے اور اس میں ایسی کثرت سے مختلف اقوام آباد ہیں کہ بظاہر یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ ایک ہی جماعت میں ان سب کے نمایندے شریک ہوسکیں۔ ممکن ہے کہ کبھی ......

ائندہ زمانہ میں جاکر اس قسم کی پارلیمنٹ وجود میں آجائے مگر ہم لوگوں کی زندگی میں تو یہ مشکل نظر آتی ہے۔ امپیریل طاقت (بشرطیکہ اسے موثر بنانا منظور ہو) ایک ہی شخص کے ہاتھ میں رہنی چاہیئے اور وائسرائے کے اختیارات کو کمزور کرنے کے بجائے میری خواہش ہے کہ انہیں اور زیادہ طاقتور بنا دیا جائے۔ لیکن صوبوں میں اور تمام صوبہ داری معاملات کے لئے سیلف گورنمنٹ ایک ضروری شے ہے اور موجودہ زمانہ اسے عملی شکل میں دیکھنے کی پوری اہلیت رکھتا ہے +

ہندوستان کی سب سے اہم اور فوری ضرورت کفایت شعاری ہے اور اس کے لئے مالیات کی لامرکزیت بہترین علاج ہے ہر صوبہ کا اپنا بجٹ علٰحدہ ہونا چاہیئے اور اپنی سول لسٹ بھی جسپر سالانہ کونسل کی رائے لی جانا چاہیئے۔ اسکی سول سروس اپنی علٰحدہ ہونی چاہیئے اور تعمیرات عامہ کا محکمہ بھی اسی کا ہونا چاہیئے جسمیں کلکتہ کی جانب سے کسی قسم کی دخل اندازی نہ ہونی چاہیئے۔ براونشل اور امپیریل حسابات بھی علٰحدہ علٰحدہ رکھنے چاہئیں۔ موجودہ صورت میں جبکہ مختلف قسم کی امپیریل ملازمتیں رواج پا گئی ہیں اور جنکا صدر مقام کلکتہ یا شملہ ہے، روپیہ کا ضائع ہونا مناسب طریقہ سے نہیں رک سکتا حسابات خلط ملط رہتے ہیں اور وہ لوگ جنپر ٹیکس کا بار پڑتا ہے کسی قسم کی نگرانی نہیں رکھ سکتے اور کوئی شخص ٹھیک طور سے یہ نہیں سمجھ سکتا کہ عام بجٹ میں جو اخراجات دکھائے جاتے ہیں وہ کہاں کہاں خرچ کئے جائیں گے۔ لیکن اگر حسابات صوبہ داری ہوں اور مقامی اسمبلی کی جانچ پڑتال کے لئے کھلے ہوں تو موجودہ خرابیوں میں سے ایک بھی باقی نہیں رہیگی کلکتہ کے محکموں کے افسران خواہ نیت کے کتنے ہی اچھے ہوں، وہ مدراس یا پنجاب کے اخراجات کی تفصیل سے واقف نہیں ہو سکتے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بے انتہا روپیہ ہر جگہ ضائع ہو رہا ہے اور غبن بھی کیا جا رہا ہے +

میری خواہش یہ ہے کہ جہاں تک سول معاملات کا تعلق ہے ہر صوبہ کا اپنا علٰحدہ انتظام ہو، ذرائع آمدنی بھی اپنے طور پر بڑھائے، امن عامہ کی ضروریات کو پورا کرے اور صوبہ داری کونسل کا انتظام و نگرانی کرے۔ بعض صوبوں میں خالصتہً ہندوستانیوں کو ملازم رکھنے سے ابتداہی سے کفایت ہو جائیگی، دوسرے صوبوں میں انگریزی ملازمین کے بجائے ہندوستانیوں کا تقرر بلاشبہ بتدریج عمل میں آئیگا ان صوبوں میں غیر ضروری اخراجات کو کم کرنے کی تحریک یہ دیکھکر خود پیدا ہوگی کہ اخراجات کا بار براہ راست صوبہ پر پڑ رہا ہے۔

برخلاف اس کے یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان جب تک انگلستان کی زیر نگرانی ہے، مال اور انتظام اور وضع قوانین کے بعض فرائض امپیریل رہینگے جو حسب ذیل ہوں گے :-

(۱) فوج اور بیڑے کے متعلقہ اخراجات اور ذمہ داریاں (۲) سیاسی تعلقات - (۳) عام قرضہ اور (۴) محاصل بحری۔

فوج کے متعلق جو اخراجات کئے جائیں وہ بلاشبہ امپیریل ہی رہنے چاہئیں اس لئے کہ اگرچہ جنوبی ہندوستان کو اپنی سرحدات کے اندر امن قائم کرنے کی غرض سے افواج کی بہت کم ضرورت ہے، تاہم شمالی ہندوستان کی طرح وہ ہر بیرونی حملہ سے محفوظ ہے اور اُس کی ذمہ دار صرف فوج ہی ہو سکتی ہے، لہذا اس کے اخراجات کا بار اسپر بھی مساوی پڑنا چاہیئے صوبہ داری افواج کا نظام کفایت شعاری کے لحاظ سے سخت غلطی ہوگی اور اُن صوبجات پر بڑا ظلم ہوگا جو سرحد پر واقع ہیں۔ کفایت شعاری کی غلطی تو یہ ہے کہ جو اقوام کم جنگجو ہیں وہ مساوی تنخواہ حاصل کرکے ادنیٰ درجہ کے سپاہی مہیا کریں گی جو سلطنت کی عام طاقت کے لئے مضرت رساں ہوگا۔ بے انصافی یوں کہ شمال مغربی صوبجات ہی پر حفاظت کا تمام بوجھ آکر پڑ جائے گا۔ لہذا جس طرح سے میں تمام سول معاملات میں نہایت زور شور سے لامرکزیت کے اصول کی حمایت کر رہا ہوں اسی تشدد سے میں فوجی معاملات میں مرکزیت کا موید ہوں امپیریل فوج میرے خیالات کے مطابق وائسرائے کے ماتحت ہونی چاہیئے اس کے افسر انگریز ہوں اور سپاہی بہترین قسم ہوں جو ہندوستان میں دستیاب ہو سکتے ہوں اور فوج بھرتی کرتے وقت کسی کی رو رعایت نہ کی جائے۔

ظاہر ہے کہ فوج کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ نہایت ہشیار اور اپنے فن میں ماہر ہو اور یہ کہ اس میں سیاسی تعصبات کو دخل نہ ہو اور ان دونوں وجوہ سے میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستانی افسروں کے مقابلہ میں انگریز فوجی اعتبار سے ہندوستان کے بہتر ملازم بن سکینگے۔ اگرچہ سول معاملات میں ہندوستانیوں کی قابلیت کا بہت مداح ہوں تاہم میں اس واقعہ کو تسلیم کرتا ہوں کہ انگریز فوج کے بہترین کمانڈر بن سکتے ہیں اور یہ کہ وہ اسی نسبت سے اچھے

اعلیٰ تنخواہ کے مستحق ہیں اور چونکہ دیسی افسروں کے برعکس مذہبی یا ذات پات کے اثرات سے بالکل بری ہوں گے اس لئے وہ امپریل احکام کو غیر جانبدار طریقہ سے عمل میں لاسکیں گے ہندوستانی فوج کو میں اسی معنی میں امپریل اور انگریزی، بھینا چاہتا ہوں جس معنی میں میں سول ملازمتوں کو پراونشل اور ہندوستانی دیکھنے کا خواہشمند ہوں - یہاں پر میں صرف اپنی ذاتی رائے کو بیان کر رہا ہوں مجھے یقین ہے کہ ہندوستانی رائے دیسی فوجی ملازمت کی تائید میں ہے، لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا جب ہندوستان ایک قوم ہو جائیگا تو اس وقت قومی فوج کے قیام کے متعلق غور و خوض کرنے کا بہت وقت ملیگا +

مزید برآں سیاسی تعلقات ہر لحاظ سے امپریل ہی رہنی چاہئیں اور ان کا انتظام خاص وائسرائے کے ہاتھ میں ہونا چاہئے جس طریقہ سے آج کل ہندوستانی ڈپلومیسی کا انتظام کیا جاتا ہے وہ پیچیدہ اور گراں ہے لیکن مستقبل کے ہندوستان میں ہمیں اُمید ہے کہ اسے آسان بنانے کی کوشش کیجائیگی - دو اہم امور غور کرنے کے قابل ہیں:- ایک تو یہ کہ غیر ملکی سازشوں اور لڑائیوں سے کلیتہً علیحدگی برتی جائے اور دوسرے یہ کہ خود مختار ہندوستانی والیان ریاست پر پورا پورا اعتماد کیا جائے - غیر ملکی لڑائیوں کا ہندوستان کو کافی تجربہ ہو چکا ہے اور مزید تجربہ کی اُسے ضرورت نہیں - چین، ایران، افغانستان، ابی سینا، مصر اور اب سوڈان، ان سب ملکوں کی لڑائیوں میں ہندوستان اپنے مفاد اور اپنی رضامندی کے خلاف شریک ہونے پر مجبور کیا گیا ہے - روپیہ کے نقصان کے علاوہ ان لڑائیوں میں قومی وقار کو بھی صدمہ پہنچا ہے جسے ہندوستانی غصہ کی نظر سے دیکھ رہے ہیں - جو لوگ یورپ کے شریفانہ علم ادب سے واقف ہیں وہ اس امر کو باعثِ ہتک خیال کرتے ہیں کہ خود مفتوح ہو کر وہ دوسری اقوام کو مغلوب کرنے کا ذریعہ بنیں ہندوستان کا بدقسمت مصریوں سے کیا جھگڑا تھا؟ اس کا بدقسمت عربوں سے کیا تنازعہ تھا؟ تعلیم یافتہ ہندوستانی اسے بھی ناراضگی کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس سے خرچۂ جنگ وصول کیا جائے یہ امور کسی مزید تشریح کے محتاج نہیں - یہ اس مطلق العنانہ خود غرضی کا جزو ہیں جو ہندوستان کے ساتھ ہمارے گزشتہ تعلقات کی بنیاد رہی ہے اور ہندوستان کے جدید جنم میں یہ سب باتیں تبدیل کر دینی چاہئیں - ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ جو تعلقات رہے ہیں ان میں ہوکہ اور زیادتی کو بڑا دخل رہا ہے مستقبل کی پالیسی میں زیادتی کا خیال مطلق چھوڑ دینا چاہئے - ہندوستانی ریاستوں کی جانب صرف ایک پالیسی ہی سچی کہلائی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُن کے روبرو برطانوی ہندوستان کو ان کے باشندوں سے زیادہ خوشحال بنا کر پیش کیا جائے - کیا کوئی شخص شبہ کر سکتا ہے کہ اگر ہندوستان میں سلف گورنمنٹ قائم ہو، وہ زیادہ خوشحال اور قانع نظر آئے، تو قدیم دیسی ریاستیں ایک ایک کر کے اسمیں جذب نہ ہو جائینگی؟

قرضہ کے متعلق یہ ہے کہ اگرچہ ہمیں افسوس ہے کہ اسے کیوں لیا گیا، تاہم اس کا بار امپریل گورنمنٹ پر ہی پڑنا چاہئے - جنگ کے خرچہ کی طرح اس کے سالانہ سود کو صوبوں پر ان کی مالی حالت کے اعتبار سے تقسیم کر دینا چاہئے سوائے اس حصہ کے جس کا تعلق ریلوں کی ضمانت سے ہے جن کا بار بھی متعلقہ صوبجات کو اُٹھانا چاہئے - بہرحال آئندہ کے لئے، یہ پالیسی اختیار کر لینی چاہئے کہ مزید قرضہ نہیں لیا جائیگا اور امپریل کاموں کے لئے مزید ضمانتیں نہیں دی جائینگی - آئندہ سے رسل و رسایل، آبپاشی اور تزئین و ترقی کے کل کاموں کا بوجھ صوبوں پر پڑنا چاہئے جن کے فوائد کی وہ بہت زیادہ قدر کریں گے +

باقی رہا محاصل بحری کا سوال تو اسے بھی امپریل ہی رکھنا بہتر ہے اور یہ توقع رکھنی چاہئے کہ جب ہندوستان کی حکومت کے سلسلہ میں ہندوستان کے فائدہ (انگلستان کے فائدہ کا نہیں) کا خیال کیا جائیگا تو اس وقت امپریل اخراجات کو پورا کرنے کی غرض سے اسے فائدہ بخش بنا دیا جائیگا - ہندوستان کے لئے آزاد تجارت باعث برکت ثابت نہیں ہوئی اور سال درآمد پر محاصل لگانے کا اصول اعلیٰ مالیات کا اصول اولین ہے جسکے لئے خود اختیاری حکومت رکھنے والا ہندوستان سخت اصرار کریگا - ہماری اکثر نوآبادیاں اپنا فائدہ اسی میں دیکھتی ہیں - اور ہندوستان بھی ایسا ہی کریگا تاوقتیکہ معقول معاوضہ نہ دیا جائے - موجودہ صورت حالات یہ ہے کہ سارا فائدہ انگلستان کا ہے اور ہندوستان کو سراسر نقصان پہنچ رہا ہے +

ہندوستان کو سوراج دینے کے متعلق یہ میری مختصر اور ناقص اسکیم ہے - یہ ناممکن الحصول نہیں ہے اور جن لوگوں نے انگلستان کے ایک قریبی

ملک کی حیرت انگیز کامیابی کا مشاہدہ کیا ہے وہ اس کے امکان کے بارے میں شک و شبہ نہ رکھیں گے۔ آسٹریا کی سلطنت (موجودہ نسل کے آدمیوں کو یاد ہوگا) نہایت سخت قسم کی مطلق العنان حکومت تھی اور اسے باشندوں سے کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی اس کے حدود میں نصف درجن کے قریب مختلف اقوام آباد تھیں جنہیں زبان یا نسل کے روابط موجود نہ تھے اور اگر کوئی چیز اُن میں مشترک پائی جاتی تھی تو وہ ظلم کرنے والوں کے خلاف جذبۂ حقارت تھا۔ ۱۸۴۸ء کا آسٹروی افسر سرکش و ملکنت کا مترادف سمجھا جاتا تھا اور اگرچہ وہ اپنے طریقۂ حکومت کے خلاف دنیا میں بہت کچھ شیخی بگھارا کرتا تھا تاہم وہ سلطنت کے خلاف ایک وسیع بغاوت کا راستہ تیار کر رہا تھا جو لوگ اس زمانہ کی تاریخ کا مشاہدہ کر رہے تھے انہیں سے بہت کم ایسے تھے جو یقین کرتے تھے کہ آسٹروی حکومت تباہی کے قریب آگئی ہے اور کسی کو بھی اتنا یقین نہ آتا تھا کہ کبھی اس کے باشندے اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کریں گے۔ لیکن ہمنے اس واقعہ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا ہے۔ ہمنے دیکھ لیا ہے کہ اہل ہنگری بالآخر ان سے شیر و شکر ہوگئے اور نیز پول جو حالت مایوسی میں اپنی تباہی پر ۵ سال تک آسٹریا کو یورپ بھر میں مطعون کرتے پھرتے تھے۔ اگر سیلف گورنمنٹ کے عطیہ سے یہ امر ممکن ہے تو تمام باتیں ممکن ہو سکتی ہیں اور ہندوستان بھی اسی دیانتدارانہ حکومت کے ذریعہ (جسمیں صوبہ داری سیلف گورنمنٹ شامل ہے) آسٹروی اقوام کی طرح قانع اور شکر گزار بنایا جا سکتا ہے۔ بغیر کسی فوجی طاقت کے ایک اصول جس نے انہیں متحد کر رکھا ہے یہ ہے کہ وہ شاہی تاج کے وفادار ہیں اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی اقوام ہز مجسٹی ملکہ معظمہ سے گہری ذاتی عقیدت اور عمیق جذبۂ وفاداری رکھتی ہیں اور جوں جوں وہ اینگلو انڈین آقاؤں سے دور ہٹتی جاتی ہیں دوں دوں وہ زیادہ امید کے ساتھ انگلستان کی جانب اور انگریزی تخت پر بیٹھنے والے کے جانب دیکھ رہی ہیں۔ یہ جذبہ نہایت بیش قیمت ہے اور اب بھی ہندوستانی سلطنت کی اس کے ذریعہ نجات عمل میں آسکتی ہے باوجود اس کے اینگلو انڈین حضرات نے اسے بہت کچھ ٹھیس لگادی ہے۔ میں مستقبل کے لئے اسے رشتۂ اتحاد تصور کرتا ہوں کیونکہ ہندوستان پر قبضہ رکھنے کا ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ جذبۂ وفاداری ہماری خوش قسمتوں کے شریک کے طور پر ہندوستان کو ہم سے متحد رکھیگا۔ ہندوستان اس وقت انگلستان کے ہاتھ سے جاتا رہیگا بلکہ وہ موجودہ حالت سے بڑھکر ہماری شان و شوکت کا باعث بنیگا۔ اس لئے کہ وہ اس اہم کام کی یادگار ہوگا جو نہ صرف ہم اپنے فائدہ کے بلکہ دوسروں کی فائدہ رسانی کیلئے انجام دے چکے ہیں +

میں اس موضوع پر زیادہ بحث کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں ان خطرات سے واقف ہوں جو سیاسی دنیا میں ہر نئی چیز کے جنم لینے پر رونما ہوتے ہیں اور میں مخصوص فوائد رکھنے والوں کے بیجا غصہ سے بھی واقف ہوں۔ اینگلو انڈین حضرات کے مفاد سختی کے ساتھ ہماری راہ میں حائل ہیں اور نیز روز افزوں بھو کی تجارت اور بے رحم مالیات بھی رکاوٹ پیش کر رہی ہیں کیونکہ وہ موجودہ حالت میں صرف اپنا نفع دیکھ رہی ہیں۔ ہندوستان کو امن حیات دینے سے بیشتر مانچسٹر کی جوع البقر کو مطمئن کرنا چاہئے اور ہندوستان کی شاہ خرچیاں یکایک بند کر دینے سے شمالی انگلستان کے بہت سے شہروں کی تجارت کو نقصان پہنچ جائیگا۔ ہندوستان کے قرض کے معنی یہ ہیں کہ لمبارڈ اسٹریٹ میں منافع تقسیم ہوں اور اس لئے میں امید باندھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ میں ان مایوس کن مگر سچے الفاظ کو دہرا دینا چاہتا ہوں جو جنرل گارڈن نے ہندوستان میں اصلاحات کے مستقبل کے متعلق مجھ سے بیان کئے تھے یعنی یہ کہ "تمہارا جو جی چاہے کرو اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ہندوستان میں کبھی اصلاح نہ ہوگی جبتک کہ وہاں نئی بغاوت رونما نہ ہوگی"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ بغاوت کس قسم کی ہوگی اور یہ کہ آیا اس کے بعد ہم میں اصلاح کرنے کی گنجائش کہاں تک باقی رہیگی؟

نوٹ:۔ قارئین کو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ باب اور اس سے قبل کے تمام باب پورے ۲۵ سال پیشتر تحریر کئے گئے تھے اس وقت سیلف گورنمنٹ کی اسکیم کا یہ کہکر مذاق اڑایا گیا تھا کہ وہ محض خیالی ہے اور عمل میں آنے کے قابل نہیں ہے لیکن ایشیائی دنیا آگے بڑھ رہی ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز اسکی سفارش کے مفاد کو ضروری خیال کرنے لگ گئے ہیں میں یہ پیشین گوئی کرنے سے احتراز کرتا ہوں کہ انڈیا آفس نے اصلاحات کی جو اسکیم اس قدر تاخیر کے بعد با دل ناخواستہ پیش کی ہے اس سے ان تلخ جذبات کا خاتمہ ہو سکیگا یا نہیں جو لارڈ رپن کے زمانہ سے لیکر گزشتہ نسل تک ہماری خراب پالیسی سے پیدا ہوتے رہے ہیں غیر ملکی حکومت کی یہ ہمیشہ کی لعنت رہی ہے کہ اصلاحات کا نفاذ ہمیشہ دیر سے کیا جاتا ہے اور ایک شے ایسے وقت میں پیش کیجاتی ہے جبکہ اسکی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ میں رائے زنی کرنا نہیں چاہتا صرف اس قدر کہنے پر کفایت کرتا ہوں ۱۸۸۳ء تو میں میں نے ہندوستان کی جو حالت اسکے بہترین اور نہایت عقلمند وائسرائے کے زمانہ میں مشاہدہ کی تھی اسکی صحیح تصویر میں نے ان اوراق میں پیش کردی ہے + ض۔ ا۔ ب۔ بی۔ اے

روپیہ کی شرح مبادلہ

سے کس قسم کی دشواریاں پیش آسکتی ہیں ؟

قبل اس کے کہ ہم روپیہ کی شرح مبادلہ کے گھٹنے اور بڑھنے کی دشواریوں پر غور کریں ہم کو زرِ وضعی (Token money) کے مقام گداخت کو سمجھ لینا چاہئے۔ زر کی دو قسمیں ہیں (۱) زرِ مستند (Standard money) اور (۲) زرِ وضعی۔ زرِ مستند وہ ہے جس کی قدرِ ذاتی (Intrinsic value) قدرِ قانونی (Legal value) کے برابر ہو۔ چونکہ زرِ مستند کی قدرِ فلزائی (metallic value) قدرِ قانونی کے برابر ہوتی ہے اس لئے اسکی تسکیک (coinage) آزاد رکھی جاتی ہے اور ہر شخص اپنی چاندی یا سونا دیکر اجرت ادا کرنے کے بعد ایسے سکے ڈھلوا سکتا ہے۔ زرِ وضعی وہ ہے جس کی قدرِ فلزائی قدرِ قانونی سے کم ہو۔ ایسے سکے جن کی قدرِ فلزائی قدرِ قانونی سے کم ہوتی ہے اس کی تسکیک محدود رکھی جاتی ہے اور ایسی تسکیک کا حق حکومت اپنے لئے مخصوص کر لیتی ہے۔

جسطرح تمام چیزوں کی قیمت قانونِ طلب و رسد (Laws of supply and demand) سے قرار پاتی ہے اسی طرح زرِ وضعی کی قدرِ قانونی زرِ مستند کے حوالے سے اس طرح کی جاتی ہے کہ زرِ مستند کی قدرِ فلزائی زرِ وضعی کی قدرِ فلزائی سے بڑھی رہے مثلاً آج سے چند صدی قبل آٹھ دس تولہ چاندی میں ایک تولہ سونا ملتا تھا جب چاندی ارزاں ہوئی تو پندرہ سولہ تولہ چاندی میں ایک تولہ سونا ملنے لگا چاندی کی ارزانی روز بروز بڑھتی گئی اور جنگِ عظیم کے قبل تو تیس بتیس تولہ چاندی میں ایک تولہ سونا ملتا تھا اور یہی انکا بازاری نرخ تھا کاروبار کی سہولت کے لحاظ سے بازاری نرخ کو پیش نظر رکھکر اول ساورن کے پنس بنا لیتے ہیں اور ایک اونس چاندی لیکر حساب لگا لیتے ہیں کہ جب ایک تولہ سونے میں اتنی چاندی آتی ہے تو ایک اونس چاندی کتنے پنس کی ہوگی۔

چونکہ آج کل ایک ساورن ۱۵ روپیہ کے برابر قرار دیا گیا ہے اس لحاظ سے ایک اونس چاندی کی قیمت تینتالیس پنس ہوتی ہے اور ایک روپیہ کی قدرِ فلزائی سولہ پنس کے برابر ہوتی ہے۔ چونکہ ایک روپیہ کی قدرِ قانونی سولہ پنس کے برابر ہے اس لئے اگر چاندی کی قیمت فی اونس تینتالیس پنس ہو تو روپیہ زرِ مستند بن جائے گا۔ جب چاندی کی وہ قیمت جسپر سکے کی قدرِ فلزائی قدرِ قانونی کے برابر ہو جائے اصطلاحاً مقام گداخت کہلاتی ہے۔ کیونکہ جب سکے کی قدرِ قانونی کم ہو اور قدرِ فلزائی زیادہ تو لوگ اسکو گلا کر بطور دھات بیچنے لگیں گے اس لئے قدرِ قانونی سے قدرِ فلزائی نہیں بڑھ سکتی۔

چاندی کی قیمت بڑھنے کا اثر۔ اب ہم کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ روپیہ کی شرح مبادلہ گھٹنے یا بڑھنے سے کس قسم کی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر روپیہ کی قدرِ فلزائی قدرِ قانونی سے کم رہے تو وہ زرِ وضعی کے طور پر چلتا رہے گا اب اگر چاندی کی قیمت تینتالیس پنس فی اونس

سے گر جائے تو روپیہ کی تسکیک سے سرکار کو بہت فائدہ ہوگا جس طرح سے کہ آج کل بھی سرکار ہند کو روپیہ کی تسکیک سے منافع ہو رہا ہے جس کی مقدار اس وقت تک قریب بیس کروڑ پونڈ کے پہونچ گئی ہے اور جو انگلستان میں جمع ہے۔ اگر چاندی کی قیمت بہت زیادہ گر جائے تو روپیہ حد درجہ کا زر صنعی بن جائے گا، ایسی صورت میں اول تو لوگ مصنوعی سکے بنا کر چلانے کی کوشش کریں گے اور دوسرے مبادلات خارجہ میں حد درجہ دقت لاحق ہوگی کیونکہ دوسرے ممالک اپنے مال کے عوض چاندی کی جگہ صرف سونا لیتے ہیں اور وہ قدر فلزائی کا حساب لگاتے ہیں۔ کیونکہ کسی جگہ کی قدر قانونی سے اُن کو کیا بحث اور چونکہ روپیہ کی قدر فلزائی کم ہے اور قدر قانونی زیادہ اس لئے جب ہندوستان کو دیگر ممالک میں سونے کی شکل میں رقم ادا کرنی پڑتی ہے تو اس فرق قیمت کی وجہ سے بہت نقصان ہوتا ہے اور حکومت بھی روپیہ کے عوض سلور ن دینے سے عاجز آجاتی ہے ایسی حالت میں مبادلات خارجہ کا سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کئی بار ایسی صورت خود ہندوستان کو پیش آچکی ہے

چاندی کی گرانی کا اثر

دوسری طرف اگر چاندی گراں ہونی شروع ہوا اور ۴۳ پنس فی اونس سے بڑھ جائے تو سکے کا سکے کی صورت میں باقی رہنا محال ہے کیونکہ جب سکے کی قدر ذاتی اس کی قدر قانونی سے بڑھ جائے گی تو لوگ اس کو گلا کر بطور دھات استعمال کرنے لگیں گے ایسی صورت میں حکومت کو بہت دقت پیش آتی ہے ادھر تو لوگ سکے گلانا شروع کر دیتے ہیں اور دوسری طرف روپیہ کی مانگ شروع ہو جاتی ہے۔ چاندی گراں ہونے کی صورت میں سولہ آنے میں روپیہ مہیا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دوران جنگ میں یہی ہوا چاندی کی قیمت بہت بڑھ گئی اور روپئے گلنا شروع ہو گئے لہٰذا مجبوراً حکومت نے بھی قدر قانونی بڑھانی شروع کی جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ قدر ذاتی قدر قانونی سے کم رہے تاکہ سکے گلنے نہ پائیں اگر اس زمانہ میں امریکہ مدد نہ کرتا اور وہاں سے چاندی نہ ملتی تو ہندوستان کی حالت کو سنبھالنا سخت مشکل ہو جاتا۔

مطالبات وطن

ان دقتوں کے علاوہ چند اور دقتیں ہیں۔ اگر ہم مبادلات خارجہ کو تین حصوں میں تقسیم کریں تو ہر ایک کی حالت جداگانہ نظر آئے گی۔ اس کا ایک حصہ وہ ہے جو حکومت ہند سے متعلق ہے حکومت ہند کو اپنا ایک حساب انگلستان میں وزیر ہند کے پاس رکھنا پڑتا ہے۔ ہر سال انگلستان میں حکومت کے لئے بہت سا سامان مثل صادر و مشنری کے خریدا جاتا ہے اس کے علاوہ جو حکومت ہند کے وظیفہ یاب انگریز وہاں رہتے ہیں ان کو وظیفہ دیا جاتا ہے اعلیٰ کمشنر ہند (High commr for India) کی تنخواہ حکومت ہند کو انگلستان میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ غرض اس طرح ہر سال ایک بڑی رقم ہندوستان۔ انگلستان کو ادا کرتا ہے جس کو مطالبات وطن (Home charges) کہا جاتا ہے جوں جوں ہندوستان و انگلستان کے تعلقات بڑھتے جا رہے ہیں اس مطالبہ میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، فرض کیجئے کہ مطالبات وطن ہر سال دو کروڑ پونڈ ادا کئے جاتے ہیں اب اگر پونڈ کی شرح مبادلہ دس روپیہ ہو تو بیس کروڑ روپیہ مطالبات وطن کے لئے بجٹ (Budget) میں رکھنا پڑے گا۔ اگر شرح مبادلہ بجائے دس کے پندرہ ہو جائے تو اب بجائے بیس کروڑ کے تیس کروڑ ادا کرنے پڑیں گے۔ اگرچہ مطالبات وطن کی رقم (دو کروڑ پونڈ) میں کچھ اضافہ نہیں ہوا مگر صرف شرح مبادلہ کے گھٹ جانے سے ہندوستان کو دس کروڑ روپیہ کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ اب اگر اس رقم کو سرکار پبلک سے وصول کرے تو وہ بہت زیر بار ہوں گے اگر اپنے پاس سے دے جب بھی دوسرے

مدات میں سے کم کرنا پڑے گا۔ غرض ہر صورت میں ملک کا نقصان ہے۔ چونکہ سرکار جو ٹیکس وصول کرتی ہے وہ روپیہ کی صورت میں اور مطالبات وطن پونڈ میں ادا کرنے پڑتے ہیں لہذا مبادلہ کی ضرورت پیش آئی۔ اسی طرح سرکار ہند کے قرضوں کی بھی دو صورتیں ہیں انگلستان میں جو قرض لیا جاتا ہے وہ بطور طلا، اور ہندوستان میں بشکل روپیہ، لہذا انگلستان کو سود بھی پونڈ میں ادا کرنا پڑتا ہے، اور یہ سود بھی مطالبات وطن کا ایک جزو ہیں۔

ملازمت یہ ہی حال بیرونی ملازموں کا ہے اگر انگلستان کا کوئی شخص کسی عہدے پر ہندوستان بلایا جائے تو وہ پہلے دیکھے گا کہ اُسکو انگلستان میں کتنا مل سکتا ہے فرض کیجئے کہ اس کو وہاں ایکہزار پونڈ سالانہ ملے گا اب چونکہ وہ وطن چھوڑ کر آئے گا لہذا ضرور ایکہزار پونڈ سے زیادہ طلب کریگا۔ فرض کیجئے کہ وہ پچاس پونڈ سالانہ زیادہ مانگے اس طرح کل ایکہزار پچاس پونڈ سالانہ ہندوستان اس کو دیگا۔ اگر شرح مبادلہ دس روپیہ ہے تو اُس کو دس ہزار ڈھائی سو روپئے دینے پڑیں گے اگر شرح پندرہ ہو جائے تو اُسکو پندرہ ہزار ساڑھے سات سو ادا کرنے پڑیں گے۔ گو اُس کو ایکہزار پچاس پونڈ ہی ملے مگر دینے والا کو شرح مبادلہ کی کمی کیوجہ سے پانچ ہزار کا نقصان ہو گیا۔

اصل اگر کاروبار کو دیکھیں تو اسمیں بھی یہ ہی مشکل نظر آئے گی۔ بعض ممالک ایسے ہیں جن کو اصل خود ملک کے اندر ہی مل جاتا ہے مثلاً امریکہ یا انگلستان لیکن بعض ممالک ایسے ہیں جن کو دوسروں سے قرض لینا پڑتا ہے۔ مثلاً ہندوستان یا جاپان جب باہر کے لوگ اپنا اصل کسی ملک میں بھیجتے ہیں تو وہ دو باتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں اول یہ کہ جب وہ چاہیں اپنا اصل اسی صورت میں واپس لے سکیں لہذا وہ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ جہاں وہ اصل لگا رہے ہیں وہاں امن و اماں قابل اطمینان ہے یا نہیں۔ مزید اطمینان کے لئے وہ حکومت کی ضمانت بھی چاہتے ہیں۔ اور اکثر اوقات حکومت کو ضمانت بھی دینی پڑتی ہے جیسا کہ خود ہندوستان میں سرکار نے ریلوے کے لئے ضمانت دی تھی۔ اور بنکوں کا حصہ دار بننا پڑا۔ دوسرے یہ کہ اُن کا اصل محفوظ رہے اور اسمیں کمی نہ ہو اب فرض کیجئے کہ لندن میں کوئی کمپنی دس ہزار پونڈ کے سرمایہ سے ہندوستان کے لئے قائم ہو اگر شرح مبادلہ اُسوقت دس ہوگی تو گویا ہندوستان میں ایک لاکھ کے سرمایہ سے کمپنی قائم ہوئی۔ لیکن اگر شرح مبادلہ پندرہ ہو جائے تو گویا ہندوستان میں سرمایہ ایک ہی لاکھ رہیگا مگر جب اس کمپنی کے حصص بکیں گے تو ساڑھے سات سو پونڈ ہی بیں گے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی دوسری کمپنی ہندوستان کے لئے انگلستان میں ایک لاکھ کے سرمایہ سے قائم ہو تو اُس کو ۶ ۲/۳ سو پونڈ میں ایک لاکھ کا سرمایہ مہیا ہو جائے گا۔ اور جب یہ نئی کمپنی ہندوستان آکر پہلی کمپنی سے مقابلہ کرے گی تو یقیناً پہلی کو ہار ہوگی کیونکہ پہلی اتنا سستا مال فروخت نہیں کر سکتی جتنا کہ دوسری اگر چیزوں کی قیمت برابر بھی رہے تو پہلی کمپنی کے حصہ داروں کو دوسری کے مقابلہ میں صرف ۲/۳ منافع ملیگا کیونکہ پہلی کا منافع ایکہزار پونڈ پر تقسیم ہوگا۔ تو دوسرے کا ساڑھے سات سو پر۔ اگرچہ ہندوستان میں اس سے نہ کچھ فائدہ نظر آئے گا اور نہ نقصان مگر ان کمپنیوں کا اس مبادلہ کی بیشی کی بدولت بہت نقصان اور نفع ہوگا۔ جب شرح مبادلہ غیر معین ہوتی ہے تو بیرونی ممالک اپنا اصل دوسری جگہ نہیں لگاتے

درآمد برآمد تیسری صورت درآمد برآمد کی ہے اگر اُس کے کاروبار پر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں بھی مبادلہ کی کمی بیشی

سے وہی بربی پھیل جاتی ہے۔ پہلے درآمد کو لیجئے اگر شرح مبادلہ دس ہو اور ایک گھڑی ایک پونڈ میں ملے تو گویا اس گھڑی کی قیمت دس روپیہ ہوئی۔ اگر شرح مبادلہ پندرہ ہوجائے تو اسی گھڑی کی قیمت ہندوستان میں پندرہ ہوجائیگی۔ اگرچہ انگلستان میں اس وقت بھی ایک ہی پونڈ ہوگی، یہ گرانی صرف شرح مبادلہ کی وجہ سے پیدا ہوگئی۔ ہندوستان میں اس کی گرانی کی وجہ سے طلب گھٹے گی۔ جب طلب گھٹے گی تو یقیناً رسد بھی کم ہوگی اور رسد کم ہونے سے گرانی میں مزید اضافہ ہوگا،

اس کے برخلاف برآمد پر نظر ڈالئے۔ فرض کیجئے کہ ہندوستان میں گیہوں کی قیمت دس روپیہ من ہے اور پونڈ کی شرح مبادلہ بھی دس تو گویا ایک پونڈ میں ایک من گیہوں ملا۔ اگر شرح مبادلہ پندرہ ہوجائے تو ایک پونڈ میں ڈیڑھ من گیہوں ملنے لگے گا۔ یہ معلوم ہے کہ قیمت کی کمی سے طلب میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب ایک پونڈ میں ڈیڑھ من گیہوں ملے گا۔ تو گیہوں کی طلب بہت بڑھ جائیگی۔ اس اضافۂ طلب سے قیمت میں اضافہ ہوگا اور ایسی زمینوں پر جن پر ابھی تک کاشت نہیں ہوتی تھی کاشت ہونے لگیگی اور ہر کھیت سے لوگ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کریں گے ایک طرف تو اس اضافۂ قیمت سے ملک میں عام گرانی پھیل جائیگی اور دوسری طرف چونکہ زمین قانون تقلیل حاصل کے تحت ہے اس لئے ہر اضافۂ پیداوار زمین کی قوت کو کم کرے گی اور پیداوار بالآخر کم ہونے لگے گی۔ اس طرح ایک طرف تو ملک میں عام گرانی بڑھے گی اور دوسری طرف زمینیں بھی خراب ہونگی۔ غرض ہر حال میں ملک کا نقصان ہوگا اور یہ سب صرف مبادلہ کی کمی بیشی کا نتیجہ ہوگا

ابو المنصور حمید

اگر ایک سرخ چھپی ہوئی تحریر

آپ کو رسالہ کے اندر کسی جگہ رکھی ہوئی ملے جسمیں آپ کے چندہ کے ختم ہونیکی اطلاع ہو تو مہربانی فرماکر آئندہ کیلئے فیصلہ کرکے منی آرڈر بھیجدیجئے اسمیں آپکا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ۳ر وی پی کے بچ جائینگے اور جذبات بھاشا قیمتی ۱۲ر آپ کو مفت ملجائیگی۔

جن لوگوں کا چندہ ذریعہ منی آرڈر ۵ رجولائی تک نہ ملیگا انکو جولائی کا رسالہ ذریعہ وی پی روانہ کیا جائیگا لیکن جذبات بھاشا انھیں نہ ملیگی "منیجر نگار"

شکست تمنا

شورش وہنگامے سے فکر سکوں برباد تھی　　خاطر مجبور اک مجموعۂ اضداد تھی
دل کی دنیا منتشر تھی روح بھی ناشاد تھی　　سینۂ پر شوق میں دیوانگی آباد تھی
سیر گلشن کی مجھے بیساختہ رغبت ہوئی
مائل فرزانگی بڑھ کر مری وحشت ہوئی

آچکا تھا موسم گل بعد از فصل خزاں　　حسن پر تھا رنگ گل نقش و نگار بوستاں
بھینی بھینی تھی چمن میں نکہت عنبر فشاں　　پتی پتی سے عیاں تھی خوبی باغ جناں
جھٹ پٹا تھا وقت مطلق دھوپ میں گرمی نہ تھی
تھی ہوا کچھ تند لیکن چال میں نرمی نہ تھی

تھی زمیں سر سبز اک پھول تھا آغوش وا　　صحن گلشن تھا کہ تھا اک شاہد رنگین ادا
مرمریں فواروں سے آتی تھی قلقل کی صدا　　اٹھ رہی تھیں مست لہریں نہریں بھی جابجا
قطرے پانی کے اچھل کر دُرفشاں ہوتے رہے
اپنے دل میں خوش طیور خوش بیاں ہوتے رہے

آڑی ترچھی پڑ رہی تھی سبز کونپل پر کرن　　یا جوانان چمن کا تھا طلائی پیرہن
حسن پر مغرور اپنے یاسمین و یاسمن　　غنچے یوں پتوں میں تھے چلمن میں ہو جیسے دلہن
حسن فطرت جلوہ ساماں اس گلشن میں تھا
اجتماع دلفریبی شام کے دامن میں تھا

دفعتاً بدلا سماں اور ایک سناٹا ہوا　　چھپ گیا خورشید تاریکی میں گھبرایا ہوا
گوشۂ مغرب میں "رنگ قرمزی" پیدا ہوا　　آسمان پر چاند نکلا نور میں ڈوبا ہوا
چاندنی کے کھیت میں شبنم گہر بونے لگی
غنچہ و گل کی مہک کچھ تیز تر ہونے لگی

ہلکی ہلکی چاندنی میں چھپ گئی ساری فضا　　اور اٹھلاتی ہوئی چلنے لگی ٹھنڈی ہوا
پھیکی پھیکی روشنی میں ہر گل رنگیں قبا　　بھینی بھینی نکہتوں کا ایک مجموعہ بنا

رفتہ رفتہ خامشی چاروں طرف چھانے لگی
نیند کی سی آنکھوں میں اک کیفیت آنے لگی

میں اسیرِ رنگ و بوئے حُسنِ فطرت ہو گیا دل نثارِ لذتِ انعامِ نکہت ہو گیا
دیدۂ پُرشوق وقفِ شانِ قدرت ہو گیا اور شہبازِ تخیل محوِ وسعت ہو گیا

کھل گئیں آنکھیں تماشائے دو عالم کیلئے
گر پڑے آنسو مرے تقلیدِ شبنم کیلئے

بحرِ نیلی میں رواں تھیں کشتیاں یوں نور کی آبِ جو میں بجلیاں ہوں جیسے کوہِ طور کی
کیوں نہ ملتی پھر خبرِ ساحل کے قربِ دور کی کرتی جاتی تھیں وہ شرحیں منصبِ مامور کی

کہکشاں کے جام میں اک جوشِ جوئے شیر تھا
اور مریخِ فلک ظرفِ تمنا گیر تھا

داغ مہ یوں عیاں اک زورقِ پُرنور میں تھا جیسے پیوستہ ہو تِلی دیدۂ مخمور میں
یوں شعاعیں بھر گئی تھیں کاسۂ معمور میں بادۂ سرجوش جیسے ساغرِ بلور میں

جاذبِ ادراک تھیں نیرنگیاں اسرار کی
باعثِ حیرانیاں تھیں ستیاں اسرار کی

آسمانی بزم میں ضوگستری کا جوش تھا ایک اک ذرہ جہاں کا ساکت و خاموش تھا
میں سرور بادۂ حیرت سے گو مدہوش تھا شوق کی آنکھیں کھلی تھیں مستعد ہر گوش تھا

اللہ اللہ رے اُمید و بیم کیفِ انتظار!
جل رہی تھی دل جگر دونوں پہ سیفِ انتظار!!

رفتہ رفتہ زلفِ شب زیرِ کمر ہونے لگی شمعِ محفل خوگرِ جورِ سحر ہونے لگی
خوش خرامی صبا بیداد گر ہونے لگی بانگِ مرغِ بوستاں بانگِ نفر ہونے لگی

تھا یہی عالم نئی اک پھانس دل میں گڑ گئی
ایک رشکِ گل سے چشمِ شوق جا کر لڑ گئی

تھی وہ گلرو یاسمن بو لالہ رخ مستِ شباب تھا سراپا اس کا جوشِ حسنِ فطرت کا جواب
چشم کی گردش میں لطفِ گردشِ جامِ شراب پتلیوں میں بجلیاں تھیں بجلیوں میں تھا حجاب

انکھڑیوں کی ہر ادا تھی اس طرح مچلی ہوئی
جس طرح رندوں کی نیت ابر میں بدلی ہوئی

عارضِ گلرنگ سے "حسنِ تنوع" تھا عیاں — یا شبابِ شوق میں گلریز تھا کیف نہاں
پتلے پتلے ہونٹوں میں برقِ تبسم تھی رواں — جو ہزاروں سکوں کا کر رہی تھی امتحاں
لرزشِ لب میں تکلم کی فضا پوشیدہ تھی
سامعہ کے واسطے برقِ غضب لرزیدہ تھی

جلوہ گاہِ حسن میں جو ذرہ تھا مسجود تھا — سبز فرشِ خاک پر پائے حنا آلود تھا
رازِ مخفی پیکرِ مخمور میں موجود تھا — ذرہ ذرہ فطرتِ معصوم کا مشہود تھا
زلف کی شبگونیت تھی سر بسر ہمت ربا
حسن کی موزونیت تھی طاقت قسمت ربا

مست آنکھیں دیکھکر سوچی سے دیوانہ ہوا — انتہائے شوق میں اپنے سے بیگانہ ہوا
دسر تو دل کا پھر آباد ویرانہ ہوا — کعبۂ احساس میرا مثلِ بت خانہ ہوا
کھنچ گیا میں اس طرح اس حسنِ زیبا کی طرف
جام و ساغر جس طرح جھکتے ہیں مینا کی طرف

کاوشیں قلب و جگر کی پھر سرور افزا ہوئیں — آرزوئیں کوہِ طورِ درد کی موسیٰ ہوئیں
دیکھکر مجھکو وہ آنکھیں مائلِ ایما ہوئیں — شرم آلودہ نظر سے بجلیاں پیدا ہوئیں
دل مرا بیتاب اظہارِ محبت ہو گیا
یعنی ایمانِ تمنا نذرِ الفت ہو گیا

کچھ سمجھکر پہلے تو خاموش تھی مستِ شباب — چینِ پیشانی تھی لیکن ترجمانِ اضطراب
"زلفِ برہم" بنگئی تھی مرکزِ صد پیچ و تاب — یا زبانِ حال سے دیتی تھی مجھکو یہ جواب
عشق کے کعبے میں عاشق کو یہی پیغام ہے
جامۂ صبر و رضا بس جامۂ احرام ہے"

گو شرابِ تند جوشِ بادۂ گلفام ہے — جو نہ چھلکے مست ہو کر بس وہی اک جام ہے
راہِ الفت میں تمنا اک خیالِ خام ہے — عشق خود آغاز ہے خود عشق ہی انجام ہے
جوش و سرمستی بھی ہو تو دائرے میں ضبط کے
شکوہ ریزی بھی جو ہو تو قاعدے میں ربط کے

اس عتابِ بے سبب نے "محوِ حیرت" کر دیا — داغِ تفریحِ دلِ غم و سدِ محبت کر دیا

کائناتِ دل کو محرومِ مسرت کر دیا — گلشنِ اُمید کو مایوسِ نکہت کر دیا
دل بگڑ کر رہ گیا میں، دم مچل کر رہ گیا
نالۂ دل، دل ہی میں کروٹ بدل کر رہ گیا
پھیر کر منہ باغ سے جب دم وہ رخصت ہو گئی — مجھ پہ طاری ہجر کی جانسوز غفلت ہو گئی
میری مونس میری ہمدم دل کی حسرت ہو گئی — سوزشِ قلب و جگر سے خاص لعنت ہو گئی
سازِ ہستی اب مرا حافظ اذیت کوش ہے
ہر نفس سرمایہ دارِ نغمہائے دوش ہے

حافظ غازیپوری

اعجازِ علم

اے علم تو نے دنیا کو روشنی عطا کی — انجم کی بزم میں ہے شہرت تری ضیا کی
لوحِ فلک پہ کندہ نقش و نگار تیرے — ارض و سما کے مالک ہیں رازدار تیرے
سیارے تیرے خطِ پرکار چومتے ہیں — دھنتے ہیں اپنا سر اور رہ رہ کے جھومتے ہیں
تو حسنِ لم یزل ہے، اللہ ری تیری تقدیر! — مہ تیرے آئینہ میں تکتا ہے اپنی تصویر
آتشکدہ میں تیرے ہیں برق کے شرارے — اور تیری بزم کے ہیں فانوس ماہ پارے
تارِ نفس سے تیرے قائم ہے سازِ ہستی — وابستہ جستجو سے تیرے ہیں رازِ ہستی
ایوانِ آسماں سے اوپر رسائی تیری — قصرِ جناں میں ہر سو جلوہ نمائی تیری
قلزم کی وادیوں میں موتی دکھائے تو نے — آبِ رواں کی تہ میں گلشن اگائے تو نے
اوجِ فضا میں اپنی محفل سجائی تو نے — موجِ ہوا پر اپنی کشتی اڑائی تو نے
صحرا کی خاک تک میں گلشن کا رنگ بھرنا! — واللہ تیری خُو ہے فطرت سے جنگ کرنا

محمود اسرائیلی

پرستش خیال

(ایک تصویر کو دیکھکر)

جلوہ ہائے عظمت تقدیس کی دنیا ہے تو — فطرت معصوم کا اک موجزن دریا ہے تو
پاکیوں کے نور خوابیدہ تیری تصویر میں — عصمتوں کے خواب پوشیدہ تری تکمیر میں
تیرا ہر انداز درس عصمت جذبات ہے — تیرا ہر پیغام تفسیر الٰہیات ہے
اے جمیلہ! شاہد قدرت ہے شیدائی تری — اے حسینہ! لیلیٰ فطرت ہے سودائی تری
بہ رہے ہیں چشمہ ہائے نور قدموں میں ترے — لوٹتا ہے جلوہ زار طور قدموں میں ترے
یہ ادائے والہانہ یہ نگاہ پاک باز — ہیں انھیں جلووں میں پنہاں عصمت فطرت کا راز
عصمت آباد حیا آرا تری تخئیل ہے — تو علوئے عظمت انسان کی تکمیل ہے
"حریت" کے جذبات سے لبریز ہے دنیا تری — آہ! بے اندازہ الفت خیز ہے دنیا تری
جلوہ ہائے حسن پاکیزہ کا گہوارہ ہے تو — فطرت معصوم کا اک پاک نظارہ ہے تو
دستگیر حاملان عرش ہے عظمت تری — احترام ساکنان فرش ہے عصمت تری
تو سرور عصمت جذبات سے سرشار ہے — "بے نیاز دہر" تری فطرت خوددار ہے
جستجو کی وسعتوں سے دور ہے دنیا تری — پردۂ تقدیس میں مستور ہے دنیا تری
تو بھی اک غنچہ ہے لیکن بے نیاز رنگ و بو — تو بھی اک گوہر ہے لیکن تاجدار آبرو
تیری عصمت عظمت انسان کی تاسیس ہے — اے مقدس نازنیں! تو چشمۂ تقدیس ہے
تیری ہستی عصمت قدرت کا استحکام ہے — تو خدائے قدس کا اک دلربا پیغام ہے

میں اگرچہ عظمت تقدیس سے محروم ہوں
شکر کرتا ہوں کہ تیرے عشق میں معصوم ہوں

روشن صدیقی

حسیات

سایۂ تیغ میں بھی جب میں نے قضا نہ کی نماز — دہر میں عام ہو گیا میرا فسانۂ نیاز
کھوئے گئے ظہور میں ڈوب گئے سرور میں — تیرا پیام غم سہا تیرا کلام دل نواز
تاروں کا خوں نچوڑ کر خاک نثار دے گیا — عرصۂ دہر میں مگر کھول سکا نہ تیرا راز
جلوۂ مہ کہاں گیا جوش بہار کیا ہوا — تشنۂ بے ثبات ہے حسن پہ کیا غرور و ناز
زاہد پُر فریب کا کیجئے اعتبار کیا — شیخ حرم سے دوستی پیر مغاں سے ساز باز
حسن غلام ہو کے بھی کتنا شکوہ دار ہے — دیدۂ غزنوی سے تو دیکھ ذرا رُخ ایاز
مجھکو مرے علاج کا فکر عبث ہے چارہ گر — تیری دوائیں بے اثر عشق کا درد جانگداز
تارے بھی آسمان پر چشم پُر آب ہو گئے — رات کسی کے ہجر میں دیکھ کے میرا سوز و ساز
سچ ہے وہ بد نصیب ہی لطف حیات پا گیا — جس کی شب فراق ہے عمر خضر سے بھی دراز
میری زبان میرا دل تیرے غلام ہو چکے — دین مرا تری رضا ذکر ترا مری نماز
مست نشاط ناخدا بحر حیات موجزن — تیرے سپرد اے خدا میری مراد کا جہاز

باده گسار ہو گیا سارا جہان اے نظیر
دیکھ کے میرے ہاتھ میں ساغر بادۂ حجاز

نظیر لودھیانوی

اسلامی لغت

مرتبہ سید حامد حسین رضوی علیگ

جلد اول تیار ہو گئی ہے جسمیں حرف "تا" تک تمام وہ الفاظ مع مکمل تشریح و تفسیر کے درج کئے گئے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کے مذہبی، اقتصادی، جغرافی، تاریخی، علمی، معاشرتی لٹریچر سے ہے نہایت ضروری کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ۲؎ (دو روپے آٹھ آنے)

منیجر نگار نظیر آباد لکھنؤ

اسباب مخاصمت

(۱)

کچھ تجھکو خبر ہے ترا دشمن ہے فلک کیوں؟ معلوم بھی ہے تیری مخالف ہیں ملک کیوں؟

مجبور ہیں وہ

صاحبِ کردار ہے تو ہی

مختار ہے تو ہی

(۲)

کیوں شام و سحر ہیں ترے نقصان کے درپے؟ اے زندۂ جاوید! تری جان کے درپے؟

غصہ ہے انہیں

کیوں تری قسمت میں بقا ہے؟

تو چیز ہی کیا ہے؟

(۳)

کیوں درپئے آزار زماں بھی ہے مکاں بھی؟ میں تجھکو بتا سکتا ہوں یہ راز نہاں بھی

تھا غرہ انھیں

وسعت و پہنائی پہ کیا کیا!!

جو تو نے مٹایا

(۴)

بت بتکدۂ ہست کے ایماں کے دشمن ایمان کے دشمن ترے عرفان کے دشمن

ہے ان کو حسد

کیوں تجھے وجدان ملا ہے؟

ایقان ملا ہے؟

امین حزیں

غزل اثر رامپوری

سوئے در آنکھیں لگی ہیں اور سراپا گوش ہے
مرنے والے میں ابھی اتنا تو باقی ہوش ہے

وہ اُدھر آئینگے جائینگے ادھر صبر و قرار
انتظار دوست تمہید وداع ہوش ہے

یہ سوادِ شامِ غم کا رنگ بھی ہے دیدنی
آسماں پر آج تاروں کی فضا خاموش ہے

وہ معما ہے یہ انساں بھی جو حل ہوتا نہیں
اس قدر کم فہم بھی ہے جس قدر ذی ہوش ہے

تیرے سودائے محبت میں کمی پاتا ہوں کچھ
یہ سر شوریدہ اب مجھکو وبال دوش ہے

کس قدر دلچسپ ہے افسانۂ حسن و جمال
کائناتِ دل کا ہر ذرہ سراپا گوش ہے

ہے زمانے سے جدا رسمِ جہانِ عاشقی
ہو گیا بیہوش جو اسمیں وہی باہوش ہے

شک نہیں اسمیں کہ مستقبل ہے انکا شاندار
آج جسکو فکر فردا ہے خیالِ دوش ہے

پیشِ جاناں صورتِ تصویرِ حیرت ہوں اثر
حال دل کہتی ہیں آنکھیں ورنہ زباں خاموش ہے

جگر بریلوی

جان اُن پر نثار کرتا ہوں — مژدہ اے زندگی کہ مرتا ہوں
شوق نے کر دیا ہے دیوانہ — ذرے ذرے کو سجدہ کرتا ہوں
دل میں دیتا ہوں دعوتیں غم کو — اپنا پیمانہ آپ بھرتا ہوں
آج قابو نہیں رہا دل پر — ہوک اٹھتی ہے نالہ کرتا ہوں
لا رہا ہوں انھیں تصور میں — اپنے خاکہ میں رنگ بھرتا ہوں
ہو نہ جائے یہ باعثِ پندار — تیرے لطف و کرم سے ڈرتا ہوں

کیا کہوں زندگی کا حال جگر
جبر سہتا ہوں ضبط کرتا ہوں

خواجہ مسعود علی ذوقی

اقلیم دل کو عشق نے ویراں بنا دیا — اک آرزوئے خام کا زنداں بنا دیا
اُف وہ نگاہِ لطف کی بیجا نوازشیں — خود چشمِ التجا کو پشیماں بنا دیا
رند آشنائے لذتِ درماں عشق نے — صہبائے غم کو بادۂ عرفاں بنا دیا
پھر کیوں اسیر بندشِ ایماں کیا مجھے — جب آشنائے لذتِ عصیاں بنا دیا
دہر پر وہ میرے دل کا تقاضائے شوق تھا — وہ چیز جس نے غم کو فراواں بنا دیا
میں اس خرامِ ناز کی شوخی کو کیا کہوں — ویرانیوں کو جس نے گلستاں بنا دیا
اس طرح تیری یاد نے نشتر چبھوئے ہیں — تارِ نفس کو تارِ رگِ جاں بنا دیا

محویتِ جنوں میں وہ ذوقی کی بے خودی
دامانِ غیر کو بھی گریباں بنا دیا

راز رامپوری

علاج کیا ہے زمانہ کی دشمنی کے لئے — کہ موت بھی تو نہیں میری زندگی کیلئے
اگر یہی ہیں نشاطِ مذاق کے معنے — مجھے تباہ بھی کر دیجے دل لگی کیلئے
فلک بھی دوست ہوا اسکا تو فائدہ کیا ہے — جسے اک آپ سا ملجائے دشمنی کیلئے
نتیجہ اس دلِ بیمار کا خدا جانے — نہ موت ہی کیلئے ہے نہ زندگی کیلئے
نہیں ہے اہلِ زمانہ سے کچھ امید مجھے — یہ لوگ سب ہیں تماشائے بیکسی کیلئے

وفا کی موت بڑے خوش نصیب مرتے ہیں ... یہ دن تو ورنہ زمانہ میں ہے سبھی کیلئے
فلک خلاف زمانہ عدو ہے تم دشمن ... قضا نہ آئے تو کون آئے دوستی کیلئے
حدودِ ظاہر و باطن میں فرق ہے اتنا ... کہ موت مال ہو دل کی تونگری کیلئے
حجابِ عقل کی نیرنگیاں یہ فرضی ہیں ... چمن میں رونے کو شبنم ہے گل ہنسی کیلئے
مرا قصور ہے معیارِ آدمیت کا ... کہ راز ختم ہے معصومیت بنی کیلئے

کیفی چریا کوٹی

اُن کی الفت میں مٹ چکا ہوں میں ... وہ اگر جان ہیں تو کیا ہوں میں
دم لبوں پر یہ آکے کہتا ہے ... زندگانی کا انتہا ہوں میں
تجھ کو جو بزم سے نکال دیا ... کیا رقیبوں کا مدعا ہوں میں
تم جو دینے پہ مجھکو آؤ گے ... تم کو مانگوں گا وہ گدا ہوں میں
کچھ رسائی کی راہ نکلے گی ... تم جو آؤ تو نقشِ پا ہوں میں
ہوش تھا جب تھی جستجو اُن کی ... مل گئے وہ تو کھو گیا ہوں میں
دم لبوں پر کبھی نہیں آتا ... نالہ ہر چند کھینچتا ہوں میں
دیکھ! اے مجھ کو دیکھنے والے ... کس طرح تجھکو دیکھتا ہوں میں
کر دے آہِ سحر مجھے ٹھنڈا ... رات بھر بزم میں جلا ہوں میں
اس کی محفل کی کچھ نہ پوچھ اے دل ... درد کی شکل میں اُٹھا ہوں میں
اب سرِ بزم پی نہیں سکتا ... سب یہ کہتے ہیں پارسا ہوں میں
وہ سمجھ میں جو کچھ نہیں آتا ... بُت بھی کہنے لگے خدا ہوں میں
کعبہ یا دیر سے مجھے کیا کام ... اس کے در پر پڑا ہوا ہوں میں
اپنا مذہب یہی ہے اے کیفیؔ ... بندۂ شاہِ کربلا ہوں میں

ڈائری کا ایک ورق

چاند کا سفر

موسم بہار شباب پر ہے لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ

پہلے شگفتہ ہوتا ہے دل، بعد کو گلاب

تو مجھے کہنا چاہئے کہ :-

اَب کے خزاں بہار سے پہلے ہی آگئی

رات زیادہ گزر گئی ہے۔ ساری دنیا محوخواب ہے اور میں اوپر کی منزل میں تنہا بیدار۔ خلوت کی بیداری بھی کس قدر عجیب ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پردہ آہستہ آہستہ کھلتا جارہا ہے اور اُس کے نقوش یکے بعد دیگرے نگاہ کے سامنے سے گزرتے جارہے ہیں، ماضی کی داستان بھی کس قدر پُر لطف داستان ہے، اور کتنی حسرتیں ہماری اس کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ حال تو گویا ریاضی کا نقطہ ہے کہ خود اس کا کوئی وجود نہیں ہے، لیکن تمام خطوط و دوائر اسی کی جنبش کا نتیجہ ہیں۔ مستقبل نام ہے صرف توقعات کا مفروضات کا، تمناؤں کا، لیکن توہمات پر انسان جی تو سکتا ہے، مسرور نہیں ہو سکتا، اس لئے ایک ذرا پختہ عمر کے انسان کے لئے بہترین مشغلہ تنہائی کا یہی ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے واقعات پر غور کرے، گزری ہوئی باتوں کو یاد کرے اور اگر ایام شباب گزر چکے ہیں تو رات کا بڑا حصہ اس کے ماتم میں صرف کردے۔ کم ہیں وہ لوگ جن کا شباب ان کی تمناؤں کے اندازہ سے خوشکام بسر ہوتا ہے، اسلئے عہد ماضی کے افسانہ کا یہ ٹکڑا جسقدر بھی حسرت انگیز ہو کم ہے۔ لوگ وقت گزر جانے پر بھی امیدوں کی فرضی دنیا قائم کرتے رہتے ہیں اور پھر خود ہی مایوس ہو کر اُس مسمار کر دیتے ہیں۔ یہ ہیں انسانی بے بال و پری کے آخری حدود! دیر تک دماغ میں مختلف خیالات آتے رہے اور پھر کچھ دیر تک فلکیات کے بعض مسایل پر غور کرتا رہا اور چاند کی خنک آب و تاب میں آنکھ بند کرکے لیٹ رہا۔

....

....

جیسے کسی نے یہ کہکر جگا دیا ہو کہ، ہوائی جہاز طیار ہے ۔ ہاں، یاد آیا مجھے بھی تو سفر کرنا تھا، اُٹھا داڑھی مونڈی، کنگھا کیا، کپڑے بدلے، گرم کپڑوں کا صندوق، موٹے موٹے کمبلوں کا بستر اور ایک بکس مختلف ضروری چیزوں کا خادم کے ذریعہ سے موٹر تک پہونچایا اور چلدیا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد خیال آیا کہ ٹکٹ تو نہیں بھول آیا، جیب میں ہاتھ ڈالا تو موجود تھا۔ یہ ٹکٹ ایک سال کا موسمی ٹکٹ تھا اور عمومی تھا، عمومی سے مراد یہ کہ میں کرۂ ارض کے ہر مقام سے سفر کر سکتا تھا، اور کرۂ قمر کے ہر مقام تک جا سکتا تھا۔ مسٹر ولپنشن

کمپنی چونکہ سب سے زیادہ معتمد علیہ کمپنی تھی اور اس کے جہاز بھی نہایت تیز رو اور آرام دہ ہیں اس لئے کرایہ تو ضرور زیادہ ادا کرنا پڑا۔ لیکن میں نے اسی کو ترجیح دی اور آخر کار سب کو خیرباد کہہ کے اس کرہ کی سیاحت کے لئے چل دیا جس کے تابناک وجود کی ہمارے کرۂ ارض کے بہت سی عشق خیز راتیں گردیدۂ احسان ہیں۔

دس منٹ میں پولو گرونڈ کے میدان میں پہونچ گیا اور کپتان کو ٹکٹ دکھا کر غیر ضروری سامان، چھت کے ایک کمرہ پر رکھوا کر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ صبح کا وقت تھا، ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی بادوں کے ٹکڑے کہیں کہیں نظر آتے تھے، لیکن بالکل دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہلکے اور تنک ــ بگل کی بلند آواز بلند ہوئی، جھنڈا کھول دیا گیا اور سامنے کا پہیہ گردش کرنے لگا۔ ہلکی سی جنبش ہوئی اور تین پہیوں کے اوپر جہاز تھوڑی دور چلکر فضا میں آہستہ آہستہ بلند ہوتا گیا۔

میرے علاوہ نو آدمی اور بھی تھے جن میں سے تین عورتیں، دو نوجوان لڑکیاں اور چار مرد تھے، یہ سب امریکہ کے باشندے تھے اور براہ راست وہیں سے سوار ہوئے تھے، یہ جہاز دو درجوں میں منقسم تھا، اوپر کا درجہ اسباب کے لئے تھا اور دوسرا بیٹھنے، سونے اور کھانے کے لئے، لیکن ہر کام کے لئے مختلف حصے تھے، کپتان کے کمرہ میں ایک طرف لاسلکی ٹیلیفون اور ریڈیو لگے ہوئے تھے اور دوسری طرف ایک بڑی گھڑی نہایت ہی پیچیدہ مشینری کی نصب تھی جسکے ذریعہ سے درجۂ حرارت، موسمی کیفیت طول البلد، عرض البلد، درجات فلکی اور خدا جانے کیا کیا معلوم ہوسکتا تھا۔

میری جگہ بالکل دریچہ کے پاس تھی اس لئے بلند ہوتے وقت نہایت اچھی طرح محسوس کرتا جاتا تھا کہ تمام مکانات اور درخت وغیرہ کس طرح چھوٹے ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد شہر کا بلند مینار صرف ایک چھوٹا سا دھبہ نظر آنے لگا، سردی بھی بڑھتی جاتی تھی اور کبھی کبھی بادل کے ٹکڑوں کے اندر سے ہم کو گزرنا پڑتا تھا، لیکن یہ بادل بالکل خشک تھے اور دریچوں کے شیشوں پر ایک ہلکے سے نم کے علاوہ اور کوئی اثر نہ پیدا کرتے تھے۔

جس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس جہاز کے تمام مسافر بھر گئے ہیں اور اب براہ راست بغیر راہ میں کہیں قیام کئے ہوے سیدھے کرۂ قمر تک کا سفر کرنا ہے تو میرے اعصاب میں اک خاص قسم کی بے چینی محسوس ہونے لگی اور میں سوچنے لگا کہ دیکھئے وہاں کیونکر گزرتی ہے اور کس طرح واپسی ہوتی ہے۔

جہاز کی رفتار نہایت تیز ہوتی جاتی تھی اور سامنے جو رفتار پیما لگا ہوا تھا وہ بتا رہا تھا کہ اس وقت ہم ۳۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہے تھے، لیکن معلوم ہوا کہ ابھی اس کی دو چند رفتار اور بڑھیگی۔ میں بیٹھا ہوا اپنی اس نئی سیاحت کے متعلق غور کر رہا تھا کہ خادم آیا اور میرے سامنے کے مسافر کے پاس ایک تار لایا جو اسوقت لاسلکی کے ذریعہ سے موصول ہوا تھا۔ یہ اسے دیکھکر فوراً اٹھا اور ٹیلیفون کو امریکہ کے کسی کارخانہ سے ملا کر کاروبار تجارت کے متعلق کچھ ہدایات کرنے لگا۔

میں سخت حیران تھا کہ اس وقت جب کہ جہاز کم از کم ۲۰۰ میل کی بلندی پر فضا میں اڑ رہا ہے کیونکر امریکہ کے کسی آدمی سے براہ راست گفتگو کرنا ممکن ہے، لیکن یہ ایک واقعہ ہے جو میرے سامنے ہو رہا تھا اور کوئی وجہ اس سے انکار کی نہ تھی۔

دن بھر کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی۔ کیونکہ اب کرۂ ارض کا کوئی حصہ ہمکو نظر نہ آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا جہاز صرف آسمان کے نیل میں تیرتا ہوا جا رہا ہے، ہوا چونکہ ۱۰۰ میل کے بعد ہی ختم ہو گئی تھی اس لئے ہر شخص کے منہ سے آکسیجن کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں اور نبض کی رفتار ۱۵۰ فی منٹ تک پہونچ گئی تھی۔

شام کو چاند کے طلوع کا نظارہ بہت دلچسپ تھا اور وہ آج ہم سے زیادہ قریب نظر آتا تھا۔ ٹھیک اس وقت جبکہ ہم لوگ کھانا کھا کر سینما دیکھ رہے تھے، کرۂ قمر سے ایک لاسلکی پیغام کپتان کو موصول ہوا، کپتان ہم لوگوں کے کمرے میں آیا اور کہنے لگا کہ چاند کے بڑے سمندر میں شدید سیلاب ہونے کی وجہ سے جلد وہاں پہونچنا خطرے سے خالی نہیں ہے اس لئے یہ سفر کم از کم دس دن اور بڑھ جائے گا، کیونکہ جہاز کی رفتار کم کرنا ہوگی۔ بعض کو اس خبر سے خوشی ہوئی، بعض کو رنج، لیکن میں نے اس کو مذاق سمجھکر کوئی اثر نہیں لیا اور سامنے پردہ پر نہایت لطف کے ساتھ میری پکفورڈ کی ایکٹنگ کو دیکھتا رہا، میں زیادہ جزئیات سے بحث نہیں کرونگا اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، کیونکہ حقیقتاً اب جہاز میں کوئی نیا تجربہ نہ ہوتا تھا، وہی کھانا پینا، سینما دیکھنا اور سو جانا روز کا مشغلہ تھا، اب میرے مراسم لوگوں سے کافی طور پر بڑھ گئے تھے، اور اس لئے بعض اوقات برِج کھیلنے میں بھی مشغول ہو جاتا تھا ایک دن البتہ جہاز کا انجن کچھ برہم سا ہو گیا تھا اور جہاز نیچے کی طرف مائل ہونے لگا تھا، لیکن کپتان نے فوراً دوسرا انجن کھول دیا اور پانچ میل سے زیادہ نیچے نہ اترے تھے کہ جہاز پھر تازہ قوت کے ساتھ صعود کرنے لگا۔ بیس دن کے بعد ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ جہاز کی رفتار بہت بڑھ گئی لیکن رفتار پیما صفر پر ہے تھوڑی دیر میں کپتان مسکراتا ہوا آیا اور بولا کہ ہمارا سفر تو حقیقتاً آج ختم ہو گیا، اور اب ہمارا کوئی کام باقی نہیں رہا۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے لیکن جب معلوم ہوا کہ ہم کشش زمین کی حدود سے نکل کر کشش قمر کی حدود میں آ گئے ہیں تو میں اسکا مدعا سمجھا۔ الغرض ہم چاند کی طرف خود اپنی قوت سے نہیں جا رہے تھے۔ بلکہ چاند خود ہمیں اس طرح کھینچ رہا تھا جس طرح زمین پر کوئی ڈھیلا اوپر کی طرف پھینکئے اور وہ تیزی کے ساتھ زمین کی طرف مائل ہو۔ جہاز اس وقت زمین کی طرف اترنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ چاند کی کشش دفعتہً اسے نہ کھینچ لے اور اس طرح یہ خطرہ باقی نہ رہا تھا کہ ہم چاند میں پہونچکر دفعتہً کسی چیز سے ٹکرا جائیں گے۔ اسوقت سب سے زیادہ حیرت انگیز تجربہ میرے لئے یہ تھا کہ میرا بدن بالکل ہلکا ہو کر پھول سا ہو گیا تھا۔ اور جسوقت میں قدم اٹھاتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اڑ رہا ہوں۔

باقی ــــ ــــ ــــ باقی

نیاز

بابُ الاستفسار

مسئلہ معاد

مولانا!

نگار کے اکتوبر نمبر میں آپنے تصدق حسین صاحب کے سوال نمبر (۱) کے جواب میں فرماتے ہیں کہ "بہشت و دوزخ کے بیانات سب تمثیلی ہیں، اور لوگوں کے سمجھانے کے لئے اصل میں انکا تعلق صرف روحانی مسرت و اذیت سے ہے"

بیسویں صدی عیسوی کی یہ تاویلات قرآنی ہیں نے اکثر سنیں اور عموماً اس فرقہ سے جو اسوقت تہذیب و تمدن کا علم بردار ہے مجھے اس کے متعلق آپ سے کچھ عرض کرنا ہے غالباً آپ اسپر توجہ فرمائینگے،

مسرت و اذیت ہر دو کیفیات احساسی ہیں، اور ان کے لئے پہلے محرک اور سبب کا وجود ضروری ہے۔ اگر بہشت و دوزخ سے مراد مسرت و اذیت روحانی بھی ہو تو حسب قاعدہ مسرت و اذیت کے محرک اور سبب کا وجود سے مقدم ہوگا۔ اب قابلِ دریافت یہ امر ہے کہ حیات بعد الموت میں وہ محرک اور سبب کیا چیز ہوگی اور کس طرح انسانی روح پر مسرت و اذیت کے جذبات طاری ہوں گے۔ کسی مفید اور کارآمد چیز کی یافت سے انسان خوش ہوتا ہے اور اس کے فوت ہوجانے سے غمگیں۔ حیات بعد الممات میں کس چیز کی یافت سے ہم مسرور ہوں گے اور کس چیز کی نایافت سے مغموم۔

آپ روحانی مسرت و اذیت کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ یہ میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ روحانی مسرتیں اور اذیتیں ضرور رہیں ہیں۔ مگر ایسی روحانی خوشی اور اذیت جسکے ساتھ جسمانی خوشی اور اذیت شامل نہ ہو اتنی قابلِ اعتنا نہیں۔ غم عشق ضرور جاں گسل ہے مگر ان کے ساتھ ہی اگر سر بازار ہر روز بلا ناغہ عاشقِ جانباز کے کوڑے بھی پیٹے جائیں۔ تو یہ تکلیف بدرجہا زیادہ اذیت رساں ہوگی۔ لیکن مجھے تو اس میں بھی کلام ہے کہ روح کے لئے ایسی روحانی مسرت یا اذیت کا وجود جب روح جسم سے علیحدہ ہو۔ ممکن بھی ہے یا نہیں، کیونکہ ہمارے لئے کسی ایسی حالت کا اندازہ جب ہماری روح کا پیوند جسم سے نہ ہوا تھا محالات سے ہے۔ پھر آخرت جو دنیاوی زندگی کا اہم ترین مقصد ہے۔ کس طرح ایک ایسی خوشی یا اذیت سے عبارت ہوسکتی ہے جسکو کوئی فرد بشر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اور وہ انسان جو ہوا و حرص کا بندہ اور خواہشات نفسانی کا حلقہ بگوش ہے کیسے فقط مسرات روحانی پر اکتفا کرنے کے لئے تیار ہوگا؟

اگر بہشت و دوزخ کے بیانات تمثیلی ہوں اور اس سے مراد روحانی مسرت و اذیت ہو۔ تو ضرور ہے کہ ان روحانی مسرتوں اور اذیتوں سے صرف روح متمتع ہو اور بے چارہ جسم جس نے روح کا دنیا کی ہر دشوار گزار گھاٹی میں ساتھ دیا۔ جس کے سینے دشمنوں کے تیروں اور گولیوں سے چھلنی ہو گئے جس کے ہاتھ پاؤں قلعہ شکن توپوں اور ہوائی بمب بازجہازوں کے نذر ہو گئے، اور جس کے سر و دوش اینٹوں سے زخمی اور چور کئے گئے، بے یار و مددگار پیسکر خاک ہو جائے، اور زمانے کے جھکڑ اور آندھیاں اسے اڑا کر نیستی کے سمندر میں غرق کر دیں، کیا اس وقت اسے حق نہ حاصل ہوگا، کہ زبان حال سے چلا چلا کر گلا پھاڑ پھاڑ کر دربار رب لایزال میں رو رو کر یوں عرض کرے۔ فاذا انکون کریہۃ ادعی لھا۔ واذا یحاص الحیص یدعی جندب۔ اس دنیا کے کاروبار میں روح اور جسم مسرت و اذیت میں برابر کے حصہ دار ہیں (روحانی) مسرت سے اگر طبیعت خوش ہوتی ہے تو جسم کا بھی اس میں برابر کا حصہ ہے اور جسمانی اذیت سے روح کے لئے بھی تکلیف اذیت ہے لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا، کہ جب موت کے بعد انسان کے اعمال و افعال کا باقاعدہ جائزہ لیا جاتا ہے اور اسے اعمال کے مطابق مسرت یا اذیت کا حق دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ تو اس وقت جسم کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ حالانکہ روح کو جس مسرت یا اذیت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس کا ارتکاب جسم کی معرفت عمل میں آیا تھا۔ ورنہ صرف روح ہرگز اس قسم کے جرائم یا اعمال حسنہ کا ارتکاب نہ کر سکتی۔ اگر یہ صحیح ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ جسم کو بھی اس مسرت و اذیت میں برابر کا حصہ دار نہ قرار دیا جائے؟

آپ کو یاد ہوگا، کہ گزشتہ جنگ بلقان میں بلغاریا اور سرویا نے کس طرح اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈال کر ایڈریانوپل فتح کیا تھا۔ کیا آپ ان کی اس خوشی کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو انہیں اس فتح سے حاصل ہوئی ہوگی۔ لیکن اگر کوئی فیلسوف ان سے اسوقت یہ کہتا۔ کہ جسمانی منافع اور خوشیوں سے روحانی خوشیاں اور منافع بدرجہا دلاویز تر ہیں اور تم حیات بعد الممات کی خوشیوں اور اذیتوں کو بھی اسی قبیل سے قرار دیتے ہو۔ کیا اچھا ہو۔ اگر تم ان خوشیوں سے مماثلت پیدا کرنے کے لئے ایڈریانوپل کو بعد فتح کرنے کے پھر ترکوں کے حوالہ کر دو، کیونکہ ہمیں فتح سے جو روحانی مسرت حاصل ہوئی ہے وہ کیا کم ہے، اور انہیں جو شکست سے روحانی اذیت اور انفعال حاصل ہوا ہے کیا تھوڑا ہے؟

تو اگر اسوقت کوئی کوئی صلیب پرست فلاسفر جواباً یہ عرض کر سکتا ہے کہ ایڈریانوپل کی فتح سے جو مادی نقصانات ہم کو برداشت کرنا پڑے ہیں ان کی تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ اور آپ اس پہلو کو کیوں نظر انداز کر رہے ہیں؟ تو کیا رب ذوالجلال کے دربار میں جسم کی طرف سے کوئی وکیل یہ نہیں کہہ سکتا کہ

دنیا کے سرد و گرم، تر و خشک خیر و شر میں جب جسم روح کے برابر شریک تھا۔ تو کیا وجہ ہے۔ کہ اب جسم کو ان لذائذ سے تمتع کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا۔ جس طرح ایڈریانوپل فتح کے بعد تلوار سے ہی واپس لیا جا سکتا ہے اور فاتح فقط روحانی مسرت پہ اکتفا نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ جسمانی پہلو سے بھی حظ اندوزی کا طلبگار رہے۔ بالکل اسی طرح حیات بعد الممات میں بھی جسم روح کے دوش بدوش ہوگا۔ اور اپنے حقوق کے لئے داد فریاد کریگا۔ اور کوئی بھی ایسا نہ ہوگا۔ جو صرف روحانی مسرت کے کھلونے سے بہل جائے۔

اسلام نے راہبانہ زندگی سے اپنے پیرؤوں کو اسی لئے منع فرمایا۔ کہ وہ جسمانی پہلو کو نظر انداز کر کے لذائذ دنیا سے تنفر ظاہر کرتے ہیں حالانکہ اس حکیم علی الاطلاق کا انسانی تخلیق سے بالکل یہ مدعا نہ تھا۔ کہ وہ اپنے اس قدر مہتم بالشان حصہ کو نظر انداز کر دے، بلکہ یہ تعلیم دی جاتی ہے۔ کہ ہم نہایت فراخدلی سے جائز طور پر لذائذ دنیوی سے بہرہ ور ہوں اور نہایت شد و مد سے ہم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ کہ

الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا (۱۸۔ نور)

وعدۂ الٰہیہ کے پہلے جزو میں ہم کو ایک مادی چیز عنایت فرمائی جاتی ہے۔ جس سے ہمارے جسمانی پہلو کی رعایت مقصود ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس معجون (انسان) میں غالباً جسمانی پہلو روحانی پہلو سے زیادہ قابلِ اہتمام ہے۔ وعدے کا دوسرا جزو روحانیت اور جسمانیت دونوں سے مرکب ہے اور تیسرا خالص روحانی ہے۔ لیکن یہ امر کس قدر تعجب انگیز ہوگا۔ کہ حیات بعد الممات میں جسمانی پہلو کو بالکل بھلا دیا جائے، اور ایک نہ ختم ہونے والی زندگی روحانی (فرضی) مسرتوں میں بسر کرنا پڑے۔ اسی طرح حیات بعد الممات میں اگر جسمانی پہلو بالکل ترک کر دیا گیا ہے۔ تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام راہبانہ زندگی کے برخلاف کیوں زور شور سے پروٹسٹ کر رہا ہے۔ حالانکہ جب آخری زندگی سراپا روحانی مسرتوں اور اذیتوں سے لبریز ہے تو اس شخص کو کیوں قابلِ تحسین و آفرین نہیں خیال کیا جاتا۔ جو اپنی دنیوی اور اخروی زندگی میں مماثلت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

نبی اور مرسل کو روح القدس سے جو قریب کا تعلق ہوتا ہے وہ کسی اہل بصیرت سے مخفی نہیں۔ لیکن جسمانی لذائذ کچھ اس قدر دلربا واقع ہوئے ہیں کہ وہ بھی باقاعدہ اُن سے استفادہ کرتے ہیں۔ حالانکہ جب اخروی زندگی بالکل ہی روحانی زندگی ہے، تو کیا یہ قرین قیاس نہیں کہ پیغمبر اس زندگی کا مکمل

نمونہ ہوتا ہے؛ جبکہ نبی کی بعثت کا مقصود بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو اس سفر کے لئے تیار کرے لیکن سنئے، دنیا کا سب سے بڑا انسان کیا کہہ رہا ہے۔

حُبِّبَتْ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمْ ثَلَاثَۃٌ ۔ اَلطِّیبُ، وَالنِّسَاءُ وَقُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ ۔

یہاں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح ترتیب مدارج منظور ہے (۱) عورت (۲) طیب (۳) الصلوۃ اگر بہشت دوزخ روحانی مسرت و اذیت کی دوسری تعبیریں قرار دی جائیں تو کیا یہ سراپا ابلہ فریبی نہیں کس قدر مضحکہ خیز امر ہے کہ اسد کہہ کر رجل شجاع مراد ہو اور اس تاویل کے لئے ذرا بھر بھی گنجائش نہ ہو اور نہ کوئی قرینہ صادقہ موجود ہو۔ روحانی مسرتوں اور اذیتوں کو حور و قصور، اور دوزخ وہاویہ سے تعبیر کرنا معنی الشعر فی بطن الشاعر کے قبیل سے ہے۔

ہم کروڑ مسلم آبادی میں اسوقت فی لاکھ کتنے آدمی ایسے ہوں گے، جن کا یہ عقیدہ ہے کہ بہشت و دوزخ سے مراد روحانی مسرت و اذیت ہے عوام جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے۔ ہرگز جسمانی پہلو کو نظر انداز کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اگر وہاں بقول آپ کے روحانی مسرتوں اور اذیتوں کا ہی انتظام ہے تو عوام جن کی ساری عمر دوزخ کے ڈر اور بہشت کے شوق میں بسر ہوئی، خدائے متعال کی اس ابلہ فریبی کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جبکہ انکی پیاس بجھانے کے واسطے کافی سامان نہ ہونگے اور کیا اس وقت کہا جا سکتا ہے کہ بہشت و دوزخ سے مراد روحانی مسرت اور اذیت تھی۔ اگر کسی نے کہہ بھی دیا تو کیا ادھر سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ

تکلم الناس علی قدر عقولھم۔

ممکن ہے۔ آپ یہ فرماویں کہ قرآن نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون

لیکن اسوقت اگر اہل الذکر کی کسی کو جستجو بھی ہو تو ہم کروڑ مسلم آبادی سے کتنے آپ کے ہم خیال اہل الذکر پیدا ہوں گے ہاں پھر ارشاد ہے کہ

فاتبعوا السواد الاعظم اور

لا تجتمع امتی علی الضلالۃ

غلام ربانی عزیز

(نگار) یہ استفسار یا اعتراض مولوی غلام ربانی عزیز کا دو سال سے میرے پاس محفوظ ہے اور اس درمیان میں بار ہا میری نظر سے گزرا، لیکن ہمیشہ "میں نے موقوف اسے وقت دگر پر رکھا" ایک زمانہ سے میرے اوقات کا اکثر حصہ اسی غور و فکر میں بسر ہوتا ہے

کہ خالق و مخلوق کا تعلق کس نوع کا ہو سکتا ہے؟ تخلیق انسان کی غایت کیا ہے؟ قدرت ہم سے کیا توقعات رکھ سکتی ہے - اور مذہب کس حد تک اس معمہ کے حل کرنے میں کامیاب ہوا ہے، پھر اسی ایک خیال کے ماتحت چونکہ طاعات و عبادات کے مسائل، معاد و آخرت کے عقاید انبیا و رسل کے الہامات، عالم کون کے سلسلہ ہائے علت و معلول، اور وہ تمام باتیں جو ایک مذہبی لٹریچر سے متعلق ہو سکتی ہیں سبھی پر غور کرنا پڑا اس لئے ظاہر ہے کہ بہشت و دوزخ کے قصے بھی میرے سامنے آئے ہوں گے اور میں نے اُن کے متعلق بھی کوئی رائے قائم ہوگی، لیکن میں خود ایک عرصہ تک اس باب میں متفکر و متردد رہا اس لئے جی نہ چاہا کہ بغیر خود اپنا اطمینان نفس حاصل کئے بغیر دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کروں - قبل اس کے کہ میں اصل مقصود پر آؤں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا مسلمان ہونا (اگر میں واقعی مسلمان ہوں) اس بنا پر نہیں کہ میرے آبا و اجداد اس مذہب کے پیرو تھے، بلکہ مسلمان ہوں اسلئے کہ میں نے تمام مذاہب کے لٹریچر کا نہایت غایر اور وسیع مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ اگر انسان کو مذہب کی ضرورت ہی تو اسلام سے بہتر کوئی اور مذہب اس کے لئے نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے زیادہ سادہ، لیکن ہمہ گیر تعلیمات کہیں اور نہیں پائی جاتیں پھر ظاہر ہے کہ اس صورت میں میرا اسلام کوئی تقلیدی چیز نہیں ہے اور نہ تقلید محض ایک شخص کو کسی مسلک یا مذہب کا سچا پیرو بنا سکتی ہے "نفس مطمئنہ" نام کورانہ اتباع کا نہیں، بلکہ اجتہادانہ تفکر و تدبر کا ہے اور یقیناً اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہر شخص کو ہر زمانہ میں تنقید کی دعوت دے سکتا ہے اور کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ بغیر غور کئے ہوئے اس کی تعلیمات کو قبول کرے۔

بہرحال مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس سلسلہ میں، جہاں اور بہت مسائل پر غور کرنا پڑا، میں نے اس خاص مسئلہ پر بھی نہایت آزادانہ رائے قائم کرنے کی کوشش کی اور اگر مجھے اندیشہ نہ ہو کہ لوگ میرے مفہوم کے سمجھنے میں غلطی کریں گے تو میں نہ صرف یہ کہونگا کہ بہشت دوزخ اصطلاحی الفاظ ہیں، روحانی لذت و الم کے لئے بلکہ یہ دعویٰ کرونگا کہ ان مخصوص معنے کے لحاظ سے بھی معاد کا اعتقاد بالکل بے معنی سی بات ہے، اور گو اس کے وعظ و تلقین ایک عامی شخص کی صحت اخلاق کے لئے ضروری ہو لیکن ارباب فہم کے لئے اسکی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی

ہرچند معاد کے مسایل ایسے نہیں ہیں جنپر اس سے قبل کوئی گفتگو نہ کی گئی ہو، کیونکہ مذاہب کے قیام و بقا کا انحصار ہی اسپر ہے اور ہر وقت اور ہر قوم میں اسپر بحث کی گئی ہے، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ یہ مسئلہ بھی منجملہ ان بہت سے مسائل کی ہے جن پر تا بقاء نسل انسانی ہمیشہ گفتگو کی جائے گی اور ہمیشہ اختلاف آرا، پایا جائے گا - اس لئے میرا اس مسئلہ پر اظہار خیال کسی جدید بحث کا آغاز تو نہ ہوگا لیکن یہ یقینی ہے کہ جو کچھ لکھونگا وہ میری تحقیقی رائے ہوگی، میرے نقطۂ نظر سے بالکل پُر خلوص رائے ہوگی، خواہ وہ معتقدات عامہ سے کتنی ہی منحرف کیوں نہ ہو - مسئلہ عذاب و ثواب یا بہشت و دوزخ پر گفتگو کرنا اس قدر کثیر ذیلی مباحث کا پیدا کرنیوالا ہے کہ اس کے لئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے، لیکن چونکہ میرا شعار تمام مذہبی مسائل میں صرف "تمسک بالقرآن" ہوتا ہے اسلئے میں کوشش کرونگا کہ مختصر سے مختصر مقالہ میں اپنے خیالات کا اظہار کروں اور اس بحث کے دیگر "انشعابات" پر اگر نگاہ ڈالنا ضروری ہو بھی تو صرف سرسری نگاہ سے کام لوں۔

سب سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسئلہ معاد کوئی نئی چیز نہیں ہے اور قدیم ترین مباحث انسانی میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم قدیم ایام سے ایسی نہیں گزری جس نے اپنے مدارک و مدارج ذہنی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ "عالم بعد الموت" پر فکر نہ کی ہو اور مذہب کے وجود کی بنیاد اس خیال پر نہ قائم کی گئی ہو کہ اس دنیا کے بعد ایک عالم اور بھی ہے جہاں محاسبۂ اعمال ہوگا، عذاب و ثواب ہوگا، بہشت و دوزخ ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

مذہب کیونکر عالم وجود میں آیا، یہ اب کوئی سربستہ راز نہیں رہا اور نہ اس کی غایت کا علم اب پردۂ خفا میں ہے۔ قانون و مذہب میں مقدم وجود قانون ہی کا ہے لیکن واضعین قوانین نے دیکھا کہ اس سے فسادات کا سدباب پوری طرح ممکن نہیں ہے تو انھوں نے مذہب کو پیدا کیا تاکہ انسان کی طبیعت ہی صلاحیت پسند ہو جائے اور قلب انسانی میں بھی خطرۂ جرم نہ آوے۔ تصفیۂ اخلاق، تزکیۂ نفس، نظام تمدن، تشکیل ہیئت اجتماعی یہ وہ سب باتیں تھیں جو قانون کے بھی پیش نظر تھیں لیکن جب وہ ان کے حصول میں کامیاب نہ ہوا تو مذہب پیدا کیا گیا۔ درحقیقت یہ ہے کہ اگر یہ تدبیر اختیار نہ کی جاتی تو آج بھی دنیا اسی عہد وحشت و بربریت میں ہوتی جو کسی وقت اس سے قبل پایا جاتا تھا۔ تکلیف سے بچنا، آرام و راحت کی طرف دوڑنا، فطرت انسانی ہے، اس لئے اگر اس فلسفہ کو پیش نظر نہ رکھا جاتا اور مذہب کو اس سے بیگانہ رکھا جاتا تو وہ بالکل بیجان چیز رہتا اور مقصود حاصل نہ ہوتا۔ اس لئے مذہب کی بنیاد یہی معاد کے خیال، عذاب کے ڈر اور ثواب کی تمنا پر قائم کی گئی، پھر چونکہ اس اعتقاد کے لئے ضروری تھا کہ انسان کی حیات ثانیہ کو بھی ثابت کیا جائے (کیونکہ بغیر اس کے عذاب و ثواب کا مفہوم کوئی اہمیت نہ رکھ سکتا تھا) اس لئے حشر اجساد اور بقار روح کو ضروری قرار دیا گیا۔ یہ تھی مذہب کی بالکل ابتدائی تحریک جس کو میں انتہائی بھی کہونگا، کیونکہ اس وقت بھی مذہب میں کا تار و پود اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

روح کیا ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ آج تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا اور نہ شاید کبھی ہو سکے۔ اس پر مستقل تصانیف روز شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے جس کو دیکھ کر کسی شخص کو اطمینان کلی ہو سکے۔ میں اس صحبت میں تمام اکابر و اعاظم کی تحقیق سے بحث نہیں کرونگا، بلکہ غور کرونگا کہ کلام مجید میں اس کے متعلق کیا بتایا گیا ہے۔

غالباً آپ یہ سُن کر متحیر ہوں گے کہ شروع سے لیکر اس وقت تک تمام مفسرین نے اس باب میں سخت غلطی کی ہے اور کلام مجید کی اُن آیتوں سے جن میں لفظ روح پایا جاتا ہے، مسئلہ روح کے حل کرنے میں مدد لی ہے، حالانکہ "روح انسانی" کے لئے جس کا تعلق حیات و ممات سے ہے، ایک جگہ بھی کلام پاک میں روح کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔

لفظ روح قرآن پاک میں ہر جگہ "الہام" اور "قوت رشد و ہدایت" کے لئے آیا ہے۔ میں اس جگہ ان تمام آیات کو نقل نہیں کرونگا جنہیں لفظ روح استعمال کیا گیا ہے بلکہ سورۂ مومن کی صرف ایک ایسی آیت پیش کرونگا جس سے یقینی طور پر یہ امر ثابت ہو سکتا ہے کہ لفظ روح سے خدا کا کیا مفہوم ہے وہ آیت یہ ہے:-

رفیع الدرجات ذوالعرش یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ لینذر یوم التلاق۔

یعنی بلند مرتبہ والا، صاحب قوت (خدا) ڈالتا ہے روح (پیدا کرتا ہے قوت رشد و ہدایت) اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں سے تاکہ وہ ڈرائے انجام سے۔

اگر روح سے مراد روح انسانی ہوتی تو پھر یہ تخصیص کیونکر ممکن تھی کہ "جس بندہ کو چاہتا ہے یہ روح عنایت کرتا ہے" روح انسانی تو ہر آدمی میں پائی جاتی ہے اور اس سے کوئی خالی نہیں، اس لئے معلوم ہوا کہ روح سے مراد خدا کا الہام یا قوت رشد و ہدایت ہے۔

اسی پر قل الروح من امر ربی کا بھی قیاس کر لیجئے۔ یہاں روح سے قرآن مراد ہے یسئلونک عن الروح (یعنی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ قرآن جسے تم الہامات ربی کہتے ہو کیا ہے) قل الروح من امر ربی (تو اس کے جواب میں اے رسول تم کہدو کہ یہ الہامات سب حکم خداوندی و منشاء ایزدی کا نتیجہ ہیں) وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (جس کے سمجھنے کی اہلیت تم میں بہت کم ہے۔) آپ قرآن پاک کھول کر سورۂ بنی اسرائیل میں اس آیت کے قبل و بعد کی آیتوں پر غور کیجئے، آپ کو خود معلوم ہو جائیگا کہ روح سے مراد کیا ہے۔

اسی طرح سورۂ النحل کی ایک آیت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ لفظ روح سے روح انسانی مراد نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ینزل الملائکۃ بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ (یعنی قوائے ملکوتی حکم خداوندی سے الہامات پیدا کرتے ہیں اپنے مخصوص بندوں میں)۔ یہاں بھی وہی علی من یشاء ہے۔ ہر انسان مقصود نہیں ہے۔ اسی طرح مسیح کے بیان میں نفخ روح سے جو مراد ہو سکتی ہے ظاہر ہے

بہرحال روح انسانی کے لئے کلام مجید میں لفظ روح کسی جگہ نہیں آیا ہے اور اس کے سمجھنے میں تقریباً سب نے غلطی کی ہے، اس لئے اب غور طلب یہ امر ہے کہ اگر لفظ روح، روح انسانی کے لئے نہیں آیا ہے تو پھر اس معنی میں کس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے بعض کا خیال ہے کہ اس کے لئے لفظ نفس استعمال کیا گیا ہے، لیکن مجھے اس سے بھی اختلاف ہے۔ میرے نزدیک کلام مجید میں نفس کا لفظ ضمیر یا (Conscience) کے مفہوم میں آیا ہے۔

سورۂ قیامت میں ہے " ولا اقسم بالنفس اللوامۃ " سورۂ الفجر میں ہے یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ سورۂ شمس میں ہے ونفس وما سواہا۔ ان میں سے ہر جگہ نفس سے مراد ضمیر انسانی ہے۔ اور اگر نفس سے مراد واقعی روح انسانی مراد ہوتی تو اس مفہوم کے علاوہ کسی اور معنی میں یہ لفظ استعمال نہ ہوتا، حالانکہ ظاہر ہے کہ کل نفس ذائقۃ الموت میں نفس سے مراد روح انسانی نہیں بلکہ دنیاوی ہستی مراد ہے۔

الغرض میری جستجو کا نتیجہ یہ ہے کہ کلام مجید میں نہ روح کی حقیقت سے کہیں بحث کی گئی ہے اور نہ اس کی فنا یا بقا کا جھگڑا چھیڑا گیا ہے، اگر روح کا بقا ثابت ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار کلام مجید نہیں ہے، اور اگر روح فانی ثابت ہوتی ہے تو قرآن کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر حیات بعد الموت کو مذہباً تسلیم کیا جاتا ہے اور حیات بھی بالکل ویسی ہی جیسی اس دنیا میں پائی جاتی ہے یعنی جسم کے ساتھ تو از روئے نتیجہ یہ ماننا ضروری ہوگا کہ نہ صرف روح انسانی بلکہ انسانی جسم بھی غیر فانی چیز ہے، حالانکہ جسم کی بقا کا

کوئی قایل نہیں۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ جسم از سرِ نو پیدا کیا جائے گا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ روح کا دوبارہ پیدا ہونا بھی ناممکن نہیں ہے، جس طرح اول اول جسم کے ساتھ روح پیدا ہوئی تھی، اسی طرح بعد کو بھی جب جسم پیدا ہوگا روح بھی اُس کیساتھ وجود میں آجائے گی۔ اس لئے وہ جماعت جو حشر اجساد کے قایل ہے کسی طرح روح کی بقا کو دلایل عقلی سے ثابت نہیں کر سکتی۔

بہرحال قبل اس کے حشر اجساد پر بحث کی جائے، یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ آیا معاد کا اعتقاد محض لوگوں میں خشیت پیدا کرنے اور اُن کے اخلاق درست کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے یا حقیقتاً عقل کے نزدیک بھی وہ قابل قبول ہے۔ آیئے پہلے ایک نظر اس سوال پر بھی ڈال لیں۔ جسوقت ہم کائنات اور عالم خلق پر نگاہ ڈالتے ہیں تو سب سے پہلی وہ چیز جو ہماری عقل کو حیران بنا دیتی ہے اس کی وسعت و تنوع ہے۔ کائنات نام اُس کرۂ ارض کا نہیں جس کا دور صرف ۲۴۰۰۰ میل ہے اور جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک معمولی سیارہ ہمارے نظام شمسی کا ہے، بلکہ کائنات اور عالم خلق میں تمام وہ فضاء بسیط شامل ہے جس کی وسعت کا اندازہ نہیں ہو سکتا جنھوں نے فلکیات کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ امر مخفی نہیں کہ ہمارا نظام شمسی کیا ہے؟ اس میں علاوہ زمین کے اور بڑے بڑے سیارے (عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل وغیرہ) بھی ہیں ان سیاروں کے چاند بھی ہیں چھوٹے چھوٹے ستارے بھی ہیں جیسے شہاب ثاقب اور دمدار ستارے بھی پائے جاتے ہیں اور مختصراً یوں سمجھئے کہ نظام شمسی کا محیط ۱۱ ارب میل ہے لیکن باوجود اس قدر عظمت کے یہ سارا نظام شمسی کائنات کی وسعت کے لحاظ سے اس قدر حقیر چیز ہے کہ اگر اسکو آج محو کر دیا جائے تو کائنات کو اتنا بھی نقصان نہیں پہونچ سکتا جتنا سمندر کو ایک قطرہ کے نکل جانے سے" (باقی)

نیاز

معلومات

ہوائی تجارت اس وقت انگلستان میں ایک ہوائی جہاز ایسا طیار ہو رہا ہے جس کی لمبائی ۷۰۹ فٹ ہوگی اور قطر ۱۳۳ فٹ اس کے ہیکل (Body) کے ڈھلنے کے لئے ۲۲۵۰۰۰ مربع فٹ کپڑا درکار ہوگا اس کا ہیکل الیومینم کا بنایا جائے گا۔

اس میں چھ بڑے موٹر رولز رائس کے ہوں گے جن کی قوت ۶۵۰ گھوڑوں کی ہوگی اور چھوٹے چھوٹے موٹر ان کے علاوہ ہونگے اس کے درمیاں میں کمرے ہوں گے جن میں ۹۰۰ مسافر بیٹھ سکیں گے چالیس آدمی اس کے چلانے والے ہوں گے۔ کھانے کے کمرے میں بیک وقت ۵۰ آدمی کھانا کھا سکیں گے۔

اسی طرح فریڈرکھافن میں بحیرۂ کونسٹانس پر ایک جہاز اہل جرمن طیار کر رہے ہیں جن کی لمبائی ۷۶۳ فٹ ہوگی اور قطر ۹۷ فٹ اس کی رفتار ۸۰ میل فی گھنٹہ تک ہوگی اور ایک مرتبہ اڑ کر ۶۲۵۰ میل تک برابر بغیر وقفہ کے سفر کر سکیگا۔ اس کے موٹر پانچ ہیں جن کی قوت ۵۳۰ گھوڑوں کی ہوگی۔ آئندہ موسم بہار میں یہ جہاز برلن سے امریکہ کا سفر کریگا۔

کُہر کا دشمن امریکہ کی ایک برقی کمپنی نے ایک خاص قسم کے گیس سے قرمزی رنگ کی روشنی پیدا کی ہے جو کُہر کو منور کر دیتی ہے، ایک دن صبح کو جب کہ کُہر کی کثرت سے نظر بیکار ہوگئی تھی، یہ روشنی پیدا کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصف میل تک کُہر غائب ہو گیا اور ہر چیز صاف نظر آنے لگی۔

یہ ایجاد ہوائی جہازوں کے لئے بڑی نعمت ہے کیونکہ ان کا سب سے بڑا دشمن کُہر ہے جو فضا کو اُن کے لئے بالکل ناقابل سفر بنا دیتا ہے۔

کائنات کی وسعت روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی منٹ ہے اور یہی رفتار لاسلکی امواج کی ہے۔ اس لئے تقریباً سات منٹ میں روشنی سارے کرۂ زمین کا چکر لگا لیتی ہے۔ لیکن کائنات کی وسعت کا اندازہ اس سے کرنا چاہئے کہ اسی روشنی کو جو ایک منٹ میں تقریباً دو لاکھ میل کا سفر کر لیتی ہے اس کو ایک کرور سال کائنات کا دورہ کرنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ یا دوسری طرح اس وسعت کا اندازہ یوں کیجئے کہ اگر سارے کرۂ ارض کو مختصر کر کے ایک نہایت قصر جوہر فرد (ذرۂ لایتجزیٰ) میں تبدیل کر دیا جائے تو عالم کو اسی نسبت سے پورے کرۂ ارض کے برابر ماننا پڑے گا۔

مسلک نسبیت (Relativism) میں اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں کہ اگر ایک ارب کُرے زمین کے برابر فضا میں گردش کرتے ہوئے تسلیم کئے جائیں تو بھی کائنات کی وسعت کا ایک گوشہ ان سے نہیں بھر سکتا۔

ش سورج زمین سے حجم میں ۱۰ لاکھ گنا اور جرم میں تیس لاکھ گنا بڑا ہے۔ سورج کے تابع جتنے اور اجرام فلکی ہیں اُنکا اندازہ ۳۰ ہزار

ملین کیا جاتا ہے۔ پھر بھی چھوٹے چھوٹے ستارے فضا کے اندر نہیں ہیں بلکہ ہر سدیم یا تو اسی طرح کا نظام شمسی رکھتا ہے یا زمانہ کی گردش کے بعد رکھنے والا ہے۔

پھر سدیم کی وسعت کا اندازہ کس سے ہو سکتا ہے جس کے اندر اس قدر مادہ پایا جاتا ہے کہ اس سے کروڑوں آفتاب بن سکتے ہیں اور جو اس قدر لطیف ہے کہ ایک اونس کا دس لاکھواں حصہ ۱۵ ہزار فٹ بلند پہاڑ کے برابر جگہ گھیرے ہوئے ہو پروفیسر ہل کا بیان ہے کہ اس وقت ۲۰ لاکھ سدیم کا اس طرح کی دوربین سے دیکھے گئے ہیں اور وہ فضا جو دوربین کی حد سے باہر ہے اس سے ایک ارب گنا زائد ہے۔ اگر سدیم کی تعداد فضا میں کم سے کم دس کھرب ہو اور ہر سدیم میں ایک ہزار ملین ستارے ہوں تو فضا کے تمام ستاروں کی تعداد کم سے کم ۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ہوگی

اس کے بعد دیکھئے کہ ہمارا کرۂ کائنات میں کیا اہمیت رکھ سکتا ہے۔

نوبل پرائز سویڈن کے ایک مشہور علم الکیمیا نے جس کا نام نوبل تھا ڈائنامیٹ بنانے سے بے اندازہ دولت کمائی تھی ۱۸۹۶ء میں اپنے مرنے سے قبل اس نے اپنی اکثر دولت سالانہ پانچ انعاموں کے لئے وقف کر دی اور چالیس ہزار گنی ہر انعام کی رقم مقرر کر کے وصیت کر دی کہ مختلف علوم کے ماہرین کو یہ انعامات دئے جائیں۔

اول مرتبہ ۱۹۰۱ء میں نوبل کی وفات کے ۵ سال بعد انعام دئے گئے طبعیات میں پروفیسر رنٹجن کو کیمیا میں وانٹ ہوا کو، طب میں ڈاکٹر بہرنگ کو اور ادب میں سلی پروڈوم کو

اس وقت تک ۲۷ مرتبہ ۱۴۱ مردوں اور ۴ عورتوں کو یہ انعام مل چکا ہے، جن میں سے ۲۴ انعام طب و فزیالوجی کے لئے، ۲۳ طبعیات کے لئے، ۲۳ کیمیا کے لئے، ۲۶ ادب کے لئے اور ۲۸ امن کی سعی کرنے والوں کے لئے تھے۔

ان میں سے اہل جرمنی نے تیس انعام حاصل کئے جن میں زیادہ تر کیمیا اور طبعیات سے متعلق تھے، اہل فرانس نے ۲۴ انعام حاصل کئے، اہل انگلستان نے اکیس، اہل سویڈن نے ۹، اہل امریکہ نے ۸، سوئٹزرلینڈ والوں نے ۷، ڈنمارک اور ہالینڈ والوں نے چھ چھ، اسپین نے ۳، پولینڈ نے ۲، روس نے ایک، ہندوستان نے ایک، اور ناروے، بلجیم، اٹلی اور اسٹریا نے چار چار انعام حاصل کئے۔

ادب کے انعامات میں برطانیہ، فرانس، جرمنی نے چار چار، اسپین، ڈنمارک، سویڈن، ناروے اور پولینڈ نے دو دو انعام حاصل کئے، سعی امن کے انعامات میں سب سے زیادہ فرانس کو ملا اور پھر سوئٹزرلینڈ اور امریکہ کو

خاتونوں میں سے میڈم کوری کو دو انعام طبعیات اور کیمیا کے ملے، سویڈن کی ایک خاتون سلمی لگرلوف کو ادب میں انعام ملا، اور سعی امن کا انعام بھی ایک اور خاتون کو دیا گیا۔

کیڑوں کا احساس الم بعض کیڑوں میں ایسے دقیق و نازک اعصاب پائے جاتے ہیں جن کے ذریعہ سے وہ بعض ایسی کیفیات کو محسوس کر لیتے ہیں جن کو اعصاب انسانی محسوس نہیں کر سکتے۔ مثلاً چیونٹی فوق البنفسجی رنگ کو

بھی دیکھ لیتی ہے اور ہم نہیں دیکھ سکتے

بعض کیڑوں میں چھونے کی ایسی قوت موجود ہے کہ اس کی نزاکت کا تصور بھی انسان کو نہیں ہو سکتا۔ لیکن باوجود اسکے بعض علماء کا حال ہے کہ تکلیف کا احساس ان میں نہیں ہے

چنانچہ فرانس کے ایک عالم اوگسٹ خوال نے اس کا تجربہ کرنے کے لئے ایک شہد کی مکھی کا اگلا حصہ سر کا سوائے آنکھوں اور منہ کے قینچی سے کاٹ دیا اور چھوڑ دیا اس کے بعد اس نے دیکھا کہ مکھی پھر پھولوں کی طرف اڑ گرگئی اور اس کو چوسنے کی بیکار کوشش میں مصروف ہو گئی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اُس کو اپنے مقدم حصۂ سر کے قطع ہونے کا کوئی احساس نہ تھا۔

اسی طرح اس نے ایک مکھی پکڑی) اور اس کے جسم کا پچھلا حصہ بیچ سے کاٹ دیا اُس کے بعد بھی وہ نہ صرف زندہ رہی بلکہ غذا بھی کھاتی رہی اور اس حال سے بیخبر تھی کہ جو غذا اسکے پیٹ میں جاتی ہے وہ سینہ سے ہو کر پھر زمین پر گر جاتی ہے۔ اسی طرح اور بھی متعدد تجربوں سے بعض کیڑوں کے عدم احساس الم کو ثابت کیا گیا ہے۔

دو عجیب و غریب ایجادیں

امریکہ کے ایک ماہر برقیات ونزلی نے ایک عجیب و غریب آلہ ایجاد کیا ہے جس کا نام اس نے (Televox) رکھا ہے یہ آلہ حقیقتاً ایک مستقل خادم ہے اور زندہ انسان کی طرح کام کرتا ہے۔ اس مصنوعی انسان کے ہاتھ بھی ہیں، کان بھی ہیں اور وہ ان سے وہی کام لیتا ہے جو ایک انسان کر سکتا ہے

اس انسان کے مختلف اعضا، لاسلکی امواج سے مختلف صورتوں میں متاثر ہوتے ہیں اور ان سے وہی افعال ظہور میں آتے ہیں جو انسان سے ظاہر ہونے چاہئے۔ دوسرے آلہ کا نام ([illegible]) ہے یہ آلہ ایک بڑے ریاضی داں انسان کی خدمت انجام دے سکتا ہے۔

اس وقت تک ریاضی کے متعلق جو آلے ایجاد ہوئے تھے وہ صرف یہی کر سکتے تھے کہ معمولی رقموں کو جوڑ دیں، ضرب و تقسیم کا معمولی جواب نکال دیں، لیکن یہ آلہ نہایت مکمل ہے اور ریاضی کے تمام پیچیدہ سوالات حل کر سکتا ہے۔

مصنوعی حنجرے

سر رچرڈ نے اپنے ایک لکچر کے دوران میں میز پر مقوی کے متعدد ٹکڑے رکھے، جو انسان کے حنجرہ کی صورت کے تھے انیں متعدد نلکیاں لگی ہوئی تھیں جن کا تعلق ایک دھونکنی سے تھا جس کو سر رچرڈ کی لڑکی دھونکتی تھی۔ ان مصنوعی حنجروں میں ہر ایک سے مختلف حروف کا تلفظ مختلف لب و لہجہ کے ساتھ پیدا ہوتا تھا۔ یہ حنجرے بالکل اسی اصول پر بنائے گئے تھے جو انسانی حنجروں کی ساخت سے متعلق ہے۔

اگر ان حنجروں کو اس مصنوعی انسان سے ملا دیا جائے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے تو پھر یقیناً ایک ایسا انسان پیدا ہو سکتا ہے جس کی انسانیت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔

نمائندہ نگار کی ڈائری

۱۱ اپریل کو کاشانۂ مصطفائیہ محمد ادریس صاحب سے جو بریلی کے رئیس ہیں اور ایک مشہور کارخانۂ فرنیچر کے مالک ہیں ملاقات ہوئی آپ نے ایک سال کیلئے نگار کی خریداری منظور فرمائی۔ قریب ۳ بجے کے مصطفا صاحب سے رخصت ہو کر دفتر پہنچا۔ مولانا نیاز بہت مصروف تھے تاہم وقت نکال کر سفر کا پروگرام بنایا۔ مولانا نے کچھ خطوط لکھ کر دے آج شام ہی کو روانہ ہوا لیکن گاڑی نہ مل سکی اور واپس دفتر آگیا۔ آسی صاحب افسر صاحب و مولانا نیاز کہیں جانے ہی والے تھے۔ میں بھی شوکت صاحب کے ساتھ وقت کاٹنے نکل گیا جو مجھے پہونچانے اسٹیشن تک گئے تھے۔ رات کو قیام گاہ پر پہونچا تو معلوم ہوا کہ مولانا ہنوز واپس نہیں آئے، ملازم نے فوراً میز پر کھانا لگا دیا کھانے کے بعد کچھ چہل قدمی کی اور پھر سو گیا — ۱۲ اپریل۔ ملازم نے آج معمول سے پہلے مجھے جگا دیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر سامان ٹھیک کیا۔ ملازم تانگہ لے آیا۔ مولانا سے چلتے وقت ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا بالکل صحیح وقت پر اسٹیشن پہنچا۔ (کانپور) کا ٹکٹ لیا۔ اتفاق سے جس گاڑی میں بیٹھا۔ اسی میں جناب ہادی مچھلی شہری تشریف فرما تھے۔ بہت عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔ ہادی صاحب کے ذریعے وحید الدین صاحب سوداگر سے تعارف ہوا وحید صاحب نے کانپور پہنچکر نگار کی خریداری کا وعدہ فرمایا۔ مجھ سے قریب ہی جناب ارشاد حسین صاحب تشریف رکھتے تھے صاحب موصوف شروع ہی سے ہمارے پرچے کے معاون ہیں ۲۶ء میں خریداری کا انقطاع ہو گیا تھا میری گزارش پر اپریل ۲۸ء سے پھر خریداری منظور فرمائی ۹ بجے کے قریب (کانپور) آگیا۔ تانگہ لیا۔ مولوی عبد الرؤف صاحب ڈپٹی کلکٹر کے بنگلہ پر پہنچا ایک خط مولانا نیاز کا ڈپٹی صاحب کے نام تھا۔ ملازم سے معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب کہیں معائنہ کے لئے گئے ہیں۔ ملازم نے اسباب ٹھیک کیا۔ میں نہا کر کچھ غیر ارادی طور پر سو گیا ۱۱ بجے ملازم نے کھانے کے لئے جگا دیا۔ میں کھانا کھا ہی چکا تھا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لائے مجھے یہ معلوم ہوا گویا میں کسی فرشتہ سے مل رہا ہوں۔ ڈپٹی صاحب کو کچہری جانا تھا اسلئے وہ مجھ سے جلد رخصت ہو گئے میں بھی کچہری پہنچا۔ بابو کرشن سہائے صاحب وکیل سے ملا وکیل صاحب نہایت خلق سے پیش آئے۔ ۱۳ اپریل۔ فراش خانہ پہنچا محب اللہ صاحب نے نگار کی توسیع اشاعت میں بہت کچھ حصہ لیا۔ اور بہت صاحبوں سے میرا تعارف کرایا عبد الحمید صاحب نے بھی بہت دلچسپی لی عبد الغفار صاحب برادرس اور وحید الحسن صاحب وکیل نے ایک ایک سال کی خریداری شروع سال سے منظور فرمائی۔ ۱۴ اپریل میاں محمد بشیر صاحب بیرسٹر و میاں محمد نظیر صاحب نے زر سالانہ مرحمت فرمایا۔ فضل حسین صاحب اڈیٹر البریہ نے اسلامیہ یتیم خانہ لائبریری کے لئے رعایتی قیمت پر ایک سال کے لئے رسالہ جاری کرایا۔ ۱۵ اپریل۔ وحید الدین صاحب بھی ایک سال کے لئے خریدار ہو گئے اسی دن حلیم مسلم لائبریری کے لئے رعایتی قیمت پر ایک سال کے لئے رسالہ جاری کیا گیا۔ حافظ عبد اللطیف نے زر سالانہ مرحمت فرمایا اور حاجی محمد داؤد دخار صاحب سوداگر چرم کے ایک خصوصی کارکن صاحب نے ایک سال کے اجرا کی اجازت دی۔ ۱۶ اپریل۔ بابو انور علی صاحب سوداگر چرم جناب صدر الدین محمد حسین صاحبان و میاں جی عبد اللطیف صاحب سوداگر چرم نے زر سالانہ مرحمت فرما کر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا —

۱۷ اپریل۔ حافظ محمد صدیق صاحب رئیس و میونسپل کمشنر نے ایک سال کے لئے خریداری منظور فرمائی۔ ۱۸ اپریل۔ میں کانپور سے رخصت ہو کر اٹاوہ پہونچا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اسلامیہ ہائی اسکول نے ایک سال کی خریداری فرما کر ممنون فرمایا۔ ہمارے قدیم معاون

سید بدر الحسن صاحب کے ذریعہ سے محمد یحییٰ شریف الحسن صاحبان سوداگران چرم نے خریداری منظور فرماکر زر سالانہ سے اعانت فرمائی - ۱۹ اپریل - مولوی عبد الحفیظ صاحب ڈپٹی کلکٹر نے ششماہی خریداری منظور فرمائی - ۲۰ اپریل - عابد حسن خاں صاحب رئیس میونسپل کمشنر نے ایک سال کی خریداری منظور فرمائی - اور جناب شفقت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر گورکھپور اور بشیر حسین صاحب انکم ٹیکس افیسر نے اجراء نگار کی اجازت دی جو صاحب موصوف نگار کے قدیم معاون ہیں - اسی سلسلہ میں مجھے مسٹر نفیس الحسن وکیل منشی احتشام علی صاحب، جناب احمد علی خاں صاحب، حبیب حسن خانصاحب مسٹر فاروق احسن خاں صاحب، اصغر حسین صاحب، بابو جوالا پرشاد صاحب ڈپٹی کلکٹر اور انکے علاوہ تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جنھوں نے کانپور، فرخ آباد، اٹاوہ مین پوری، اور قنوج وغیرہ میں اعانت کی۔

"تبسم"

ادبی جواہر

تذکرہ حسینی (فارسی) یہ ایک تذکرہ ہے جس میں ہندوستان و اہل ایران کے فارسی گو شعراء کا ذکر ہے مگر مصنف نے اس خوبی اور عمدہ ترتیب کے ساتھ لکھا ہے کہ دیکھکر بیساختہ منہ سے کلمات آفرین نکل جاتے ہیں درمیان درمیان جو حکایات درج ہیں انھوں نے دلچسپی میں اور بھی اضافہ کردیا ہے - قیمت ۱۱؍

سراپائے سخن (اردو) یہ بھی ایک تذکرہ ہے جس میں معشوق کے تمام اعضاء کی تعریف میں اساتذہ معروف و مشہور کے اشعار درج کئے گئے ہیں - عمر

زندگانی بے نظیر (اردو) یعنی سوانح عمری میاں نظیر اکبرآبادی - ہندوستان کے مشہور اور مقبول ہر دلعزیز شاعر نظیر کی سوانحعمری نہایت اعلیٰ عبارت میں درج کی گئی ہے از پروفیسر شہباز قیمت عہ

سخن شعرا (اردو) ایک جامع اور دلچسپ تذکرہ شعرا - مصنف مولوی عبد الغفور نساخ قیمت عہ

کلیات انوری (فارسی) محمود غزنوی کے دربار کے سب سے بڑے شاعر انوری کا کلام مع ہزلیات قیمت عہ

دیوان شمس تبریز (فارسی) صوفیانہ بادۂ تصوف میں ڈوبا ہوا کلام ہے نہایت عمدہ کاغذ پر صحت و اہتمام کیساتھ حال ہی میں طبع ہوا ہے عہ

دیوان نعمت خان عالی (فارسی) نعمتخاں عالی وہ شاعر ہے جس کے کمال نے اُسے عالمگیر ایسے بادشاہ کے دربار میں ہر دلعزیز بنایا عمر

دیوان ملا نور الدین ظہوری (فارسی) ظہوری وہ شاعر ہے جسے غالب بھی مانتا اور اس کا اتباع کیا ہے اسکا تمام و کمال کلام یہ ہے قیمت عہ

کلیات مرزا جلال اسیر (فارسی) جلال اسیر ان مشہور و مقبول شعرا میں سے ہے جو صاحب طرز گزرے ہیں - قیمت عہ

کلیات ظفر ہر چہار جلد (اردو) آخری تاجدار دہلی کا تمام و کمال کلام فصاحت زبان - روزمرہ - اور محاورہ میں ڈوبا ہوا ہے ۱۲؍

کلیات مومن - حضرت مومن کا پایہ شعراء میں اتنا زبردست ہے کہ دہلی کے بڑے بڑے شعرا بھی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے قیمت عمر

دیوان ناسخ - اس کو نہایت صحت کے ساتھ چھوٹی تقطیع پر چھاپا گیا ہے جس سے شان کلام بڑھ گئی ہے قیمت عہ

کلیات میر - ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر میر کے پورے کلام کا مجموعہ ہے قیمت عہ **کلیات سودا** - میر کے حریف ظریف سودا کا وہ کلام جسنے انکے معاصرین پر انکی دھاک بٹھا دی تھی - ہر صنف شعر میں استاد کامل تھے قیمت عہ

المشتہر :- **منیجر نولکشور بکڈپو لکھنؤ**